عہدِ الست

تنزیلہ ریاض

عہدِ اَلَست

تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

روشنی کو حکم تھا کہ وہ اس کے پورے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ روشنی کی بساط نہ اوقات کہ وہ اس کے حکم سے انکار کرتی سو اس نے فقط پلکیں جھپکی تھیں اور ایک معصوم وجود کو تاریکی سے روشنی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی۔ وہ آچکا تھا ایک ایسی دنیا میں جو تخلیق ہی اس کے لیے کی گئی تھی تا کہ وہ اس طرح جی سکے جس طرح جینے کا حکم ہے۔ اسی لیے وہ مطمئن اور پر سکون تھا۔ اسے زندگی کی نعمت وان کر دی گئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کا ایک ایک نقش، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اور اس کے خون کی ایک ایک بوند اس نعمت پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھی۔ وہ چند لمحے قبل دنیا میں آیا تھا لیکن اس کی حسیات مکمل تھیں۔ وہ سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

کیا واقعی "دنیا" ایک حقیقت ہے؟"

☆ ☆ ☆

کیا بنا رہے ہیں؟" زین العابدین نے پاؤں سے موزے اتارتے ہوئے بنا اسے مخاطب کئے پوچھا تھا۔ نور محمد مختصر سے ہال اور کچن کے درمیان بنے مشترکہ کیبنٹس کے قریب کھڑا ماربل شیلف پر پڑی ٹوکری میں سے سلاد بنانے کے لیے سبزیاں منتخب کر رہا تھا۔

چکن چیز سینڈوچ۔۔۔ نوڈلز اور سلاد وائٹ ساس کے ساتھ۔" اس نے بائیں ہاتھ سے کچھ سبزیاں منتخب کر کے چوپنگ بورڈ پہ رکھتے ہوئے جواب دیا تھا اور ساتھ ہی لمحہ بھر کے لئے زین العابدین کا چہرہ دیکھا تھا کہ آیا وہاں ناگواری کے تاثرات تو نہیں تھے پھر اسے بے حس و حرکت تساہل سے صوفے پہ پھیلا دیکھ کر وہ دوبارہ سے اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ بہت مہارت سے اس نے شملہ مرچ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا تھا اور اسے چوپ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسکا بایاں ہاتھ بہت نفاست اور مہارت سے بورڈ پر چل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے سب سبزیاں چوپ کر لی تھیں۔ سینڈوچ کی تیاری کے لئے وہ ضرورت کی سب چیزیں نکالنے کے لئے فرج کی طرف مڑنے لگا جب اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا روم میٹ آج کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے ٹانگیں بازو پھیلائے صوفے پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اس کے میلے موزے ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبے تھے۔

تم کچھ لو گے؟ چائے کافی؟" اس نے بظاہر فرج کے اندر جھانکتے ہوئے زین العابدین سے پوچھا تھا۔ مایونیز، چیز، انڈے، کیچپ ایک کے بعد ایک اس نے یہ سب چیزیں بھی درمیانی شیلف پر منتقل کر لی تھیں۔ زین العابدین نے مندی مندی سی آنکھیں کھولی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنی نیند سے خاموش لڑائی لڑ رہا ہے۔

نہیں شکریہ۔۔۔ڈنر کرونگا آپ کے ساتھ۔" زین العابدین نے اپنا عندیہ بھی سوئے جاگے انداز میں ظاہر کیا۔ نور محمد نے منہ سے کچھ کہا تھا نہ اثبات میں گردن کو زحمت دی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوگا۔ وہ جو کچھ بھی تیار کر رہا تھا اس کی مقدار اس نے اتنی ضرور رکھی تھی کہ نا صرف وہ بلکہ زین العابدین بلکہ ان کے باقی دو روم میٹس بھی چاہتے تو بخوشی ڈنر میں شامل ہو سکتے تھے۔ ویسے تو کھانے پینے کے معاملے میں وہ چاروں اپنی اپنی مرضی کے مالک تھے۔ کوئی کسی پر بھی انحصار نہیں کرتا تھا لیکن نور محمد جب بھی کچن میں مصروف نظر آتا تو ان لوگوں کو اندازہ ہو جاتا کہ آج انہیں خود سے محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

میں کچھ مدد کروں آپ کی؟" زین العابدین نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے انداز میں تھکاوٹ سی محسوس ہوتی تھی نور محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ہمیشہ اپنا کام اکیلے ہی کرنا پسند کرتا تھا۔ زین العابدین دوبارہ صوفے پر گر گیا تھا۔ نور محمد نے فرج والے ساکٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہال کی اضافی لائٹ بند کر دی تھی۔ اب وہاں صرف ہلکی سی روشنی موجود تھی جو اس ٹیوب لائٹ سے آرہی تھی جو کچن میں لگی تھی یا پھر کوریڈور کی طرف ایک چھوٹا بلب تھا جس سے روشنی کی دبلی پتلی سی کرنیں ہال میں لیٹے زین العابدین کے وجود پر پڑ رہی تھیں۔

مجھے تو آج زیادہ آرام نے تھکا دیا ہے۔ سچ کہا کسی نے فراغت ہر ایک کو راس نہیں آتی"

وہ جیسے غنودگی کے عالم بولا تھا۔ نور محمد نے اس کی بات پر بھی کوئی تاثرات ظاہر نہیں کئے تھے۔ وہ بائیں ہاتھ سے چھری پکڑے اس کی تیز دھار سے ڈبل روٹی کے موٹے کنارے علیحدہ کر رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ زین العابدین کو فراغت نہیں ڈپریشن تھکا رہا تھا۔ اسے اس کی شام کی شفٹ والی ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اس کی اضافی آمدنی کا ایک ذریعہ بند ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھا مگر وہ اپنی پریشانی کا کھل کر اظہار نہیں کرتا تھا۔ صرف وہی نہیں یہاں زیادہ تر لوگ ایسے ہی تھے۔ نور محمد ہر روز ایسے کتنے ہی لوگوں سے ملتا تھا جن کے چہرے اس قسم کی پریشانیوں نے کملا رکھے تھے۔ وہ اپنی پریشانیوں کو، اپنے مسائل کو اپنی اولاد کی طرح پال رہے تھے یعنی ہر گزرتا دن ان کو بڑھاپے کی طرف لے جا رہا تھا اور مسائل تھے کہ دن بدن تنومند ہوتے جا رہے تھے۔ نور محمد کو ان سب پر ترس آتا تھا۔ زین العابدین بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایرانی تھا اور تبریز کا رہنے والا تھا۔ ڈیڑھ سال قبل وہ اسٹڈی ویزہ پر انگلینڈ آیا تھا لیکن نور محمد نے کبھی اسے کسی قسم کی سٹڈی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نو مہینے سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور اس نے اسے گدھوں کی طرح کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ دو دو جگہ پہ ڈیوٹی کرتا تھا، اسکے علاوہ اوور ٹائم بھی کرتا تھا۔ چھٹی کے دن بھی وہ سکیورٹی گارڈ کے طور پر کسی جگہ کام کرتا تھا۔ اتنی سخت محنت کے باوجود وہ بمشکل چند پاؤنڈ فی گھنٹہ کما پا رہا تھا۔ اس کے خاندان میں اس کی بیوی اور ایک بیٹے سمیت بارہ افراد تھے۔ اسکا باپ ایک حادثے میں معذور ہو گیا تھا، اسکی ماں بوڑھی تھی، اس کے بھائی چھوٹے تھے اور اس کی بہنیں تیزی سے جوان ہو رہی تھیں اور زین العابدین سب سے زیادہ اپنی بہنوں کے لئے ہی پریشان نظر آتا تھا۔ وہ تمام رقم اپنے گھر تبریز بھجوا دیا کرتا تھا جہاں اس کی ماں اس رقم سے اس کے بھائیوں کو پڑھا رہی تھی اور اس کی بہنوں کا جہیز بڑھا رہی تھی۔ یہی چیز زین العابدین کے لئے اطمینان بخش تھی۔

بچیاں بہت جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔۔۔ان کے بارے میں جلدی سوچنا پڑتا ہے۔"

وہ اکثر خود کلامی کے سے انداز میں کہا کرتا تھا۔ یہاں زیادہ تر لوگ اسی انداز میں بات کرنے کے عادی تھے کیونکہ یہاں بات کرنے والے زیادہ اور سننے والے بہت کم تھے۔ نور محمد بھی زیادہ لمبی چوڑی بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی زین العابدین کی ایسی باتوں پر کمنٹ کرتا تھا۔

"یہ قانونِ فطرت ہے زین العابدین اسے بدلنا آسان نہیں ہے۔"

آپکا کیا خیال ہے فطرت اپنے اصول کبھی نہیں بدلتی۔۔۔؟۔۔۔ بدلتی ہے۔۔۔ بوقتِ ضرورت بدل لیتی ہے۔ مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے مگر پالک کو کبھی مقناطیس کو کھینچتے نہیں دیکھا گیا حالانکہ پالک میں بھی تو فولاد ہوتا ہے۔ مقناطیس اپنی فطرت بدلتا ہے نا۔۔۔ جب باپ معذور ہو جائیں تو بیٹیوں کو بھی جوان ہوتے تھوڑا سا تو سوچنا چاہیئے۔۔۔ مجھے اس سے زیادہ کی خواہش ہے ہی کب۔۔۔ برادر نور محمد۔"

وہ اکثر جذباتی ہو کر ایسی غیر منطقی باتیں کیا کرتا تھا۔ نور محمد چاہتا تو اس کو بہت زیادہ تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کر سکتا تھا۔ اسے گفتگو کے فن پر انتہا کا عبور حاصل رہا تھا لیکن اسکا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ زین العابدین کی صرف مالی مدد کر سکتا تھا اور وہ کر دیا کرتا تھا۔ ایک ہی چیز تھی جس کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ اس کے پاس دو چیزیں وافر تھیں۔۔۔ پیسہ اور دوسروں پر پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ۔ اسکے پاس ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچوں کے الفاظ والی کوئی ڈکشنری نہیں تھی۔ اس کے کندھے ہر قسم کی ذمہ داری کے بوجھ سے آزاد تھے۔ وہ جہاں رہ رہے تھے یہ دو بیڈز کا فلیٹ اسکا اپنا تھا۔ ایک کمرہ اس نے ایک عرب طالبعلم کو دے رکھا تھا جو اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ یہ روم شیئر کر رہا تھا۔ نور محمد اور زین العابدین دونوں ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اس گھر میں کارپٹ سے لے کر فرنیچر تک اور برتنوں سے لے کر اپلائنسز تک، بہت سی چیزیں نور محمد کی ملکیت تھیں۔ انرجی بلز سے لے کر گروسری تک کافی چیزوں کی ادائیگی اس کی جیب سے ہوتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ رہنے والے اسے کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی سہولت سے اسے دیتے تھے نور محمد بلا چوں چراں کئے رکھ لیتا تھا اور اگر کسی مہینے وہ کچھ بھی نہ ادا کرتے تو وہ مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ یہ شاید اتنی بڑی بات نہ لگتی لیکن برطانیہ جیسے مہنگے ملک میں یہ کافی بڑی صلہ رحمی تھی۔ اس صلہ رحمی کے جواب میں نور محمد کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ اس کے ساتھ جو بھی رہے وہ مسلم ہو۔ اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ ویسے بھی کسی سے زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس کے لئے صرف دو چیزیں اہم تھیں اسکی کتابیں اور اس کی مسجد۔ کتابیں اسکا شوق تھا اور مسجد اسکا جنون۔ وہ لوٹن کی جامعہ مسجد میں مؤذن کے طور پر فرائض ادا کر رہا تھا۔ وہ ان ہی دو چیزوں کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتا رہتا تھا اور اگر ان دو چیزوں کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ تھا تو کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔

سینڈوچز میں فلنگ لگانے کے بعد نور محمد نے مایونیز اور کریم کو مکس کر کے سلاد تیار کرنی شروع کی تھی۔ سینڈوچز اس نے تیار کر کے اوون میں رکھ دیئے تھے تاکہ گرم رہیں پھر سلاد کا کام نمٹا کر اس نے دائیں ہاتھ سے چمچ بھر کر اسے منہ میں رکھا تھا۔ نمک، کالی مرچ اور لہسن کے ہلکے سے ذائقے کے ساتھ سلاد مکمل تیار تھی۔ اس نے اسے ڈھانپ کر دوبارہ فرج میں رکھ دیا تھا اب صرف نوڈلز کا کام باقی تھا۔ اس نے ہال میں دیکھا تھا وہاں اب زین العابدین نہیں تھا۔ اسے اپنے کاموں میں اس کے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس نے برنر کے سائیڈ والے کیبنٹ کھول کر اس میں

سے انسٹنٹ نوڈلز کے دو کپ نکالے تھے۔ الیکٹرک کیتل میں سے ابلتا گرم پانی کپوں میں ڈالتے ہوئے اس نے عقب میں زین العابدین کی آواز سنی۔

کتنی دیر ہے برادر؟" اس نے مڑ کر دیکھا۔ زین العابدین شاید منہ ہاتھ دھو کر آیا تھا اور اب صوفے کے سامنے پڑی میز پر پڑی چیزیں سمیٹ کر رکھ رہا تھا۔

ڈنر تیار ہے۔" نور محمد نے اطلاع دی تھی۔ نوڈلز کے کپ کو کیپ لگا کر صرف شیک کرنا تھا اور نوڈلز تیار تھیں۔

میں میز لگاتا ہوں۔" اس نے کہا تھا پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

آج مسجد میں نمازِ عشاء کے بعد کچھ لوگ آپ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔"

پتا نہیں وہ بتا رہا تھا یا پوچھ رہا تھا۔ نور محمد بائیں ہاتھ سے نوڈلز کے کپ کو شیک کر رہا تھا۔ اس نے یکدم چونک کر زین العابدین کا چہرہ استفہامیہ انداز میں دیکھا تھا۔

مجھے استقلال بیگ نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔ آپ شاید آج مسجد سے جلدی واپس آ گئے تھے۔" زین العابدین آج کل نمازِ عشاء مسجد میں ہی ادا کرتا تھا۔

مجھ سے ملنے۔۔۔؟ مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے؟" نور محمد کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ وہ کافی گھبرا گیا تھا۔

مجھے تو نہیں پتا۔۔۔ میں نے تو نہیں دیکھے۔۔۔ شاید پاکستانی تھے۔" وہ اپنے دھیان میں مگن کہہ رہا تھا۔ نور محمد کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔

پاکستانی۔۔۔ کون پاکستانی۔۔۔؟" وہ ہڑبڑا کر پوچھ رہا تھا۔ بایاں ہاتھ بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے مزید قریب ہو کر نوڈلز والا کپ شیلف پر رکھ دیا تھا۔

میرے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟ مجھ سے کیا کام تھا ان کو؟" اب کی بار اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں جیسے یہ بات خود سے پوچھ رہا تھا۔ عجیب سے خدشات تھے جس نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ اسے اپنا آپ کمرۂ امتحان میں موجود اس طالبعلم کی طرح لگ رہا تھا جس کا وائیوا لیا جانے والا ہو اور اس سے پہلے والا امیدوار وائیوا دینے جا چکا ہو۔ اس کی باری آنے ہی والی تھی جبکہ وہ خود کو حوصلہ دے رہا ہو کہ اس میں ڈرنے والی بات کچھ بھی نہیں ہے۔

آپ کے بارے میں اس لئے پوچھ رہے ہوں گے کہ کوئی دم درود والا مسئلہ ہو گا۔ یہ پاکستانی، ہندوستانی مسلمان سب کے سب بڑی ہی بدعتوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی بیماری، کوئی پریشانی، کوئی مسئلہ ہو جائے، دوڑے جاتے ہیں بابوں کے پاس تعویذ لینے، دم کروانے۔ یہ نہیں کہ بندہ خدا تم خود قرآن پڑھو۔ دعا مانگو۔ اللہ بہتر مدد کرنے والا ہے۔

زین العابدین اپنے مخصوص متکبرانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے ایرانی مسلمان خون پر بہت فخر تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ کچن والے

حصے میں ہی آ گیا تھا پھر اسنے کافی کے لئے دو مگ اٹھائے تھے۔ نور محمد نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

میرے لئے کافی مت بنانا۔۔۔ تم ڈنر کر لو۔۔۔ سب کچھ تیار ہے۔"

نور محمد نے نوڈلز والا کپ اٹھا کر اسکا کیپ کھولا تھا پھر سینڈوچ میں کی گئی فلنگ کا تھوڑا سا بچ جانے والا مواد اس کپ میں ڈال کر اسے زین العابدین کو پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ زین العابدین نے حیرانی سے اسے دیکھا اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ نور محمد سے اسکے رویے کی وجہ پوچھنا بیکار تھا۔ نور محمد اپنی مرضی سے بولتا تھا۔ اپنی مرضی کے سوالوں کا جواب دینا پسند کرتا تھا۔ اس نے صرف ایک مگ میں ہی پانی لے کر کافی پھینٹنا شروع کر دی تھی۔ نور محمد کے ایسے معمولات اس کیلئے ایسے نئے نہیں تھے۔ وہ اکثر نہایت بدمزاج ہو جاتا تھا اور تب اسکی نیلی آنکھیں بے حد بے حس لگنے لگتی تھیں۔

ڈنر تیار کر دیا مگر خود ساتھ بیٹھ کر نہیں کھائیں گے شاید بھوکے ہی سو جائیں۔ کتنی بار کہا ہے بائیں ہاتھ سے کام مت کیا کرو برادر، بے برکتی ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ایسے طعام کا فائدہ جس کا ایک لقمہ بھی کھانا نصیب نہ ہو۔" نور محمد کو اپنے کمرے کی جانب جاتا دیکھ کر اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ نوڈلز کی کپ سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

تین سینڈوچ، دو چائے، ایک ایپل جوس اور ایک باؤنٹی (چاکلیٹ)" کیفے ٹیریا کے کاؤنٹر کے گرد کھڑے آرڈر پلیس کرتے ہوئے اس نے سرسری غیر ارادی نگاہ اس سمت میں ڈالی تھی جہاں سے کچھ دیر پہلے اٹھ کر وہ آرڈر پلیس کرنے آیا تھا۔ عمر ابھی بھی سابقہ شاہانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا جبکہ امائمہ کھڑی ہو چکی تھی چونکہ شہروز کی جانب اس کی پشت تھی اس لئے وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ کھڑی ہو کر کیا کر رہی ہے۔ چند لمحوں بعد اس نے اسے کرسی کی پشت پر لٹکا اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکاتے اور ڈیپارٹمنٹ کے رستے کی طرف قدم بڑھاتے دیکھا۔ وہ واپس جا رہی تھی۔

ہیلو۔۔۔ ایکسکیوزمی۔۔۔ کدھر۔۔۔؟ اس نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ اس کی نگاہ وہاں تک پہنچ رہی تھی لیکن آواز کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اوپن ائیر کیفے ٹیریا میں دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے بھی کافی لوگ موجود تھے اس لئے اس نے نام لے کر امائمہ کو نہیں پکارا تھا حالانکہ امائمہ کے رویے نے اسے کچھ الجھا دیا تھا۔ ان کی کلاس تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ امائمہ کو کنوینس کا کچھ پرابلم تھا۔ شہروز اسے گھر تک ڈراپ کرنے والا تھا اسی لئے وہ بہروز بھائی سے گاڑی مانگ کر لایا تھا ورنہ اسے اسکی بائیک کافی تھی اور امائمہ اس کے ساتھ بائیک پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ گاڑی میں بھی وہ اسے اکیلا ڈراپ نہیں کرنے والا تھا بلکہ اس کی دو عدد کلاس فیلو بھی ہمراہ جانے والی تھیں۔ پہلے بھی وہ کبھی کبھار امائمہ اور اسکی فرینڈز کو گھر تک چھوڑ دیا کرتا تھا۔ سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک تھا پھر اب وہ اس طرح اٹھ کر کیوں چلی گئی تھی۔ یہ سوال اسے شاید اتنا نہ الجھاتا اگر عمر اس ٹیبل پر موجود نہ ہوتا۔

امائمہ چلی گئی؟ مطلوبہ چیزوں کی ٹرے لے کر اپنی جگہ تک آتے ہوئے وہ اسی کے متعلق الجھ رہا تھا اسلئے آتے ہی پہلا سوال بھی یہی کیا۔

نظر آ رہی ہے کیا؟" عمر نے جواب دینے کی بجائے اس سے سوال کیا تھا۔ شہروز نے اس کے انداز کو زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا تھا۔

میرا مطلب ہے۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ کیوں چلی گئی وہ۔۔۔ کوئی پرابلم؟" وہ عمر کے انداز کو برداشت کرتا ہوا دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

تمہیں یہ سوال امائمہ سے پوچھنا چاہیئے۔۔۔ نہیں؟" اب وہ اس ٹرے کو دیکھ رہا تھا جو شہروز لے کر آیا تھا۔ شہروز نے اسے دل ہی دل میں گالی دی۔ گالی وہ اسے منہ پر بھی دے دیتا تھا لیکن پبلک پلیس اور پھر یونیورسٹی میں ڈیسنٹ امیج کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ بھوک بھی بے حد لگ رہی تھی اسی لیے وہ لائبریری میں بیٹھنے کی بجائے کینٹین تک آیا تھا۔ اگر اسے پتہ ہوتا کہ عمر صاحب ٹپکنے والے ہیں تو شاید وہ ایسا نہ کرتا۔ عمر کو آجکل نجانے کیوں یونی ورسٹی آنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ اگرچہ پہلے بھی وہ شہروز کا سایہ بنا رہتا تھا لیکن نوبت یہاں تک نہیں آئی تھی کہ وہ سکول اور کالج میں بھی اس کا پیچھا کرتا رہے۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان دوستی نہیں تھی۔ دوستی تو مثالی تھی عمروں، مزاجوں اور دلچسپیوں میں فرق کے باوجود وہ گہرے دوست تھے۔ اس دوستی نے ان کے درمیان خون کے رشتے کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن اس دوستی کو جھگڑوں اور خفگیوں کا تڑکا لگتا رہتا تھا۔

شہروز کے چاچو کی فیملی ایک عرصے سے انگلینڈ میں مقیم تھی اور ہر تین یا چار سال بعد چاچو لوگ دو تین مہینے کی چھٹی پاکستان ضرور گزارتے تھے۔ اسی لئے ان کے بچے بڑے ہو کر بھی اسی روایت پر چل رہے تھے۔ عمر تو اب اکیلا بھی پاکستان آ جایا کرتا تھا جبکہ عمر سے چھوٹا عمیر نہیں آتا تھا۔ اسکا دل اپنے والدین کے بغیر پاکستان میں نہیں لگتا تھا۔ عمر نے بی بی اے آنرز کیا تھا اور اب تو جاب بھی کرنے لگا تھا لیکن پھر بھی اس کی طبیعت میں سنجیدگی نہیں تھی جس کی وجہ سے شہروز چڑ جایا کرتا تھا۔ اس دفعہ بھی وہ دو مہینے کے لئے آیا تھا۔ ایک مہینہ تو ہو چلا تھا آئے ہوئے اور اس ایک مہینے میں وہ شاید آٹھویں یا نویں دفعہ شہروز سے ملنے یونیورسٹی آ گیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ یونیورسٹی کے بعد شہروز سارا وقت اسے دیتا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے غصہ دلانے کے لئے آ جاتا تھا۔ ابھی تو باقاعدہ کلاسز نہیں ہو رہی تھیں اس لئے شہروز بھی ہفتے میں دو تین بار سے زیادہ نہیں آتا تھا اگر آتا ہوتا تو شاید عمر بھی روز اس کے ساتھ آ جاتا۔ آج سے پہلے عمر نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا مگر امائمہ کے اس طرح اٹھ کر چلے جانے کے بعد وہ یہ سوچ سوچ کر تپ رہا تھا کہ عمر کیوں آ گیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے اور امائمہ کے درمیان کوئی ایسا تعلق تھا کہ کسی تیسرے کی موجودگی ناگوار گزرتی۔ امائمہ اس کے لئے بے حد قابلِ عزت تھی۔ اسی وجہ سے اسے خدشہ تھا کہ عمر نے کچھ ایسا نہ کہہ دیا ہو جو اسے برا لگا ہو۔ عمر کافی منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ اس کی طبیعت میں بے حد لاپروائی تھی اسے پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سے کیا بات کرنی ہے۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں سے ایک انداز میں بات کرتا تھا۔ گھر کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن امائمہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ وہ اس کی کزن تھی نہ کلاس فیلو اور ابھی ابھی شہروز کو یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ آج بھی جب اس نے عمر کو آتے دیکھا تھا تو ناگواری کی رمق اس کے چہرے پر در آئی تھی جسے تب شہروز نے کچھ خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" پہلا سینڈوچ ختم کر کے اس نے سوچا تھا اور عمر کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بھی کھانے میں مگن تھا۔

امائمہ نے تم سے کچھ کہا؟" بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے شہروز نے پوچھا تھا۔ عمر سینڈوچ ختم کر چکا تھا۔ اس کے ریپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے ٹرے میں موجود چاکلیٹ اٹھانا چاہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ شہروز کے سوال کو سن کر بھی ان سنی کر رہا ہے۔ یہ اس کی پرانی

عادت تھی۔

یہ تمھارے لئے نہیں ہے۔" اسے چاکلیٹ اٹھاتا دیکھ کر شہروز نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

اوہ۔۔۔ سوری" وہ پیچھے ہٹ گیا اور چائے کا کپ اپنی جانب سرکا لیا۔ شہروز کوفت میں مبتلا ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا امائمہ نے تم سے کچھ کہا؟" شہروز نے دہرایا۔ عمر سیدھا ہوا پھر انجان بن کر بولا

اس نے مجھ سے "کچھ" کہنا تھا؟" اسکا انداز ایسا تھا کہ عمر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ عمر لاپرواہ تھا، منہ پھٹ تھا کچھ بولڈ بھی تھا لیکن فلرٹ نہیں تھا"۔۔۔ تو پھر۔۔۔؟" شہروز نے بہت غور سے اسکا چہرہ دیکھا۔

میرا مطلب ہے کہ اس نے تم سے کہا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے والی ہے؟" وہ سنبھل کر بولا تھا مگر سامنے بھی شہروز تھا جو اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عمر کو آسانی سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ غلط کر چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں کا غلطی کا تصور کچھ مختلف تھا۔ عمر کا خیال تھا کہ شہروز ہر شرارت کو غلطی قرار دیتا ہے جبکہ شہروز کو یقین تھا کہ عمر شرارت کے نام پر ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔

اس طرح کیوں گھور رہے ہو مجھے؟" شہروز کو مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے ناک چڑھا کر پوچھا تھا۔ شہروز نے کچھ کہنے کی بجائے ایک اور کڑی نظر اس پر ڈالی۔ اسکائی بلیو رنگ کی آدھی بازوؤں والی ٹی شرٹ اور ڈارک بلیو جینز میں ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ گندم کی دانوں کی طرح چمکتا اس کا یہ کزن نجانے اس کے ساتھ کون سی گیم کھیل رہا تھا۔

خدا کے لئے مجھے اس طرح گھورنا بند کرو۔۔۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔۔۔ میں نے ایک جنرل بات کی تھی اور اسے پتا نہیں۔۔۔"

شہروز کی نظروں سے خائف ہو کر وہ اگل رہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔

آپ مجھے وہ جنرل بات بتانا پسند کریں گے؟" شہروز کا چائے کی طرف بڑھتا ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا تھا۔ بلی آدھی تھیلے سے باہر آ چکی تھی اور اس آدھی بلی نے ہی شہروز کو غصہ دلا دیا تھا۔ اس کے مزاج کی سنجیدگی صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ عمر پر برسنے کو تیار ہے۔

غصہ مت کرو۔۔۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ آجکل کا زمانہ بھی عجیب ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ گرل فرینڈز بیٹھی رہتی ہے اور بوائے فرینڈز نوکروں کی طرح چائے پانی لانے پر لگے رہتے ہیں۔ اس کیفے ٹیریا کی صورتحال ہی دیکھ لو۔۔۔ سب لڑکیاں بیٹھی ہیں اور لڑکے چائے سموسے لے کر آ رہے ہیں۔۔۔ اتنا ہی کہا تھا میں نے۔۔۔ بس پھر"

بیڑا غرق۔" شہروز نے اپنی پیشانی پر عورتوں کے سے انداز میں ہاتھ مارا تھا۔ وہ جسے تھیلے کی بلی سمجھا تھا وہ باہر آنے کے بعد ہاتھی بن چکی تھی۔ اس طرح کے کمنٹس کا تو کوئی بھی لڑکی برا مان سکتی تھی حتیٰ کہ وہ بھی جو لڑکوں کے ساتھ کینٹین میں آتی ہی اس لئے تھیں اور یہ تو امائمہ تھی جو لڑکے تو لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بھی زیادہ دیر کیفے ٹیریا میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ لڑکے تو کیا کسی لڑکی کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ امائمہ اور اس کی فرینڈز سے ان کی حدود سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی۔

کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟" عمر اس کے تاثرات سے خائف ہوئے بنا پوچھ رہا تھا چہرے پر معصومیت اتنی تھی جیسے پتا ہی نہ ہو کہ سہی اور غلط میں فرق کیا ہے۔

اتنے بھی بچے نہیں ہو تم کہ یہ نہ پتا ہو۔۔۔ تمہیں یہ بکواس کرنے کی ضرورت کیا تھی؟" شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا ہی کھا جائے۔

اب تم برا مان جاؤ۔۔۔ ایک تو یہ بہت پرابلم ہے یہاں پہ۔۔۔ سچ بولو تو بھی لوگ بو تھا سجا لیتے ہیں۔۔۔ ایک بات بتاؤ اگر میں واقعی غلط ہوں تو پھر کاؤنٹر کے گرد جو اتنے لڑکے کھڑے ہیں اور وہ جو چائے کے کپ اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں اور یہ جو ٹیبلو کے گرد لڑکیاں ہی لڑکیاں بیٹھی ہیں اور پھر اپنی امائمہ بیگم کو کرسی پر بیٹھا کر تم جو آرڈر پلیس کرنے کاؤنٹر پر گئے تھے وہ سب کیا ہے۔ کبھی کبھی سچی بات آرام سے ہضم کر لینی چاہیئے۔۔۔ مان لو شہروز بیٹا کہ پاکستانی لڑکے لڑکیوں کی چاکری کرنا پسند کرتے ہیں۔"

بکواس مت کرو عمر۔" شہروز نے اسے روکنا چاہا تھا لیکن وہ نہیں رکا تھا۔

کیوں۔۔۔ اب تمہاری باری ہے؟۔۔۔ فکر مت کرو تمہیں بھی بکواس کرنے کا موقع ملے گا لیکن اس سے پہلے میرا ایک مفت مشورہ ہے۔"

اب وہ کرسی پر مزید سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

چھوڑ دو اس لڑکی کو۔۔۔ بڑی نخریلی ہے۔۔۔ شوخی۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں اپنے لئے ایک بہتر گرل فرینڈ تلاش کرنی چاہیئے۔"

وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔ ڈیم اٹ۔" شہروز غرایا تھا۔

ہاں ہاں وہی کلاس فیلو۔" عمر کا انداز اب بھی سابقہ تھا۔ ان کے درمیان اس طرح ہی بات ہوا کرتی تھی۔ ایک دوسرے کو چڑانا، غصہ دلانا ان دونوں کو ہی پسند تھا اور عمر تو اس کام میں ماہر تھا۔

اٹھو۔۔۔ اٹھو یہاں سے۔۔۔ اور دفع ہو جاؤ۔۔۔ خبیث تم اس قابل ہی نہیں ہے کہ تم سے بات کی جائے۔۔۔ ال مینرڈ۔۔۔ تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ کسی لڑکی سے کس طرح بات کرتے ہیں۔۔۔ تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ ابھی کے ابھی چلے جاؤ۔"

شہروز اسے انگلی سے وارننگ دے رہا تھا لیکن اس پر مطلق اثر نہیں ہوا۔

کیوں چلے جاؤں۔۔۔ یہ جگہ گورنمنٹ نے تمہارے ابا کو الاٹ کر دی ہے؟ اور ہاں بائی دا وے کس طرح بات کرتے ہیں لڑکی سے۔۔۔ الٹا لٹک کر۔۔۔؟ سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے۔۔۔ لڑکی ہے کہ تھانیدارنی۔۔۔ دفع ہم سے نہیں ہوتا یہ سب۔۔۔ ہم ال مینرڈ ہی ٹھیک ہیں۔"

عمر کا اطمینان نجانے کیوں پہلی بار شہروز کو چونکانے کا باعث بن رہا تھا۔ اسے ایک دم ہی احساس ہوا تھا کہ جیسے عمر کا اطمینان مصنوعی ہے۔ وہ اتنا مطمئن نہیں تھا جتنا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی بے چینی کو چھپانا چاہ رہا ہے اس لئے بلاوجہ سارا مدعا شہروز پر ڈال رہا ہے اور ایسے بھی لگ رہا تھا جیسے وہ شہروز پر اپنا راز عیاں ہو جانے کے خوف سے ادھر اُدھر کی ہانک کر اس کی توجہ خود پر سے ہٹانا چاہ رہا ہے۔ کچھ ایسا انوکھا پن ضرور تھا عمر کے انداز میں جس سے بار بار شہروز ٹھٹھک رہا تھا۔

اوہو کم آن۔۔۔ مجھے گھورنا تو بند کرو۔۔۔ او کے کیا کروں میں۔۔۔؟ ایکسکیوز کروں تمہاری گرل۔۔۔"

اسے خود کی جانب مسلسل دیکھتا پا کر عمر گویا زچ ہو کر بولا تھا لیکن چونکہ عادت سے مجبور تھا اس لئے اتنا کہہ کر لمحہ بھر کے لئے رُکا پھر بولا میرا مطلب ہے تمہاری کلاس فیلو سے؟"

اس موقع پر شہروز اسے آزما سکتا تھا مگر وہ چوک گیا۔

آج تو تم مجھے حیران کرنے پر تلے ہوئے ہو۔۔۔نا صرف اپنی غلطی مان رہے ہو بلکہ معافی مانگنے پر بھی تیار ہو۔"

استہزائیہ مسکراہٹ خود بخود اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔

غلطی؟۔۔۔کون سی غلطی۔۔۔؟۔۔۔میں نے کوئی غلطی نہیں کی میرے بھائی۔۔۔اور معافی مانگ رہا ہوں تیری خاطر۔۔۔تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ سچ بات کرتا ہوں۔۔۔پرفیکٹ لوگ کبھی غلط نہیں ہوتے۔"

اپنی مدح سرائی میں وہ ہمیشہ کتاب لکھنے کو تیار رہتا تھا۔شہروز اس کے انداز پر مزید کھل کر مسکرایا۔تابوت کا آخری کیل اگرچہ باقی تھا مگر تابوت اس کے بغیر بھی بند تھا۔آخری کیل نہ بھی لگتا تب بھی تابوت کے کھلنے کا امکان نہیں تھا لیکن شہروز کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

معاف کیا۔۔۔کیا یاد کرو گے تم بھی۔۔۔کسی کی خاطر معاف کیا تمہیں۔"

احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔میں نے کہا نا میں اس سے ایکسکیوز کرنے کو تیار ہوں۔"

اس نے گلے میں لٹکائے سن گلاسز آنکھوں پر ٹکائے تھے۔وہ سمجھ چکا تھا کہ شہروز اسے کڑی نگاہوں سے گھور رہا ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھا تھا کہ شہروز اس کا راز کھوجنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے تئیں اس میں آدھا کامیاب بھی ہو چکا ہے۔

بیکار میں وقت ضائع مت کرو۔۔۔ویسے بھی وہ تمہارے انتظار میں نہیں بیٹھی ہو گی۔۔۔گھر جا چکی ہو گی۔"

شہروز نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تھی۔

نہیں۔۔۔ابھی نہیں گئی۔۔۔اگر گئی ہوتی تو مجھے نظر آ جاتا اور ویسے بھی اسے تم ڈراپ کرنے والے تھے نا۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔اس کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا جہاں کئی اسٹوڈنٹس اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹس سے داخلی راستے کی جانب رواں رواں تھے۔ان کے ڈیپارٹمنٹ سے اس راستے کی طرف جانے کے لئے کیفے ٹیریا کے سامنے والی روش سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔بے شک یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن اتنا کم بھی نہیں تھا کہ وہاں موجود ایک کرسی پر بیٹھ کر کسی کو جاتا دیکھ کر پہچانا جا سکتا۔یہ تب ہی ممکن تھا جب کوئی مسلسل اس سمت میں دیکھتا رہتا اور اسے جانے والے کے کپڑوں کے رنگ وغیرہ کی پہچان ہوتی۔شہروز نے بمشکل اپنی حیرانی کو چھپایا تھا۔اسے اپنے اندازوں کی سو فیصد مثبت رپورٹ ایک انجانی سی خوشی میں مبتلا کر رہی تھی۔عمر کو تنگ کرنے اور اس کا ریکارڈ لگانے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ لگا تھا اس کے۔

ہاں لیکن تمہیں کیسے پتہ۔۔۔آئی مین میں اسے ڈراپ کرنے والا ہوں؟"

وہ بھی جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اوہو اسٹوپڈ تم کیسے احمقانہ سوالات پوچھ رہے ہو۔۔۔آف کورس تم نے بتایا تھا رات۔۔۔اسامہ بن لادن تو فون کرنے سے رہا مجھے۔"

عمر اس کے سوال سے کم انداز سے زیادہ چڑ رہا تھا۔ شہروز نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا رہا تھا۔ یہ ذو معنی مسکراہٹ عمر کو خجل بھی کر رہی تھی۔

بڑا یاد رکھا جناب نے۔۔۔ میں نے تو سرسری ساذکر کیا تھا۔" شہروز کی آنکھیں شرارتی انداز میں سکڑی تھیں۔ اب کی بار عمر نے اس کی جانب بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں پر گلاسز تھے اس لئے اس کی آنکھیں پڑھنا فی الوقت شہروز کے لئے مشکل تھا مگر وہ ٹھٹک چکا تھا۔

اوئے۔۔۔ کدھر۔۔۔ کیا سوچ رہا ہے تو۔۔۔ تیری ٹرین زیادہ دور نہ نکل جائے اس لئے پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ غلط اسٹیشن کی طرف جا رہا ہے تو اور اتنا سڑا ہوا اسٹیشن تجھے ہی مبارک ہو۔۔۔ میں چلتا ہوں۔"

وہ واقعی گیٹ کی جانب چل دیا تھا لیکن جاتے ہوئے خفگی سے بولا تھا۔ اس مصنوعی خفگی نے شہروز کو گہری طمانیت بھری مسکراہٹ سے دوچار کیا تھا۔ اس کے ہاتھ عمر کا بہت بڑا سیکرٹ لگ چکا تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹرے میں پڑی چاکلیٹ اٹھا کر اس نے ہاتھ میں پکڑی تھی۔ چند لمحے اس چاکلیٹ کی جانب دیکھنے کے بعد اس نے اس کا ریپر پھاڑا تھا۔ چاکلیٹ اسے کچھ خاص پسند نہیں تھی لیکن فی الحال منہ میٹھا کرنے کے لئے کچھ اور میسر نہیں تھا۔

اور میں سمجھتا تھا تو واقعی میری خاطر آتا ہے دوست؟" چاکلیٹ کا بائٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں نے بال ٹرم کروا لئے۔" موبائل فون کان سے لگاتے ہی زارا کی افسردہ سی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ شہروز نے منہ کا برا سا زاویہ بنا کر گہرا سانس بھرا۔ موبائل کی سکرین پر اسکا نام چمکتا دیکھ کر وہ جس خوشگوار احساس میں مبتلا ہوا تھا اسکا اثر یکدم کم ہوا۔ زارا کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ اچھے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے اسقدر زود رنج طبیعت پائی تھی کہ اس وقت شہروز کسی ناگواری کا اظہار کرتا تو شاید وہ گھنٹوں روتی رہتی۔

آہاں۔۔۔ بڑی فرصت نکالی اپنے لئے۔۔۔ اور میرے لئے بھی کہ مجھے اطلاع بھی دی جا رہی ہے۔۔۔ ویسے اچھے لگ رہے ہوں گے۔۔۔ ہے نا۔۔۔ کونسا کٹ کروایا ہے؟"

لہجے میں مصنوعی بشاشت پیدا کر کے اس نے رائے کا اظہار بھی کیا اور استفسار بھی۔ اس کی طبیعت سے کسی قدر چڑنے کے باوجود یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اب جبکہ وہ اس کی آتھورائزڈ منگیتر بن چکی تھی تو اتنی دلجوئی تو فرض تھی اس پر۔

مشروم کٹ" زارا کی آواز میں افسردگی کا لیول کم نہیں ہوا تھا۔

یہ اچھا کیا تم نے۔۔۔ مجھے ویسے بھی زیادہ چھوٹے بال پسند نہیں ہیں۔" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اپنی دانست میں اس نے اسے خوش کرنا چاہا تھا حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ مشروم کٹ کونسا ہیئر کٹ ہے۔

مشروم کٹ وہی ہیئر کٹ ہے جو میں نے پہلے کروا رکھا تھا۔" زارا کے لہجے میں افسردگی کے ساتھ طنز بھی جھلکا تھا جسے شہروز سمجھ نہیں پایا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے جوگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔ کچھ دیر قبل وہ اور عمر جم سے واپس آئے تھے۔ اس کے منہ کا ذائقہ تو زارا کی بات سن کر کڑوا ہو گیا۔ زارا کا پرانا ہیئر کٹ اسے سخت ناپسند تھا پسند تو وہ زارا کو بھی نہیں تھا بلکہ اس کی تو دلی خواہش تھی کہ وہ بالوں کو بڑھائے، ان کی چوٹی بنائے، ان

میں پراندہ ڈالے اور پھر جھومتی پھرے مگر اس کو کبھی بال بڑھانے ہی نہیں دیے گئے تھے۔ وہ جب بھی ایسی کوشش کرتی تھی کزنز کے مذاق کا نشانہ بنتی تھی اور اس کی ماما یعنی شہروز کی پھپھو تو ویسے ہی اس کے لمبے بال دیکھ کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتی تھیں۔ انکا خیال تھا کہ میڈیسن کی مشکل پڑھائی کے لئے لمبے بال ناموزوں ہیں۔ وہ زارا کی ضد اور ناپسندیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ہر مہینے دو مہینے بعد پارلر لے جا کر اس کے بال کٹوا دیا کرتی تھیں اور اب کی بار جو اس نے بال بڑھانے کی کوشش کی تھی تو یہ خاص شہروز کی فرمائش پر منگنی کے بعد کی تھی۔ شہروز اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اپنے لئے وہی چیز اپناؤ جو تمہیں پسند ہو۔" یہ شہروز کا کہنا تھا۔ تب ہی گزشتہ ایک سال سے وہ بالوں کی لمبائی بڑھانے میں لگی ہوئی تھی اور جب بھی اس کی شہروز سے ملاقات ہوتی تھی وہ اپنے بالوں کو لہرا کر پوچھنا نہیں بھولتی تھی کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ شہروز اس سوال کا جواب کیا دیتا وہ تو اسے ہر حال میں اچھی لگتی تھی۔ یہ اور بات کہ اسے چڑانے کے لئے اس نے کبھی مکمل کر پسندیدگی کا اظہار کیا ہی نہیں تھا لیکن جب کبھی وہ زیادہ خود ترسی کا شکار ہوتی تھی جس کی اسے عادت تھی تو وہ اس کی دلجوئی کی خاطر تعریف ضرور کیا کرتا تھا۔ اب بھی اس نے یہی کیا۔

زبردست۔۔۔۔ تم اچھی لگ رہی ہو نا۔"

وہ اب اپنی جرابیں اتار رہا تھا۔

اچھی۔۔۔۔ اونہہ۔۔۔۔ میں ایک بار پھر اسٹوپڈ، چائلڈش ہیری پوٹر لگنے لگی ہوں۔"

اسکا لہجہ گلوگیر مگر انداز استہزائیہ تھا۔ شہروز نے خفگی سے اپنے موبائل فون کی جانب دیکھا۔ ناگواری کی ہلکی سی لہر اس کے اندر سر اٹھا رہی تھی۔ زارا کے اسی بچپنے سے اسے چڑ ہوتی تھی۔ اکلوتی ہونے کی بناء پر جہاں اسے بے پناہ پیار ملا تھا وہیں بے پناہ حساسیت بھی اسکی طبیعت میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ بات بعد میں پوری ہوتی تھی آنسو آنکھ میں پہلے آ جاتے تھے۔ والدین اور کزنز وغیرہ کے لاڈ پیار نے اسے مغرور بنانے کی بجائے احساسِ کمتری کا شکار بنا دیا تھا۔

نو پرابلم یار۔۔۔۔ مجھے ہیری پوٹر اچھا لگتا ہے۔" پاؤں کی انگلیوں کو ریلیکس کرنے کی خاطر وہ انھیں ایک ہاتھ سے اوپر نیچے کرنے لگا تھا۔ اسکا لہجہ بے حد نرم تھا وہ اپنی خفگی کو فی الحال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تمہیں اچھا لگتا ہے۔ تو میں کیا کروں۔۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" جواب میں وہ تڑخ کر بولی تھی۔ شہروز بستر پر لیٹنے لگا تھا مگر زارا کی بات سن کر لیٹتا لیٹتا اٹھ بیٹھا۔ وہ جھگڑے کے موڈ میں نہیں تھا اس نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ اسے زارا کا انداز برا لگا۔

نہیں اچھا لگتا تو مت کرنا اس سے شادی۔۔۔۔ مجھ سے جھگڑا کیوں کر رہی ہو یار۔" وہ رسانیت سے بولا تھا۔

میں تم سے جھگڑا نہیں کر رہی۔۔۔۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں اور مجھے تمہارے کسی مشورے یا نصیحت کی ضرورت نہیں۔۔۔۔ مجھے پتا چل چکا ہے کہ تم میرے کتنے ہمدرد ہو۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی۔

واٹ ربش۔۔۔تم بات کس طرح کر رہی ہو۔۔۔میرا خیال ہے مجھے فون بند کر دینا چاہیے۔ابھی تمہارے مزاج شریف کچھ درست نہیں لگ رہے۔۔۔جب طبیعت ٹھیک ہو جائے تب دوبارہ فون کر لینا۔"

اب کی بار وہ بھی اپنا غصہ چھپا نہیں پایا تھا۔زارا نے اس سے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

میں دوبارہ فون نہیں کروں گی۔۔۔میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں نے بال ٹرم کروا لیے ہیں اور میں نے یہ سب تمہاری وجہ سے کیا ہے۔"زارا کا لہجہ بھی پہلے سے زیادہ خفگی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔

میری وجہ سے؟"وہ حیران ہوا۔"میں نے تم سے کب کہا کہ بال کٹوا دو۔۔۔ بلکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ بال مت کٹوانا۔مجھے لڑکیوں کے لمبے بال اچھے لگتے ہیں اور اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے یہ بھی کہا تھا کہ چلو بہت لمبے نہ سہی مگر اتنے لمبے بال تو ہوں کہ کندھوں تک آئیں اور یہ اسٹوپڈ کھمبی کٹ جو تم نے کروایا ہے کتنا زہر لگتا ہے مجھے اور پھر۔۔۔چلو چھوڑو۔۔۔میں نے کچھ کہا تو تمہیں برا لگ جائے گا اس لیے بہتر ہے میں خاموش رہوں۔"

وہ دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہو گیا۔دوسری جانب بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔وہ کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا تھا۔کال ابھی کٹ نہیں ہوئی تھی۔شہروز کو یکدم ہی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

اوئے تم رو رہی ہو؟"وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔وہ واقعی رو رہی تھی شہروز کو شرمندگی سی ہوئی۔وہ بہت بار اس کے سامنے رو چکی تھی لیکن اس کی وجہ سے شاید آج پہلی مرتبہ روئی تھی۔

اوہ یار۔۔۔پلیز۔۔۔ایسے مت کرو۔"وہ اسے چپ کروانے کی کوشش کرنے لگا لیکن زارا اس کی ہمدردی پا کر مزید شیر ہو گئی اور بلی کی طرح رونے لگی۔شہروز اس کے چپ ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن اسے چپ ہوتا نہ دیکھ کر مزید غصے میں آ گیا۔

میں نے کہا رونا بند کرو زارا۔۔۔تم کو کس احمق نے کہا تھا کہ بال ٹرم کروا دو۔۔۔خود ہی تو تم نے کہا تھا کہ اب بال نہیں کٹواؤ گی تو پھر اب کیوں کیوں کٹوا دیے۔۔۔جب اپنی مرضی ہی کرنی ہوتی ہے تو مجھ سے مشورہ کیوں کرتی ہو۔۔۔اوئے اسٹوپڈ رونا تو بند کرو۔۔۔یا خدا! میں اس لڑکی کا کیا کروں؟"

وہ بیچارہ اس کے رونے سے عاجز آ گیا تھا۔وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس کی خاموشی سے جھنجھلا گیا۔

یار۔۔۔میری بات سنو۔۔۔ابھی میں ذرا مصروف ہوں۔۔۔مجھے عامر کی طرف جانا ہے۔وہاں سے فارغ ہو کر میں لگاتا ہوں تمہاری طرف چکر۔۔۔میں تمہیں دیکھ کر بتاؤں گا کہ تمہارے بال اور تم خود کیسی لگ رہی ہو۔۔۔اور اگر تمہارے بال اچھے نہیں لگ رہے۔۔۔میرا مطلب ہے فرض کر لو کہ اگر تمہارے بال اچھے نہیں لگ رہے تو۔۔۔یار بڑھ جائیں گے بال۔۔۔لمبے ہو جائیں گے۔۔۔اب مت کٹوانا۔۔۔او کے۔"

اس کے آنسوؤں سے زچ ہو کر وہ تحمل و نرمی سے بولا تھا۔

شہروز پرابلم یہ نہیں ہے کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔۔۔اگر میں بری لگ رہی ہوں تو بھی تو پرابلم۔۔۔یہ میرا مسئلہ ہے۔۔۔میں اس وجہ

سے ہرٹ نہیں ہوئی۔ میں تمہاری وجہ سے ہرٹ ہوئی ہوں۔۔۔ تم اپنے منہ سے مجھے یہ سب بتا سکتے تھے تمہارا اور میرا ریلیشن شپ اتنا کمزور نہیں ہے کہ تم مجھے میری کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ نہ کر سکو۔ میں جانتی ہوں میں کیسی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سب کزنز مجھے "ڈاکٹر منی" کہہ کر چھیڑتے ہیں لیکن میں کیا کروں اگر میں دبلی پتلی ہوں۔ میں کیا کروں اگر میں اپنی عمر کی لڑکیوں سے چھوٹی لگتی ہوں۔ مجھے اپنی سب خامیوں کا پتا ہے شہروز۔۔۔ لازمی تو نہیں ہے نا کہ تم سب کزنز مجھے ہی ڈسکس کرو اور پھر شہروز میں تمہیں ناپسند تھی تو ماموں کے اصرار پر تمہیں مجھ سے انگیج مینٹ نہیں کرنی چاہیے تھی ہم پہلے فرینڈز اور پھر کزنز ہیں۔

یار۔۔۔ آئی ایم ہرٹ۔۔۔ آئی ایم ریئلی ہرٹ اینڈ۔۔۔"

شٹ اپ" شہروز دھاڑ کر بولا تھا۔ شہروز چپ کی چپ رہ گئی۔

بہت کر لیا تم نے اپنا یہ میلوڈرامہ۔۔۔ تم سے کس نے کہا یہ سب۔۔۔ اسکا نام بتاؤ مجھے" اس کی بات کاٹ کر وہ نہایت سنجیدہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی وہ واقعی شہروز کی باتوں سے ہرٹ ہوئی تھی۔

زارا۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ تم پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔۔۔ اچھا آئی لو یو۔۔۔ یہی سننا چاہتی تھی نا تم۔ میں نے آج تک۔۔۔"

وہ اتنا عاجز ہو چکا تھا کہ وہ بھی کہہ گیا جو کہنا اس خیال میں غیر ضروری سی بات تھی۔ ان دونوں کے درمیان باقاعدہ اظہار محبت والی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔

اوہ ہو شہروز میں یہ کب کہہ رہی ہوں تم سے ۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو شہروز میں چھوٹی بچی نہیں جو لفظوں سے بہل جاؤنگی"

وہ واقعی چھوٹی نہیں تھی۔ وہ بیوقوف تھی۔

زارا یار تم میری انسلٹ کر رہی ہو۔ شہروز کو واقعی برا لگا

میں تمہاری انسلٹ نہیں کر رہی بلکہ عمر کے ساتھ یہ سب باتیں کر کے میری انسلٹ کی ہے۔ تمہیں کسی تیسرے کے ساتھ ہم دونوں کی بات ڈسکس نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

زارا کے لہجے میں مان بھری شکایت تھی۔ شہروز نے گہری سانس بھری تھی ساری بات سمجھانے کو عمر کا نام ہی کافی تھا۔ اس نے یونیورسٹی والی بات کا بدلہ لیا تھا۔

عمر نے کہا تم سے یہ سب" وہ بے وجہ تسلی کے لئے پوچھنے لگا تھا

اور میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے۔۔۔ اب تم اس سے نا جھگڑنا شروع کر دینا اس نے تو سرسری ساذکر کیا تھا وہ تو میں نے ہی۔۔۔"

ہاں ہاں تمہاری ذہانت پر تو مجھے پورا بھروسہ ہے، یہ بتاؤ اس نے اور کیا کہا۔۔۔ اس نے امائمہ کا نام بھی لیا ہوگا؟"

اسکی بات کاٹ کر وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

بات میری ہو رہی ہے وہ بھلا امائمہ کا نام کیوں لے گا" زارا چڑ کر بولی تھی

اس نے ذکر نہیں کیا میری کسی گرل فرینڈ کا؟ شہروز نے کھوجنے والے انداز میں پوچھا تھا۔عمر کی عقل پہ اسے زیادہ بھروسہ نہیں تھا مگر اسکی اس حرکت نے شہروز کو مزید مشکوک کر دیا تھا۔وہ شہروز کے اندازوں سے بڑھ کر تیز رفتاری دکھا گیا تھا۔

گرل فرینڈ۔۔۔؟ کیا مطلب؟؟؟ امائمہ تمہاری گرل فرینڈ۔۔۔وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے؟" زارا کا لہجہ حیرانی و پریشانی سے چور تھا۔یہ تو واقعی افتادہ والی بات تھی۔

اوہ بھائی! کوئی اس حماقتوں کے اٹیچی کیس کا لاک تو لگا دے۔تم بھی جب بھی بولو گی بے تکا ہی بولو گی۔اب رونے مت لگ جانا، خاموش رہ کر بات سنو میری۔۔۔۔بتاتا ہوں تمہیں اس عمر بن احسان کا قصہ"

وہ چڑ کر عمر کا راز اس سے شیئر کرنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

شہروز! تمہیں یقین ہے کہ یہی بات ہے۔" کیبنٹ میں سے گلاس نکال کر میز پر اس کے سامنے رکھتے ہوئے زارا نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔اسے آئے بمشکل پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے اور اس دوران وہ تین مرتبہ یہ سوال پوچھ چکی تھی۔

حیرانی سے فوت ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔میں نے کب کہا کہ مجھے یقین ہے۔۔۔میں نے کہا مجھے شک ہے۔"

کن انکھیوں سے اسکا جائزہ لیتا ہوا شہروز ڈرائنگ روم یا لاؤنج میں بیٹھنے کی بجائے اس کے ساتھ کچن میں ہی چلا آیا تھا اور اب کارنر میں پڑی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھا اسکا جائزہ لے رہا تھا۔میرون ڈریس میں وہ بڑی منفرد سی لگ رہی تھی۔شکل کی بری تو وہ کبھی بھی نہیں تھی دراصل اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ذرا کم تھا پھر میڈیسن کی پڑھائی کو ہمیشہ سر پر سوار رکھ کر ایسی چیزوں میں دلچسپی بھی کم لیتی تھی لیکن جب کبھی دل لگا کر تیار ہوتی تھی تو اچھی لگتی تھی۔

شہروز کے جواب سے چڑ کر وہ فرج کی جانب بڑھ گئی۔یہ بھی شہروز کو اہمیت دینے کا ایک انداز تھا کہ انگیج مینٹ کے بعد جب بھی وہ زارا سے ملنے پھپھو کے گھر آتا تھا زارا اسے چائے، کافی یا جوس خود ہی سرو کرتی تھی اور شہروز کو دل ہی دل میں اس کی یہ ادا اچھی بھی لگتی تھی مگر منہ سے وہ کبھی بھی شکریہ نہیں کہتا تھا اب بھی نظریں تو اس کا تعاقب کر رہی تھیں مگر وہ اس پر ظاہر نہیں کر رہا تھے کہ آج وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ان دونوں کے درمیان کافی دن بعد ملاقات ہو رہی تھی۔شہروز کو یونی ورسٹی اور زارا کو میڈیکل کی پڑھائی نے مصروف کر رکھا تھا۔فون پر تو بات ہو جاتی تھی مگر ملاقات کافی دن بعد ہو رہی تھی۔شہروز کو اتنے دنوں بعد اس سے ملنا اچھا لگ رہا تھا لیکن زارا کو فی الحال عمر کے متعلق ہونے والے انکشاف میں زیادہ دلچسپی تھی۔وہ شہروز کے اندازوں سے زیادہ پر جوش ہو رہی تھی۔

مجھے لگتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" فرج سے پائن ایپل کیک اور جوس نکال کر میز کی جانب آتے ہوئے زارا نے پھر وہی بات دہرائی تھی۔شہروز نے ناک چڑھا کر ناپسندیدگی ظاہر کرنی چاہی تھی مگر اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا۔وہ شہروز کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور جوس

کی بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے بولی۔

کہاں امائمہ کہاں عمر۔۔۔ایک مشرق دوسرا مغرب۔۔۔ مجھے تو سن کر ہی کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔۔۔آئی مین یقین نہیں آ رہا۔"

وہ گلاس میں جوس انڈیلنا ترک کر کے شہروز کی طرف دیکھنے لگی تھی۔شہروز نے آنکھوں کے اشارے سے اسے اس جانب متوجہ کیا تو دوبارہ سے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

شہروز! مجھے یہ سوچ کر اچھا بھی لگ رہا ہے۔امائمہ بہت اچھی ہے۔وہ ہماری فیملی کا حصہ بن جائیگی تو بہت اچھے لگے گا۔" بات مکمل کر کے وہ شہروز کی تائید حاصل کرنا چاہتی تھی۔شہروز کچھ چڑ سا گیا۔

کیا سارا وقت ان دونوں کے متعلق بات کرتی رہو گی؟"کرسی کا رخ اس کی جانب موڑ کر وہ پوچھ رہا تھا۔زارا نے ناسمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا اسے عادت ہی نہیں تھی شہروز کے ایسے لہجے کی۔وہ جب بھی ملتے تھے آدھا وقت زارا اپنے پرابلم شیئر کرنے میں گزارتی تھی باقی کا آدھا وقت شہروز ان پرابلمز کا حل نکالنے میں ضائع کر دیتا تھا اور اگر اس دوران کوئی محبت بھری بات ہونے لگتی تھی تو ان دونوں کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ دونوں روایتی منگیتر بن ہی نہیں پائے تھے۔دراصل ان دونوں کی انگیجمنٹ کسی لمبے چوڑے افیئر کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ بزرگوں کے درمیان یہ بات ان کے بچپن سے ہی چل رہی تھی۔ان کے کانوں میں بھی پڑتی رہتی تھی اس لئے دونوں کی پسندیدگی بھی تھی یہ اور بات ہے کہ شہروز زارا کے سامنے پسندیدگی کا اعتراف کم ہی کرتا تھا اور چونکہ بچپن سے ہی اس قسم کا ریلیشن شپ تھا کہ لڑائی جھگڑے اور نوک جھونک زیادہ ہوتی تھی اس لئے انگیجمنٹ کے بعد بھی اس میں فرق نہیں آیا تھا۔

کیا مطلب۔۔۔باتیں نہ کروں۔۔۔کھانا لگا لوں۔۔۔بھوک لگ رہی ہے۔ممی ڈیڈی کو تو آ لینے دو۔"

شہروز کے ٹوکنے پر زارا یہی سمجھی تھی کہ وہ بھوکا ہے اور اسکی باتوں سے اکتا رہا ہے اسی لئے ایسے کہہ دیا جبکہ شہروز پہلے سے زیادہ جھنجھلایا۔

اوئے ہوئے۔۔۔قسمت خراب۔"اس نے عورتوں کی طرح ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

کیسی لڑکی ہو تم۔۔۔عمر ٹھیک کہتا ہے تمہیں سامنے پیک۔۔۔جتنا چھوٹا قد اتنا ہی چھوٹا دماغ۔"

وہ منہ کا زاویہ بگاڑ کر بولا پھر اس کے چہرے پر پھیلی خفت کو دیکھ کر ذرا توقف کیا اور بدقت مسکرایا۔وہ اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔زارا کے چہرے پر اتنے بیچارے سے تاثرات تھے کہ شہروز کو ہنسی آ گئی۔آنکھوں کا تاثر بھی بدل گیا تھا۔

اچھی لگ رہی ہو اس کلر میں بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔

شہروز نے یکدم زور دے کر کہا تھا۔وہ کبھی برملا اس کی تعریف نہیں کرتا تھا۔اسی لئے زارا پہلے چونکی پھر کھل اٹھی۔

سچ؟"اس نے اپنی کرسی پوری کی پوری اس کی جانب گھما ڈالی۔تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو نا؟"وہ مشکوک تھی۔شہروز کا گزشتہ ریکارڈ ایسا ہی تھا۔شہروز نے دلچسپی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا تھا۔زارا کی خوشی دیدنی تھی۔

مجھے لگا تھا تم کہو گے کہ میں بہت بری لگ رہی ہوں۔تمہیں یہ ہیئر کٹ پسند نہیں ہے نا؟"

وہ پرانی بات تھی اب بھی ہیئر کٹ میرا فیورٹ ہے۔" وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ زارا کے چہرے پر پھیلی خوشی اسے بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے رویے نے زارا کو ہی نہیں اسے بھی حیران کر دیا تھا مگر وہ اسے اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ خود کو یہ سب کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی اتنی ملائمت اتنی نرمی چھلک رہی تھی کہ زارا کنفیوز سی ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا زارا نے اسے ٹوکا تھا۔

زیادہ رومینٹک مت بنو شہروز! تمہیں پتا ہے نا مجھے جلدی نظر لگ جاتی ہے۔" وہ زیادہ ہی کنفیوز ہو گئی تھی۔

تم نظر کو لگ جایا کرو۔" شہروز اب بھی اسے سابقہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

میں چھوت کی بیماری نہیں ہوں۔" وہ اب اپنے ناخنوں کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی تھی۔ شہروز کو ہنسی آ گئی۔

دھت تیرے کی۔۔۔ کر دیا نا بیڑا غرق میرے رومینٹک موڈ کا۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا پھر سامنے رکھے جوس کا گلاس ہاتھ میں پکڑ لیا۔

کیا یار۔۔۔ کتنی بورنگ ہو تم۔۔۔ ایک اچھا بھلا ہینڈسم۔۔۔ سمارٹ لڑکا تم سے رومانس جھاڑ رہا ہے اور تم اتنی بری بری شکلیں بنا کر دیکھ رہی ہو۔" اس نے جوس کے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے تھے۔

اس کے بعد شکایتیں بھی کرو گی۔ عمر نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ تم نے ماموں کے اصرار کی وجہ سے مجھ سے انگیجمنٹ کی ہے نا۔ تم مجھے پسند نہیں کرتے مجھے سب پتا چل گیا ہے۔"

وہ اس کی نقل کر رہا تھا۔ زارا خجل سی ہو کر مسکراتی رہی۔

میں کیا کرتی اس نے اتنے پر یقین لہجے میں کہا تھا کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔۔۔ تمہیں پتا ہے نا میرا۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

اسی لیے تو کہتا ہوں کہ آنکھیں کھلی رکھا کرو ورنہ عمر کی طرح سب لوگ تمہیں "ڈاکٹر بونگی" کہنا شروع کر دیں گے۔"

شہروز نے اپنا جوس ختم کیا تھا۔ زارا نے ہمیشہ کی طرح اس کی نصیحت کو بڑے دھیان سے سنا اور اس سے بھی زیادہ دلجمعی سے بھلا دیا تھا۔ گھر میں اس وقت ملازم ہی تھے۔ پھپھو اور پھپھا جی طب کے شعبے سے منسلک تھے اور ان کے گھر میں ٹھہرنے کے اوقات بڑے تنگ سے تھے۔ ان دونوں کے آنے پر ہی کھانا لگتا تھا اور شہروز کھانے کے ارادے سے ہی آیا تھا۔ انکا انتظار کرتے اور عمر کے متعلق باتیں کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ڈنر کے بعد جب شہروز اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا تو عمر کا فون آ گیا۔ اس نے آج کا سارا دن اپنی امی کے حکم دینے پر اپنی خالہ کے گھر گزارا تھا اور اب وہ شہروز کو پک کرنے پھپھو کے گھر آ رہا تھا۔ وہ جب پہنچا تو زارا اور شہروز گھر کے باہر مین سڑک پر واک کر رہے تھے۔ ساڑھے دس بج رہے تھے مگر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ عمر بھی سائیڈ میں گاڑی پارک کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

اوئے ساشے پیک! تم تو بڑی اچھی لگنے لگی ہو۔"

اسکا اشارہ زارا کے بالوں کی طرف تھا کیونکہ اس کے بالوں پر قینچی پھروانا اسی کی کارستانی تھی۔

ھذا من فضل ربی۔۔۔ کبھی غرور نہیں کیا۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ عمر پھڑک اٹھا۔

اوہ بھائی کوئی مجھے پکڑے۔۔۔ یہ لفظ اس ساشے پیک کے منہ سے ہی نکلے ہیں نا۔" وہ بیہوش ہونے کی ایکٹنگ کرنا چاہ رہا تھا مگر

سڑک پر ہونے کی وجہ سے کر نہیں پایا۔

میں نہیں مانتا یہ تم کہہ سکتی ہو زارا۔۔۔میرا خیال ہے تم صرف منہ ہلا رہی ہو ڈبنگ شہروز کروا رہا ہے۔"

وہ زارا کو کندھا مار کر بولا تھا۔ وہ دونوں کچھ نہیں بولے بلکہ خاموشی سے مسکراتے رہے۔

یار! تم لوگ خاموش کیوں ہو۔۔۔دیکھو خوامخواہ مجھے کباب کی ہڈی مت سمجھو کیونکہ میں خود بھی ایسا کچھ نہیں سمجھتا۔"

وہ اب شہروز کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ موسم بڑا اچھا سا ہو رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں سڑک پر چلنا ان تینوں کو ہی اچھا لگ رہا تھا۔

عمر! اتنی بک بک کر کے تو تھکتا نہیں ہے؟" شہروز نے خفگی سے پوچھا تھا۔

نہیں۔۔۔میں سگریٹ نہیں پیتا۔" اس نے وسیم اکرم کے مشہور کمرشل کا مشہور زمانہ فقرہ دہرایا۔ وہ تینوں ہی ہنس پڑے تھے۔ اسی دوران ایک آئسکریم والا سائیکل پاس سے گزر رہا تھا۔ زارا کی فرمائش پر عمر نے تینوں کے لئے آئسکریم لے لی۔

اس کی بک بک کی وجہ سے تو میں نے بال کٹوائے ورنہ میں نے پکا عہد کر لیا تھا کہ اب کی بار بال لمبے کر کے ہی چھوڑنے ہیں۔ امائمہ سے شرط لگائی تھی میں نے کہ اس سے زیادہ لمبے بال بڑھاؤں گی۔

آئسکریم کا ریپر کھولتے ہوئے زارا نے بے ساختہ کہا تھا۔ شہروز نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔ اس نے بروقت امائمہ کا نام لیا تھا۔

اس کے بال لمبے ہیں؟" عمر کے لہجے میں دلچسپی اور تجسس تھا۔ شہروز نے اس کی آنکھوں سے جھلکتے ان جذبوں کو بغور خاص نوٹس کیا۔ وہ امائمہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ امائمہ چونکہ ڈوپٹے سے سر ڈھانپ کر رکھتی تھی اس لئے عمر بے خبر تھا کہ اس کے بالوں کی لمبائی کتنی ہے۔

تم جانتے ہو امائمہ کو؟" زارا نے حیران ہونے کی بھرپور اداکاری کی تھی جبکہ عمر اس سوال پر محتاط سا ہو گیا۔

ہاں۔۔۔نہیں میرا مطلب ہے وہ شہراز کی کلاس فیلو ہے نا۔۔۔اسی کی بات کر رہی ہو نا تم۔۔۔اسے تو میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ یہ شہروز ہر وقت اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے اور جب کبھی بھی میں اس سے ملنے یونیورسٹی گیا یہ اس سڑیل لڑکی کے ساتھ بیٹھا نظر آتا ہے۔"

وہ شہروز کی سائیڈ پر چل رہا تھا بات کرتے کرتے زارا کی سائیڈ پر آ گیا۔

تمہیں تو کوئی فکر ہی نہیں ہے اب تمہاری فکر بھی مجھ غریب کو کرنی پڑے گی۔ پہلے ہی تایا ابو نے اتنی مشکل سے شہروز کو تم سے شادی کرنے کیلئے رضامند کیا ہے اب اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے پتا ہے میرے ابو نے مجھے تم پر قربان کر دینا ہے۔ انہیں ویسے بھی میرے لئے ہمیشہ وہ چیز پسند آتی ہے جو سائز میں چھوٹی ہو اور بیکار ترین ہو۔۔۔سمجھیں مس ساشے پیک؟" کوئی اور موقع ہوتا تو زارا نے فٹ سے اس کی آخری بات پر منہ لٹکا لینا تھا لیکن شہروز کے محبت بھرے انداز نے جو حوصلہ دیا تھا اس نے فی الحال اسے ایکٹیو کر دیا تھا۔" مجھے شکر قندی کی قربانی چاہیے بھی نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی تھی۔ شہروز کا قہقہہ چھوٹ گیا اسے عمر کے لئے یہ نام "شکر قندی" بڑا مناسب لگا تھا۔

شکر قندی کی قربانی جائز ہوتی ہے شہروز؟" عمر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ سب کزنز میں اپنی انہیں خوبیوں کی بنا پر ڈھیٹ ابن ڈھیٹ مشہور تھا۔

میں جا رہا ہوں یہاں سے۔ تم دونوں بیچ سڑک میں بیٹھ کر لڑتے مرتے رہو۔" شہروز واقعی واپسی کی لئے مڑا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کے

پیچھے چلے آئے تھے۔

میری بات یاد رکھنا لڑکی ورنہ نقصان میں رہو گی۔۔۔ حفاظت کرواپنے منگیتر کی۔" ایسا لگ رہا تھا کہ عمر جان بوجھ کر بات کا رخ اس طرف موڑ رہا ہے۔اب تو زارا بھی مشکوک سی ہو رہی تھی کہ عمر کا امائمہ کی طرف جھکاؤ ہے۔

میرا دماغ مت کھاؤ عمر۔۔۔ میں امائمہ کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور وہ جانتی ہے کہ شہروز میرا منگیتر ہے۔"

زارا کا انداز ناک سے مکھی اڑانے والا تھا۔شہروز اب عمر کو ہی دیکھ رہا تھا۔

تم جانتی ہو اسے۔۔۔ کیسے؟" عمر نے بے حد سرسری لہجے میں پوچھا تھا جو واضح طور پر مصنوعی محسوس ہوا۔شہروز نے زارا کو جتانے والے انداز میں دیکھا اور پھر بلاوجہ مسکرا دیا۔وہ دونوں جانتے تھے کہ عمر بلاوجہ کسی کے متعلق انکوائری نہیں کرتا۔

فرینڈ ہے میری۔۔۔ بہت اچھی۔" زارا نے آنکھیں مٹکائیں اور دوسرے راؤنڈ کے لئے پھر مڑ گئی۔شہروز نے اسکا ساتھ دیا۔ان کے ہاتھ میں موجود آئسکریم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔عمران سے ذرا پیچھے ہو کر چل رہا تھا۔اس نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔وہ بہت رغبت سے آئسکریم کھا رہا تھا۔زارا نے شہروز کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔شہروز نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔وہ جان بوجھ کر موضوع سے ہٹ گئے تھے۔

شہروز کے کسی دوست کی بھانجی کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا تھی جسکا علاج کافی مہنگا تھا سو وہ زارا سے اس متعلق پوچھنے لگا۔وہ آج کل اسی سلسلے میں اپنی فیملی اور دوست احباب سے مدد اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔بات کرتے کرتے وہ دونوں کن اکھیوں سے عمر کی جانب بھی دیکھ لیتے تھے جو آئسکریم ختم کر چکا تھا اور اب راہ میں آنے والے پتھروں کو ٹھوکر مار کر نجانے کیا سوچتا ان کے پیچھے چلا آرہا تھا۔

زارا۔۔۔ یار بات سنو۔۔۔ وہ واقعی تمہاری دوست ہے؟" عمر نے عقب سے اسے پکارا۔گھر کا گیٹ قریب آچکا تھا۔عمر نے گاڑی گیٹ سے ذرا ہٹ کر پارک کی ہوئی تھی۔وہ گیٹ کی طرف جانے کی بجائے گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔زارا نے شہروز کی جانب دیکھا پھر وہ بلاوجہ مسکرائے تھے۔عمر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔انہیں مسکراتا دیکھ کر اس نے ٹھاہ کر کے دروازہ بند کر دیا تھا۔پھر بڑے بڑے قدم بھرتا ان کے قریب آگیا۔

تو امائمہ کے متعلق پوچھ رہا ہے؟" آنکھوں میں ذومعنی مسکراہٹ لیے شہروز زچ کرنے والے انداز میں سوال کر رہا تھا۔

زیادہ خباثت دکھانے کی ضرورت نہیں۔" عمر نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

زیادہ اوور ایکٹنگ مت کرو۔تم دونوں جو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہے ہو نا میں کب سے نوٹس کر رہا ہوں۔" اس کے چہرے پر خفیف سے تاثرات یکدم بدلے تھے۔وہ مسکرایا تھا پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنا دایاں کان کھجایا۔

کیا یاد کرو گے تم لوگ بھی۔۔۔ چلو مان لیا۔" مسکراہٹ دھیرے سے چمکی اور صبح کی روشنی کی طرح دور تک پھیل گئی۔اس نے شہروز کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اچھی لگتی ہے وہ مجھے ۔۔۔ پتا نہیں کیوں؟"

اس نے اعتراف کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

افغانستان بے شک ایک اسلامی ملک ہے لیکن اس نے کبھی ہمسائے ہونے کا حق ادا ہی نہیں کیا۔"

اسفند خان اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔ شہروز نے خاموشی سے ان کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ چند لمحے قبل عمر کے ہمراہ سر آفاق کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تھا اس لئے اسے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ گفتگو کا موضوع کیا ہے مگر وہ پروفیسر اسفند خان کو اچھی طرح جانتا تھا جو سیاسیات کے پروفیسر تھے اور سر آفاق کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔

ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان ملک کی جس طرح مدد کر سکتا ہے، افغانستان نے کبھی پاکستان کی اس طرح مدد نہیں کی۔ افغانستان نے کبھی پاکستان کو کوئی ایسا حق نہیں دیا جس کی بناء پر دونوں ممالک کے درمیان برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار ہو سکیں۔"

انکا بات کرنے کا ایک بڑا مخصوص سا انداز تھا۔ وہ بحث بھی ایسے کرتے تھے جیسے کلاس روم میں لیکچر دے رہے ہوں۔ ہر نکتے کو بیان کر دینے کے بعد وہ مقابل کا چہرہ تکنے لگتے تھے اسی لئے شہروز بے حد چوکنا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہی اس کے بے حد قابل عزت اساتذہ تھے۔

یہ وہ ہمسایہ ملک ہے جس کے لئے پاکستان کو ہمیشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر کڑی آزمائش میں اس ہمسائے کا ساتھ دینے کے باوجود ہمیں کیا ملا۔۔۔ اقتصادی پابندیاں، دنیا میں ایک نیگیٹو امیج۔ اسلحہ اور ہیروئن کلچر کا فروغ جو ناسور کی طرح ہماری رگوں میں بس چکا ہے اور معاشی بوجھ ان سب کے علاوہ ایک علیحدہ بڑا مسئلہ ہے۔"

ان کی بات کو توجہ سے سنتے ہوئے شہروز نے عمر کو کندھے سے ٹہوکا دیا۔ وہ لاتعلق سا بیٹھا منہ کھولے سامنے والی دیوار پر لگی تصویر کو گھور رہا تھا۔ پروفیسر اسفند کی پاکستانی خارجہ پالیسی پر بڑی گہری نظر تھی اور وہ اسے ناکام قرار دیتے ہوئے اکثر جذباتی ہو جایا کرتے تھے۔ سر آفاق ان کی سب باتوں سے اتفاق کرنے کے باوجود انکی جذباتیت سے خائف رہتے تھے۔ اب بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔

خان صاحب! میں آپکی بات سے انکار نہیں کر رہا" انہوں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ خان صاحب نے انکی بات کاٹ دی۔

آپ ہمیشہ میری بات سے انکار نہیں کرتے مگر کبھی اتفاق بھی تو نہیں کرتے جناب۔" یہ انکا پرانا شکوہ تھا۔

یہ وہ واحد ملک ہے جس نے "یو۔این او" میں پاکستان کی ممبر شپ کی مخالفت کی، پاکستانی علاقوں پر اپنا حصہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ پاکستان کے مقابلے میں ہمیشہ ہندوستان کا ساتھ دیا۔ کیا افغانستان اسلامی ملک نہیں ہے؟ کیا یہ پاکستان کا حق نہیں تھا کہ افغانستان اسلامی ملک ہونے کے ناطے ہر معاملے میں ڈنکے کی چوٹ پر پاکستان کا ساتھ دیتا جبکہ پاکستان تو ہر معاملے میں اسکا ساتھ دے رہا ہے۔ کیا پاکستان کے اپنے مسائل کم ہیں یا وسائل بہت زیادہ ہیں جو ہم کبھی مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی نظر انداز نہیں کرتے۔ ضرورت کے وقت خوراک کی امداد دے کر امداد دیتے ہیں چاہے ہمارے بچے خوراک کی کمی کا شکار ہو کر بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہوں اور حال ہی میں جو گرم پانیوں تک تجارت کی غرض سے رسائی دی گئی کیا اس سے ہماری معیشت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ کو پتا ہے افغانی تاجر انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیے گئے ہیں۔ وہ انکم ٹیکس سے بھی بچ رہے ہیں اور اپنا مال ہماری سرحدوں پر بیچ کر ڈبل منافع کما رہے ہیں۔

شہروز کو ان کی گفتگو میں بے حد دلچسپی محسوس ہوئی۔ ماس کمیونیکیشن میں اس کی فیلڈ پرنٹ میڈیا تھی۔ وہ اخبارات اور سیاسی پروگرام

وغیرہ دیکھتا تھا مگر خان صاحب جو باتیں بتا رہے تھے وہ اس کے لئے ایک ایسا کالم یا ٹی وی پروگرام کی طرح تھیں جو ابھی ٹیلی شائع یا ٹیلی کاسٹ نہ ہوا ہو۔ اس کیلئے یہ سب فرسٹ ہینڈ نالج تھی۔ وہ بھول ہی گیا کہ عمر بھی اس کے ہمراہ ہے اور اب مصنوعی جمائیاں لے کر اور منہ کے زاویے بگاڑ بگاڑ کر اسے اپنی بوریت کا احساس دلانا چاہ رہا تھا۔

ہم نے تیس لاکھ افغانی مہاجرین کو پناہ دے رکھی تھی۔ کیا یہ ہماری نازک ناتواں معیشت کے لئے بوجھ نہیں ہے۔ وہاں بنگلہ دیش میں بیٹھے بہاری کب سے واویلا مچا رہے ہیں کہ ہمیں بلاؤ اور ہم اپنی معیشت بچانے کے لئے اس مسئلے پر آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ افغانی ہمیں بنگالیوں سے زیادہ عزیز کیوں ہیں۔" پروفیسر اسفند توقف کر کے پانی پینے لگے تھے۔ عمر نے ایک اطمینان بھری مصنوعی ٹھنڈی سانس بھری۔ شہروز نے ٹپٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، بازو صوفے کی پشت پر پھیلائے ایسے بیٹھا تھا جیسے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہو۔ شہروز نے آنکھوں کے اشارے سے پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر اسے گھرکنے کی کوشش کی جبکہ وہ اسے یہاں سے اٹھنے کے اشارے کرنے لگا تب ہی سر آفاق نے ان کی جانب دیکھا تھا۔

خان صاحب! یہ بچے یہاں بیٹھے ہیں۔۔۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کی اس مسئلے پر کیا رائے ہے؟" انہوں نے ایکدم ہی انہیں بھی گفتگو میں گھسیٹ لیا۔ شہروز کو پتا تھا عمر کچھ نہیں بولے گا اس لئے اس نے خود ہی اپنی رائے دینی شروع کر دی۔

میں خان صاحب سے متفق ہوں۔" وہ بولا تھا حالانکہ اس نے اس موضوع پر جو سنا تھا ابھی سنا تھا لیکن حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھنے کی وجہ سے وہ کچھ نہ کچھ تو بہرحال جانتا تھا۔

سر! دراصل ہماری جنریشن کا سب سے بڑا مسئلہ بیروزگاری اور روزگار میں ایک جیسے مواقع کی عدم دستیابی ہے۔"

عمر نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے جو بھی کہا تھا عمر کو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا جبکہ شہروز مودب و مگن کہہ رہا تھا۔

ہر گزرتا دن بیروزگاری کی شرح میں اضافہ کر رہا ہے۔ کتنے پڑھے لکھے نوجوان مناسب نوکری نہ ملنے کے باعث ایسے کام کرنے پر مجبور ہیں جس سے انکا وہ ہنر ضائع ہو رہا ہے جس کی انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اچھی نوکری یا نوکری سرے سے نہ ہونے کے باعث۔ والدین جوان اولاد سے شکوہ کناں نظر آتے ہیں۔ والدین کی امیدیں پوری نہ کرنے کے باعث کا احساسِ گناہ ہماری نسل کو جرائم کی طرف لے جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں روزگار نہ ملنے کے باعث کی جانے والی خودکشی کا ریٹ بڑھ گیا ہے۔ سر! ایسی صورتحال میں واقعی تیس لاکھ مہاجرین کی آبادکاری معیشت کے لئے بوجھ اور یوتھ کے لئے ڈپریشن کا باعث بن رہا ہے۔ کل ہی ایک دوست بتا رہا تھا کہ اس نے جرمنی کے لئے ویزہ اپلائی کیا ہے اور پیپرز میں اس نے خود کو بحالتِ مجبوری قادیانی ظاہر کیا ہے کیونکہ ایسے ویزہ جلدی مل جاتا ہے۔ میں اسے گناہ کہتا ہو مگر میرا دوست بھوک کے پیٹ کو بھرنے کیلئے اس گناہ کو مجبوری کہتا ہے۔ میرے کئی دوست اس طرح فرانس، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ جا رہے ہیں۔"

اس نے لمحہ بھر کا توقف کر کے دونوں قابلِ احترام اساتذہ کی جانب دیکھا۔

میں موضوع سے ہٹ نہیں رہا۔۔۔ دراصل میں یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جب ہم بحیثیت قوم اتنے مسائل کا شکار ہیں تو پہلے

ہمیں ان مسائل کو حل کرنا چاہیئے پھر کسی اور کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔"

اس نے بات مکمل کرلی تھی پروفیسر صاحب سر آفاق کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو شہروز بیٹا! مگر جغرافیائی حدود کو نظر انداز کر کے کوئی ملک کیسے ترقی کرسکتا ہے۔ اگر ہم مسائل کو حل کرنے میں ان کی مدد نہ کرتے تو کون کرتا بہر حال وہ ایک اسلامی ملک ہے۔ ہمارا دین ہمیں ان کی مدد کرنے کا درس دیتا ہے۔ مجھے حیرانی ہے کہ خان صاحب پٹھان ہو کر پٹھان کا ساتھ دینے پر اعتراض کر رہے ہیں۔" سر آفاق نے چند لفظوں میں اپنا موقف بیان کر دیا تھا۔

بات ساتھ دینے نہ دینے کی نہیں ہے آفاق صاحب! بات یہ ہے کہ کیا آپ ساتھ دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ افغانستان سے طالبان کو نکال دیا گیا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ ہمارے یہاں ہیں۔ جب امریکہ سرکار افغانستان سے طالبان کو نکالنے کے لئے بمباری کرسکتی ہے تو پاکستانی سرحدیں اس کی پہنچ سے دور نہیں ہیں۔ وانا اور وزیرستان کی صورتحال دیکھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہو رہا کہ اصل میں کیا ہو رہا ہے۔ کس چیز کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ سارے حقائق ثابت کرتے ہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے مسائل و مصائب کا انبار لائے گا۔ اللہ کرے کہ میں غلط ثابت ہو جاؤں تو یقین کریں مجھے اس کی خوشی ہوگی۔ میں کسی قوم کسی ذات کسی صوبے یا قبیلے کے خلاف نہیں ہوں آفاق صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں محب وطن پاکستانی ہوں۔ مجھے اس سرزمین سے عشق ہے۔ یہ سوچ کر میری جان نکل جاتی ہے کہ میرے ملک کی سالمیت سے کسی کو خطرہ ہے اور جس جس چیز سے جس جس شخص سے میرے ملک کی سالمیت کو خطرہ ہو میں اس کی حمایت کیسے کرسکتا ہوں۔"

پروفیسر صاحب کا انداز جذباتی مگر دوٹوک تھا۔ سر نے تحمل سے اس کی بات کو سنا۔

خان صاحب! یہ بہت حساس موضوع ہے۔ ہم کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ بہت سے محب وطن اہل دل پاکستانی اس کی حمایت نہیں کریں گے۔

آفاق صاحب! بڑی دل دکھانے والی بات کر دی آپ نے۔۔۔ کیا میں اہل دل پاکستانی نہیں ہوں؟" خان صاحب تڑپ کر بولے تھے۔ سر آفاق مسکرائے۔

آپ میری بات نہیں سمجھے۔۔۔ میرا مطلب تھا اس موضوع پر اتفاق رائے نہیں ہے۔ اس لئے۔۔۔ ارے بھئی آپ خفا مت ہوں۔۔۔ میں معذرت خواہ ہوں اگر میری بات سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو۔"

انہوں نے پروفیسر اسفند کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔ پروفیسر صاحب نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "شرمندہ مت کرو یار۔" وہ ہنسنے لگے تھے۔

خان صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک بات کہوں؟" شہروز نے اجازت طلب کی تھی۔ وہ عمر کو اور اس کے اشاروں کو اگنور کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ سر آفاق کئی مرتبہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ اشارہ بازی محسوس کر چکے ہیں۔

بیٹا! میں ابھی تم سے اتنا بڑا نہیں ہوں کہ تم مجھ سے اجازت طلب کرو۔ تم کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شہروز بھی مسکرا دیا اور عمر کی جانب دیکھا۔ وہ بہت اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات قدرے سپاٹ ہو چکے تھے اور انداز نشست بھی مزید ڈھیلا ہو گیا تھا۔

آپ کی بات ٹھیک ہے ہمیں افغانی مہاجرین کو پناہ نہیں دینی چاہئے تھی لیکن ہمیں امریکہ کو بھی اپنی زمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے تھی۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا جو کاز یتک اسمبلیاں کہتی ہیں کہ یہ سب آخری آپشن کے طور پر کیا گیا۔ ہم امریکہ کو "نو" کیوں نہیں کہہ سکتے۔ بہت سے ممالک اپنی سیاسی و معاشی کمزوریوں کے باوجود ایسا کر رہے ہیں۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے جو اپنا اصولی موقف منوانے کے لئے امریکہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا ہے۔ اسی بناء پر مغرب کی مخالفت کے باوجود دنیا بھر میں ایران کا امیج بلند ہوا ہے۔ لبنان نے اسرائیل کو شکست دے کر امتِ مسلمہ کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے اور ہم پہلی اسلامی ایٹمی قوت ہو کر بھی گیدڑ کی سو سالہ زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ دراصل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ایمان خود پر سے اٹھ گیا ہے۔ ہمیں خود پر بھروسہ نہیں رہا اور جنہیں اللہ کی طاقت پر بھروسہ نہ ہو ان کے لئے ایٹمی قوت بھی کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ کمرے میں چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی جسے پروفیسر اسفند خان صاحب کی خاموشی نے توڑا۔

بچے! بات تو تم نے بالکل ٹھیک کی ہے، واقعی ہمیں اللہ کی قوت پر بھروسہ نہیں رہا۔"

یہ اب اس ٹاپک پر بولنا شروع ہو جائیں گے۔۔۔ خدا کے لئے شہروز یہاں سے چلو۔۔۔ میں بور ہو کر بھی تھک چکا۔"

اپنے حساب سے عمر نے بہت دھیمی آواز میں شہروز سے کہا تھا مگر اس کی آواز اتنی ضرور تھی کہ سر آفاق ان کی جانب دیکھنے لگے۔ شہروز ان کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

یہ بچہ کون ہے؟" سر آفاق نے ایک دم شہروز سے پوچھ ڈالا۔

یہ عمر ہے سر! احسان چاچو کا بیٹا۔" اس نے مختصر سا تعارف کروایا۔ عمر ابھی بھی سابقہ لاتعلق سے انداز میں بیٹھا تھا۔ سر آفاق کے احسان چاچو سے بھی مراسم تھے اس لئے شہروز نے بھی حوالہ دیا۔ سر آفاق نے بھی عمر کا انداز اور تاثرات دیکھ کر اسے زیادہ مخاطب نہیں کیا بلکہ وہ شہروز سے اس کے ڈیڈی اور بھائیوں کے حال احوال پوچھنے لگے تھے۔ انہوں نے جس طرح عمر کو اگنور کیا تھا اس سے شہروز کے دل میں یہ مستحکم ہو گیا تھا کہ وہ اس کی بات سن چکے ہیں۔ اس لئے اس نے چند منٹوں بعد ہی ان سے اجازت چاہی تھی۔ اسے عمر پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا تب ہی گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ عمر پر برس پڑا تھا۔

انتہائی فضول انسان ہو تم۔۔۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی بڑے سے کیسے بات کرتے ہیں۔"

میں جیسا ہوں مجھے ویسا ہی رہنے دو۔۔۔ مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔" عمر بھی غصے میں آ گیا تھا۔ اسے اکتاہٹ پہلے ہی ہو رہی تھی۔ شہروز کی خفگی نے مزید غصہ دلا دیا۔

او کے۔۔۔ ایز یو وش۔" شہروز چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا تھا۔ کافی دیر تک انکے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہروز اسے

اگنور کرتے ہوئے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ رہا جبکہ عمر اسٹریٹ لائٹس کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ شہروز کے چہرے پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔

مجھے یہ اچھے نہیں لگے۔"

گاڑی میں پھیلی خاموشی کو عمر نے ہی توڑا۔ اسکا اشارہ مسز آفاق کی جانب تھا۔ شہروز کو اس کے اعتراض پر حیرانی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

نو وریز۔۔۔ تم بھی انہیں اچھے نہیں لگے ہوں گے۔" اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

مجھے پرواہ نہیں ہے۔ عمر نے پاکٹ سے ببل گم نکالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

ہونی چاہیے احمق آدمی۔۔۔ تم ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" شہروز کا انداز پہلے جیسا تھا۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر ایسے جمے تھے جیسے عمر کی گردن پر رکھے ہوں۔

اسی لئے نہیں ہے کہ ان کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ ان سے نہیں۔"

شہروز نے اس کے لاپرواہ انداز کو مزید ناپسندیدگی سے دیکھا۔

میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔۔۔ میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔۔۔ میرے مطلب کی وہاں کوئی بات نہیں تھی۔ تم تینوں مل کر مجھے بور کر رہے تھے اور پھر اپنے سر کا انداز دیکھا تھا تم نے۔۔۔ میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے وہ جیسے میں چوہا ہوں۔۔۔ مجھ سے کتنا روڈلی بی ہیو کیا انہوں نے۔"

وہ ناک چڑھا کر بول رہا تھا۔ وہ جیسے جیسے بول رہا تھا شہروز کو غصہ ویسے ویسے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ببل گم چباتے ہونٹ پر ایک مکا رسید کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔

میں نے ایسا کیا کیا تھا کہ میں شرمندہ ہوتا پھروں اور پلیز تم بھی بلاوجہ غصہ مت کرو۔۔۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔۔۔ میرا پرپوزل ریجیکٹ کر دیں گے وہ۔۔۔ اچھی بات ہے۔۔۔ کر دیں۔۔۔ انکا نقصان زیادہ ہوگا۔ ان کی سڑیل بیٹی کو مجھ سے زیادہ اچھا لڑکا نہیں ملے گا۔"

وہ قطعیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ عمر کا یہی مسئلہ تھا وہ بولتا پہلے تھا سوچتا بعد میں تھا۔ شہروز کچھ کہنے کی بجائے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسے فی الوقت عمر کی آواز سے بھی نفرت محسوس ہو رہی تھی جبکہ وہ ببل گم چبانے میں مگن تھا۔

☆ ☆ ☆

عمر بہت بدتمیز ہے۔"

شہروز نے ناک چڑھا کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ زارا نے بیزاری سے اس کی بات کو سنا تھا۔ وہ کچھ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے کہ کسی بڑے سے کیسے بات کرتے ہیں اور کسی سے ملنے کے کیا مینرز ہوتے ہیں۔"

پارکنگ تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ ایک بار پھر کہہ رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں گاڑیوں کی لمبی قطار تھی اور جس انداز میں شہروز پارکنگ کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا اگر اس انداز میں مزید ایک گھنٹہ بھی کوشش کرتا تو اسے جگہ نہیں ملنی تھی۔ اسی لئے زارا بیزاری کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

ہاسپٹل سے اسے پک کرنے کے بعد اب تک وہ بات بھی عمر کے متعلق کئے جا رہا تھا جبکہ ہاسپٹل میں ایک بے پناہ مصروف دن گزارنے کے بعد زارا نہ صرف تھکی ہوئی تھی بلکہ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس لئے وہ شہروز کی باتوں پر کوئی رسپانس ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ وہ صرف یہ چاہ رہی تھی کہ شہروز پہلے اسے ڈنر کروا دے یا پھر اسے گھر ڈراپ کر دے۔ شہروز نے جب اسے فون کر کے ڈنر کی آفر کی تب بھی وہ اسے انکار کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ بہت تھکی ہوئی تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اسے کہہ نہیں پائی۔ اسے خدشہ تھا کہ شہروز اس کے انکار کا برا منائے گا مگر اب اس کی منہ سے مسلسل اس کے اور عمر کے درمیان اختلافات کا ذکر سن کر وہ نہایت بور ہو چکی تھی اور پھر جس طرح شہروز پارکنگ نہ ملنے کا بہانہ کر کے ایک ریسٹورنٹ سے دوسرے ریسٹورنٹ تک چکر لگا رہا تھا اس نے بھی زارا کو اکتاہٹ کا شکار کر دیا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا ہے زارا میں اب اس کے کسی معاملے میں نہیں بولوں گا۔۔۔ ان فیکٹ میں اب اس سے بات ہی نہیں کرنے والا۔۔۔ وہ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ ہاں وہ ہینڈسم ہے، اس کے پاس پاؤنڈز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پیرنٹس کا بہت لاڈلا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جس کی چاہے جب چاہے انسلٹ کر دے۔ ہم بھی کسی سے گئے گزرے نہیں۔ لاکھوں سے بہتر ہیں مگر ہم تو اس کی طرح نخرے نہیں کرتے تو پھر وہ ہمیں کس خوشی میں اکڑ اکڑ کر دکھاتا ہے۔ ارے بابا نواب ہو گا اپنے لندن کا، چاچو، چاچی کے ساتھ کیا کرے اس طرح کی بدتمیزیاں، ان کو دکھائے یہ نخرے۔۔۔ ہم پر اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔۔۔ تم مجھ سے لکھوا لو یار یہ ڈبوئے گا چاچو کا نام۔۔۔ کہاں وہ اتنے خوش اخلاق اور ویل مینرڈ اور کہاں یہ ڈفر۔۔۔

میں تو اس سے بات نہیں کروں گا اب، بے شک تم آج کی تاریخ میں یہ بات نوٹ کر لو۔"

شہروز اس سے کافی ناراض لگ رہا تھا، زارا نے اس کے بیان کو عدم توجہی سے سنا۔ اسے فی الحال وہ بورڈز اور ہورڈنگز زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ لگ رہے تھے جن پر کھانے سے متعلق کچھ نہ کچھ نمایاں تھا۔

غلطی ایکچوئلی اس کی نہیں میری ہے۔ میں نے اسے زیادہ سر چڑھا لیا ہے۔ کزنز اور فرینڈز میں ہمیشہ اس کو ترجیح دے دے کر اسکا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اسے تو اب میں سیدھا کروں گا۔۔۔ تم دیکھنا میں نے تو اسے مخاطب کرنا بھی چھوڑ دینا ہے۔"

اس کی تقریر کے جواب میں زارا مسلسل چپ تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر شہروز نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

تم کیوں خاموش ہو؟"

احتراماً"

زارا نے اسکی جانب دیکھے بغیر سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ لہجے کی سادگی چہرہ کی بیزاری و اکتاہٹ سے بالکل میچ نہیں کر رہی تھی۔

احتراماً؟" شہروز نے استفہامیہ انداز میں اس کے لفظ کو دہرایا۔ اب کی بار زارا نے اس کی جانب دیکھا پھر چبا چبا کر بولی۔

پیٹ میں کچھ چوہے اودھم مچا رہے تھے۔۔۔ ان میں سے آدھے بھوک کے باعث وفات پا گئے ہیں۔ ان کی تدفین کے احترام میں خاموش ہوں۔"

شہروز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی پھر وہ خجالت بھری ہنسی ہنس دیا۔

بھوک لگ رہی ہے؟"

نہیں۔۔۔ مذاق کر رہی ہوں۔" زارا کے لہجے میں طنز کی آمیزش زیادہ ہوئی تھی۔

شکر ہے میں سمجھا تم سیریس ہو۔" شہروز اسے مزید چڑانا چاہتا تھا مگر پھر اس کے چہرے پر پھیلی اکتاہٹ دیکھ کر ارادہ ترک کر دیا۔

آئی ایم سوری یار۔ میں اپنی باتوں میں بھول گیا۔۔۔ دراصل یہ عمر۔۔۔" وہ ایک بار پھر عمر کے متعلق کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر پھر ارادہ ترک کر کے خاموش ہو گیا۔ اسے کوئی موزوں ریسٹورنٹ بھی نہیں ملا تھا۔ عمر کی شکایتیں لگاتے لگاتے وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس نے گاڑی بھی رہائشی علاقے کی طرف موڑ لی تھی جہاں کوئی اچھا ریسٹورینٹ موجود نہیں تھا۔ جو تھے وہاں کا ماحول کچھ زیادہ آزاد تھا یا شہروز کے بجٹ کی حدود میں نہیں آتا تھا۔

لنچ میں کیا کھایا تھا تم نے؟" اسے زارا کی خاموشی سے شرمندگی بھی ہو رہی تھی مگر اس پر ظاہر کئے بنا وہ عام سے لہجے میں پوچھنے لگا۔ زارا نے منہ پھلا کر گہرا سانس بھرا پھر اس کی جانب دیکھ کر اسی کے انداز میں بولی۔

لنچ نہیں کیا میں نے۔"

شہروز کے دل کو واقعی کچھ ہوا۔ ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا زارا ناشتہ کرنے کی عادی نہیں ہے۔ اگر اس نے لنچ نہیں کیا تھا تو واقعی وہ چوہوں کی تدفین کے احترام میں خاموش تھی۔ شہروز کا ارادہ تھا وہ گھوم پھر کر نو بجے کے قریب ڈنر کے لئے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں چلے جائیں گے پھر کسی آئسکریم پارلر سے اسے آئسکریم کھلوا کر وہ اسے گھر ڈراپ کر دے گا تب ہی اس نے زیادہ پرواہ نہیں کی تھی۔ زارا کے ایک دو بار ٹوکنے پر وہ ریسٹورنٹ کے سامنے رکا ضرور تھا مگر پارکنگ کے پرابلم کا بہانہ بنا کر آگے نکل آیا۔ وہ عمر کے متعلق اپنی ساری بھڑاس نکالنا چاہتا تھا جو ڈرائیونگ کے دوران ہی ممکن تھا۔ شرمندگی کی وجہ سے وہ کچھ لمحے خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ ڈرائیونگ کے لئے آج اس کا دن کافی اچھا تھا۔ ابھی تک ہر سگنل کھلا ملا تھا اور سڑکوں پر گاڑیوں کا رش بھی کچھ کم تھا۔

میرا خیال ہے مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ میں شرمندہ ہوں۔" وہ زارا کی بیزاری و خفگی کا لیول کم کرنے کیلئے بولا تھا۔ زارا کو اس کی شوخی ذرا نہیں بھائی۔ اس نے شہروز کی بات پر سر ہلایا پھر جبڑے باچھوں تک چیر کر مصنوعی انداز میں مسکرائی اور دوبارہ لمحہ بھر بعد ہی ہونٹوں کو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا دیا۔

میرا یقین کرو یار میں نے آج تک یہ بات کسی لڑکی کے سامنے نہیں کی۔"

زارا نے منہ بنا کر اس کی جانب دیکھا۔

مشکل ہے مگر کر لیتی ہوں یقین۔۔۔ خوش۔۔۔؟۔۔۔ اب پلیز مجھے کسی "ٹیک اوے" سے کچھ کھانے کو لے دو چاہے ایک سینڈوچ اور ایک کولڈ ڈرنک۔۔۔ میں بھوک سے نہیں مرنا چاہتی شہروز۔"

زارا کے لہجے میں اب بے بسی تھی۔ وہ زچ ہو چکی تھی۔ شہروز نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔ یہ وہی زارا تھی جسے وہ اتنا ستایا کرتا تھا کہ وہ

رونے والی ہو جاتی تھی اور اب جب سے ان دونوں کے درمیان رشتے کی نوعیت بدلی تھی تو اس کو ستا کر بھی دل کو کچھ ہوتا تھا۔اس کی جانب دیکھتے ہوئے شہروز نے ذرا سا رخ موڑ کر جینز کی پاکٹ سے ایک فل سائز چاکلیٹ نکال کر اسے تھما دی۔

عمیرہ کے لیئے لی تھی۔۔۔گزارہ کرو تب تک میں ڈھونڈتا ہوں کوئی اچھی جگہ۔" وہ محبت سے بولا۔زارا نے چند سیکنڈز تک خود کو یقین دلایا کہ وہ اسی سے مخاطب ہے پھر فوراً چاکلیٹ پکڑ لی۔ایک جانب سے ریپر پھاڑ کر اس نے پہلے شہروز کی جانب بڑھائی۔شہروز نے مسکراتے ہوئے ایک بائٹ لے لیا تھا۔اس کے بعد وہ خود کھانے لگی۔اسے واقعی بے حد بھوک لگ رہی تھی۔اس کے کھانے کے انداز سے ظاہر بھی ہو رہا تھا۔شہروز اسے دوبارہ نہیں چھیڑا۔وہ چاہتا تھا زارا آرام سے کھالے۔زارا نے اطمینان سے چاکلیٹ ختم کی۔اس کی بھوک ختم نہیں ہوئی تھی مگر بیزاری ختم ہو گئی تھی۔شہروز کو اتنا کیئرنگ دیکھ کر اس کی اکتاہٹ بالکل ختم ہو گئی تھی۔

تھینک یو" چاکلیٹ ختم کر کے وہ مسکراتے ہوئے مشکور ہوئی تھی۔

یو آر آل ویز ویلکم۔"شہروز نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

اب فٹافٹ عمر کے متعلق جو کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو۔۔۔ڈنر کے دوران مجھے بور مت کرنا۔"

زارا چاہتی تھی کہ وہ اپنی بات گاڑی میں ہی مکمل کر لے۔وہ پہلے بھی شہروز اور عمر کے جھگڑوں میں ثالث کا کردار کرتی آئی تھی۔

مجھے اب اس کے متعلق مزید کچھ نہیں کہنا۔۔۔میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس سے بات ہی نہیں کرنی اب۔۔۔وی آر نو مور ناؤ۔"

اسکا انداز حتمی تھا۔زارا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ہر جھگڑے کے بعد شہروز ایسا بیان ضرور جاری کرتا تھا۔

شہروز! یہ بات تم نے پہلے بھی کہی تھی۔۔۔یاد ہے۔۔۔؟ جب عمر نے اور تم نے ماموں کی گاڑی کا حشر خراب کر دیا تھا اور عمر نے ماموں کے سامنے تمہارا نام لیتے ہوئے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ جب گاڑی ٹکرائی تو وہ بھی تمہارے ساتھ تھا اور ہاں تب جب اس نے تمہارے کلاس فیلو کو گھر ڈنر پر انوائٹ کر لیا تھا اور تمہیں اپنی پوری پاکٹ منی مامی جی کو دینی پڑی تھی تاکہ وہ تمہاری شکایت ماموں سے نہ کریں۔" اس کے جتاتے ہوئے انداز نے شہروز کو مسکرانے پر مجبور کیا۔

واقعی یار۔۔۔شکر ہے تم نے مجھے یہ سب یاد دلا دیا۔۔۔یہ عمر شروع سے ہی خبیث ہے۔" وہ ڈھیٹ بنا کہہ رہا تھا۔

اب بتا بھی چکو عمر نے کیا کر دیا ہے۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے حکیم لقمان کی شاگرد ہو۔۔۔ساری بات سن کر فوراً مسئلہ حل کر دو گی۔۔۔ہو تو اسکی کزن۔۔۔اسی کی طرح ڈفر۔۔۔ساری بات سن کر اسی کی حمایت کرو گی۔"

وہ بے وجہ اس پر برس پڑا۔زارا نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر بجھے دل سے باہر دیکھنے لگی۔"ڈفر تو اسکا نک نیم تھا جیسے۔۔۔

اچھا اب رونا نہ شروع کر دینا۔۔۔سنو اپنے عمر کے کارنامے۔۔۔پتا ہے کیا ہوا۔۔۔"زارا کی پرواہ کیئے بغیر اس نے بتانا شروع کیا تھا۔

وہ پہلے تو منہ بگاڑ کر بیٹھی رہی پھر اس نے آہستہ آہستہ دلچسپی لینا شروع کی تھی۔عمر کی یہ حرکت اس کی پرانی بدتمیزیوں اور شرارتوں کے مقابلے میں صفر

تھی مگر چونکہ یہ معاملہ سنجیدہ نوعیت کا تھا اسی لئے شہروز زیادہ ہی ری ایکٹ کر رہا تھا۔

میری طرف سے بھاڑ میں جائے پرنس عمر۔۔۔"

سب کچھ کہہ لینے کے بعد شہروز نے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔

تم اسے لے کر سر آفاق کے گھر گئے ہی کیوں تھے؟" زارا کو سب سے پہلا اعتراض اس بات پر ہوا تھا۔

سر کے گھر سر سے ملوانے کے لئے لے گیا تھا اس کو۔۔۔" شہروز اکتا کر بولا۔

مگر کیوں؟" زارا واقعی کنفیوژ ہو گئی تھی۔ شہروز مزید چڑ گیا۔

اوہ میری ٹیوب لائٹ۔۔۔ تم واقعی ٹیوب لائٹ ہو۔ جس طرح ٹیوب لائٹ آن ہونے سے پہلے کچھ سیکنڈ بلنک کرتی ہے اسی طرح تم بھی ہر بات سے پہلے بلنک کرتی ہو پھر بات سمجھتی ہو۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے زارا کی طرف دیکھا پھر لہجہ نرم کر کے بولا۔

سر سے ملوانے لے کر گیا تھا تاکہ عمر اور امائمہ کے رشتے کی بات چلائی جاسکے۔"

زارا کچھ نہیں بولی۔ اس نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔ شہروز کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس کے کندھے پر دستک دینے والے انداز میں انگلی بجا کر بولا۔

رو رہی ہو؟"

جی نہیں۔۔۔ میں برسات ہوں کیا جو بلا وجہ برستی رہوں۔" وہ تنگ کر بولی۔ شہروز نے قہقہہ لگایا۔

اوئے ساشے پیک۔۔۔ بڑے عرصے کی مثال دی ہے۔۔۔ ذہین ہوتی جا رہی ہو چلو اب میں تمہیں ٹیوب لائٹ کہنا چھوڑ دوں گا۔

زارا خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔

زارا۔۔۔ یار۔۔۔ او کے آئی ایم سوری۔" وہ شرمندہ نہیں تھا مگر اس کی خاموشی سے اکتا رہا تھا۔

مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم عمر کے اس پرسنل معاملے میں خود کو کیوں انوالو کر رہے ہو۔ ابھی تو یہ بھی کنفرم نہیں ہے کہ وہ سیریس بھی ہے یا نہیں۔ تم جانتے ہو وہ بہت بار اپنی سٹیٹمنٹ سے مکر بھی جاتا ہے۔ میرا مشورہ ہے شہروز اس معاملے کو ویسے ہی ہینڈل کرو جیسے کہ کرنا چاہیے۔" زارا اسے سمجھا رہی تھی۔

اس کی بھی وضاحت کر دو کہ یہ معاملہ کس طرح حل کرنا چاہیے۔"

شہروز کا انداز کسی قدر طنزیہ ہی تھا۔

ہمارا کنسرن یہاں تک تھا کہ وہ امائمہ میں انٹرسٹڈ ہے یا نہیں۔۔۔ اسکے بعد یہ اسکا اور اسکے پیرنٹس کا معاملہ ہے۔ اسے چاہیے وہ اپنی پسندیدگی اپنے پیرنٹس کو بتائے تاکہ بزرگ انوالو ہوں اور بات آگے بڑھے۔ تم عمر سے کہو کہ وہ احسان ماموں کو یہ سب بتائے اسکے بعد یہاں۔۔۔"

میں اسے کچھ بھی مشورہ نہیں دینے والا۔۔۔وہ اپنے مسائل خود حل کرتا پھرے۔" شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔

اوکے۔۔۔یہ مشورہ میں اسے دے دوں گی۔۔۔اور پلیز تم اس ٹاپک کو یہیں ختم کردو۔۔۔میں بہت بور ہو گئی ہوں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔شہروز کچھ نہیں بولا مگر وہ کچھ سوچ ضرور رہا تھا۔

ٹیوب لائٹ نے بات تو گُر کی بتائی تھی۔یہ مسئلہ واقعی بڑوں کے حل کرنے والا تھا۔یہی سب سوچتے ہوئے اس نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے باہر روک لی تھی۔

☆ ☆ ☆

شہروز۔۔۔کچن میں داخل ہوتے ہی ممی نے اسے کچھ اس انداز میں پکارا کہ وہ پریشان سا ہو گیا۔فریج کی جانب پانی کی بوتل نکالنے کے لئے بڑھایا گیا ہاتھ بھی دروازے کے ہینڈل پر جم سا گیا۔ممی ہفتہ بھر کی سبزیاں ٹیبل پر سجائے انہیں فریج میں محفوظ کرنے کیلئے چھوٹی ٹوکریوں اور تھیلیوں میں منتقل کر رہی تھیں۔مٹر کے دانے نکال کر ایک ایئر ٹائٹ باکس میں رکھے ہوئے تھے۔لہسن کے چھلے ہوئے جوئے ایک الگ پیکٹ میں پڑے تھے۔ادرک،ہری مرچ وغیرہ بہر حال چھوٹی ٹوکری میں سالم و ثابت پڑے تھے۔شہروز نے کن انکھیوں سے سب دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔اتوار کو وہ ممی سے کافی بچنے کی کوشش کرتا تھا۔آج بھی ناشتے کے بعد سے وہ انٹرنیٹ پر معروف تھا۔عمر اور اس کے درمیان سرد جنگ چل رہی تھی۔عمر رات سے اپنی ممی کی کزن یعنی اپنی خالہ کے گھر گیا ہوا تھا اور شہروز کی معلومات کے مطابق وہ تا حال واپس نہیں آیا تھا۔

یس ممی۔" لاڈ سے انہیں پکارتے ہوئے وہ دوبارہ فرج سے پانی نکالنے لگا۔

ادھر آؤ ذرا۔۔۔وہیں جم کر کھڑے ہو گئے ہو" وہ اسے گھور کر بولی تھیں۔شہروز کچھ سوچتے ہوئے ان کی جانب آ گیا۔ممی کچھ ناراض لگ رہی تھیں۔ہفتہ بھر کی تازہ رنگ برنگی سبزیاں ٹیبل پر بکھری ہوئی تھیں۔وہ ہفتہ بھر کی سبزیاں لا کر اسی طرح فرج میں محفوظ کر لیا کرتی تھیں اور اتوار کے روز مارکیٹ جانے کے لئے انہیں شہروز سے بہتر ڈرائیور کوئی نہیں لگتا تھا۔شہروز کو ڈرائیور بننے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ڈیڈی اور بھائی لوگوں کو ہفتہ بھر معروف رہنے کے بعد اتوار کا دن ہی آرام کرنے کے لئے میسر ہوتا تھا سو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے وہ ممی کا ڈرائیور بخوشی بن جاتا تھا لیکن اتوار بازار سبزی لینے جانے کے لئے علی الصبح اٹھنا اسے سخت ناپسند تھا جبکہ ممی کا کہنا تھا کہ وہاں سے سبزی تازی اور سستی ملتی ہے سو ہر پندرہ بیس دن بعد اس ایک معاملے میں ممی اس کی کلاس لیا ہی کرتی تھیں وہ خاندان بھر میں اپنے اسی سلیقہ شعاری کی وجہ سے پہچانی جاتی تھیں۔بہوؤں کی موجودگی اور ملازم کی سہولت کے باوجود وہ اپنے کچن کے بیشتر کام خود کرتی تھیں یا اپنی نگرانی میں کروانا پسند کرتی تھیں۔یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن شہروز کو تب زیادہ چڑ ہوتی جب ممی اسے لہسن چھیلنے،مٹر کے دانے نکالنے اور ٹماٹر دھونے جیسے کاموں پر لگا دیا کرتی تھیں۔کچن کے اوپر کے کاموں کے لئے ایک کل وقتی ملازم موجود تھا لیکن جب کبھی وہ چھٹی پر چلا جاتا تو گھر بھر میں ممی کو شہروز سے بہتر ہیلپر کوئی نہیں لگتا تھا۔انہیں خود کو اور دوسروں کو مصروف رکھنے کا خبط تھا اور شہروز چونکہ ابھی آفس نہیں جاتا تھا سو وہ انہیں سب سے زیادہ فارغ اور نکما نظر آتا تھا۔

ارے آپ نے یہ سب خود ہی کر لیا۔۔۔مجھے آواز دے لیتیں آپ۔۔۔میں فارغ ہی تھا۔" وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ہاں مجھے پتا ہے تم میرے کتنے فرمانبردار بیٹے ہو۔۔۔صبح سے کمرے میں گھسے بیٹھے ہو اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ آ کر ہی پوچھ لو گوشت وغیرہ تو نہیں لانا۔ یہ یاد رہتا ہے کہ اتوار ہے بریانی ہی کھانی ہے۔ یہ کبھی یاد نہیں رہتا کہ گوشت بھی لا کر دینا ہے۔ چکن کا ریٹ پھر بڑھ گیا ہے۔"

وہ اسے ڈانٹنے کے ساتھ جتا بھی رہی تھیں۔

میرے ذہن سے نکل گیا ممی۔۔۔چلیں پرامس نیکسٹ سنڈے میں جلدی اٹھوں گا اور آپ کی ساری شکایتیں دور کر دوں گا۔۔۔کیسا؟

ٹوکری میں پڑا ٹماٹر اٹھا کر اپنے ٹراؤزرز سے رگڑتے ہوئے وہ انہیں مسکہ لگا رہا تھا۔

رہنے دو بھائی۔۔۔کوئی ضرورت نہیں اس مہربانی کی۔۔۔کہہ دیا ہے میں نے تمہارے ڈیڈی کو گھر کے لئے ایک ڈرائیور رکھ دیں۔۔۔بہت پریشانی ہوتی ہے ہمیں۔۔۔مارکیٹ جانا ہے تو شہروز صاحب کی منت کرو، کسی کے گھر تعزیت کے لئے جانا ہے یا مبارک سلامت کرنی ہے تو پہلے شہروز صاحب کو عرضی دو۔۔۔وہ "ہاں" کہیں گے تو ہم جا پائیں گے ورنہ بیٹھے نخرے دیکھتے رہو۔۔۔اونہہ۔۔۔ارے اتنے نخرے تو میں نے کبھی تمہارے ڈیڈی کے نہیں سہے، مہروز بہروز بھی تو ہیں کیسے میرے دل کی بات جان لیتے ہیں۔"

وہ کچھ زیادہ ہی غصے میں تھیں۔ شہروز خجالت بھری ہنسی ہنسا۔ ممی سچ کہہ رہی تھیں۔

اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے آپ کو۔۔۔ڈیڈی سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔۔۔انکا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہی ہیں؟"

ان کے کندھے کو اپنے کندھے سے ٹہوکا دیتے ہوئے وہ لاڈ سے بولا تھا۔

وہ بیچارے کہاں جھگڑتے ہیں کسی سے۔۔۔ان کے مزاج کی نرمی نے ہی تو بگاڑا ہوا ہے تمہیں۔"

وہ واقعی آج کچھ زیادہ خفا تھیں۔

سبحان اللہ سبحان اللہ۔۔۔ڈیڈی اور نرم مزاج۔۔۔آپ نے شاید تب انہیں نہیں دیکھا جب وہ مجھے ڈانٹ رہے ہوتے ہیں۔۔۔آپ تو خیر ان کی فیور ہی کریں گی ممی۔۔۔آپ کے مجازی خدا ہیں بھئی۔"

ٹماٹر کترتے ہوئے وہ سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

زیادہ بک بک مت کرو۔۔۔ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔۔۔شام تک وہ کلاس لینے والے ہیں تمہاری۔" انہوں نے اسے ٹوکا تھا۔

کون؟ ڈیڈی؟" وہ چونکا۔ اس کے ارد گرد الارم بجنے لگے تھے۔ ممی نے اثبات میں سر ہلایا۔

کیوں ممی۔۔۔میں نے کیا کیا ہے۔" وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔ ممی اور بھائیوں کی باز پرس سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن ڈیڈی کی ذرا سی جواب طلبی اسے ڈرا دیتی تھی۔ وہ ڈانٹتے زیادہ نہیں تھے لیکن سزائیں ایسی دیتے تھے کہ کئی دن وہ جلتا کلستا رہتا تھا۔ کبھی پاکٹ منی بند، کبھی حکم صادر کر دیتے کہ گاڑی کو چھونا بھی مت۔

بتائیں نا ممی۔۔۔میں نے کیا کیا ہے۔۔۔بہروز بھائی نے شکایت لگائی ہے۔۔۔؟ یا۔۔۔آپ نے کہا ہوگا ان سے کچھ۔"

وہ ان کے ہاتھ کو پکڑ کر لجاجت سے بولا تھا۔ اسکا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا کہ گزشتہ دنوں اس نے کونسی حرکت کی ہے جو ڈیڈی

کے نوٹس میں آ گئی ہے۔

مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔خود سوچو۔۔۔یقیناً کوئی شرارت کی ہوگی تم نے جو تمہارے ڈیڈی خفا ہیں تم سے۔"

اس کے پریشان ہو جانے پر ممی کچھ مطمئن سی لگنے لگی تھیں۔دل ہی دل میں انہیں خوشی ہوئی تھی کہ جوان بیٹا باپ کا فرماں بردار ہے۔

لیں مجھے کیا پتہ وہ کیوں خفا ہیں۔۔۔میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔۔۔آپ نے یا بھائی نے کی ہوگی شکایت۔" وہ منہ بسور کرحتمی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔چہرہ لٹک سا گیا تھا۔ممی کو ہنسی آ گئی۔

یہ عمر اور امائمہ کا کیا سلسلہ ہے؟" انہوں نے ہنسی دبا کر ہلکی آواز مگر سخت لہجے میں پوچھا۔شہروز کو جھٹکا سا لگا۔

ڈ۔۔۔ڈیڈی نے یہ پوچھنا ہے۔۔۔انہیں کیسے پتا چلا؟" وہ یکدم مزید پریشان ہو گیا۔بات ہی ایسی تھی۔

عمر نے خود بتایا ہے۔ممی کے لہجے میں کھنکتا ہوا اطمینان تھا۔شہروز ان کی آنکھوں میں چھپی شرارت پڑھ نہیں پایا تھا۔

کس کو؟۔۔۔ڈیڈی کو؟"شہروز کی پریشانی اب خفگی میں ڈھل رہی تھی۔"

بہت ہی بدتمیز انسان ہے یہ عمر۔۔۔اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔"ممی کو خاموش پا کر وہ خود ہی اپنا غصہ نکالنے لگا تھا۔

اسے تم بعد میں سبق سکھانا۔۔۔پہلے مجھے بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔۔۔یاد رکھنا اگر کچھ بھی جھوٹ بولا تو میں ڈیڈی کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

اس کا کان مروڑتے ہوئے وہ گھرک رہی تھیں۔شہروز مشکوک ہوا۔

اس کا مطلب ہے ابھی ڈیڈی کو نہیں پتا۔۔۔ہے نا۔۔۔آپ ڈرا رہی ہیں مجھے۔" وہ ناراض ہوا تھا اور عمر پر بے پناہ غصہ بھی آ رہا تھا۔

میں تمہیں ڈرا یا دھمکا نہیں رہی بلکہ کچھ پوچھ رہی ہوں اور اگر تم نے مجھے سب سچ سچ نہ بتایا تو میں تمہیں جوتے بھی لگاؤں گی۔" امی کا سارا دھیان سبزیوں سے ہٹ کر اس کی جانب منتقل ہو چکا تھا۔

تم سے اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تمہاری کلاس فیلو ہے۔تم نے کوئی اچھائی، کوئی خوبی تو دیکھی ہوگی جو عمر کیلئے اسکا نام لیا ہے نا۔"

وہ خود ہی سوال کر رہی تھیں اور خود ہی جواب دیتی جا رہی تھیں۔ان کے ہاتھ تو اچھی مصروفیت لگنے والی تھی جبکہ شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عمر کی اچھی مرمت کرے۔اس نے ہمیشہ کی طرح سارا مدعا شہروز پر ڈال دیا تھا۔

عمر واپس کب آئے گا؟"اس کے لہجے میں ابھی بھی خفگی تھی۔اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ عمر اس طرح سب کچھ اس کی ممی یعنی اپنی تائی جان کو بتا سکتا ہے۔

وہ تو کب سے ڈرائینگ روم کا اے سی آن کر کے سویا ہوا ہے۔۔۔میں نے کہا بھی کہ اس موسم میں بھلا اے سی کی کیا ضرورت۔۔۔بولا لندن کی یاد تازہ کرنی ہے۔"

انہوں نے تسلی سے جواب دیا۔شہروز کھولتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔چند لمحوں بعد ہی وہ ڈرائینگ روم کے انتہائی خنک ماحول میں کھڑا عمر کو کشنوں سے پیٹ رہا تھا۔

سوری یار۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ کہہ تو رہا ہوں سوری۔۔۔ عمر ایک ہی گردان کئے جا رہا تھا۔ شہروز نے جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی اس پر نتیجاً پندرہ بیس منٹ بعد وہ دونوں کارپٹ پر آڑے ترچھے لیٹے قہقہے لگا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

یہ تو اس صدی کا معجزہ ہو گیا۔۔۔ ناقابلِ یقین اور حیران کن۔ شہروز نے آڑو میں دانت گاڑتے ہوئے با آواز بلند تبصرہ کیا تھا تاکہ عمر جو اس کے عقب میں صوفے پر چت لیٹا آنکھوں کو کشن سے ڈھکے، دونوں پاؤں کے انگوٹھوں کو دائیں بائیں ہلانے میں مصروف تھا بخوبی سن سکے۔

تم نے منہ کی بجائے ناک سے کھانا شروع کر دیا ہے۔ عمر کی بجائے زارا نے جواب دیا جو سامنے سنگل کاؤچ پر دونوں ٹانگیں اوپر چڑھائے، گود میں آڑو والی باسکٹ رکھے کب سے اپنی پسند کا آڑو تلاش کر رہی تھی۔

یہ پہلے بھی منہ سے نہیں کھاتا۔۔۔ اچھا۔ عمر نے آنکھوں پر سے لمحہ بھر کے لئے کشن ہٹا کر زارا کو بتایا بلکہ جتایا تھا۔ زارا نے حیرانی سے کشن کو دیکھا جس کے پیچھے عمر تھا۔

ہاں۔۔۔ تو پھر؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

آف کورس۔۔۔ دانتوں سے کھاتا ہے۔" یہ جواب سر سے کشن ہٹائے بغیر دیا گیا تھا۔

اونہہ۔۔۔ بیکار جوک۔" زارا کو بالآخر اپنی پسند کا آڑو مل گیا تھا۔

ہونا پھر ٹیوب لائٹ۔ شہروز نے اسے چڑانا چاہا۔

مجھے اپنی خوبیوں پر فخر ہے۔" زارا نے کندھے اچکائے تھے۔ وہ کوشش کرتی تھی ان کی باتوں سے خار نہ کھائے۔

اچھا آ آ۔ عمر یکدم حیران ہوتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا پھر زمین پر بیٹھے شہروز کا کندھا پکڑ کر کہنے لگا۔

یہ تو واقعی معجزہ ہو گیا۔۔۔ ناقابلِ یقین اور حیران کن۔۔۔ زارا بی بی کو اب فخر ہونے لگا ہے اپنی خوبیوں پر۔۔۔ واہ بھئی واہ۔۔۔ سن کر خوشی ہو رہی ہے۔"

دھیان سے بھائی۔۔۔ اس خوشی میں میرا کندھا نہ توڑ دینا۔" شہروز نے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

نہیں ٹوٹتا تیرا کندھا۔۔۔ اور بالفرض ٹوٹ گیا تو ڈاکٹر صاحبہ بیٹھی ہیں نا۔۔۔ ان کا ہنر آزمائیں گے تیرے اس کندھے پر۔"

سوچ لو ٹوٹے کندھے کے ساتھ تمہاری منگنی پر بھنگڑا ڈالتا کیسا لگوں گا۔" شہروز تیسرا آڑو ختم کرتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

ارے ہاں۔۔۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔۔۔ چلو معاف کیا۔" وہ سیدھا ہو گیا تھا۔

شہروز! کہیں تم امائمہ اور عمر کی انگیجمنٹ کو تو اس صدی کا معجزہ قرار نہیں دے رہے۔"

زارا نے یکدم پوچھا تھا جیسے ساری بات اب سمجھ میں آئی ہو۔ شہروز اور عمر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ ہنسے تھے۔

زارا! وہ کیا ہے؟" عمر نے لاؤنج میں روشن ٹیوب لائٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

ٹیوب لائٹ" وہ ترنت بولی پھر پچھتائی۔

وہی تو میں کہہ رہا تھا۔۔۔ ٹیوب لائٹ۔" وہ دونوں پھر ایک بار ہنسے تھے۔ زارا نے ناک چڑھائی پھر بولی، میری فکر چھوڑو اور اپنے بارے میں سوچو۔۔۔ میں تو ابھی تک شاک میں ہوں کہ سر آفاق نے "ہاں" کیسے کہہ دی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آنٹی جو مرضی کہیں مگر سر آفاق تمہیں کبھی امامہ کے لئے پسند نہیں کریں گے۔" وہ ساتھ ساتھ آڑو بھی کتر رہی تھی۔

کیوں جی۔۔۔ امامہ میں کونسے سرخاب کے پر لگیں ہیں جو مجھے ناپسند کرتے وہ۔۔۔ ان فیکٹ وہ تو شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ اتنا اچھا داماد مل رہا ہے انہیں۔" عمر نے فخر سے گردن اکڑائی۔

اچھا تو داماد صاحب اَذرا ڈرائینگ روم میں جا کر چیک کریں کہ بزرگوں کی میٹنگ ختم ہوئی کہ نہیں۔۔۔ کوئی مٹھائی شٹھائی کھلانے کا پلان ہے کہ نہیں۔"

شہروز بلاوجہ کی بحث سے سب سے پہلے اکتایا تھا۔ وہ سب لوگ اپنی اپنی مصروفیت چھوڑ کر اکٹھے ہی اس لئے ہوئے تھے کہ امامہ کی امی نے شہروز کی ممی کو فون پر بتایا تھا کہ انہیں یہ رشتہ قبول ہے۔

میں نہیں جا رہا۔۔۔ ابو کا فون آیا ہوا ہے۔۔۔ وہ فون بند کریں گے تو میں جاؤں گا۔"

عمر دوبارہ لیٹ گیا تھا۔ اس کے والدین کو پہلے ہی خوشخبری دی جا چکی تھی۔ اب وہ بھی فون کے ذریعے شامل تھے۔

تمہیں شرم آ رہی ہے عمر؟" زارا نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ عمر نے پہلے تو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا پھر دوبارہ سے چپ چاپ ٹیوب لائٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیچاری چپ ہو گئی۔

چاچو سے بات نہیں کرنا چاہتے تم؟" شہروز پوچھ رہا تھا۔

نہیں۔" عمر کے انداز میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔

کیوں؟" شہروز نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ عمر نے گہری سانس بھر کچھ کہنے لگا مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں تھا

☆ ☆ ☆

ایلی فینٹ"

اس بچے کے سامنے ایک بار پھر دہرایا گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی پینسل کو انگلیوں کے درمیان ذرا سا گھمایا پھر وہ رائیٹنگ پیڈ پر جھک گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ چھ لفظ لکھ چکا تھا۔ ساتواں لفظ ایلی فینٹ تھا جس پر وہ اٹک گیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ یہ لفظ پڑھ چکا ہے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ لفظ "ایلی فینٹ" لیٹر "ای" سے شروع ہوتا ہے مگر لیٹر "ای" کے بعد اسے کیا لکھنا ہے اسے دوسری بار دہرانے پر بھی یاد نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ لمحے اسی طرح رائیٹنگ پیڈ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے میز کے دوسری جانب بیٹھے شخص کی طرف دیکھا تھا جو اسے ڈکٹیشن کروا رہا تھا۔ وہ

شخص بھی اس بچے کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نگاہوں میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ بچہ کنفیوز ہو کر دوبارہ رائیٹنگ پیڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی لکھائی بے حد واضح اور خوبصورت تھی۔ وہ ڈکٹیشن کا ہر نیا لفظ لکھتے وقت پہلے نمبر لکھتا تھا پھر اس کے آگے لفظ لکھتا تھا۔ ساتواں ہندسہ لکھنے کے لئے اس نے 7 کا ہندسہ پہلے ہی لکھ لیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ سامنے بیٹھا شخص منتظر نگاہوں سے اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظروں سے خائف ہو کر اس نے ڈھیلے ہاتھوں سے رائیٹنگ پیڈ پر 7 کے ہندسے کے آگے لیٹر "ای" لکھ دیا تھا مگر اس کے بعد وہ ایک بار پھر پینسل کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔ وہ اگلا لیٹر لکھنے کے متعلق قطعاً پر یقین نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا اور پہلے کی طرح خائف ہو کر نظریں جھکا لیں۔ اب کی بار اسے شرمندگی بھی ہوئی تھی۔ اسی شرمندگی کی وجہ سے اس نے لیٹر "ای" کے ساتھ لیٹر "پی" لکھ دیا تھا۔ سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اسے اپنے اندازوں کے مصدقہ ہو جانے کی خوشی ہوئی تھی۔ وہ ابھی پوری طرح سے مسکرا بھی نہ پایا تھا کہ اس بچے نے پنسل کے دوسرے حصے کو لیٹر "پی" پر رگڑنا شروع کر دیا۔ وہ لیٹر "پی" کو مٹا رہا تھا۔

سوری۔۔۔ مجھے یہ یاد نہیں آ رہا۔" پی" کو مٹا دینے کے بعد اس نے رائیٹنگ پیڈ سے نظریں اٹھائے بغیر گلوگیر لہجے میں کہا۔ وہ شخص اب مکمل کر مسکرایا۔

نو پرابلم۔۔۔ ایک ورڈ کے نہ آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔" اس شخص نے مسکراہٹ چھپا کر تسلی دی۔ اس بچے کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

آپ نیکسٹ ورڈ لکھو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ون کلاس کی انگلش کی کتاب کے صفحوں کو الٹ پلٹ کیا تھا۔ اس بچے نے نظریں اٹھائی تھیں نہ ہاتھ میں پکڑی پینسل۔ وہ اگلا لفظ لکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس بچے کے چہرے کے تاثرات نے اس شخص کو مزید مسکرانے پر مجبور کیا، اس نے اتنے چھوٹے بچے کو کبھی اتنا شرمندہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ذرا جھک کر بچے کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ وہ پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے اسی پانی کو بہتے دیکھا۔ اس نے متعجب ہو کر ہاتھ میں پکڑی کتاب کو بند کر کے میز پر ہاتھ رکھ دیا۔

آپ کو کیا چیز پریشان کر رہی ہے؟" اس نے بے حد نرم لہجے میں سوال کیا تھا۔ بچہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

آپ مجھے نہیں بتاؤ گے کہ آپ کیوں رو رہے ہو تو مجھے کیسے پتا چلے گا؟" اس نے پھر پوچھا۔ بچہ اب کی بار خاموش نہیں رہا تھا۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

کیا آپ کو مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟" اس کی کوشش تھی کہ بچے کا اعتماد بحال ہو جائے۔ بچے نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر بولا۔

نہیں۔۔۔ آپ تو اچھے لگے ہیں مجھے۔"

وہ شخص پھر مسکرایا۔

واقعی۔۔۔؟ مجھ میں کیا اچھا لگا آپ کو؟" اس کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ بچے کو حوصلہ دے رہی تھی۔ وہ اب رو نہیں رہا تھا۔

آپ ڈانٹنے والے نہیں ہیں۔۔۔ اس لئے اچھے لگے مجھے۔"

جب کوئی غلط کام کرے تو ڈانٹنے والا بھی بن جاتا ہوں میں۔۔۔ اتنا اچھا نہیں ہوں میں۔"

وہ ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے اس وقت اس بچے سے بات کرنا ہی اس کے لئے سب سے ضروری کام ہو۔

"مجھے نہیں ڈانٹا آپ نے۔" اس نے جتایا۔

"ویل۔۔۔ آپ نے کوئی غلط کام بھی تو نہیں کیا۔"

"کیا ہے۔۔۔ میں نے ایلی فینٹ کے اسپیلنگز نہیں لکھے۔" اس بچے کی آواز ایک بار پھر دھیمی ہوئی۔ اس شخص نے قہقہہ لگانے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

"یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ آپ نے سکس ورڈز کے اسپیلنگز بالکل ٹھیک لکھے ہیں۔ میں اس کی بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔ میں جب آپ جتنا تھا تو میں ایک ورڈ بھی صحیح نہیں لکھ پاتا تھا۔"

اس کی بات پر بچے نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر حیرانی کی جگہ تاسف نے لے لی۔

"آپ کے ابو آپ کو بہت ڈانٹتے ہوں گے نا؟" وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل بھی نہیں" اس شخص نے فوراً کہا پھر مزید بولا۔

"وہ خود بھی میرے جیسے تھے۔ ہم سب بڑے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو ہمیں اسپیلنگز لکھنے میں دشواری ہوتی ہے جیسے آپ کو ہوئی ہے لیکن پھر جب ہم دل لگا کر پڑھتے ہیں تو ہر دشواری دور ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اس لئے پریشان ہو کہ آپ کو اسپیلنگز نہیں آتے تو آپ بے فکر ہو جاؤ۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ تو اتنے ذہین ہو کہ آپ نے ایک لفظ کے اسپیلنگز نہیں لکھے مگر باقی چھ فوراً لکھ لئے تھے۔۔۔ ہے نا؟"

وہ سمجھانے کے ساتھ ساتھ استفسار بھی کر رہا تھا۔

"غلطی، غلطی ہوتی ہے۔ ابو کہتے ہیں ایک غلطی معاف کر دو تو بچے بار بار غلطیاں کرتے ہیں۔ ابو کو بار بار غلطیاں کرنے والے بچے اچھے نہیں لگتے۔ میرے ابو کو کبھی اسپیلنگز نہیں بھولتے۔ وہ مجھے ڈکٹیشن کرواتے وقت آپ کی طرح بک سے ورڈز نہیں دیکھتے۔ انہیں سب ورڈز زبانی یاد ہیں۔"

وہ اس کو جھٹلا کر بولا تھا۔ وہ شخص بہت متاثر ہو کر مسکرا دیا تھا۔ اس کا واسطہ ہر روز بہت سے بچوں سے پڑتا تھا لیکن اتنی ذہانت سے بھرپور باتیں کرنے والے بچے اس نے کم ہی دیکھے تھے۔ وہ فقط تین سال کا تھا لیکن اس کی باتیں پانچ سال کے بچے جیسی تھیں۔

"ابو کہتے ہیں غلطی کی کوئی معافی نہیں ہوتی۔ غلطیاں کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اگر میں غلطیاں کروں گا تو میں پیچھے رہ جاؤں گا پھر میں ڈاکٹر نہیں بن پاؤں گا۔"

وہ بچہ مزید کہہ رہا تھا۔ اس شخص کو خود بخود سمجھ آ گیا تھا کہ ایک لفظ کے اسپیلنگ نہ آنے کی وجہ سے وہ بچہ پریشان ہو کر کیوں رونے لگا تھا۔

آپ ڈاکٹر بننا چاہتے ہو؟" وہ شخص صرف یہی سوال کر سکا تھا۔

جی۔" اس بچے نے گردن بھی ہلائی تھی۔

آپ کو ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

مجھے ابو اچھے لگتے ہیں بس۔" وہ سادگی سے بولا تھا پھر اپنے رائیٹنگ پیڈ کی طرف دیکھ کر مزید کہنے لگا۔

لیکن میں انہیں اچھا نہیں لگتا۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو جاتی ہے نا۔۔۔ مجھے ایلی فینٹ کے اسپیلنگز بھول گئے۔"

وہ شخص ایک بار پھر بہت غور سے اس بچے کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بچے کو سمجھائے کہ "ایلی فینٹ" بے شک بہت بڑا ہوتا ہے مگر اس کے اسپیلنگز بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور انہیں بھول جانا تو بہت چھوٹی سی غلطی ہے لیکن وہ خاموش رہا۔ اس بچے کے ذہن میں موجود "غلطی" کا تصور اس شخص کے لفظوں سے زیادہ جامع تھا۔

☆ ☆ ☆

غلطی کی کوئی معافی نہیں ہوتی۔" اس کے گھر میں یہ فقرہ اکثر دہرایا جاتا تھا۔ وہ غلطیاں کرنے کا عادی نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کے ابو اسے یاد دلانا ضروری سمجھتے تھے اور اسکول میں پہلے ہی دن اس نے سیکھ لیا تھا کہ غلطی کی معافی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ دراصل غلطی کے حجم اور ماہیت پر منحصر ہے۔ بہر حال تین سال کی عمر میں اسے ایک اچھے پرائیوٹ انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔

ایڈمیشن ہونے سے پہلے اسکول کا تصور اس کے لئے بہت نیا اور انوکھا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسکے گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور بچہ نہ تھا۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ تب ہی کھیل پاتا تھا جب وہ گوجرانوالہ اپنے نانا ابو کے گھر جاتا تھا۔ اس کے گھر کے قرب وجوار میں جو گھر واقع تھے وہاں بھی بچے موجود تھے لیکن اس کے ابو کو یہ قطعاً پسند نہیں تھا کہ وہ کھیل کود کے لئے باہر گلی محلے میں نکلے اس لئے اس کی امی اسے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ وہ گلی محلے میں کھیل کود کا شوقین بھی نہیں تھا لیکن اسے یہ شوق ضرور تھا کہ اسے اپنے اردگرد اپنے علاوہ اور بچے بھی نظر آئیں یہی وجہ ہے کہ وہ اسکول جانے کے تصور سے ہی بہت خوش تھا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسکول میں اسے ہمہ وقت نہیں رہنا لیکن جتنا وقت بھی رہنا ہے اسے پڑھنا ہے اور اپنا کام توجہ سے مکمل کرنا ہے۔ اس کو پڑھانے لکھانے کی ذمہ داری اس کے ابو کی تھی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فقط تین سال کی عمر میں اسے چھ کلمے، چھوٹی چھوٹی کئی سورتیں اور دعائیں یاد تھیں۔ وہ ابتدائی کلاس کی کتابیں بھی رٹ چکا تھا۔ اس ایک معاملے میں اس کے ابو کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ پڑھائی کے دوران وہ اسے کوئی رعایت نہیں دیتے تھے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی انہوں نے اس کی پڑھائی کے لئے دو گھنٹوں کا وقت مختص کر رکھا تھا لیکن ان مخصوص دو گھنٹوں کے علاوہ بھی جب انکا دل چاہتا تھا وہ انہیں پڑھانے کے لئے بٹھا لیا کرتے تھے۔ وہ پڑھائی سے گھبراتا نہیں تھا لیکن کبھی کبھار وہ بہت تھک جاتا تھا تب بھی وہ کوشش کرتا تھا کہ ابو کو ناراض ہونے کا موقع نہ دے لیکن تھکن میں اس سے غلطیاں ہو جایا کرتی تھیں اس لئے ایسی صورتحال میں اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کتابیں اور کاپیاں ایک سائیڈ میں رکھ دے اور ابو کی گود میں لیٹ کر ان سے باتیں کرے بالکل اس طرح جیسے وہ اپنی امی کی

گود میں لیٹ کر ان سے باتیں کرتا تھا۔ اس کی امی اسے بالکل بھی نہیں ڈانٹتی تھیں لیکن پھر بھی اسے ابو زیادہ اچھے لگتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی ہر بات ماننے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ انہیں کبھی بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کے ابو کو غلطیاں کرنے والے بچے اچھے نہیں لگتے اس لئے وہ کوشش کرتا تھا اس سے غلطی نہ ہو۔ اس نے سیکھ رکھا تھا کہ غلطی کی کوئی معافی نہیں ہوتی جب ہی غلطی اسے رونے پر مجبور کر دیتی تھی اور سکول میں پہلے ہی دن اس نے کیا سیکھا تھا۔

غلطی در گزر بھی کی جا سکتی ہے۔"

اس کا ننھا سا ذہن یہ بات اتنی جلدی ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ بات گھر پہنچنے تک بھول بھی گیا تھا کیونکہ ابو کے ساتھ اسکول آفس سے نکلتے ہوئے، گیٹ کے قریب کھڑی بائیک پر بیٹھنے اور پھر گھر پہنچنے تک اس کے ابو نے اسے "ایلی فینٹ" کے اسپیلنگ بھول جانے پر اتنی بار سرزنش کی تھی کہ اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ "غلطی در گزر بھی کی جا سکتی ہے۔"

☆ ☆ ☆

ایسا مت کریں۔۔۔ پلیز۔"

اس نے آفس میں داخل ہوتے ہوئے سر شعیب کو کہتے سنا تھا۔ سر شعیب وہی شخص تھے جنہوں نے پہلے دن اس کا انٹرویو کیا تھا۔ اسے اسکول آتے ہوئے تقریباً دو ہفتے ہو چلے تھے اور اس عرصے میں اس نے سر شعیب کو بہت مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اسکول کو آرڈینیٹر تھے۔ کلاس وزٹ میں، بریک کے دوران، اسمبلی سیشن میں یا پھر چھٹی کے وقت راؤنڈ لیتے ہوئے وہ اسے اکثر نظر آ جاتے تھے۔ انہیں مسکراتے دیکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ ہی نہیں اسکول میں بے شمار ایسی چیزیں تھی جو اسے اچھی لگتی تھیں۔ وہ ہر دم ہنستے مسکراتے رہنے والا، بیحد دوستانہ طبیعت کا مالک بچہ تھا۔ دو ہفتوں میں وہ نا صرف ٹیچرز کا بلکہ سب کلاس فیلوز کا پسندیدہ بچہ بن چکا تھا مگر نا جانے کیا بات تھی کہ ابو کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ انہیں اس کی کتابیں پسند آئی تھیں نہ اس کے ٹیچرز کے پڑھانے کا طریقہ۔ اس نے امی اور ابو کو اس کے متعلق باتیں کرتے بھی سنا تھا لیکن اس کا ننھا ذہن سمجھ نہیں پایا تھا کہ اسکول میں ایسی کیا چیز ہے جو ابو کے لئے غیر تسلی بخش ہے۔ انہوں نے امی کو بتایا تھا کہ وہ دو تین بار اسکول فون کر کے بھی اس متعلق بات کر چکے ہیں۔ جہاں تک اس کی بات تھی وہ خود بے حد مطمئن تھا۔ اس کی کتابیں بہت آسان تھیں۔ وہ ہر روز کا سبق سب سے پہلے یاد کر کے سنا دیتا تھا۔ نوٹ بک پر لکھنے کے لئے جو کام دیا جا رہا تھا وہ بھی سب سے پہلے وہی مکمل کر کے ٹیچرز کو چیک کرواتا تھا پھر ایسا کیا تھا کہ ابو مطمئن نہیں ہو پا رہے تھے۔ اسے جب آفس میں بلوایا گیا تو وہ رائم یاد کرنے کے بعد اب باقی سب بچوں کو یاد کروا رہا تھا۔ آفس میں داخل ہونے کے بعد سر شعیب کو گڈ مارننگ کہنے تک اس کی نظر دوسری طرف پڑی کرسی پر نہیں پڑی تھی۔ وہ جب کمرے کے بالکل وسط میں پہنچا تھا تو اس نے ابو کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اسے انہیں وہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ دوڑ کر ان کے قریب گیا پھر اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اسکول آفس میں ہے۔ وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا تب ہی اس نے سر شعیب کو دوبارہ کہتے سنا۔

ایسا مت کریں۔۔۔ پلیز۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر مزید بولے۔

آپ جو کہہ رہے ہیں میں اسے جھٹلا نہیں رہا۔۔۔ بلاشبہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں نے ہی آپ کے بچے کا ٹیسٹ لیا تھا۔ اس کا سکور بہت شاندار تھا۔ میں جانتا ہوں آپ نے بچے پر محنت کی ہے۔ اسکا "کیلی بر" اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ سب آپ کی محنت کی وجہ سے ہی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ کی محنت بالکل بھی ضائع نہ ہو۔ ہم تین سال کے بچوں کو نرسری میں ایڈمیشن دیتے ہیں۔ میرے پاس کچھ ایسے بچے بھی ہیں جو تین سال سے زیادہ عمر کے ہیں مگر انکے پیرنٹس انہیں پری اسکول کی کلاس میں ہی رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ بنیاد بہت اہم ہوتی ہے اگر بچے کی بنیاد ٹھیک ہو تو وہ پڑھائی میں کبھی مار نہیں کھاتا اس لئے میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں کہ ایسا مت کریں۔"

سر شعیب بہت تحمل سے بات کر رہے تھے۔ اس نے ان کی بات سنی تھی مگر سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس کی دلچسپی بس اتنی تھی کہ ابو بات مکمل کریں تو وہ انہیں لے کر اپنے کلاس روم میں جائے اور ان کلاس فیلوز کو جو اس کے دوست بن چکے ہیں اپنے ابو سے ملوائے۔ اسے ابھی ابو کے ارادوں کی خبر نہیں تھی۔

آپ درست کہہ رہے ہیں شعیب صاحب! میں بھی آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن آپ کا مشورہ ماننے کا مطلب ہے میری اور میرے بچے کی اتنے دن کی محنت بیکار چلی جائے۔ میں پلے گروپ یا نرسری کلاس جیسی کسی چیز کو نہیں مانتا۔ میں جانتا ہوں میرا بچہ جب ایک کام کر سکتا ہے تو میں اس چیز پر اصرار کیوں نہ کروں؟ یہ سب کتابیں جو آپ ان کلاسز کو پڑھا رہے ہیں میں اپنے بیٹے کو گزشتہ سال پڑھا چکا ہوں۔ آپ بے شک اس کا ٹیسٹ لے لیں۔ آپ مایوس نہیں ہوں گے۔" ابو کا انداز بھی سر شعیب کی طرح بے حد دھیما تھا۔

یہ دونوں کیا کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے سوچا تھا۔

بچہ واقعی بہت ذہین ہے ماشاء اللہ۔۔۔ مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے۔ میں ایک بار نہیں دو بار اس کو چیک کر چکا ہوں۔۔۔ اسی وجہ سے میں نے اسے نرسری یا پریپ کی بجائے ون کلاس میں بٹھایا ہے۔ ون کلاس کا "کریکولم" بچے کے "کیلی بر" کے حساب سے پرفیکٹ ہے۔ وہ نا صرف پڑھ سکے گا بلکہ دوسری صلاحیتوں کو بھی نکھار سکے گا۔ ہم جب بھی کسی بچے کو ایڈمٹ کرتے ہیں تو نہ صرف میں بلکہ سر پرنسپل بھی ٹیچرز کے ساتھ مکمل رابطے میں رہتے ہیں۔ میں آپ کے بچے کو مسلسل واچ کر رہا ہوں۔ وہ اسکول کو انجوائے کر رہا ہے اسے یہ کرنے دیں۔ آپ کے کہنے پر میں بچے کو ٹو کلاس میں پرموٹ کر دیتا ہوں لیکن بچہ پڑھائی کا اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ بچہ پڑھائی کو وبالِ جان سمجھنا شروع کر دے گا۔" سر شعیب نے پھر ابو کو سمجھایا تھا۔

ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ میں اپنے بیٹے کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ میرا بیٹا پڑھائی کو بوجھ سمجھ ہی نہیں سکتا اور پھر میں بھی تو ہوں۔ میں ایسا باپ نہیں ہوں کہ بچے کو ٹیچرز کی ذمہ داری سمجھ کر اس کی پڑھائی سے جان چھڑوا لوں۔ میں خود اسے پڑھاؤں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس کے رزلٹ ہمیشہ شاندار پائیں گے۔۔۔ آپ براہ مہربانی اسے ٹو کلاس میں پرموٹ کر دیجیے۔"

ابو نے حتمی انداز میں کہا تھا۔ سر شعیب نے گہری سانس بھری تھی۔

اوکے۔۔۔ایز یو وِش۔۔۔میں تو فقط درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ بچے کو اسکی عمر کے مطابق پھلنے پھولنے دیں۔" وہ ابھی بھی متامل تھے۔

ابو نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

میں اپنے بیٹے کو کسی سے پیچھے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگلے دس سالوں میں زمانہ بہت آگے چلا جائے گا میں چاہتا ہوں میرا بیٹا زمانے کا مقابلہ فاتحین کی طرح کرے۔ وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اسی لئے۔۔۔"

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ سر شعیب بھی انہی کی طرف متوجہ تھے لیکن نجانے کیوں اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ سر شعیب ابو کی بات سن ضرور رہے تھے لیکن ان کے انداز میں رضامندی نہیں تھی۔ اسے اب ان دونوں کی گفتگو سے الجھن سی ہو چلی تھی۔ سر شعیب نے ابو سے بات کر لینے کے بعد پیون کو اس کا بیگ لانے کے لئے کہا تھا۔

لیکن کیوں؟" اس کا دل چاہا کہ وہ پوچھے لیکن اسے ڈر تھا کہ ابو ڈانٹ دیں گے۔ اس کا بیگ جونیئر سیکشن کے سب سے آخری کلاس روم میں رکھ دیا گیا۔ اس کی ساری کتابیں اور نوٹ بکس واپس لے لی گئیں تھیں۔

کل آپ کو نئی بکس اور نوٹ بکس مل جائیں گی۔" اس کی نئی ٹیچر نے کہا تھا۔

ابو جو اسے نئے کلاس روم میں بٹھا کر وہیں کھڑے تھے ٹیچر کی بات سن کر مطمئن ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ اس نے تحیر اور خوف کے ملے جلے جذبات میں گھبر کر کلاس روم میں بیٹھے بچوں کو دیکھا تھا۔ وہ سب اسے خود سے بڑے لگے تھے۔ اسے عجیب طرح کی اداسی نے گھیر لیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے کنارے نم محسوس ہوئے تھے۔

کیا میں اب ہر روز اسی کلاس روم میں بیٹھا کروں گا؟" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نیا کلاس روم، نئے کلاس فیلوز اور نئے ٹیچرز سب اسے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ اس ڈیسک پر بیٹھ گیا جس پر ٹیچر نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔

"Mend my shoes! cobbler,cobbler":

اس کے کانوں میں وہی پوئم گونجنے لگی جو وہ پرانی کلاس میں بچوں کو یاد کروا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہاں کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی منہ بسور کر امی سے کہا تھا۔ ون کلاس میں وہ ایک ہی دن میں ایڈجسٹ کر گیا تھا جبکہ ٹو کلاس میں وہ ایک ہفتے میں بھی ایسا نہیں کر پایا تھا۔ اسے واقعی یہاں کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے اگلے ہی دن نئی بکس اور نوٹ بکس فراہم کر دی گئی تھیں۔ ون کلاس کی بکس کی نسبت وہ تعداد میں زیادہ بھی تھیں اور مشکل بھی لیکن وہ پڑھائی سے گھبرانے یا ڈرنے والا نہیں تھا۔ ڈرنے اور گھبرانے کے لئے کلاس فیلوز کا رویہ ہی کافی تھا۔ اسے نجانے کیوں وہاں کسی بچے کا رویہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ون کلاس میں بھی کچھ بچے ایسے تھے جو اس سے بڑے تھے لیکن ٹو کلاس میں تو ایسے بچوں کی اکثریت تھی جو اس سے بڑے تھے۔ ان کے انداز بھی بڑوں والے تھے۔ وہ دھونس جما کر بات کرتے تھے۔ انہیں ایک "چھوٹے دوست" کی ضرورت نہیں تھی جو کلاس میں انکے اسٹیٹس کو ہلا دینے کے لئے آیا تھا۔ ٹیچرز اس سے پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے

اسے کلاس کے سب سے ذہین بچے کے ساتھ بٹھایا تھا۔لیکن وہ بچہ اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔وہ اس پر رعب جماتا تھا،اس کی نوٹ بکس میں غلطیاں ڈھونڈتا رہتا تھا،اسکا مذاق اڑاتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس نے باقی کلاس فیلوز کو اس کے ساتھ دوستی کرنے اور کھیلنے سے روک دیا تھا۔یہ سب چیزیں اسے ہرٹ کرتی تھیں اور وہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں پاتا تھا اسی لئے اس نے امی کے سامنے کھلم کھلا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔اسے پتا نہیں چلا تھا کہ عقب میں ابو بھی اس کی باتیں سن رہے ہیں۔یہ بات اسے تب پتا چلی تھی جب وہ شام کو پڑھنے کے لئے ان کے پاس بیٹھا تھا۔

سائنس کے ٹیسٹ میں اتنی خراب ہینڈ رائٹنگ۔۔۔وجہ؟"انہوں نے ایک نوٹ بک اس کے سامنے کی تھی۔اس ٹیسٹ میں اس نے فل مارکس لئے تھے لیکن ہینڈ رائٹنگ عجلت میں لکھنے کے باعث واقعی اچھی نہیں تھی۔

میں ایسی باتوں پر کوئی کمپرومائز نہیں کروں گا۔۔۔خبردار یہ غلطی آئندہ دہرائی تو۔۔۔"انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں وارننگ دی تھی۔پڑھائی کے وقت وہ بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

سوری ابو"اس نے معذرت کی۔

دیکھو بیٹا!سوری کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔آپ اگر دل لگا کر نہیں پڑھو گے تو ڈاکٹر کیسے بنو گے؟اس کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔آپ تو ابھی سے گھبرا گئے ہو تو مزید بڑی کلاس میں جا کر کیا کرو گے۔"وہ اسے سمجھانے لگے تھے۔

ابو!مجھے وہاں کچھ اچھا نہیں لگتا"اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔امی سے کہتے وقت اس کا انداز اور طرح کا تھا لیکن ابو سے کہتے وقت وہ تھوڑا سا ڈر بھی رہا تھا۔

آپ کو اپنی بکس پسند نہیں آئی؟"انہوں نے سوال کیا تھا۔

نہیں۔۔۔بکس تو اچھی ہیں"اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا تھا۔

تو پھر۔۔۔؟"انہوں نے مزید استفسار کیا۔

وہاں کوئی میرا دوست نہیں ہے۔۔۔کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔وہ سب آپس میں باتیں کرتے ہیں۔وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتے ابو؟"

اس نے ابو کو بلا آخر اپنا مسئلہ بتا دیا تھا۔وہ انہیں اس لڑکے کے متعلق بتانے لگا تھا جو کلاس میں فرسٹ آتا تھا لیکن وہ بہت لڑاکا تھا اور وہ اکثر اس کے ساتھ جھگڑا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ابو نے اس کی ساری بات تفصیل سے سنی تھی اور سننے کی بعد وہ اطمینان سے بولے تھے۔

یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلتا۔"جب وہ اسے اس انداز میں سمجھاتے تھے تو ان کے لہجے سے سارا لاڈ پیار ختم ہو جاتا تھا۔

مجھے ایک بات کہہ لینے دو کہ اسکول کوئی کھیلنے کی جگہ نہیں ہے۔یہ جوائے لینڈ یا سندباد نہیں ہے کہ جہاں تمہارے ماموں تمہیں جھولا دلوانے لے جائیں گے۔وہاں تم پڑھنے جاتے ہو اس لئے تمہیں وہاں پڑھنا ہی ہے اگر کوئی بچہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلتا یا وہ آپس میں کھیلتے رہتے ہیں تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔تم اپنا کام کرو انہیں اپنا کام کرنے دو اور میں تمہیں بتا چکا ہوں تمہارا کام کیا ہے پڑھائی اور بس

پڑھائی۔۔۔اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کلاس میں تمہارے کتنے دوست ہیں لیکن اس بات سے بہت فرق پڑتا ہے کہ کلاس ٹیسٹ میں تمہارے کتنے مارکس ہیں۔ کم دوست ہیں تو بھی خیر ہے لیکن کم مارکس ہیں تو تمہاری خیر نہیں۔ تمہیں سب کلاس فیلوز کو پڑھائی میں بیٹ کرنا ہے کھیل کود میں نہیں اس لئے ایسی کسی بات کی پرواہ مت کرو۔۔۔ آئندہ میں تمہیں کسی ایسی فضول یا احمقانہ بات کے لئے پریشان مت دیکھوں۔"

وہ اسے ایک بار پھر وارن کر رہے تھے۔ اسے سب باتیں سمجھ میں آ گئیں تھیں مگر ہمیشہ کی طرح کچھ باتوں کے لئے اس کا ذہن عجیب الجھن کا شکار ہوا تھا مگر چونکہ ابو کہہ چکے تھے کہ یہ "فضول" اور "احمقانہ" بات ہے اس لئے اس نے اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا تھا یا پھر جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔

☆ ☆ ☆

تم ففتھ کلاس میں ہو؟" عذیر نے از حد حیرانی میں گھر کر اس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اسے عجیب سی خجالت محسوس ہوئی۔ اگرچہ حیرانی کے یہ تاثرات اسکے لئے نئے نہیں تھے۔ وہ لوگ جو اس سے پہلی بار ملتے تھے اس طرح حیرانی کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی نا جانے کیوں عذیر کے سامنے اس امر کا اقرار کرتے ہوئے اسے شرمندگی ہوئی۔

تمہاری ایج کیا ہے؟" عذیر نے ایک اور سوال کیا تھا۔ اس کا جواب سن کر وہ پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا۔ اس نے اسکے کزن بلال کی طرف دیکھا تھا۔

میں بھی سات سال کا ہی ہوں مگر میں تو ابھی تھری کلاس میں آیا ہوں۔ سات سال کے سب بچے تھری کلاس میں پڑھتے ہیں۔ میری کلاس میں سب بچے میرے جتنے ہیں پھر تم ففتھ کلاس میں کیسے آ گئے؟"

عذیر کے تفتیشی انداز نے اسے مزید شرمندہ کیا۔ کلاس میں اور اسکول میں بھی اسے ایسے ریمارکس سننے کو ملتے تھے مگر وہاں سب لوگ عادی ہو چکے تھے۔ وہ جس اسکول میں پڑھ رہا تھا وہاں سب اس کو جانتے تھے۔ سب ٹیچرز کو بھی اس کا پتا تھا۔ اس نے پڑھائی میں ہمیشہ آؤٹ سٹینڈنگ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک ذہین و فطین بچے کے طور پر ہمیشہ اس کو سراہا گیا تھا لیکن دوسری طرف دوستوں کے معاملے میں وہ زیادہ خوش قسمت نہیں تھا۔ اس کی ساری دلچسپی کتابوں کے بعد گھر اور گھر میں موجود پالتو جانوروں اور پرندوں میں تھی پھر اب ابتداء کی طرح کلاس فیلوز اسے ہرٹ نہیں کرتے تھے لیکن وہ اس سے کتراتے ضرور تھے۔ وہ اس کے پاس زیادہ وقت تب ہی گزارنا پسند کرتے تھے جب ان میں سے کسی کو پڑھائی کے سلسلے میں کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی ایک بات تھی جس کی وجہ سے وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتا تھا۔ میتھس، انگلش یا سائنس وہ کسی مضمون میں نکما نہیں تھا۔ ہر مضمون میں وہ ہر سال ہنڈرڈ پرسینٹ مارکس لے رہا تھا۔ اسکول کے علاوہ ننھیال و ددھیال میں بھی اسے دل کھول کر سراہا جاتا تھا۔ کزنز بھی اسے پسند کرتے تھے لیکن عذیر اس کا کزن تھا نہ کلاس فیلو وہ اس کے ماموں کے پڑوس میں رہتا تھا۔ ماموں کے دونوں بیٹے کی اس سے اچھی خاصی سلام دعا تھی اس دوستی کی وجہ سے اس کی اور عذیر کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے پڑھائی کے سخت شیڈیول کی وجہ سے ننھیال جانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا لیکن وہ ہمیشہ وہاں آنا پسند کرتا تھا اور آجکل تو اس کو خوب مزا آ رہا تھا کیونکہ وہ اور امی پندرہ دن کے لئے آئے تھے۔ پہلے ہی دن اسے عذیر سے ملنا اچھا لگا تھا۔ وہ تقریباً اس کے ہی جتنا تھا لیکن اب یہ عقدہ کھل چکا تھا کہ وہ عذیر کی کلاس میں نہیں بلکہ اس کے بڑے

بھائی کی کلاس میں ہے (اسکول اگرچہ مختلف تھے مگر کلاس ایک ہی تھی)۔" تو نجانے وہ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزرنا پسند کرتا یا نہیں۔ یہی ایک وجہ تھی جو اس کے لئے شرمندگی کا باعث تھی۔ وہ اسی بات سے خائف رہتا تھا۔

میں بھی سات سال کا ہوں۔ یہ دیکھو میرا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا ہے۔" شرمندگی کی حالت میں ہی اس نے منہ کھول کر اسے یقین دلانا چاہا تھا۔ اس کے پاس ٹوٹے دانت کے علاوہ خود کو سات سالہ ثابت کرنے کا کوئی اور ثبوت نہیں تھا۔ عذیر نے بغور اس کے دانتوں کا جائزہ لیا۔ سامنے والے دانتوں میں واقعی ایک دانت جتنا خلاء تھا۔ عذیر بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے ایک عجیب طرح کا احساس کمتری محسوس ہوا تھا۔ ایک بچہ جو دیکھنے میں اس کے ہی جتنا تھا مگر اسکول میں کلاس کے حساب سے اس کے بڑے بھائی کے برابر تھا وہ دوستی جو چند گھنٹے قبل شروع ہوئی تھی وہ کس طرح برقرار رہ سکتی تھی۔

رباب آپی! یہ کہتا ہے یہ سات سال کا ہے اور ففتھ کلاس میں پڑھتا ہے۔"

عذیر نے اس کے بڑے ماموں کی سب سے بڑی بیٹی جنہیں سب بچے رباب آپی کہتے تھے کو شکایت لگانے والے انداز میں کہا گویا اسے یقین تھا کہ اس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔

وہ سچ کہہ رہا ہے۔" رباب آپی نے مسکرا کر تائید کی۔ وہ لان میں بیٹھی کوئی جرنل مکمل کر رہی تھی۔

تم سب نکموں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ تم دونوں جتنا ہے یہ بھی لیکن تم دونوں سے زیادہ ذہین ہے۔ ہر کلاس میں فرسٹ آتا ہے۔"

وہ ہمیشہ اسے اسی انداز میں سراہتی تھی۔ عذیر کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی شرمندہ کرنا چاہا تھا۔

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اسلئے مجھے بہت زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ میرے ابو کہتے ہیں کہ اگر ڈاکٹر بننا ہوتا اسی طرح زیادہ پڑھائی کرنی پڑتی ہے۔"

وہ عذیر اور بلال کو وضاحت دے رہا تھا جبکہ رباب آپی نے اس کی تعریف میں مزید کچھ الفاظ کہے تھے۔ اسے یہ تعریف اچھی نہیں لگ رہی تھی کیونکہ اس سے عذیر کی آنکھوں میں اجنبیت بڑھنے لگی تھی۔ بلال تو یہ باتیں سنتا ہی رہتا تھا اس کے لئے یہ سب باتیں تو بچے کے خرنامے سے زیادہ نئی نہیں تھیں جبکہ عذیر کو اتنی تعریف ہضم نہیں ہو رہی تھی مگر پھر بھی ان تینوں نے دوبارہ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

میں بھی بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا مگر میں اپنی کلاس چھوڑ کر ففتھ کلاس میں نہیں جا سکتا۔۔۔"

عذیر نے کھیل شروع ہونے سے پہلے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ بلال نے بھی اسی کا ساتھ دیا تھا۔

میں بھی نہیں۔۔۔" وہ بھی عذیر کے انداز میں بولا تھا۔

عذیر اور بلال ہنسنے لگے تھے جبکہ وہ شرمندہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی عمر کے باقی بچوں کی طرح تھرڈ کلاس کا اسٹوڈنٹ کیوں نہیں ہے۔ لیکن یہ شرمندگی زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کی ماموں اور خالائیں اسے اتنا سراہتے تھے کہ وہ چند دن بعد اس شرمندگی کو بھول گیا تھا مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ عذیر کے ساتھ پہلے دن والی بے تکلفی قائم نہیں رہی تھی۔ اپنے گھر واپس آجانے کے بعد وہ عذیر کو بھی بھول گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تمہیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔" اسے جماہیاں لیتا دیکھ کر ابو نے کھردرے لہجے میں کہا تھا۔ اسے نیند آرہی تھی وہ سونا چاہ رہا تھا لیکن ابو کی بات سن کر دوبارہ سے کتاب کی جانب دیکھنے لگا۔

اس کا دل اب پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اس کے پورے وجود پر تھکن غالب آچکی تھی۔ اسکا ہوم ورک مکمل ہو چکا تھا کل کلاس میں ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری بھی وہ کر چکا تھا لیکن ابو کے ٹوکنے پر وہ دوبارہ سے انگلش کی کتاب پر نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی پڑھائی کا دورانیہ بڑھ گیا تھا۔ ابو بارہ بجے تک لیکچر کی تیاری کرتے اور تب تک اسے بھی اپنے ساتھ بٹھائے رکھتے۔ اسکول کا کام ختم ہوتا تو وہ انگلش گریمر کرنے لگتا یا پھر میتھس کی پہلے سے کی گئی ایکسر سائزز کی دوبارہ پریکٹس کرنے لگتا۔ اکثر اوقات وہ اس روٹین سے بہت اکتا جاتا تھا لیکن ابو کے ڈر کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ پاتا۔ وہ اب سیونتھ کلاس میں آچکا تھا۔ چند سال پہلے اس کے گھر میں جس ننھی بہن کا اضافہ ہوا تھا وہ اب بڑی ہو چکی تھی۔ اس سال سے اسکی بہن بھی اسکول جانے لگی تھی۔ ابو نے اسے بھی نرسری یا پریپ کی بجائے ون کلاس میں داخل کروایا تھا۔ اسے اپنی بہن سے بہت پیار تھا۔ اب اگر اسکول میں کوئی بچہ اس کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا تو وہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے گھر میں اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے ایک وجود کا اضافہ ہو گیا تھا ویسے بھی اب کھیلنے کے لئے وقت کہاں رہا تھا۔ اتنی ڈھیر کتابیں۔ یاد کرنے کا الگ کام، لکھنے کا الگ کام اور پھر شام میں قاری صاحب قرآن پاک کا سبق دینے آتے تھے۔ ایک بار قرآن پاک ختم کر لینے کے بعد وہ اب دوسری بار قرآن پڑھ رہا تھا۔

وہی بچہ جو بے حد صحت مند اور گول مٹول سا ہوا کرتا تھا اب ایک لمبے مگر دبلے پتلے وجود کا مالک بن چکا تھا۔ اس کے ابو جہاں اس کی پڑھائی کے لئے ہلکان رہا کرتے وہیں اس کی امی کو اس کی صحت اور خوراک کے معاملات پریشان رکھتے تھے۔ ان کی بھرپور کوشش ہوتی کہ وہ وقت پر کھائے اور پیٹ بھر کر کھائے مگر اسے کھانے پینے سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی جبکہ اس کی بہن اس معاملے میں اس سے بہت بہتر تھی۔ بھوک لگنے پر وہ پیٹ بھر کر کھاتی اور اکثر اوقات جب وہ اپنے حصے کی چیز چھوڑ دیتا تو وہ بھی اس کی چھوٹی بہن کھا لیا کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس کی زندگی کا محور صرف اس کی کتابیں ہیں۔ ماموں بھی اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان سے باہر سیٹ ہو چکے تھے۔ زندگی میں اس کی دلچسپیاں بے حد محدود تھیں۔ کھیل کود کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسکول میں بریک کے دوران بھی وہ کلاس روم میں بیٹھا رہتا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ جس طرح کے کھیل اس کی کلاس کے زیادہ تر بچے کھیلتے تھے ایسے کھیل اسے جلدی تھکا دیتے تھے اور جیسے کھیل وہ کھیل سکتا تھا اس کے کلاس فیلوان میں کم دلچسپی رکھتے تھے۔ چینگ مین، اسکریبل اور جگسا پزل ان بچوں کے لئے کرکٹ، ہاکی اور بھاگ دوڑ والے کھیلوں کی طرح مزیدار نہیں تھے۔ اسی لئے کلاس فیلوز کے مذاق کا نشانہ بننے سے بہتر وہ کلاس روم میں بیٹھے رہنا پسند کرتا تھا۔ اگرچہ اسکا دل بہت چاہتا تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح بھاگے دوڑے شرارتیں کرے لیکن ابو پڑھائی کو اس کے سر پر اس طرح سوار رکھتے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان چیزوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتا تھا۔ اس کی جسمانی صحت اس لئے کمزور تھی۔ وہ باقی کلاس فیلوز سے عمر میں چھوٹا تھا ہی مگر دبلا پتلا ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی چھوٹا اور کمزور لگتا۔ یہ صورتحال ابو کو پریشان نہیں کرتی تھی لیکن امی بہت پریشان رہا کرتی تھیں۔

ٹیچرز۔ پیرنٹس میٹنگز میں جب اس کے ٹیچرز اس کی کارگردگی کی تعریف کرتے ہوئے اسے کمزور قرار دے کر ایکٹو ہو جانے یا غیر

نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی تلقین کرتے تو اس کی امی خاموش رہ جاتیں جبکہ ابو واضح الفاظ میں کہتے۔

بڑھتی ہوئی عمر میں بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ اس کے ہم عمر بچوں یا اس کے کلاس فیلوز کی طرف نظر بھی نہیں ڈالتے تھے۔ وہ باقی بچوں سے اس کا تقابل صرف پڑھائی میں کیا کرتے تھے اور اس معاملے میں وہ کسی بھول چوک کو معاف نہیں کرتے تھے حالانکہ ان معاملات میں وہ غلطی کا عادی نہیں تھا۔ اسکا نام کلاس ہی نہیں اسکول کے بھی ذہین ترین بچوں میں پہلے نمبر پر آتا تھا۔ ہر کلاس میں ہر ٹرم میں فرسٹ پوزیشن لینے والا اور ہر سال اسی بناء پر اسکالرشپ لینے والا وہ واحد بچہ تھا۔ اس کے ریکارڈز ن بریک ایبل تھے لیکن اس کے باوجود یہ امر حیران کن تھا کہ اس کے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کے علاوہ باقی اسکول فیلوز کے لئے اسکا چہرہ انجان تھا۔ سب اس کے نام سے واقف تھے مگر اس کو اس کے چہرے سے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس کی واحد اور سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ کتابوں کے علاوہ کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ وہ اسکول کے کسی فنکشن میں نہیں آتا تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ ایسے دنوں میں وہ چھٹی کر لیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح سے پڑھائی کا حرج ہوتا تھا حالانکہ یہ سوچ اس کی نہیں بلکہ اس کے ابو کی تھی۔ وہ ایسی باتوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ یہ صورتحال اسے تکلیف نہیں دیتی تھی تب ہی انکی کلاس میں ایک نئے بچے کا اضافہ ہوا۔ یہ بچہ "سلیمان حیدر" تھا۔

☆ ☆ ☆

تم واپس جانا نہیں چاہتے؟" شہروز نے گود میں پڑی آڑوؤں کی سب گٹھلیاں ٹیبل پر رکھ کر ٹشو پیپر کے کیس سے ٹشو پیپر کھینچتے ہوئے پوچھا تھا۔

میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ جانا تو پڑے گا نا" اس نے کشن ایک بار پھر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ شہروز کو یکدم احساس ہوا وہ بہت سست لگ رہا تھا۔ شہروز چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اس نے ٹیبل پر پڑا میگزین اٹھا لیا۔ عمر اور اس کے درمیان سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کبھی کسی تیسرے کی موجودگی میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں اگر ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں بانٹتے تھے تو دکھ کہنے کے لئے بھی انہیں ایک دوسرے سے بہتر رازدان میسر نہیں تھا اور یہی ان دونوں کی مضبوط دوستی کی بنیاد تھی

نیکسٹ سنڈے کو انوائٹ کیا ہے انکل آفاق نے۔" ارم بھابھی سب سے پہلے خبر لائی تھیں۔

مبارک ہو بھئی۔" بہروز، مہروز بھائی اور پھر پھپھو، تایا جان، تائی امی ایک کے بعد ایک لاؤنج میں چلے آئے تھے۔

شہروز نے عمر کی دوستی کا حق ادا کر دیا۔۔۔ ماشاء اللہ بہت اچھی جوڑی ہے۔" پھپھو نے سب کو ایک ساتھ سراہا تھا۔ ماحول یکدم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ سب ہی اگلے اتوار ہونے والے فنکشن کو لے کر بہت خوش تھے۔ پھپھو اور تائی امی یعنی زارا اور شہروز کی ممیز کا تو یہ فیورٹ ڈیپارٹمنٹ تھا۔ وہ خاندان اور خاندان سے باہر بچے، بچیوں کے رشتے جوڑنے میں ماہر سمجھی جاتی تھیں۔

ایک ہفتہ بھی نہیں ہے درمیان میں۔۔۔ بہت کام ہے کرنے والا" دونوں بھابھیوں کو شاپنگ کا کریز تھا۔

آفاق صاحب نے زیادہ بڑا فنکشن نہیں رکھا۔۔۔ باقاعدہ منگنی وغیرہ ٹائپ کچھ نہیں ہے بس ایک طرح کا ڈنر سمجھ لیں اور صرف ہم گھر والوں کو انوائٹ کیا ہے۔ انہوں نے رنگ وغیرہ لانے سے بھی منع کیا ہے۔"

شہروز کی ممی نے بطور خاص منور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا تھا کیونکہ انہیں یہ ساری باتیں امائمہ کی والدہ نے بتائی تھیں۔

مجھے بھی آنے کی اجازت ملی ہے یا نہیں۔ عمر نے چڑ کر کہا تھا لیکن آواز مدھم تھی۔ شہروز اور مہروز بھائی ہی سن پائے تھے اسکا واویلا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ڈیڈی عمر تو جائے گا نا ہمارے ساتھ۔" وہ عمر کا سوال اب با آواز بلند پوچھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ سب مسکرا رہے تھے۔

آف کورس جائیگا۔۔۔ ہم اپنی خوشی اپنے طریقے سے سیلیبریٹ کریں گے۔ عمر بھی جائے گا اور رنگ بھی لے جائیں گے ہم بلکہ جو بھی ضروری لوازمات ہیں گفٹس وغیرہ وغیرہ سب خرید لیں آپ لوگ۔۔۔ آفاق صاحب کو ہم خود سمجھا لیں گے۔۔۔ پریشان نہیں ہونا عمر۔"

منور صاحب کے کہنے پر عمر بھی خجالت بھری ہنسی ہنس دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسکی آنکھ کسی انجانے خوف سے کھلی تھی لحہ بھر کے لئے وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیا چیز ہے جس نے اسے نیند سے بیدار کیا ہے۔ اسکی آنکھیں نیند کے بوجھ سے اس قدر ہلکان تھیں کہ وہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا اسے پھر محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے دروازے پہ دستک دی ہے۔ اس نے کروٹ بدل کر اس دستک کو اگنور کرنا چاہا تھا مگر اسکی انتہائی کوشش کے باوجود وہ ایسا کر نہیں پایا تھا پہلی دفعہ اسے اپنے جسم کی لاچاری سے خوف آیا۔ وہ حرکت کیوں نہیں کر پا رہا تھا ایسا کیا ہوا تھا اسکے جسم کے ساتھ کہ وہ ہاتھ ہلانے سے بھی قاصر تھا یہ سب اس کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران دستک زیادہ تیزی سے ہونے لگی تھی اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا کہ جو بھی آیا ہے خود بخود واپس چلا جائے وہ اٹھ کر دروازہ نہیں کھول سکتا تھا ایک لمحے بعد دستک رک گئی تھی اس نے گہری سانس بھری تھی اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پا رہا اسے مزید خوف آیا ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیا اسکی طبیعت خراب ہو رہی تھی کیا اسے معالج کی ضرورت تھی۔ دستک ایک بار پھر ہونے لگی تھی اب کی بار اس نے اپنے خوف پہ قابو پانے کی کوشش کی اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہیے تھا۔ یہ ضروری تھا ورنہ کیسے پتا چلتا کہ کون اس سے ملنا چاہتا تھا اس نے ہمت مجتمع کر کے پھر اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اس بار بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔ وہ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ دستک دینے والے نے ناکام ہو کر دروازہ خود کھول دیا تھا وہ جو کوئی بھی تھا اسکے لئے بالکل انجان تھا۔

میرا بچہ کہاں ہے مجھے میرا بچہ چاہئے مجھے میرا بچہ واپس کر دو۔"

اور تب اسے احساس ہوا کہ کمرے کے اندر آنے والا وجود کوئی مرد نہیں بلکہ ایک عورت تھی اس نے پھر اٹھنا چاہا تھا یہ بڑی معیوب بات تھی کہ وہ ایک عورت کی موجودگی کے متعلق جاننے کے باوجود اسی چت حالت میں لیٹا رہتا۔ مگر اسکا وجود جیسے اس کے کہنے کا نہیں رہا تھا اسے خوف کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی اس نے پہلے کبھی ایسی جہالت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو بہت تمیزدار شخص کے طور پر جانا جاتا تھا۔

تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہئے تھا میرے بچے نے بھروسہ کیا تھا تم پر، اسکا تم نے یہ صلہ دیا۔ تم نے ایک بار نہیں سوچا کہ تم غلط کر رہے ہو بلکہ گناہ کر رہے ہو۔ کسی کے بھروسے کو توڑتے ہوئے تمہیں ذرا احساس نہیں ہوا کہ کسی کے معصوم وجود سے کھیلنا گناہ ہے۔" اس نے بولنا چاہا تھا وہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب سچ نہیں ہے مگر لفظ پھر جیسے کہیں اندر دب رہ گئے تھے اس نے اپنے آپکو بے انتہا بے بس محسوس کیا۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ وہ بولنا

تھا تو اسکے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ عورت جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسکی خاموشی سے اکتا کر مزید آگے بڑھ آئی تھی۔

میں اپنا بچہ لے جانے آئی ہوں اور میں اسے لے کر ہی جاؤنگی۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم اسے واپس کر دو۔"

مجھے نہیں پتا تم کیا کر رہی ہو میں تمہارے بچے کو نہیں جانتا میں تو تمہیں بھی نہیں جانتا کہ تم کون ہو تم کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو، میری طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔" اس نے یہ سب بڑی ہمت سے کہا تھا۔ اسے بولنے کے لئے بھی بہت ہمت درکار تھی۔ اسکا ہر عضو جیسے فالج زدہ ہو چکا تھا۔ اس عورت نے شاید کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

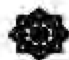
میں تمہاری منت کرتی ہوں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں اس طرح خاموش مت رہو۔ میں بہت امید لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ میرا بچہ مجھے واپس کر دو۔" وہ عورت یکدم رونے لگی تھی۔ اسے دکھ کی لہر نے اپنے حصار میں لیا۔ وہ کس قدر مجبور تھا کہ کچھ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ کھانسی سے مشابہہ تھیں جو خود اسکی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں تو وہ بھلا اس عورت سے کیا توقع کرتا کہ وہ انہیں سمجھ سکے گی۔ اس نے لمبا گہرا سانس بھرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔ اسے پہلے بھی اس قسم کا کوئی عارضہ لاحق نہیں رہا تھا۔ اتنا لاغر اس نے پہلے کبھی اپنے آپ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ اسے یکدم لگا کہ شاید وہ سمجھ پا رہا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اسی اثناء میں وہ عورت اس کے قریب ہوئی تھی اور اسے لگا اس کا سانس مزید بند ہونے لگا ہے۔ اس عورت نے اس کے گریبان کو ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔ حیرانی والی بات یہ تھی کہ اتنا قریب ہو کر بھی اس عورت کے چہرے کے خدوخال واضح نہیں ہو رہے تھے۔

گناہ گار ہو تم۔۔۔ گناہ گار اور میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرونگی۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔"

وہ عورت چلا چلا کر بولنے لگی تھی اور تب ہی اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کیوں بول نہیں پا رہا اور اس کا وجود اس کے اپنے قابو سے باہر کیوں ہو رہا تھا۔ اس نے آیت الکرسی کی تلاوت شروع کی تھی۔ اس عارضہ کا بھی ایک واحد حل تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہو جاتا۔ اس بار اسے اتنی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ آیت الکرسی کے بعد اس نے معوذتین کی تلاوت شروع کی تھی۔ اسکی صورتحال بہتر ہو رہی تھی۔

پہلے اسکی آنکھیں کھلی تھیں پھر اسکا سانس بحال ہونے لگا تھا۔ حواسوں کے بحال ہونے پر اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ سب خواب تھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ یہ ایک خواب ہی تھا۔ اسکی آنکھیں کھلتے ہی اسے اپنے کمرے کے مانوس ماحول نے حرارت بخشی تھی۔ اسکا خوف کم ہو رہا تھا اور طبیعت بحال ہو رہی تھی مگر اسکے سینے پر کچھ نادیدہ بوجھ سا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے مسلنا چاہا تھا جب ہی اسکا ہاتھ کسی چیز سے مس ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس چیز کو تھام لیا تھا۔ یہ ہی تھی وہ چیز جو حقیقت میں اسکے سینے کا بوجھ تھی۔۔۔ اس پر واضح لفظوں میں لکھا تھا۔۔۔

"عہدِ الست"



1973ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔۔۔

زندگی کے بوسیدہ، اکتاہٹ بھرے، الجھے الجھے اوراق پلٹنے کی کوشش کروں تو پہلا ورق ہمیشہ یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ میرے شعور نے زندگی سے پہلا تعارف یہاں سے ہی حاصل کیا تھا۔

73ء کا زمانہ ہے اور روپ نگر کا علاقہ۔۔۔

تم ماس مچھی کیوں کھاتے ہو؟" بیتاراؤ مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ اس کے سوال میں عجیب سا طنز ہے اور لہجے میں چٹکی سی کاٹ۔ میں بیوقوفوں کی طرح اسکا چہرہ دیکھتا ہوں اور کندھے اچکا دیتا ہوں۔

یہی چکن۔۔۔ مٹن۔۔۔ الا بلا۔۔۔" وہ مزید برا سا منہ بنا لیتی ہے۔

کیوں۔۔۔؟ تم نہیں کھاتی؟" میں اس کے قدم سے قدم ملانے کے لئے مزید لمبا ڈگ بھرتا ہوں۔ وہ مزید دو قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔

چھ۔۔۔ چھ۔۔۔ چھ" وہ زمین پر تھوکتی ہے۔ میں اس کے انداز پر ساکت رہ جاتا ہوں۔ وہ الٹے قدموں میری جانب مڑتی ہے۔ لمبے، گھنگھروؤں سے گندھے بال جھٹکا کھاتے ہیں۔۔۔ چھن چھن چھن۔۔۔ میں سمجھ نہیں پاتا کہ آواز اس کے بالوں سے آئی ہے یا دل ٹوٹ جانے کے باعث میرا سینہ گنگنایا ہے۔ بیتاراؤ کی آنکھوں سے انتہائی ناپسندیدگی چھلکنے لگتی ہے۔

تمہیں پسند نہیں ہے؟" اس کے تاثرات سے سب عیاں ہے مگر میں پھر بھی پوچھ لیتا ہوں۔

پسند۔۔۔؟" وہ نخوت سے استفہامیہ انداز میں دہراتی ہے اور ہاتھ میں پکڑی نازک چپلیں زمین پر پھینک کر اس میں پاؤں پھنسانے لگتی ہے۔ ننگے پاؤں چہل قدمی کرتے رہنے کے باعث اس کے چپلوں پر بھی مٹی منتقل ہونے لگتی ہے۔ رات بھر کہیں چند آوارہ بادلوں نے رم جھم کا سماں باندھے رکھا ہے۔ صبح کی تازہ دھوپ نے زمین کے آنچل کو خشک تو کر دیا ہے مگر مٹی کے اندر میٹھی سی نمی باقی ہے۔ قدم اٹھاؤ تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مٹی پر نہیں مٹی کی نرم ہتھیلیوں پر قدم بہ قدم چل رہے ہوں۔ فضاء میں جنگلی پھولوں اور گھاس کے ساتھ گیلی مٹی کی خوشبو بھی شامل ہے۔ ہر چیز خوشگوار ہے۔ ناگواری صرف بیتاراؤ کے چہرے پر ہے۔

یہ ہمارے یہاں کبھی نہیں بنتا۔۔۔ ہم نے کبھی اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور جہاں یہ بنتا ہو ہم کبھی وہاں سے گزرے بھی نہیں۔"

وہ مجھے بتاتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی یہ رائے خوراک کے بارے میں نہیں میرے بارے میں ہے۔ میں اس کے سامنے ہونق نہیں لگنا چاہتا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ہونق ہی لگ رہا ہوں۔

وہ چپل پہن کر آگے بڑھنے کی بجائے واپسی کے لئے پیچھے مڑ جاتی ہے اور میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہوں۔

آج بھی جب کبھی اپنا ماضی کھنگالنے کی کوشش کروں تو پہلا ورق یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے اور میں اپنے آپ کو اسی جگہ کھڑا محسوس کرتا ہوں۔ ننھے معصوم دل پر جو لرزتی کیفیت تب طاری ہوئی تھی اس کی کسک آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ بچپن کے خوف بڑے عجیب ہوتے ہیں ان کی

خاص اہمیت بے شک نہ ہوتی ہو لیکن وہ محسوس ہوتے ہیں، چبھن دیتے ہیں اور یادوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔۔۔ میرے لئے وہ مقام وہ وقت آج بھی ایسا ہی ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔۔۔

یتاراؤ سے میری پہلی ملاقات یہاں ہی ہوئی تھی۔ میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ یہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ ہم یارک شائر برطانیہ کے رہنے والے تھے جہاں ویک فیلڈ میں کوئلے کی کانوں سے دو ہٹ کر ہمارا بڑا سا فارم ہاؤس تھا۔ یہ میرا اور گرینی کا انڈیا کا پہلا ٹور تھا۔ گرینڈ پا یہاں پہلے بھی آ چکے تھے اور اب بھی تقریباً ایک سال سے یہاں ہی رہ رہے تھے۔ برٹش آرکیٹکچرل ٹیکنالوجی پروگرام کے ممبر کی حیثیت سے وہ یہاں کسی پروگرام میں حصہ لے رہے تھے۔ یہ کافی بڑا پروجیکٹ تھا اور گرینڈ پا سارا دن سائٹ پر مصروف رہتے یا اپنے آفس میں پنسل اور گراف پیپر کے ساتھ مگن نظر آتے تھے۔ میں اور گرینی فطرت کی خوبصورتی سے مالا مال روپ نگر سے متاثر تھے لیکن فراغت ہمیں تھکانے لگی تھی تب گرینی نے اس کا ایک اچھا حل ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے گھر کے دالان میں ایک کوچنگ سینٹر کھول لیا۔ یہ گھر ہماری رہائش کے لئے دیا گیا تھا اور کافی بڑا تھا۔ کوچنگ سینٹر کے قیام کے چند دنوں بعد ہی ہمارے دالان میں مقامی بچے بھاگتے دوڑتے نظر آنے لگے۔ میستاراؤ بھی اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ انگلش اور جغرافیہ پڑھنے کے لئے آتی تھی۔ وہ گرینڈ پا کے انڈین کولیگ کی بیٹی تھی۔ وہ نا صرف بے حد پرکشش تھی بلکہ اس کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی طرحداری تھی۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود سب بچے آپس میں گھل مل گئے تھے لیکن یتاراؤ کسی کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ شہزادیوں کی سی آن بان لئے زیادہ تر خاموش بیٹھی رہتی۔ وہ عمر میں بھی باقی بچوں سے بڑی تھی اور اس کے انداز میں بھی نخوت جھلکتی تھی جس کی بنا پر باقی بچے اسے ناپسند کرتے تھے لیکن میرا دل نجانے کیوں اس سے دوستی کرنے کے لئے مچلتا رہتا۔

گرینی ویک اینڈ پر ہمیں چہل قدمی کے لئے جنگل کی جانب لے جاتی تھیں دراصل روپ نگر ایک بڑا ہی خوبصورت علاقہ تھا۔ اس کا ظاہری روپ سبزی مائل تھا اور پسماندگی اور سادگی اس کے ہر انداز سے جھلکتی تھی۔ جنوبی پنجاب انڈیا میں واقع یہ خوبصورت علاقہ ستلج کے پانی کی مہمان نوازی سے خوب لطف اندوز ہوتا تھا اسی لئے سبزہ طمانیت کی طرح اس کے چہرے پر بکھرا تھا۔ یہاں کے باسی اس کی لہلہاتی فصلوں کے روپ میں روپ نگر کی فراخدلی سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی پیشانی پر تیوریاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتی رہتی۔ روپ نگر کا روپ اتنا سادہ تھا کہ جیسے کوئی صحتمند ویلش لڑکی سنہرے بالوں کو چھپائے اپنے حسن سے لاپرواہ کوئی علاقائی گیت گاتی اپنے کام میں مصروف ہو۔ روپ نگر کے اس روپ کے سامنے ورڈز ورتھ کی سولٹری ریپر بھی پانی بھرتی نظر آتی۔ یتاراؤ پہ نجانے کیوں اس نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

ہمارے ساتھ پکنک پر جاتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ سپاٹ چہرہ بنائے رکھتی۔ اس کی مسکراہٹ چاند گرہن کی طرح تھی یعنی سال میں کبھی کبھار اور مجھے نجانے کیوں چاند گرہن سے اس درجہ الفت محسوس ہونے لگی تھی کہ میں باقی بچوں کو چھوڑ چھاڑ اس چاند گرہن کے درشن کی خاطر یتاراؤ کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی ویک اینڈ تھا جب میں بیتاراؤ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ خود سے کم بات کرتی تھی مگر میری باتوں کا جواب دے دیتی تھی۔ اس کے ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس نے ہمیشہ اس چیز کے لئے ناپسندیدگی ظاہر کی تھی جو مجھے پسند تھی۔۔۔ جگسا پزل، فٹ بال، کامکس، ٹی وی۔۔۔

اسی لئے جب اس نے مجھ سے میری فیورٹ ڈش پوچھی تو میں نے فوراً "چکن" کا نام لیا تھا جس پر اس نے بھنویں اچکائیں اور پھر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ نجانے اسے کیا پسند آتا تھا۔ وہ ہم میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ ہم سب اگر چہل قدمی کرتے تو وہ ملازم کو کہہ کر رسی کا جھولا لٹکوا لیتی اور جھولا جھولتی رہتی اگر ہم کھیلنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوتے تو وہ چہل قدمی کے لئے آگے نکل جاتی اور دور کسی سنسان گوشے میں جا کر تھا تھیا۔۔۔ تھیا تھیا کرتی رہتی، ناچتی اور گنگناتی رہتی۔ وہ کوئی ڈانس فارم سیکھ رہی تھی۔ یہ بات اس کے چھوٹے بھائی نے مجھے بتائی تھی۔ اس کے چکن کے بارے میں ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ میں اس کی تلاش میں جانے کی بجائے باقی بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا لیکن میں پتا نہیں کیوں اس کے ساتھ دوستی کرنے کے لئے اس قدر بے چین تھا۔ وہ مجھے جھولے پر بیٹھی نظر آئی۔ گرینی کچھ بچوں کے ساتھ بکھرے ہوئے جنگلی پھول چن رہی تھیں۔

بلی۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔ دیکھو خدا نے ہمیں کتنے خوبصورت تحفے دیئے ہیں۔" انہوں نے مجھے پکارا۔ میں ایک نظر جھولا جھولتی بیتاراؤ پر ڈال کر ان کی جانب آ گیا۔ انکے ہاتھ میں ٹوکری تھی جس میں مختلف رنگوں کے پھول پتے تھے۔ میں عدم دلچسپی سے ان کی سرگرمی میں حصہ لینے لگا۔

مسز گرانٹ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" لکشمی نے انگلی سے اشارہ کر کے پوچھا تھا۔ درخت کے تنے کے گرد گھاس میں کچھ چھپا تھا۔ گرینی نے ہاتھ سے گھاس کو ہٹایا۔

ارے واہ۔۔۔ یہ مشرومز ہیں۔۔۔ آؤ بچو۔۔۔ دیکھو یہ سب کتنی پیاری ہیں۔۔۔ اور کتنی زیادہ بھی۔"

گرینی سب کو متوجہ کر رہی تھیں۔ سب بچے مزید پر جوش ہو کر اب مشرومز کا خاندان دیکھنے لگے اور مشرومز شاید بچوں کو۔۔۔ میں نظر بچا کر ایک بار پھر بیتاراؤ کے پاس آ گیا۔ اس نے وہی سرد سی نگاہ میری جانب اچھالی۔

میں اس کے عقب میں جا کر اسے جھولا جھلانے لگا تھا۔۔۔ صد شکر اس نے مجھے روکا نہیں۔

تم میری برتھ ڈے پر آؤ گی؟" میں نے اسے مخاطب کرنے میں پہل کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔ میں اور گرینی میری برتھ ڈے پارٹی کے لئے بہت پر جوش تھے۔ بیتا نے چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

ہم کیسے آ سکتے ہیں۔۔۔ ہم نان ویج نہیں کھاتے۔" وہ لمحہ بھر کے لئے رکی پھر مزید گویا ہوئی۔

ہم مسز گرانٹ کے پاس صرف پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔۔۔ ہم نے کبھی تمہارے گھر سے پانی بھی نہیں پیا ہے کچھ کھانا تو دور کی بات ہے۔۔۔ پارٹی میں آنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔" اس لمحے اس کی زبان ہی نہیں اس کی آنکھیں بھی سفاک لگ رہی تھیں۔

تمہیں کیا پسند ہے۔۔۔ اگر چکن ناپسند ہے تو۔۔۔ نوڈلز۔۔۔ فرنچ فرائز۔۔۔ یہ سب بھی ہو گا۔۔۔ گرینی خود بنائیں گی۔" میں نے

اسے مطلع کیا تھا۔

ہم نے کہا نا۔۔۔ ہم نہیں آ سکتے۔۔۔ ہم ایسے لوگوں کے ساتھ مراسم نہیں رکھتے جو نان ویج کھاتے ہوں۔۔۔ ہمارے دھرم میں یہ سب ناپسندیدہ ہے اور ہماری ممی جی بھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔" اس نے گردن جھٹکی تھی۔ میں جھولے کی رسی پکڑے اس کے سامنے آ گیا۔ جھولے کی رفتار آہستہ تھی۔ اس نے میرے چہرے کی جانب دیکھا۔

تم ایک بار ان سے بات کر کے دیکھو۔" میرا اشارہ اس کی ممی کی طرف تھا۔ میں منت سماجت پر اور وہ جھولے سے زمین پر اتر آئی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن چہرے کے تاثرات ناگوار تھے جو مجھے سب کچھ باور کروا رہے تھے۔

جیتا! ہم دوست نہیں بن سکتے؟" میں ایک بار پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

ہم دوست کیسے بن سکتے ہیں۔۔۔ میں نے کہا نا ہم نان ویج نہیں کھاتے۔"

اسکا انداز پہلے سے بھی زیادہ سفاک ہو گیا تھا۔ سبزی خور ہونے میں نجانے ایسا کونسا فکر کا حوالہ چھپا تھا۔

خوراک کی ضرورت جسم کو ہوتی ہے۔۔۔ روح کو نہیں۔۔۔ کھانے پینے سے دوستی پر فرق نہیں پڑا کرتا۔"

میں نے اتنی بڑی بات کر دی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ رک گئی۔

ہم یہ سب نہیں جانتے۔۔۔ لیکن ہمیں اتنا ضرور پتا ہے کہ ہمیں کسی نان ویج کھانے والے سے دوستی نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ جو نان ویج کھاتے ہوں خصلتاً برے انسان ہوتے ہیں۔ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کسی دوسرے جاندار کو قتل کر دینے والے لوگ مجھے پسند نہیں۔۔۔ ایسے لوگ کسی سے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اپنی خوراک کے لئے دوسرے جاندار کو مارنے والے انسان کے اندر برائی کی قوتیں اپنا گڑھ بنا لیتی ہیں۔ نان ویج کھاتے رہنے سے یہ برائی کی قوتیں اتنی زیادہ اور طاقتور ہو جاتی ہیں کہ ایسے انسان کسی کے ساتھ وفادار نہیں رہ سکتے۔۔۔ وہ وفاداری کے قابل ہی نہیں رہتے۔۔۔ بات اصل میں یہ نہیں ہے کہ ہم تمہیں دوست نہیں بنا سکتے۔۔۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تم کسی کے دوست بن ہی نہیں سکتے۔۔۔ تم کسی سے وفادار ہو ہی نہیں سکتے۔۔۔ مجھے دوست صرف وفادار اچھے لگتے ہیں جو تم کبھی نہیں ہو سکتے۔۔۔ تمہارے ساتھ دوستی کرنے سے بہتر ہے میں کسی گھوڑے سے دوستی کر لوں جو سبزی خور بھی ہوتا ہے اور وفادار بھی۔"

اس نے اپنی بات نہیں مکمل کی تھی مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نامکمل کر دیا تھا۔ وہ غرور و تکبر سے تنی گردن لئے آگے بڑھ گئی تھی اور میں وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ فضا میں پھیلی ستلج کے فراخدل پانیوں کی مہک جو مجھے بہت بھلی لگا کرتی تھی یکدم کڑوی سی لگنے لگی تھی۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔۔۔

☆ ☆ ☆

ڈینئیل تم میرے دوست بنو گے نا۔۔۔ بہترین دوست" میں نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہلایا تھا پھر ان کی نرمی کو محسوس کر کے اپنی انگلیاں اس میں ڈبو دی تھیں۔ میں بہت محبت سے اس کی پشت کو تھپتھپا رہا تھا۔ وہ اپنی تھوتھنی اور دم ہلانے لگا۔ مجھے لگا اس نے

میری بات کا جواب دیا ہے۔ مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ میں ہی اس کے ساتھ خوش نہیں تھا وہ بھی میرے ساتھ خوش تھا۔ میں نے اسے گود میں بٹھالیا۔ گرینڈ پا کے ڈرائیور نے اسے خوشبودار شیمپو سے نہلایا تھا اور بہت محنت سے اس کے بالوں میں کنگھا کیا تھا۔ گرینی نے اس کی گردن کو سجانے کے لئے ایک خوبصورت بینڈ تیار کیا تھا جو اب اس کی گردن کے گرد بندھا تھا۔ میں نے اسے گرینی کا پرفیوم بھی لگایا تھا۔

یہ جرمن نسل کا ایک چھوٹا سا کتا تھا۔ گرینڈ پا کے ایک آسٹریلین کولیگ نے اسے تحفتاً میرے کھیلنے کے لئے دیا تھا۔ گرینڈ پا چے اس کو لیگ کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور وہ ڈینئیل کو شکریہ کے ساتھ لوٹا دینا چاہتے تھے لیکن میری ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے اسے واپس نہیں کیا تھا۔ میں ڈینئیل کی وجہ سے بہت خوش تھا۔

تم آج کے دن ہمارے پاس آئے ہو اسی لئے ہم تمہاری سالگرہ ہر سال اسی دن منایا کریں گے۔۔۔ 18 اپریل ہی تمہاری سالگرہ کا دن ہوگا۔"

میں اس کے بالوں والے جسم کو چوم رہا تھا۔ ڈرائیور انکل اس کے لنچ کا انتظام کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک پیالے میں دودھ ڈالنا شروع کر دیا تھا اور وہ ساتھ ساتھ مسکرا بھی رہے تھے۔ وہ ہمارے گھر کے اکثر کام بہت خوش ہو کر کرتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ انکا نام سکھوندر تھا اور میں ان کے ساتھ بے تکلف تھا۔

یہ تمہارا اچھا دوست ضرور بنے گا۔۔۔ دوستی کرنا اور اسے مرتے دم تک نبھانا اس کی خصلت میں شامل ہے۔۔۔ سیانے کہتے ہیں کتا ایک وفادار جانور ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں سمجھایا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان زبان کا بڑا مسئلہ تھا۔ وہ مکمل میری بات نہیں سمجھ پاتے تھے اور میں مکمل ان کی لیکن ٹوٹا پھوٹا جو بھی ہم بول پاتے اس سے مفہوم واضح ہو جاتا تھا۔ میں "وفادار جانور" پر چونکا۔ جیاراؤ کا طعنہ یکدم یاد آگیا تھا۔ اس کے لفظوں کی کرچیاں ابھی تک میرے دل میں چبھ رہی تھیں حالانکہ یہ چوبیس گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ ڈرائیور انکل نے سارا دودھ پیالے میں ڈال دیا تھا۔ ان کے اشارہ کرنے پر ڈینئیل میری گود سے نکل کر اس کی سمت لپکا۔ چند لمحوں بعد وہ پیالے میں منہ مارنا شروع ہو چکا تھا۔

ڈینئیل نان ویج کھالیتا ہے؟" میں نے ڈرائیور انکل سے پوچھا۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔ کبھی کبھی ان کو دیکھ کر لگتا تھا وہ مسکرانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کے چہرے کا مستقل رنگ ہی یہ ہے۔ انہوں نے پھیلے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا یعنی وہ میری بات نہیں سمجھ پائے تھے۔ میں نے منہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

نان ویج۔۔۔ نان ویج" میں نے دہرایا۔ وہ ابھی بھی نہیں سمجھے تھے۔ ڈینئیل ہم سے لاتعلق اپنی پیٹ پوجا میں مصروف تھا۔ ڈرائیور انکل کو اتنا ہی سمجھ آیا تھا کہ میں ڈینئیل کی خوراک کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔

چکن۔۔۔ مٹن۔۔۔ فش" میں نے مزید وضاحت کی۔ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

ہاں تے ہور کیہ۔۔۔ سب کھائے گا۔۔۔ یہ کتا بڑی سکھ نسل کی چیز ہوتا ہے جی۔۔۔ یہ ہندو مسلم تھوڑی ہے کہ پیٹ سے جڑے معاملات بھی سوچ سوچ کر نبٹائے۔۔۔ سب کھلائیں گے اس کو۔"

میں نے سر ہلایا۔ اب کی بار مجھے ان کی مکمل بات سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن مجھے وضاحت درکار نہیں تھی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ "سب کھائے گا" میں نے سمجھ لیا تھا۔ ڈینئیل نے دودھ ختم کر لیا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ گود میں بھر لیا۔ اسکے منہ کے گرد دودھ کی جھالریں بن گئی تھیں۔ میں اسے صاف کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نجانے میرے دل میں کیا سمائی میں نے اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ میرے پاؤں کے پاس منہ مارنے لگا۔

میں تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی پڑھا تھا کہ کتا ایک وفادار جانور ہوتا ہے اور ڈرائیور انکل کہہ رہے تھے کہ وہ نان ویج کھاتا ہے تو پتا کیوں نان ویج کھانے والوں کو وفادار نہیں سمجھتی تھی۔ میں گھر کے اندر کی طرف بھاگا۔ آخری کونے میں بڑا سا کچن تھا۔ میری منزل وہی کچن تھا۔ میں نے ریفریجریٹر کھول کر دیکھا وہاں ہمیشہ چکن یا میٹ وغیرہ موجود رہتا تھا۔ میں اس میں سے کچھ مقدار لینا چاہتا تھا لیکن وہ جم چکا تھا۔ میں نے چھری کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے چھری نظر نہیں آئی تھی لیکن ایک کونے میں لگے نل کے نیچے کھلے منہ کے برتن میں مچھلی پڑی تھی۔ یہاں اکثر تازہ مچھلی آتی رہتی تھی۔ ہمارا کُک یا کبھی کبھی گرینی بہت مزیدار مچھلی کے قتلے اور ٹماٹر کی کھٹی ساس بناتے رہتے تھے۔ میں نے بنا سوچے سمجھے وہی مچھلی اٹھالی تھی۔ اس میں بساند تھی اور نل کے نیچے پڑے ہونے کے باعث اس میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ میں دوبارہ بھاگ کر واپس باہر آ گیا۔ ڈینئیل باغیچے میں گھاس پر لوٹنیاں لگا رہا تھا۔

ڈینئیل۔۔۔ڈینئیل۔۔۔یہاں آؤ" میں نے اسے پچکارا۔ وہ اپنا نام پہچاننے لگا تھا۔ میں نے وہ مچھلی اس کے آگے ڈال دی۔ وہ مچھلی کے پاس آ کر اسے سونگھنے اور منہ مارنے لگا۔ اس نے اسے منہ میں پکڑ کر چند بار اچھالا اور اپنی سامنے والی ٹانگوں سے اسے ہلایا جلایا بھی لیکن اس کام کے چند لمحوں بعد وہ مچھلی کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے گھاس میں کھیلنا تھا۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔

اسے نان ویج نہیں چاہیئے تھا"

☆ ☆ ☆

مجھے پتا ہے یہاں تمہارا دل نہیں لگ رہا۔۔۔ تم اداس ہو گئے ہو نا۔۔۔ چند مہینوں کی بات ہے پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔"

گرینڈ پا نے مجھے تسلی دی۔ مجھے اندازا تھا وہ میرا الجھا ہوا چہرہ بھانپ کر اندازے لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مجھے نجانے کیوں اپنے مسائل اپنے منہ سے بتاتے ہوئے ہمیشہ کچھ وقت لگ جاتا تھا۔

میں وعدہ کرتا ہوں ہم ہیلووین سے پہلے واپس چلے جائیں گے۔" اب کی بار انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا اور ساتھ ہی ہارن پر ہاتھ رکھا۔ فوکسی کے اردگرد جمع ہونے والے بچے مجھے دیکھ کر مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ ہم نزدیکی بازار سے کچھ خریداری کر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ مجھے کچھ رنگین پنسلیں درکار تھیں۔ گرینڈ پا نے اپنی ضرورت کی بھی کچھ چیزیں خریدی تھیں پھر ہمیشہ کی طرح مجھے ٹھیلے والی عورت سے کٹے ہوئے امرود لے کر دیئے تھے۔ ٹھیلے والی عورت نجانے ان پر کیا چھڑکتی تھیں کہ ان کا ذائقہ مزید اچھا ہو جاتا تھا۔ وہ امرود ابھی بھی کاغذ کے لفافے میں بند میری گود میں جوں کے توں پڑے تھے حالانکہ اب ہم واپس جا رہے تھے۔

تم نے ابھی تک ایک لقمہ بھی نہیں لیا ہے۔۔۔ جہاں تک مجھے پتا ہے یہ کافی پسند ہیں نا تمہیں؟"

انہوں نے بھورے بھورے ننگ دھڑنگ بچوں کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد گاڑی کو کچے راستے سے اب ایک پتلی سی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چڑھا لیا تھا۔ میں نے ان کے سوال پر ان کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

میرا دل نہیں چاہ رہا گرینڈ پا۔۔۔ یہ میں نے گرینی کے لئے رکھے ہیں" میں نے انہیں بتایا تھا اور پھر گلاس ونڈو سے باہر دیکھنے لگا۔ روپ نگر کا ظاہری روپ سبزی مائل تھا جبکہ یہاں بسنے والے براؤن رنگت کے حامل تھے لیکن اس وقت مجھے کچھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔ میرا دل عجب کشمکش میں گھر گیا تھا۔ بیتا راؤ نے میری دوستی کا دم بھرنے سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ میرا دل توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہماری گاڑی جھٹکے لے لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔ آس پاس کے کچے گھروں میں بسنے والے کسانوں کے کچھ دلیر بچے ابھی بھی گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ جس بچے کا ہاتھ گاڑی کو چھو جاتا وہ فخریہ انداز میں باقی بچوں کو دیکھنے لگتا۔ مجھے آج ان کی شرارتوں میں بھی کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ بچے بھی شاید کسی نان ویج کھانے والے کو ناپسند کرتے ہوں اور مجھ سے دوستی میں قطعاً دلچسپی نہ رکھتے ہوں یہ سوچ کر میں ان کی مسکراہٹوں اور ان کے ہلتے ہاتھوں کا جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔

ہیلوویئن کے لئے اس دفعہ زبردست سی منصوبہ بندی کریں گے۔۔۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے لئے چیزوں کو پراہتمام اور حیران کن بنا سکوں۔"

وہ مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں یقیناً اپنا آپ میری مردہ دلی کا باعث لگ رہا تھا۔ ہمیں ان سے شکایت رہنے لگی تھی کہ وہ اپنی مصروفیت میں ہمیں اگنور کر رہے ہیں۔ دراصل انہیں صبح سے شام تک بہت کام ہوتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ جو وقت بھی گزارتے اس میں ہمیں بھرپور خوشیاں اور اپنی تمام تر توانائی فراہم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں میری خاموشی سے یقیناً چڑ ہو رہی تھی۔

گرینڈ پا!" میں نے یکدم انہیں اپنی الجھن میں شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ "آپ نے ڈینیل کو دیکھا۔۔۔ وہ بہت پیارا ہے نا" میں نے ابتداء کی تھی۔ انہوں نے سر ہلایا۔

میں تمہارے لئے خوش ہوں بالآخر تمہیں اس سرزمین پہ ایک اچھا اور پیارا دوست مل گیا۔"

آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے گھوڑا لے کر دیں گے۔۔۔ عربی نسل کا۔۔۔ سفید۔۔۔" مجھے انکا وعدہ یاد آیا تھا۔ انہوں نے سر ہلایا اور مسکرائے۔

مجھے یاد ہے۔۔۔ میں تمہیں ضرور لے کر دونگا۔۔۔ تم اسکا بہت خیال رکھنا۔ وہ جب تین برس کا ہو جائیگا تو ہم اسے ڈربی میں دوڑائیں گے۔۔۔ میں اس کی لگام پکڑ کر اسے ریس کورس لے جاؤنگا۔۔۔ وہ ہمیشہ جیت کر واپس آیا کرے گا۔۔۔ تمہارا گھوڑا تمہیں کبھی مایوس نہیں کرے گا۔۔۔ ایک وفادار پالتو جانور تمہیں زندگی بھر خوشگوار تجربات سے دوچار کرتا رہے گا۔"

یہ وہ بات تھی جسے وہ ہمیشہ دہرانا پسند کرتے تھے۔ میں انکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

گھوڑا وفادار جانور ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں مگن تھے۔

بے حد۔۔۔ مرتے دم تک مالک کا دم بھرتا ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں جیسے سیلوٹ بھی کر ڈالا تھا۔

گرینڈ پا! گھوڑا نان ویج کھاتا ہے؟" میرے تذبذب کی اصل وجہ تو یہ سوال تھا۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ سبزی خور ہوتا ہے۔ تم اس کی خوراک کے بارے میں فکر مند مت ہو۔۔۔ یہ ڈیوٹی ہم تمہاری گرینی کو دیں گے۔ تم جانتے ہی ہو وہ ہم سب کے کھانے پینے کا کتنے اچھے سے خیال رکھتی ہیں۔"

وہ میرے مزاج کی شگفتگی کو بحال کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ بول رہے تھے۔ میں نے اب کی بار سر ہلایا نہ کچھ بولا۔ میں اگلا سوال پوچھنے سے پہلے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

ڈینیل بھی نان ویج نہیں کھاتا؟" دونوں باتوں کا تعلق جیتا راؤ کی دوستی تھیوری سے ہی ملتا تھا۔ گرینڈ پا نے بغور مجھے دیکھا۔

بھوک لگی ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ میں اب بھی فوراً کچھ نہیں بولا تھا۔ مجھے عجیب طرح کے احساسات نے گھیر رکھا تھا۔ جیتا راؤ کا چہرہ یاد آتا تو ان احساسات کی شدت میں اضافہ ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ میں مزید الجھ گیا تھا۔ گرینڈ پا نے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

مجھے چکن نہیں چاہیے۔" میں نے اپنی پلیٹ گرینڈ پا کی جانب کھسکا کر بنا گرینی کی طرف دیکھے اپنا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ میرا انداز بجھا بجھا سا تھا جو مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ گرینی کو محسوس نہ ہوتا۔

مجھے چکن ہی چاہیے۔" اس سے پہلے گرینی مجھے ٹوکتیں گرینڈ پا نے فوراً اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔ ٹیبل پر چکن کے تلے ہوئے قتلوں کے علاوہ سوپ اور مختلف سبزیوں کی سلاد بھی موجود تھی۔ میں نے سوپ کا پیالہ اپنی جانب کر لیا اور چپ چاپ اس میں موجود کورن کے دانوں کو دیکھنے لگا۔

چکن کا ذائقہ زبردست ہے۔" گرینی کے اشارہ کرنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کیا تھا۔ آج کا ڈنر خانساماں کی بجائے خود گرینی نے تیار کیا تھا۔ چکن کے قتلے اور ٹماٹر کی کھٹی ساس مجھے اور گرینڈ پا کو بےحد مرغوب تھی۔ گرینڈ پا چکن کی تعریف کر رہے تھے۔ میرا جی للچایا مگر جیتا راؤ کی تکلیف دہ باتیں بھی یاد آ گئیں۔

تم کسی سے وفادار ہو ہی نہیں سکتے۔۔۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو۔۔۔ بات اصل میں یہ ہے۔۔۔ مزے کا سوپ ہے۔۔۔ بہت مزے کا سوپ ہے۔"

میں نے گھبرا کر سوپ کا چمچ منہ میں رکھا تھا۔ سوپ ابھی گرم تھا۔ مجھے اپنا منہ جلتا محسوس ہوا مگر میں نے تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ میں ان دونوں کے سامنے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جیتا کی گفتگو نے بےحد الجھا دیا تھا۔

چکن نہیں لیا تم نے۔۔۔ دوپہر کو تم نے سینڈوچ بھی یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ اس میں چکن ہے۔۔۔ اب بھی نہیں چاہیے۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔ تمہیں اعتراض کیا ہے۔۔۔ مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟"

کوئی مسئلہ نہیں ہے گرینی۔۔۔ میں نے نان ویج چھوڑ دیا ہے۔۔۔ آپ میرے لئے۔۔۔"

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ گرینی نے ہاتھ میں پکڑا فورک پلیٹ میں رکھ دیا اور غرا کر بولیں۔

کیوں۔۔۔؟" مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ میں سوپ کی طرف متوجہ رہا۔

نان ویج کیوں چھوڑ رہے ہو تم؟" انہوں نے دہرایا۔ "تمہارے بڑھتے ہوئے جسم کو پروٹین کی ضرورت ہے۔۔۔ اگر تم یہ سب چھوڑ دو گے تو بونے بن کر رہ جاؤ گے۔۔۔ یہ سب فوڈ آئٹم پروٹین کا ذریعہ ہیں۔۔۔ مسٹر گرانٹ ایک منٹ توجہ دیں گے آپ۔"

انہوں نے گرینڈ پاپا کو بھی درمیان میں گھسیٹنے کی کوشش کی۔

چکن بہت اچھا ہے بلی۔۔۔ تم تھوڑا لے کر دیکھو۔" گرینڈ پا نے کسی کی جانب دیکھے بنا کہا اور اپنے کھانے کی رفتار کو بھی کم نہیں کیا تھا۔ میں نے سوپ کا ایک اور چمچ بھر کر منہ میں رکھا اور کن اکھیوں سے گرینی کو دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہی تھیں۔ میں ان کے آگے خود کو ہمیشہ بے بس محسوس کرتا تھا۔ انکا میرا پیار بڑا گم صم سا تھا۔ وہ مجھے بہت ٹوکتی تھیں، بہت ڈانٹتی تھیں اور بہت کم میری بات بنا وہ بحث کے مانتی تھیں مگر میں اگر بیمار پڑ جاتا یا سست نظر آتا تو ان کی نیند اڑ جاتی تھی۔ یہی صورتحال تب ہوتی تھی جب میری کھانے پینے کی روٹین میں کوئی کمی بیشی ہوتی تھی۔ اس لئے انہیں اب بھی بے چینی سی شروع ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا وہ مجھے زبردستی چکن کھانے پر مجبور کر دیں گی اسی لئے میں تیزی سے سوپ پینے میں مگن ہو گیا تھا کہ بھوک کو جلد از جلد ختم کر کے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ جاؤں۔

میری بات سن رہے ہو تم۔۔۔ میں دیکھ رہی ہوں بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو تم۔۔۔ اسی لئے میں یہاں آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔۔۔"

ان کی آواز مزید بلند ہوئی تھی۔

تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں رہی کہ اپنے بڑوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔۔۔ یہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔"

وہ فربہی مائل تھیں اور غصے میں مزید فربہ دکھنے لگتی تھیں۔ گرینڈ پا اس حالت میں ہمیشہ انہیں "پاپ کارن" بلاتے تھے۔ انکا غصہ دیکھ کر مجھے یکدم رونا آنے لگا۔ میں سوپ کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پینے لگا۔

کم آن میگی۔۔۔ بچہ ہے۔۔۔ بھوک لگے گی تو کھا لے گا سب کچھ۔۔۔ تم ڈنر کرو۔۔۔ کیوں فکر کرتی ہو۔۔۔ یہ چکن کھاؤ نا۔"

گرینڈ پا نے انہیں راضی کرنا چاہا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی پلیٹ پر جھکی تھیں پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔

یہ سوپ جو تم پی رہے ہو نا۔۔۔ یہ بھی نان ویج ہے۔۔۔ پتا ہے کہ نہیں۔۔۔" انہوں نے آنکھیں گھمائیں تھیں۔ میری آنکھیں پھر بھاری ہونے لگیں۔

مسٹر گرانٹ۔۔۔! بتائیں ذرا اپنے لاڈلے پوتے کو۔" سوپ میں ساس ڈالتے ہوئے گرینی کا انداز مزید طنزیہ ہو گیا۔

سوپ بھی نان ویج ہوتا ہے کیا؟" میں نے ملی جلی کیفیت میں گھر کر گرینڈ پا کو دیکھا یہ بات حتمی تھی کہ گرینی جھوٹ نہیں بولتی تھیں۔

ارے نہیں بھئی۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ تم ختم کرو یہ سوپ۔" انہوں نے مجھ سے کہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گرینی کو کچھ اشارہ کیا جو میں نے فوراً بھانپ لیا۔ میرا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ کب سے پلکوں کی باڑھ لئے روک کر بیٹھے آنسو پھسل کر گالوں پر آ گئے۔ میں نے سوپ کا پیالہ

سامنے سے ہٹا دیا۔

میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں۔۔۔ بڑا ہو گیا ہوں۔۔۔ میں نے کہا نا میں نان ویج نہیں کھاؤں گا تو آپ لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آتا۔۔۔ کیا میں اپنی مرضی سے کچھ کھا بھی نہیں سکتا۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں مجھے ٹوکتے میں اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ کچن کے بعد کافی وسیع وعریض ہال تھا۔ میں اس ہال سے گزر کر باہر لان میں آ گیا تھا۔ یہاں کافی خنکی تھی لیکن میں نے پرواہ نہیں کی۔ میں خاموشی سے درخت کے کٹے ہوئے تنے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ دن کے وقت جو ماحول خوشگوار لگتا تھا رات کے وقت وہیں عجیب سا خوف چھایا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے اردگرد جھینگروں کا مشاعرہ ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا جس سے مجھے مزید خوف ستانے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے اٹھ جاتا میں نے گرینڈ پاء کو آتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے پُرحرارت لمس اپنے اردگرد پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ گرینڈ پاء نے میری جیکٹ میرے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ میں نے منہ مزید بسور لیا یہ میری مصنوعی ناراضی تھی۔

مجھ سے ناراض ہو؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے یقیناً میرے آنسو بھی دیکھ لیے تھے۔

گرینی کبھی کبھی مجھے بھی بہت غصہ دلا دیتی ہے۔۔۔ جیسے آج انہوں نے تمہیں دلا دیا۔۔۔ وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔"

انکا اپنا ایک سادہ سا مخصوص انداز تھا۔ میں خاموش رہا حالانکہ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں گرینی سے زیادہ اپنے آپ سے خفا ہوں کیونکہ میں لاتعداد برائی کی قوتوں کا گڑھ بن چکا ہوں۔

جب لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ بہت اشتعال کا باعث بننے لگتے ہیں۔ انہیں بلاوجہ ہر چیز پر تحقیق کرنے کا شوق ہو جاتا ہے۔۔۔ کیوں، کیسے، کس لیے۔۔۔ انہیں یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ انہیں چھوٹے بچوں کی طرح ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیئے۔" وہ بات کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں گردن بھی ہلا رہے تھے۔

بوڑھے لوگ کتنے بھی بوڑھے ہوں۔۔۔ وہ بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔۔۔ ان کی محبت کے بارے میں مشکوک ہونا فضول ہے۔ محبت کو شکوک اور وسوسے راس نہیں آتے۔۔۔ محبت اور مذہب میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے

میں نے بنا تاثر دیئے دیکھنے کا عمل جاری رکھا۔ گرینڈ پاء کی وضاحت بیکار تھی۔ میں گرینی کی محبت کے متعلق کسی وسوسے کا شکار نہیں تھا۔ بے شک میری ان کی کم بنتی تھی لیکن میں ان کی وجہ سے کبھی رویا نہیں تھا۔

میں جانتا ہوں گرینڈ پاء۔۔۔ گرینی بہت اچھی ہیں۔۔۔ لیکن وہ مجھ پر دھونس کیوں جماتی ہیں۔۔۔ میں نے کہا نا نان ویج چھوڑ چکا ہوں میں۔ مجھے چکن نہیں چاہیئے تھا۔"

اچھا۔۔۔ اچھا تو یہ بات ہے۔۔۔ اس کی کوئی خاص وجہ۔۔۔؟ میں تمہاری گرینی کو سمجھا دوں گا۔"

انکا انداز بے حد سرسری تھا اور مجھے ان کی یہی بات پسند تھی۔ وہ کسی چیز کو مسئلہ نہیں بناتے تھے اور ہمیشہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرتے

تھے۔ میں یکدم ان کی جانب مڑا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی میں کوئی فیصلہ کرتا اور انہیں اس میں شامل نہ کرتا۔

میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔۔۔ یتاراؤ سے دوستی کی خواہش۔۔۔ اگی نان ویج کھانے والوں کیلئے ناپسندیدگی اور اپنی آزردہ دلی۔۔۔

ایک ایسی لڑکی جو دوستی کی ابتداء سے پہلے ہی تم میں برائی کی نشاندہی کر رہی ہے۔۔۔ ایسی لڑکی کو دوست بنا کر تم کیا کرو گے۔۔۔"

میرے خاموش ہو جانے پر وہ تحمل بھرے لہجے میں بولے تھے جبکہ میں پر جوش ہو گیا۔

مجھے لگتا ہے گرینڈ پا۔۔۔ اس بات میں کچھ حقیقت تو ہے۔"

وہ حیران ہوئے تھے۔ میں نے گہری سانس بھری۔ یہی تو کنفیوژن کی وجہ تھی۔

آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ قتل کبیرہ گناہ ہے۔ جب ہم اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے کسی دوسرے جاندار کی جان لیتے ہیں تو یقیناً گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس گناہ کی پاداش میں برائی کے فرشتے ہی پیدا ہونگے نا۔۔۔ یہ برائی کے فرشتے ہمارے اندر برائی یعنی غداری پیدا کرتے ہیں۔ گرینڈ پا، گھوڑا ایک وفادار جانور ہے اور اس کی خوراک کیا ہوتی ہے جبکہ شیر کیا کھاتا ہے اور اس کی وفاداری کا عالم کیا ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہے ہمارے گھر ایک بلی ہوتی تھی۔۔۔ کرسٹل۔۔۔" میں نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

گرینی کرسٹل کو کبھی گوشت کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ پالتو جانور کو گوشت کھلانے سے اس کے منہ کو خون کا ذائقہ لگ جاتا ہے پھر اسے کاٹنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔"

میرا انداز ایک بار پھر پر جوش ہوا تھا۔ گرینڈ پا مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ میری بات مکمل ہوتے ہی انہوں نے گہری سانس بھری۔

اس لئے تم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ تم چکن، مٹن وغیرہ کچھ نہیں کھاؤ گے۔" وہ پوچھ رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ انہوں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

میں وفادار رہنا چاہتا ہوں گرینڈ پا۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ برائی کی قوت یا فرشتے میرے اندر اپنا گھر بنائیں۔"

میں نے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔ وہ ساری گفتگو کے درمیان پہلی بار کچھ مطمئن سے نظر آئے۔

مجھے امید ہے کہ تم میری بات کو یتاراؤ کی بات سے تھوڑی سی زیادہ اہمیت دو گے۔۔۔ ورنہ میں تمہاری مدد نہیں کر پاؤں گا۔ میں نے سر ہلایا تھا۔

میرے بچے وفاداری کوئی سکھائی جانے والی چیز نہیں ہے۔۔۔ ارشمیدس کا اصول یا فیثا غورث کا مسئلہ۔۔۔ یہ فطرت ہے۔۔۔ انسانی فطرت۔۔۔ قدرت نے ہمارے اندر یہ مادہ رکھا ہے۔ ہم انسان پیدائشی طور اپنے اندر لاتعداد خوبیاں لے کر آتے ہیں وفاداری ان میں سے ایک ہے۔ ہم جب کسی چیز کے ساتھ وفادار رہتے ہیں۔۔۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ دوست، عقیدہ، کوئی خیال۔ کوئی سوچ یا پھر زمین کا کوئی ٹکڑا۔۔۔ تو ہمیں اس سے سکون ملتا ہے۔۔۔ روح کی بھوک کا تو ذ صرف ایک ہے۔۔۔ سکون۔۔۔ بدن کو روٹی نہ ملے اور روح کو خوشی نہ ملے تو انسان انسان نہیں رہتا اپنے محور سے ہٹنے لگتا ہے۔ گھوڑا وفادار ہے کیونکہ بنانے والے نے یہ عنصر اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے جبکہ شیر کی فطرت میں یہ نہیں

ہے۔ یہ جانور ہم سے وفادار نہیں ہیں بلکہ اپنی فطرت سے وفادار ہیں۔ یہ اس عنصر سے وفادار ہیں جو خدا نے ان کی طبیعتوں میں رکھی ہے اس لئے وفاداری یہ ہے کہ ہم اپنی فطرت سے مخلص ہو جائیں تا کہ روح کی بھوک مٹتی رہے، اسے سکون و اطمینان ملتا رہے اور انسانیت اپنے محور سے نہ ہٹے۔"

گرینڈ پاء۔۔۔ آپ میری بات۔۔۔" میں ان کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

قدرت نے انسان کو۔۔۔ تمہیں۔۔۔ مجھے۔۔ ہم سب کو۔۔۔۔ بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور جسے محبت سے تخلیق کیا جاتا ہے نا اس کی فطرت میں بھی صرف محبت رکھی جاتی ہے۔ خدا کبھی انسانوں سے یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ برائی میں ملوث رہیں۔ اس لئے یہ بات یاد رکھو کہ برائی انسان کی فطرت نہیں ہے۔ خدا ہر بچے کی فطرت کو نیکی کی مٹی سے گوندھ کر تخلیق کرتا ہے۔ ہر بچہ نیکی کے ایمان اور اچھائی کے گیان پہ پیدا کیا جاتا ہے۔ تمہارا کام اس ایمان اور اس گیان کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہے۔ انہوں نے لمحہ بھر کا توقف کیا تھا۔ مجھے انکی سب باتیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔۔۔

انسان کا اپنی ذات کے ساتھ اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔"

انہوں نے جھک کر زمین سے کچھ اٹھایا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے انہیں زمین پر کچھ بناتے دیکھا۔ انہوں نے شاید کوئی نوکیلا کنکر اٹھایا تھا جس کی مدد سے وہ زمین پر کچھ بنا رہے تھے۔ اگلے لمحے وہ اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ زمین پر ایک بڑا سا دائرہ نرم مٹی کے قلب میں کھدا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔

یہ دنیا ہے۔۔۔ تمہاری دنیا۔" انہوں نے دائرے کی سمت اشارہ کر کے کہا پھر وہ اس دائرے کے اندر کچھ بنانے لگے تھے۔

یہ تم ہو۔۔۔ خدا کی سب سے خوبصورت تخلیق۔۔۔ حضرت انسان۔" انہوں نے مٹی پر دائرے کے عین اندر اب ایک پانچ کناروں والا ستارہ بنا دیا تھا جو اس دائرے میں محصور تھا اور وہ اس محصور چیز کو حضرت انسان کہہ رہے تھے۔

تم ساری زندگی بحیثیت انسان اسی دائرے میں قید رہو گے یعنی یہ تمہاری ذات ہے اور تمہاری ذات ہی تمہاری دنیا ہے اور اس دنیا کے ساتھ تمہارا اخلاص ہی تمہاری وفاداری ہے۔ اس وفاداری میں کوئی دوسرا انسان ذمہ دار نہیں ہو سکتا سوائے خود تمہارے اپنے کیونکہ خدا نے تمہیں اس دائرے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس کی وسعت کا اختیار بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کسی انسان کا دائرہ بہت وسیع ہو سکتا ہے اسی طرح کسی کا بہت مختصر ہو سکتا ہے۔۔۔ اس دائرہ میں کون کون ہو گا اس کا فیصلہ بھی انسان خود کرتا ہے۔ اس کے لئے اس کی خوبیاں، خامیاں، اس کی قوت فیصلہ ہر چیز ذمہ دار ہوتی ہے۔ خود غرض انسان کا دائرہ ہمیشہ مختصر ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے وجود سے پیار ہوتا ہے اپنی ذات سے نہیں اور جسے صرف وجود کی چاہ ہو وہ کسی کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ انسانیت کا ہر سبق دراصل ذات ہی سکھاتی ہے ہمیں، اس لئے وفاداری سیکھنی ہے تو اپنی ذات کا احترام کرو، ذات کی خواہشات کا احترام کرو۔ اپنی طلب سے لڑنا، اپنی فطرت سے لڑنے کے مترادف ہے اور یہ کام انسان کے بس کا نہیں اس لئے اگر تم یہ سوچتے ہو کہ فطرت سے بغاوت کر کے تم وفادار ہو سکتے ہو تو یہ غلط ہے۔"

انہوں نے میری جانب دیکھا اور اب مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے دراصل بتانا کیا چاہ رہے تھے۔

وفاداری سیکھنا چاہتے ہو، وفادار رہنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کے ساتھ اخلاص برتو، اس دائرے کے ساتھ اخلاص برتو۔"

وہ اب اس دائرے پر انگلی گھمار ہے تھے۔

"یہ دائرہ اس مٹی پر بنا ہے۔ وفاداری سیکھنی ہے تو اس مٹی سے سیکھو۔ مٹی سے زیادہ وفادار کوئی دوسری چیز اس دنیا میں نہیں۔ انسان کا خمیر اس مٹی سے اٹھایا جاتا ہے اور بعد از مرگ اسی مٹی میں دفنایا جاتا ہے۔"

انہوں نے اب اس دائرے میں قید ستارے پر انگلی رکھی تھی۔

"یہ تم ہو۔" انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔

"اس مٹی سے بنتے ہو۔" انہوں نے پہلے کنارے پر انگلی چلائی۔

"اس مٹی پر پلتے ہو۔" اب کی بار بغیر انگلی اٹھائے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

"اس مٹی پر چلتے ہو۔" ان کی انگلی تیسرے کنارے پر آ پہنچی۔

"اس مٹی سے کھاتے ہو۔" چوتھا کنارہ شروع ہو گیا تھا۔

"اس مٹی میں مر جاتے ہو۔" ان کی انگلی آخری کنارے پر پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس ستارے سے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"کیا دنیا میں واقعی "برائی" کا وجود نہیں ہے؟"

☆ ☆ ☆

"شہروز۔۔۔ تم کیا کر رہے ہو؟" دوسری جانب سے ہیلو کی آواز سنتے ہی اس نے پوچھا تھا گویا اسے یقین تھا کہ فون شہروز نے ہی ریسیو کیا ہوگا۔

"بھنگڑا۔۔۔ تم بھی آجاؤ۔" شہروز کی کسی قدر اکتاہٹ بھری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ زارا کو اندازہ تھا کہ وہ اس وقت اس کی کال کو زیادہ پسندیدہ رسپانس نہیں دے گا۔ اس کا سیل آف مل رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مصروف ہے۔ وہ جانتی تھی شہروز کا "وائیوا" دو ایک دن میں ہونے والا ہے۔ وہ نا صرف محنتی سٹوڈنٹ تھا بلکہ اپنے پروفیسرز کا فیورٹ بھی تھا۔۔۔ پوزیشن ہولڈر ہونے کی وجہ سے اسے اپنا سی جی پی اے بھی برقرار رکھنا تھا۔ اس نے تھیسز پہ جتنی محنت کی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ وائیوا کے لئے کر رہا تھا۔ اسی لئے وہ بہت دنوں سے اسے نظرانداز بھی کر رہا تھا۔ زارا ایسی باتوں پہ دوسری لڑکیوں کی طرح برا نہیں مناتی تھی بلکہ وہ خود بھی اس سے زیادہ رابطہ نہیں کرتی تھی اب بھی اگر مسئلہ نہ درپیش ہوتا تو وہ اسے کبھی ڈسٹرب نہ کرتی۔ وہ خود کافی پریشان تھی لیکن اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو لائٹ سے انداز میں بولی۔

"نو من تیل میسر آ گیا تھا میری رادھا کو۔"

"نہیں۔۔۔ تب ہی تو ناچ ہی نہیں رہی، بھنگڑا ڈال رہی ہے آپ کی رادھا۔" شہروز کی آواز میں اب تھکن بھی نمایاں تھی۔

"میری رادھا تھک گئی ہے؟" اس نے اپنی پریشانی کو چھپا کر محبت سے کہا تھا۔

"ہائے۔۔۔" شہروز نے گہری سانس بھری پھر بولا۔

کچھ مت پوچھو زارا۔۔۔اتنا کام ہے کرنے والا اور دو دن سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔۔۔میرا ذہن بالکل بلینک ہے۔ عمر کے چکروں میں بڑا وقت ضائع ہوا ہے میرا" وہ اپنا دکھڑا رو رہا تھا۔ زارا کو اپنا یاد آ گیا۔

شہروز" زارا نے اتنا کہہ کر توقف کیا تھا۔ اسکی آواز میں مخصوص سی بیچارگی آ گئی تھی جس سے شہروز بطور خاص واقف بھی اور چڑتا بھی تھا۔

اب بک بھی چکو کہ کیا پرابلم ہے۔ مجھے پتا ہے میری خیریت پوچھنے کے لئے فون نہیں کیا تم نے اس وقت۔"

اس کے اس طرح کہنے پر زارا نے سامنے لگے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔

شہروز۔۔۔تم اس وقت آ سکتے ہو میری طرف۔" وہ لجاجت سے بولی تھی جسکا شہروز پر ذرا اثر نہیں ہوا۔

جی نہیں۔۔۔اتنی خوبصورت نہیں ہیں آپ کہ میں آپ کی ہر فرمائش پوری کرتا پھروں۔" اس نے صاف انکار کیا

پلیز سیریس یار۔۔۔ایک پرابلم ہو گئی ہے۔" زارا کی آواز میں لجاجت و منت کی آمیزش بڑھی تھی۔

اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔۔۔تم ہو ہی پرابلم کا اپیچی کیس۔" وہ بے پناہ چڑ کر بولا۔ زارا کو بھی غصہ سا آ گیا۔

ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس وقت پرابلم کا تعلق مجھ سے نہیں بلکہ تمہارے چہیتے عمر احسان سے ہے۔" وہ غرا کر بولی تھی۔

شہروز کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ عمر آجکل شہروز کے دائیوا کی وجہ سے زارا لوگوں کے گھر رہ رہا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے اسے شہروز نے ہی کہا تھا کیونکہ اسے شکایت تھی کہ عمر اس کا بہت وقت ضائع کرتا ہے جبکہ عمر کا کہنا تھا کہ شہروز اس کو ٹائم نہیں دیتا جبکہ وہ ان کے گھر مہمان ہے۔

وہ بھی تمہارا جڑواں بھائی ہے۔۔۔تم سے کم نہیں ہے۔ اور ہاں وہ آجکل تم لوگوں کے گھر رہ رہا ہے تو اس کے پرابلم بھی تم لوگ سولو کرو۔ مجھے معاف رکھو اس کے معاملات سے۔" شہروز ابھی بھی زیادہ سنجیدہ نہیں تھا جس کی وجہ سے زارا چڑ رہی تھی۔

شہروز! تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔۔۔بات بہت سیریس ہے۔ عمر نے امائمہ کے ساتھ منگنی توڑ دی ہے۔ وہ اپنی رنگ اس سے واپس لے آیا ہے۔" اس نے بالآخر اگل دیا تھا۔

واٹ" شہروز اس کی بات سن کر واقعی اچھل پڑا۔ "تم سچ کہہ رہی ہو؟" وہ پر یقین نہیں تھا۔

میں تم سے جھوٹ کیوں کہوں گی شہروز۔۔۔اس نے واقعی منگنی توڑ دی ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ خود بتایا ہے بلکہ وہ رنگ بھی دکھائی ہے جو منور ماموں نے اس کی طرف سے امائمہ کو پہنائی تھی۔" وہ اسے تفصیل بتا رہی تھی۔

لیکن کیوں زارا۔۔۔آئی مین اس نے یہ سب کیوں کیا؟۔۔۔ابھی تو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا انگیجمنٹ کو" شہروز بھی پریشان ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا عمر لاپرواہ ہے مگر اتنی غیر ذمہ داری کی توقع بھی نہیں تھی اسے عمر سے۔

یہ تو مجھے نہیں پتا مگر وہ کافی غصے میں تھا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے لگتا ہے اسکا اور امائمہ کا جھگڑا ہو گیا ہے۔"

شٹ یار۔۔۔کیا چیز ہے یہ شخص۔۔۔تم فون رکھو۔ میں آتا ہوں تمہاری طرف۔۔۔پتا نہیں ڈیڈی ابھی سوئے ہیں کہ نہیں۔۔۔بائیک پر آنا پڑے گا اس وقت۔۔۔بہرحال میں دیکھتا ہوں۔" وہ کان کو انگلی سے کھجاتا ہوا سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

زارا کو اس کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پھپھا جی سو چکے تھے جبکہ پھپھو کا آپریشن ڈے تھا وہ ابھی تک ہاسپٹل سے نہیں لوٹی تھیں۔ شہروز لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ عمر کا قیام گیسٹ ہاؤس یا اینکسی میں نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اوپر والے پورشن کے بیڈروم میں رہ رہا تھا۔ وہ سو چکا تھا یا جاگ رہا تھا اس کی خبر ان دونوں کو نیچے بیٹھے نہیں ہو سکتی تھی۔

مجھے زیادہ تفصیل نہیں پتا شہروز۔۔۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا جب میں ہاسپٹل سے واپس آئی۔ ڈنر کے وقت پاپا نے مجھے کہا تھا کہ فون کر کے اس کو پوچھوں کہ وہ کہاں ہے تب ہی اس کا ایس ایم ایس آ گیا۔ وہ ڈنر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو اس کا موڈ آف تھا۔ میں نے سرسری سا پوچھا تو وہ پھٹ پڑا۔" زارا اتنا بتا کر چپ ہو گئی۔

اس نے کیا کہا؟" شہروز کے لہجے میں ہی نہیں انداز میں بھی اکتاہٹ تھی۔

وہ کہتا ہے وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ اس سے نا صرف غلطی ہوئی ہے بلکہ ناشکری بھی کہ اس نے اچھی اچھی لڑکیوں کو چھوڑ کر ایک ایبنارمل لڑکی کو لائف پارٹنر کے طور پر پسند کیا۔"

زارا اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بتا رہی تھی۔ شہروز کی نگاہ اس کی انگلیوں پر ہی تھی مگر وہ ہمیشہ کی طرح اس کی اس حرکت پر اسے ٹوک نہیں سکا تھا۔ وہ مسلسل کچھ سوچنے میں مگن تھا۔ عمر کی انگیجمنٹ والی تقریب کے بعد اس کی اس سے زیادہ بات نہیں ہوئی تھی اور اب اس کے اس دوست نما کزن نے کیا حرکت کی تھی اس سے وہ بالکل انجان تھا لیکن پریشانی بھی بے حد تھی۔ منگنی سے لے کر رشتہ بھیجنے تک وہ ہر کام میں پیش پیش رہا تھا۔ عمر اس کا کزن تھا تو امائمہ اس کی کلاس فیلو اور فرینڈ تھی منگنی کے بعد اور پہلے بھی سارا سلسلہ شروع ہونے تک وہ تین چار بار امائمہ سے ملا تھا۔ وہ اسے بہت خوش تو دکھائی نہیں دی تھی مگر مطمئن ضرور تھی۔ یہ رشتہ یقیناً اس کی رضامندی سے طے پایا تھا۔

اب کیا ہوا ہے اس احمق کو۔۔۔ مجھے تو ذلیل کر کے رکھ دیا ہے اس نے۔"

شہروز اس کی جانب دیکھ رہا تھا پھر وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

میں پوچھ کر آتا ہوں۔" شہروز سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا جبکہ زارا نے پریشانی سے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ جانتی تھی اب دونوں کا جھگڑا ہو جائے گا۔

پاپا سو رہے ہیں۔" سیڑھیاں چڑھتے شہروز کو اس نے بتانا ضروری سمجھا مبادا وہ دونوں اتنا ہنگامہ کریں کہ پاپا اٹھ جائیں اور اس پر غصے کا اظہار کریں۔ شہروز کے عمر کے روم میں چلے جانے کے بعد وہ کچھ دیر لاؤنج میں ہی ٹہلتی رہی پھر اس سے صبر نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی دبے قدموں اوپر چلی آئی۔

اس میں میری کیا غلطی ہے شہروز۔۔۔ تم لوگوں کو مجھے پہلے ہی انفارم کر دینا چاہیے تھا کہ محترمہ امائمہ آفاق ذہنی مریضہ ہیں۔"

وہ شاید شہروز کے استفسار پر بتا رہا تھا۔ انتہائی پرسکون لہجے میں ادا کیا گیا یہ جملہ آخری سیڑھی پر اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی کمرے کے دروازے تک پہنچی تھی مگر اندر داخل ہونے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ان دونوں کے درمیان شدید نوعیت کا

جھگڑا ہونے والا ہے۔ ادھ کھلے دروازے سے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا شہروز جارحانہ تیور لئے صاف نظر آرہا تھا۔ زارا نے ذرا سا آگے ہو کر عمر کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ صوفہ کم بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا، گردن میں ہیڈ فون لٹکائے بظاہر ٹی وی میں مگن دکھائی دیتا تھا۔

ذہنی مریضہ وہ نہیں ہے، تم ہو اور غلطی بھی واقعی تمہاری نہیں میری ہے۔ میں اُلو کا پٹھا ہوں جو تم جیسے ڈھیٹ انسان کے پرسنل افیئرز میں بلا وجہ دلچسپی لیتا ہوں۔" شہروز غرا کر بولا تھا۔

تم چڑ کیوں رہے ہو۔ میں تمہیں تمہاری غلطی سدھارنے کا موقع دے تو رہا ہوں۔" عمر کا انداز پہلے سے بھی زیادہ تپانے والا تھا۔ اب کی بار زارا نے بھی اکتا کر اس کی جانب دیکھا۔ عمر کی غیر سنجیدگی اسے اس وقت ذرا بھی نہیں بھا رہی تھی۔

آپ کو اتنی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ فقط اتنا بتا دیجیے کہ اب آپ کون سا گل کھلا کر آئے ہیں کہ آپ کی رِنگ واپس کر دی گئی ہے۔"

ایک ایک لفظ پر زور دیتے شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائے۔

مجھے میری رِنگ واپس نہیں کی گئی۔۔۔ میں اس کو خود واپس لے کر آرہا ہوں۔ جب وہ لیڈی ڈیانا مجھ سے کوئی رشتہ وابستہ نہیں رکھنا چاہتی تو میں اتنی قیمتی رِنگ اس کو کیوں دوں۔۔۔ میں اپنی رِنگ خود واپس لے آیا۔"

وہ ناک چڑھا کر خود وضاحت دے رہا تھا۔ اس کی بات پر شہروز اور زارا دونوں حیران ہوئے۔ زارا تو کمرے میں داخل ہو کر شہروز کے ساتھ آن کھڑی ہوئی حالانکہ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کمرے کے باہر سے ہی ان کی باتیں سنتی رہے گی۔

وہ تم سے کوئی رشتہ وابستہ نہ رکھنا چاہتی تو پھر یہ رِنگ پہنتی ہی کیوں۔۔۔ یہ بات تمہاری عقل میں نہیں آئی۔" شہروز نے سوالیہ نظروں سے زارا کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کا انداز نہیں بدلا تھا مگر لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ "زارا تم ہی اس کو بتاؤ کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ یار۔"

وہ واقعی بہت پریشان ہو گیا تھا۔ زارا عمر کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اصل معاملے سے لاعلم تھی۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے عمر۔۔۔ تم واقعی غلط سوچ رہے ہو۔ میں نے کتنی بار امائمہ سے بات کی ہے۔ تم اگر اسے ناپسند ہوتے تو وہ فوراً اظہار کر دیتی۔۔۔ اتنی بھی دبو ٹائپ لڑکی نہیں ہے وہ۔" زارا نے بونگے پن سے بڑی بہن کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں اور ناپسند؟" عمر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں اسے ناپسند کیسے ہو سکتا ہوں زارا ڈیئر۔۔۔ اتنے اچھے لڑکے کے بارے میں اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔۔۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے اسے اپنے لئے پسند کیا۔۔۔ لیکن۔۔۔ اسے اپنی بدقسمتی زیادہ عزیز ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔

I can't help

کندھے اچکاتے ہوئے وہ فخریہ لہجے میں بولا تھا۔ شہروز کے ماتھے کی رگیں مزید تن گئیں۔

کتنے خبیث انسان ہو تم۔۔۔ پتا نہیں کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو۔۔۔ اوقات کیا ہے تمہاری اس کے آگے۔۔۔"

شہروز کا لہجہ اتنا سخت ہو گیا تھا کہ زارا بھی پریشان ہو کر اسکا چہرہ دیکھنے لگی۔

شہروز پلیز۔۔۔اس طرح سے بات مت کرو عمر سے۔" وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولی تھی۔" مجھے لگتا ہے ان دونوں کے درمیان کچھ مس انڈرسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔"

میں اپنے آپکو کیا سمجھتا ہوں۔۔۔مجھے وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔میں ایسا ہی ہوں شہروز۔۔۔اب سے نہیں۔۔۔بہت پہلے سے۔۔۔اور میں ایسا ہی رہوں گا۔۔۔مرتے دم تک۔ میں کبھی اس سانچے میں نہیں ڈھل سکتا جو تم میرے لئے تیار کرتے ہو کیونکہ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ میں جیسا بھی بہت اچھا ہوں اور ہاں میں صرف اپنے پیرنٹس کے آگے جوابدہ ہوں۔۔۔مجھ سے بلاوجہ آرگیو کرنے کا حق میں کسی کو نہیں دیتا۔"

عمر کا لہجہ بے حد سرد ہو گیا تھا اور چہرے کے تاثرات بالکل سرد ہو گئے تھے۔ زارا نے ان دونوں کو پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان دونوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرتی تھی لیکن عینی شاہد بننے کا یہ پہلا موقع تھا۔

تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کیوں کر رہے ہو۔۔۔ٹمپر لوز مت کرو۔" وہ منت کر بولی تھی۔ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قائل نہیں کر سکی تھی۔

تم نے سنا ابھی مسٹر عمر نے کیا فرمایا۔۔۔بہتر ہے ہم خاموش رہیں۔"شہروز کو یقیناً بہت برا لگا تھا۔

یار پلیز! تم تو اس طرح مت کہو۔۔۔تم تو جانتے ہو عمر بہت جذباتی ہے۔" زارا کا اتنا کہنا ہی قیامت ہو گیا۔

ہاں۔۔۔عمر جذباتی ہے، اسٹوپڈ ہے، ڈفر ہے۔ سب تھانوں میں اسی کمبخت کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔۔۔او کے۔۔۔ایسے تو ایسے ہی سہی۔۔۔جس کو مجھ سے بات نہیں کرنی وہ مت کرے۔۔۔میں اپنے آپ سے بہت خوش ہوں۔۔۔انڈرسٹینڈ" وہ نتھنے پھلا پھلا کر کہہ رہا تھا۔

زارا۔۔۔اٹھو یہاں سے۔۔۔آؤ چلیں۔"شہروز نے آگے بڑھ کر یکدم زارا کا بازو پکڑا تھا۔ زارا ہکا بکا ان کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

تم لوگ ایسے کیوں کر رہے ہو۔۔۔پلیز لڑو مت۔۔۔تم لوگ" وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی آنسو ابل کر آنکھوں سے باہر آنے لگے۔ شہروز نے غصے سے اس کی بازو جھٹک دی اور خود کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

شہروز۔۔۔پلیز" زارا نے اسے پکارا پھر وہ بھاگ کر دروازے تک گئی تھی۔ شہروز لابی کراس کر کے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ زارا نے ایک بار پھر اسے پکارنا چاہا مگر اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔ وہ چند لمحے اسی جانب دیکھتی رہی جہاں شہروز نظر آ رہا تھا پھر اس نے عمر کی جانب دیکھا۔

اسکا وائیوا ہے عمر۔۔۔پرسوں۔۔۔ایسے تو وہ پڑھ نہیں پائے گا۔۔۔عمر" وہ بیچاری بہت پریشان ہو گئی تھی۔ عمر نے تھک کر سر جھکا لیا۔ وہ نادم لگ رہا تھا یا شاید زارا کو وہم ہوا تھا۔ عمر کا مزاج نجانے ایسا کیوں تھا۔

☆ ☆ ☆

تمہیں سارا وقت کلاس روم میں بیٹھا رہنا اچھا لگتا ہے؟"سلیمان نے اس کے ساتھ والے ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے ناک چڑھا کر سوال کیا تھا۔ بریک کی وجہ سے کلاس کے زیادہ تر بچے باہر گراؤنڈ میں تھے۔ سلیمان ساتویں کلاس کے فائنل ٹرم سے کچھ روز قبل ان کی کلاس میں داخل ہوا

تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور تیز طرار بچہ تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کی تقریباً سب بچوں سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ آٹھویں کلاس میں پرموٹ ہونے کے بعد تو سلیمان حیدر پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ نیو ایڈمیشن ہونے کے باوجود اس نے تھرڈ پوزیشن لے کر سب ٹیچرز کے دل جیت لئے تھے اور یہی سلیمان حیدر اب اس کے ساتھ بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

میں بریک میں بھی کلاس روم میں بیٹھا رہتا ہوں۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

کیوں؟" سلیمان حیدر نے ایک اور سوال کیا۔ اب کی بار وہ عجب سے انداز میں مسکرایا۔

میں باہر جا کر کیا کروں گا؟" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔ اس کے بیگ پر اس کا لنچ بکس کھلا پڑا تھا جس میں دو سینڈوچز تھے جبکہ اس کی گود میں کیمسٹری کی کتاب تھی۔ بریک کے فوراً بعد کیمسٹری کا پیریڈ تھا۔

تم یہاں بیٹھ کر کیا کر رہے ہو؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ کلاس روم سے باہر جا کر بھی تم بغیر ڈسٹرب ہوئے یہی کام کر سکتے ہو۔"

سلیمان نے اس کے لنچ بکس سے ایک سینڈوچ اٹھا کر اطمینان بھرے لہجے میں کہا تھا۔

میں روزانہ کلاس روم میں ہی لنچ کرتا ہوں؟" وہ اس کی بے تکلفی کا برا مانے بغیر بولا تھا۔

تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم واقعی روزانہ لنچ کرتے ہو؟" وہ اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔ سلیمان نے لنچ بکس سے دوسرا سینڈوچ اٹھا کر اسے پکڑایا اور اس کی گود میں پڑی کیمسٹری کی کتاب بند کر دی۔

تمہاری صحت دیکھ کر نہیں لگتا کہ تم روزانہ لنچ کرتے ہو گے۔" وہ سلیمان کی بات پر جھینپی ہوئی ہنسی ہنسا تھا۔

میں شروع سے ہی دبلا ہوں۔ مجھے بھوک نہیں لگتی۔" اس نے ایک گھسی پٹی توجیہہ دی تھی۔ سلیمان آدھا سینڈوچ کھا چکا تھا جبکہ اس نے ابھی پہلا لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔

تم اگر اس طرح کتاب گود میں رکھ کر لنچ کرو گے تو تمہیں کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ میں اس طرح کبھی نہیں کرتا۔ لنچ کے وقت میں بھول جاتا ہوں کہ کونسا سبق یاد کرنا ہے یا کونسا ٹیسٹ دینا ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ میری امی نے مجھے اتنے مزے کا لنچ بنا کر دیا ہے اور مجھے بریک میں بس لنچ کرنا ہے تو مجھے خود بخود بھوک لگنے لگتی ہے اور سچی بات بتاؤں تو کبھی کبھی مجھے بریک سے بھی پہلے بھوک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔"

سلیمان سینڈوچ کھاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ اس کے اس طرح کہنے پر اس نے بھی سینڈوچ کھانا شروع کر دیا تھا۔

تمہاری امی نے بہت مزے کا سینڈوچ بنایا ہے۔ میں نے تمہارا لنچ شیئر کیا ہے اور اب تم میرا لنچ شیئر کرو گے لیکن یہاں کلاس روم میں نہیں۔۔۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔"

سلیمان نے اسے آفر دی تھی۔ باہر گراؤنڈ باہر میں جانے کے خیال سے اسے لمحہ بھر کے لئے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی لیکن سلیمان کا انداز اتنا دوستانہ تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکا اور کتاب بیگ کے اوپر رکھ کر باہر آ گیا۔ کلاس روم کے آگے بنے برآمدے کراس کر کے وہ گراؤنڈ میں آ گئے۔ سارے اسکول کے بچے ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے کھیلوں کی اقسام بھی مختلف تھیں۔ ایک عجیب قسم کا شور وغل تھا۔ وہ اکیلا ہوتا تو شاید

واپس کلاس روم میں چلا جاتا لیکن سلیمان کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔

آؤ سلیمان کھیلیں۔۔۔ادھر آجاؤ۔۔۔سلیمان کھیلنا ہے۔۔۔آج میرے پارٹنر بن جاؤ سلیمان۔"

وہ اس حصے کی طرف آئے جہاں انکے کلاس کے بچے کھیل رہے تھے تو جیسے شور مزید بڑھ گیا۔ ہر بچہ سلیمان کو اپنے ساتھ کھیلانا چاہ رہا تھا۔

ہم کھیلیں گے مگر ہمیں لنچ تو کر لینے دو۔"سلیمان ابھی کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھا اسکا ہاتھ تھامے وہ کسی پرسکون گوشے کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ جونیئر کلاسز والے حصے میں کافی سکون تھا۔ وہ ایک کلاس روم کے باہر بنے چبوترے پر بیٹھ گئے تب تک اسکا سینڈوچ ختم ہو چکا تھا۔

تمہارا فیورٹ گیم کونسا ہے؟"سلیمان نے اپنا لنچ بکس کھول کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

کوئی بھی نہیں۔۔۔گیم کے لئے تو ٹائم ہی نہیں بچتا۔۔۔پڑھائی اتنی ٹف ہے۔"اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ اسے یقین تھا باقی کلاس فیلوز کی طرح اب سلیمان بھی اس کی اس بات کو مذاق کا نشانہ بنائے گا لیکن اسے حیرت ہوئی جب سلیمان نے اس کی اس بات سے اتفاق کیا تھا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"وہ حیرانی سے سلیمان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اسکا مذاق تو نہیں اڑا رہا تھا لیکن سلیمان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اپنے لنچ بکس میں پڑے پراٹھے کی تہیں کھول رہا تھا۔

تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔پڑھائی تو بیحد ٹف ہو گئی ہے ابھی تو ہم نے بڑی کلاسز میں جانا ہے تب تو شاید ہمیں منہ دھونے کا وقت بھی نہ ملے۔ ابھی ہم اتنی مشکل سے وقت نکالتے ہیں حالانکہ ابھی ہم سیونتھ کلاس میں ہیں۔ نائنتھ ٹینتھ میں ہمارا کیا بنے گا۔"

اس نے پراٹھا کھول کر اس کے سامنے بچھا دیا تھا اور ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا تھا۔

میرے ابو کہتے ہیں اس میں زیادہ قصور ہمارا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک کام کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بنائے انسان سب کاموں میں حصہ لیں۔ وہ پڑھائی کریں، کھیلیں کودیں، امی ابو کا ہاتھ بٹائیں، دوستوں سے ملیں جلیں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال بھی رکھیں۔ میرے ابو کہتے ہیں اللہ میاں نے انسان کی مشینری اس طرح کی بنائی ہے کہ وہ یہ سب کام کر سکتا ہے۔ ابو یہ بھی کہتے ہیں اگر کوئی اس طرح نہیں کر پاتا تو یہ اسی کا قصور ہوتا ہے۔"

سلیمان نے بات کرتے ہوئے اسے اشارے سے پراٹھے کی جانب راغب کیا تھا۔ وہ پراٹھا کھاتے ہوئے اس کے ابو کی بات پر غور کرنے لگا۔ اس کے ابو سلیمان کے ابو کی طرح کی باتیں نہیں کرتے تھے۔

انسان کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ دو دو تین تین کام اکٹھے کر سکتا ہے۔ میں تمہیں اپنی روٹین کے متعلق بتاتا ہوں جب میں صبح سو کر اٹھتا تو مجھے جاگنگ کے لئے لے جاتے ہیں۔"

سلیمان نے بتانا شروع کیا تھا۔ اس نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھ کر ایک بار پھر حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس کے ابو ایسے نہیں کرتے تھے وہ صبح اسے جگاتے ہی رات کو یاد کروایا گیا سبق سننا شروع کر دیتے تھے۔

ناشتہ کر کے میں اسکول آجاتا ہوں لیکن بریک میں کچھ نہ کچھ ضرور کھیلتا ہوں۔ میں اگر ایسا نہ کروں تو مجھے سبق یاد نہیں رہتا پھر بریک کے

بعد والے پیریڈز میں مجھے بھی ڈر رہتا ہے کہ ٹیچر سے مجھے ڈانٹ نہ پڑے۔" سلیمان مزید کہہ رہا تھا اور وہ مزید حیران ہو رہا تھا۔ سلیمان کو بریک میں نہ کھیلنے کی وجہ سے خدشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ کہیں اسے سبق نہ بھول جائے اور ٹیچرز سے اسے ڈانٹ نہ پڑے۔

گھر جا کر میں کچھ آرام کرتا ہوں پھر پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ جب میں پڑھنا شروع کرتا ہوں تو میں ہر بات بھول جاتا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح میں کھیل کے دوران ہر بات بھول جاتا ہوں اس طرح سے مجھے سب کچھ جلدی یاد ہو جاتا ہے اور بھولتا بھی نہیں ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس طرح سے میرے پاس شام کو پھر کھیلنے کا وقت نکل آتا ہے۔ میرے ابو ٹھیک کہتے ہیں کہ اگر ہم ہر کام ٹھیک طریقے سے منیج کر لیں تو ہم ہر کام کر سکتے ہیں۔"

سلیمان نے اپنی بات ختم کی تو اس نے پراٹھے کے چند نوالے ہی ختم کئے تھے۔

تم جلدی جلدی کھانا کھاؤ تا کہ پھر ہم ریس لگائیں گے۔ بریک ختم ہونے میں دس منٹ باقی ہیں۔"

سلیمان کے کہنے پر اس نے تیزی سے کھانا شروع کیا تھا۔ اسے سلیمان اور اس کی باتیں دونوں اچھی لگی تھیں۔ کھانا کھا کر انہوں نے ریس لگائی تھی۔ سلیمان جیت گیا تھا لیکن اسے سلیمان سے زیادہ مزا آیا تھا۔

جب ہم ایک ہی وقت میں کھا سکتے ہیں، بول سکتے ہیں، سن سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں تو پھر ہم پڑھائی کے دوران کھیل کے لئے وقت کیوں نہیں نکال سکتے؟"

☆ ☆ ☆

سلیمان حیدر سے اس کی دوستی اس کی زندگی میں یکدم بے حد خوشگوار تبدیلی لے آئی تھی۔ وہی بچہ جو پہلے کلاس روم میں خاموش بیٹھا کتابوں کی دنیا میں گم رہتا تھا اب اکثر باتیں کرتا ہوا بھی دکھائی دینے لگا۔ بریک میں وہ باقی کلاس فیلوز کی طرح بہت اچھل کود تو نہیں کرتا تھا مگر پہلے کی طرح اس نے کلاس روم میں بیٹھے رہنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ آؤٹ ڈور گیمز میں وہ اتنا ہوشیار نہیں تھا لیکن ان ڈور گیمز میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے یہ گیمز سلیمان حیدر سے دوستی ہونے کے بعد کھیلنے شروع کئے تھے ورنہ بہت عرصے سے وہ یہ سب چیزیں چھوڑ چکا تھا۔ سلیمان کے کہنے پر اس نے کورس کی کتابوں کے علاوہ بچوں کے میگزین اور رسالے وغیرہ پڑھنے شروع کر دیئے تھے اور ایسا کرنے میں اسے مزا بھی آ رہا تھا۔ سلیمان حیدر کی معیت میں وہ زندگی کے کچھ مختلف رنگوں کو جاننے پرکھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ عمر میں تو وہ بھی اس سے بڑا تھا لیکن وہ کچھ بھی جتانے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اسے برابری کی بنیاد پر ٹریٹ کرتا تھا۔ یہی بات اسے اچھی لگتی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ دوستی کے معاملے میں احساس کمتری کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔ سب کلاس فیلوز کے ساتھ گھلنے ملنے کا موقع ملا تو اسے احساس ہوا کہ جس طرح اسے وہ ان سے خائف رہتا تھا وہ بھی اس سے کچھ نہ کچھ دبے ضرور رہتے تھے انہیں لگتا تھا وہ مغرور ہے یا اپنی پڑھائی کا رعب ڈالنے کے لئے ہر وقت کتابوں کی دنیا میں گم رہتا ہے۔ سلیمان حیدر نے ان کے بیچ پل کا کام کیا تھا۔ سلیمان سے چونکہ سب بچوں کی دوستی تھی اس لئے وہ اسے بھی دوست کا درجہ دینے لگے تھے۔ ان ساری چیزوں کا کریڈیٹ وہ سلیمان کو دیتا تھا جو اس کا بیسٹ فرینڈ بن چکا تھا۔ وہ دونوں ایک ڈیسک پر بیٹھتے تھے، ایک دوسرے کا لنچ شیئر کرتے

تھے۔ کلاس روم سے باہر جانے کے لیے وہ ایک دوسرے کا انتظار کرتے تھے۔ اسے سلیمان کی شخصیت میں موجود توازن بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ نا صرف پڑھائی میں اچھا تھا بلکہ کرکٹ ٹیم کا اہم کھلاڑی بھی تھا۔ کوئز اور تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لینا پسند کرتا تھا۔ بچوں کے رسالوں میں اس کی نگارشات اور مراسلے وغیرہ بھی چھپتے تھے۔ سلیمان کے مقابلے میں وہ صرف پڑھائی میں اچھا تھا۔ کرکٹ، ہاکی جیسے گیمز سے وہ ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ کوئز اور تقریری مقابلوں کو وہ وقت کا ضیاع سمجھتا تھا اور بچوں کے رسالے تو اس نے ہاتھ میں بھی تب پکڑنے شروع کیے تھے جب اس کی سلیمان سے دوستی تھی۔ اب یہ عجیب بات تھی کہ سلیمان حیدر کا ذکر اس نے گھر میں نہیں کیا تھا۔ وہ یوں بھی کافی کم گو تھا۔ ابو نے کبھی پڑھائی کے علاوہ کوئی بات کی ہی نہیں تھی اور امی کو ایسی باتوں سے فقط اس حد تک دلچسپی تھی کہ ان کا بیٹا آجکل خوش رہنے لگا تھا۔ پڑھائی کا لوڈ بھی کم نہیں تھا مگر نجانے کیسے خود بخود سب ٹھیک ہو جاتا تھا۔ پہلے کی طرح وہ اپنی پڑھائی یا کتابوں سے خوفزدہ نہیں رہتا تھا۔ یہ سب کچھ شاید اسی طرح چلتا رہتا مگر ایک روز بالآخر ابو کو اس کی خوشی کا راز پتا چل ہی گیا۔

☆ ☆ ☆

تم واقعی بہت جینئس ہو۔ سلیمان نے اس کا بائیالوجی کا ٹیسٹ دیکھتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ سلیمان اسے سراہ رہا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ یہ ایک عام سی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں تشکر تھا نہ تفخر، طمانیت تھی نہ خوشی فقط ایک سادگی تھی۔ تعریف اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی لیکن تعریف کو کس طرح وصول کرنا ہے یہ اسے آج تک سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ بہت بچپن سے وہ عام طور پر ہر ٹیسٹ میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا آیا تھا۔ اس کے فائنل رزلٹس ہمیشہ اسے فرسٹ پوزیشن دلواتے آئے تھے۔ اس کے کلاس ٹیچرز جانتے تھے کہ اس چیز میں کلاس کا کوئی دوسرا بچہ اسے بیٹ نہیں کر سکتا۔ اس کے کلاس فیلوز کبھی ٹیچرز سے یہ نہیں پوچھتے تھے کہ فرسٹ کون آیا ہے بلکہ وہ یہی سوال کرتے تھے کہ سیکنڈ لیڈ کس کی ہے۔ ان سب کے لیے یہ جیسے ایک طے شدہ امر تھا کہ کوئی اور ٹاپ کر ہی نہیں سکتا سو یہ ایک عام سی بات بن چکی تھی۔ اس میں کسی کے لیے کوئی تھرل یا نیا پن نہیں تھا۔ یہ اسکول کا احوال تھا جبکہ گھر میں تو یہ عام نہیں بلکہ بے حد عام اور عام ترین بات بن چکی تھی۔ اس کے ابو اس کے ہر چھوٹے بڑے ٹیسٹ کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے مگر انہوں نے اس کے ٹیچرز کی طرح کبھی اسے "ویل ڈن" نہیں کہا تھا۔ ان کے منہ سے وہ ہمیشہ "کیپ اِٹ اَپ" یا اسی قسم کے جملے سنتا آیا تھا اور یہ سب کہتے ہوئے ان کے لہجے میں اگر کوئی خوشی یا اطمینان ہوتا بھی تھا تو وہ جو اسکول کا "موسٹ جینئس" بچہ تھا کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ ابو کے چہرے اور آنکھوں کے تنبیہ دینے والے تاثرات ہی دیکھ اور سمجھ پاتا تھا۔ ایسی صورتحال میں سلیمان جیسے دوست کی تعریف پر وہ سادگی سے مسکراتا نہ تو اور کیا کرتا۔

تم اتنی اچھی ڈایاگرامز ڈرا کرتے ہو۔" وہ سمجھ نہیں پایا کہ سلیمان نے سوال کیا ہے یا تعریف۔۔۔۔ بہرحال یہ اسے ضرور پتا تھا کہ وہ ڈایاگرامز اچھی بناتا ہے۔ بائیالوجی کے کونسیپٹ یاد کرنے سے کہیں زیادہ وہ ان ڈایاگرامز کو بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بائیالوجی کے یہ ٹیسٹ آج ہی چیک ہو کر واپس آئے تھے۔ سر طاہر نے اس ٹیسٹ میں صرف ڈایاگرامز ڈرا اور لیبل کرنے کے لیے دی تھیں۔

میرے ابو بھی اتنی اچھی ڈایاگرامز نہیں کر سکتے جتنی اچھی تم نے کی ہیں۔"

یہ اتنی اچھی تو نہیں ہیں۔" اب کی بار اس نے بھی بغور اپنے ٹیسٹ کو دیکھا تھا۔

تم ذرا یہ میرا ٹیسٹ اور میری ڈرا کی ہوئی ڈایا گرامز اپنے ٹیسٹ اور اپنی ڈرا کی ہوئی ڈایا گرامز کے ساتھ رکھ کر دیکھو تمہیں خود پتا چل جائیگا کہ یہ کتنی اچھی ہیں۔" سلیمان نے اپنا ٹیسٹ بھی اس کے ساتھ رکھا تھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ سلیمان کی ڈرائینگ واقعی اچھی جسیں تھی۔ اس کی ڈرا کی ہوئی ڈایا گرامز میں کافی غلطیاں تھیں مگر پھر بھی وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر بولا۔

یہ بھی اچھی ہیں۔"

میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ یہ کتنی اچھی ہیں۔" سلیمان نے خود اپنا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر سلیمان کی بات تردید کرتا وہ مزید کہنے لگا۔

میری ڈرائینگ بہت پور ہے۔ مجھے سکیل کے بغیر کاغذ پر سیدھی لائن ڈرا نہیں کرنی آتی۔ میرا خیال ہے مجھے تم سے ڈایا گرامز بنانی سیکھنی چاہئیں۔"

مجھ سے۔۔۔؟۔۔۔ میں۔۔۔ تمہیں۔۔۔" اس کی بات پر وہ مسکرایا بھی تھا اور کچھ کہنا بھی چاہا تھا مگر لفظ ہی نہ مل سکے۔ سلیمان جواب طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ڈایا گرامز تو ڈایا گرامز ہوتی ہیں۔ انہیں سکھایا کیسے جا سکتا ہے، اب کی بار جب میں پریکٹیکل نوٹ بک پہ ڈایا گرامز بناؤں گا تو تم بھی دیکھ لینا۔ میں بھی انہیں ویسے ہی ڈرا کرتا ہوں جیسے تم۔۔۔"

وہ عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ سلیمان نے نفی میں گردن ہلائی۔

گیمز بھی تو گیمز ہوتی ہیں مگر ہم ایک دوسرے کو گیمز بھی تو سکھاتے ہیں۔ ہم دونوں کرکٹ کھیلتے ہیں مگر تم جلدی آؤٹ ہو جاتے ہو جبکہ میں تو اتنا اچھا پلیئر ہوں اس کا مطلب یہی ہے نا کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے۔ میرا ہاتھ کرکٹ بیٹ کو جتنا اچھے طریقے سے ہینڈل کر سکتا ہے اتنا پینسل کو نہیں جبکہ تمہارا ہاتھ پینسل کو زبردست طریقے سے ہینڈل کرتا ہے مگر بیٹ کو نہیں۔۔۔ دونوں باتوں میں فرق ہے نا۔۔۔ تو پھر سکھاؤ گے مجھے ڈایا گرام بنانا؟"

اپنی دلیل بیان کر دینے کے بعد سلیمان نے ایک بار پھر سوال کیا تھا۔ اسے اتنی لاجیکل باتیں کہاں کرنی آتی تھیں اگر آتی ہوتیں تو شاید وہ بیٹ اور پینسل کو مماثل قرار دینے پر زبردست بحث کرتا۔ مگر اب وہ دل ہی دل میں سلیمان کی گفتگو کو سراہنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا ساتھ ہی اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا تھا کہ واقعی وہ کرکٹ کھیلنا نہیں جانتا۔

ہاں سکھاؤں گا۔۔۔ اگر تم مجھے کرکٹ کھیلنا سکھاؤ تب۔" اس نے یکدم ہی شرط عائد کی تھی۔

اوکے۔۔۔ ڈن" سلیمان نے مسکرا کر فوراً اس کی بات مان لی تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اسے کرکٹ کھیلنے کا اتنا کوئی خاص شوق نہیں تھا لیکن چونکہ سلیمان کھیلتا تھا اور بہت اچھا کھیلتا تھا اس لئے اس کے کہنے پر وہ بھی بریک میں کھیل لیا کرتا تھا۔ اب جب سلیمان نے اسے کرکٹ سکھانے کی

ہامی بھرلی تھی تو وہ ایک نئی گیم کھیلنے کے شوق میں پر جوش ہو رہا تھا۔

پچیس تیس منٹ کی بریک میں کوئی کتنا کھیل سکتا تھا یا کسی کو کتنا سکھا سکتا تھا سلیمان کو تو گھر جا کر اپنے کزنز اور محلے سے دوستوں کے ساتھ بھی کھیل لیا کرتا تھا جبکہ وہ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا سو اسکول میں ہی اگر انہیں بیٹ مل جاتا تو وہ کھیل لیا کرتے تھے۔مسئلہ یہ تھا کہ ان کی کلاس میں ایک دو بچے ہی بیٹ لاتے تھے انہیں خود بھی کھیلنا ہوتا تھا۔ایک بیٹ صرف اس لئے مختص نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سلیمان اسے کرکٹ کے اسرار و رموز سکھا سکے۔اسکا حل بھی سلیمان نے ہی نکالا۔

اگر تم ایک بیٹ خرید لو تو ہم اپنی مرضی سے کھیل سکیں گے۔روز روز کے مانگنے سے تو نجات ملے گی۔"

اس نے سلیمان کی بات مان کر بیٹ لانے کی ہامی بھرلی تھی مگر اسے نہیں پتا تھا کہ یہ"ہاں" اسے کس قدر مہنگی پڑنے والی ہے۔

☆ ☆ ☆

امی! آپ مجھے ایک بیٹ لادیں گی؟" اس نے کھانا کھاتے ہوئے امی روز امی سے فرمائشی درخواست کی تھی۔اس کے ابو اس وقت اکیڈمی میں مصروف تھے۔امی نے حیرانی سے اسکا چہرہ دیکھا۔وہ اس قسم کی فرمائش پہلے کہاں کرتا تھا۔یہ تبدیلی اس میں کب آئی تھی انہیں پتا نہیں چلا تھا۔وہ پہلے سے زیادہ خوش رہنے لگا تھا۔یہ بات تو وہ محسوس کر چکی تھیں۔اس کے کھانے پینے کے معاملات میں نخرے اور سستی بھی پہلے سے کم ہو گئی تھی مگر ایسی فرمائش وہ اس کے ابو سے پوچھے بغیر پوری نہیں کر سکتی تھیں۔ان کی بیٹی ابو کی لاڈلی تھی۔وہ ہر چیز دھڑلے سے مانگتی تھی جبکہ ان کا بیٹا کوئی چیز مانگ بھی رہا تھا تو ڈرتے ڈرتے اور زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ ایک دم ہاں بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے انکار کر دیں یا فی الحال ٹال دیں۔

سلیمان مجھے کرکٹ کھیلنا سکھائے گا۔وہ کرکٹ کا بیسٹ پلیئر ہے۔"

اس نے انہیں بیٹ لانے کی وجہ بھی بتادی تھی۔وہ ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" انہوں نے شاید بات کو ٹالنے کی غرض سے سوال کیا تھا۔

ٹھیک۔۔۔ہمیں ابھی سے ناینتھ کلاس کا سلیبس پڑھا رہے ہیں نا۔۔۔مشکل ہے مگر۔۔۔مجھے نہیں لگتا۔"

وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔امی اس کی پڑھائی کے متعلق سوالات کم ہی کرتی تھیں۔ایسی ساری باتیں ابو کیا کرتے تھے۔اس کی امی تو بس اس فکر میں رہتی تھیں کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھا کرے،کھایا پیا کرے اور اپنی عمر کے باقی بچوں کی طرح خوش باش رہا کرے۔اس کے چہرے پر پھیلے خوشی کے احساس کو دیکھ کر یکدم ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

تم سلیمان سے کہو وہ بیٹ لے آئے۔میں تو مارکیٹ جا نہیں پاؤں گی۔وہ بیٹ لے آئے گا تو تم اس کو ادائیگی کر دینا۔" انہوں نے مسکرا کر اسے کہا تھا۔

ٹھیک ہے۔۔۔میں اسے کہوں گا کہ وہ مجھے لادے۔" امی کے اتنی جلدی مان جانے پر وہ مطمئن ہوا تھا۔

کیا؟" اس کے عقب سے یکدم ہی ابو کی آواز ابھری تھی۔ وہ نجانے کب آئے تھے یا اسے پتا چل سکا تھا نہ امی کو۔

بیٹ" وہ فوراً اپنی دھن میں بول گیا تھا مگر دل ہی دل میں خوف کے احساس نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

بیٹ کیا کرنا ہے؟" وہ اس کے قریب آ گئے تھے پھر انہوں نے اس کے ساتھ والی کرسی گھسیٹی تھی۔ ان کے چہرے پر وہ ہی تاثرات تھے جن سے وہ ڈرتا تھا۔

سلیمان مجھے کرکٹ سکھائے گا" اس نے ان کے تاثرات سے خائف ہو کر فوراً کہا تھا۔

کیوں؟" انہوں نے تیسرا سوال پوچھا۔ اس کا سوال کا جواب وہ اتنی جلدی دے نہیں پایا تھا۔

وہ۔۔۔ میں۔۔۔ دراصل" اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔

تم اسکول پڑھنے جاتے ہو یا کرکٹ کھیلنے؟" انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ سرد لہجے میں سوال کیا تھا۔

بولو" اس کے خاموش رہنے پر وہ دھاڑ کر بولے

پڑھنے" اس نے بیحد عجلت میں جواب دیا۔ وہ اس کے دائیں جانب بیٹھے تھے۔ انکا ہاتھ اس کے چہرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے جواب دے دینے کے بعد وہ ذرا سا بھی دور نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اس کے کان کو زور سے کھینچا تھا۔

تو پھر۔۔۔؟ جب پڑھنے جاتے ہو تو بیٹ کیا کرنا ہے؟" اسے کان سے پکڑ کر انہوں نے اسے اپنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس کی امی کا دل تاسف سے بھر گیا تھا۔ وہ اس کی بات ٹال کر اسے بچا سکتی تھیں مگر۔۔۔

بولو۔۔۔ جواب دو" انہوں نے اسے پہلا تھپڑ رسید کیا تھا۔

بہت دن سے غور کر رہا ہوں کہ صاحبزادے کے رنگ ڈھنگ بدلے بدلے سے نظر آ رہے ہیں۔ پڑھائی میں دھیان کم ہے۔ کتابیں کھولنے کو کہو تو ٹال مٹول سے کام لینے لگتا ہے۔ اب وہ وجہ سمجھ میں آ رہی ہے۔"

انہوں نے دوسرا تیسرا تھپڑ بھی رسید کر دیا تھا۔ اس کی امی اٹھ کر باہر چل دی تھیں ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بیٹھ کر تھپڑوں کا یہ کاؤنٹ ڈاؤن دیکھ سکتیں۔

کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ان خرافات سے دور رکھنا ہے خود کو۔۔۔ یہ سب کام کرنے کے لئے اسکول نہیں بھیجتا میں تجھے۔۔۔ تو میرا بیٹا ہے ظہیر عباس کا نہیں۔۔۔ تجھے بڑے ہو کر عمران خان نہیں بننا۔۔۔ تجھے اپنے باپ کا خواب پورا کرنا ہے۔۔۔ اور یہ سلیمان کون ہے؟ بول۔۔۔ بتا۔۔۔ کون ہے؟ بتا اب مانگے گا بیٹ۔۔۔ اب کہے گا بیٹ لا کر دینے کے لئے۔۔۔ بتا۔۔۔ بول" وہ اسے مسلسل پیٹ رہے تھے۔

نہیں ابو جی۔۔۔ ہائے ابو جی۔۔۔ مت ماریں ابو جی" وہ مسلسل چلانے اور رونے میں مصروف تھا۔

☆ ☆ ☆

آج تمہیں ہوا کیا ہے؟" بیحد اکتا کر بالآخر پوچھ لیا۔ پہلا پیریڈ تھا اور نجانے کیوں سر اظہر ابھی تک کلاس روم میں نہیں آئے تھے۔ وہ

انہیں مینٹمس کرواتے تھے۔ کامران کو اس کی خاموشی سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ منہ لٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے روزانہ کی طرح سلیمان کے لئے اپنے ساتھ والے ڈیسک پر جگہ بھی نہیں رکھی تھی۔ ان سب میں جو بھی پہلے آتا تھا وہ اپنے دوست یا دوستوں کے لئے جگہ ضرور رکھ لیتا تھا۔ سلیمان روزانہ لیٹ آتا تھا سو جگہ رکھنے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ اس نے چونکہ آج جگہ نہیں رکھی تھی اس لئے نافع اس کے ساتھ والے ڈیسک پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سلیمان کی درخواست پر نافع نے جگہ چھوڑ دی تھی کیونکہ سب ہی کلاس فیلوز ان کی دوستی سے واقف تھے۔ سلیمان کے بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

بیمار ہو گیا؟" اس نے پھر پوچھا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اس اثناء میں سر اظہر کلاس میں آ گئے تھے۔ وہ ان کے کلاس انچارج تھے۔ رول کال کے بعد انہوں نے نوٹ بکس نکالنے کے لئے کہا تھا۔

سلیمان کل سے آپ یہاں نہیں بیٹھیں گے۔" سر نے کہا سلیمان سے تھا مگر منہ اٹھا کر ان کی جانب وہ دیکھنے لگا۔ اگر سر، سلیمان کو اس کے ساتھ بیٹھنے سے منع کر رہے تھے تو اس کا مطلب تھا ان تک آرڈرز آ چکے تھے۔

کیوں سر؟" سلیمان نے منہ بسور کر پوچھا۔ اس طرح کی وارننگز تو ان بچوں کو دی جاتی تھیں جو کلاس میں پڑھنے سے زیادہ باتیں کرنے میں وقت گزارتے تھے جبکہ وہ دونوں تو کبھی ٹیچرز کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔

ہم باتیں نہیں کرتے سر پھر آپ ہمیں ایک ساتھ بیٹھنے کیوں نہیں دے رہے؟" یہ سوال بھی سلیمان نے ہی پوچھا تھا۔ سر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود مارکر لے کر وائٹ بورڈ کی طرف مڑ گئے۔ سلیمان کا منہ لٹک گیا تھا۔ سارا پیریڈ اسی طرح گزر گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن پیریڈ آف ہونے کے بعد سر کے کلاس روم سے باہر جاتے ہی سلیمان نے کھل کر غصے کا اظہار کیا تھا۔

سر اچھا نہیں کر رہے۔۔۔ یہ تو بالکل غلط بات ہے۔ جب ہم شکایت کا موقع نہیں دیتے تو پھر ہمیں سزا کیوں دی جا رہی ہے۔" سلیمان نے یہ کہتے ہوئے اس کی مرضی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے پوچھ لیتا تو شاید سر اظہر سے اتنی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ اگلے تین پیریڈز اسی طرح گزر گئے تھے۔ سلیمان اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔ وہ سر اظہر سے ایک بار بات کرنا چاہتا تھا۔ چوتھے پیریڈ کے بعد بریک ہو جاتی تھی۔ بریک میں سلیمان کے کہنے پر اس نے باہر جانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

آج تو ایک عجیب دن چڑھا ہے۔۔۔ اب تمہیں کیا ہوا ہے۔۔۔ کلاس روم میں بیٹھ کر کیا کرنا ہے۔۔۔ بس مجھے نہیں پتا آؤ باہر چلیں۔" سلیمان نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑوا لیا۔

مجھے باہر نہیں جانا۔۔۔ تم چلے جاؤ۔" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا تھا۔ اس نے اپنا منہ فزکس کی بک میں گھسا رکھا تھا۔

میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔۔۔ آؤ سر اظہر سے بات کریں کہ وہ ہمیں ساتھ بیٹھنے سے کیوں منع کر رہے ہیں۔" سلیمان نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

میں نے کہہ دیا نا مجھے باہر نہیں جانا۔۔۔ تم چلے جاؤ۔" اب کی بار اس کے لہجے کی قطعیت نے سلیمان کو حیران کیا تھا۔ وہ برا مان کر باہر کی

جانب چل دیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ جو بات سلیمان سر اظہر سے پوچھنے گیا تھا وہ بات اسے پہلے ہی پتا تھی۔

کل سے اگر تم کسی سلیمان کے ساتھ بیٹھے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" اس کے کانوں میں ایک فقرہ گونجا تھا۔ وہ جانتا تھا کل کے بعد ابو یقیناً اس کے کلاس انچارج کے ساتھ بات کریں گے۔ اس کے اندازے کی تصدیق نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے یقین پر "مثبت" اسٹیمپ لگی تھی۔

بریک سے کچھ پہلے سلیمان واپس آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چبھن اور کاٹ تھی۔ اس نے اپنا بیگ اس ڈیسک سے اٹھایا تھا اور خاموشی سے کچھ کہے بنا وہ دوسری رو کے ایک خالی ڈیسک پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس دن ان دونوں کے درمیان دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگلے دن بھی جب وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نظر نہ آئے تو کلاس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

تمہاری اور سلیمان کی لڑائی ہو گئی کیا؟" اس سے بھی کچھ کلاس فیلوز نے پوچھا تھا۔ وہ جواب میں نہیں کہہ کر خاموش ہو جاتا تھا جبکہ سلیمان نے سب کلاس فیلوز کے درمیان کلاس روم میں علی الاعلان اس بات کا اعتراف کیا تھا لیکن اپنے طریقے سے۔۔۔

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ میرے انکے ساتھ بیٹھنے سے انکی پڑھائی کا حرج ہوتا ہے تو انکا میرے ساتھ بات نا کرنا ہی بہتر ہے اور ویسے بھی ایک ایسے لڑکے کے ساتھ دوستی رکھنا جسے کوئی گیم نہ کھیلنی آتی ہو، جو فزکس کا ایک نیومیریکل یا میتھس کا ایک کوئسچن غلط ہو جانے پر بچوں کی طرح روتا ہو اور جو کسی کے ساتھ اعتماد کے ساتھ بات نہ کر سکے، دوستی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ایسا لڑکا نارمل نہیں ہو سکتا اور میں کسی ابنارمل کو دوست بنانا نہیں چاہتا۔"

ابو کی مارنے جو دکھ دیا تھا سو دیا تھا لیکن سلیمان کے الفاظ نے تو اسے ادھ موا کر دیا۔ اس کے بعد سے سلیمان نے اسے بالکل اگنور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اگر کبھی اسکی جانب دیکھتا بھی تھا تو اسکی آنکھوں میں عجیب سی کاٹ ہوتی تھی جو اسے توڑ کر رکھ دیتی تھی وہی بچہ جو اپنے خول سے باہر آ کر دنیا کے رنگوں کو دیکھنا پرکھنا چاہتا تھا یکدم پھر سے اپنے خول میں ڈبک گیا۔ زندگی میں ایک بار پھر صرف کتابیں رہ گئیں تھیں۔

یہ صورتحال اسے دن بدن پہلے سے زیادہ چڑ چڑا اور زود رنج بنا رہی تھی۔ سلیمان کی وجہ سے جو بچے اس کے قریب آئے تھے وہ بھی اب اسے منہ نہیں لگاتے تھے۔ زندگی پرانی ڈگر پر واپس آ گئی تھی۔ وہ خود کو ایک بند گلی میں محسوس کرتا جہاں اسے واپسی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ پہلے کی طرح اس نے اپنا سارا وقت کتابوں کی دنیا میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ ایک حساس ذہن رکھنے کی وجہ سے اسے سب کلاس فیلوز کا رویہ ہرٹ کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے متعلق سوچتا لیکن وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ اس نے خاموشی کو اسقدر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا کہ کسی سے بھی بات کرنا ختم کر دیا۔ کوئی مخاطب کرتا تو بات کا جواب دے دیتا ورنہ اپنی دنیا میں گم رہتا۔ کلاس فیلوز نت نئے نام رکھ کر اسے چڑانے کی کوشش کرتے کوئی خبطی کہتا اور کوئی پروفیسر مگر وہ سب کو اگنور کرتا رہتا۔ اس صورتحال میں سب سے زیادہ مطمئن ظاہر ہے اس کے ابو ہی تھے۔ وہ گھنٹوں اسے کتابوں میں گم خاموش دیکھتے تو مطمئن ہو جاتے۔ ان کے لئے یہ سب سے زیادہ اہم تھا کہ اس کے رزلٹس سو فیصد آ رہے ہیں۔ وہ کبھی بھی نہیں سوچتے تھے کہ انکا سخت رویہ ان کے بچے کی شخصیت کو کیا نقصان پہنچا رہا ہے۔ وقت مزید آگے گزرا۔ وہ اب نہم کلاس میں آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شہروز کوئی مسئلہ ہے کیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا" بھابھی رومانہ نے اسے لاؤنج میں داخل ہوتا دیکھ کر پوچھا تھا۔ شہروز ابھی سو کر اٹھا تھا۔

رات ٹھیک طرح سے نیند نہیں آسکی تھی اس لئے ابھی بھی دماغ مکمل طور پر بیدار نہیں ہوا تھا۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور سارے وجود پہ اتنی کسلمندی چھائی تھی کہ بلاوجہ بیزاری محسوس ہو رہی تھی، غصہ سا آئے جا رہا تھا اسی لئے بھابھی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا تھا۔ امی ٹی وی دیکھنے میں مگن تھیں بھابھی کے سوال پر اس کی جانب پلٹیں اور اسکو دیکھتے ہی وہ بھی پریشان کن لہجے میں بولی تھیں

کیا ہوا شہروز۔۔۔ کیسا چہرہ اترا ہوا ہے۔۔۔ سب خیریت ہے نا" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ بھابھی کو پکڑایا تھا اور بے چین سے لہجے میں اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ وہ صوفے پر بالکل ان کے ساتھ آ بیٹھا۔

بخار ہے کیا۔۔۔ آنکھیں بھی کیسی سرخ ہو رہی ہیں" انہوں نے اس کے سر ماتھے اور گردن پر باری باری ہاتھ رکھا تھا۔ شہروز کو بخار تھا نہ اسکی طبیعت خراب تھی مگر ماں کے لمس نے ایسا سکون بخشا تھا کہ اس نے خود کو مزید بیمار ظاہر کرنے کے لئے منہ سا بنا لیا تھا۔ امی نے اسکا ہاتھ تھام لیا۔

ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔۔۔" وہ اسکو محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں حالانکہ اسکا بدن گرم نہیں تھا مگر ماں کا دل بے چین ہو گیا تھا۔

ٹھیک ہوں امی بس سر میں درد ہے۔۔۔ رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکا" اس نے تساہل سے کہتے ہوئے انکی گود میں سر رکھ لیا تھا۔ وہ دایاں ہاتھ نرمی سے اس کے بالوں میں چلانے لگی تھیں

کیوں۔۔۔ کیوں نہیں سو سکے۔۔۔ کوئی پریشانی تھی کیا" وہ اولاد کے معاملے میں بڑی جلدی فکرمند ہو جانیوالی ماں تھیں۔ شہروز نے انکا بایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ایسا سکون نصیب ہوا تھا کہ ہر مسئلہ حل ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دنیا کا کوئی علم کوئی سائنس کوئی فلسفہ آج تک کوئی ایسی تھیوری اخذ نہیں کر پایا جو ماں اور اولاد کے تعلق کو ٹھیک سے سمجھ سکے اور واضح کر سکے۔

ماں کے لمس سے ایک ایسی منفرد توانائی حاصل ہوتی ہے جو ساری بیزاری کو اپنے اندر جذب کر کے خوشیوں کو سو دو سو گنا کر دیتی ہے اور پریشانیاں صفر ضرب صفر ہو جاتی ہیں جبکہ آخر میں حاصل جمع کل ملا کے آتا ہے۔۔۔ "سکون۔۔۔ ڈھیروں سکون"

امی کی انگلیوں سے ایسی ہی توانائی شہروز کے بالوں میں جذب ہونے لگی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ اسے جس سکون کی ضرورت تھی وہ خود بخود اس کے وجود میں اترنے لگا۔ وہ مسکرایا تھا اور امی کو بھی جیسے ایسی ہی ایک توانائی مل گئی تھی۔ وہ مطمئن ہوئی تھیں۔

ماں کے لمس سے جو توانائی اولاد کو ملتی ہے۔۔۔ اولاد کی صرف ایک مسکراہٹ سے ہی ماں کو وہی توانائی دو سے یا شاید سو دو سے ضرب ہو کر ملنے لگتی ہے۔ اولاد کی محبت تو شاید سمجھ میں آ بھی جائے مگر ماں کی سائنس کو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔ وہ اولاد کے لئے پریشان ہو تب بھی روتی ہے اور خوش ہو تب بھی اسکی آنکھیں پانیوں سے ہی بھرتی ہیں

آپ فکرمند نا ہوں آنٹی۔۔۔ یہ بیمار ہے نا پریشان ہے اسے عمر کی یاد ستا رہی ہے۔ آپ ذرا فون ملائیں اسے اور کہیں کہ فوراً گھر واپس آئے ہمارا بچہ اداس ہے" بھابھی شرارتی انداز میں کہہ رہی تھیں

شہروز نے ناک چڑھایا۔

رہنے دیں اسے وہاں ہی جہاں وہ ہے۔۔۔ آپکو گھر میں سکون برا لگ رہا ہے" اس نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔

لیں آنٹی سمجھ میں آ گئی مجھے شہروز کی بیماری۔۔۔اسکا عمر کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے اسی لئے بوتھا اتنا سوجا ہوا ہے" بھابھی نے بالکل صحیح تشخیص کی تھی۔شہروز نے آنکھیں کھول کر انکی جانب دیکھا پھر مصنوعی انداز میں لمحہ بھر کے لئے مسکرا کر انہیں دیکھا اور دوبارہ منہ بنالیا

آپ بہت ذہین ہوتی جارہی ہیں۔۔۔دھیان رہے بہروز بھائی کو ذہین عورتوں سے چڑ ہے۔۔"اس نے انہیں چڑایا تھا وہ اسی کی بھابھی تھیں اسکی بات کاٹ کر بولیں۔

تم بہروز کی بات کررہے ہو مجھے تو خود ذہین عورتوں سے بڑی سخت چڑ ہے" انہوں نے لفظ "عورت" پہ زور دیا تھا۔

بس بس اب وہی گھسا پٹا پرانا لطیفہ مت سنائیے گا کہ آپ تو ذہین لڑکی ہیں عورت نہیں۔۔۔۔ہمیں جسیں آتی ان ڈیڑھ سوسال پرانے لطیفوں پہ ہنسی شہروز ساتھا انداز میں بولا تھا

اچھا تو پھر بتاؤ تمہیں کونسا لطیفہ سنایا جائے"

باتیں مت بنائیں اور جا کر میرے لئے ناشتہ بنا کر لائیں۔۔۔بہت ست ہوتی جارہی ہیں آپ۔۔۔بہروز بھائی نے بہت سرچڑھالیا ہے آپکو۔

جی جی بادشاہ سلامت! آپکے حکم کا ہی انتظار کررہی تھی" وہ خوشدلی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں

ایسے مت کہا کرو۔۔۔رومانہ بہت اچھی ہے مگر ہے تو بھابھی نا۔۔۔برا بھی مان سکتی ہے۔"رومانہ کے باہر نکلتے ہی امی نے اسے ٹوکا تھا

امی میرا دل آج بہت جلا ہوا ہے پلیز آج کوئی اچھی سی بات کریں۔۔۔آج کوئی نصیحت سننے کا دل نہیں کررہا" امی نے اسکے بالوں میں مزید ملائمت سے انگلیاں چلائی تھیں

کیا ہوا ہے شہروز۔۔کیا واقعی عمر سے جھگڑا ہوا ہے۔۔۔وہ بھی دو تین دن سے وہیں تمہاری پھپھو کے گھر ہی جم کر بیٹھا ہوا ہے۔۔۔شکل نہیں دکھائی اس نے بھی۔۔۔پہلے تو کبھی اتنے دن نہیں رکا وہ وہاں" انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

شہروز نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

امی میرا دماغ خراب ہے نا کل۔۔۔میں نے ہی اسے کہا ہے کہ وہیں رہے خبردار جو یہاں آیا۔۔۔وقت برباد کرنے کے علاوہ اس جاہل کو اور آتا کیا ہے" وہ چڑ کر بولا تھا

ہم۔۔۔" انہوں نے ہنکارا بھرا پھر گہری سانس لے کر بولیں۔

کس بات پر جھگڑا ہوا ہے"

امی شہروز نے آنکھیں کھولیں پھر بیزاری سے بولا۔

امی جھگڑا نہیں ہوا۔۔۔بتایا تو ہے آپکو"

بیٹا تمہاری ماں ہوں۔۔۔مائی بھاتاں نہیں ہوں کہ تم آسانی سے بیوقوف بنالوگے اور تمہاری ماں بن جائیگی" وہ اب مصنوعی ناگواری لیے

میں بھر کر بولی تھیں

یا خدایا سب ذہین عورتیں میرے اردگرد ہی کیوں اکٹھی ہوگئی ہیں۔۔۔ یہ تو سخت ناانصافی ہے۔۔۔ یا اللہ ایک ماں دی وہ بھی ذہین۔۔۔ اور بائی داوے مائی پھاتاں کو بیوقوف بنانا آسان ہوتا ہے کیا؟۔۔۔ کاش آپ مائی پھاتاں ہوتیں۔۔"

وہ مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے انکی توجہ اصل بات سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔

بکومت اور جو پوچھا ہے وہ بتاؤ" انہوں نے اسے گھر کا تھا۔

امی جھگڑا نہیں ہوا بس کبھی کبھی عمر غصہ بہت چڑھا دیتا ہے۔۔۔ اسکی جلد باز اور جذباتی طبیعت بعض اوقات میرے لئے بہت پریشانیاں پیدا کردیتی ہے اور پھر وہ اپنی غلطی بھی تسلیم نہیں کرتا بالکل ہی ڈھیٹ بن جاتا ہے" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ہوا کیا ہے" وہ گردن ہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھیں

اس بات کو چھوڑ دیں امی۔۔۔ آپ جانتی ہیں میں نہیں بتاؤنگا" اس کے لہجے میں بیچارگی تھی۔

تمہاری بات کسی حد تک ٹھیک ہے۔۔۔۔ وہ جذباتی تو ہے لیکن ضدی نہیں ہے۔۔۔ تمہارے چاچو کی سخت طبیعت نے اس طرح کا بنا دیا ہے اسے۔۔۔ اسکو سمجھانا مشکل ہے لیکن جس بات کو سمجھ لیتا ہے پھر اسے آخری حد تک نبھاتا ہے۔۔ اچھا بچہ ہے مجھے تو پسند ہے میرے لئے تو تم دونوں ایک برابر ہو"

وہ بردباری سے اسے سمجھا رہی تھیں شہروز کو ایک بار دل ہی دل میں غصہ آیا

چلیں اس بہانے یہ تو پتا چلا کہ آپ مجھے بھی پسند کرتی ہیں۔۔۔" اس نے منہ بنا کر کہا تھا اور دوبارہ انکی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔۔ یہ باتیں امی اسکے اور عمر کے ہر جھگڑے کی تفصیلات سننے کے بعد کیا ہی کرتی تھیں۔ اسکا ذہن پھر الجھنے لگا تھا۔ منگنی ہوجانے کے صرف چند ہی بعد دن بعد اسے اس طرح توڑ دینا کم از کم کوئی شرارت نہیں تھی کہ عمر کو فوراً معاف کردیا جاتا مگر آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہوگا اسکا ذہن یہ سوچنے سے بھی قاصر تھا۔

☆ ☆ ☆

شہروز کے سیل کی بیپ بج رہی تھی۔ اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں یہ سوچ کر سیل اٹھایا تھا کہ شاید عمر کی کال ہوگی۔ عمر نے اسکو اتنا زچ کردیا تھا کہ وہ اب کچھ دن تک نا اسکی شکل دیکھنا چاہتا تھا نا اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ سکرین پر چمکنے والا نمبر دیکھ کر اسے مزید اکتاہٹ ہوئی وہ اس نمبر سے واقف نہیں تھا۔ وہ یونیورسٹی کی چند ایک کمیٹیوں کا ممبر بھی تھا اس وقت نجانے کس نے کس مقصد کے لئے اس سے رابطہ کیا تھا۔

ہیلو" اس نے بے حد سڑے ہوئے انداز میں کال ریسیو کی تھی مگر دوسری جانب سے نسوانی آواز سن کر وہ یکدم محتاط ہوا

اسلام وعلیکم کیسے ہیں بیٹا شہروز آپ"

وعلیکم سلام۔۔۔ الحمدوللہ۔۔" اس نے ذرا توقف کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اسکا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ یہ کون خاتون ہوسکتی

ہیں، وہ یہ آواز پہلی دفعہ سن رہا تھا۔اس سے پہلے اس نے یہ آواز نہیں سنی تھی یا شاید وہ اس آواز کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔وہ ممی کی کوئی دوست تھیں نا ہی اسکی کوئی آنٹی لگ رہی تھیں مگر وہ جس محبت بھرے انداز میں اسکی خیریت دریافت کر رہی تھیں یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے جانتی ہیں

آپکی یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے۔۔۔۔وائیوا ہونے والا ہے نا آپکا" وہ پوچھ رہی تھیں

شہروز یکدم مزید مشکوک ہوا۔یہ اس کے دوست طلحہ کی ممی ہو سکتی تھیں جو اپنے بیٹے کے متعلق جاننے کے لئے اسے فون کر رہی ہو سکتی تھیں۔طلحہ اکثر اپنی ممی سے جھوٹ بول کر شہروز سے یہ فیور لیا کرتا تھا کہ ممی کی کال آئے تو بول دینا کہ میں تمہارے ساتھ کمبائن اسٹڈی کر رہا ہوں مگر یہ طلحہ کی ممی کی آواز نہیں تھی۔وہ انکی آواز سے بخوبی واقف تھا

آپ آئے نہیں دوبارہ ہمارے گھر۔۔۔۔میں امائمہ سے ابھی آپکا ذکر کر رہی تھی" انکی آواز میں عجیب سا سوز تھا جو سننے والے کو انکی نرم مزاج طبیعت کا پتا دیتا تھا۔شہروز اس آواز کو پہچان چکا تھا، وہ امائمہ کی ممی کی آواز تھی۔وہ ان سے کئی بار مل چکا تھا لیکن فون پر آواز سننے کا یہ پہلا تجربہ تھا

جی جی آنٹی انشاءاللہ ضرور آؤنگا۔۔۔آپ سنایئے کیسے مزاج ہیں سر کی طبیعت کیسی ہے۔" اسکی ساری حسیات محتاط ہو گئی تھیں۔وہ اگر عمر کے متعلق بات کرنے والی تھیں تو یہ اس کے لئے بہت شرمندگی کی بات تھی۔اسے نہیں پتا تھا اسے انہیں کیا وضاحت دینی تھی۔

الحمدوللہ سب خیریت سے ہیں۔۔۔۔دراصل۔۔۔آہم آہم۔۔۔آپ کے پاس کچھ وقت ہے تو آپ مجھ سے ملنے آسکتے ہیں مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

جی آنٹی میں آجاتا ہوں ابھی۔۔۔۔نو ایشوز۔" شہروز نے دل مسوس کر کہا تھا۔وہ واقعی عمر کے کسی معاملے میں مزید خوار نہیں ہونا چاہتا تھا اور امائمہ کی ممی یقیناً اسی متعلق بات کرنا چاہتی تھیں

نہیں ابھی نہیں۔۔۔ابھی امائمہ اور آفاق صاحب گھر ہیں۔۔۔آپ چار بجے تک آسکتے ہیں۔" ان کے انداز میں عجیب سی التجاء تھی۔شہروز کا دل چاہا کہہ دے

نہیں آنٹی۔۔۔مجھے معاف کر دیں پلیز۔۔۔میں نہیں آسکتا مگر وہ اتنا بے مروت اور بدتمیز کبھی بھی نہیں تھا اسی لئے اس نے کہا تھا

جی آنٹی میں چار بجے آجاؤنگا۔۔۔" انہوں نے مشکور ہوتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔شہروز کو نئے سرے سے عمر پہ غصہ آنے لگا یہ اسکی زندگی کا ایک بدترین دن ثابت ہونے جا رہا تھا اور اسکی وجہ اسکا کزن عمر احسان ہی تھا۔

❁

(تنزیلہ ریاض کا یہ خوبصورت ناول "عہدِ الست" ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

تم کیوں اتنی پریشان ہو زارا۔۔۔ منگنی عمر کی ٹوٹی ہے تمہاری نہیں۔ شہروز نے اس کے الجھے بکھرے سراپے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ذرا کی ذرا طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولی تھی مگر ایک شکوہ سا آنکھوں میں در آیا تھا۔ شہروز اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اسے زارا پر بھی تھوڑا سا غصہ تھا کہ وہ اس دن عمر سے جھگڑے کے بعد اٹھ کر اس کے ساتھ کیوں نہیں آئی تھی۔

وہ دونوں اس وقت ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ دوپہر ڈھل کر سہ پہر بن چکی تھی۔ اس غیر ملکی ریسٹورنٹ میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ اکا دکا ٹین ایجیرز ہی نظر آ رہے تھے۔

یہ ریسٹورنٹ یونیورسٹی سے نزدیک پڑتا تھا اسی لئے زارا کو لے کر شہروز یہاں آ گیا تھا جو اس سے ملنے کے لئے بطورِ خاص یونیورسٹی آئی تھی۔ وائیوا تو اچھا ہو گیا تھا سو اس جانب سے شہروز کافی مطمئن ہو چکا تھا۔ عمر سے جھگڑے کے بعد اب تک ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ زارا کو اندازہ تھا کہ شہروز کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہوگا۔ وہ جلدی غصے میں نہیں آتا تھا لیکن جب اس کا مزاج کسی بات پر برہم ہو جاتا تھا تو نارمل ہوتے کئی دن لگ جاتے تھے اسی لئے وہ اس کی خفگی دور کرنے کی غرض سے یہاں تک اپنی ہر مصروفیت ترک کر کے آئی تھی لیکن شہروز کا رویہ اسے مزید بے چین کر رہا تھا۔ دوسری طرف شہروز نے بظاہر خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ وہ اب سارے قصے سے خود کو انتہائی لاتعلق ظاہر کر رہا تھا مگر اسے اندازہ بھی تھا کہ زارا نہ صرف پریشان ہے بلکہ الجھی ہوئی بھی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اتنی ہی حساس تھی۔ اب بھی شہروز کا طنزیہ جملہ سن کی اس کی آنکھیں جھلمل کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس لئے شہروز کی خفگی کا گراف بھی بڑھ رہا تھا۔

یہ سب کیسے حل ہوگا شہروز۔۔۔ اب کیا کریں گے ہم؟" وہ اسی الجھے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

تمہیں کوئی اور بات کرنی ہے یا ہم چلیں اب۔ شہروز کے اس طرح سے کہنے پر اُس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

ایسے مت کہو شہروز۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بہت پریشان ہے۔ شہروز کو خدشہ تھا کہ وہ رونے لگے گی لیکن اس کے عمر کی حمایت میں بولنے پر وہ بھڑک اٹھا۔

پریشان کون نہیں ہے زارا۔۔۔ وہ پریشان ہے۔۔۔ میں نہیں ہوں۔۔۔ میں تو پشیمان بھی ہوں۔۔۔ شرمندگی ہو رہی ہے مجھے اس سارے ایشو سے۔ مجھے لگتا ہے زارا اس سارے پرابلم کا ذمہ دار میں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس سارے پھڈے میں ٹانگ اڑانی ہی نہیں چاہئے تھی۔ عمر جو بھی کرتا، جیسے بھی کرتا۔۔۔ جس مرضی لڑکی سے کرتا۔۔۔ یا۔۔۔ نا کرتا یہ سب اسکا سر درد ہوتا۔۔۔ میرا نہیں۔۔۔ مجھے تو کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔۔۔ اب بتاؤ ڈیڈی مجھ سے پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔۔۔ کانچ کا گلاس نہیں ٹوٹا، رشتہ ٹوٹا ہے زارا بی بی۔۔۔ ڈیڈی ہی نہیں پوچھیں گے بلکہ چاچو بھی مجھ سے ہی سوال جواب کریں گے۔ سب بڑے تو یہی سمجھتے ہیں کہ عمر اپنی مرضی سے نہیں شہروز کی مرضی سے شادی کر رہا ہے۔ وہ امائمہ کو عمر کی نہیں میری پسند سمجھتے ہیں۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ زارا کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا جہاں عجیب سی سوچ نے تانا بانا بن رکھا تھا۔ اس نے شہروز کو اتنے جذباتی

انداز میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

اس میں غلط کیا ہے شہروز؟" زارا اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

تم مان کیوں نہیں لیتے کہ امائمہ تمہاری پسند ہے۔" وہ جیسے زچ ہو کر بولی تھی۔

زارا۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔" شہروز اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔ وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

ایسا ہی ہے شہروز۔۔۔ تمہیں امائمہ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں، جو ذہین ہوں۔ کانفیڈینٹ ہوں۔ انہیں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ ہو۔۔۔ وہ ویل مینرڈ ہوں اور امائمہ میں یہ سب کوالیٹیز ہیں اس لیے تم اسے پسند کرتے ہو بلکہ تم اس کے بہت بڑے ایڈ مائرر ہو۔۔۔ عمر کی پسندیدگی کو بھانپ لینے کے بعد سے لے کر اب تک جبکہ یہ منگنی ٹوٹ چکی ہے تم عمر کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے رہے ہو کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے جیسے اسے لائف پارٹنر نہیں جنت مل گئی ہو۔ تم عمر کی فیلنگز کو، اس کے ایموشنز کو سمجھ نہیں پا رہے۔۔۔ وہ ہرٹ ہو رہا ہے۔۔۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے شہروز جو فیڈر پی کر سو جائے یا کارن فلیکس کھا کر اسکول چلا جائے۔۔۔ تم۔۔۔ تم کو تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا شہروز۔۔۔ اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ ایسی کیا بات ہوئی جو اس نے یہ سب کیا۔۔۔ وہ جذباتی ہے۔۔۔ لیکن بدتمیز نہیں ہے۔"

پتا نہیں اس کی بات مکمل ہوئی تھی کہ نہیں مگر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ شہروز خاموش کا خاموش رہ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے زارا کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔

مجھے بھی اس پر غصہ آیا تھا لیکن میں نے غصہ پی لیا۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ وہ کتنا جذباتی ہے تمہیں بھی پتا ہی ہے اسکی ذہنی کیفیت کا۔۔۔ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا شہروز۔" وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولی تھی۔

تم نے اگر اپنا غصہ پی لیا تھا تو پھر تم ہی پوچھ لیتی کہ ایسی کیا بات ہوئی جو شہزادے عمر کے مزاج پر گراں گزری اور۔۔۔"

زارا نے اس کی بات کاٹ دی۔

میں پوچھ چکی ہوں" شہروز نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ اسکا موڈ بری طرح بگڑ چکا تھا۔

امائمہ نے مس بی ہیو کیا ہے اس کے ساتھ۔" زارا نے اپنی جانب سے کوئی گھبرا راز اگلا تھا مگر شہروز پر مطلق اثر نہ ہوا۔

مس بی ہیو۔۔۔ امائمہ نے۔۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ عمر نے تمہیں غلط سلط بات بڑھا چڑھا کر بتائی ہے۔۔۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔۔۔ زارا تم نہیں جانتی وہ بہت "سوفیسٹی کیٹیڈ" ہے۔ ہماری کلاس کی سب سے ایلی گینٹ اور گریس فل لڑکی۔"

میں نے کہا نا۔۔۔ تم کافی پسند کرتے ہو اسے۔" زارا کا چہرہ اور انداز بالکل نارمل تھا۔ اسمیں کوئی طنز یا کاٹ نہیں تھی۔ لیکن شہروز بھڑک اٹھا۔

زارا تم کہنا کیا چاہتی ہو۔۔۔ صاف صاف کہو نا۔۔۔ کیا کھچڑی پک رہی ہے تمہارے ذہن میں۔" وہ بھڑک کر بولا تھا۔ زارا نے جتاتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔

مجھے میری بات مکمل کرنے دو شہروز۔۔۔ تم امائمہ کو کافی پسند کرتے ہو لیکن ایک کلاس فیلو کی نظر سے۔۔۔ تم کہتے ہو وہ تمہاری کلاس کی

سب سے ایلی گینٹ اور گریس فل لڑکی ہے۔۔۔کیا پتا شہروز میرے کلاس فیلوز میرے بارے میں یہی کہتے ہوں۔"

وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی تھی۔شہروز اس کی بات کا مفہوم سمجھ نہیں پایا تھا۔

میرے کلاس فیلوز میرے بارے میں جو بھی کہتے ہیں تم اس سے کبھی متفق نہیں ہو گے کیونکہ تمہارا اور میرا رشتہ وہ نہیں ہے جو میرا اور میرے کلاس فیلوز کا ہے۔اسی طرح جب تم امائمہ کی بات کرتے ہو تو عمر کا اس سے ایگری کرنا ضروری تو نہیں ہے۔میں جانتی ہوں وہ امائمہ کو پسند کرتا ہے۔تمہارا اندازہ درست تھا کہ عمر کافی دیر سے امائمہ میں انٹرسٹڈ ہے۔اس نے یہ بات تب ہمیں بتائی جب ہم اس کے بارے میں مشکوک ہوئے۔اب وہ دونوں انگیجڈ ہیں۔انہیں اپنے طریقے سے اپنے تعلقات بہتر بنانے دو۔تمہاری کوئی بھی غیر ضروری نصیحت یا مشورہ عمر کو بلا وجہ تم سے متنفر کر دے گا۔تمہاری اور اس کی دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی شہروز۔۔۔امائمہ کی وجہ سے تم عمر جیسا دوست کھو دو گے۔۔۔تمہیں اچھا لگے گا۔"

وہ خاموش ہو گئی تھی۔شہروز ایک ٹک اسکی جانب دیکھ رہا تھا۔منہ سے کچھ نہیں بولا تھا لیکن دل میں اعتراف کر لیا تھا کہ زارا کچھ غلط نہیں کہہ رہی۔

زارا! تم کیا چاہتی ہو۔۔۔اب۔۔۔اب تو سب کچھ ختم ہو چکا۔۔۔تمہاری باتیں۔۔۔فرض کر لو اگر سچ بھی ہیں تو اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔عمر اس کی انگلی سے رنگ اتار کر لے آیا ہے۔۔۔یہ بات تو تم بھی مانو گی کہ عمر نے اپنی جذباتیت میں ہماری بہت انسلٹ کروائی ہے۔"اب کی بار شہروز نے تحمل سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

وہ جذباتی ہے میں مانتی ہوں لیکن اس نے انسلٹ نہیں کروائی ہماری۔یوں سمجھو بات ابھی ان دونوں کے درمیان ہی ہے۔جو بھی مس انڈرسٹینڈنگ اسے یا امائمہ کو ہوئی ہے وہ دور کی جا سکتی ہے۔اسے اپنی غلطی کا احساس ہے تو یقیناً امائمہ کو بھی ہو گا۔تم اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھنا چھوڑ دو شہروز۔۔۔تمہاری یہ باتیں اسے مزید ہرٹ کریں گی اور وہ پہلے سے زیادہ غصہ کرے گا۔اس کی واپسی میں زیادہ دن نہیں رہ گئے۔۔۔اس کو تمہاری فیور کی ضرورت ہے شہروز۔۔۔وہ پریشان ہے اور شرمندہ بھی۔"ناصحانہ انداز میں کہتی زارا اس لمحہ شہروز کو بڑی مختلف سی لگی۔

اسے شرمندہ تو ہونا ہی چاہئے۔۔۔لیکن۔۔۔پریشان کیوں ہے وہ؟"شہروز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔زارا چند لمحے کچھ نہ بولی پھر اس نے گہری سانس بھری۔

لوٹیل یو دا ٹروتھ۔۔۔وہ بھی کافی پسند کرتا ہے امائمہ کو۔۔۔تمہاری طرح"شہروز کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔زارا اس کے پاس عمر کی حمایت کرنے آئی تھی اور کافی اچھے طریقے سے یہ کام کر چکی تھی۔وہ یہ نا بھی کرتی تب بھی شہروز کو غصہ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد عمر کی فیور تو کرنا ہی تھی اور یہ بات وہ"ہوتی ہیں محبت میں بھی کچھ راز کی باتیں" کے مصداق زارا کو نہیں کہہ سکتا تھا۔اس کی اور عمر کی دوستی ایسی باتوں سے ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر جھگڑے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے تھے۔

اب کیا سوچ رہے ہو؟"اس کی استہزائیہ مسکراہٹ اور خاموشی سے اکتا کر زارا نے اسے ٹوکا تھا۔شہروز نے لمحہ بھر کیلئے اسکی آنکھوں میں جھانکا۔وہ پریشان تھی اور شہروز اسی ایک بات کو طول دے کر اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یار۔۔۔تمہارے کلاس فیلوز واقعی تمہیں ایلی گینٹ اور گریس فل کہتے ہیں۔"اس نے سر کھجاتے ہوئے مصنوعی حیرت سے کہا تھا۔زارا

کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

میرے لئے زیادہ اہم وہ ہے جو تم مجھے کہتے ہو۔" زارا نے مسکراتے ہوئے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تھا پھر شہروز کے چہرے پر استفہامیہ رنگ اور مسکراہٹ دیکھ کر بولی۔

ٹیوب لائٹ"

☆ ☆ ☆

اُس روز گھر میں ایک عجیب پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عین بارہ بجے معمول کے مطابق گھر کے باہر موٹر بائیک آ کر رکی۔ گھر کے مکین ہی نہیں در و دیوار بھی اس موٹر بائیک کی آواز کو بخوبی پہچانتے تھے۔ یہ اس کے ابو کی موٹر بائیک کی آواز تھی۔

ابو روزانہ اسی وقت گھر آتے تھے لیکن آج کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ اس موٹر بائیک کی آواز سن کر نا صرف وہ بلکہ اس کی امی اور چھوٹی بہن سہم سے گئے تھے۔

امی۔۔۔ امی جی۔۔۔" اس کے منہ سے کراہ تما آواز نکلی۔ اس کی امی نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا لیکن ہمیشہ کی طرح ان کی زبانی ہمدردی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی امی کا دل چاہا کہ بیٹے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیں مگر اس لمحاتی تسلی کا فائدہ بھی کیا تھا۔ یہ بات وہ سمجھ سکتی تھیں مگر ان کی سات سالہ بیٹی نہیں۔

کچھ نہیں ہوگا بھائی۔۔۔ آپ ڈریں مت۔" وہ اٹھ کر بھائی کے قریب آ بیٹھی اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے بہن کو دیکھا وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن ابو کی لاڈلی ہے مگر اس لمحہ لاڈ پیار بھی بے فائدہ تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پہلے آٹو میٹک لاک کھلنے کی آواز آئی پھر بائیک اندر کئے جانے کے آوازیں آنے لگیں۔ چند منٹ بعد لاک دوبارہ بند ہونے کی آواز آئی۔ ابو یقیناً بائیک اندر کھڑی کر چکے تھے۔ مزید چند منٹ کا کھیل باقی تھا۔ عادت کے مطابق ابو کو باہر لگے واش بیسن پر ہاتھ دھونے تھے۔ پالتو طوطے کا دانہ پانی چیک کرنا تھا اور اندر آ جانا تھا اور پھر۔۔۔

اسے یکدم ہی جھرجھری محسوس ہوئی۔ اب نل سے آوازیں گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند منٹ بعد پانی گرنے کی آواز آنا بند ہوگئی اور پھر جالی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کا تنفس تیز ہوا اور ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔ اس کی بہن نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا ابو اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے اسے اپنا ہاتھ بھائی کے ہاتھ سے ہٹا لینے پر مجبور کیا۔ وہ شاید سمجھ چکی تھی کہ تنکا بے شک ڈوبنے والے کو سہارا دے سکتا ہے مگر ڈوبنے والا تنکے کو کوئی سہارا نہیں دے سکتا۔ اس نے بہن کی جانب نہیں دیکھا مگر اس کا یہ اضطراری عمل اس پر بہت کچھ واضح کر گیا تھا۔ وہ ابو کے قدموں کی چاپ بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے الٹی گنتی شروع کر دی۔ ہر ہندسے کے ساتھ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ دس سے شروع کر کے بالآخر وہ زیرو پر پہنچ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ضبط کے باوجود پانی کے چند قطرے پھسلے۔ اس کی امی نے بیحد دکھ سے اس پانی کی جانب دیکھا چاہنے کے باوجود وہ شوہر کی جانب نہیں دیکھ پائی تھیں۔

اسی لمحہ جب اس سمیت، اس کی امی اور بہن خود کو متوقع صورتحال کے لئے تیار کر چکے تھے اچانک کال بیل بج اٹھی۔ ابو خاموشی سے واپس مڑ گئے۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سانس خارج ہوئی۔ ابھی وہ پہلو بھی نہیں بدل پایا تھا کہ اس نے ابو کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ دروازے سے ملنے والے کو فارغ کر آئے تھے۔ مزید چند لمحوں بعد وہ جو کچھ کرنے والے تھے اس کے لئے بہت ضروری تھا کہ گھر میں کوئی باہر والا موجود نہ ہو۔

اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ اس نے سر کو بالکل جھکا لیا۔ اب وہ کسی کی جانب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

میرے کمرے میں آؤ" اس کی سماعتوں نے ابو کے سرد لہجے میں دیئے گئے حکم کو سنا اب کی بار اس نے امی یا ابو کی جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر ابو کے پیچھے ان کے کمرے کی جانب چل دیا۔ امی نے اسے تسلی دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت مذہبی خاتون تھیں۔ کسی بھی مشکل لمحے میں وہ کوئی عملی قدم اٹھانے کی بجائے تسبیح کے دانے گرانے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس نے جھکے سر کیساتھ کمرے میں قدم رکھا۔

دروازہ بند کر دو" ابو نے پہلے سے زیادہ سرد لہجے میں حکم دیا۔ اس نے دروزہ بند کر دیا۔

کنڈی لگاؤ" اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ کنڈی ایک بار لگ جاتی تو اسے ابو کے علاوہ کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔

میں نے کہا کنڈی لگا دو" اسے متامل دیکھ کر وہ تلخ لہجے میں بولے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ کنڈی لگا دی اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ کمرے کے وسط میں پہنچ گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اس نے ابو کے ہاتھ میں اپنا اعمال نامہ دیکھ لیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں اس کے سیریز ٹیسٹ کی مارکس شیٹ تھی۔

یہ کیا ہے؟" انہوں نے اس کے سامنے اس کی مارکس شیٹ لہرائی۔ اس سوال کا جواب وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ وہ پھر غرائے۔

میں نے پوچھا ہے کچھ؟" ہر اگلا جملہ ان کے درجہ حرارت کو بڑھا رہا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" اب کی بار انہوں نے اس کا کان پکڑ لیا تھا۔

ما۔۔۔ مارکس شیٹ۔۔۔ میری مارکس شیٹ۔" وہ منمنا کر بولا۔ ابو نے اتنی زور سے اس کے کان کو پکڑ رکھا تھا کہ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میں جانتا ہوں یہ مارکس شیٹ ہے اور تم جانتے ہو میں مارکس شیٹ کے متعلق نہیں پوچھ رہا۔۔۔ وہ بتاؤ جو میں پوچھ رہا ہوں۔"

انہوں نے اس کا کان مروڑا۔ اس نے سہم کر التجائیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ سرخ ہوتے چہرے اور آنکھو کے ساتھ ڈبڈبائے لہجے میں اس نے کچھ کہنے کی کوشش مگر الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ تین نمبروں کے فرق سے وہ فرسٹ پوزیشن لینے میں ناکام ہو گیا تھا۔ اسکول میں میٹرک کے سالانہ امتحان سے پہلے ایک سیریز ٹیسٹ ہوتے تھے جن میں پورے میٹرک کے امتحان کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ ان ٹیسٹ کا پورا رزلٹ بنتا تھا۔ انہی ٹیسٹ میں وہ سیکنڈ پوزیشن لے سکا تھا۔ سلیمان حیدر اس بار فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ اگرچہ پہلی بار ہوا تھا مگر چونکہ یہ امتحان نہیں تھے ٹیسٹ تھے اس لئے اس کے ٹیچرز ابھی بھی اس کے متعلق بہت پر اعتماد تھے۔ وہ یقین سے اس کے بارے میں پیشگوئی کرتے تھے کہ وہ بورڈ میں پوزیشن ضرور حاصل کرے گا۔ ابو اس کے متعلق ہمیشہ مشکوک رہتے تھے۔ گزشتہ بار کے پروموشن ٹیسٹ میں اس کے اور سلیمان کے نمبروں میں آٹھ نمبروں کا فرق تھا۔ سلیمان کے آٹھ نمبر کم تھے اور اس نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔ ابو نے تب

ہی اسے وارن کر دیا تھا کہ اتنے کم نمبروں کا فرق کوئی فرق نہیں ہوتا اسے اگلی بار پچاس نمبروں کے فرق سے لیڈ کرنا چاہیے مگر وہ فرسٹ پوزیشن ہی نہیں حاصل کر پایا تھا۔

میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔" اسے مسلسل خاموش دیکھ کر وہ دھاڑے۔ اس نے پلکیں جھپکا کر آنسو پینے کی کوشش کی تھی۔

ابو جی۔۔۔وہ جو ایک سوال تھا ایکسر سائز 5 کا۔۔۔وہ جو میری بک میں غلط تھا وہ مجھے نہیں آتا تھا۔۔۔سر اظہر نے کہا تھا کہ وہ سوال پیپر میں نہیں آئے گا۔۔۔مگر وہ آ گیا۔۔۔ابو جی میں نے۔۔۔"

آنسو ضبط کرتے ہوئے وہ مسلسل بول رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اب بھی نہیں بولا تو ابو کا پارہ مزید چڑھ جائے گا۔

الو کے پٹھے صرف تیری کتاب میں غلط تھا۔۔۔اس کی کتاب میں غلط کیوں نہیں تھا جس نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔" اب کی بار اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ پڑا تھا۔

اس نے بھی اندازے سے کیا تھا لیکن۔۔۔"

وہ رونے لگا تھا جس کے باعث اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔

ہاں یقیناً خورشید نے خود آ کر سکھایا تھا اسے جو اس کا جواب صحیح آ گیا اور تیرا غلط۔۔۔" اسے ایک اور تھپڑ پڑا تھا۔

آپ سر رضا سے پوچھ لیں میں نے ان کو بھی بتایا تھا۔۔۔میں سچ۔۔۔"

پہلے تجھ سے تو پوچھ لوں پھر سر رضا سے بھی پوچھ لوں گا۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

میں نے کیا کہا تھا تجھ سے کہ تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔۔۔سارا دن کام چوروں کے ساتھ کھیلے گا تو یہی حال ہوگا۔ میں واقعی تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ اتنی مشکل سے عزت بنی ہے معاشرے میں۔۔۔تو میرا نام ڈبو دے۔۔۔لوگ کہتے ہیں دوسروں کو کیا پڑھائے گا یہ جب اپنے بیٹے کو نہیں پڑھا سکتا۔ اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ میرا بیٹا کام چور اور نکما ہے۔۔۔حرام خور کہتا ہے کتاب میں سوال غلط ہے۔۔۔تیری کتاب میں سوال غلط ہے صرف۔۔۔تیری کتاب میں۔۔۔صرف تیری کتاب میں۔"

وہ کہہ رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ دیکھے بنا کہ ان کا تھپڑ کہاں پڑتا ہے اسے پیٹ رہے تھے۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ معافی مانگ رہا تھا اور اس کی امی بند دروازے کے پیچھے آنسو بہانے میں معروف تھے۔

☆ ☆ ☆

ایک ایک نمبر کی جنگ میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔" اگلے روز ابو نے ناشتے کی میز پر سخت لہجے میں اسے نصیحت کی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔ وہ مزید کہہ رہے تھے۔

تین ہفتے رہ گئے ہیں اینول ایگزامز میں۔۔۔تم دودھ پیتے بچے نہیں ہو کہ ہر بات نئے سرے سے سمجھائی جائے۔ تمہیں خود اندازہ ہونا چاہیے کہ ہر لمحہ تمہارے لئے کتنا اہم ہے اب میں تمہیں وقت ضائع کرتے نہ دیکھوں اور نہ ہی تمہارے منہ سے یہ بات سنوں کہ فلاں چیز اس لئے غلط

ہو گئی کہ وہ کتاب میں غلط تھی۔"

ان کا انداز اور لہجہ بے لچک تھا مگر پھر بھی وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا ایکسکیوز قبول کر لیا گیا ہے۔ کل کی ساری رات رونے کے بعد وہ ان سے معافی مانگتے وقت دوبارہ نہیں رویا تھا۔ اسکا لہجہ نم تھا مگر اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں کو بھیگنے نہیں دیا تھا۔ ابو نے اسے واضح لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔

میں اب کبھی رنگوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔۔۔ میں ڈرائنگ بناؤں گا نہ کارڈز۔۔۔ رنگ اتنے اہم نہیں کہ میں ان کیلئے ابو کو ناراض کروں۔"

اس نے دل میں یہ تہیہ بھی کیا تھا۔ ابو نے منہ سے نہیں کہا تھا کہ وہ ڈرائینگ میں مصروف رہ کر اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ ابو اس کی خراب کارکردگی کی وجہ اسی چیز کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اسے چند روز قبل بہن کے ساتھ مل کر اسکی سہیلی کے لئے برتھ ڈے وش کارڈ بناتے دیکھ لیا تھا۔

تین ہفتے بعد اس کے ایگزامز شروع ہو گئے تھے۔ اسے خود پر بھروسہ تھا نہ اپنی محنت پر مگر وہ بے تحاشہ پڑھنے پر یقین ضرور رکھتا تھا۔ اس نے دن رات ایک کر کے پیپرز دیئے تھے۔ ابو کا اور ان کی ناراضی کا خوف امتحان کے خوف سے کہیں زیادہ تھا لیکن کوئی بھی خوف اس کی کارکردگی کو متاثر نہیں کر پایا تھا۔ اس کے سب ہی پیپرز اچھے ہو گئے تھے۔

پیپرز کے دو دن بعد ہی ابو نے اپنے کسی اولڈ سٹوڈنٹ سے اسے فرسٹ ائیر کا کورس لا دیا تھا حالانکہ ابھی پریکٹیکلز ہونا باقی تھے۔

ابھی ہم فرسٹ ائیر کی پڑھائی شروع نہیں کریں گے۔۔۔ فی الحال تم ان کتابوں کا، اپنی کورس آؤٹ لائن کا جائزہ لو۔۔۔ ان میں موجود تصویریں دیکھو۔۔۔ دل چاہے تو تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھرو۔۔۔ ہم پریکٹیکلز کے بعد پڑھائی شروع کریں گے۔" یہ ابو کا ایک اور حکم تھا جو انہوں نے بظاہر مسکرا کر دیا تھا یعنی وہ اسے خود رنگوں سے کھیلنے کی اجازت دے رہے تھے اس حکم نے اسے خوش کر دیا تھا۔ وہ کم از کم چند دن پڑھائی کے بوجھ سے خود کو بچا سکتا تھا۔ پریکٹیکلز کے لئے جرنلز بکس تیار تھیں۔ اس نے پریکٹیکلز کی کئی بار پریکٹس کی ہوئی تھی اس لئے یہ دن اس نے بہت ریلیکس ہو کر گزارے۔ یہی وجہ ہے کہ پریکٹیکلز کے بعد جب اس نے فرسٹ ائیر کی پڑھائی شروع کی تو وہ بہت تازہ دم تھا۔ ابو کا بے جا تسلط یہاں بھی جاری تھا۔

میتھس اسکا فیورٹ سبجیکٹ ہونے کے باوجود ابو نے اسے پری انجنئرنگ منتخب کرنے کا حق نہیں دیا تھا یہ بات جیسے اس کے پیدائش کے وقت سے طے شدہ تھی کہ اسے پری میڈیکل ہی لینا ہے اور وہ پری میڈیکل کی بکس ختم کرنے میں مگن ہو گیا۔

جب میٹرک کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو وہ فرسٹ ائیر کے کورس کا پچاس فیصد مکمل کر چکا تھا۔ میٹرک میں اس نے پورے سات سو اسی نمبر لے کر پورے لاہور بورڈ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اب کی بار اس نے ابو کو ڈانٹنے یا مارنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی اتنی بڑی کامیابی پر فیملی کے علاوہ اس کے ٹیچرز بھی بہت خوش تھے۔ اس کے اسکول کو یہ اعزاز پہلی مرتبہ حاصل ہوا تھا کہ وہاں پڑھنے والے کسی بچے نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کے حلقے میں جہاں اسے بے پناہ شاباشی ملی وہاں یہ بھی سننے کو ملا کہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ اکثر لوگوں کو یقین تھا کہ جس طرح وہ دن

رات کتابوں کو چاٹنے میں مصروف رہتا تھا ایسی صورت میں اسکا پوزیشن نہ لیتا حیران کُن امر ٹھہرتا۔ وہ بہر حال خوش تھا کہ وہ ابو کو خوش کر پایا۔ جب کالج میں ایڈمیشن کا معاملہ شروع ہوا تب بھی ابو نے اس کے لئے شہر کے سب بڑے کالجوں کو چھوڑ کر ایک غیر معروف کالج کا انتخاب کیا۔ اسی پر موقوف نہیں وہ بہت سے حیران کُن کام کر رہے تھے۔ اس کے ابو کو نجانے کیوں سب کو حیران کرنے کا شوق ہو چلا تھا اور اس کے معاملے میں تو یہ شوق انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ سب حیران ہوئے تھے کہ وہ ابھی چودہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ دوسرے بچوں نے فرسٹ ائیر کے کورسز خریدنے شروع کئے تھے اور اس نے پچاس فیصد سلیبس ختم کر لیا تھا اور اس کے اتنے شاندار رزلٹ کے باوجود اسے مشہور کالج میں داخلہ کیوں نہیں دلوایا گیا تھا۔

جس روز ابو نے اسکی کالج فیس جمع کروائی اسی روز سر شعیب جو اس کے اسکول کوآرڈینیٹر سے سیکنڈ پرنسپل بن چکے تھے اس سے ملنے چلے آئے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ اس نے جی سی اور ایف سی کالج کو چھوڑ کر ایک غیر معروف کالج کا انتخاب کیا ہے تو انہوں نے ابو سے کافی بحث کی۔

مجھے آج تک آپ کی کوئی لاجک سمجھ نہیں آئی۔ آپ اپنے بچے میں اعتماد اور حوصلہ پیدا کرنے کے اس قدر خلاف کیوں ہیں۔ میرا بچہ اتنا ذہین ہوتو میں ناچتا پھروں۔ آپ نے اس کی اتنی بڑی کامیابی پر اسے ٹھیک طرح خوش ہونے کا موقع بھی نہیں دیا۔ آپ خود کسی اسکول فنکشن میں آئے نہ اسے آنے دیا۔ پرنسپل صاحب کی ذاتی درخواست پر بھی آپ بضد رہے کہ میرے بچے نے ٹاپ کیا ہے نکاح نہیں کیا کہ اس کی دعوتیں کی جائیں۔ بچوں کے کچھ میگزینز نے اسکا انٹرویو کرنا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا کہ یہ ایک اوچھا کام ہے۔ چند اچھی اکیڈمیز نے خود آپ سے رابطہ کیا اور اسکالرشپ کی بات کی تب بھی آپ نے ایک نہیں سنی اور آپ اب مجھے بتا رہے ہیں کہ جی سی اور ایف سی میں پڑھائی نہیں ہوتی وقت ضائع ہوتا ہے۔ آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں۔ بچے نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے کم از کم اسے اپنے کسی فعل سے تو احساس دلائیں کہ یہ کامیابی ہی ہے۔ آپ اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔

وہ بیچارے واقعی پریشان ہو گئے تھے اس لئے خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ ساری گفتگو کے دوران ابو کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ چمکتی رہی۔ سر شعیب کی باتوں کے جواب میں انہوں نے کیا کہا یہ اسے بالکل پتا نہیں چل سکا کیونکہ ابو نے اسے وہاں سے اٹھ جانے کے لئے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ سر شعیب کی باتیں اسے حیران کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ اسے اسکول کے کسی فنکشن میں انوائیٹ کیا جانا یا اس کے انٹرویو کے لئے کسی میگزین وغیرہ کے رابطے کے متعلق اسے کچھ بھی نہیں پتا تھا۔ اس نے تو گولڈ میڈل وصول کیا تھا، تصویر بنوائی تھی اور اللہ اللہ خیر صلا۔ اس کے علاوہ اس کے لئے اس کارنامے میں کوئی سنسنی نہیں تھی۔ رشتے داروں یا ٹیچرز وغیرہ کی شاباشی تو وہ بچپن سے ہی موصول کر رہا تھا اس میں اس کے لئے کوئی نیا پن نہیں تھا اور جب کوئی نیا پن نہیں تھا تو وہ کیوں یاد رکھتا کہ اس نے بورڈ میں کوئی پوزیشن لی تھی۔

☆ ☆ ☆

تمہیں ریگولر کالج جانے کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔ تم گھر پر رہ کر پڑھا کرو۔ شام کو اکیڈمی جاؤ تو وہاں دوسرے کلاس فیلوز سے پوچھ لیا کرو کہ کالج میں کچھ خاص تو نہیں ہو رہا۔ ہفتے میں بس ایک بار کالج جانا کافی ہے جب کوئی خاص ٹیسٹ یا پریکٹیکل ہو تو جایا کرنا۔"

اسے کالج جاتے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے جب ابو نے نیا حکم صادر کر دیا۔ انہوں نے اس کے کالج کے ہیڈ کلرک سے بات کر لی تھی۔ ان کی واقفیت کی بنا پر حاضری رجسٹر میں اس کی حاضری خود بخود پوری ہو جاتی تھی۔ اس کے ابو کے کئی دوست اس کالج میں موجود تھے جو اس قسم کے ہر مسئلے کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے لئے ایک غیر معروف کالج کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے ابو کے حکم کی تعمیل کرنا شروع کر دی تھی کیونکہ اس کی زندگی میں کسی "لیکن" یا "مگر" کی گنجائش کبھی نہیں رہی تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح انکا ایک غلط فیصلہ مان رہا تھا مگر اس بار وہ دل ہی دل میں بہت بے چین تھا۔ اسے یہ سب برا لگ رہا تھا۔ وہ چودہ سال کا ہو رہا تھا۔ اس کا قد ہی نہیں بڑھ رہا تھا، خیالات میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ کالج میں اس کا واسطہ ایک نئی دنیا سے پڑا تھا۔ اسکول کی نسبت کالج آ کر وہ زیادہ مطمئن تھا۔ وہاں بہت سے لڑکے تھے چھوٹے، بڑے، فیشن پرست، مذہبی، نکھے، پڑھاکو، شرمیلے، ان کے درمیان وہ خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔ سب ہی لڑکے نوجوانی کے زعم میں مبتلا اس نئی دنیا میں خوش تھے۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ اس کو خبطی یا پروفیسر کہہ کر چڑاتے اور پھر پہلے ہی دن سے اس کے شاندار رزلٹ، اس کی چھوٹی عمر اور فرسٹ ائیر کے سلیبس پر اس کے عبور نے اسے کسی قسم کا احساسِ کمتری نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ وہ کالج میں ایک نئے اسٹیٹس کو لے کر داخل ہوا ہے لیکن شاید اس کے ابو خوش نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی مرضی جانے بغیر اس پر اپنی مرضی مسلط کر دی تھی۔ وہ اس کی بڑھتی عمر کے تقاضوں کو یا تو سمجھ نہیں پا رہے تھے یا وہ ان تقاضوں کو بری طرح اگنور کر رہے تھے۔

وہ کوئی ان ڈور پلانٹ نہیں تھا کہ اسے بند کمرے میں بڑھنے پھولنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا جسے اپنے اردگرد دوسرے انسانوں کی ضرورت تھی۔ اسے اپنے اردگرد اپنے ہم عمر اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کی باتوں کو ان کی معیت کو انجوائے کرنا پسند کرتا تھا۔

کالج میں چونکہ اسکول کی طرح ہر وقت کلاس میں بیٹھنے کی پابندی نہیں تھی اس لئے ایک لیکچر ہال سے دوسرے لیکچر ہال میں جاتے ہوئے، لیب میں پریکٹیکل کے دوران یا فری پیریڈز میں کوریڈورز یا گراؤنڈ میں سے گزرتے ہوئے دوسرے کلاس فیلوز سے علیک سلیک ہو جاتی تھی جو دھیرے دھیرے دوستی کی سرحد میں داخل ہونے لگی تھی لیکن ابو نے پھر اس کی خوشی کے آگے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔

مجھے جو چیز بھی اچھی لگتی ہے ابو مجھے وہی کرنے سے روک دیتے ہیں۔۔۔ کیوں؟" پہلی بار یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا پہلا پہرا اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چاند آسمان کے عین وسط میں کسی بادشاہ کی طرح تن کر کھڑا تھا۔ چاندنی بھی چہار سو پھیلی تھی مگر اسٹریٹس لائٹس کی زرد روشنی نے چاندنی کو بھی بسنتی چولا پہنا رکھا تھا۔ ہوا بہت تیز نہیں تھی مگر خنک تھی سو ان کے گرم خون کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

وہ دونوں کب سے نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔ دونوں نے جینز کے پائنچے چڑھا رکھے تھے اور دونوں ہی بہت دیر سے چپ تھے۔ یہ جگہ شہروز کی دریافت تھی۔ بہت پہلے جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تب سے کیمپس ایریا کے درمیان سینڈوچ بنی یہ نہر اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ کالج

کے دوران بھی اکیڈمی آتے جاتے ہوئے وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا اور یونیورسٹی میں تو وہ اس نہر کو اپنی کیبلی مانا کرتا تھا۔ اسکا ماننا تھا کہ ٹریفک جیسی بھی مرضی کیوں نہ ہو، موسم کتنا بھی ناخوشگوار ہو یہ نہر اپنے قدر دانوں کے لئے ہمیشہ مہربان رہتی ہے۔ عمر کو بھی اس نہر کی میٹھی آغوش کا چسکا شہروز کی وجہ سے لگا تھا۔ وہ دونوں جب لڑائی جھگڑوں سے اکتا جاتے تھے تو ایک بار دل ہلکا کرنے یہاں ضرور آتے تھے۔

یہ نہر ان کے کئی رازوں کی امین تھی۔ اس نہر میں ان کے کالج اسٹیرز کے لولیٹرز دفن تھے۔ اس نہر میں وہ آنسو بھی تیرتے نظر آتے تھے جو وہ چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑوں اور ناراضگیوں پر بہایا کرتے تھے۔ اس نہر کے سینے میں وہ شکوے بھی دبے تھے جو ان کو ایک دوسرے سے تھے یہ نہر ان دونوں کو ساتھ ملا کر ایک ٹرائی اینگل تھی جو انکی اس محبت کی حثیت کو مکمل کرتی تھی۔ وہ انکی ہمدرد تھی جو انکو مشورے بھی دیتی تھی اور ان کے درمیان ثالث کا کردار بھی ادا کرتی تھی۔ اس دفعہ کے جھگڑے میں بھی اسی نہر نے ان کی صلح کروائی تھی۔ انہوں نے سارے گلے شکوے کر لئے تھے اور اب مطلع بالکل صاف تھا۔

میں یہ شادی نہیں کر سکتا شہروز!" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بالآخر عمر نے کہہ ڈالا تھا۔ شہروز نے گہری سانس بھری تھی۔ عمر کی جذباتیت سے وہ ہمیشہ خائف رہتا تھا

یہ بات ڈیڈی کو تمہیں خود بتانی ہوگی۔" شہروز نے اس سے "وجہ نہیں پوچھی تھی بس مشورہ دے ڈالا تھا۔ عمر ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور پھر کافی دیر بعد بولا۔

وہ بہت تنک چڑھی ہے شہروز!۔۔۔ بدتمیز، ضدی اور ہٹ دھرم بھی۔۔۔ مجھے ایسی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں جو بلاوجہ نخرے کریں، جنہیں ہر لمحہ یہ وہم رہتا ہو کہ وہ بہت خوبصورت ہیں اور لڑکے ان پر واری صدقے ہوتے رہتے ہیں اور وہ صرف اس لئے پیدا کی گئیں کہ وہ دوسروں کی انسلٹ کر سکیں۔"

کم آن عمر۔۔۔ امامہ بالکل بھی ایسی نہیں ہے۔" شہروز نے اپنی دوست کی حمایت کی۔

میرے ساتھ وہ ایسی ہی ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے شہروز وہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی۔"

تم غلط سوچ رہے ہو عمر۔۔۔ تم دونوں کی انگیجمنٹ ہوئی ہے۔ ظاہر ہے رضامندی سے ہی ہوئی ہے۔ سر آفاق اپنی بیٹی کا رشتہ اس کی مرضی کے بغیر تو نہیں کرنے والے۔" شہروز کے سمجھانے کا ایک مخصوص سا انداز تھا۔ اس کی نگاہیں پانی کی سطح پر بنتے چاند کے عکس پر تھیں۔ وہ ٹانگیں سمیٹ کر بازوؤں کا گھیرا ان کے گرد ڈالے ہوئے تھا۔

میں بہت کنفیوزڈ ہو گیا ہوں شہروز! سچ کہوں تو مجھے اس لڑکی سے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔ بہت ایٹی ٹیوڈ ہے اس میں اور میری برداشت بہت کم ہے۔ کل کلاں کو بھی تو یہ رشتہ ختم ہونا ہی ہے اسی لئے بہتر ہے اسے ابتداء میں ہی ختم کر دیا جائے۔" عمر کا انداز واقعی بڑا الجھا الجھا سا تھا۔ شہروز کہنا چاہتا تھا کہ یہ رشتہ تو تم ختم کر ہی چکے ہو مگر اس نے کہا نہیں۔ عمر کے مزاج کی کچھ الجھنیں تھیں جن سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اسے اسکی ذات کے نفسیاتی پہلوؤں تک سے آگاہی تھی۔ وہ واقعی گہرے دوست تھے۔

پرسوں کیا ہوا تھا عمر؟"

شہروز! ہمارے درمیان بڑا عجیب سا تعلق ہے۔ وہ مجھے کبھی فون نہیں کرتی، میرے فون کالز اٹینڈ نہیں کرتی۔ میں اتنا بچہ تو نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ نہ سکوں۔ تمہارا اور زارا کا تعلق ایسا تو نہیں ہے۔ پرسوں میں اس سے ملنے چلا گیا۔ میں نے سوچا پھر میں واپس چلا جاؤں گا تو کہاں ملاقات ہو سکے گی اسی لئے میں ان کے گھر چلا گیا۔ محترمہ نے گیٹ سے اندر ہی نہیں جانے دیا مجھے۔۔۔ اتنی اِل مینرڈ ہے وہ کہ مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے جان چھڑا رہی ہو پھر مجھے بھی غصہ آ گیا۔"

پھر تم نے کیا کہا؟" شہروز کا انداز عجلت بھرا تھا۔ عمر نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

بتا رہا ہوں۔۔۔ مرے کیوں جا رہے ہو۔۔۔ بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں چاکلیٹ کیک لے گیا تھا وہی میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کہا مبارک ہو بی بی! آپ کی جان چھوٹ رہی ہے ہم سے۔۔۔ یہ کیک اسی لئے لایا ہوں۔۔۔ منہ میٹھا کیجیے اور ہماری رنگ واپس کر دیجیے۔" وہ ایک بار پھر رکا۔ اب کی بار شہروز نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔

وہ منہ اٹھا کر میری شکل دیکھنے لگی۔۔۔ میں نے کہا بی بی شرمایئے مت آپ کی ہماری نہیں نبھ سکتی۔۔۔ واپس کریں ہماری رنگ، اور تم اس کی ہٹ دھرمی دیکھو شہروز فوراً انگلی سے اتار کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔۔۔ اونہہ نخرے باز۔۔۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ بہت شوخی ہے۔"

اس میں تیری غلطی بھی تو ہے عمر۔۔۔ تجھے ان کے گھر جانے کی ضرورت کیا تھی اور کیا پتہ وہ تجھے گھر کے اندر بلانا چاہتی ہو مگر اس وقت گھر پر کوئی نہ ہو۔۔۔ اسے مناسب نہ لگا ہو؟" شہروز چڑ کر بولا تھا۔

مناسب نہ لگا ہو؟" عمر نے دہرایا۔

کیا مناسب نہ لگا ہو۔ میں وہاں ایسا کیا کرنے چلا گیا تھا؟۔۔۔ اچھی مصیبت ہے بھئی ہم تو ہمیشہ مشکوک ہی رہیں گے۔۔۔ چور ڈاکو ہیں نا ہم۔۔۔ تھانے میں پیدا ہوئے تھے۔۔۔ اونہہ مناسب نہ لگا ہو" وہ بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔

یار! تو بات کو سمجھتا نہیں ہے اور غصہ کرنے لگتا ہے۔ یہ لاہور ہے لندن نہیں کہ کسی کی کوئی ویلیوز نہ ہوں۔ یہاں لوگ اپنے حساب سے حدود مقرر کرتے ہیں اور اگر تمہیں ان سب چیزوں پر اعتراض ہے تو تم وہیں کسی جولی، جینی سے شادی کر لیتے یہاں اتنا کھڑاک پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔" شہروز کا لہجہ نارمل مگر الفاظ سخت تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس سارے ایشو میں سب سے زیادہ خوار بھی وہ ہی ہو رہا تھا اگر خدانخواستہ یہ انگیجمنٹ واقعی ٹوٹ گئی تھی تو وہ سب بڑوں کی نظر میں بہت خوار ہونے والا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے عمر کو دیکھا جو ایک دم ہی ہونٹ سی کر بیٹھ گیا تھا۔

یار! میری بات سنو۔۔۔ غور سے۔۔۔ تمہاری انگیجمنٹ کسی کورٹ شپ کا نتیجہ تو نہیں ہے نا۔۔۔ میرا مطلب کوئی لمبی چوڑی کمٹمنٹ تو ہے نہیں۔ ایسے ریلیشن شپ ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ میٹھے اور بل دار۔۔۔ جلیبی جیسے۔۔۔ ایسے ریلیشن شپ وقت کے ساتھ بہت مضبوط ہو جاتے ہیں۔۔۔ لیکن تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم نا صرف جذباتی ہو بلکہ عجلت پسند بھی۔۔۔ یہی دو چیزیں سب سے بڑا بگاڑ ہیں۔ تم اپنے فیصلوں پر بہت جلد پچھتانے لگتے ہو۔" اب کی بار شہروز نے تحمل سے کام لیا تھا۔

میں کیا ہوں، مجھ میں کون کون سی خامیاں ہیں یہ سب کچھ تم لوگ ایک ہی دفعہ بتا دو۔ مجھے تو ایسے لگنے لگا ہے جیسے میں دنیا کا کوئی گندہ ترین انسان ہوں جو بہت بری جگہ سے تعلق رکھتا ہے۔ میری کوئی ویلیوز ہیں نہ مورلیٹی۔۔۔ کسی کے گھر چلا جاؤں تو غیر مناسب، کسی سے بات کرنا چاہوں تو غیر مناسب، کسی کی طرف ایک نظر دیکھ لوں تو بھی غیر مناسب۔۔۔ ارے بابا میں بھی مسلمان ہوں، ایک اللہ اور رسول کا ماننے والا تم لوگ جس سمت کو قبلہ مانتے ہو نا ہم بھی اسی سمت کو مانتے ہیں۔۔۔ اللہ دلوں میں بستا ہے لاہور یا لندن میں نہیں کہ جگہ بدلتے ہی رب بھی بدل جائے۔۔۔ ہم اگر لاہور میں مسلمان ہیں تو لندن، پیرس، میلان جہاں بھی چلے جائیں مسلمان ہی رہیں گے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے وقت ٹرین بدلتی ہے خدا نہیں۔"

وہ بھڑک کر بولا تھا پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

ایسا کرو عمر احسان کو چوک میں کھڑا کر کے پھانسی دے دو۔ شہروز کو بالکل بھی برا نہیں لگا کیوں کہ عمر کے غصے کا ذائقہ اس کے لئے بڑا پرانا تھا مگر وہ شرمندگی ضرور محسوس کر رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے عمر کو طعنہ نہیں دینا چاہیئے تھا۔

او کے۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔" مسکراہٹ چھپاتے ہوئے شہروز نے ایکسکیوز کیا تھا۔ عمر کچھ نہیں بولا۔ شہروز نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

اچھا یار۔۔۔ کہہ تو رہا ہوں سوری۔۔۔ اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اسے ہنسی بھی آ رہی تھی اور شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ عمر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

میرا مذاق کا موڈ نہیں ہے شہروز۔۔۔ آئی ایم ہرٹ۔۔۔ اچھا نہیں لگتا مجھے جب لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔۔۔ میں الحمد للہ مسلمان ہوں۔۔۔ میرے پیرنٹس مسلمان ہیں مگر ہم لوگوں کو بار بار ثابت کرنا پڑتا ہے کہ ہم اور ہمارا عقیدہ وہی ہے جو باقی مسلمانوں کا۔۔۔ ہم وہ کام نہیں کریں گے جو ہمارے مذہب میں ناپسندیدہ ہیں۔ کسی جگہ رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ انسان اس جگہ کی برائیاں بھی اپنا لیتا ہے جہاں وہ رہا ہوتا ہے۔۔۔ ہوتے ہونگے لوگ ایسے مگر میں اور میرے گھر والے ایسے نہیں ہیں شہروز۔" عمر واقعی بہت غصے میں تھا۔

اچھا اچھا سن لی ہے تقریر۔۔۔ بولا ہے نا سوری۔۔۔۔۔"

شہروز نے اس کے کندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیا تھا۔ عمر نے ہونٹ بھینچے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لئے الفاظ منتخب کر رہا ہے۔

اٹس او کے شہروز۔۔۔ مگر دکھ تو ہوتا ہے نا اور میں سچ سچ بتاؤں تجھے۔ وہ جو امامہ بی بی ہیں نا وہ بھی یہی سمجھتی ہے۔۔۔ مجھے اس کے انداز سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے قابل بھروسہ نہیں سمجھتی۔۔۔ ورنہ ایسا بھی کیا ہوا کہ انسان منگیتر کو گیٹ سے ہی ٹرخا دے۔۔۔ دو منٹ بات کرنے کا روادار بھی نہ ہو۔"

عمر یار! ہماری سوسائٹی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ یہاں سب سے زیادہ ناقابل بھروسہ منگیتر ہی ہوتا ہے اور جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔۔۔ بار بار اس سے اس کا کریکٹر سرٹیفکیٹ طلب کیا جاتا ہے۔" شہروز ہنس کر کہہ رہا تھا۔ عمر مسکرایا تک نہیں۔

مجھے بچہ سمجھتے ہو نا تم۔۔۔ فیڈر پینے والا چھ ماہ کا بچہ۔۔۔ اگر یہی سچ ہے تو پھر زارا اور تمہارے درمیان جس طرح کا تعلق ہے وہ تو تمہیں

ایب نارمل لگتا ہوگا۔" اسکا انداز تمسخرانہ تھا۔ شہروز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ گتھی جیسے خود بخود سلجھ گئی تھی۔ عمر یقیناً اپنا اور امائمہ کا اس کے اور زارا کے ساتھ موازنہ کرتا رہتا تھا ظاہر ہے اس نے ان دونوں کو لڑتے جھگڑتے صلح صفائی کرتے، ایک دوسرے کے ساتھ روٹھتے منتے دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح کے تعلق کا خواہشمند تھا جو کوئی ایسی غیر فطری بات نہیں تھی لیکن چونکہ وہ امائمہ کی طبیعت سے واقف نہیں تھا اس لئے امائمہ کے گریز کو وہ اس کی ناپسندیدگی سمجھتا تھا۔

عمر! تم خود کو ہمارے ساتھ کمپیئر مت کرو۔۔۔ ہم کزنز ہیں۔۔۔ میں اور زارا۔۔۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔۔۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیل کود کر۔۔۔ لڑ جھگڑ کر ہم دونوں عمر کے اس حصے میں پہنچے ہیں۔ ہمارے درمیان وہ جھجک نہیں ہے جو تمہارے اور امائمہ کے درمیان ہے۔ جب یہ جھجک دور ہو جائیگی تو تم دونوں کے درمیان بہت اچھے فرینڈلی ٹرمز ڈیولپ ہو جائیں گے اور تب میں تمہاری طرح جیلس ہوا کرونگا۔" شہروز ملائمت بھرے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یار! میں جیلس نہیں ہوتا۔۔۔ آئی سوئیر نہیں ہوتا ہوں مگر ہرٹ ہوتا ہوں اب کی بار تو بہت ہوا ہوں۔۔۔۔ جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مجھے اگنور کرتی ہے بلکہ وہ مجھ سے مس بی ہیو کرتی ہے۔" وہ بازو پھیلا کر گھاس پر لیٹ گیا تھا۔

"شہروز۔۔۔ بائی گاڈ میں بہت کنفیوزڈ ہو گیا ہوں۔۔۔۔"

"پرابلم پتا ہے کیا ہے۔۔۔ ہم لوگوں کا فیملی سیٹ اپ بہت مختلف ہے۔ ایکچوئلی وہ ایک مختلف ماحول کی پروردہ، تم ایک مختلف ماحول کے۔۔۔ ان کے گھر کا ماحول ہمارے گھر کے ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ ہم آپس میں جس طرح بات کرتے ہیں، تم، میں اور زارا، اس طرح وہ اپنے کزنز کے ساتھ بھی نہیں کرتی۔ ہم کلاس فیلوز سے بھی وہ ایک حد تک ہی فرینک ہوتی ہے۔۔۔ دیکھ یار! ہر فیملی کی اپنی ویلیوز ہوتی ہیں۔ میں جیسے زارا کے ساتھ فرینک ہوں اس طرح تم امائمہ کے ساتھ فرینک نہیں ہو سکتے۔ جیسے میں اور زارا ہوٹلنگ کر لیتے ہیں۔ اکیلے ہر جگہ چلے جاتے ہیں تم ایسے امائمہ کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ سر آفاق اس چیز کو کبھی پسند نہیں کریں گے اور سچ تو یہ ہے کہ امائمہ خود بھی ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔"

شہروز نے لمحہ بھر کا توقف کر کے اس کی جانب دیکھا کہ وہ اس کی بات پر کس طرح ری ایکٹ کرتا ہے مگر وہ چپ چاپ، چت لیٹا آسمان کی آغوش میں محصور چاند کو دیکھتا رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ بہت کنزرویٹو ہیں۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔ امائمہ نے ہمارے ساتھ بہت سے سیمینارز، کانفرنسز اٹینڈ کی ہیں۔ وہ دوسری کلاس فیلوز کی طرح کام ادھورا چھوڑ کر اس لئے کبھی گھر نہیں گئی تھی کہ اندھیرا پھیل رہا ہے یا پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ ہے۔ اگر کنزرویٹو ہوتی تو لڑکوں کے ساتھ نہیں پڑھ رہی ہوتی۔ وہ اچھی لڑکی ہے، رشتوں کی قدر کرنے والی۔۔۔ اپنی ویلیوز کو پہچاننے والی اور ایک دن آئے گا جب تم مجھ سے یہ ساری باتیں کیا کرو گے کیونکہ تب تمہیں احساس ہو چکا ہوگا کہ تم نے اپنے لئے جس طرح کا لائف پارٹنر چاہا تھا امائمہ بالکل ویسی ہے۔"

شہروز اس کے دماغ میں لگی گرہیں کھول رہا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ عمر کو اس کے بہت سے فیصلوں پر مطمئن کرنے والا شہروز ہی تھا۔ وہ ایک دوسرے کے دل میں چھپی بات کو بنا کہے جان لینے کے دعوے دار تھے۔ ان کے درمیان ہمیشہ مسائل کا حل اسی طرح ڈھونڈا جاتا تھا۔

"یہ بات بھی تم ذہن نشین کر لو۔۔۔ وہ تمہیں ناپسند نہیں کرتی۔"

اس نے تم سے خود کہا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔؟" عمر کے لہجے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ طنز کر رہا ہے یا سنجیدہ ہے لیکن وہ شہروز کا جواب سننے کے لئے بے چین ہے یہ شہروز کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔

یہ رنگ جو تم اس کی انگلی سے اتروا کر لائے ہو، اگر وہ تمہیں ناپسند کرتی تو یہ رنگ انگلی سے اتار کر نہیں بلکہ الماری کے کسی نچلے خانے سے نکال کر دیتی۔"

ہاں یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ اور ویسے بھی مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے کو وہ ناپسند کر بھی کیسے سکتی ہے۔ اس کی تو لاٹری نکلی ہے۔"

اسی انداز میں لیٹے عمر نے کہا تھا۔ شہروز بلاوجہ ہی مسکرایا۔ عمر نارمل ہو رہا تھا۔ شہروز کو ہنستا دیکھ کر عمر دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایک بات بتاؤ گے سچ سچ؟" شہروز نے جواب میں فقط ہنکارہ بھرا۔

زارا نے بھی نخرے کئے امائمہ کی طرح؟" عمر کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

اور نہیں تو کیا۔۔۔ سب لڑکیاں نخرے کیا ہی کرتی ہیں۔۔۔ یہ انکا پیدائشی حق ہے۔" شہروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ موسم کی دلفریبی تھی نا عمر کا ساتھ بلکہ یہ زارا کی یاد تھی جس نے اس کے چہرے کو انوکھی سی مسکراہٹ بخش دی تھی۔

نہیں یار۔۔۔ اس ڈفر کو نخرے کرنا کہاں آتا ہوگا۔۔۔ وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے۔" عمر اسے چھیڑ رہا تھا۔ شہروز نے اسے گھور کر دیکھا۔

ایسے مت کہا کرو۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس کے انداز میں مصنوعی ناراضی تھی۔

بہت پسند کرتے ہو نا اسے تم؟" عمر نے اس کے کندھے کو ٹہوکا دیا تھا۔

بہت سے بھی بہت زیادہ۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے۔" شہروز کی کوئی بات عمر سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

شہروز! مجھے بھی وہ بہت ہی اچھی لگتی ہے۔" عمر کے لہجے میں اعتراف تھا۔

کون۔۔۔ زارا۔۔۔؟" شہروز صرف اسکو چڑانے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

او شٹ اپ۔۔۔ اتنا بدذوق تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا" اس نے ناک چڑایا تھا۔

شہروز نے اس کی جانب مصنوعی ناراضی کے انداز میں دیکھا تھا پھر وہ دونوں ہی ہنس دیئے۔ عمر نے ذرا سا اٹھتے ہوئے ہپ پاکٹ سے اپنا والٹ نکالا تھا پھر اس کی اندرونی زپ کھول کر اس نے پلاٹینم کی رنگ نکال لی جس میں تین ننھے ننھے ڈائمنڈز لگے تھے۔ یہ وہ ہی انگیجمنٹ رنگ تھی جو شہروز اور عمر نے امائمہ کے لئے خریدی تھی۔ بہت سی رنگز دیکھنے کے بعد بالآخر یہی وہ رنگ تھی جو ان دونوں کو پسند آ گئی تھی اور یہی وہ رنگ تھی جو عمر امائمہ کی انگلی سے اُتروا لایا تھا۔ والٹ سے رنگ نکال کر عمر چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اُس نے وہ رنگ شہروز کی جانب بڑھائی تھی۔

یہ تم اُس کو واپس کر دو گے؟" امید بھرے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

نہیں۔" شہروز نے قطعیت سے کہا۔

یہ رنگ اب تم خود واپس کرو گے اس کو۔"

وہ محترمہ مجھ سے فون پر بات نہیں کرتیں، گھر چلا جاؤں تو اندر بلانے کی روادار نہیں۔

اب یہ رنگ کیا ایس ایم ایس کروں اس کو۔ عمر نے ناک چڑھا کر کہا۔

نہیں۔۔۔میں بتاتا ہوں۔" شہروز بزرگوں کے سے انداز میں اس کے قریب ہوا۔

کل صبح تم چاچو کو فون کرو گے اور کہو گے۔۔۔"

عمر بغور اس کی بات سن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسقدر خوبصورت بھی لگ سکتا ہے"

شہروز نے دل کھول کر سراہا تھا۔ زارا کو لگا اسکی محنت وصول ہو گئی۔ اس نے عمر اور امائمہ کے نکاح کی تقریب کے لئے بہت دل سے تیاری کی تھی۔ لباس سے لے کر جیولری تک اور فٹ وئیر سے میک اپ تک اس نے ہر چیز خود خریدی تھی اور اس کے لئے اس نے نا صرف میگزینز کنگھالے تھے بلکہ ٹی وی شوز بھی دیکھے تھے کہ کیا چیز ان ہے اور کیا چیز آؤٹ ہے اور اس کے بعد ہی اس نے اپنی شاپنگ مکمل کی تھی۔ ویسے تو یہ بڑی عام سی بات تھی بہت سے لوگ شادی بیاہ کی تقریب کی تیاری ایسے کرتے ہی ہیں لیکن زارا کی طبیعت اس معاملے میں بڑی مست ملنگ سی تھی۔ وہ کپڑوں اور جیولری کے جھنجھٹ میں کبھی وقت برباد کرنے کی عادی نہیں رہی تھی کیونکہ اس معاملے میں اسکا ذوق کافی تھکا ہوا واقع ہوا تھا۔ اس نے جب بھی کبھی کوئی چیز اپنی پسند سے خریدی تھی اسکے ارد گرد رہنے والوں کو وہ کبھی پسند نہیں آئی تھی۔ اس لئے وہ زیادہ تردد ہی کرنا چھوڑ چکی تھی مگر اس تقریب کے لئے اسکا دل چاہا تھا کہ وہ سب سے اچھی نظر آئے اور شمع محفل بننے کی اس خواہش نے اس کا وقت اور محنت دونوں خرچ کروائے تھے حالانکہ اس تقریب کا گمان کسی کو دور دور تک نہیں تھا بس اچانک ماموں نے انگلینڈ سے فون کیا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہے عمر نکاح کر کے واپس آئے تاکہ بعد میں کاغذات بنوانے میں آسانی رہے گی۔ سارا خاندان ہی یہ بات سن کر متحرک ہو گیا تھا۔ زارا نے اپنی مصروفیت کو بالائے طاق رکھ کر بوتیکس کے چکر لگائے تھے اور نا صرف اپنے لئے بلکہ امائمہ کے لئے بھی کچھ شاپنگ کی تھی اور اب شہروز کے منہ سے ایک ہی جملہ سن کر واقعی اسکا دن بن گیا تھا اور اسکی محنت وصول ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی گردن میں ایک نئی طرح کے خم کو اور لہجے میں مزید اکڑ کو محسوس کیا۔

میں نے بھی نہیں سوچا تھا" اس نے مسکراتے ہوئے اپنی تعریف کو وصول کیا تھا۔ شہروز سامنے اسٹیج کی جانب دیکھنے میں مگن تھا جہاں عمر اور امائمہ سب کی نظروں کا مرکز بنے ہوئے تھے، اسکی بات سن کر وہ اسکی جانب مڑا تھا پھر وہ بشاشت سے مسکرایا۔

میں امائمہ کی بات کر رہا تھا۔" اسکا جائزہ لیتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کہیں کوئی چیز چھن سے ٹوٹی تھی۔

میں۔۔۔میں بھی امائمہ ہی کی بات کر رہی ہوں۔" زارا نے بہت ہمت کر کے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ بہت عام سی بات تھی اس قسم کی غلط فہمی انسانوں کو ہو ہی جاتی ہے۔ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی کہ شہروز اس کی نہیں بلکہ امائمہ کی بات کر رہا ہے اور جو فخر و انبساط اسکو یکدم محسوس ہوا تھا اس کے حصار سے یکدم نکلنا آسان نہیں تھا۔

واؤ۔۔۔یہ تم ہی ہو زارا۔۔۔مائی گاڈ۔۔۔عمر اچانک قریب آ کر بولا تھا

ارے کوئی مجھے پکڑ کر چٹکی بھرنا، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" وہ زارا کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر بولا تھا۔

میں یہ کام تمہیں پکڑے بغیر زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں اور یہ حقیقت ہی ہے"

شہروز کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

اگر یہ حقیقت ہے تو مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ پارٹنر کا انتخاب کرنے میں میں نے نا صرف عجلت بلکہ غلطی بھی کی۔۔۔شہروز یار ابھی کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔"

وہ کہتے کہتے جان بوجھ کر چپ ہوا تھا۔شہروز نے اسکی پشت میں دھمو کا جڑا تھا

بکواس نہ کرو۔۔۔اور میں نے غلطی کی نہ عجلت، اور یہ بھی کہ اب کیا کبھی بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔وہیں واپس جا کر بیٹھو جہاں سے اٹھ کر آئے ہو۔زارا ازمائی پرنسز"

وہ بہت جذب سے بولا تھا اسکی آنکھوں اور لہجے میں وہی سچائی جھلک رہی تھی جو اسکے انداز میں تھی مگر زارا کا دل جیسے کسی نے نچوڑ ڈالا تھا۔وہ سابقہ کیفیت اور احساسات کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی تھی۔اس نے شاید کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔اس نے سر ہلایا پھر وہ مسکرائی تھی۔

اچھی لگ رہی ہوں کیا؟" وہ لہجے میں مصنوعی بشاشت بھر کر بولی تھی۔

بے حد، بے حساب"شہروز کے لہجے میں سچائی تھی۔اس نے کہنے کے ساتھ اسکا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔زارا کو انجانی سی طاقت محسوس ہوئی۔

تم نے ضرور کوئی دم درود کیا ہے، راتوں رات ایسے معجزے نہیں ہو سکتے" یہ عمر تھا۔

مہربانی، شکریہ"

اس نے بدقت اپنی مسکراہٹ کو گہرا کیا تھا۔وہ جانتی تھی شہروز دل سے اسکی تعریف کر رہا ہے۔وہ اسے عام حلیے میں دیکھ کر بھی سراہنے کا عادی تھا مگر اسے پہلی بار زندگی میں حسد محسوس ہوا۔ وہ شہروز کے لیے کم از کم شہزادی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ہر عورت کی زندگی میں کوئی ایک مرد ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی زندگی میں وہ ملکہ سے کم کے درجہ پر کبھی راضی نہیں ہوتی۔اس سے ہوا ہی نہیں جاتا۔زارا کے لئے شہروز ایسا ہی مرد تھا۔اس نے اس پر محبت بھری نظر تو ڈالی تھی مگر دوسری جبکہ اسے پہلی کی خواہش تھی۔

میں تمہیں پہلے کیوں نظر نہیں آئی۔۔۔میری محنت میں ایسی کون سی کمی رہ گئی تھی شہروز"اس نے دل میں سوچا تھا مگر شہروز سے کہا نہیں تھا۔وہ اسکا مذاق اڑاتا اسکے جذبات کو کبھی سمجھ نہ پاتا اور اس وقت وہ رونے کے موڈ میں نہیں تھی۔اس نے مسکراتے ہوئے گہری سانس بھری تھی۔اسکا دل اتنا صاف تھا کہ اسے اس بات پر بھی شرمندگی ہوئی کہ وہ حسد کا شکار ہو ہی کیوں رہی ہے۔اس نے اسٹیج پہ بیٹھی امائمہ کو دیکھا تھا۔وہ واقعی دیکھنے کے قابل تھی۔اس پر دلہناپے کا بہت روپ آیا تھا۔اس نے امائمہ کے لئے اپنے دل میں رشک کے جذبات کو ابھرتے محسوس کیا۔وہ روشنیاں اگلتی محسوس ہو رہی تھی۔وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آج اسکا دن تھا مگر ہر دن ہر علاقے کے لئے نہیں ہوتا۔شہروز کا دل اسکا مفتوحہ علاقہ تھا اور وہاں پہلا قدم رکھنے کا حق بھی اسے تھا وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔زارا کی گردن میں جو خم لمحہ بھر پہلے آیا تھا وہ لمحہ بھر میں ہی ختم ہو گیا تھا وہ اب

وہی زارا تھی جو تعریف سن کر بھی مطمئن ہوتی تھی نہ یقین کرتی تھی مگر یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ شہروز کے رویے سے الجھ گئی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا حالانکہ یہ عام سی بات تھی۔ شہروز پہلے بھی نا صرف امائمہ کی بلکہ اپنی دوسری کلاس فیلوز کی کزنز کی تعریف کرتا تھا ان کے متعلق زارا سے بات کرتا رہتا تھا۔ زارا کو کبھی کسی سے جلن یا حسد محسوس نہیں ہوا تھا لیکن آج کچھ ایسا تھا کہ اسکا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ہر چیز سے بے وجہ اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

میں مان لیتا ہوں دنیا میں معجزے ہوتے ہیں اور چلو مان لیا تم آج معجزتاً بہت خوبصورت لگ رہی ہو مگر اسکا یہ مطلب نہیں کی تم بت بن کر ایک ہی جگہ کھڑی ہو جاؤ"

شہروز نے اسکی خاموشی سے اکتا کر اسکا کندھا ہلایا تھا۔ زارا نے اسکی جانب دیکھا۔ اسکی آنکھیں بے تاثر اور بے رنگ تھیں نجانے شہروز کو کچھ محسوس ہوا یا نہیں۔ زارا نے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور مشکل سے ہی سہی مگر وہ کامیاب ہو گئی تھی۔

آؤ ذرا اچھی سی فوٹوگراف بنواتے ہیں۔۔۔ کیا پتا تم دوبارہ کبھی اتنی خوبصورت لگو یا نہیں۔۔۔ معجزے کون سا روز روز ہوتے ہیں بھئی"

عمر کہہ رہا تھا۔ زارا کو اب کی بار مسکرانے کے لیے محنت نہیں کرنا پڑی تھی وہ شہروز کے لیے دل میں کبھی کوئی میل رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ عمر فوٹوگرافر کو اشارہ کر رہا تھا۔ زارا نے شہروز کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ وہ شہروز کے ساتھ تصویر بنوانا چاہتی تھی مگر شہروز اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اسٹیج کی جانب بڑھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے، میں آپکو نہیں جانتا"

نور محمد نے آنکھیں اٹھائے بنا کہا تھا۔ اسکا دل ہولے ہولے لرز رہا تھا اور دھڑکن معمول سے ہٹ کر گنگنا رہی تھی۔ اسکے لہجے میں عجیب سی گھبراہٹ تھی اور وہ مسلسل اپنی انگلیاں چٹخانے میں مصروف تھا۔ یہ اس کے سامنے بیٹھے شخص کا رعب حسن نہیں تھا کہ وہ اس قدر الجھا ہوا تھا بلکہ یہ اسکی عادت تھی۔ اسے اجنبی لوگوں سے ملنے میں ان سے بات کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ کا سامنا رہتا تھا۔ وہ انسانوں سے الرجک تھا اسے اپنی ذات میں گم رہنے میں سکون ملتا تھا۔ اسکی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ اسے کم سے کم لوگوں سے ملنا پڑے اور نئے لوگوں سے ملنے سے تو اسکی جان جاتی تھی۔ یہ اسکی اپنی کمزوری تھی جسے وہ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ سب ہی کرتے ہیں۔ اسکے اردگرد رہنے والے اسکی طبیعت سے بخوبی واقف تھے اور کوئی بھی اسکی اپنی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کے لئے نہیں کہتا تھا اسے، لیکن کبھی کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی تھی کہ اسے یہ کڑوی گولی نگلنی ہی پڑتی تھی۔ آج بھی اسکا کڑوی گولی نگلنے کا دن تھا۔ اکیسویں صدی کو خوش آمدید کہے دنیا کو پانچ سال گزر چکے تھے اور اب چھٹے سال کی ابتداء تھی۔ لوٹن کی جامعہ مسجد میں موذن کے فرائض سرانجام دیتے اسے تین سال ہو رہے تھے۔ مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور موسم میں سردی کی شدت تھوڑی سی کم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نور محمد کو کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ ہیٹرز بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ یہ شخص جو اسکے سامنے بیٹھا تھا اس نے اسے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ وہ آج اس سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ دراصل وہ خود بھی روز روز کی انکوائری سے تنگ آ گیا تھا۔ ہر دوسرے روز اسے پیغام ملنے لگا تھا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے مسلسل انکار کو کوئی اور مطلب پہنائے اسی لئے جب مسجد کے منتظمین کی جانب سے بھی اسے پیغام ملا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے تو وہ انکار نہیں کر سکا تھا اور اسی لئے اب وہ یہاں موجود تھا۔

آپ واقعی مجھے نہیں جانتے، دراصل میں اس علاقے میں کچھ عرصہ پہلے ہی آیا ہوں اور میں اچھے دوستوں کی تلاش میں ہوں۔ میں یہاں نماز پڑھنے آتا ہوں تو اکثر آپکو دیکھتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" اس شخص نے مسکراتے ہوئے بہت عاجزی سے اپنا مطمع نظر بیان کیا تھا۔ نور محمد دل ہی دل میں حیران ہوا تھا اس شخص کو اگر یہ کام تھا تو وہ کسی سے بھی کہہ سکتا تھا۔

میں آپکو اس علاقے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس علاقے میں آپکو بہت جلد اچھے دوست مل جائیں گے۔ نور محمد نے ابھی بھی انگلیاں چٹخانا بند نہیں کیا تھا۔

آپ میرا مطلب نہیں سمجھے شاید میں دراصل آپ ہی سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ شخص اب مسکرایا تھا۔ اسکی نیلی آنکھوں میں عجیب سی التجا چھپی تھی۔ نور محمد کو اسکی آنکھوں کے رنگ اچھے نہیں لگے تھے۔ وہاں اسے نجانے کیوں سفاکی سی محسوس ہو رہی تھی اور اسکی خواہش نے نور محمد کو اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوستی تو دور کی بات وہ تو کسی شخص سے دوسری بار ملنے کے خیال سے بھی چڑتا تھا۔

آپ مجھے نہیں جانتے میں بہت خشک طبیعت کا مالک ہوں۔ میری عادات اس قسم کی ہیں کہ لوگ زیادہ دیر میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ میں آپ کے لئے زیادہ عرصہ اچھا دوست ثابت نہیں ہو سکوں گا۔۔۔ معاف کیجیے گا نماز کا وقت ہونے والا ہے۔"

نور محمد نے بات پوری کر کے اس شخص کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔

آپ براہ مہربانی میری بات۔۔۔۔" نور محمد کو اسکی بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسکی پوری بات سنے بغیر بہ عجلت وہاں سے نکل گیا تھا۔

وہ شخص کون تھا؟؟؟

☆.........☆.........☆

نور محمد اس شخص کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا لیکن وہی شخص اسکے لئے اس معاملے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہ اس سے پہلی ملاقات کے اگلے دن کی بات تھی جب اس نے نمازِ عصر کے وقت اسے دیکھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ شخص اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے اور کسی مذہبی معاملے کے متعلق بحث جاری تھی۔ نور محمد ایسی گفتگو میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاموشی سے سننے میں مگن تھا جب اس نے اس شخص کی جانب غیر ارادی نگاہ ڈالی اسے عجیب قسم کی ناگواری کا احساس ہوا تھا۔ وہ شخص اسکی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے سر کے اشارے سے نور محمد کو سلام کیا تھا۔ نور محمد کو اسکا انداز کچھ عجیب لگا تھا وہ سلام کا جواب بھی نہیں دے پایا تھا۔ اس نے دوبارہ اسکی جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ مبادا وہ اسے پھر دوستی کی پیشکش کر ڈالے لیکن اس دن کے بعد سے یہ جیسے ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ شخص ہر نمازِ عصر میں موجود ہوتا اور اسی طرح نور محمد کی جانب دیکھتا رہتا تھا کبھی کبھی وہ نمازِ مغرب میں بھی موجود ہوتا تھا اور اس وقت بھی اسکا انداز وہی ہوتا تھا جو نور محمد کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ اسکے لئے باعثِ خلجان بنتا جا رہا تھا۔ وہ شخص بظاہر اسے یا کسی بھی اور شخص کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہ نماز ادا کرتا اور اسکے بعد نور محمد کے کہیں آس پاس بیٹھ کر فقط نور محمد کو دیکھنے میں مگن رہتا۔ بہت بار نور محمد نے سوچا وہ اسکی شکایت کرے یا اسی سے بات کرے کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے مگر پھر نجانے کیا چیز اسے روک لیتی تھی اسے لگتا تھا سب اسکو بیوقوف سمجھ کر اسکا مذاق نہ اڑائیں۔ وہ دوستی کی پیشکش ہی تو کر رہا تھا کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہا تھا۔ وہ شخص ویسے بھی سب کا پسندیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ نمازِ عصر

کے بعد اکثر لوگ جو عام طور سے فارغ ہوتے تھے مسجد میں قیام کرتے تھے۔ایسے لوگوں کا ایک چھوٹا سا ایک گروپ بن گیا تھا جن میں زیادہ تر بزرگ شامل تھے اور وہ لوگ سیاست اور مذہب کے متعلق بات کرنا پسند کرتے تھے۔اکثر لوگ اپنے اپنے ممالک کے مسائل کا ذکر بھی کرتے نظر آتے۔ وہ شخص بھی عام طور سے انہی بزرگوں کے گروپ میں بیٹھ جاتا تھا اور اسکا دوسرا پسندیدہ کام بس یہی تھا کہ وہ نور محمد کو دیکھتا رہتا کچھ عرصہ نور محمد اس امر کو اپنا وہم سمجھ کر ٹالتا رہا مگر پھر اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ شخص اسی کو دیکھنے میں مگن رہتا ہے اسکے دیکھنے پر وہ سر کے اشارے سے سلام کرتا اور مسکرا دیتا۔اس کے علاوہ ان کے درمیان کبھی کوئی بات براہِ راست نہیں ہوتی تھی لیکن اس بات سے بھی دن گزرنے کے ساتھ ساتھ نور محمد کی جھنجھلاہٹ اور اس سے بھی بڑھ کر پریشانی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔اس نے کوشش کی کہ وہ نماز کے اوقات کے علاوہ مسجد میں قیام کرنا کم کردے مگر وہ انتظامیہ میں شامل تھا اور کب سے مسجد کے انتظامات کی دیکھ ریکھ کر رہا تھا۔وہاں پہ سب لوگ اتنا صرف اسکی عزت کرتے تھے بلکہ اسکو کافی پسند بھی کرتے تھے۔ویسے بھی ایسے لوگ بہت کم تھے جو ہر روز ہر نماز میں شامل ہوتے تھے ڈیوٹی آورز کے ساتھ ساتھ فاصلہ زیادہ ہونے کا مسئلہ بھی درپیش رہتا تھا بہت سے لوگوں کو۔ایسی صورتحال میں جو لوگ مسجد آپاتے تھے ان کے دلوں میں نور محمد کی بہت قدر تھی عمروں کے فرق کے باوجود اسکی بات توجہ کے ساتھ سنی جاتی تھی اور اس کی رائے کو اہمیت بھی دی جاتی تھی اور پھر اس کام میں اسے سکون ملتا تھا سو نور محمد اس شخص کو برداشت کرنے پر مجبور تھا چنانچہ یہ سلسلہ کچھ عرصہ ایسے ہی چلتا رہا۔نور محمد کو بھی اس شخص کی عادت ہوتی چلی گئی اور پھر ایک دن وہ شخص اچانک کہیں غائب ہو گیا۔نمازِ عصر میں اسے ناپا کر نور محمد نے سوچا شاید وہ کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہوگا اور نمازِ مغرب میں آجائیگا لیکن وہ نمازِ مغرب کے وقت بھی نہیں آیا تھا۔وہ رات نور محمد نے اسکے بارے میں سوچتے ہوئے ہی گزاری اور صبح اُٹھ کر وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ سے بھی ہچکچاتا رہا۔اسے اکیلے رہنے کی عادت تھی۔وہ اپنے روم میٹس کے علاوہ کسی سے بہت ہی کم بات کرتا تھا۔اس کے لئے یہ بڑی بے چین کر دینے ولی بات تھی کہ وہ کسی انسان کی غیر حاضری کو اتنا محسوس کر رہا تھا۔اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات تب ہوئی جب وہ شخص اگلے روز بھی غیر حاضر رہا۔نور محمد نے اسے ناپا کر پہلی بار اسکی خیریت کے متعلق دعا کی۔یہ اسکی زندگی میں شاید تیسری یا چوتھی بار ہو رہا تھا کہ وہ کسی کے لئے اتنا سوچ رہا تھا۔یہ ایک نفسیاتی سائنس تھا۔اتنے عرصہ اس شخص کو اپنی طرف متوجہ پا کر اب اسے اسکی عادت سی ہو گئی تھی۔اس نے اسے چونکہ بتایا بھی تھا کہ وہ یہاں نیا ہے تب ہی نور محمد زیادہ پریشان تھا کی وہ کہیں بیمار نہ ہو یا اسے کوئی اور پریشانی نہ لاحق ہو۔نور محمد نے یہاں زندگی کو بہت ذلیل وخوار ہوتے دیکھا تھا۔انسانی رشتے ہوا سے بھی سستے اور ہلکے ثابت ہوتے تھے۔اقدار یہاں پیسے کے عوض پامال ہو جاتی تھیں۔لوگ مختلف ملکوں سے آتے تھے اور اپنا نام ونشان چھوڑے بغیر مٹی کے مول بک جاتے تھے۔یہ بڑا ظالم ملک تھا۔یہاں لوگ کھانے کو ایک وقت روٹی تو دے سکتے تھے مگر تسلی کوئی نہیں دیتا تھا۔لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کے ساتھ بیٹھ کر اسکی خوشی یا غم کو بانٹ سکتے۔یہاں میٹھا بول سب سے قیمتی اور نایاب تحفہ تھا اور یہ خوش نصیب لوگوں کو ملتا تھا۔یہاں تنہائی سب سے قریبی عزیز ثابت ہوتی تھی۔یہاں دکھ سے زیادہ دکھ بانٹنے والوں کی کمیابی رلاتی تھی۔یہاں کبھی کبھی انسانوں کے ہجوم میں بھی قبر جیسا سناٹا محسوس ہوتا تھا اور اسی لئے شاید خدا یہاں زیادہ یاد آتا تھا کیونکہ یہاں اسکی یہ حکمت بخوبی سمجھ میں آجاتی تھی کہ اس نے "اکیلا" ہونا صرف اپنے لئے کیوں پسند کیا۔

☆......☆......☆

آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ میں آپ کے لیے پریشان تھا نور محمد نے اسکی جانب دیکھتے ہوئے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ اسے انسانوں کی دلجوئی کرنا نہیں آتا تھا مگر وہ اس شخص کی حالت دیکھ کر کہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔ وہ تین دن بعد آیا تھا اور کافی کمزور لگتا تھا۔ اسکی آنکھیں نیلی کائی زدہ لگتی تھیں۔ اسکی داڑھی بے ترتیب تھی اور اسکا چہرہ زردی مائل تھا۔ نور محمد کی بات سن کر وہ مسکرایا تھا۔

آپ نے میری غیر حاضری کو محسوس کیا، میں اسکے لئے آپکا مشکور ہوں" اس شخص کی آواز میں کمزوری کا عنصر غالب تھا، وہ بہت اونچا لمبا شخص تھا مگر نقاہت اسقدر اس کے وجود پہ حاوی تھی کہ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح لگ رہا تھا۔

آپ اتنے دن نماز کے لئے نہیں آئے تو ہم سب ہی آپکی غیر حاضری کو محسوس کر رہے تھے۔ نور محمد نے جیسے صفائی دی تھی۔

میں کچھ بیمار تھا اس لئے میں آ نہیں سکا تھا مگر میں گھر پر نماز ادا کرتا رہا ہوں" وہ جیسے اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ نماز کا پابند ہے۔ نور محمد نے سر ہلایا تھا یہ اسکی عادت تھی وہ سب کی بات سنتے ہوئے سر ہلاتا تھا گویا انکی بات اسکے نزدیک بہت اہمیت کی حامل تھی مگر اسکے پاس باتوں کے جوابات کم ہی ہوتے تھے سو وہ چپ رہنے میں عافیت محسوس کرتا تھا۔

میں آپکا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا آپکی وجہ سے میری زندگی میں بہت مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگا ہوں" وہ شخص نور محمد کے خاموش رہنے پر خود ہی کہنا شروع ہوا تھا۔ نور محمد نے حیرانی سے اسکی جانب دیکھا۔ اس نے اس شخص کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے پھر اس شخص کے اس رویے سے جھنجلاہٹ ہوئی۔

آپ ایسی بات مت کریں آپ جانتے ہیں میں نے آپ کے لئے کچھ نہیں کیا میں تو آپکو جانتا بھی نہیں ہوں" ان کے درمیان گفتگو سانپ سیڑھی کے کھیل کی طرح پھر ابتدائی نمبروں پر آ گئی تھی۔

میں یہاں بہت عرصے سے آ رہا ہوں۔ آپکو نہیں پتا آپ نے میرے لئے کیا کیا ہے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپکو نماز پڑھتا دیکھ کر میں نے اپنی بہت سی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ میں اسی لئے چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے دوستی کر لیں۔ میری رہنمائی فرمائیں۔" وہ شخص اتنی عاجزی سے کلام کرتا تھا کہ اسکی بات مان لینے کو دل کرتا تھا مگر دوسری جانب بھی نور محمد تھا جو ایسے انداز دیکھ کر ہی ڈر جایا کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ اس شخص کی بات سن کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

آ۔۔آپ مجھے نہیں۔ جانتے۔۔آپکو۔۔میرے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔۔" اس نے بے بس سے لہجے میں بات شروع کی تھی اور اسی انداز میں ادھوری چھوڑ دی تھی۔

نہیں۔۔۔۔ دراصل آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں آپکو بہت عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس مسجد میں آپکی وجہ سے ہی آنا شروع ہوا تھا۔ اللہ پاک کا آپ پر بہت کرم ہے۔ اس نے آپکو بہت خوبصورت آوز سے نوازا ہے۔ آپ اتنی خوبصورت قرأت کرتے ہیں۔ میں پہلے پہل یہاں آپکی تلاوت سننے کے لیئے ہی آنا شروع ہوا تھا۔"

نور محمد حیرانی سے اسکی بات سن رہا تھا۔ وہ بہت اچھی قرأت کرتا تھا یہ بات اکثر لوگوں کے منہ سے اسے سننے کو مل جاتی تھی مگر یہ شخص جس

انداز میں اسے سراہ رہا تھا ایسے تو کبھی کسی نے اسے نہیں سراہا تھا۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ اس نے اسے قرأت کرتے وقت کب سنا تھا۔ وہ زیادہ تر نمازِ فجر کے بعد تلاوت کیا کرتا تھا اور اس نے اس شخص کو کبھی نمازِ فجر میں مسجد میں نہیں دیکھا تھا۔

میں زیادہ کا مطالبہ تو نہیں کر رہا۔ آپ تو ویسے بھی معلم ہیں، میں جانتا ہوں آپ بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتے ہیں۔ آپ مجھے بھی ان بچوں میں سے ایک سمجھ لیں۔ وہ اب کی بار مسکرایا بھی تھا۔

نور محمد کو اسکی مسکراہٹ اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے لگا وہ اسکا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ اس سے کیا سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ مسجد میں اور مسجد کے باہر بھی کچھ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لئے جایا کرتا تھا لیکن وہ سب چھوٹے بچے تھے اس نے کبھی کسی اتنے بڑے شخص کو کچھ نہیں پڑھایا تھا اور وہ قرآن پڑھنے کی بات کر ہی کب رہا تھا۔ نور محمد نے کبھی اپنے آپکو کسی معاملے میں اسقدر قابل نہیں سمجھا تھا کہ وہ کسی کے لئے قابلِ تقلید ہو سکتا۔ وہ احساسِ کمتری کے کمتر ترین درجے سے کبھی اُوپر چڑھ ہی نہیں سکا تھا۔

آپ پتا نہیں کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟ نور محمد کے لہجے میں اب ایک مخصوص قسم کی بیزارگی نمایاں ہونے لگی تھی۔ اسے بلاوجہ کی گفتگو ویسے ہی اکتا دیتی تھی۔

آپ پر اللہ پاک کی بڑی رحمت ہے۔ اللہ نے آپکو بہت خوبصورت آواز سے نوازا ہے۔ آپ اتنی اچھی قرأت کرتے ہیں کہ راہ چلتے لوگ بھی رک کر سننے لگتے ہیں۔ میں جب جب آپکو قرأت کرتے سنتا ہوں میں ایک عجیب سے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ آپ ایک جنتی آدمی ہیں۔" اس شخص کے لہجے میں بے پناہ عقیدت تھی۔ نور محمد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ کون شخص تھا۔ وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ نامحسوس طریقے سے تھوڑا سا پیچھے ہوا تھا۔ اسے اس شخص سے خوف آیا تھا۔ وہ اسے جنت کی نوید دے رہا تھا۔ نور محمد نے اپنی خفگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے واقعی اس شخص سے خوف آ رہا تھا وہ اس شخص سے جلد از جلد جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اس نے زندگی میں ستائش سمیٹنا نہیں سیکھا تھا تو وہ عقیدت کہاں سنبھال سکتا تھا۔ وہ شخص اسے کوئی بہت بڑا نوسرباز نظر آ رہا تھا۔ اسے اگر صرف تعریفیں کر کے نور محمد کو شرمندہ کرنا تھا یا خوفزدہ کرنا تھا تو نور محمد کے پاس قطعاً فارغ وقت نہیں تھا اپنی جانب سے وہ اسکی تیمارداری کر چکا تھا۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا اس شخص نے نور محمد کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں لرزش تھی جو اسکی بیماری کا پتا دیتی تھی۔

میری آپ سے گزارش ہے آپ میری راہ نمائی فرمائیں مجھ سے دوستی کر لیں۔ آپ جیسے شخص سے دوستی مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر لے جائیگی۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔" نور محمد کی پیشانی پر پسینہ نمایاں ہونے لگا تھا۔ کیا وہ واقعی کوئی نوسرباز تھا۔

آپ مجھے معاف کیجئے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ میں کسی کی کیا رہنمائی کرونگا مجھے تو خود رہنمائی کی ضرورت ہے۔" اس نے اس شخص کے ہاتھ جھٹکنے چاہے تھے۔

ایسے مت کیجئے میں آپ کے پاس بہت امید لے کر آیا ہوں۔ مجھے ناامید مت کیجئے۔ آپکو نہیں پتا آپکا انکار کسی کو موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہے۔" وہ منت پر اتر آیا تھا۔

آپ عجیب آدمی ہیں- پتا نہیں آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں------"نور محمد نے بات پوری نہیں کی تھی کہ اس نے بات کاٹ دی

میں زیادہ نہیں چاہتا بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے دوستی کر لیں- مجھے دین سکھا دیں"

یا خدا--- آپ پتا نہیں میرے ساتھ یہ کیوں کر رہے ہیں، میں کسی کو کیا سکھا سکتا ہوں- میں تو خود ابھی دین سیکھ رہا ہوں- میں تو خود ابھی طالبعلم ہوں"

نور محمد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے-

آپ ایسے انکار مت کریں- مجھے اندھیروں میں مت دھکیلیں- میں واقعی بہت امید لے کر آیا ہوں- میں بہت دیر سے اس مسجد میں آرہا ہوں- آپکو نہیں پتا میں کب سے آپکو دیکھتا ہوں- آپ پنج وقتہ نمازی ہیں- آپ سے زیادہ دین دار کون ہوگا بھلا؟"

اس شخص کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہونے لگا تھا-

آپ مسجد میں آتے ہیں مجھے پانچ وقت نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو یقینا آپ بھی پنج وقتہ نمازی ہوگئے، آپ بتایئے آپ سے زیادہ دین دار کون ہوگا بھلا، نور محمد نے جیسے تھک کر اسے سمجھانے چاہا تھا-

اس شخص نے سر جھکا لیا تھا جیسے پشیمانی میں گھر گیا ہو-

میں نماز پڑھتے ہوئے بھی آپکو دیکھتا رہتا ہوں- میں نے نماز پڑھنا سیکھا ہی آپ سے ہے- اس سے پہلے مجھے نماز پڑھنا آتا ہی کہاں تھا- سجدے کے نام پر صرف پیشانی زمین پر رگڑنے کا نام نماز نہیں ہوتا- نماز کیا ہوتا ہے یہ آپ نے سکھایا ہے مجھے، آپ خدارا مجھے اپنا دوست بنا لیں میں آپکا مشکور رہوں گا"

بندہ خدا اگر آپ مجھے دیکھنے کی بجائے نماز پر دھیان دیتے رہتے تو زیادہ اچھا ہوتا- آپ کو مسجد یا نماز کی حرمت کا ہی نہیں پتا آپ مجھے بھی اس طرح کر کے گناہگار کرتے رہے ہیں- میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا- میں شرمندہ ہوں- نور محمد واقعی تھک گیا تھا- یہ ساری صورتحال تھی ہی عجیب سی، وہ اس شخص کو سمجھا پا رہا تھا نہ خود کو- بہتر تھا وہ یہاں سے چلا جاتا- یہی سوچ کر اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تھا۔

آپ،، آپ میری ایک آخری بات سن لیجئے-"اس شخص نے جیسے کچھ سوچ کر کہا تھا اور پھر گہری سانس بھری تھی-

میں آپ کے پاس خود نہیں آیا، مجھے کسی نے بھیجا ہے- آپ کے کسی بہت عزیز نے------"وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

نور محمد نے چونک کر اسکا چہرہ دیکھا-----وہ دوبارہ سے اسی پوزیشن میں بیٹھ گیا تھا جس میں اٹھنے کا ارادہ کرنے سے پہلے بیٹھا تھا-

کس نے بھیجا ہے آپکو؟"الفاظ اسکے منہ سے جیسے سرسراتے ہوئے نکلے تھے۔

خضر الہی نے"اس شخص نے اسکی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

نور محمد ساکت رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

روپ نگر سے واپسی کے کچھ سالوں بعد گرینڈ پا کا انتقال ہو گیا۔ انہیں مثانے کا سرطان تھا اور ان کی اس بیماری سے ہم ہی لاعلم نہیں تھے وہ خود بھی تھے۔ انفیکشن سمجھ کر وہ جس تکلیف کو نظر انداز کرتے رہے تھے وہ مثانے کا سرطان تشخیص ہوا اور بالآخر یہی مہلک بیماری گرینڈ پا کے آخری سفر کا سبب بن گئی۔ ان کی وفات میرے لئے بہت بڑا سانحہ تھی۔ میں ان کے پاس کب سے تھا مجھے نہیں پتا لیکن وہ میرے پاس ہمیشہ سے تھے یہ مجھے بخوبی پتا تھا۔ لاشعور سے شعور کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے ہمیشہ اپنی انگلی کو ان کی انگلی میں قید پایا تھا۔ وہ میرا اثاثہ ہی نہیں میرا سرمایہ بھی تھے۔ وہ میری روشنی کا ماخذ، میری حرارت کا منبع تھے۔ وہ واقعی میرا سورج تھے۔ ان کے بعد زندگی یکدم تاریک اور سرد ہونے لگی تھی۔ میں اور گرینی ایک دوسرے کا دم بھرنے کی کوشش کرتے مگر ہمیں ایک دوسرے کے وجود میں وہ حرارت نہیں ملتی تھی جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ میں نے اپنے ڈیڈی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری پیدائش سے ایک ماہ پہلے انتقال کر گئے تھے جبکہ ممی مجھے گرینی کے حوالے کر کے اپنی زندگی میں مگن ہو گئی تھیں۔ ان کے اور میرے درمیان ٹرمز نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں ان کے حوالے سے جو چند ایک باتیں جانتا تھا وہ مجھے گرینی کے توسط سے ہی پتا چلی تھیں۔ وہ کبھی کبھار کرسمس پر فون کر لیا کرتی تھیں جو ہیلو ہائے سے زیادہ طویل نہیں ہوتی تھی۔ وہ گرینڈ پا کے فیونرل پر آئی تھیں اور دعا میں شامل ہو کر واپس چلی گئی تھیں۔ اس سے زیادہ ہمارے درمیان تعلقات نہیں تھے کہ ہم ایک دوسرے کو کوئی سہارا یا آسرا فراہم کر پاتے۔ میرے اردگرد اب گرینی ہی تھیں۔ میری اور ان کی زیادہ بنتی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جلدی اکتا جاتے تھے حالانکہ اب وہ مجھے پہلے کی نسبت کم ڈانٹتی تھیں، کم غصہ دلاتی تھیں اور کم ٹوکتی تھیں لیکن وہ گرینڈ پا کی طرح میرے ساتھ باتیں نہیں کرتی تھیں، کھیلتی نہیں تھیں، فلم نہیں دیکھتی تھیں۔ اُن کی نسبت گرینی بوڑھی تھیں اور بدذوق بھی۔ اُن کی باتیں، اُن کے شوق، اُن کی دلچسپیاں اور اُن کے دوست مجھے بھاتے نہیں تھے اور اُنکی طرف بھی میرے معاملے میں یہی صورتحال تھی سو ہم بہت جلد اپنے آپ میں مگن ہو گئے۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی۔ میں باسکٹ بال کھیل کر واپس آیا تھا جب میں نے گرینی کو بے وقت کچن میں مصروف دیکھا۔ وہ اچھے طریقے سے تیار تھیں۔ انہوں نے سنہرے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا ان کے چہرے پر میک اپ تھا اور اُن سے گرینڈ پا کے فیورٹ پرفیوم کی مہک آ رہی تھی۔ مجھے اتنے دنوں بعد انہیں اس طرح دیکھنا اچھا لگا۔

کافی پر مہمان آ رہے ہیں۔" میرے پوچھنے پر گرینی نے بتایا۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گیا۔ گرینڈ پا کے بعد یہ پہلی مرتبہ تھا کہ ہمارے گھر کوئی مہمان کافی پر آ رہے تھے۔ گرینی کی سہیلیوں سے میرا زیادہ تعارف نہیں تھا۔ وہ مجھے گرینی کی طرح بدذوق اور عمر رسیدہ لگتی تھیں سو اپنے بیڈ روم میں رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں نے ٹی وی لگا لیا میری پسندیدہ ٹی وی سیریز آ رہی تھی میں ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی پسندیدہ بھنی ہوئی کھٹی میٹھی مونگ پھلیاں پھانکنے لگا کچھ دیر بعد باہر ہال سے خوش گپیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ گرینی خوش دلی سے گفتگو میں مصروف تھیں۔ ان کے ہنسنے کی آوازیں گاہے بگاہے مجھ تک آ رہی تھیں۔ ان کی آواز میں تازگی چھلکتی محسوس ہوتی تھی جو اچھی لگ رہی تھی۔ گرینڈ پا کے بعد جس طرح وہ ابھی ابھی لگتی تھیں اس کے اثرات کافی کم ہوتے لگ رہے تھے۔

ہلی! ہمارے ساتھ کافی شیئر کرو گے؟"

گرینی مجھے بلانے کے لئے آئی تھیں۔ پہلے میرا دل کیا کہ انکار کردوں پھر یہ سوچ کر کہ میری موجودگی سے انہیں خوشی ملے گی میں ان کے ساتھ باہر آ گیا۔ کافی ٹیبل کے گرد چار لوگ موجود تھے۔ ایک آنٹی ریکا جو گرینی کی پرانی سہیلی تھیں ایک ہماری پڑوسی مسز ڈیمور تھی تھیں ایک گرینڈ پا کے کولیگ کی اہلیہ مسز رامسی تھیں ان کے علاوہ مسٹر ایرک تھے۔ یہ گرینی کے کزن تھے اور پہلے بھی چند بار ہمارے گھر آ چکے تھے۔

تم پہلے سے زیادہ ہینڈسم ہو گئے ہو ینگ مین۔" انہوں نے پُرجوش لہجے میں کہا تھا۔ وہ اچھے دلچسپ انسان تھے اور گرینڈ پا کی طرح چھوٹے بچوں سے کافی پیار کرتے تھے۔

یہ بالکل اپنے باپ کے جیسا ہے۔" گرینی نے مجھے محبت سے دیکھا۔

نہیں میگی۔۔۔ یہ تمہارے جیسا ہے۔۔۔ کیوٹ۔۔۔ چارمنگ۔۔۔" مسٹر ایرک نے گرینی کو دیکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی جن کے رنگ بڑے انوکھے سے تھے۔ میں چونک سا گیا اور کافی پیتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر انکو دیکھتا رہا۔ کیا وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کیا گرینی اتنی جلدی گرینڈ پا کو بھول گئی تھیں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا مگر میں نے اس چیز کا اظہار نہیں کیا۔ کافی پی کر سب آنٹیز چلی گئی تھیں لیکن مسٹر ایرک کافی دیر بیٹھے رہے تھے۔ مجھے ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا لیکن گرینی کی طرف ان کا التفات مجھے کچھ چونکا رہا تھا۔

ایرک اچھا انسان ہے۔۔۔ تمہیں اس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگا۔۔۔ ہے نا؟" رات کو میرا یونیفارم وغیرہ نکالتے ہوئے گرینی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی لیکن مسکراہٹ کا سایہ ضرور تھا۔ میں بستر پر لیٹ چکا تھا۔ ان کی باتیں سن کر یکدم اُٹھ بیٹھا۔

گرینی! مسٹر ایرک اکیلے رہتے ہیں؟" میرے انداز میں تجسس تھا۔

ہاں۔۔۔ اس کی بیوی مر چکی ہے۔۔۔ ایک بیٹی ہے اپنے شوہر کے ساتھ "کارڈف" میں رہتی ہے ایرک بیچارہ میری طرح اکیلا ہے۔"

گرینی کا لہجہ سادہ تھا اور انداز مگن سا تھا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ وہ خود کو میرے ہوتے ہوئے اکیلا کیوں سمجھنے لگی تھیں۔ میں تو انکے ساتھ ہی تھا لیکن وہ شاید میرے ساتھ نہیں تھیں۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ گرینی کو میری خاموشی کا احساس ہوا تھا یا شاید وہ ابھی بھی اپنے آپ میں گم تھیں۔

جب لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انہیں اکیلا رہنا ہی پڑتا ہے۔" میرا بلینکٹ درست کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

جب لوگ اکیلے ہو جاتے ہیں تو انہیں بوڑھے ہونا ہی پڑتا ہے گرینی۔" میں نے بجھے ہوئے دل سے انہیں جتایا تھا پھر اُن کے چہرے کی جانب دیکھے بنا لحاف کو چہرے کے اوپر کر لیا۔

☆ ☆ ☆

مسٹر ایرک اکثر و بیشتر ہمارے گھر آنے لگے۔ وہ فطرتاً اچھے انسان تھے۔ پیار کرنے والے اور باتونی۔۔۔ انہیں بہت سی مزیدار باتیں اور لطائف یاد رہتے تھے۔ وہ ہمارے گھر میں ہوتے تو ان کے اور گرینی کے قہقہے در و دیوار سمیت گونجتے رہتے۔ گرینی ان کی موجودگی میں خوش رہتی تھیں۔ وہ اکٹھے کچن میں کچھ بیک کرتے رہتے یا پھر کھرپی اور کھاد لے کر باغبانی کا شغل جاری رہتا پھر گرینی ان کے ساتھ واک پر بھی جانے لگی

تھیں۔کبھی کبھی وہ گروسری بھی اکٹھی کر لیتے۔ ہمارے ریفریجریٹر میں مسٹر ایرک کی پسند کی چیزیں کثرت سے موجود رہنے لگی تھیں۔ گرینی کی گفتگو میں مسٹر ایرک کا ذکر نمایاں رہتا اور یہ سب کچھ مجھے بے چین کر رہا تھا۔ مجھے ان سے چڑ ہونے لگی تھی۔ میں بے شک گرینڈ پا کی نسبت گرینی سے اتنا اٹیچڈ نہیں تھا لیکن گرینی پر کوئی حق جتائے یہ بھی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے ابھی تک گرینی سے ان کے اس ریلیشن شپ کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن ان کے بدلے بدلے انداز مجھے سب سمجھا رہے تھے۔ نئی بات یہ تھی کہ وہ اب وقتاً فوقتاً میری ممی کا ذکر کرنے لگی تھیں۔ وہ مجھے اکسانے لگیں تھیں کہ مجھے ممی سے فون پر بات کرنی چاہیئے۔

تم اپنی ممی سے ملو۔۔۔ ان سے فون پر باتیں کرو۔۔۔ انہیں پوسٹ کارڈ بھیجا کرو۔۔۔ تم دونوں کے بہترین تعلقات تمہاری آئندہ زندگی میں معاون ثابت ہوں گے۔"

ایک دن جب مسٹر ایرک ہمارے گھر میں موجود تھے تو گرینی نے میری ممی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر ایرک بھی انکا ساتھ دینے لگے۔ میں پڈنگ کھا رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر میرا دل چاہا میں پڈنگ کا پیالہ فرش پہ دے ماروں۔ وہ مجھے ممی سے تعلقات بڑھانے کے لئے کہہ رہیں تھیں جن کو میں نے زندگی میں کبھی ممی کہہ کر بھی نہیں بلایا تھا بلکہ میں نے انہیں کبھی مخاطب بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ لندن کے کس ایریا میں رہتی ہیں۔ میری پیشانی پر تیوریاں نمایاں ہونے لگیں تھیں۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا چمچ پڈنگ کے پیالے میں زور سے پٹخا اور پیالہ میز پر رکھ دیا۔

آپ لوگوں کو میری زندگی کے فیصلے کرنے کا، اس میں مداخلت کرنے کا اور ناپسندیدہ چیزوں کے لئے مجھے مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔ مجھے آپ لوگوں کی کوئی بات نہیں سننی۔۔۔" میں غرایا تھا اور میرا چہرہ مسٹر ایرک کی طرف تھا۔ گرینی چند لمحے حیرانی سے مجھے دیکھتی رہیں پھر جیسے انہیں ہوش آیا۔

بل۔۔۔ اتنی بدتمیزی پر میں تمہیں سخت سزا دے سکتی ہوں۔۔۔ میں تم سے توقع کرتی ہوں کہ تم ایرک سے ابھی معافی مانگ کر اپنے برے رویے کا ازالہ کرو گے۔"

گرینی نے مجھے تنبیہہ کی تھی۔ میری آنکھیں پانی سے لبالب بھرنے لگیں۔ میں ایک چھوٹا بچہ ہی تو تھا جس کے اردگرد رہنے والوں کو اس کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ مجھے گرینڈ پا کی شدید یاد آئی۔ میں نے مسٹر ایرک کے چہرے کو آنسوؤں کی بناء پر دھندلاتے دیکھا۔

آپ کبھی میرے گرینڈ پا کی جگہ نہیں لے سکتے۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ ہیٹ یو۔۔۔ سمجھے آپ۔۔۔"

میں چلایا تھا اور پھر بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے بہت رونا آ رہا تھا اور میں رونا چاہتا تھا۔

تمہارے انداز دن بدن جارحانہ ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ تمہیں ایرک سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیئے تھی۔"

گرینی نے مسٹر ایرک کے جانے کے بعد رات کو میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے کہا تھا۔ وہ ناراض لگ رہیں تھیں۔ روتے رہنے کے باعث میری ناک بہہ رہی تھی اور میرے سر میں درد تھا۔ گرینی کی بات سن کر مجھے اور رونا آنے لگا جسے میں نے بمشکل ضبط کیا۔

آپ اور مسٹر ایرک شادی کرنے والے ہیں؟" بالآخر میں نے پوچھ ڈالا۔ میری بے چینی تب ہی ختم ہو سکتی تھی جب میں گرینی سے اس موضوع پر کھل کر بات کر لیتا۔ میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ گرینی پہلے میرا سوال سن کر چونکیں پھر انہوں نے گہری سانس بھری۔

یہ سوال ہے یا خدشہ؟" وہ اب نارمل ہو چکی تھیں۔

ایک ہی بات ہے گرینی۔۔۔ سوال ہو یا خدشہ"

نہیں۔۔۔ ایک ہی بات نہیں ہے۔۔۔ خدشے کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ میرے پاس جواب ہے۔ میں اور ایرک شادی نہیں کرنے والے۔۔۔ وہ میرا اچھا دوست ہے۔ وہ تنہائی کے دکھ کو سمجھتا ہے اور میرے دکھ کو بانٹنے آتا ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں اور ناراض لگتی تھیں۔

تمہارے گرینڈ پا کی جگہ کوئی اور کیسے لے سکتا ہے بلی۔۔۔ وہ جگہ خالی نہیں ہے۔۔۔ جیک کی یادوں نے اس جگہ کو کبھی خالی نہیں کیا۔۔۔ تم نے یہ کیوں سوچ لیا۔" وہ اب اداس بھی لگنے لگی تھیں۔ مجھے شرمندگی سی ہوئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔

آپ بار بار کیوں ممی کا ذکر کرتی ہیں۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا گرینی۔۔۔ مجھے ان کے ساتھ نہیں رہنا۔۔۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ہمیشہ۔"

میں نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔ انہوں نے میرا چہرہ دیکھا اور دیکھتی رہیں۔

میں نے خود بھی ہمیشہ ایسا ہی چاہا ہے۔۔۔ میں خود تمہاری ممی کو زیادہ پسند نہیں کرتی اور یہ بات تم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پہلے دن سے وہ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ایک ویمپ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔۔۔ اس کی وجہ سے میرے بیٹے کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میں ہمیشہ اس سے خائف رہی ہوں کہ وہ تمہیں ہم سے چھین لے گی۔۔۔ مجھے ہمیشہ یہ اچھا لگتا تھا کہ تم اس کے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ رہ رہے ہو۔۔۔ مگر۔۔۔ انہوں نے کہتے کہتے اپنی مخصوص ٹھنڈی آہ بھری۔

وہ تمہاری ماں ہے۔۔۔ جوان اور پُرجوش۔۔۔ وہ مجھ سے بہتر تمہارا خیال رکھ سکتی ہے۔ تمہارے ساتھ باسکٹ بال کھیل سکتی ہے، گٹار بجا سکتی ہے، ڈانس کر سکتی ہے اور یہ سب میں نہیں کر سکتی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کسی چھوٹے بچے کا اچھے طریقے سے خیال رکھ سکوں۔"

میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں، بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے باسکٹ بال کھیلنے یا ڈانس کرنے کے لئے کسی پارٹنر کی ضرورت نہیں ہے گرینی۔۔۔ مجھے آپکی ضرورت ہے۔۔۔ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔۔۔"

میں نے تڑپ کر کہا تھا اور اپنی بانہیں اُن کے گرد حمائل کی تھیں۔ وہ بیچارگی سے مسکرائیں۔

تم نہیں میں چھوڑ کر جا سکتی ہوں۔۔۔ یہ خدشہ ہے اور اسکا جواب میرے پاس نہیں ہے۔۔۔ جیک اس طرح اچانک ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اگر اسی طرح میں بھی چلی گئی تو تمہارا خیال کون رکھے گا؟"

گرینڈ پا بیمار تھے گرینی اور۔۔۔ آپ بیمار نہیں ہیں۔" میں نے سابقہ انداز میں کہا۔

میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔ بوڑھی ہوں۔" انہوں نے پھر ٹھنڈی لمبی سانس بھری۔

بوڑھے لوگوں سے لمبی دوستی نقصان کا باعث بنتی ہے اور میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔"

آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں گرینی؟" میں روانسا ہو رہا تھا۔

بڑھاپا بھربھری مٹی کا پیڈسٹل ہوتا ہے۔ یہ آپ کو اونچا کر سکتا ہے لیکن اس اونچائی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ تمہیں مضبوط پیڈسٹل کی ضرورت ہے جب تک تم خود اپنے قد کی بناء پر اونچے نہیں ہو جاتے۔ تمہاری ممی یہ مضبوط پیڈسٹل بن سکتی ہے۔" وہ اب ناصحانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

میں پہلے ہی بہت اونچا ہو چکا ہوں گرینی۔ میرا قد آپ جتنا ہو گیا ہے۔ مجھے مزید اونچا نہیں ہونا۔ مجھے کسی پیڈسٹل کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے خود کو مزید رونے سے بھی نہیں روکا تھا۔

میں تمہیں اس سے بھی زیادہ اونچا دیکھنا چاہتی ہوں۔ جذباتی ہونے سے کامیابی نہیں ملتی۔۔۔ کامیاب ہونا ہو تو جذبات کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔"

وہ قطعیت سے کہہ رہی تھیں اور میں قطعیت سے رو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ سب میرے لئے آسان نہیں ہے لیکن آسانیاں تلاش کرتے رہنے سے مشکلات بڑھتی ہیں اس لئے مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں آسانیاں نہیں۔"

گرینی نے اپنے مخصوص پُر وقار انداز میں کہا تھا۔ ہم ڈنر ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ کھانا ابھی چنا نہیں گیا تھا۔ سب کے انداز دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کسی کو بھوک نہیں ہے۔ سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ گرینی بالکل سامنے بیٹھی تھیں۔ انکے ساتھ میری کرسی تھی۔ میرے بالکل سامنے میری جوان، طرحدار، خوبصورت ممی بیٹھی تھیں۔ انکے ساتھ والی کرسی پر آنٹی ربیکا تھیں جبکہ مسٹر ایرک میرے ساتھ والی کرسی پر براجمان تھے۔

گرینی مجھے ممی کے ساتھ رخصت بھجوا رہی تھیں اس لئے بے چین تھیں جبکہ ممی شاید اس لئے بے چین تھیں کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں۔

وہ ایک دن پہلے ہی آئی تھیں۔ گرینی نے انہیں خط لکھ کر بلوایا تھا ان کے اور گرینی کے درمیان مجھے لے جانے والے ایشو پر کیا بات ہوئی تھی مجھے اس سے قطعاً بے خبر رکھا گیا تھا۔ گرینی نے مجھے صرف اطلاع دی تھی کہ ممی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر خوش دلی سے آمادہ ہیں اور اب مجھے ممی کے ساتھ ہی جانا ہے اور اب یہ آخری ڈنر تھا جو میں گرینی کے ساتھ کرنے والا تھا۔ میرا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور دل کی حالت بہت بے چین تھی۔ میں گرینی کی بہت منت سماجت کر چکا تھا کہ مجھے ان کے ساتھ ہی رہنا تھا، ان کو چھوڑ کر نہیں جانا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی تھیں۔ اسی ضد کی بناء پر انہوں نے ممی کو رضامند کر لیا تھا۔

میرا پوتا بلس مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں نے تیرہ سال تک اُس کو اپنے پروں میں چھپا کر رکھا ہے۔ اس پہ کوئی آنچ نہیں آنے دی اور بلس بہت اچھا بچہ ہے۔ اسے کتابوں سے محبت ہے۔ یہ فطرت کا دلدادہ ہے اور بے ترتیبی سے اسے سخت نفرت ہے۔ اس کی طبیعت کی شائستگی کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اس کی تربیت کرنے میں آسانی ہوئی ہے۔ میں امید کرتی ہوں کرسٹی کہ تم اپنے بیٹے کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔ ایک

بچے کا ساتھ آپ کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتا ہے اور کرسٹی میں تمہیں تمہاری خوشیاں اپنی پوری رضامندی کے ساتھ لوٹاتی ہوں۔"

گرینی کی آواز بھرانے لگی تھی۔ انہوں نے بات مکمل کر کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے آنکھوں کے کنارے صاف کیے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ مجھے بہت رونا آ رہا تھا اور میں بہت ضبط کر رہا تھا۔ گرینی نے دایاں ہاتھ میری جانب بڑھایا۔ میں نے اُن کے ہاتھ کو تھام کر پہلے ہونٹوں اور پھر آنکھوں سے لگایا تھا۔ آج جب میں انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھے ان سے کتنی محبت ہے۔

میں آپ کو بہت مس کروں گا گرینی!" میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں بھی۔۔۔۔ میرے بچے۔۔۔۔" وہ بھی آبدیدہ تھیں۔ آنٹی ریبکا نے بھی اپنی آنکھیں صاف کیں۔

میں پوری کوشش کروں گی میگی آنٹی کہ بل کا خیال ویسے ہی رکھ سکوں جیسے آپ نے اب تلک رکھا ہے۔"

میری ممی نے گرینی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا لیکن ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکایا۔ مجھے بار ہا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دلی رضامندی سے مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا رہیں۔ مسز روز میری جو ہماری ہاؤس کیپر تھیں نے کھانا لگوانا شروع کر دیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں چند لمحے بعد بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

بڑھی اکیلی رہ رہی ہے یا پھانس لیا ہے کوئی مرغا۔" یہ میری ممی کا گرینی کے متعلق ان سے علیحدہ ہو جانے کے بعد پہلا سوال تھا اور اب میں اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ ان کے مفہوم سمجھ نہیں پاتا۔ میں نے حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ گرینی کے سامنے تو اتنی غیر مہذب نہیں لگی تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا لیکن مجھے ان کے بدلے ہوئے لہجے سے نجانے کیوں خوف آیا۔

مسٹر ایرک کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے کیا۔۔۔ ساتھ رہ رہے ہیں دونوں۔"

یہ دوسرا سوال تھا اور اتنا چبھتا ہوا سوال تھا کہ میں ان کی جانب سے نظریں ہٹا کر ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن غروب ہونے کی تیاری میں تھا۔ اس کی دمکتی کرنیں اب زرد و نارنجی لباس پر تاریکی کی دھاریوں والا لبادہ اوڑھ رہی تھیں۔ آسمان کا رنگ بھی میلا میلا سا ہو رہا تھا ایسے میں غروب ہوتا ہوا سورج مجھے کسی بوڑھے ہارے ہوئے بادشاہ کی طرح اکیلا اور تھکا ہوا دکھائی دیا۔

گرینی بہت اکیلی ہیں۔" میں نے "بہت" پر زور دیتے ہوئے میں نے گہری سانس بھری۔

اتنی اکیلی ہوتی تو تمہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔۔۔ اونہہ۔"

ان کا لہجہ سفاک تھا۔ ہنکارا بھر کر انہوں نے اپنا وینٹی باکس کھول کر اس میں سے کچھ نکالنا شروع کر دیا تھا۔ میں ان کی بات پر ساکت رہ گیا تھا۔ میں بلاوجہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا جو میری گود میں دھرے تھے۔

آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں؟"

میرا لہجہ شاید میری دلی کیفیت ظاہر کر رہا تھا مگر ممی نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ ان کی ہنسی بہت کھنک دار تھی۔

تم بھی اپنے گرینڈ پیرنٹس کی طرح بہت جذباتی ہو۔" انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور پھر اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرنے لگیں۔

کسی انسان یا اس سے متعلق صورتحال کو جانچنا ہو تو جذبات کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اس سے ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔"

لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیلا کر انہوں نے ہونٹوں کو باہم مس کیا تھا۔ وہ آئینے میں دائیں بائیں زاویے سے اپنے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کام سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے لپ اسٹک اور آئینے کو باکس میں واپس رکھ دیا۔

یہ ٹرین دیکھ رہے ہو۔۔۔ یہ ہمیں لندن لے کر جائے گی۔" میری جانب رُخ موڑ کر انہوں نے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ لی تھی۔

اتنی دلچسپ بات مجھے پہلے سے پتا ہے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

میں جو بات اب تمہیں بتانے والی ہوں وہ صرف دلچسپ نہیں ہے۔" ممی اب خفا نہیں لگ رہی تھیں۔

مجھے ٹرین کا سفر اس لئے پسند ہے کہ اس میں کوئی" یوٹرن" نہیں ہوتا۔۔۔ انسان کو یوٹرن لینے کے لئے خود ٹرن لینا پڑتا ہے۔ میری زندگی گزارنے کی فلاسفی بالکل ٹرین کے جیسی ہے۔ میں یوٹرن نہیں لے سکتی۔۔۔ مجھ سے لیا ہی نہیں جاتا۔ ٹرین کی طرح۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں۔ میں سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کے بارے میں گرینی پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ وہ بے لچک سی خاتون ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو گے۔۔۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو خود کو بدلنا ہوگا، خود کو میرے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں ہوگا تمہارے لئے کہ تم مجھے ایک اچھے بچے لگ رہے ہو اور یقین کرو میں بھی بری لڑکی نہیں ہوں۔ میرا اپنا ایک طرزِ زندگی ہے، ہر شخص کا ہوتا ہے، تمہارا بھی ہوگا، میں نے تمہیں کبھی بھی ڈس اون نہیں کیا۔۔۔ ابھی بھی نہیں کروں گی۔۔۔ لیکن۔۔۔"

وہ لمحہ بھر کے لئے رکی تھیں۔

میں یوٹرن نہیں لے سکتی۔"

مجھے آپکی بات سمجھ میں آگئی ہے۔ آپ مجھے کُند ذہن مت سمجھئے اور یہ بھی مت سمجھیں کہ میں کبھی آپکو یوٹرن لینے کیلئے مجبور کروں گا۔"

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ انہوں نے سر ہلا دیا جیسے میری سمجھداری کو سراہ رہی ہوں۔

بہت خوب۔۔۔ مجھے تمہارا انداز اچھا لگا۔ تم جلدی بات سمجھ لیتے ہو۔۔۔ اپنے باپ کی طرح۔۔۔" وہ مسلسل ہولے ہولے سر ہلا رہی تھیں۔

میں نے انکا چہرہ آج پہلی بار اتنے قریب سے اور اتنے غور سے دیکھا تھا۔

آپ کے شوہر اس بات پر اعتراض تو نہیں کریں گے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔"

میں نے پوچھا تھا۔ میرے لہجے میں عجیب سی جھجک در آئی تھی۔ میرے لئے یہ پوچھنا بہت ضروری تھا کہ ان کے گھر والے میرے بارے میں کیا سوچتے تھے۔

اوہ میرے خدا۔۔۔ تم واقعی اپنے باپ کی طرح ہو۔۔۔ وہی وضعداری۔۔"

انہوں نے اپنی تیکھی ناک سکوڑی۔ گرینی کی ان کے بارے میں ایک بات تو غلط ثابت ہوگئی تھی۔ وہ ممی کو ویمپ کہتی تھیں۔ اتنی خوبصورت ویمپ کے بارے میں کہیں نہیں پڑھا تھا میں نے۔ یہ میری اور ممی کی پہلی باضابطہ طویل نشست تھی۔ آج سے پہلے مجھے ان کے ساتھ اتنی دیر بیٹھنے یا بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں ان کے بارے میں جانتا ہی کیا تھا اور اب جوان کو جاننے کا موقع مل رہا تھا تو خدشات میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

میرا کوئی شوہر نہیں ہے بیٹ مین۔۔۔ تم مجھے سنگل سمجھو" انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔

زندگی میں ایک شادی کافی ہوتی ہے۔ غلطی کرنا حماقت نہیں ہوتی۔۔۔ غلطی کو دوہراتے رہنا حماقت ہوتی ہے۔۔۔ اور میں احمق نہیں ہوں۔"

انہوں نے کہتے کہتے یکدم میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ ممتا کا پہلا لمس بے حس، بے تاثر اور بے کار تھا۔ محبت" سے آپ کو کچھ اور ملے نہ ملے توانائی ضرور ملنی چاہیئے۔ میری ممی کی محبت میں میرے لئے کوئی توانائی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ ایک سیکنڈ سے بھی پہلے اٹھا لیا۔ میں نے اطمینان بھری سانس لی۔

ٹرین آگے کی سمت جا رہی تھی۔ میں کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تم کالج کیوں نہیں آتے؟" راشد نے اس کے بنائے ہوئے نوٹس کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ راشد سے اس کی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی تھی جہاں وہ ایف ایس سی کے تین مضامین کی ٹیوشن پڑھ رہا تھا۔ اونچے لمبے قد والا راشد طبیعتاً بیحد ملنسار و خوش مزاج تھا۔ اس کی خاموشی اور لاتعلقی کو نظر انداز کر کے وہ اس کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے درمیان دوستی ہونا شروع ہوگئی تب ہی اسے پتا چلا کہ راشد اس کے کالج میں ہی پڑھتا ہے۔ کالج میں اس کی مسلسل غیر حاضری کو محسوس کر کے راشد نے اس سے پوچھا تھا۔

بلاوجہ ٹائم ضائع کرنے کا فائدہ۔۔۔ کالج میں پڑھائی کب ہوتی ہے" اس نے ابو کی زبان بولی تھی۔ راشد نے نظریں اٹھا کر لمحہ بھر کے لئے اس کی جانب دیکھا۔

ہمیشہ نہیں ہوتا ٹائم ضائع۔۔۔ ہم بھی تو جاتے ہیں کالج۔۔۔ میں، جبران، طلحہ۔۔۔ ہم پڑھنے ہی جاتے ہیں" راشد نے اپنے کالج کے دوستوں کے نام لئے تھے۔

میں گھر پر پڑھ لیتا ہوں" اسکا لہجہ سادہ اور لاتعلق تھا۔ راشد نے کچھ کہنا چاہا مگر اکیڈمی ٹیچر کے آجانے سے وہ کہہ نہیں پایا لیکن چند دن بعد اس نے ایک بار پھر یہ ٹاپک چھیڑ دیا اور بطورِ خاص تاکید کی۔

کل کالج ضرور آنا"

کیوں۔۔۔ کوئی خاص بات؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔ فزکس کا لیکچر ہو رہا تھا۔

کل کالج میں اینول اسپورٹس ڈے ہے" راشد کا لہجہ پرجوش تھا۔ وہ ہاکی کی ٹیم میں شامل تھا۔ راشد کی تاکید کے باوجود وہ اینول

اسپورٹس ڈے پر کالج نہیں گیا تھا بلکہ اسکے دو دن بعد جب زیادہ تر لڑکے غیر حاضر تھے وہ فقط حالات حاضرہ جاننے کے لئے کالج کا چکر لگا آیا تھا۔ کالج فنکشنز اور ایونٹس کنفیوژن اور تھکن کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیتے تھے۔ ایسی باتوں میں اس کی دلچسپی صفر تھی۔ کالج میں اسکا کوئی دوست نہیں تھا۔ کلاس فیلوز سے اس کا رشتہ بے حد سرسری تھا۔ جو لڑکے اسے پہچانتے تھے وہ کبھی کبھار اسے کالج میں دیکھ کر ہیلو ہائے کے بعد اپنی راہ ہو لیتے تھے۔ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ایک بورنگ پڑھاکو اور غیر دلچسپ باتیں کرنے والے لڑکے کے پاس کھڑے ہو کر گپ شپ کی جاتی۔ اسی لئے وہ اکیڈمی میں مطمئن رہتا تھا وہاں چند ایک لڑکے تھے جو علیک سلیک کے بعد بھی اس سے چند باتیں کر لیا کرتے تھے۔

میں نے تمہارا بہت انتظار کیا بلکہ میں نے تمہارے لئے اپنے ساتھ جگہ بھی رکھی تھی اگلی رو میں تاکہ ہم سب کچھ با آسانی دیکھ سکیں۔۔۔ مگر تم۔۔۔" راشد نے چند دنوں بعد اس سے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور مسکراہٹ ایک ساتھ چمکی۔ ایسے شکوے اس سے کبھی کسی نے نہیں کئے تھے۔

میں۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ میں نے آنا تھا۔۔۔ میرا مطلب میرا ارادہ تھا مگر میری طبیعت خراب ہو گئی۔۔۔ سوری۔" دوستی کا وہ رشتہ جو مضبوط ہونے جا رہا تھا۔ اس میں اتنا جھوٹ بولنا جائز لگا تھا اس کو۔

اوہو۔۔۔ چلو کوئی بات نہیں۔۔۔ اب جس جس روز تم کالج آؤ مجھے ایک روز پہلے بتا دینا۔۔۔ میں تمہیں طلحہ اور جبران سے ملواؤں گا۔"

راشد نے اسکا ایکسکیوز قبول کر لیا۔ راشد کی طبیعت میں ملنساری کچھ زیادہ ہی تھی اور اسے باتیں کرنے کا فن بھی آتا تھا لیکن وہ باتیں کرنے کا شائق تھا نہ اسے زیادہ لوگوں سے ملنے کی طلب تھی۔ جس طرح دن، رات کا تعاقب کرتا ہے اور رات، دن کی پیروی میں پاگل رہتی ہے اسی طرح ان کے درمیان بھی کیمسٹری بتدریج ملنے لگی۔ راشد کی اس کے نوٹس میں اور اس کی راشد کی باتوں میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ کالج جا کر اس نے طلحہ اور جبران سے بھی ملاقات کی۔ وہ دونوں بھی کافی خوش مزاج تھے اس لئے اُس روز اسے کالج میں بہت مزہ آیا ویسے بھی اکیڈمی میں زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا لیکن کالج میں کلاسز بنک کر کے وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کرکٹ، ہاکی کی باتیں، فلموں اور گانوں کی باتیں، ٹیچرز اور کلاس فیلوز کی باتیں۔۔۔ ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کتنا کچھ تھا طلحہ، راشد اور جبران کے پاس جبکہ وہ سن رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ ایک دوستی نے کچھ زخم دیے تھے "ایک" اور دوستی ان زخموں کے خشک ہو جانے والے کھرنڈوں کو بہت نرمی سے کھرچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیکنڈ ائیر کا ٹور جا رہا ہے۔۔۔ مری۔ طلحہ نے بے حد پر جوش لہجے میں اطلاع دی۔ یہ اطلاع صرف اس کے لئے تھی راشد باقاعدگی سے کالج جاتا تھا اس لئے اسے یہ بات پہلے سے پتا تھی۔ فرسٹ ائیر کے ایگزامز ہو چکے۔ فرسٹ ائیر کے سارے سیکشن کو عارضی طور پر پروموٹ کر دیا گیا تھا۔ پڑھائی کا لوڈ اور سپیڈ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھا اسی لئے طلحہ نے اسی کی اکیڈمی جوائن کر لی تھی۔

تم چلو گے نا۔۔۔ اب یہ مت کہنا کہ ٹائم ضائع ہوگا" راشد کو اسکے متوقع انکار کا پتا تھا اسلئے اس نے پہلے ہی اس سے یقین دہانی چاہی۔

سر کہہ رہے تھے سنڈے کو لے کر جائیں گے کیونکہ منڈے کو فرسٹ مئی کی چھٹی ہے دو دن کا ٹور ہے اس لئے ٹائم ضائع نہیں ہوگا۔ طلحہ

نے بھی اس کے متوقع لا جک کو بیان کرنے سے پہلے رد کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سر کے جلدی آ جانے کی دعا کرنے لگا تا کہ فی الحال بات ٹالی جا سکے۔ اس کے پاس انکار کی کوئی مناسب دلیل نہیں رہی تھی۔ تین گھنٹے دورانِ امتحان کاغذ پر بے شمار الفاظ اتارنے والا وہ لڑکا بعض اوقات بولنے کے لئے تین مناسب لفظ بھی نہیں ڈھونڈ پاتا تھا۔

میرے ابو ایسی چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔ جتنو کسی کے سر نہیں آئے تھے سوائے ٹور کا سوال حل کرنا ہی پڑا تھا۔ اس نے سر جھکائے ہوئے سادہ سے لہجے میں اپنے دوستوں کو اصل وجہ بتا دی تھی۔

سب ہی ابو ایسی چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں۔۔۔ میرے ابو بھی کب اجازت دے رہے تھے۔" راشد کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

تم ابو کی بات کرتے ہو میری امی اجازت نہیں دیتیں۔۔۔ انہیں عجیب و غریب خدشات ستاتے رہتے ہیں۔۔۔ اکیلے کیسے جاؤ گے میرے بغیر۔۔۔ تھکن ہو جائے گی۔۔۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو۔۔۔ رات کو لیٹ ہو گئے تو واپسی میں مشکل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ طلحہ چونکہ اکلوتا اور لاڈلا تھا سو امی کی فکریں اسے عجیب و غریب خدشات لگتے تھے۔

تم لوگوں نے اپنے پیرنٹس کو کس طرح منایا پھر۔۔۔؟ اسے اُن دونوں کے منہ سے یہ سن کر حیرانی ہوئی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ ایسی روک ٹوک صرف اس کے ابو کرتے ہیں۔

بہت آسان حل ہے۔۔۔ بھوکے رہو۔۔۔ کھانا مت کھاؤ۔۔۔ ضد کرو۔۔۔ کمرے میں بند ہو جاؤ۔۔۔ بات چیت بند کر دو۔۔۔ منہ بسور کر دکھاؤ۔۔۔ فوراً مان جائیں گے۔"

طلحہ نے اسے آزمودہ طریقے بتائے تھے۔ اسے کوئی بھی طریقہ خاص قابلِ ذکر نہیں لگا۔ ابو کی ایک گھرکی اور ایک گھورتی ہوئی نظر ان تمام طریقوں پر پانی پھیر سکتی تھی۔ اس نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا جبکہ طلحہ اور راشد مسلسل ٹور کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتیں سن سن کر اسکے دل میں بھی کھد بد مچ رہی تھی۔ وہ ٹور کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ ایسی تفریح کا خیال اس کے لئے بے حد انوکھا تھا اور ایسی صورتحال میں جب اس کے کچھ اچھے دوست بن چکے تھے جو بے حد اصرار کے ساتھ اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہ رہے تھے اسکا دل اور بھی ہمکنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ابو سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتا انہوں نے خود ہی یہ دروازہ بند کر دیا۔

میرے کولیگ بتا رہے تھے اس سال سے میڈیکل میں ایڈمیشن کے لئے اینٹری ٹیسٹ ہوا کرے گا جس کا کلیئر کرنا بے حد ضروری ہے اس ٹیسٹ کا پیٹرن ایگزامز کے پیٹرن سے بالکل مختلف ہوگا یعنی ڈبل محنت کی ضرورت ہے۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔۔۔ ضائع کرنے کے لئے تمہارے پاس ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔"

انہوں نے اسے نصیحت کی ماہانہ ڈوز اپنے مخصوص کڑوے لہجے میں دی تھی۔ اب یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ابو سے کالج ٹور پر جانے کی بات کر پاتا مگر پہلی بار وہ بے حد جھنجھلاہٹ اور اکتاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

کیا مجھے کبھی اپنے لئے ایک لمحہ بھی نہیں مل سکے گا" ہاتھ سے لکھے گئے نوٹس کے صفحوں کو بلاوجہ الٹتے پلٹتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

ابو نے اجازت نہیں دی۔" اگلے دن راشد کے استفسار پر اس نے بتا دیا تھا۔ طلحہ اور راشد نے بمشکل اس کے انکار کو ہضم کیا۔ انکا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتا بلکہ وہ دونوں یہ بھی سمجھتے تھے کہ بحیثیت دوست کے وہ انہیں زیادہ پسند نہیں کرتا اگرچہ وہ اس امر کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن ہر گزرتا دن ان کے اس خیال کی تصدیق کر دیتا تھا۔ راشد نے بہت خلوص سے اسے اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی نے قرآن پاک حفظ کیا ہے۔۔۔ اس کی آمین ہے۔۔۔ تم ضرور آنا۔" وہ چونکہ جانتا تھا ابو اجازت نہیں دیں گے اس لئے اس نے خود ہی معذرت کر لی مگر چند دن بعد طلحہ نے کمبائن اسٹڈی کے لئے راشد کو گھر دعوت دی تو اسے بھی بلانا چاہا۔

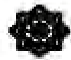
تمہارا گھر بہت دور ہے۔۔۔ واپسی پر شام ہو جائے گی۔۔۔ بہت مشکل ہے یار۔۔۔ میں نہیں آ پاؤں گا۔" اسے بہانے بنانا آتا جا رہا تھا۔

اس کی تم فکر نہیں کرو۔۔۔ میرے ابو مجھے لینے آئیں گے تو ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔" راشد نے اس کی مدد کے خیال سے فوراً حل پیش کیا۔

میرے ابو اجازت نہیں دیں گے۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہہ دیا تھا۔ یہ ہی حقیقت تھی لیکن اس کے دوستوں کو ہمیشہ کی طرح بہانہ لگا تھا۔

یار! مجھے ایک بات بتاؤ۔۔۔ تمہارے ابو جلاد ہیں کیا۔۔۔ وہ کسی بات کی بھی اجازت نہیں دیتے۔۔۔ کالج جانے کی نہیں۔۔۔ ٹور پر بھی نہیں۔۔۔ فرینڈز کے گھر بھی نہیں۔۔۔ کمبائن اسٹڈی کے لئے بھی نہیں۔۔۔ اتنی پابندیاں تو آجکل لوگ لڑکیوں پر بھی نہیں لگاتے۔۔۔ تم واقعی ان کی سگی اولاد ہو نا۔۔۔ آئی مین سوتیلے بیٹے والا چکر تو نہیں۔ طلحہ نے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گیا۔ جھوٹ کی وضاحت مزید ایک جھوٹ سے ہو سکتی ہے۔ وہ سچ کی وضاحت کیا دیتا۔ طلحہ اور راشد دونوں اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں منانے کی کوشش نہیں کی لیکن نجانے کیوں اسے ساری رات سکون کی نیند نہ آ سکی۔ دل تو بوجھل تھا ہی ساتھ ہی ساتھ طلحہ کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے۔

تم واقعی ان کی سگی اولاد ہو نا۔"



"یہ محبت بھی بڑی ہی ذلیل و خوار کر دینے والی شے ہے۔"

پلین کی لمبی سی سرنگ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اکتا کر سوچا تھا۔ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اسے لاہور سے لندن کی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ملی تھی سو سب سے پہلے وہ قطر پہنچی تھی جہاں جہاز کو شکم سیر ہونا تھا اس کے بعد قاہرہ جہاں بارہ گھنٹے کا قیام اس کے لئے ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھا اور اب وہ بالآخر لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ کے چھٹے ٹرمینل پر اتر رہی تھی۔ اترنا بھی کیا تھا بس جہاز سے باہر آ گئی تھی۔

سنا تھا جہاز میں سیڑھیاں وڑھیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔۔۔ شاید پچھلے وقتوں کا قصہ ہوگا۔"

وہ جب پلین میں سوار ہوئی تھی تو سوچا تھا۔ تب ذہن بھی تروتازہ تھا اور وہ خود بھی۔ لیکن اب ایک لمبے سفر نے اسے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ہیتھرو ویسا نہیں تھا جیسا دوستوں نے بتایا تھا، انٹرنیٹ پہ دیکھا تھا یا اخباروں میں پڑھ رکھا تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا، پُرشکوہ، بلند و بالا اور کسی قدر ہیبت ناک۔ اسے چکنے فرش پر ہینڈ کیری گھسیٹتے ہوئے پہلی بار وطن سے دوری اور تنہائی کا احساس ہوا اور ساتھ ہی عمر احسان پر بے حد غصہ آیا۔ اچھا بھلا وہ اسے خود لینے آنے والا تھا پھر جانے کیسے اس کی چھٹیاں ایک مسئلہ بن گئیں اور اسے حکم ملا کہ وہ اکیلی رخصت ہو کر سسرال چلی آئے حالانکہ نکاح کے بعد سے تین سالوں تک وہ عمر کو یہی باور کرواتی رہی تھی کہ وہ خود اسے لینے پاکستان آئے گا تو وہ آئے گی ورنہ وہیں بیٹھی رہے گی اور عمر کا وعدہ بھی یہی تھا کہ دلہنیں اکیلی سسرال آتی اچھی لگتی ہیں بھلا؟۔۔۔ مگر۔۔۔ اس مگر کے بعد بظاہر سب ختم ہو جاتا تھا۔

"یار سمجھنے کی کوشش تو کرو۔۔۔ میں نہیں آ سکتا۔۔۔ میں آنا چاہتا تھا یار۔۔۔ مگر۔۔۔"

اس مگر کے بعد وہ گہری سانس بھرتا تھا۔ ایسی گہری سانس کہ امائمہ چاروں شانے چت ہو جاتی تھی۔ اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر عمر کا اصرار بڑھنے لگتا۔

"میں نے تین سالوں سے تمہیں نہیں دیکھا۔۔۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نہیں آ سکتا تمہیں لینے اس سال۔۔۔ ممی ڈیڈی بھی یہی پلان کر رہے ہیں کہ ہیتھرو ائیر چلیں گے۔ وہ اس سال حج کے لئے سعودیہ جانا چاہتے ہیں اور وہاں سے پاکستان وزٹ کریں گے۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتا یار۔۔۔ میں تھک گیا ہوں۔۔۔ پلیز تم آ جاؤ۔۔۔"

یہ عمر کے الفاظ نہیں ہوتے تھے بلکہ کوئی جنتر منتر ہوتا تھا جو اچھی بھلی امائمہ آفاق علی کو چڑیا، بلبل، ہوٹل ٹائپ کوئی پرندہ بنا دیتے اور اس کا دل چاہتا کہ وہ اڑ کر عمر کے پاس چلی جائے۔ گزشتہ تین سالوں میں عمر احسان نے اس کو اتنا چاہا تھا، اتنی محبت دی تھی کہ وہ، وہ نہیں رہی تھی کچھ اور بن گئی تھی۔ وہ جو دوستوں پہ ہنسا کرتی تھی کہ محبت بھی بھلا کوئی کرنے والا کام ہے اور وہ جو برملا کہا کرتی تھی کہ عورت چاہنے نہیں چاہے جانے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ جیسے کشتی دریا پہ راج کرتی ہے تو قائم رہتی ہے۔ اگر دریا کشتی پر راج کرنے لگے تو کشتی کا کچھ نہیں بچتا وہ ڈوب جاتی ہے بالکل اسی طرح جب عورت مرد سے محبت کرتی ہے تو وہ ختم ہو جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔

عمر احسان کے ساتھ نکاح کے چند بولوں نے اسے واقعی فنا کر دیا تھا۔ ابتداء میں اس نے بھی ڈوبتی کشتی کی طرح بچاؤ کی کوششیں کی

تھیں پھر جب بس نہیں چلا تو وہ عمر کی محبت میں پور پور ڈوب گئی تھی۔

"اللہ کے کاموں میں انسانوں کا کیا دخل۔" وہ فخریہ انداز میں فرینڈز کے سامنے اپنی محبت کو تسلیم کر لیتی تھی۔ اس نے اپنی انگلی میں بڑی پلاٹینم کی انگوٹھی کو گزشتہ تین سالوں میں کبھی خود سے علیحدہ نہیں کیا تھا۔ نکاح کے بعد عمر نے یہ انگوٹھی خود اس کی انگلی میں پہنائی تھی حالانکہ تب وہ بہت خفا تھی۔ وہ انگوٹھی پہننا چاہتی تھی نہ نکاح کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہ شخص جیون ساتھی کے طور پر پسند ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے دن سے اس سے سخت متنفر تھی اور پھر جب وہ منگنی کے بعد جھگڑا کر کے اس سے انگوٹھی واپس لے گیا تھا اس نے تب ہی امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس قصے کو بھول جائیں۔ وہ یہ شادی نہیں کرے گی لیکن اس کے باوجود نجانے امی نے کیا جادو چلایا تھا کہ عمر کے ابو نے اس کے ابو کو فون پر فون کرنا شروع کر دیے تھے۔

"ہم چاہتے ہیں بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔۔۔ بعد میں پیپرز وغیرہ آسانی سے بن جائیں گے۔" اس کے ابو تو پہلے ہی ایسے معاملات میں عجلت پسند واقع ہوئے تھے سو فوراً یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ امائمہ کو بعد میں عمر نے بتایا تھا کہ اس کے ابو نے یہ مطالبہ عمر کی فرمائش پر کیا تھا۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن فلائی کر گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار امائمہ کو ڈنر پر لے گیا تھا۔ اس ڈنر سے واپسی پر بھی امائمہ امی سے سخت خفا ہوئی تھی وہ پہلے ہی نکاح کے لئے کسی طور راضی نہیں تھی۔ وہ امی کے اصرار پر عمر کے ساتھ گئی تھی اور واپس آ کر اس نے امی کے سامنے عمر کو "بونگا" قرار دیا تھا اور گزشتہ تین سالوں میں اسی بونگے نے نجانے اس پر کیا سحر پھونکا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"یہ محبت بھی بڑی ذلیل و خوار کر دینے والی شے ہے۔"

یہ محبت ہی تو تھی کہ وہ یوں اکیلی اتنی دور سفر کر کے آ گئی تھی ورنہ عمر اسکی خاطر ملازمت چھوڑنے کو تیار تھا۔۔۔ یہ اس کا تصور ہی تو تھا جس نے اسے اکیلے سفر کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ابو نے کہا بھی تھا کہ وہ اگلے سال اپنے ساس سسر کے ساتھ جائے تو بہتر ہے مگر امی نے کہا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ اپنے شوہر کے پاس جائے کیونکہ وہ خود بھی حج کے لئے جانا چاہتے تھے سو امائمہ کی رخصتی شوہر اور سسرالیوں کے بغیر ہو گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سے بیرون ملک مقیم پاکستانی خاندان ایسے ہی شادی بیاہ رچانے کی عادی ہیں سو وہ بھی بہت اعتماد سے تن تنہا یہاں تک آ گئی تھی۔

سامان وغیرہ سمیٹ کر اور ساری کارروائیوں سے فراغت کے بعد اسے ویٹنگ لاؤنج میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

"ویلکم ٹو مائی ورلڈ۔" کوئی بہت دھیمی آواز میں گنگنایا تھا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عمر اس کے مقابل آ گیا تھا۔ امائمہ نے ایک نظر ہی اس کی جانب دیکھا پھر اس کے چہرے سے اشتیاق و بے چینی کی پھوٹتی روشنیوں سے جھجک کر نظریں جھکا لیں محبت کا سنہرا رنگ سیاہ آنکھوں پہ اتنا حاوی تھا کہ ہر چیز جھلملاتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک شخص جسے وہ نا جانے کون کون سے ناموں سے پکارا کرتی تھی اب ایسے سامنے کھڑا تھا کہ اس سے زیادہ وجیہہ شاید کبھی کوئی نظر ہی نہ آیا ہو۔ وہ کیسا لگ رہا تھا یہ کوئی امائمہ کے دل سے پوچھتا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی جیسے بہت دن سے شیو نہ کی ہو۔ ڈارک گرین ہائی نیک جرسی اور بلیو جینز میں وہ امائمہ کو بے حد مکمل انسان لگا۔ ایسا انسان جس کی ہمراہی کسی بھی عورت کے لئے خوش قسمتی کا باعث بن سکتی تھی۔

یہ وہی چہرہ تھا جو چند سال قبل اس کے لئے ڈفر، بونگا اور نلو تھا اور اب۔۔۔ یہ عمر نہیں تھا جو بدل گیا تھا بلکہ یہ امائمہ تھی جس کی کایا پلٹ گئی تھی۔

"السلام وعلیکم" اس کو بھرپور استحقاق سے دیکھتے ہوئے عمر نے سلام میں پہل کی تھی اور اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ جھجک تو رہی تھی مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے اعتماد سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔

"ایسے تو کام نہیں چلے گا یار!" اس نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے اس کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ لمحے بھر کا کھیل تھا۔ اب وہ اس کا ہاتھ تھامے اُسے ممی ڈیڈی سے ملوا رہا تھا اور امائمہ خود کہاں تھی۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ شاید ہوا بن کر آسمانوں میں جھوم رہی تھی، خوشبو بن کر باغوں میں منڈلا رہی تھی یا شاید سانس بن کر کسی کے وجود میں سما گئی تھی۔ محبت مجسم موجود ہوتی تو شاید سرمستی کے عالم میں رقص کرنے لگتی۔ محبت واقعی فاتحِ عالم ہے۔ کون کہتا ہے محبت کی طبیعت میں بچپنا ہے۔۔۔ غلط۔۔۔ محبت کی طبیعت میں بڑھاپا ہے، معجزا پا ہے، قوت ہے، طاقت ہے، علم ہے، عمل ہے اور سب سے بڑھ کر معجزہ ہے۔ یہ زمین پر بیٹھے آسمان دکھا سکتی ہے، آسمان پر بیٹھے زمین گھما سکتی ہے۔

یہ رب نہیں ہے۔ یہ رب کی عطا ہے، اسکا کرم ہے، اس کی جزا ہے۔

ایک ایسی چیز جو من وسلویٰ نہیں ہے مگر روح کی بھوک مٹا دیتی ہے۔

ایک ایسی چیز جو پیغمبر نہیں ہے مگر پیغمبروں کی سی کرامات دکھا سکتی ہے۔

ایک ایسی چیز جو علم نہیں ہے مگر پتھر کو ہیرے اور ہیرے کو پتھر میں بدل سکتی ہے۔

ایک ایسی چیز جو قرآن نہیں ہے مگر دل کے جزدان میں لپیٹ کر رکھی جاتی ہے۔

محبت۔۔۔ "کُن فَیَکُون" کی عملی تفسیر۔۔۔ اللہ کی دنیا والوں کے لئے ایک باصلاحیت نعمت۔۔۔ "محبت"۔۔۔ فقط "محبت"۔۔۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح اس کی زندگی کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ آنکھ تو کھل گئی تھی مگر ذہن پر ابھی بھی نیند کا غلبہ تھا۔ سوئے ہوئے اعصاب کو جگانے کے لئے اسے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ لمبے سفر کی تھکان اور پھر تاخیر سے سونے کے باعث اس کی نیند پوری نہیں ہو پائی تھی وہ مزید سونا چاہتی تھی۔ اس کے پورے وجود پر کسلمندی طاری تھی لیکن اعصاب خوابیدہ ہونے کے باوجود اسے احساس دلا رہے تھے کہ اسے بیدار ہو جانا چاہیے۔ گھر سے دوری کا احساس لاشعور میں کہیں دبکا بیٹھا تھا۔ ذہن منتشر سا تھا اس لئے بھی آنکھیں پوری طرح کھل نہیں پا رہی تھیں۔ آنکھوں کو پٹپٹا کر اس نے نیند کو بھگانے کی کوشش کی پھر گہری جماہی لیتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ اسے یکدم یاد آیا کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں ہے سو فوراً ہی اپنا آپ سمیٹتے ہوئے وہ کمبل میں سکڑ سی گئی تھی۔ عمر بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی یہ حرکت عمر کی نظروں سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ امائمہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی

"گڈ مارننگ۔۔۔ مزید سونے کی اجازت نہیں ہے میم!" وہ بڑے مگن سے انداز میں اس کی جانب بڑھا تھا۔ امائمہ جھجکتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی پھر ٹانگیں سمیٹ کر اس کے لئے جگہ بنائی تھی۔ اسے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنا اعتماد بحال نہیں کر پا رہی تھی۔

"میں تھوڑی دیر اور سو جاؤں۔۔۔ پلیز!" جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو یہی کہہ دیا۔ عمر بے ساختہ ہنس دیا۔

"یہ بات میری طرف دیکھ کر بھی تو کہی جا سکتی ہے۔" وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

امائمہ نے بدقت آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چند سیکنڈز ہی اس کی جانب دیکھ پائی تھی پھر اس نے اپنا سر ان آنکھوں کے سامنے سرنڈر کر دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ اب اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"عمر!۔۔۔ مجھے کنفیوژ مت کرو پلیز۔" اسے خود اپنی کیفیت پہ الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ گزشتہ تین سالوں سے عمر کے خواب دیکھ رہی تھی۔ دن بھر میں وہ ایک دوسرے کو لاتعداد ایس ایم ایس کرتے تھے، رات کو وہ اکثر انٹرنیٹ پر باتیں کرتے رہتے تھے اور ویک اینڈ پر عمر اس کو لمبی لمبی کالز کرتا تھا بلکہ جھگڑتا بھی تھا کہ وہ اس کی وجہ سے روپے جمع نہیں کر پاتا اور اس کی تنخواہ فون کالز میں ہی ختم ہو جاتی ہے اور اب نجانے کیا جادو ہوا تھا کہ منہ سے لفظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

"میں تمہیں کنفیوژ نہیں کر رہا یار۔۔۔ میں تو ایک اچھا سا گانا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میں تمہیں دیکھ کر گا سکوں۔۔۔ تم بہت خوبصورت ہو امائمہ اور اللہ کا شکر ہے کہ میری ہو۔۔۔ مجھے شروع سے یقین تھا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔"

یہ امائمہ کے لئے نیا کمپلیمنٹ نہیں تھا بلکہ وہ اکثر کھلے دل سے اس کی تعریف کرتا تھا اور خود کو خوش قسمت قرار دیتا تھا لیکن اس طرح اس کے منہ سے اسی کے سامنے بیٹھ کر یہ سب سننا امائمہ کو ایک نئی خوشی، ایک نئے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ عمر اگر خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا تو امائمہ اس لمحے خود کو خوش قسمت ترین سمجھ رہی تھی۔ وہ عمر کو چاہنے کے باوجود بھی نہیں بتا پائی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس کی محبت پا کر کتنا معتبر محسوس کرتی ہے یا یہ کہ اگر وہ عمر کو خوبصورت لگتی ہے تو عمر بھی اس کے لئے خوبصورت ترین مرد تھا۔

"اے۔۔۔ واقعی سو تو نہیں گئی ہو؟" اس کی خاموشی سے عمر یہی سمجھا تھا۔ وہ منہ اٹھا کر ایک بار پھر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ مزید سونے کی اجازت نہیں ہے۔" وہ منہ بسور کر بولی تھی۔

"تم سونا چاہتی ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ امائمہ نے جھٹ اثبات میں گردن ہلائی۔

"اونہہ۔۔۔ بدذوق۔۔۔ میں نے سوچا تم کہو گی۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ امائمہ بات مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہی جب وہ کچھ نا بولا تو پوچھنے لگی۔

"کیا؟" عمر اس کی بات پر مسکرایا پھر بولا۔

"اب ہر بات بچوں کو بتانے والی بھی نہیں ہوتی۔" اسکا انداز اتنا ذومعنی تھا کہ امائمہ سے دوبارہ اس کی جانب دیکھا ہی نہیں گیا۔

"اب دوبارہ سو مت جانا۔۔۔ فریش ہو جاؤ میں تمہارے لئے چائے لاتا ہوں۔۔۔ چلو چلو اٹھو ہری اپ۔۔۔ سب ناشتے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔"

وہ امامہ کو ریلیکس کرنا چاہتا تھا سو تاکید کرتا کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ خالی پیٹ چائے پینے کی عادی نہیں ہے لیکن عمر نے اتنی محبت سے کہا تھا کہ وہ زہر بھی پی سکتی تھی۔ عمر کے جاتے ہی وہ بستر سے نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہم ممی لوگوں کے ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں عمر!" امامہ نے ایک بار پھر بیچارگی سے کہا تھا۔ اسے یہ گھر بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ یہ گھر تھا بھی نہیں بلکہ ایک ڈربہ نما سی چیز تھی جسے دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ لندن میں لوگ بہت چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ گھر اتنے چھوٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ ایلفرڈ میں ان کا یہ ڈربہ دراصل ایک بڑے گھر کی انیکسی ٹائپ چیز لگتی تھی۔ یہ تو پہلے ہی طے شدہ تھا کہ وہ لوگ الگ رہیں گے۔ امامہ کے پاکستان سے آنے سے پہلے عمر اس گھر کو فرنشڈ کر چکا تھا بلکہ اس نے بہت سی چیزیں امامہ سے پوچھ پوچھ کر خریدی تھیں تب امامہ بھی بہت پرجوش ہوتی تھی لیکن اب جب لندن آمد کے ایک ہفتے بعد وہ باقاعدہ اس گھر شفٹ ہوئے تھے تو امامہ کا مزاج کافی خراب ہو گیا تھا۔ یہ ایک عجیب طرز کا گھر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی کچن تھا جس کا دروازہ لاؤنج میں کھلتا تھا۔ لاؤنج بہت کشادہ بھی نہیں تھا اور بہت تنگ بھی نہیں تھا۔ لاؤنج سے ہی ایک دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا۔ لاؤنج سے ہی سیڑھیاں اوپر کی جانب جاتی تھیں جو ایک چھوٹی راہداری پر ختم ہوتی تھیں جس کے سامنے والا کمرہ ان کا بیڈ روم بن گیا تھا۔ بیڈ روم میں باتھ روم تھا اور عمر نے اسے بتایا تھا کہ بعض لوگوں کے بیڈ روم کے ساتھ باتھ روم نہیں ہوتا اور انہیں کچن اور باتھ روم کے لئے ایک جگہ استعمال کرنا پڑتی ہے۔ اس کی بات سن کر امامہ نے شکر ادا نہیں کیا تھا بلکہ اسے عجیب ناگواری کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنا باتھ روم بھی کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔ چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ ایک طرف ٹوائلٹ تھا اور دوسری جانب واشنگ مشین رکھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہونے کے لئے بمشکل جگہ تھی۔ امامہ کے سامنے اس کے ساس سسر ظاہر کر چکے تھے کہ وہ چاہتے ہیں عمر اور امامہ ان کے ساتھ رہیں مگر عمر نہیں مانتا۔ پہلے امامہ بھی دل ہی دل میں راضی تھی مگر پھر یہ گھر دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ بہتر ہے کہ ان کے ساتھ رہ لیا جائے سو وہ چاہتی تھی عمر ان کی بات مان لے۔ وہ لوگ بھی نزدیک ہی رومفرڈ میں رہتے تھے۔ ان کا ذاتی گھر تھا۔ یہ گھر دو بیڈ کا تھا جہاں اسکے ساس سسر اور عمیر رہتے تھے۔ ممی نے امامہ سے کہا تھا کہ اگر وہ عمر کو رضامند کر پائے تو بخوشی اس گھر میں ان کے ساتھ رہ سکتی ہے لیکن عمر راضی نہیں تھا۔

وہ امامہ کو صاف کہہ چکا تھا کہ وہ الگ ہی رہے گا سو وہ آج ہی یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ عمر نے اس کی آمد سے بھی پہلے ممی کے ساتھ مل کر گھر سیٹ کیا ہوا تھا۔ ضرورت و سہولت کی ہر چیز اس نے پہلے ہی خرید کر رکھی ہوئی تھی لیکن کوئی بھی چیز امامہ کے دل کا ملال کم نہیں کر رہی تھی۔

"ہم ابو کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے عمر؟" سوال گھوم پھر کر ایک ہی نقطے پر مرکوز تھا۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں فلور کشنز پر بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں فرنیچر کے نام پر ایک ٹی وی ٹرالی تھی اور ایک طرف دیوار میں ریک نصب تھا جبکہ ایک کونے میں کارنر ٹیبل بھی دھرا تھا۔ کارپٹ کے اوپر عین درمیان میں بڑا خوبصورت سا پینٹ کیا گیا تھا۔ فلور کشنز کے کورز اس کے رنگ کے مناسبت سے خریدے گئے تھے۔ کمرے میں تمام آرائشی چیزیں بہت خوبصورت اور اچھے ذوق کو ظاہر کرتی تھیں۔ کشنز سے لے کر پردوں تک جو اس کمرے میں موجود کھڑکی نما چیز پر لٹکایا گیا تھا کوئی بھی چیز رنگ، سائز یا خوبصورتی کے لحاظ سے بدذوقی کو ظاہر نہیں کرتی تھی لیکن کشادگی کا یہ عالم تھا کہ دو لوگ بھی وہاں زیادہ لگتے تھے امامہ نے پاکستان میں

بڑے بڑے گھر ہی دیکھے تھے۔ انکا اپنا گھر بھی کافی بڑے رقبے پر پھیلا تھا اور انتہائی خوبصورت بنگلوں میں شمار ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ یہ گھر اس کی ناک کے نیچے نہیں سما رہا تھا۔

"میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں"

اس نے کان میں انگلی گھما کر اسے کھجایا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل نہا کر نکلا تھا اور اب لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا کل سے اسکا آفس شروع ہو رہا تھا۔ امائمہ کی وجہ سے اس نے ایک ہفتہ کی چھٹیاں لی تھیں۔

"تم انکو اتنا ناپسند کیوں کرتے ہو۔۔۔آج بتا ہی دو مجھے"

"کم آن امی۔۔۔ناپسند کیوں کروں گا۔۔۔بس میری بنتی نہیں ہے ان کے ساتھ" وہ لیپ ٹاپ کا پاور بٹن دبا رہا تھا۔

امائمہ نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ جانچنا چاہتی تھی مگر کیا۔۔۔؟

"لیکن کیوں۔۔۔کوئی خاص وجہ۔۔۔؟" اس کے لہجے میں عجیب سے شکوک تھے عمر نے حیران ہو کر اسکا چہرہ دیکھا۔

"اتنی نفرت کیوں کرتے ہو اپنے ابو سے؟" اسکے لہجے میں اب کی بار صرف شک نہیں تھا، بیچارگی بھی تھی۔

"او میڈم! جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔ نفرت کیوں کرونگا ان سے۔۔۔میرے ابو ہیں وہ"

"ان کے ساتھ ایک گھر میں رہنے میں کیا مسئلہ ہے پھر تمہیں" وہ ابھی بھی وہیں اٹکی تھی۔ عمر نے گہری سانس بھری۔

"ہم ان کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں۔ یہاں سب اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ پیرنٹس کب تک بچوں کو اپنے ساتھ رکھیں" عمر نے بہت نرم لہجے میں کہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ کی لڈ پھر بند کر دی تھی اور امائمہ کی جانب رخ کر لیا تھا۔

"ہم برٹش نہیں ہیں عمر۔۔۔ہمارے یہاں بچے مرتے دم تک پیرنٹس کے ساتھ ہی رہتے ہیں" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ عمر نے سارے لاؤنج کا جائزہ لیا۔

"تمہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگا نا؟" اس کے لہجے سے تاسف جھلکنے لگا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے عمر۔۔۔سب کچھ بہت اچھا ہے مگر سب کچھ بہت چھوٹا چھوٹا ہے۔ کچن میں بمشکل دو لوگ اکٹھے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ باتھ روم میں ایک بندہ بھی ٹھیک سے کھڑا ہو لے تو یہی بڑی بات ہے اور وہ جو واشنگ مشین ہے اس میں تو دو جینز ڈالو تو تیسرا کپڑا ڈالنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ ہر چیز دیکھ کر گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔۔۔اسی لئے میں کہہ رہی تھی کہ ہم ابو کے ساتھ رہ لیتے ہیں۔ انکا گھر کشادہ تو ہے" وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے بہت آس سے پوچھ رہی تھی۔ عمر نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

"ان کے ساتھ رہنے کا خیال دل سے نکال دو۔۔۔ہمیں یہیں رہنا ہے۔۔۔تمہیں اگر یہ گھر پسند نہیں آیا تو میں کوئی اور جگہ تلاش کرلوں گا مگر وہ بھی ہوگا ایسا ہی۔۔۔مطلب چھوٹا اور تنگ۔۔۔پاکستان جیسا گھر تو یہاں میں بڑھاپے میں بھی افورڈ نہیں کر سکونگا"

"ابو کہہ رہے تھے اگر ہم ان کے ساتھ رہیں تو پیسے بچ سکتے ہیں" اس کا موقف نہیں بدلا تھا۔

"وہ مجھے بھی یہی کہہ رہے تھے۔ وہ مجھے مسائل سے بچانا چاہ رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کے ساتھ رہوں مگر یہ بھی تو سوچو کہ ان کے ساتھ رہنے پر وہ کتنے پرابلمز میں آ جائیں گے۔ ان کے پاس بھی تو دو بیڈ روم کا گھر ہے۔ ایک ان کے استعمال میں ہے ایک میں اور عمیر شیئر کرتے تھے اب یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ میں عمیر کو کہوں کہ وہ سٹنگ روم میں شفٹ کر جائے اور اپنا بیڈ روم ہمیں دے دے۔ یہ پلان ممی نے دیا تھا جسے میں نے قبول نہیں کیا۔ ابو کہتے ہیں وہ ڈرائینگ روم ہمیں دے دیتے ہیں۔۔۔ اوکے ہم ڈرائینگ روم لے لیتے ہیں تو وہ گیسٹ جو ہمارے گھر آتے ہیں اُن کو کہاں بٹھائیں گے۔۔۔ لاؤنج میں۔۔۔؟ چلو اوکے۔ ان کو سٹنگ روم میں بٹھا لیا تو جو صبا ہر سال گرمیوں میں یہاں آتی ہے اس کا کیا کریں گے۔ اب تو ماشاءاللہ اس کا بے بی بھی ہے ان کو بھی کم از کم ایک روم تو دینا ہوگا نا۔۔۔ مجھے تو یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ ہماری وجہ سے ممی کو پرابلم ہو۔"

وہ بہت ملائمت سے اس پر اپنا برطانوی موقف واضح کر رہا تھا۔ امائمہ نے صرف گردن کو ہلایا۔ اس نے اس نہج پر واقعی نہیں سوچا تھا۔ عمر کو اس کا بجھا بجھا انداز دیکھ کر دکھ ہوا۔

"میری جان! اتنا پریشان مت ہو۔ میرا یقین کرو سب کچھ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا ابتداء میں تھوڑی مشکل ہوگی مگر پھر آہستہ آہستہ تم عادی ہو جاؤ گی۔ ابھی مجھے اپنی گاڑی لینی ہے۔ میرے پاس گاڑی بھی نہیں ہے۔۔ میری جاب اور سیلری بہت اچھی ہے مگر تم مہنگائی بھی تو دیکھو کس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سہولتیں پانے کے لئے بڑی بڑی سہولتوں کو اگنور کرنا پڑ رہا ہے۔" وہ خود بھی بجھے بجھے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ امائمہ کو افسوس سا ہوا۔

"مجھے پتا ہے ممی کو بھی اچھا نہیں لگا کہ ہم ان کی بات مان کر ان کے ساتھ نہیں رہ رہے مگر وہ خود بھی جانتی ہیں کہ صورتحال کتنی خوفناک ہو چکی ہے۔ میں اب بچہ تو نہیں ہوں کہ سارا بوجھ ان پر ڈالے رکھوں۔ میرے پیرنٹس نے بہت محنت کی ہے تب یہ مقام حاصل کر پائے ہیں۔ جب ہم چھوٹے چھوٹے سے تھے تب سے انہیں ایسے ہی کام کرتے دیکھ رہے ہیں۔ پاپا یعنی میرے دادا نے بہت چاہا کہ ڈیڈی پاکستان آ کر رہیں وہاں ان کا اچھا خاصا بزنس تھا مگر ڈیڈی کہتے تھے کہ وہاں میری تعلیم کی قدر نہیں سو میں یہاں ہی رہوں گا۔ ممی نے بہت عرصہ جاب کی۔ اپنی خواہشوں کو مارا اور ضرورتوں کو اگنور کیا تب کہیں جا کر زندگی کی یہ شکل بنی ہے۔ اب عمیر رہ گیا ہے۔ وہ کسی اچھے انسٹی ٹیوٹ سے ڈگری کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک ہی جنون ہے۔ اسے انجینئرنگ کرنی ہے۔ اس کی اسٹڈیز بہت مہنگی ہیں۔ وہ ہم تینوں بہن بھائی میں سب سے زیادہ ذہین ہے۔ ابو کی بچت اس پر خرچ ہوں تو زیادہ اچھا ہے نا۔۔۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ امائمہ نے اس کے ایک ایک لفظ کو بغور سنا تھا اور اُسے اس کی ساری باتیں سن کر احساس ہوا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ لاابالی سا لڑکا جو تین سال پہلے اسے ملا تھا کتنا سمجھدار ہو چکا تھا۔ اسے زندگی کو طریقے سے گزارنے کا سلیقہ آ چکا تھا امائمہ نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھا پھر اپنا سر وہیں ٹکا دیا۔

"پریشان ہو گئی ہو نا؟" وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ امائمہ نے سر اس کے گھٹنے سے اٹھایا تھا۔ اس کے پاس ایک آئیڈیا تھا۔

"عمر! میں بھی تو جاب کر سکتی ہوں نا؟"

"جی نہیں۔۔۔ شکریہ۔۔۔ مجھے پتا ہے تم کر سکتی ہو مگر مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ میں نے ساری زندگی ممی کو جاب کرتے دیکھا ہے۔ میں اسکول سے آتا تھا تو کبھی گھر میں ممی نظر نہیں آتی تھیں۔ میں، عمیر اور صبا کے لئے کھانا گرم کرتا تھا، انہیں کھلاتا تھا، انکا خیال رکھتا تھا۔ تم کیا چاہتی ہو کہ جب میں آفس سے آؤں تب بھی یہی صورتحال ہو۔"

وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ امائمہ کو یہ بات وہ پہلے بھی بتا چکا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کہ امائمہ جاب کرے اور یہ بات پہلے ہی بحث کی گنجائش سے نکل چکی تھی۔

"اب پلیز اس ٹاپک پر اتنا مت سوچو۔۔۔ صورتحال اتنی خوفناک نہیں ہے جتنی تم نے تصور کر لی ہے۔ سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ پہلے اسے ڈراتا تھا پھر تسلی دینے لگتا تھا۔ امائمہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔ عمر نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ وہ ملائمت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ پریشان ہو گئی ہے۔

"ہاں۔۔۔ انشاء اللہ۔۔۔ آئی ایم ساری عمر۔۔۔ میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔" محبت کرنے والوں کی یہی مجبوری ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔

"سوری تو مجھے بولنا چاہیے۔۔۔ تم کیوں ایکسکیوز کر رہی ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تم بھی ایکسکیوز مت کرو۔۔۔ میں بلاوجہ تکرار کر رہی تھی۔۔۔ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"اچھا۔۔۔" عمر بھی مسکرایا پھر اس کی دائیں آنکھ کے کنارے کو نرمی سے چھو کر بولا۔

"آؤ ان کو بند کرنے کا انتظام کروں۔"

☆ ☆ ☆

اس نے بہت جلد خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا نا صرف ڈھال لیا تھا بلکہ وہ بہت جلد ہر چیز کو خوشدلی سے قبول کرنے میں لگ گئی تھی۔ بہت ساری باتیں تھیں جو عمر نے اسے نہیں بتائی تھیں لیکن وہ خود ہی سمجھ گئی تھی اور جب سمجھ گئی تھی تو اس کی شکایات خود بخود دور ہونے لگی تھیں۔

اسے بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا گھر بے شک بہت چھوٹا سا تھا لیکن وہ ایک اچھے علاقے میں رہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ رہنے والوں کے دل اتنے کشادہ تھے کہ گھر کی تنگی محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔

عمر اسے بے پناہ چاہتا تھا تو ساس سسر بھی اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ ویک اینڈز وہ زیادہ تر انہی کے یہاں گزارتے تھے۔ ویسے بھی دونوں گھروں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا امائمہ وہاں اکیلی بھی آجایا کرتی تھی۔ عمیر بھی اسے بڑی بہنوں کی طرح ٹریٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا ویسے بھی وہ بڑا پڑھاکو سا لڑکا تھا۔ کتابوں سے نکلتا تو انٹرنیٹ پر پروجیکٹ اور تھیسز وغیرہ میں مگن رہتا مگر فرصت ملنے پر وہ اس کے پاس بیٹھتا تھا اور اپنے برٹش لہجے میں اس سے پنجابی میں باتیں کرتا تھا۔ امائمہ ان سب کا رویہ دیکھتی تو امی کی بصیرت اور جہاں دیدہ نظر کو داد دیتی نہ تھکتی۔ اسے امی کے فیصلے پر بجا طور پر فخر محسوس ہوتا تھا۔

"ایک وقت آئے گا امائمہ کہ تم خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھا کرو گی۔"

جب عمر اس سے رنگ واپس لے گیا تھا تو امی نے اس کی وکالت میں کہا تھا امی ہمیشہ اسے مطمئن کرنے کی خاطر دلیلیں اکٹھی کرتی رہتی تھیں جب تک اسکا دل عمر کی جانب مائل نہیں ہو گیا تھا وہ اسکی ڈھیروں باتیں کرتی رہا کرتی تھیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موضوع تلاش کرتیں کہ جن میں خود بخود عمر یا اسکے گھر والوں کا ذکر آجاتا اور پھر وہ اکثر اسے باور کرواتی تھیں کہ وہ بہت خوش قسمت ہے اور اب وہ واقعی ان کے اس دعوے پر ایمان لے آئی تھی۔ عمر کی محبت ہی قابل قدر نہیں تھی بلکہ وہ اس کی عادتوں کی بھی گرویدہ ہو گئی تھی۔

وہ اسے ناشتے کھانے کے لئے کبھی جگا کر نہیں کہتا تھا۔ وہ اگر سو رہی ہوتی تو وہ اپنا ناشتہ خود بنا لیتا تھا کھانا بھی مائیکرو ویو اوون میں گرم کر لیتا تھا بلکہ بعض اوقات وہ امائمہ کے لئے بھی یہ سب کام کر دیتا تھا۔ امائمہ اس کے ذاتی کام کر دیا کرتی تھی کبھی اس کے کپڑے آئرن کر دیتی یا الماری ٹھیک کر دیتی تھی لیکن وہ اس چیز کے لئے امائمہ کا اتنا شکر گزار ہوتا کہ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی رہتی۔ اسے گیلا تولیہ بستر پر پھینکنے کی عادت تھی نہ ہی وہ میلے کپڑے ادھر اُدھر پھیلاتا تھا۔ اپنی ڈی وی ڈی، اخبار، آفس کی فائلز ہر چیز سمیٹ کر رکھا کرتا تھا لیکن ویک اینڈز پر وہ ایک بالکل مختلف عمر کے روپ میں نظر آتا۔ وہ ہر کام میں امائمہ کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ گروسری کے لئے اکٹھے جاتے تھے۔ گھر کی کوئی مرمت کرنی ہوتی یا بیک یارڈ میں لگی گھاس کی جھاڑ جھنکار کرنی ہوتی وہ فٹافٹ سب کام کر لیا کرتا تھا۔ می ڈیڈی کی طرف جا کر بھی اس کی یہی روٹین رہتی۔ وہ ابتداء میں بہت حیران ہوتی تھی اور اسی حیرانی کا اظہار اس نے عمر کے سامنے بھی کر دیا تھا۔

"اس میں ایسی کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ تم اتنی حیرانی کا اظہار کرو۔ میں بالکل اپنے ابو کے جیسا ہوں۔ وہ بھی میری می کے ساتھ ہمیشہ اتنے ہی لونگ اور کیئرنگ رہے ہیں۔ ایسی باتوں پر جھجکتے نہیں ہیں ہم، ہمارے نبی بھی تو اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے میں کیا کرتا ہوں بس یہی تو کرتا ہوں۔ اپنا کام ہی تو اپنے ہاتھوں سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

عمر نے امائمہ کے استفسار پر عام سے لہجے میں کہا تھا اور اس نے سچ کہا تھا واقعی ابو بھی ایسے ہی تھے۔ وہ اپنا کھانا ختم کر کے نا صرف پلیٹ کچن میں رکھ کر آتے تھے بلکہ اپنے حصے کے برتن بھی دھوتے تھے۔ اسی طرح ویک اینڈز کی چائے عمیر کے ذمے تھی جسے وہ بخوشی بنایا کرتا تھا۔ ان کے دیکھا دیکھی امائمہ نے بھی می کے ساتھ کچن کی ذمہ داریاں بانٹ لی تھیں۔ وہ سلاد کے لئے سبزیاں چوپ کر دیتی تھی۔ سینڈوچز کی فلنگ کر دیتی تھی۔ اوون میں بیک ہوتے کھانوں کو چیک کر لیا کرتی تھی۔ کچن کے تمام شیلف اور کیبنٹس کی تفصیلی صفائی وہ ہر ویک اینڈ پر کیا کرتی تھی۔ می کی کمر میں درد رہتا تھا سو وہ ان کے گھر آتے ہی ویکیوم اور جھاڑن لے کر صفائی میں جت جاتی۔ قرینہ اور سلیقہ تو ان سب میں تھا مگر پھر بھی امائمہ صفائی ستھرائی کے دوران اپنی مہارت دکھا دیتی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی ساس بے حد سگھڑ ہیں سو وہ ان سے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ امی کی سخت ٹریننگ میں گزشتہ تین سالوں میں کوفتوں سے لے کر بریانی اور رس ملائی سے لے کر کھیر تک ہر چیز بنانا جان گئی تھی لیکن وہ لوگ ایسا کھانا کم کھاتے تھے۔ پاستا نوڈلز، اسٹیم چکن، پزا یا پھر بہت سادہ سینڈوچز یا پھر ڈارک براؤن چاکلیٹ کیک کو ونیلا کسٹرڈ کے ساتھ سجا کر کھانا انہیں بریانی، پلاؤ سے کہیں زیادہ مرغوب تھا سو امائمہ کو کچن میں بھی زیادہ وقت نہیں دینا پڑتا تھا۔ غرضیکہ امائمہ کی زندگی ایسی تھی کہ لڑکیاں جس کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ خوشیوں کے جھولے جھولتے کیسے چھ ماہ گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے ناشتہ کیا یا نہیں۔۔۔اُف اوہ۔۔۔کب سے اٹھے ہو تم۔۔۔اتنا سست بنا رکھا ہے تمہاری گرینی نے تمہیں۔۔۔کافی نہیں بنا سکتے تھے اپنے لئے۔"

میری ممی انکتائے ہوئے انداز میں تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھیں۔کچن کی حالت عجیب ابتری تھی ویسے سارا گھر ہی دہلیز پار کرتے ہی بے ترتیبی کا رونا روتا ہوا محسوس ہوتا تھا مگر کچن کچھ زیادہ ہی بکھرا ہوا تھا۔فریج اور کیبنٹس خالی جبکہ شیلف اور درمیانی کاؤنٹر بھرے ہوئے تھے۔گرینی کہتی تھیں کہ ممی بدسلیقہ عورت ہیں اور یہ بات ممی کے انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔وہ سفید باتھ گاؤن میں ملبوس تھیں۔ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے جو کاؤنٹر پر دھرے برتنوں میں گر رہے تھے۔مگر انہیں پرواہ نہیں تھی۔اتنا چہرہ کل کی نسبت کچھ پھیکا مگر خوبصورت دکھتا تھا۔

مجھے ان کے کچن کو دیکھ کر اپنے ویک فیلڈ والے فارم ہاؤس کا کچن یاد آیا اور ممی کو دیکھ کر گرینی کی یاد آئی۔ممی کو گرینی والی نفاست چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔میرا دل ان کی یاد سے بوجھل ہونے لگا۔میں ممی کے اس گھر میں ایک رات گزار چکا تھا اور یہ رات بہت بھاری تھی۔میرے پاس اس خوفناک رات کو بیان کرنے کے لئے الفاظ بھی نہیں ہیں۔میں رات بھر روتا رہا تھا۔اتنا اکیلا پن زندگی میں پہلے کبھی نہیں سہا تھا میں نے۔

اکلاپا واقعی بڑا اسیاپا ہوتا ہے۔یہ انسان کی ذات کو راس نہیں آتا۔تنہائی کا خوف موت کے خوف سے بڑا ہوتا ہے۔ایک رات کی تنہائی نے میرے کس بل نکال دیے۔

"اس رات نے مجھ پر تنہا ہونے کے نئے معنی واضح کیے تھے۔"تنہا" ہونا یہ نہیں ہوتا کہ آپ کے پاس کوئی نہیں ہے۔تنہا ہونا دراصل یہ ہوتا ہے کہ سب آپ کے پاس ہیں لیکن آپ کا کوئی نہیں ہے۔مجھے رات بھر یہ احساس رہا کہ جیسے میں ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہوں اور سمندر عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میرے سب دوست احباب ایک بڑے "بحری جہاز" میں مجھے دیکھتے ہوئے،مجھ پر ہنستے ہوئے میرے پاس سے گزر گئے ہیں۔یہ تھا میرا "اکیلا پن"۔

"کافی بنانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔شوگر،کریم،دودھ ملاؤ۔۔۔کافی تیار ہے۔۔۔اتنا سا کام تو تم خود کر لیتے۔۔۔میرے انتظار میں بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔آئندہ ایسا مت کرنا۔"

انہوں نے میرے آگے ٹرے رکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔میں کاؤنٹر کے گرد ایک اونچے سے غیر آرام دہ اسٹول پر بیٹھا تھا۔کچن میں ایک طرف دو کرسیاں اور میز بھی پڑی تھیں لیکن ممی نے مجھے وہاں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔میں نے وہیں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کر کے ٹرے اپنے مزید آگے کر لیا۔اس میں کافی کا ایک مگ اور کیک کے چند ٹکڑے تھے۔میں نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔کیا انہیں اتنا بھی احساس نہیں تھا کہ میں کتنا بھوکا تھا۔میں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔سفر میں بھی مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا تھا اور گھر آ کر بھی ممی نے مجھے پوچھا ہی نہیں تھا کہ مجھے کھانے کو کچھ چاہیے یا نہیں۔اب مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی اور وہ مجھے کھانے کو کیا دے رہی تھیں۔میری تو آنکھیں بھی بھوک سے خشک ہو گئی تھیں۔

"آپ نہیں آئیں گی؟" میں نے عادت کے مطابق پوچھا تھا کیونکہ مجھے اور گرینی کو اکٹھے ناشتہ کرنے کی عادت تھی۔انہوں نے پہلے اپنی پرکشش گہری آنکھیں پھیلا کر دیکھا تھا پھر ناگواری ان کے چہرے پر پھیل گئی۔

"سارے زمانے کے لئے ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔اس سے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور دنیا میں صرف زندہ رہنا اہم نہیں ہوتا، کامیابی سے زندہ رہنا اہم ہوتا ہے۔"

انہوں نے لفظ کامیابی پر زور دیا پھر اپنا بایاں ہاتھ اوپر کر کے مجھے دکھایا۔اس میں کافی کا مگ تھا۔وہ مجھے جتا رہی تھیں کہ وہ اپنے لئے کافی لے چکی ہیں۔

"ایک بات یاد رکھنا۔۔کامیابی تب ملتی ہے جب انسان سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچے۔۔۔میں اپنے پیٹ کا خیال تم سے بہتر رکھ سکتی ہوں اس لئے جو کام تم بہتر طریقے سے کر ہی نہیں سکتے اس کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

انہوں نے اپنی بات پوری کر کے کافی کا سپ بھرا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔میں نے تذبذب کے عالم میں اپنا کپ اٹھایا اور دائیں ہاتھ میں کیک کا پیس لے کر کھانا شروع کیا۔وہ کیک سخت باسی اور بدمزہ سا تھا۔

مجھے ویک فیلڈ کے اصول ترک کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔وہاں بھی میں ناشتے کی میز پر اکیلا نہیں بیٹھا تھا۔گرینی اس بات پر اصرار کرتی تھیں کہ کھانے کی میز پر گھر میں جتنے افراد بھی ہوں، موجود ہوں۔ان کے پڑھائے ہوئے سبق یہاں فرسودہ اور غیر ضروری محسوس ہونے لگے تھے۔ممی کے گھر کے اور ان کے اپنے سب اصول گرینی سے مختلف تھے۔گھر پہنچ کر انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ جب تک میرے لئے کچھ بندوبست نہیں ہو جاتا میں یہ کمرہ استعمال کر سکتا ہوں۔اس کے بعد میں اس کمرے میں ہی رہا تھا اور اب صبح کو باہر آیا تھا۔وہ دو بیڈ کا گھر لگتا تھا۔یہاں گندگی اور بے ترتیبی بہت زیادہ تھی جو پہلی نظر میں ہی محسوس ہو جاتی تھی۔کیک کے سوکھے سلائس اپنے اندر منتقل کرتے ہوئے میں ادھر اُدھر بھی نظر ڈال رہا تھا۔یہ کوئی غیر ارادی فعل نہیں تھا۔میں دراصل کھاتے ہوئے اس کیک کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ ایسا کرنے پر شاید میں انہیں کھا نہیں پاتا۔میرے سامنے ممی نے جو کیک رکھا تھا اگر گرینی نے مجھے دیا ہوتا تو میں منہ بھی نہ لگاتا لیکن ثابت ہوا کہ بھوک بے شرم ہوتی ہے اس کی کوئی انا نہیں ہوتی۔میں خاموشی سے اپنا ناشتہ ختم کرتا رہا۔ایک، دو، تین سب سلائس ختم ہو گئے تھے اور بھوک ابھی باقی تھی۔مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ممی سے مزید کچھ کھانے کے لئے مانگ سکتا۔میں نے کیک کے بعد کافی ختم کی اور ٹرے کو سنک میں رکھ دیا۔میں نے ٹشوز تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ میں کاؤنٹر کو بھی صاف کر دوں مگر وہ وہاں موجود نہیں تھے یا شاید مجھے نظر نہیں آئے۔میں نے کاؤنٹر پہ گرا ناداید، کچرہ ہاتھ سے صاف کیا اور اسے بھی کچن سنک میں بہا دیا کیونکہ مجھے وہاں ڈسٹ بن بھی نظر نہیں آیا تھا۔میں واپس ابھی اسی جگہ بیٹھا ہی تھا کہ ممی دوبارہ نازل ہوئیں۔

"تم ابھی تک یہی بیٹھے ہو۔۔۔اتنی سستی اچھی نہیں ہوتی۔۔۔تمہاری عمر کے بچے تو بہت پھرتیلے ہوتے ہیں۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور توانائی بھی۔۔۔وہ ادھر ویکیوم مشین پڑی ہے۔۔۔تم یہاں ہال میں اور اپنے روم میں صفائی ستھرائی کر لو۔۔۔اپنی چیزوں کو ترتیب دے لو۔"

انہوں نے مجھے دیکھا، ٹوکا، اگلا حکم دیا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ایک سانس، دو نظریں، چند سیکنڈز اور اتنے لفظ۔۔۔وہ تو بہت پھرتیلی عورت تھیں۔میں اٹھ کر اس سمت کے کیبن کو کھولنے لگا جہاں ممی نے اشارہ کیا تھا۔چند لمحوں بعد میں اس جگہ پر ویکیوم چلا رہا تھا جہاں ممی

کچھ بھی تھیں۔ یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا میں اسے اچھے طریقے سے کر پا رہا تھا ممی کی چبھتی ہوئی باتیں سننا صفائی ستھرائی کرنے سے زیادہ مشکل تھا۔ یہ کام نپٹا کر میں نے ویکیوم مشین کو واپس اس کے کیبن میں رکھ کر دہری کر رہی تھی کہ ممی کی آمد ہوئی۔

وہ اب نک سک سے تیار تھیں۔ نیوی بلیو، پولکا ڈاٹس والی فراک کے ساتھ بلیک ہائی ہیل شوز پہنے ممی ایک گلیمرس، چونکا دینے والی شخصیت کی حامل خاتون لگ رہی تھیں۔ ان کے بال کھلے اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سراہے والے انداز میں مسکرائیں۔ مجھے ذرا حوصلہ ہوا تھا۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو" انہوں نے میری تعریف کی تھی۔ اسی دوران میں نے ممی والے کمرے میں سے کسی کو باہر کی سمت آتے دیکھا۔ وہ سیاہ بالوں اور براؤن رنگت والا او نچے قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس نے ملجگا سا لباس پہن رکھا تھا جس پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ اس شخص کی چال متوازن تھیں۔ میری نظروں کو اس جانب پا کر ممی نے بھی اُدھر دیکھا تھا۔

"تم اٹھ گئے روڈی۔" وہ مسکرائیں تھیں۔

"یہ روڈی ہے۔۔۔" انہوں نے اس شخص کا تعارف کروایا پھر اس کی جانب دیکھ کر بولیں۔

"روڈی۔۔۔ یہ مل ہے۔۔۔ میرا کزن۔۔۔ اس کے ممی ڈیڈی مر چکے ہیں۔۔۔ اب میرے ساتھ رہے گا۔"

"کزن۔۔۔؟؟؟؟" میری آنکھیں پھیل گئی تھیں میں نے چونک کر ممی کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ڈنگ ڈونگ۔" ڈور بیل کی آواز بھی بدصورت، بوڑھی جادوگرنی کی کریہہ قہقہے کی صورت میرے کانوں میں پڑی تھی۔ میں ہال کے لیدر کاؤچ پہ منہ پہ کشن دھرے لیٹا تھا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی تھی اسی لئے میں بیل کی آواز پہ ہڑبڑا سا گیا۔

ایک لمحے کے لئے میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ کیا ہوا ہے کیونکہ میں نے ابھی تک اس گھر میں رہتے ہوئے ڈور بیل کی آواز سنی تھی نہ ہی کبھی کسی کے لئے دروازہ کھولا تھا۔ اس گھر میں کوہو اور اس کے پارٹنر کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا جبکہ ان دونوں کے پاس ڈپلی کیٹ چابی ہر وقت موجود ہوتی تھی۔ سو وہ بیل نہیں بجاتے تھے۔ میں یہ سب سوچتا ہوا دروازہ کھولنے کے لئے آیا تھا۔

"کون ہو تم۔۔۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔ پیچھے ہٹو۔۔۔ اندر تو آنے دو مجھے۔" وہ جو کوئی بھی تھیں، اخلاقیات سے بالکل عاری تھیں۔ انہوں نے پہلے جھٹکے میں مجھے اور دوسرے جھٹکے میں دروازے کو ہٹا کر قدم اندر رکھا تھا۔ اوائل اکتوبر کے دن تھے۔ دروازے کی جھری سے روشنی کی چھریری لکیریں بن بلائے اندر آ رہی تھیں اور میرے پاؤں سے بغل گیر ہونے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ان خاتون سے زیادہ مجھے وہ لکیر بھلی لگی تھی۔

"میں نے پوچھا کون ہو تم۔۔۔ اب بتاؤ گے یا یونہی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے رہو گے۔"

وہ چلا کر پوچھ رہی تھیں۔ ان کا حلیہ بھی بڑا اچھنبا چلا تا سا تھا۔ گہرا میک اپ، بھڑکیلا لباس اور غراتا ہوا لہجہ۔۔۔ وہ اتنا چیخ کر بول رہی تھیں کہ ان کے بولنے سے ان کے بھورے گھنگریالے بال بھی مرتعش ہوتے لگ رہے تھے۔ ان کا چہرہ خوبصورت، مگر کرخت تھا اور ان کی آواز کرخت مگر خوبصورت تھی۔

"میں کوہو کا کزن ہوں۔" میں نے بے بسی سے چور لہجے میں کہا۔ اتنے دن ہو گئے تھے مجھے یہاں رہتے ہوئے اور یہ پہلا موقع تھا جب میں کسی کو اپنے منہ سے اپنے اور ممی کے رشتے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ممی نے مجھے اپنے حلقہ احباب میں اپنا کزن کہہ کر متعارف کروایا تھا بلکہ وہ پہلے دن سے اس بات پر غصہ کر رہی تھیں کہ میں انہیں "ممی" کیوں کہتا ہوں سو اب میں انہیں ان کے اسی نام سے بلاتا تھا جو ان کے دوستوں میں عام تھا۔ ہمارے درمیان زیادہ بے تکلفی نہیں تھی لیکن بڑوں کے ساتھ جو ایک احترام روا رکھا جاتا ہے ممی نے مجھے اس سے بھی آزاد کر دیا ہوا تھا۔ سو اب وہ میرے لئے صرف میری کزن تھیں۔۔۔ کوہو۔۔۔

"کیا۔۔۔ کوہو کے کون ہو تم؟" وہ ایک بار پھر غرائیں۔ میں جو ذرا پُر اعتماد ہونے کی کوشش کر رہا تھا ان کی آواز پر پھر لڑکھڑا گیا۔

"کزن۔۔۔ کزن ہوں۔۔۔ کوہو کا۔۔۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"اوہ شٹ اپ۔۔۔ مجھے یہ مت بتاؤ کہ تم میری بھانجی کے کزن ہو اور میں تم سے پہلی مرتبہ مل رہی ہوں۔"

وہ آگے بڑھ کر ہال کی جانب چلنے لگیں تھیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

"تم مجھ سے پوچھ رہے ہو مجھے کس سے ملنا ہے۔۔۔ اس گھر کی مالکن ہوں میں۔۔۔ سمجھے تم۔"

انہوں نے مڑ کر میری جانب انگلی کر کے کہا تھا۔ مجھے اس صورتحال سے بڑی کوفت سی ہوئی۔ میری بلا سے وہ جو بھی تھیں مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔

"جی۔۔۔ میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بڑا شکریہ۔" میں نے جذبات کو قابو میں رکھ کر کہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا بیگ سینٹرل میز پر رکھا تھا اور پھر سر سے لے کر پاؤں تک میرا طنزیہ نظروں سے جائزہ لیا تھا۔

"اب مجھے یقین آ گیا کہ تم کوہو کے کزن ہو سکتے ہو۔۔۔ وہ بھی تمہاری طرح بے حد بدلحاظ ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس بھروسے پر بھی آپ کا شکریہ ادا کر دینا چاہیئے۔"

"نہیں بچے۔۔۔ اپنا شکریہ بچا کر رکھو۔۔۔ ابھی بہت مواقع آئیں گے اسے ادا کرنے کے۔۔۔ میں اتنی جلدی نہیں جانے والی۔ یہاں سے۔۔۔"

انہوں نے بالکل میرے انداز میں میری بات کا جواب دیا اور پھر کاؤچ پر ڈھیر ہو کر اشارے سے میز پر پڑی کرسٹل باسکٹ پکڑوانے کا کہا۔ میں نے خاموشی سے وہ باسکٹ انہیں پکڑوا دی۔ اس میں میری من پسند بھنی ہوئی مونگ پھلیاں تھیں۔ انہوں نے اسے ٹونگنا شروع کر دیا۔ میں انہیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر اس کمرے میں آ گیا جسے میں اتنے دن سے بطور بیڈ روم استعمال کر رہا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے بہت دن ہو گئے تھے لیکن زندگی جیسے وہیں اس ٹرین کے ڈبے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ عین اسی مقام پر جب میری ممی کے ارادے آنکھے اس جملے کے ذریعے مجھ تک پہنچے تھے۔

"مجھے ٹرین کا سفر اس لئے پسند ہے کہ اس میں کوئی "یوٹرن" نہیں ہوتا۔۔۔ انسان کو یوٹرن لینے کے لئے خود ٹرن لینا پڑتا ہے۔ میری زندگی گزارنے کی فلاسفی بالکل ٹرین کے جیسی ہے۔ میں یوٹرن نہیں لے سکتی، لے ہی نہیں سکتی۔۔۔ ٹرین کی طرح۔"

انہوں نے جو بھی کہا تھا سچ کہا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنے کے لئے ایک یوٹرن نہیں لینا پڑا تھا بلکہ ہر گھنٹے بعد وہ مجھ سے اس کی توقع کرتی

تھیں۔ میں خود کو موڑتے موڑتے اتنا مڑ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے اپنی پچھلی زندگی ایک خواب لگتی تھی۔ چند مہینوں میں ہی اپنے گھر کے کئی بڑے چھوٹے کام اس نے میرے ذمے لگا دیے تھے۔ کچن کی صفائی ستھرائی، اپنا ناشتہ بنانا، ڈسٹنگ کرنا، لانڈری دیکھنا۔۔۔ میں سب کر لیتا تھا۔ کوہو نے مجھے کسی اسکول میں داخل نہیں کروایا تھا وہ مجھے اگلے سال کے لئے رجسٹر کروانا چاہتی تھی سو وہ خود جس اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر کے طور پر کام کر رہی تھی وہیں مجھے بھی لے جاتی تھیں۔ وہ جان کیس فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والا ایک کنڈرگارڈن تھا۔ تیرہ سال کے بچے کے لئے وہاں کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن کوہو کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کوہو نے میرے لئے اجازت لی تھی لیکن میری اجازت نہیں لی تھی۔ میں نا چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ جاتا تھا۔ میں ویک فیلڈ میں بہت اچھے اسکول میں جاتا تھا۔ میں پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور غیر نصابی سرگرمیوں میں آگے آگے رہتا تھا لیکن یہاں ایلیڈ گیٹ میں سب ختم ہو گیا تھا۔ گرینی اس بات پر مطمئن تھیں کہ میں اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا ہوں لیکن انہیں اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ میں کس طرح رہ رہا ہوں۔ کسی کو بھی اسکی پرواہ نہیں تھی۔

میں نے بھی انہیں زیادہ یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کسی کی "یاد" کو کانٹا ہوا جوتا بنانے کی عادت تھی بھی نہیں کہ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ درد تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ میں حالات کو اپنے مطابق نہیں بنا پایا تھا سو میں نے اب خود کو حالات کے مطابق بنانا شروع کر دیا تھا جس میں سر فہرست یہ اقدام تھا کہ میں اپنے کام سے کام رکھتا۔ اب بھی ان خاتون کو جو خود کو کوہو کی آنٹی کہتی تھیں ہال میں چھوڑ کر آ گیا تھا۔ وہ خاتون کچھ زیادہ ہی ضدی تھیں۔ انہوں نے مجھے دس منٹ بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔

"اے لڑکے۔۔۔ کہاں مر گئے ہو۔۔۔؟ یہاں آؤ۔۔۔" وہ پکار رہی تھیں۔ میں ان کی بات سننے کے لئے واپس ہال میں آ گیا۔

"کچھ کھانے کو ہے تو لے کر آؤ۔" مجھے دیکھتے ہی انہوں نے حکم دیا۔ وہ باسکٹ اب خالی تھی جو میں انہیں تھما کر گیا تھا۔ میں ان کی رفتار پر حیران ہوتا ہوا کچن میں آیا تھا۔ وہاں کل میں نے بسکٹ رکھے تھے لیکن وہ مجھے کسی کیبنٹ میں نظر نہیں آئے۔ میں اس بات پر مزید حیران ہوا۔ کوہو کو کھانے پینے سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ جاگنگ کرتی تھی، جم جاتی تھی یوگا کرتی تھی اور جو وقت بچ جاتا تھا اس میں فاقے کرتی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ کو میں صرف ویک اینڈ پر ہی دیکھ پاتا تھا تو وہ بسکٹ کہاں چلے گئے تھے۔ اسی دوران مجھے داخلی دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ میں باہر آ گیا۔ وہاں بسکٹ کے پیکٹ کا خالی ریپر گرا ہوا تھا۔ کوہو کی آنٹی بہت ندیدی خاتون تھیں۔

"کون آیا ہے بلی؟" کوہو کی آواز بھی ساتھ ہی سنائی دی تھی۔ اس نے داخلی دروازے کے پاس پڑے سفری بیگ کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ اس کی آواز میں حیرانی سے زیادہ پریشانی محسوس ہوئی تھی مجھے۔ باہر کے دروازے سے ہال کے اندر تک نگاہ پڑتی تھی۔ کوہو نے بھی بیگ کو دیکھنے کے بعد دوسری نظر کاؤچ میں دھنسی ہوئی خاتون پر ڈالی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں نمایاں ہوئیں اور اپنا اثر چھوڑے بغیر غائب ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے سن گلاسز اور بیٹ کو میز پر رکھ دیا۔

"آپ آئی ہیں۔۔۔" گہری سانس بھری پھر بولی۔ "واپسی ہو گئی آپ کی؟" کوہو کا انداز طنزیہ تھا۔ ان خاتون نے گردن گھمائی اور مسکرائیں۔

"کیا بہت یاد کرتی رہی ہو مجھے۔۔۔ سننے میں کافی اچھا لگ رہا ہے۔"

"اوہ کم آن وینڈی آنٹی۔۔۔اتنا پوزمت کیجیے۔۔۔ایکٹرس آپ نہیں میں ہوں۔۔۔" اس کے چہرے پر ناگواری بڑھی تھی۔آنٹی وینڈی نے قہقہہ لگایا۔۔۔انتہائی مصنوعی اور چڑا دینے والا قہقہہ۔

"میں ایکٹرس نہیں ہوں مگر ایکٹرس کی آنٹی تو ہوں نا۔۔۔کیا میں نہیں ہوں؟"

کوہو نے سر جھٹکا جیسے اس لایعنی بحث سے چڑ رہی ہو۔

"تم یہاں سے جاؤ بلی۔" اس نے ان کی جانب سے نگاہ ہٹا کر مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔مجھے ویسے بھی اس صورتحال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔میں سکون سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

"اے رکو۔۔۔کدھر جا رہے ہو۔۔۔ذرا رکو۔۔۔" یہ وینڈی آنٹی تھیں۔

"اس سے کیا کام ہے آپ کو؟" کوہو نے جیسے غرا کر کہا تھا۔وہ اپنی آنٹی کی بجائے مجھے گھور رہی تھی۔

"یہ کون ہے۔۔۔میں چاہتی ہوں مجھے اس سے متعارف کروایا جائے۔۔۔یہ خود کو تمہارا کزن کہہ رہا ہے۔۔۔اتنا پلا پلایا کزن کہاں سے آیا تمہارے پاس۔" وہ آنکھیں گھما کر اپنا موقف بیان کر رہی تھیں۔

"آنٹی وینڈی۔۔۔اس معاملے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔آپ اپنے کام سے کام رکھیے۔"

کوہو نے جھٹکے سے اپنے ہائی ہیل شوز اتارے تھے جو باری باری دور جا گرے تھے پھر وہ خود بھی تن فن کرتی دور کچن والی سائیڈ پر چلی گئی۔اس کی بڑبڑاہٹ واضح نہیں تھی۔آنٹی وینڈی میری جانب مڑیں۔

"میں وینڈی والس ہوں۔۔۔تمہاری کوہو کی آنٹی۔۔۔تم کون ہو؟" یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا۔اب میں پہلی دفعہ غصہ دلا دینے والے تذبذب کا شکار ہوا تھا۔

"میں کچن سے آپ کے لئے کافی لینے گئی تھی۔۔۔زہر لینے نہیں۔۔۔تھوڑا تحمل برتیں۔۔۔میں آپ کو آپ کے سوالوں کا جواب دیئے بغیر مروں گی نہیں اور آپ کو بھی مرنے نہیں دوں گی۔۔۔اور تم کیوں کھڑے ہو اب تک یہاں۔۔۔دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں۔" وہ دو کافی کے مگ ہاتھ میں لئے باہر آئی تھی۔مجھے زندگی میں اتنی بے عزتی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔میں نے دونوں خواتین کے رویے پر لعنت بھیجی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ میرا کمرہ استعمال کر رہا ہے۔۔۔میرا کمرہ مجھ سے پوچھے بغیر اسے کیوں دیا گیا۔۔۔؟ یہ میرا دوسرا سوال ہے اور میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ۔۔۔یہ کون ہے۔۔۔؟"

ان کی آواز نے میرا تعاقب کیا تھا۔مجھے کوہو کے رویے پر غصہ تو آیا تھا مگر نجانے کیوں میں دروازے کے پاس جا کر رک گیا اور کمرے کے اندر جانے کی بجائے وہیں رک کر سننے لگا کہ وہ میری بابت اپنی آنٹی کو کیا بتاتی ہے۔

"یہ میرا اور باب کا بیٹا ہے۔۔۔ویک فیلڈ سے آیا ہے۔۔۔اب یہ میرے ساتھ رہے گا۔"

کوہو کی آواز میں شکست خوردگی سی تھی۔ مجھے آنٹی وینڈی پر رشک آیا کہ کوئی تو ایسا تھا جو کوہو کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

"میں اسے تمہاری بدقسمتی سمجھوں؟" کافی دیر بعد آنٹی وینڈی کی آواز آئی تھی۔

"نہیں۔۔۔بیوقوفی۔۔۔"

"او کم آن کوہو۔۔۔ایک ہی بات ہے۔۔۔بیوقوفی ہی وقت گزرنے کے بعد بدقسمتی بن جاتی ہے۔" آنٹی وینڈی کے ہنکارا بھرنے کی آواز آئی تھی۔

"یہ آپ کے ساتھ ہوا ہوگا وینڈی آنٹی۔۔۔میری بیوقوفی میری خوش قسمتی بن جائے گی۔۔۔کچھ سال کی بات ہے۔"

پہلی بار کوہو کی آواز میں عجیب سا رنگ چھلکا تھا۔ میں تھوڑا سا اور آگے ہوا تا کہ کوہو کی آواز مزید بہتر طریقے سے مجھ تک پہنچ سکے۔

"ایسے دعوے تو تم پچھلے کئی سالوں سے کر رہی ہو ڈیئر کوہو۔"

"یہ دعویٰ نہیں ہے آنٹی۔۔۔یہ اطلاع ہے۔" وہ ہنسی بھی تھی۔

"یہ اطلاع تو مجھے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی مل گئی تھی۔۔۔کہ تم آجکل "ماں" کی ڈیوٹی سرانجام دے رہی ہو۔"

آنٹی وینڈی کا انداز بوڑھی چالاک جادوگرنیوں کا سا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اب وہ ہنس رہی تھی۔

"یہ صرف اطلاع نہیں ہے۔۔۔یہ خوش خبری بھی ہے۔" کوہو کا لہجہ بہت پرسکون سا تھا۔

"میں نے اگر تمہیں پالا ہوتا تو اس خوشخبری پر ضرور مبارک باد دیتی میں لیکن میں چونکہ تمہاری اس چالاک لومڑیوں والی خصلت سے واقف ہوں اس لئے مجھے حقیقت بتاؤ۔۔۔یہ لڑکا بھلے تمہارا بیٹا کیوں نا ہو، بغیر اپنی کسی غرض کے تم ان چکروں میں کبھی نہ پڑو۔"

"آنٹی وینڈی! اپنی کھوپڑی پر اور مجھ پر ترس کھائیں اور براہ مہربانی اپنے آنے کی وجہ بتائیں۔" میری طرح کوہو بھی اس لایعنی بحث سے اکتانے لگی تھی۔

"تمہیں پتا ہے کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا کرتی ہوں۔" وہ پہلی دفعہ بہت مطمئن سی لگی تھیں۔ اس کے بعد چند لمحے خاموشی چھائی رہی اور پھر آنٹی وینڈی کی تڑپتی ہوئی آواز آئی۔

"مجھے بیوقوف سمجھتی ہو۔۔۔یہ فائیو ہنڈرڈ پاؤنڈز دے کر جان چھڑا رہی ہو مجھ سے۔"

"ایسی غلطی میں کیسے کر سکتی ہوں۔۔۔آپ کو بیوقوف سمجھتی ہوتی تو اب تک آپ سے جان نہ چھڑا چکی ہوتی۔۔۔اب تک آپ کو بھگت رہی ہوں۔۔۔اسی بات سے میرے دل میں اپنی اہمیت کا اندازہ لگالیں۔"

"تمہارے دل میں میری اہمیت میری اپنی محنت کی وجہ سے ہے اور چونکہ تم جانتی ہو کہ میں بہت قیمتی ہوں سو تم مجھے دو ہزار پاؤنڈز دے دو۔"

"کیاآآآ۔۔۔" کوہو چلائی تھی۔

"کوہو میرے پاس ضائع کرنے کے لئے صرف وقت ہی ہے اور تمہارے پاس وقت بھی ہے اور دولت بھی۔"

"وینڈی آنٹی... میں محنت کرتی ہوں... گھر بیٹھے پیسے نہیں ملتے مجھے آپ کی طرح۔" کوہو نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"میرے شوہر کی پینشن ملتی ہے مجھے جبکہ تمہیں تمہارے شوہر کا ترکہ ملنے والا ہے... اب مجھے جھٹلانا نہیں... مجھے سب پتا ہے یہ اپنا لڑکا جو تم ویک فیلڈ سے لائی ہو نا یہ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بالا آخر بڑھی کے ساتھ تمہارے معاملات بخیریت انجام پا گئے ہیں... بڑھے کے بعد تو ویسے بھی اب کوئی بڑی رکاوٹ رہی نہیں تھی... بڑھی نے کیا آفر دی ہے تمہیں اس جھنجھٹ میں پڑنے کی... سچ سچ بتادو۔"

آنٹی وینڈی کا اشارہ یقیناً گرینڈ پا اور گرینی کی طرف تھا یہ تو مجھے سمجھ آ گیا تھا لیکن کوہو اور گرینی کے درمیان کوئی معاملات بھی طے ہوئے تھے اس کا مجھے ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ کوہو مجھ سے کم بات کرتی تھی لیکن گرینی نے بھی مجھے یہاں بھیجنے کے لئے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا ضرور لیا تھا لیکن کسی قسم کی ڈیل کے متعلق تو کوئی بھنک نہیں پڑی تھی مجھے۔ میں اور بھی چوکس ہو کر ان دونوں کی باتیں سننے لگا۔

"اس نے مجھے کوئی آفر نہیں دی اور جہاں اتنی خبریں تھیں آپ کے پاس وہاں آپ کو یہ کیوں نہیں پتا چل سکا کہ بڑھی نے اپنے پرانے عاشق سے شادی کر لی ہے۔"

کوہو کے الفاظ نے اس کی آنٹی کو تو پتا نہیں ہلایا تھا یا نہیں مگر مجھے ضرور ہلا دیا تھا۔ مجھے لگنے والا یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میں چند لمحوں کے لئے جیسے سن ہو گیا۔ گرینی سے میں نے کبھی یہ توقع نہیں کی تھی کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولیں گی۔ وہ بے شک شادی کرتیں لیکن مجھ سے چھپاتی تو نہیں۔ کیا واقعی یہ وہی گرینی تھیں جن کے ساتھ میں نے زندگی کے تیرہ سال گزارے تھے۔ میری زندگی اگر کوئی فیری ٹیل ہوتی تو میں سوچتا کہ شاید گرینی کو کسی بدصورت جن نے خوفناک جادوگری سے بدل دیا ہے لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں تھا۔ میری آنکھیں پانی سے لبالب بھرنے لگیں۔ مجھے رونا آ رہا تھا۔ یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہا تھا۔

مجھے کوہو اور اس کی آنٹی کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں بہت سارا رونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆ ☆ ☆

تمہیں میگی نے کچھ نہیں بتایا... اپنے اور میرے بارے میں... اوہ پور بے بی... وہ تمہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوگی... وہ ایسی ہی ہے... سویٹ... زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں کو خوشگوار بنانے کے لئے وہ ایسی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔"

مسٹر ایرک بہتر خوشگوار موڈ میں تھے۔ مجھے بہت رات کو ویک فیلڈ فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں کوہو کی غیر موجودگی کا یقین کر کے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ میں عجلت کا شکار تھا مگر دوسری جانب مسٹر ایرک نے فون اٹھایا تھا اور وہ یقیناً عجلت میں نہیں تھے۔ گرینی کی بابت پوچھنے پر وہ بتا رہے تھے۔ ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے مجھے چڑا رہے ہوں۔ آنٹی رات گئے اپنے فارم ہاؤس کے فون پر ان کی آواز سن کر ہی مجھے یقین آ گیا تھا کہ کوہو اور اس کی آنٹی گرینی کے متعلق جو باتیں کر رہی تھیں وہ سب سچ تھیں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو کر بہت رو چکا تھا اور اب میرا خیال تھا کہ مجھے مزید رونا نہیں آئے گا لیکن میں غلط تھا۔ میرا اندازہ درست نہیں تھا۔ تیرہ سال کا کوئی بھی بچہ اپنے متعلق درست اندازے لگا بھی تو نہیں سکتا۔

"مجھے گرینی سے بات کرنی ہے مسٹر ایرک۔" میں نے گہری سانس بھر کر گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے گرینڈ پا کہو ینگ مین۔۔۔ میں اور میگی اب مسٹر اور مسز بن چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس خبر سے بہت خوشی ہو رہی ہو گی۔۔۔ میگی میرے لئے کچن سے پینے کو کچھ لینے گئی ہے۔۔۔ میگی جلدی آؤ۔۔۔ تمہارے لئے فون ہے۔"

وہ بہت پُر جوش ہو رہے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے مزید کچھ بھی کہے سنے بغیر بند کر دیا۔ مجھے اب زندگی بھر ان سے کوئی بات نہیں کرنی تھی۔ میں نے کاؤچ کی پشت سے اپنا سر لگا دیا جو روتے رہنے کی وجہ سے بہت بھاری ہو رہا تھا لیکن دل پر اس درد کا بوجھ نہیں تھا۔ اصل بوجھ اس درد کا تھا جو مجھے اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کی لاتعلقی کی وجہ سے سہنا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک میں ایسے ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سوچنے کے لئے اب بچا بھی کیا تھا۔ میں زندگی کب گزار رہا تھا، زندگی مجھے گزار رہی تھی تو جو کام میں کر ہی نہیں رہا تھا اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ وہ پہلا سبق تھا اس رات کا جس رات نے مجھے سکھا دیا تھا کہ "رشتے" آپ کی ذات سے اہم نہیں ہوتے۔ پہلے آپ کی ذات ہوتی ہے، اس کے بعد باقی چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ وہ پہلی طاقت کی گولی تھی جو میں نے نگلی تھی۔ اسی طاقت کی گولی کو صبر کہتے ہیں شاید۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے بھوک ستا رہی تھی۔ میں آپ کو "بھوک" کی فطرت کے بارے میں ایک عجیب بات بتاتا ہوں۔ یہ تب ظاہر ہوتی ہے جب آپ "صبر" کرتے ہیں اور تب ختم ہو جاتی ہے جب آپ "شکر" کرتے ہیں۔ میں ثابت قدمی سے اٹھا اور کچن کی جانب چل دیا۔ میں "صبر" کر چکا تھا اور "شکر" کرنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے کئی دن طلحہ اور راشد اس سے خفا رہے۔ انہوں نے اگرچہ اس سے بات چیت بند کی تھی نہ اس کے ساتھ بیٹھنا چھوڑا تھا لیکن ان دونوں کے رویے میں ایک عجیب سا کھچاؤ آ گیا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے آپس میں زیادہ باتیں کرتے تھے۔ اس کے نوٹس یا کتابیں شیئر کرنے کی بجائے وہ کسی اور لڑکے سے یہ چیزیں مانگ لیتے لیکن اس سے ایک بال پوائنٹ یا ڈائیگرامز ڈرا کرنے کے لئے ایک پینسل تک مانگنے کے روادار نہ رہے تھے۔ یہ سب چیزیں اسے بہت بری طرح ہرٹ کر رہی تھیں۔ وہ بھی اگر باقاعدگی سے کالج جا رہا ہوتا یا اس کا حلقہ احباب ان دونوں کے علاوہ کسی اور دوست پر بھی مشتمل ہوتا تو شاید ان دونوں کے انداز اس کے لئے قابل برداشت ہوتے مگر اب تو وہ ان دونوں کی اس ذرا سی خفگی سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ وہ انہیں بلاوجہ مخاطب کرنے کی کوشش کرتا، ان کی ہر بات پر مسکرانے کی کوشش کرتا اور ان کے کہے بغیر ان کی جنرل بکس بنانے کے لئے تیار ہو جاتا مگر وہ سرد مہری جو ان دونوں کے انداز میں آتی جا رہی تھی وہ کسی طور پر ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ ان دونوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے بے حد ڈرتے ڈرتے ابو سے ایک مرتبہ پھر دوستی کے نام پر ایک اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

وہی ہوا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔" اس کے ابو سنتے ہی بھڑک اٹھے۔

میں نے کہا تھا نا کہ کالج یا اکیڈمی کو تفریح کی جگہ مت سمجھنا۔۔۔ تم سمجھتے ہو میں کالج میں پہنچ گیا اب بس ہر کام کی آزادی ہے۔۔۔ پڑھائی کی کوئی فکر نہیں اور دوستوں میں وقت برباد کرنے کا شوق۔۔۔ یہ دوست کچھ نہیں دیں گے تمہیں۔۔۔ خبردار جو دوبارہ مجھ سے ایسی کوئی بات کی۔۔۔ میں

اب دوبارہ نہ سنوں کہ تم نے کسی دوستی کو اتنا آگے بڑھایا کہ نوبت گھر آنے جانے تک پہنچ جائے۔"

وہ ہمیشہ دوٹوک لہجے میں نصیحت کرتے تھے۔ان کے یہاں کبھی کسی دلیل کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔یہ پندونصائح اسے ہمیشہ سر جھکا کر آنسو پینے پر مجبور کر دیتے تھے لیکن پہلی بار اس نے سر جھکایا تھا نہ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے ابو کی جانب دیکھتا رہا۔ابو کے لہجے میں ہی نہیں ان کے چہرے کے نقوش میں بھی ایک سختی اور درشتگی تھی۔اس نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔وہ ان کے چہرے کی جانب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔وہ کمرے سے ہی باہر نکل آیا تھا۔ابو کی ڈانٹ نے پہلی بار اسے خوفزدہ نہیں کیا تھا۔دوستوں کی خفگی اسے زیادہ ڈرا رہی تھی لیکن چند دن بعد ان دونوں کا رویہ اس کے ساتھ خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا۔سرد مہری کی برف پگھلنے لگی تھی مگر اب اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ دونوں اس کو اسی طرح ٹریٹ کریں جیسے وہ ایک دوسرے کو کرتے تھے۔طلحہ اور راشد کے فیملی ٹرمز بھی تھے۔وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے تھے بلکہ ان کے والدین بھی فارغ اوقات میں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔وہ ایک دوسرے کو اکثر اپنے گھروں میں مدعو کرتے تھے۔انہوں نے اس کو بتایا تھا کہ وہ دونوں شاپنگ ایک ساتھ کرتے تھے۔وہ دونوں ایک دوسرے کے جتنا قریب تھے ظاہر ہے یہ قربت اس کے ساتھ پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اکیڈمی کے علاوہ بھی ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا جس کی اجازت اس کے ابو کبھی نہیں دیتے بلکہ وہ تو انہیں فون کال بھی نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کا دل چاہتا تھا کہ جو پر خلوص سا رشتہ طلحہ اور راشد کے مابین ہے ویسا ہی رشتہ وہ ان کے ساتھ قائم کر سکتا۔اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے اس کے ابو کے لئے فقط وقت کا ضیاع تھے۔

انہیں نجانے کیوں اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سوڈے کی بوتل کو لبالب بھر دینے سے اس کے پھٹنے کے امکانات سو فیصد بڑھ جاتے ہیں اور وہ بوتل کو نا صرف بھر چکے تھے بلکہ اس پر کارک لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میرے گھر چلتے ہیں۔۔۔۔ بہت مزہ آئے گا۔" راشد نے طلحہ کو پیشکش کی تھی جسے اس نے فوراً قبول کر لیا تھا جبکہ اسے انہوں نے رسماً بھی اپنے ساتھ آنے کے لئے نہیں کہا تھا۔وہ تینوں کتابیں سمیٹ رہے تھے۔موسم اچانک ہی خوشگوار ہو گیا تھا

گہرے سیاہ بادلوں نے پہلے زمین کے حصے میں آنے والی سنہری روشنی کو نگلا تھا پھر باقی ماندہ زرد رنگ کو بھی نگل لیا تھا اور ہر طرف سرمئی سے رنگ پھیل گئے تھے۔

بادل سورج بادشاہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔اپنی اس کامیابی پر شاید ان کی اپنی آنکھیں بھر آئی تھیں تب ہی رم جھم سی شروع ہو گئی۔ ہلکی بوندا باندی ہونے سے ہوا میں بھی تازگی آ گئی تھی۔اکیڈمی میں موجود لڑکوں کی اکثریت پڑھنے کی بجائے مون سون کی پہلی بارش سے لطف اندوز ہونا چاہ رہی تھی سو ٹیوٹر نے سب ہی کلاسز کو چھٹی دے دی تھی۔وہ کونسا لڑکیاں تھیں جو بیٹھ کر انتظار کرتیں کہ کوئی لینے آئے گا تو ہی گھر جاسکیں گی۔دیکھتے ہی دیکھتے سب لڑکے باہر نکل گئے تھے۔

" آنٹی سے کہوں گا پکوڑے بنا کر کھلائیں۔۔۔ چائے بھی پیوں گا اور ہاں وہ پچھلی دفعہ کس چیز کا حلوہ کھلایا تھا تم نے۔۔۔؟" طلحہ نے راشد سے

فرمائش کرنے کے ساتھ ساتھ پوچھا تھا۔ وہ چٹورا بھی بہت تھا اور راشد کی امی سے کافی بے تکلف بھی تھا۔

"لوکی کا حلوہ تھا وہ۔" راشد نے اپنی سائیکل کا لاک کھولتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ طلحہ نے بھی گردن ہلائی تھی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کس چیز کا حلوہ تھا جبکہ اُن دونوں کے ساتھ وہ بھی اپنی سائیکل کیریئر پر بیگ رکھتا حسرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے ان دونوں کے مابین یہ بے تکلفی بہت بھاتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی معیت میں کتنا مزہ کرنے والے تھے یہ سوچ کر ہی اس کے دل میں خواہش انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے ایسی بے تکلف دوستی کا مزہ کبھی نہیں چکھا تھا لیکن وہ چکھنا چاہتا تھا مگر کیسے۔۔۔؟ اب وہ تینوں اپنی سائیکلوں پر سوار ہو رہے تھے چند لمحوں بعد وہ اپنی اپنی سمتوں میں روانہ ہو جاتے۔ اس کے ذہن میں یکدم ہی ایک خیال آیا تھا۔

"میں بھی اگر دونوں کے ساتھ چلا جاؤں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔۔۔ ابھی تو چھٹی میں دو گھنٹے پڑے ہیں۔ میں وقت پر گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگر ابو کو پتا چل بھی گیا کہ آج جلدی چھٹی ہوگئی تھی تو میں کہہ دوں گا کہ میں اکیڈمی میں بیٹھ کر پڑھتا رہا تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔ بہت مزہ آئے گا۔"

اس نے سوچا تھا نجانے کیسے سوچا تھا ایسا بہانہ پہلے کبھی نہیں بنا پایا تھا وہ۔ جھوٹ بولنے کے لئے ایک ہمت درکار تھی جو اس کے پاس نہیں تھی لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو وہ کسی دوکان سے خرید لاتا۔ اسے اپنے اندر یہ "چیز" اپنے آپ پیدا کرنی تھی۔ وہ خود کو آزمانا چاہتا تھا۔

"میں۔۔۔ میں بھی چلوں۔۔۔ تمہارے ساتھ؟" اس نے سوچنے میں زیادہ وقت لگایا تھا مگر کہنے میں ایک لمحہ بھی نہیں۔

"تم۔۔۔ ہمارے ساتھ۔۔۔ میرا مطلب ہے راشد کے گھر؟" طلحہ کے لہجے اور راشد کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"تم چلو گے میرے گھر؟" راشد نے بھی بے یقینی سے اس کے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے جھینپتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہاں ضرور چلو۔۔۔ بہت مزہ آئے گا۔۔۔ میں تمہیں کمپیوٹر دکھاؤں گا۔ میری خالہ نے نیویارک سے بھیجا ہے۔"

راشد اسے پُرجوش لہجے میں بتا رہا تھا۔ وہ تینوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہو گئے تھے۔ وہ شام اس کی زندگی کی بہترین شام تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ اس نے زندگی کے ایک نئے رخ سے متعارف ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لئے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اس کے ابو اس کی اس سرگرمی قطعاً بے خبر رہے تھے۔ یہ شام اسے طلحہ اور راشد کے مزید قریب لے آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتاتے۔" وہ تینوں کسی بات پر ہنس رہے تھے جب طلحہ نے اچانک کہا۔

"کیا بتاؤں۔۔۔؟ تم پہلے ہی میرے بارے میں کافی کچھ جان چکے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ دل ہی دل میں اسے طلحہ کا یہ شکوہ بہت اپنائیت بھرا لگا تھا۔

"جی نہیں۔۔۔ کچھ نہیں جانتے ہم۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں کبھی کوئی بات کرتے ہی نہیں ہو۔"

طلحہ نے اس کی تردید کی تھی۔ اب کی بار وہ کچھ حیران ہوا۔ اپنی دانست میں وہ انہیں کافی کچھ بتا چکا تھا۔ اتنی باتیں تو اس نے آج تک کسی

سے بھی نہ کی تھیں جتنی وہ ان دونوں سے کرتا تھا۔

"طلحہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔واقعی تمہارے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے جبکہ ہمارے سارے سیکرٹس تمہیں پتا ہیں۔"

راشد نے سر ہلا کر کہا تھا۔ اکیڈمی میں تھیوری ٹیکل کورس ختم ہو چکا تھا اور پریکٹیکلز کی پریکٹس شروع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے انہیں باتیں کرنے کے لئے زائد وقت مل جاتا تھا۔

"میرے پاس شیئر کرنے کے لئے کوئی سیکرٹ نہیں ہیں۔" اس نے اپنی ازلی معصوم پن سے کہا تھا۔ اس کے دوستوں کو یقین نہیں آیا تھا۔

"پھر بھی۔۔۔کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔" طلحہ بضد تھا۔

"کیا بتاؤں؟" اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"میں ایک عام سا لڑکا ہوں۔۔۔ابو کے بارے میں تم لوگوں کو پتا ہی ہے۔۔۔امی ہاؤس وائف ہیں۔۔۔ایک بہن ہے۔۔۔چھوٹی ہے مجھ سے۔۔۔تم لوگوں کی طرح میری کوئی خاص ہابی نہیں ہے۔۔۔میرے ابو کو فلمیں دیکھنا پسند نہیں ہے۔۔۔ہمارے گھر ڈش انٹینا اور ویڈیوز وغیرہ نہیں ہے۔۔۔کمپیوٹر بھی نہیں ہے۔۔۔اور۔۔۔اور ہاں میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کروں اور میں بڑا ہو کر کارڈیالوجسٹ بننا چاہتا ہوں۔۔۔اور۔۔۔"

وہ اپنے بارے میں چیدہ چیدہ باتیں دوبارہ سے بتا کر اب پُرسوچ انداز میں ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس مزید کچھ نہیں تھا بتانے کے لئے۔

"کتنا میسنا ہے یہ۔" طلحہ نے راشد کی جانب دیکھ کر کہا تھا ساتھ ہی اس کی پشت پر دھپ رسید کیا تھا۔

"ہمارے ساتھ چالاکیاں۔۔۔ہاں۔" راشد بھی سر ہلا دیا تھا۔

"پتا نہیں تم لوگ کیا جاننا چاہتے ہو۔" وہ بے بسی سے مسکرایا۔ اپنی ناسمجھی و نادانی پر شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔

"یہ ساری باتیں تو ہمیں پہلے سے پتا ہیں۔۔۔یہ سیکرٹس تو نہیں ہیں گھنے۔" طلحہ کہنے کے ساتھ آنکھیں بھی گھما رہا تھا۔

"تو پھر کیا سیکرٹس؟" وہ اب واقعی حیران تھا۔

"او ئے اسٹوپڈ۔۔۔اس کا مطلب ہے لڑکیوں کی باتیں۔۔۔کوئی لڑکی تو ہو گی تمہاری لائف میں۔۔۔کوئی تو پسند ہوگی تمہیں یا تم کسی کو پسند ہو گے۔۔۔کوئی کزن۔۔۔ہمسائی یا کلاس فیلو۔۔۔یہاں اکیڈمی میں بھی کتنی ہی لڑکیاں آتی جاتی ہیں۔۔۔کبھی تو کوئی اچھی لگی ہوگی نا۔"

راشد کا انداز بھی طلحہ جیسا ہی تھا۔ وہ جھینپ سا گیا۔ راشد اور طلحہ بھی کبھار اپنی کزنز کا حوالہ دیتے تھے لیکن اس نے کبھی ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے ایسی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں۔ ایسی باتیں سننے کے بعد اسے مزید وضاحت کی ضرورت پڑتی تھی۔

"میری زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔۔۔ابھی ہم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ایسی باتیں کریں۔"

وہ جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا تھا۔ طلحہ اور راشد ڈش کلچر سے متعارف ہونے کی وجہ سے اس معاملے میں کسی قدر ہٹ دھرم ہو چکے تھے۔

"تمہارا مطلب ہے ایسی باتوں کے لئے ہمارا بڑا ہونا ضروری ہے۔۔۔ جب ہمارے بچے ہمارے جتنے ہو جائیں تب ہم ایسی باتیں کریں۔۔۔ ہے نا۔۔۔ بہت عقلمند ہو تم۔۔۔ آفٹر آل پوزیشن ہولڈر ہو۔۔۔ اپنی سمجھ کے مطابق بات کرو گے۔۔۔ اسٹوپڈ۔۔۔ اٹھارہ سال کا ہو چکا ہوں میں۔۔۔ اور یہ۔۔۔ یہ راشد ایک مہینہ ہی چھوٹا ہے مجھ سے۔"

طلحہ کا انداز استہزائیہ تھا۔ اسے نا چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

"اگرچہ یہ بات ہمیشہ میرے لئے شرمندگی کا باعث بنی رہی ہے۔۔۔ مگر ہے سچ۔۔۔ یہ عمرو عیار مجھ سے ایک ماہ بڑا ہے۔"

راشد نے بے ڈھنگے پن سے طلحہ کی تائید کی تھی۔ انکا انداز اتنا مزاحیہ تھا کہ وہ ہنستا ہی چلا گیا اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس کے دوستوں کے ہاتھ ہنسنے کا ایک منفرد ٹاپک لگ گیا تھا۔ وہ اکثر اُسے چڑانے لگے۔

"تم اپنے لئے کوئی گرل فرینڈ ڈھونڈ لو ورنہ مجبوراً مجھے اپنی ایک آدھ گرل فرینڈ تمہیں دینی پڑے گی۔" راشد اس کو کہتا تھا۔

وہ اگرچہ لفظوں ہی "گرل فرینڈ" کے اصل مفہوم سے آشنا تھے لیکن اس کے لئے تو یہ لفظ ہی بے حد انوکھا اور نیا تھا اس لئے وہ خجل سا ہو جاتا۔

"ہاں بھئی بڑھاکو کوئی گرل فرینڈ ملی یا نہیں؟" طلحہ بھی اکثر سوال کرتا۔ وہ چپ چاپ خجالت بھرے انداز میں ہنستا رہتا۔ اسے ان کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اس کے لئے یہ سب سنجیدہ موضوعات نہیں تھے بلکہ دوستوں کے بے تکلفی کے مظاہرے تھے۔ پریکٹیکلز کے بعد اکیڈمی میں ٹیسٹوں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طلحہ اور راشد بھی بے شک پوزیشن ہولڈر نہیں تھے لیکن امتحانات ان کے لئے بھی اہم تھے سو باتیں کرنے کے مواقع کم ہو گئے اگرچہ ختم نہیں ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یہ صبا نورین کون ہے؟" اس نے طلحہ سے پوچھا تھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" طلحہ کی ذہنیت دن بدن تبدیل ہو رہی تھی۔ وہ فوراً ہی ذومعنی انداز اختیار کر لیتا تھا۔

"عاطف صاحب آج بہت تعریف کر رہے تھے۔۔۔ کہہ رہے تھے لڑکیوں کے سیکشن میں صبا نورین ٹاپ پر جا رہی ہے۔ اس نے سیریز ٹیسٹ میں کیمسٹری کے سبجیکٹ میں مجھ سے تین مارکس زیادہ لئے ہیں جبکہ بائیو اور فزکس میں میرے مارکس زیادہ ہیں اور انگلش میں ہم برابر ہیں۔"

اس نے کیمسٹری کے آخری ملنے والے ٹیسٹ کی جوابی کاپی کو دوبارہ سے صفحہ با صفحہ دیکھنا شروع کیا تھا اور ساتھ ہی طلحہ کو وضاحت دی تھی۔ نمیریکل کی ایک غلطی نے اسے ٹیسٹ میں تین مارکس کم دلوائے تھے۔ اسے فی الحال اپنے ابو کے خوف سے زیادہ کوئی چیز یاد نہیں تھی جبکہ طلحہ کو شرارت کا موقع مل گیا تھا۔

"تم بڑھاکو لوگ بھی بس ایویں ہی ہوتے ہو۔۔۔ اب لڑکی بھی کونسی پسند آئی جو منہ متھے لگنے کے قابل بھی نہیں ہے۔۔۔ سانولی اور موٹی۔۔۔ جسے مسکرانا بھی نہیں آتا۔۔۔ اونہہ۔۔۔" طلحہ بظاہر اسے چڑا رہا تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اس کی گفتگو زیادہ ہی بے لگام ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے وہ لڑکی پسند نہیں آئی۔۔۔ میں نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔۔۔ میں نے اس کا نام بھی آج پہلی بار سنا ہے۔۔۔ مجھے کیا پتا وہ سانولی

ہے یا موٹی۔۔۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کیمسٹری میں مجھے بیٹ کر رہی ہے۔۔۔ میرے ابو کو باقی تینوں سبجیکٹس نظر نہیں آئیں گے۔۔۔ صرف کیمسٹری کے رزلٹ نظر آئیں گے اور صبا نورین کا نام نظر آئے گا۔"

وہ اٹھا کر بولا تھا۔ اکیڈمی میں لڑکے لڑکیوں کی کلاسز الگ الگ ہوتی تھیں لیکن حوصلہ افزائی کے لئے رزلٹس ایک نوٹس بورڈ پر ڈسپلے کئے جاتے تھے۔

"تمہارے ابو کو یہ نام بعد میں نظر آئے گا پہلے تمہاری نظر اس نام پر اٹکے گی۔۔۔ سچ سچ بتاؤ کہیں تم نے جان بوجھ کر تو کیمسٹری میں کم مارکس نہیں لئے؟" طلحہ کی ٹرین ایک ہی اسٹیشن پر رک سی گئی تھی۔

"میرا دماغ ابھی اتنا ناکارہ نہیں ہوا۔" اس نے غلط ہو جانے والے نیومریکل کو دوبارہ چیک کرتے ہوئے کہا تھا۔ دو جگہ والیوم کا یونٹ نہ لکھنے پر سر نے اس کے تین مارکس کاٹ لئے تھے۔ اسے اس چیز کے لئے سر سے بھی شکایت تھی کہ یونٹ نہ لکھنے پر ایک نمبر کٹنا چاہیے تھا۔

"ہو جائے گا۔۔۔ ہو جائے گا۔۔۔ دماغ کو ناکارہ ہوتے کون سی دیر لگتی ہے۔۔۔" طلحہ نے پھر کہا تو وہ اٹھا کر اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔

دوستی اپنی جگہ تھی لیکن پڑھائی اس کی ترجیحات میں سرفہرست تھی جسے وہ کبھی نظرانداز نہیں ہونے دیتا تھا لیکن اس کے دوست زندگی کی غیر ضروری دلچسپیوں میں مگن رہنے لگے تھے۔ اس کی ان دونوں کے ساتھ بے تکلفی بڑھی تھی تو وہیں ان دونوں کی کچھ عادات سے اسے چڑ بھی ہونے لگی تھی خصوصاً طلحہ سے اسے زیادہ شکایات تھیں۔ طلحہ کافی منہ پھٹ تھا اور پڑھائی کے لئے اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا کہ شروع میں نظر آتا تھا۔ اونچے قد کاٹھ اور تیکھے نین نقش والا طلحہ بلاشبہ خوش شکل لڑکوں میں شمار تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس خوبی کے زعم میں کچھ زیادہ ہی مبتلا رہنے لگا تھا۔ نچلے درجے کے فیشن اور شوبز میگزینز پڑھ پڑھ کر وہ خود کو کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی گفتگو بھی فلمی جوکس اور فلمی گوسپ کے گرد گھومتی تھی تب ہی اس کے منہ سے ایک لڑکی کا نام سن کر اور اس کے متعلق استفسار سن کر وہ بلاوجہ اسے اس لڑکی کا نام لے کر چھیڑنے لگا تھا۔ فرسٹ ایئر کا رزلٹ آنے والا تھا اسی لئے اکیڈمی کے ٹیچرز اکثر اپنے بہترین اسٹوڈنٹس کا ذکر لیکچر یا پریکٹیکل کے دوران کرتے تو صبا نورین کا نام بھی بکثرت سننے کو ملتا۔ جب بھی یہ نام سنائی دیتا طلحہ خواہ مخواہ ذو معنویت سے اسے تکنا لگتا، کبھی مار کر متوجہ کرنے کی کوشش کرتا یا آنکھیں گھما گھما کر مسکرانا شروع کر دیتا۔ وہ ان کی ایسی حرکات کو نظرانداز کرتا مگر کبھی کبھی اسے ہنسی بھی آجاتی جس سے انہیں مزید شہہ ملتی۔

یہ سلسلہ شاید اسی طرح چلتا رہتا مگر فرسٹ ایئر کے رزلٹ نے یکدم ہر چیز پر بڑا سا فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صابر بھائی ٹونکہ

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" ابو نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کبھی اسے دیکھتے تھے اور کبھی ہاتھ میں پکڑی مارکس شیٹ دیکھنے لگتے تھے۔ ان کے سامنے میز پر اس لڑکی کی مارکس شیٹ پڑی تھی جس نے بورڈ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی جبکہ وہ اس بار تیسری پوزیشن حاصل کر پایا تھا۔ اس کے ابو ان لوگوں میں سے تھے جن کے لئے تیسرا درجہ آخری ہوتا ہے۔ اس کے اوپر، نیچے یا درمیان میں کچھ نہیں ہوتا اس لئے اس کی تیسری پوزیشن ان کے لئے کوئی کارنامہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس پر برس رہے تھے اور یہ سلسلہ تب سے جاری تھا جب سے رزلٹ باقاعدہ اناؤنس کیا گیا تھا۔ آج وہ جانے کس طرح فرسٹ اور سیکنڈ آنے والی لڑکیوں کی مارکس شیٹ نکلوا لائے تھے اور اب ایک بار پھر اس پر برس رہے تھے۔

"تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم لاتوں کے بھوت ہو۔ تم سے نرمی برتنے کا مطلب ہے۔۔۔ غلطی۔۔۔ صرف غلطی۔"

انہوں نے اس کی مارکس شیٹ اس کے پاؤں میں پھینک دی تھی۔ وہ پہلے ہی سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارکس شیٹ قدموں میں گرتے ہی اس نے گردن مزید جھکا لی تھی۔ مارکس شیٹ پر لکھا اس کا اپنا نام اسے ذرا سا دھندلایا ہوا لگ رہا تھا حالانکہ اس کی آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ ابھی تک ابو نے اسے ایک بھی تھپڑ رسید نہیں کیا تھا۔ وہ شاید آج صرف لفظوں کی مار سے اسے گھائل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"میری محنت کا یہ صلہ دیا ہے تم نے مجھے۔۔۔ لوگوں کو باتیں بنانے کا اچھا موقع مل گیا۔۔۔ تم اپنی نہ سہی میری عزت کا خیال کر لیا کرو۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ تم ایسا کیوں کرو گے۔۔۔ تمہیں تو موقع چاہیے باپ کو ذلیل کرنے اور کروانے کا۔۔۔ سب لوگ کہتے تھے کہ اسے کسی بڑے کالج میں داخل کرواؤ۔ میں نے کہا نہیں۔۔۔ بڑے کالج میں ایڈمیشن کا مطلب ہے الٹی سیدھی سرگرمیوں میں وقت ضائع کرنا۔۔۔ چھتیس طرح کی سوسائٹیاں بنی ہوتی ہیں ایسے کالجز میں۔۔۔ بچوں کو گھیر گھار کر اس میں شامل کر لیتے ہیں پھر ان کا وقت ضائع کرتے ہیں لیکن مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ میرا بیٹا کسی سوسائٹی کا حصہ بنے بغیر بھی یہ کام اچھے طریقے سے کر سکتا ہے۔ میں ذرا مصروف کیا ہوا تمہیں پر پرزے نکالنے کا موقع مل گیا۔" ان کا لہجہ سرد تھا مگر الفاظ شعلوں کی طرح گرم تھے۔ اسے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی تھی۔

"جانتے ہو نا اس سال سے اینٹری ٹیسٹ ہو گا۔۔۔ پورا پنجاب بیٹھے گا اس ٹیسٹ میں۔۔۔ ایک ایک نمبر کے لئے سخت مقابلہ ہو گا اور ڈس کوالیفائی ہونے کا مطلب ہے میڈیکل کی فیلڈ میں نو اینٹری۔۔۔ سن رہے ہو میری بات۔ ایک ایک نمبر کا مقابلہ ہے۔۔۔ ایک بات غور سے سن لو میں دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔۔۔ اگر تم میرٹ لسٹ پہ نہ آسکے تو میں بخشوں گا نہیں تمہیں۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔"

اس کے ابو بھول گئے تھے کہ بخشنے کا اختیار صرف اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنا غصہ اپنے بیٹے پر اتار رہے تھے جبکہ بیٹا ان کی باتوں پر پہلی بار اتنا غمگین نہیں ہوا تھا۔ اس کے لئے اس کے ابو کی باتیں جوہڑ کے پانی کی طرح تھیں۔۔۔ سڑی ہوئی اور بدبودار جو اسے سر درد اور ذہنی تعفن کے علاوہ کچھ نہیں دیتی تھیں۔ اس نے فرسٹ آنے والی لڑکی سے آٹھ نمبر کم لئے تھے۔ وہ پُر امید تھا کہ اگلے سال ان آٹھ نمبروں کی سیڑھی کو دو دو کر کے پھلانگ لے گا اور اپنی سابقہ پوزیشن کو بحال کر لے گا۔۔۔ مگر۔۔۔ ایک عجیب سی بات تھی جو اس نے اتنی شدت سے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ فرسٹ پوزیشن حاصل کر لینا کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لینے کے برابر نہیں تھا۔ وہ میٹرک میں یہ کام کر چکا تھا مگر تب بھی ابو نے اسے گلے لگا کر مبارکباد

نہیں دی تھی۔ وہ تب بھی اس سے اتنا ہی دور تھے جتنا کہ اب۔۔۔ اُن کا اور اس کا درمیانی فاصلہ آج بھی برقرار تھا۔ اس کے اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

"ابو فرسٹ پوزیشن لینے پر بھی خوش نہیں تھے۔۔۔ ابو تھرڈ پوزیشن لینے پر بھی ناراض ہیں۔۔۔ جب میں ابو کو خوش کر ہی نہیں سکتا تو کس لئے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟"

اس کے ابو کو اس سے "صلہ" چاہیے تھا اور وہ "گلہ" کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اے لڑکے۔۔۔ کیا ہر وقت فارغ بیٹھے رہتے ہو۔۔۔ یہاں آؤ" میں گھر کے دروازے کے باہر بیٹھا خشک ٹنڈ منڈ بکھرے میلے میلے سے رنگی پتوں کو دیکھ رہا تھا جو میرے سامنے ہی درخت سے علیحدہ ہوئے تھے۔ ان میں اور مجھ میں بہت مماثلت تھی اور فرق صرف ایک تھا۔ وہ پاؤں کے نیچے کچلے جاتے تھے تو چر مر ہو کر شور مچاتے تھے، اپنے ہونے کا احساس دلاتے تھے جبکہ میں نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ گرینی سٹرایک اور کو ہو۔۔۔ میں سب سے لاتعلق اور لاپرواہ ہو چکا تھا۔ میں نے سب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

"اے لڑکے! میں تم سے مخاطب ہوں۔"

لکڑی کے جنگلے کے اس پار سے پھر کوئی پکار رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا۔ وہ مسٹر ایمرسن تھے۔ میرا ان سے تعارف تھا۔ کبھی ملاقات ہوئی تھی۔ کو ہو نے مجھے ایک بار ان کے بارے میں بتاتے ہوئے محتاط رہنے کی ہدایت تھا کہ وہ کافی بدمزاج شخص ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی بار آتے جاتے اپنے گھر کے لان میں خود سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کچھ بدمزاج اور غصیلے قسم کے انسان ہیں۔ وہ اپنے گھر میں اپنی ہاؤس کیپر پر اتنی زور سے چلاتے تھے کہ ان کی آوازیں ہمارے گھر کے لان تک آتی تھیں۔

"میں ڈی ونچی کا آرٹ پیس نہیں ہوں۔۔۔ اتنے غور سے مت دیکھو مجھے۔۔۔ میں اس بات کا برا مناتا ہوں۔"

ان کی آواز میں اور ان کے انداز میں مزاح کی جھلک تھی نہ بے تکلفی کا کوئی عنصر۔۔۔ وہ سنجیدہ اور کسی قدر کرخت دکھائی دیتے تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی معمول کی طرح سیڑھیاں اتر کر جنگلے تک اور پھر دروازہ کھول کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔

"میرے گھر آؤ۔۔۔ کچھ بات کرنی ہے۔" وہ ساٹھ کے پیٹے میں لگتے تھے۔ ان کی چال میں چستی تھی اور ان کے ہاتھ میں لاٹھی بھی نہیں تھی لیکن اُن کی پشت تھوڑی خمیدہ تھی۔

"ہم یہاں ہی کھڑے ہو کر بات کر لیتے ہیں۔" جب وہ اپنے گھر کے اندر قدم رکھنے لگے تو میں نے کہا تھا۔ وہ میری جانب مڑے۔ اُن کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی۔

"مرد راستے میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔۔۔ بالخصوص دو پڑھے لکھے، سمجھدار اور وجیہہ مرد۔"

انہوں نے بنا مسکرائے کہا تھا۔ میں بھی نہیں مسکرایا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی حسِ مزاح یقیناً ناکارہ اور قابلِ مرمت تھی۔ میں اُن کے پیچھے اُن کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ان کا گھر کشادہ، اور صاف ستھرا تھا۔ ہلکی سی مدت کے ساتھ فضا میں میٹھی سی خوشبو بھی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے سب کچھ بہت بھلا سا محسوس ہوا۔ تمام تر حسیات کو جیسے سکون ملا ہو۔ میں نے چند بے آواز لمبی سانسیں بھریں۔

"آپ تنہا رہتے ہیں؟" وہاں کوئی آہٹ سنائی دی تھی نہ آواز سو میں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ وہ ہال سے ہو کر اوپر کی جانب جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے تھا۔

"میں گنہگار ہوں نا فرشتہ۔۔۔ میں کیوں رہوں تنہا۔" وہ مجھے جتا رہے تھے۔ مجھے ان کے اس جملے کے ابہام نے الجھا دیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا اس لئے میں نے پوچھ لیا۔" میں نے وضاحت کی۔ سیڑھیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہم کوریڈور سے گزر رہے تھے۔ دیوار پر جا بجا چھوٹے بڑے فریم آویزاں تھے۔ ہر چیز میں بہت سلیقہ اور قرینہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں مسز ایمرسن کی نفاست و خوش ذوقی کو سراہا۔

"کون نظر نہیں آیا تمہیں۔۔۔ کسے دیکھنا چاہ رہے ہو تم۔۔۔ میرے ساتھ کوئی نہیں رہتا۔۔۔ اکیلا ہوں میں۔۔۔"

انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا لیکن چونکہ میری جانب ان کی پشت تھی سو میں ان کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ وہ ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ آپ اکیلے نہیں رہتے۔۔۔ آپ گنہگار ہیں نہ فرشتہ"

میں نے انہیں یاد دلایا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے مسٹر ایمرسن نہیں بلکہ گرینڈ پا کھڑے ہوں۔ میں ان کے ہمراہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا وہ دراصل ایک بڑی سی لائبریری تھی۔ چاروں دیواروں کے ساتھ چھت تک کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ایک جانب آرم چیئر تھی جبکہ دوسری جانب اسٹڈی ٹیبل تھی جس پر ایک کتاب اوندھی پڑی تھی۔ ایک الگ کارنر میں رائیٹنگ ٹیبل بھی نظر آ رہی تھی۔

"میں اکیلا رہتا ہوں مگر تنہا نہیں ہوں۔۔۔ دونوں باتوں میں فرق ہے اور میرے پاس نہ تو اتنا دماغ ہے نہ وقت کہ میں اس فرق کو تم جیسے احمق کو سمجھا سکوں۔"

ان کی آواز میں غصہ نہیں جھلکتا تھا لیکن الفاظ وہ غصیلے ہی استعمال کرتے تھے۔

"یہ میری دنیا ہے۔۔۔ اسے صاف کرنے کے کتنے پیسے لو گے؟" انہوں نے میرے تاثرات کی پرواہ کئے بنا پوچھا تھا۔

"اپنی دنیا کو گندا کرنے کے کتنے پیسے خرچ کئے تھے آپ نے؟" میں ان کی پہلی بات پر غصہ میں تھا اس لئے میں نے انہی کے انداز میں پوچھا تھا۔ انہوں نے مڑ کر بغور میرا چہرہ دیکھا پھر دوسری جانب مڑے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ جتنے پیسے اس کو گندا کرنے میں لگے ہیں اتنے ہی پیسے لے کر تم اسے صاف کرو گے۔" وہ ایک ریک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے لگا وہ اپنی مسکراہٹ چھپا رہے ہیں۔ میں خاموش رہا۔

"اس حساب سے تمہیں ایک پینی بھی نہیں ملے گی۔" وہ اب کتاب اٹھا رہے تھے۔

"ایک پینی چاہیے بھی کسے؟" میں نے کہا۔

"تو پھر۔۔۔؟" ان کی پشت میری جانب اور ساری توجہ کتاب کی طرف تھی جسے وہ اپنے ٹراؤزر سے رگڑ کر نادیدہ مٹی صاف کر رہے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کتاب صاف کر کے انہوں نے ریک میں رکھ دی اور میری جانب مڑے۔

"پہلے آپ کام بتائیے۔" میں نے بنا سوچے سمجھے کہا۔ مجھے ان سے باتیں کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ مہینوں بعد شاید کسی سے اتنی باتیں کی تھیں میں نے۔

"اتنے احمق بھی نہیں ہو برخوردار جتنا میں نے تمہیں تصور کر لیا تھا۔"

وہ گردن ہلا رہے تھے شاید مجھے سراہ رہے تھے۔ میں ہنس دیا۔ ایک خالص، بے ریا، بے ساختہ ہنسی بڑی نعمت ہوتی ہے۔

"میں آپ کی اسی غلط فہمی کو ہی دور کرنا چاہ رہا تھا۔" میں نے دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں اڑس لئے۔

"تم کامیاب ہو گئے ہو لڑکے۔۔۔ آؤ اب کام کی بات کریں۔" مسکراہٹ ان کی ٹھوڑی تک آئی اور پھر غائب ہو گئی۔

"تمہیں یہ ساری کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھنی ہیں۔۔۔ بے حد احتیاط کے ساتھ اور بے حد احترام کے ساتھ۔۔۔ اس میں کچھ کتابیں بہت مقدس ہیں اس لئے ان کا احترام کرنا ہے اور کچھ بہت بوسیدہ ہو چکی ہیں اس لئے اُن کی احتیاط کرنی ہے اور باقی بچ جانے والی کتابیں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اس لئے تم پر ان کا احترام بھی لازم اور احتیاط بھی۔۔۔ بولو کر پاؤ گے۔۔۔ اتنا ظرف ہے تمہارے ہاتھوں میں۔۔۔؟" "احتیاط اور احترام ہاتھوں کے محتاج نہیں ہیں۔۔۔ یہ دل کی پیداوار ہیں اور دل ہی ان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔۔۔ جی کرلوں گا۔"

میں اعتماد کے ساتھ بولا تھا۔

"فرض کر لیا تم اچھی باتیں کر سکتے ہو۔۔۔ چلو یہ بھی فرض کر لیا کہ تم ذہین ہو۔۔۔ براہ مہربانی یہ بھی بتا دو کہ کیا چارج کرو گے تم اس سروس کے لئے۔"

وہ جو کہہ رہے تھے کہ ان کا چہرہ اس کی نفی کر رہا تھا۔ میں نے فقط سر ہلا یا جیسے بڑوں کی بات سن کر تعظیماً ہلاتے ہیں۔

"میری ہاؤس کیپر ہفتے میں تین دن آتی ہے۔۔۔ اچھی عورت ہے، کام کاج کی ستھری ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔۔۔ جاہل ہے۔۔۔ کتاب سے کیا سلوک کرنا چاہیئے اس بات سے بالکل بے خبر ہے۔"

وہ چلتے چلتے اپنی آرام چیئر پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں بیٹھنے کے لئے کوئی دوسری چیئر نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے ان کی نظروں کی سمت دیکھا وہاں رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ ایک چیئر تھی میں اسے اٹھا کر لے آیا۔

"اس بات سے میں بھی بے خبر ہوں۔۔۔ کیا سلوک کرنا چاہیئے کتاب کے ساتھ؟" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ارے برخوردار۔۔۔ اتنا دماغ مت کھاؤ میرا۔۔۔ مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانے کیلئے مجبور بھی مت کرو۔۔۔ میں تمہیں دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ تم جو نظر آتے ہو، اصل میں وہ ہو نہیں۔۔۔ سارا دن بدھا کی طرح سیڑھیوں پر آسن جمائے بیٹھے رہتے ہو۔۔۔ ابھی تک کوئی گیان حاصل ہوا کہ نہیں۔۔۔ اگر تمہیں بھی مجھے یہ سکھانا پڑے گا کہ "کتاب" کے ساتھ کیا رویہ رکھنا ہے تو مسز برگنڈی ہی ٹھیک ہیں۔۔۔ کم از کم وہ خاموش تو رہیں گی نا۔" وہ چڑ کر بول رہے تھے۔ میں چپ چاپ ان کی بات سنتا رہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی زود و رنج قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت دن بعد مجھے گرینڈ پا جیسا کوئی انسان ملا تھا۔ بہت دن کے بعد میرا دل کسی کو دوست بنانے کے لئے ہمک رہا تھا۔

"مجھے اس کام کے لئے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔ میں بلا معاوضہ کر دوں گا۔" میں نے عجلت میں کہا تھا مبادا وہ مجھے چلے جانے کے لئے کہہ دیں۔

"میرے خدا۔۔۔" انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا پھر لمحہ بھر کا توقف کر کے بولے۔ "مجھے معاف کر دو میں نے تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔۔۔ تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ میرا دماغ اور وقت خراب کرنے کا بے حد شکریہ۔"

وہ انتہائی غصے سے بولے تھے۔ پہلی دفعہ مجھے ان کا انداز برا لگا مگر مجھے خوف بھی آیا۔ میں ان کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے جناب! میں دراصل۔۔۔ میں۔۔۔" پہلی بار مجھے لفظوں کے انتخاب میں مشکل ہوئی۔

"محنت کی قیمت جھجک کر وصول کرنے والے ہمیشہ ناکام رہتے ہیں احمق لڑکے۔۔۔ قدرت نے جو تحائف تمہیں دے رکھے ہیں ان کی قدر پہچاننے میں سستی کا مظاہرہ مت کرو۔"

وہ جلدی ہی نرم پڑ گئے تھے۔ میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔

"میں تمہیں پانچ پاؤنڈز فی گھنٹا کے حساب سے دے سکتا ہوں۔۔۔ ہفتے میں تین دن جھاڑ پونچھ کرنی ہو گی۔ ان کی ترتیب درست کرنی ہو گی اگر کسی کتاب کے اوراق کو مرمت کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی کرنی ہو گی۔۔۔ بے ایمانی اور چوری ناقابل معافی ہو گے۔۔۔ منظور ہے؟"

"آپ برا نہ منائیے گا جناب لیکن یہ تجارت تو نہیں ہے کہ لین دین صرف رقم سے مشروط ہو۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے گھورا پھر گردن ہلائی اور مجھے مزید بولنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے پانچ پاؤنڈز نہیں چاہیے۔"

"تمہیں جو چاہیے وہ بتاؤ۔" انہوں نے مجھے اجازت دی۔ مجھے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ میری کتابیں مجھے اپنی محبوبہ کی طرح عزیز ہیں۔۔۔ یہ میں کسی کو نہیں دیا کرتا۔۔۔ تم یہاں بیٹھ کر جو چاہے لے لو لیکن میں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم انہیں یہاں سے نکال کر کہیں اور لے جاؤ۔۔۔" ان کا لہجہ قطعی تھا۔

"مجھے کتابیں نہیں چاہیے۔۔۔ میں یہیں بیٹھ کر پڑھ لیا کروں گا۔" دوسرا جملہ میں نے عجلت میں بولا۔ مبادا اسے وہ کتاب کی "شان" میں گستاخی ہی نہ سمجھ لیں۔

"اب بک بھی دو۔۔۔ تمہارا مطالبہ کیا ہے۔" وہ اکتا گئے تھے۔

"آپ مجھ سے میرے اس کام کے عوض تھوڑی باتیں کر لیا کریں گے۔۔۔ ہفتے میں ایک دفعہ۔۔۔ ایک گھنٹہ۔۔۔ پورا ایک گھنٹہ۔۔۔"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ انہوں نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا پھر ناگواری سے گھورا اور آخر میں ناک سکوڑ کر لمبی سانس بھری۔

"مانگ لی نا میری سب سے قیمتی چیز۔۔۔ میرا وقت۔۔۔ اتنی سی عمر میں ڈیلنگ ایسی ہے۔۔۔ بڑے ہو کر اچھے بزنس مین بنو گے۔۔۔ کیا یاد کرو گے تم بھی۔۔۔ منظور ہے۔"

وہ ذرا سا مسکرائے تھے اور میں بہت زیادہ۔

☆ ☆ ☆

"تم کہیں جا رہے ہو؟" کوہو نے مجھے باہر نکلتے دیکھ کر سوال کیا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ نجانے کیسے آج جلدی اٹھ گئی تھی۔ میں اپنا سب کام نپٹا کر مسٹر ایمرسن کی طرف جا رہا تھا جب اس نے مجھ سے سوال کیا۔ میں بہت عجلت میں تھا۔ مجھے مسٹر ایمرسن سے اس کتاب کو ڈسکس کرنا تھا جو انہوں نے مجھے کل پڑھنے کو دی تھی۔ وہ اب مجھے اپنی کتابیں گھر لے جانے کے لئے بھی دے دیا کرتے تھے۔ اس کتاب میں چند بہت دلچسپ تھیوریز کو ڈسکس کیا گیا تھا اور چونکہ میں انہیں واضح طریقے سے سمجھ نہیں پایا تھا اس لئے میں جلد از جلد مسٹر ایمرسن کے پاس جانا چاہتا تھا۔ مسٹر ایمرسن جن کا پورا نام نک ایمرسن برنارڈسن تھا ایک ادیب، محقق، مورخ اور پبلشر تھے۔ ان کے اور میرے درمیان ایک بات مشترک تھی وہ انسانوں سے اکتائے ہوئے تھے اور میں انسانوں کا ستایا ہوا تھا۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔ میں ان کی لائبریری کا کیئر ٹیکر بن گیا تھا۔ ان کی لائبریری میں کمیاب اور نادر کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ ابتداء میں مجھے کتابیں پڑھنے کا اتنا جنون نہیں تھا لیکن میرے پڑھنے کی رفتار اتنی تیز تھی اور مسٹر ایمرسن نے ابتداء میں مجھے چند کتابیں پڑھنے کو دی تھیں جو انہیں میں نے بہت جلد پڑھ کر واپس کر دیں جس سے وہ بہت خوش اور حیران ہوئے۔ پہلی بار انہوں نے مجھے ازراہ مروت اپنی کتابیں دی تھیں پھر وہ مطالعہ کو میرا جنون سمجھ کر خوشی خوشی یہ کام کرنے لگے اور میں نے بھی پہلی بار کتابیں صرف ان کا دل جیتنے کو پڑھنا شروع کی تھیں لیکن مجھے بھی دھیرے دھیرے اس کام میں مزہ آنے لگا۔

کوہو کا بلاوجہ و بلا ضرورت سوال اسی لئے مجھے بدمزہ کر گیا تھا۔

"کوئی کام ہے۔۔۔ مجھ سے؟" میں نے بنا اس کی جانب دیکھے سوال کیا تھا۔ وہ چپ رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ میں نے اپنا جیکٹ پہنا اور اس کے کالرز کو کانوں تک پھیلا کر باہر نکلنے لگا۔

"تم جہاں بھی جا رہے ہو۔۔۔ وہاں سے جلدی واپس آ جانا۔۔۔ تمہارا سامان پیک کرنا ہے۔"

وہ سابقہ انداز میں بولی جبکہ میں نا صرف حیران ہوا بلکہ عجب کشمکش و پیچ میں گھر گیا۔ کوہو کا شروع سے ہی یہی انداز تھا وہ مجھ سے اپنی مرضی سے مخاطب ہوتی تھی اور مرضی کی ہی بات کرتی تھی۔ پہلے میرا دل چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اب مجھے کہاں بھیجا جا رہا ہے لیکن جان بوجھ کر اسے چڑانے کے لئے میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

"اوکے۔۔۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" اس کے سامنے سے تو میں سپاٹ چہرہ لئے ہٹ گیا تھا لیکن دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی جیسے میرا دل بے چین ہوا تھا۔

"میرا سامان اب کیوں پیک کروایا جا رہا تھا۔" دروازے کے باہر سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔

"یہ دونوں عورتیں کب تک مجھے پنگ پانگ سمجھتی رہیں گی۔"

سیڑھیوں کے بعد اب سرخ روش شروع ہو گئی تھی۔ مسٹر ایمرسن کے سامنے بھی میں کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اپنا سب کام نپٹا کر میں جب میں اُن کے سامنے بیٹھا تو زیادہ دیر تک اس کھلاتے سوال کو اُن سے پوچھنے سے روک نہیں پایا تھا۔

"کیا بدقسمتی کا کوئی تریاق نہیں ہوتا؟" میرے لہجے سے رنجیدگی نا چاہتے ہوئے بھی ٹپک رہی تھی۔

"سنا ہے وہم کی بیماری لاعلاج ہوتی ہیں۔۔۔اور میری معلومات کے مطابق لاعلاج بیماریوں کے لئے کوئی تریاق نہیں ہوا کرتا۔"

وہ اپنے مخصوص چڑچڑے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس حاوی رہتا تھا کہ شاید وہ آپ کی باتوں کو ناپسند کر رہے ہیں لیکن مجھے اتنے دنوں میں ان کے ساتھ رہتے ہوئے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انکے چہرے کا یہ تاثر مستقل تھا اور تجربات زندگی کی دین تھا۔

"آپ بدقسمتی کو وہم کہہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔وہم کو بدقسمتی کہہ رہا ہوں۔" یہ بھی ایک مخصوص طنزیہ جملہ تھا مجھے باور کروانے کے لئے کہ جب بات واضح ہے تو بلا وجہ سوال کی کیا ضرورت تھی۔

"تم جانتے ہو تمہارا مسئلہ کیا ہے۔" وہ میری جانب متوجہ تھے۔وہ ایک گھنٹہ جو وہ مجھے میری خدمات کے معاوضے کے طور سے مجھے دیتے تھے اس میں وہ کسی استاد کی طرح مکمل نیک نیتی سے مجھے برداشت کرتے تھے۔

"قدرت نے تمہیں چھوٹی عمر اور بڑا دماغ دے دیا ہے۔۔۔تم قدرت کی اس مہربانی پر شکر گزار ہونے کی بجائے اسی سے انتقام لینے پر تُل گئے ہو۔اتنا مت خرچ کرو اس دماغ کو۔۔۔آئندہ بہت مرحلے آنے ہیں اس کام کے لئے۔"

ایک بار پھر وہی مخصوص ناگوار انداز،ناصحانہ الفاظ۔مجھے بھی ہمیشہ کی طرح غصہ آیا۔

"آپ خود بھی بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کا دماغ بھی۔۔۔آپ کی ساری جنریشن کا یہی مسئلہ ہے کہ جو چیز آپ لوگوں نے اپنی ذات پر نہیں برتی ہوتی آپ اسے "وہم" قرار دے دیتے ہیں لیکن مسٹر ایمرن لازمی نہیں کہ جو چیز آپ نے زندگی میں کبھی تجربہ نہ کی ہو وہ صرف وہم ہی ہو۔ہم زندگی کو جس رنگ کے شیشوں کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں زندگی اسی رنگ کی نظر آتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ باقی رنگ ہیں ہی نہیں یا پھر ہمارا وہم ہیں۔آپ کسی پیدائشی اندھے شخص سے پوچھیں کہ تاریک رات کے اس پار کیا ہوتا ہے تو وہ یہی جواب دے گا کہ مزید تاریک رات۔اسے بھی آپ اس کا وہم قرار دیں گے؟"

میں نے ان سے سوال کیا تھا۔میرا انداز جارحانہ ہو گیا تھا۔ان کی عینک ان کی نوکیلی ناک کے آخری سرے پر تھی اور وہ مکمل طور پر اخبار میں منہمک نظر آنے کی اداکاری کر رہے تھے۔

"اندھا نہیں جانتا کہ رات کے بعد دن بھی ہوتا ہے کیونکہ اس نے کبھی دن دیکھا نہیں ہوتا۔۔۔اس لئے ہم اسے "وہمی" نہیں کہہ سکتے۔۔۔وہ بدقسمت ہوتا ہے مسٹر ایمرن۔۔۔بدقسمت۔۔۔"

میں نے آخری لفظ پر اپنی ساری قوت لگا دی تھی۔انہوں نے گردن ہلائی۔

"تم تو بہت ذہین ہو گئے ہو۔" وہ بظاہر مجھے سراہ رہے تھے۔

"چلو مان لیتا ہوں کہ اندھا شخص بدقسمت ہوتا ہے۔۔۔لیکن کیا تم اندھے ہو؟" یہ انکا پہلا سوال تھا۔انہوں نے آنکھوں سے عینک اتاری تھی۔

"تم کسی اور معذوری کا شکار ہو۔۔۔گونگے ہو یا بہرے۔۔۔لولے لنگڑے یا کسی دائمی مرض کا شکار ہو۔"

عینک کے شیشوں پہ ان کا عکس دھندلا ہونے لگا تھا۔

"قدرت نے تمہیں مکمل، تندرست اور ایک جائز بندھن کے نتیجے کے طور پر دنیا میں بھیجا ہے۔ کسی بھی انسان کی خوش قسمتی کی اس سے بڑی دلیل کوئی نہیں ہو سکتی کہ قدرت اس کی اتنی معاونت کرے۔۔۔ یہ ذرا میری عینک صاف کرو۔"

بات کرتے کرتے انہوں نے اپنی عینک مجھے تھما دی تھی۔ میں اپنے رومال سے اسے صاف کرنے لگا۔

"اس لئے خود کو بدقسمت کہہ کر قدرت کو زیر کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔۔۔ تم یہ کام نہیں کر سکتے۔"

ان کا انداز قطعی تھا اور میرا موقف بھی سو میں نے پر عزم ہو کر ان کے عینک ان کی جانب بڑھائی اور چوکس ہو کر میدان میں اتر آیا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔۔۔ میں نے وہ کام کرنا ہی ترک کر دیئے ہیں جو میں نہیں کر سکتا یا اچھے طریقے سے نہیں کر سکتا لیکن جو کام میں اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں۔۔۔ وہ تو میں ضرور کروں گا۔"

"اچھا۔۔۔ میں بھی تو سنوں کہ تم کونسا کام اچھے طریقے سے کر سکتے ہو۔"

انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ اور ناک پر عینک رکھ لی۔ ہاتھ میں جو کتاب تھی وہ بھی کرسی کی آرم پر اوندھی رکھ دی۔

"بحث۔۔۔ کم از کم یہ میں کر سکتا ہوں مسٹر ایمرسن۔"

"تمہارے پاس بمشکل تیس منٹ باقی ہیں۔۔۔ کام کی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ جاؤ یہاں سے۔"

انہوں نے دوبارہ کتاب کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ یہ ان کا نفسیاتی حربہ تھا۔

"کیا واقعی "بدقسمتی" صرف ہمارا وہم ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا تھا۔ انہوں نے زچ ہو کر گہری سانس بھری۔

"میرا موقف تو کم از کم یہی ہے کہ "بدقسمتی" صرف وہم ہوتی ہے۔ تم خود سوچو قدرت ایک دنیا بناتی ہے، اسے محبت سے تخلیق کرتی ہے، اسے نعمتوں سے برکتوں سے مالا مال کرتی ہے۔ اپنی مخلوق کے لئے ہر آسانی عطا کرتی ہے۔ اس کا مطمع نظر کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی مخلوق کو پریشان کرے اسے دکھ دے یا اس کی بے چینی کا باعث بنے۔ یہ کام حضرت انسان خود کرتا ہے۔ اس دنیا میں جتنی کشمکش ہے، جتنی بے سکونی ہے وہ ہماری یعنی انسان کی پیدا کردہ ہے۔ بدقسمتی بھی اسی بے سکونی کا نام ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لئے رکے پھر بولے۔

"قدرت نے اسے تخلیق نہیں کیا۔۔۔ اس نے تقدیر لکھی ہے۔۔۔ چلو تم اسے قسمت کہہ لو۔۔۔ ایک بات ذہن نشین کر لو۔۔۔ قدرت آپ کی "تقدیر" کو آپ کی آسانی کے لئے لکھتی ہے۔ یہ پاؤں کی بیڑی ہے، ہتھکڑی نہ زنجیر، یہ وہی ہے جو آپ ہیں یعنی آپ کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے قدرت جس حفاظتی پرت سے آپ کو ملفوف کر دیتی ہے اسے "تقدیر" کہتے ہیں۔ قدرت آپ کو جس "تقدیر" کا تحفہ دیتی ہے۔۔۔ یقین کر لو وہی "مناسب ترین" ہوتی ہے۔ ایک عمدہ موزوں لباس کی طرح۔۔۔ آپ کسی اور کے لباس میں اتنی آسانی سے نہیں سما سکتے جتنا کہ خود اپنے لباس میں۔۔۔ اس لئے اسے قدرت کا دان سمجھو۔۔۔ عطا۔۔۔ مہربانی۔۔۔ یہ بندش نہیں ہے کہ اس کا توڑ ڈھونڈا جائے، یہ بیماری نہیں ہے کہ اس کا تریاق مانگا جائے۔ فرض کرو قدرت انسان کو اپنے ہاتھوں سے تقدیر لکھنے کا موقع دے دیتی تو کیا ہوتا۔۔۔ دنیا کا اس سے برا حال ہو جاتا جو اب ہے۔ انسان تو آزادانہ طور پر اپنی

خوراک کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ دوپہر کو کیا کھا رہا ہے تو شام کو کیا کھائے گا۔۔۔کل کیا کھائے گا۔۔۔کل کے بعد کیا کھائے گا۔۔۔یہ قدرت کا کام ہے میرے بچے۔۔۔اُسے کرنے دو۔"

وہ ایک بار پھر رکے اور چند گہری سانسیں بھریں۔

"میں یہ مانتا ہوں کہ تقدیر کے دو پہلو ہیں۔۔۔اچھی تقدیر۔۔۔جب آپ اپنی تقدیر پر ہنسی خوشی قانع ہو جائیں تو یہ اچھی تقدیر ہے اور جب آپ اپنی تقدیر پر قانع نہ ہوں اور وہ بد و مخالفت پر اتر آئیں تو یہ بری تقدیر بن جاتی ہے۔

"قدرت کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔۔۔مقابلہ اپنے برابر والوں سے ہوتا ہے۔قدرت پر راضی ہوا جاتا ہے۔اس کی لکھی تقدیر پر قانع ہوا جاتا ہے۔یہ بات تم جتنی جلدی سمجھ لو اتنا اچھا ہے۔میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ قدرت آپ کو مکمل پیدا کرے اور ایک ایسے بندھن کے نتیجے میں پیدا کرے جو جائز ہو تو یہی اس کی آپ پر سب سے بڑی مہربانی ہے۔اس مہربانی پر شکر ادا کرنا سیکھو۔۔۔قانع ہونا سیکھو۔۔۔تقدیر کو اوڑھنی بچھونا نہیں ،اسے پشت پر نہیں بہادروں کی طرح سینے پر رکھو۔۔۔تقدیر کو "زیر" نہیں "زبر" کرنا سیکھو۔"

ان کا انداز ہمیشہ کی طرح مدلل اور مفصل تھا۔مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا لیکن ان کے کہنے کے مطابق تقدیر کو زیر کیسے کرنا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہو۔۔۔تمہاری زندگی میں کچھ مشکلات ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کہ تم اس وہم کا شکار ہو جاؤ کہ تم بدقسمت ہو۔۔۔یہ تو ایسا ہی ہے کہ تم اپنی ناکامی پر اپنے ہاتھوں سے ماتھے پر "بدقسمتی" کا ٹیگ لگا لو اور اس کے بعد خود کو کوسنے کی بجائے قسمت کو ،تقدیر کو کوستے رہو۔۔۔اس سے تم کامیاب نہیں ہو جاؤ گے۔کامیابی کے پیچھے صبر آزما محنت درکار ہوتی ہے۔تم کامیاب عظیم لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے دیکھو۔۔۔ہر شخص مشکلات سے دوچار رہا،نبرد آزما رہا۔۔۔جیسس کرائسٹ سے لے کر نیوٹن،آئن سٹائن تک ہر شخص کی زندگی میں مشکلات تھیں لیکن آج کی دنیا ان کا نام کامیاب انسانوں کے طور پر لیتی ہے۔تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔تم اچھے لڑکے ہو۔۔۔تم میں بہت صلاحیتیں ہیں۔۔۔میں نے تمہیں آزما لیا ہے۔۔۔تمہاری انگلیوں میں لفظوں کے خزانے دفن ہیں۔۔۔تم ابھی اس سے بے خبر ہو۔۔۔وقت آنے پر اس خزانے کو دل کھول کر استعمال کرنا۔۔۔تم خود کو بدقسمت کہنا چھوڑ دو گے۔۔۔شرط صرف یہی ہے کہ شارٹ کٹ مت تلاش کرو۔۔۔محنت کرو اور۔۔۔تقدیر پر قانع ہونا سیکھ لو۔"

انہوں نے گھڑی دیکھی اور کتاب دوبارہ اٹھالی۔ایک گھنٹہ پورا ہونے میں ایک منٹ ہی باقی تھا۔

"مزید کچھ پوچھنا ہے تمہیں؟" یہ انہوں نے منہ سے نہیں کہا تھا لیکن ان کا انداز مجھے سمجھ میں آ رہا تھا۔

"تقدیر پر قانع ہونے کا کوئی تریاق ہے؟" میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔وہ گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہاں۔۔۔سوئمنگ کیا کرو۔"انہوں نے کہا اور کتاب میں گم ہو گئے۔ایک گھنٹہ ختم ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ دین سکھادیں گے نا مجھے؟"

احمد معروف کے لہجے میں آس ہی نہیں کرب بھی تھا۔ وہ بہت دھیمی آواز میں ہر لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ نور محمد کو اس پر غصہ نہیں آیا۔ احمد معروف پر غصے کا اثر ہوتا بھی نہیں تھا۔ نور محمد کو اس پر ترس آیا۔ وہ کیسا اونچا لمبا سا شخص تھا، دیکھنے میں توانا بھی تھا مگر نا جانے کس کس کا ستایا ہوا تھا کہ جب اپنے مخصوص لہجے میں نیلی آنکھوں کو جھکا کر التجائیہ انداز میں بات کرتا تو منہ سے لفظ جلتی موم بتی کے موم کی طرح پگھل پگھل کر نیچے گرتے۔ ان لفظوں کو ہاتھ لگاتے بھی نور محمد کو ڈر لگتا تھا کیونکہ موم گرم بھی ہوتا ہے لیکن پھر نور محمد کو ترس آنے لگتا کیونکہ موم ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔

"آپ نماز سیکھنا چاہتے ہیں؟" موم ہی ٹھنڈا نہیں ہوتا، انسان کا مزاج بھی ٹھنڈا ہو جایا کرتا ہے۔ نور محمد کے لہجے میں نرم سی ٹھنڈک اتری تھی۔ خدا ترسی مزاج کو نرم کر ہی دیا کرتی ہے

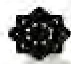
"میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔۔۔ نماز آتی ہے مجھے" احمد معروف نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اسکی مسکراہٹ میں بھی ہچکچاہٹ پنہاں تھی۔

"آپ قرآن پڑھنا چاہتے ہیں؟" نور محمد نے دوسرا سوال کیا تھا۔

"وہ تو پڑھ چکا ہوں میں" احمد اب اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ نور محمد نے ناسمجھی کے عالم میں اسکا چہرہ دیکھا۔

"نماز آپکو آتی ہے، قرآن آپ پڑھ چکے ہیں۔۔۔ تو پھر مجھ سے کیا سیکھنا چاہتے ہیں آپ" وہ تذبذب میں گھر کر پوچھ رہا تھا۔ اسے معمے حل کرنے نہیں آتے تھے؟

"کیا دین میں نماز قرآن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟" احمد نے سر اٹھائے بنا پوچھا تھا۔ نور محمد اسکے سوال پر ششدر رہ گیا تھا۔



"چھپ چھپ چھپ" پانی کی بوچھاڑ اڑی تھی۔ اس کی ناک ہی نہیں آنکھوں اور کانوں میں بھی پانی اپنا وجود منواتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ اسے لگا وہ ڈوب رہا ہے۔ منہ اور ناک میں گدلے پانی کا ذائقہ اور خوشبو ایک ساتھ گھسے تھے۔ اسکے ارد گرد آوازیں تھیں مگر پھر بھی اسے صرف اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔

"پانی سے ڈرتے ہو" کسی نے بتایا تھا یا شاید پوچھا تھا پھر اسکا ہاتھ تھام لیا گیا۔

"پانی تو زندگی ہے۔ زندگی سے ڈرتے ہو" اسے سیدھا کھڑے ہونے میں مدد دی گئی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ پانی بمشکل اسکے کندھوں تک آ رہا تھا لیکن اسکے قدموں تلے نرم نرم چکنی مٹی تھی جو پھسلتی جاتی تھی۔ نرم مٹی سے اس مٹی کے باوے کا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اس نے سر مجید کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اسکی آنکھیں اب ٹھیک سے دیکھ سکتی تھیں۔ پانی کے اوپر کی دنیا کتنی طاقتور تھی۔ وہ احساس دلاتی تھی کہ زندگی ابھی قائم و دائم ہے چلتی پھرتی ہے۔ وہ زندہ تھا۔ اسے زندگی کے اس احساس سے توانائی ملی تھی۔ زندگی صرف توانائی کا احساس نہیں دلاتی اس کے ساتھ مزید بھی اور چیزیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ اسے شرمندگی ہوئی۔ اسے اس درجہ خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ بڑی ہتک والی بات تھی۔

"میں ڈوب رہا تھا سر" اس نے جھینپ مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے سر مجید کی شکل دیکھی۔

"تم نہیں ڈوب رہے تھے۔۔۔۔ صرف تمہارا دل ڈوب رہا تھا احمق" انہوں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر اس نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

"اپنے دل کو کبھی خوف کے حوالے نہیں کرنا چاہئے ورنہ یہ آپکا خدا بن جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے "خوف" بھی شرک کی ایک قسم ہے"

وہ اسے جھڑک رہے تھے۔ وہ مزید شرمندہ ہوا مگر اس نے انکا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ پانی میں اترنے کا اسکا پہلا تجربہ تھا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اکیڈمی کی بجلی فیل ہو گئی تھی۔ گرمی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن نئی ٹرم کی ابتدا تھی سب لڑکے پڑھائی کے معاملے میں لاپرواہ سے ہو رہے تھے سو سب نے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ سر مجید اور سر امتیاز سب کو گھیر گھار کر پکنک منانے لے آئے تھے۔ موسم میں بے پناہ حبس تھا۔ ہوا کسی مجسمے کے سانس کی طرح ساکن تھی۔ نہر کا پانی اسی لئے ماں کی ممتا کی طرح مہربان محسوس ہوتا تھا۔ اسے یہاں آنا بہت اچھا لگا۔ سب ہی ہاؤ ہو مچانے میں مگن ہو گئے تھے کیسا عجیب سا گنگناتا ہوا سکون تھا وہاں کہ دل چاہتا تھا وہیں کے ہو کر رہ جاؤ اسی لئے سب ہی لڑکے بے قابو ہو کر اسکی آغوش میں پناہ لینے دوڑ پڑے تھے۔

وہ شاید اکیلا ہی تھا جو چھوٹے معصوم بچوں کی طرح ایک جانب کھڑا رہا تھا۔ دل میں خواہش تو تھی کہ پانی کے ایسے لمس کو محسوس کرے مگر خوف بھی تھا کہ کپڑے گیلے نہیں ہونے چاہئیں ورنہ ابو ناراض ہوں گے کہ وہ کیوں سب کے ساتھ نہر پر چلا گیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبا منہمک کھڑا تھا جب سر امتیاز کے اشارے پر سر مجید نے اسکا ہاتھ تھام کر یکدم ہی پانی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

وہ اسکا ہاتھ تھامے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانی میں چکنی مٹی ہی نہیں تھی بلکہ پتھر بھی تھے جو پاؤں میں چبھتے تھے تو

گدگدی ہوتی تھی۔

"بزدل مت بنو، بزدل مرد برا ہی نہیں لگتا بے شرم بھی لگتا ہے۔ بزدلی مرد کو مقابلہ کرنے سے پہلے ہی پچھاڑ دیتی ہے اور اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ مرد ایسی چیز سے مار کھا جائے جو اللہ نے اسکی فطرت میں رکھی ہی نہیں ہے۔ اللہ نے کچھ چیزیں مرد کے لئے نہیں بنائی میں بزدلی ان ہی چیزوں میں سے ایک ہے۔ اسے بہادر مرد اچھے لگتے ہیں۔ وہ پسند کرتا ہے کہ مرد اس کے علاوہ صرف اپنے آپ سے خوفزدہ ہو، صرف اپنے آپ سے شرم کھائے۔۔۔ جانتے ہو کیوں۔۔۔ اس لئے کہ جو مرد دوسرے انسانوں سے شرمانے سے پہلے خود سے شرمالے تو پھر وہ نڈر ہو جاتا ہے پھر اسے اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہیں ستاتا"

وہ اسکا ہاتھ تھام کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔

"بے خوفی مرد کے لئے سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی لگام ہے جو سرکش گھوڑے جیسے پانی کو بھی انسان کا مطیع بنا دیتی ہے۔ پانی انسان کو بڑے سبق پڑھاتا ہے"

وہ اسے آج ایک نیا سبق پڑھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ آگے چلنے میں بھی مدد دے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے وہ زیادہ گہرائی والے حصے میں جائے۔ اسے پہلی بار اس کھیل میں مزا آیا تھا۔

"تم ڈوبو گے نہیں میرے دوست، ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے اور تمہیں تو پورا جہاز ڈول گیا ہے" یہ جنید نے کہا تھا اسکا اشارہ سر مجید کی طرف تھا۔ وہ کہنے کے ساتھ ہی ناک کو دائیں ہاتھ کی انگلی سے دباتا ہوا پانی میں گھس گیا تھا۔ سر مجید سے سب ہی لڑکے کافی بے تکلف تھے۔ سر نے جنید کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔

"پانی میں پہلی بار اترو اور یہ سوچ کر اترو کہ اس کو تسخیر کرنا ہے تو پھر اسکو نظر انداز مت کرو۔ یہ وہ پہلا اصول ہے جو پانی کو زیر کرنے میں آپ کے کام آتا ہے۔ آپکی ساری توجہ پانی پر ہونی چاہئے۔ پانی کو اہمیت دو اسکی عزت میں کمی نا کرو کیونکہ یہ آپ کا ہی جزو ہے۔ مٹی میں اللہ پاک نے پانی ملایا تو انسان وجود میں آیا"

وہ بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوا رہے تھے۔ اسکا دل لمحہ بھر کے لئے پھر غیر معمولی رفتار سے دھڑکا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کچھ قرآنی آیات کا ورد کیا تھا۔ وہ اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ نہر کے پانی میں طغیانی نہیں تھی اور اتنی گہرائی بھی نہیں تھی مگر اسکا دل سر کی اتنی باتیں سن کر بھی بہادری کے درجے پر فائض نہیں ہوا تھا۔

"سر آج بس آپ اس بھیڑو کو ہی لیکچر دیتے رہیں گے یا ہمیں بھی کوئی توجہ دیں گے" جنید ایک بار پھر سطح آب پر ظاہر ہوا تھا۔

سر مجید نے ابھی بھی اسکی جانب دیکھا تھا نا اسکی بات کا جواب دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پانی گہرا ہونے لگا تھا۔ کندھوں سے منتقل ہوتی نمی گردن تک پہنچی تھی پھر وہ اسے اپنے کانوں تک محسوس کرنے لگا تھا۔

"اپنے آپکو پانی کے حوالے کر دو۔۔۔ یہ دیکھو۔ ایسے" سر مجید نے یکدم پینترا بدلا تھا۔ وہ ذرا سا اوپر ہوئے تھے اور خود کو پانی کے سینے پر

رکھ دیا تھا پھر انہوں نے بازو پھیلا کر انہیں چپوؤں کی طرح چلانا شروع کیا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے تیرنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں اپنے گرد "دائرہ" بناتے دیکھا

"پانی پر قابض ہونے کے لئے اس کو اپنا آپ پیش کرنا پڑتا ہے، اپنا آپ اسکو سونپنا پڑتا ہے۔۔۔ایسا کرنیوالوں کو پانی اچھالتا نہیں ہے بلکہ سنبھال لیتا ہے"

وہ اس کے عقب میں تھے۔ انکی بات کو سننے کے لئے وہ بہت احتیاط سے انکی جانب مڑا تھا۔ مٹی پھر اسکے قدموں کے نیچے سے سرکی تھی وہ پھر پانی کے شکنجے میں پھنسنے لگا تھا۔ اس کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی تھی۔ دل جیسے کسی نے زور سے دبا ڈالا تھا۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ پہلی دفعہ کا تجربہ یہ دوسری دفعہ سے زیادہ خوفناک تھا۔

"میں نے کہا نا خود کو پانی کے حوالے کر دو۔۔۔یہ پانی بہت بے ضرر ہے۔ اسکی نرمی کو محسوس کرو۔ اسکی رضا کا خیال رکھو" سر مجید فوراً اس کے قریب آئے تھے لیکن انہوں نے اسکو سہارا نہیں دیا تھا۔

وہ اپنے ڈوبتے حواسوں پر بمشکل قابو پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسکی ہمت اتنی ہی تھی بس۔ اسے پھر سر کی باتیں بھولنے لگی تھیں۔

"اپنے اعصاب کو پرسکون ہونے دو۔۔پانی میں ممتا والی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ انسان کو اپنی بانہوں میں لے کر لوری سنا سکتا ہے لیکن انکو جنہیں پانی کی فطرت سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے" وہ مسلسل بول رہے تھے۔ انہوں نے پھر اسکا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اسے حوصلہ ملا لیکن لمحہ بھر کا کھیل تھا انہوں نے پھر اسکا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"سر پلیز پلیز۔۔۔میرا ہاتھ مت چھوڑیں" اس نے التجاء کی تھی۔

"شٹ اپ۔۔چیونٹی بھی پانی میں گر جائے تو ہاتھ پاؤں ہلانا سیکھ جاتی ہے۔۔۔تم اس سے بھی گئے گزرے ہو گیا۔۔ڈرپوک۔۔مرو گے نہیں تم۔۔۔اور اگر یہاں لکھی ہے تمہاری تو بچو گے نہیں تم۔۔۔موت کا وقت اور جگہ مقرر ہوتی ہے۔ اسے ٹالا یا روکا نہیں جا سکتا۔ یہاں آنی ہوئی تو یہیں آ کر رہے گی۔ میں اس سے درخواست نہیں کر سکوں گا کہ بی بی آج بچہ راضی نہیں ہے، کل پرسوں آجانا" وہ اسے جھڑک کر بولے تھے۔

اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی ہمت مجتمع کی تھی۔ وہ سر کے ساتھ ساتھ گھومنے لگا تھا۔ اس کا دل لرز رہا تھا مگر وہ اس کی جانب سے لاپرواہ ہونے لگا۔ وہ چیونٹی سے تھوڑا سا زیادہ بہادر تو تھا۔ وہ سر کے سامنے مزید شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"شاباش۔۔بالکل ٹھیک۔۔۔پانی کو شریک مت سمجھو۔۔۔اس کے ساتھ دوبدو مت ہو۔۔" انکی ہدایات جاری تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے پانی کے سحر میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اس نے سینہ تان کر چند قدم بھرے تھے۔ وہ بازوؤں کو پھیلانا سیکھ رہا تھا پھر اس نے یکدم اپنا آپ پانی کے حوالے کر دیا تھا، اسکے پنجے گیلی مٹی سے اوپر اٹھ رہے تھے۔

"پانی کی فطرت میں بظاہر عاجزی ہے یہ آپ کے ساتھ دوبدو مقابلہ نہیں کرتا لیکن آپکو ایک بار اس کے سامنے اپنی "میں" مارنی پڑتی ہے خود کو اس کے سپرد کرنا پڑتا ہے، اپنے آپکو اسکے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے سینے پر عاجزی سے قدم دھرنا پڑتا ہے کہ یہ لے تو اگر انسان سے بڑا

سورما سمجھتا ہے خود کو تو مجھے کرے تسخیر، مجھے اپنے بس میں کر سکتا ہے تو کرے۔۔۔ پانی کو بس اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ انسان میری موت کرتا جاتا ہے یا نہیں۔ اسے میری حرمت کا پاس ہے یا نہیں کہ اللہ نے مٹی میں مجھے ملایا تو اسے بنایا۔ وہ انسان کی اس ادا سے مسرور ہو جاتا ہے۔ انسان کی خود سپردگی اسے پاگل کر دیتی ہے پھر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور خود کو انسان کے حوالے کر دیتا ہے"

سر مجید کی باتوں نے اس کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ وہ واقعی پانی کے مہربان لمس کو پورے ارتکاز کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے پہلی بار ڈر نہیں لگا تھا، اس نے بہت آہستگی سے اپنے پاؤں گدلی مٹی سے بالکل علیحدہ دکھتے تھے پھر اپنے بازو واہ کر کے وہ پانی سے ہم آغوش ہونے لگا تھا۔ یہ مشکل نہیں، بہت مسرور کن تھا۔ اس نے پانی کو اپنی سب سے قیمتی چیز دے دی تھی۔ اس نے پانی کو اپنا آپ دے دیا تھا۔

پانی نے اسے کیا دیا تھا۔

پانی نے اسے عاجزی کا وہ سبق پڑھانا شروع کیا تھا کہ جس کو سیکھنے کے لئے انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا۔ ایک ایسی چیز جو خدا کے پاس نہیں اور وہ انسان سے اسکی تمنا کرتا ہے۔۔۔ عاجزی۔۔۔

پانی آپکو عاجزی نہیں سکھاتا۔۔۔ وہ سکھاتا کہ عاجز ہو جانے میں دراصل کیسی کشش ہے کیا مزا ہے۔

پانی آپکو سکھاتا ہے کہ سربسجودگی میں کس قدر آسودگی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ اوائل اکتوبر کی ایک خوبصورت شام تھی۔ شام بھی کیا تھی، مہک مہک کر چلتی، دھیرے دھیرے ڈھلتی رات بن رہی تھی۔ آٹھ بج رہے تھے لیکن ابھی بھی مکمل تاریکی نہیں چھائی تھی یہ اہلِ لندن کے لئے قدرت کا ایک خاص تحفہ ہے۔ یہاں سورج کم کم درشن دیتا ہے۔ سردیوں میں بالخصوص آسمان بادلوں کی اتنی مضبوط چادر اوڑھ لیتا ہے کہ سورج جیسا سورما بھی اس میں شگاف نہیں ڈال سکتا اور اس کا بدلہ سورج یوں لیتا ہے کہ جب ظاہر ہو جاتا ہے تو آسانی سے اپنے اثرات غائب نہیں ہونے دیتا۔ جس طرح ایک نیک آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح لندن میں رات ہو جانے کے بعد بھی سورج کی روشنی باقی رہتی ہے۔ تاریکی کو اپنا راج پاٹ قائم کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔

وہ بھی اکتوبر کی ایک شام تھی سو خوبصورت تھی۔ معمول کے مطابق آسمان پر پیلے، نیلے اور سرمئی رنگوں کی امتزاج بکھرا تھا۔ سردی بھی اوقات میں تھی اور گرمی بھی، موسم بے حد معتدل تھا جو طبیعت کو بھلا لگ رہا تھا۔

امائمہ کو چھ ماہ گزارنے کے بعد یہ احساس ہو گیا تھا کہ لندن کی فطرت میں آوارگی ہے۔ شہریت، مذہب، قومیت کی تخصیص کے بغیر سب لوگ تفریح پر جانا پسند کرتے تھے اسی حساب سے یہاں آؤٹنگ اٹریکشنز تھیں جیسے میوزیم، پارکس، پلے لینڈز، آرٹ گیلریز، تھیٹرز غرض دیکھنے کے لئے اتنا کچھ تھا کہ وہ حیران ہو جاتی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود لوگ ان چیزوں سے اکتا جاتے تھے اور پھر ایک اور چیز تھی جو ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتی تھی۔ سپر مارکیٹس، سپر اسٹورز، شاپنگ مالز، بیوٹی کلینکس اور فیشن ہاؤسز کی یہاں بھرمار تھی۔ سیاحوں کے لئے یہ جگہ کسی ونڈرلینڈ سے کم نہیں تھی مگر سیاحوں کی یہ جنت بے حد مہنگی تھی سو وہ لوگ جن کا تعلق ترقی پذیر قوموں سے تھا وہ یہاں رہتے تھے تو بچت کے کچھ درمیانی راستے بھی

انہوں نے ڈھونڈ نکالے تھے۔ وہ لوگ شاپنگ مالز میں جاتے تھے، گھومتے تھے اور بغیر شاپنگ کیے واپس آجاتے تھے کیونکہ ایسی جگہوں پر شاپنگ کرنا صرف ادب یہی عرب شیوخ کا حق تھا۔ امائمہ کو اب سمجھ میں آیا تھا کہ عربوں کو دراصل "اربوں" لکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ اس نے دیکھا کم لیکن سنا بہت تھا کہ عرب شیخ ایک پرفیوم کی ننھی سی شیشی خریدنے پر سینکڑوں پاؤنڈز بہت آرام سے خرچ کر دیتے ہیں۔ اربوں کی پراپرٹی عربوں کے لئے بہت عام سی بات تھے۔ یہی عرب شیوخ کی یہاں ذاتی پراپرٹی تھی۔ مہنگے مہنگے اسٹورز پر عربوں کا رش اور عربوں کا ہی روپیہ نظر آتا تھا۔ ماس کمیونیکیشن میں اس نے پرنٹ میڈیا میں اسپیشلائزیشن کی تھی۔ اسے ان چیزوں میں بہت دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ عمر کو اس طرح کی چیزوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ امائمہ کی خاطر ایسی کتابیں اور میگزینز ڈھونڈ کر لاتا رہتا تھا جن میں یہاں کے معاشرتی مسائل اور سماجی زندگی کے متعلق تفصیلات ہوتی تھیں اس نے امائمہ کو پبلک لائبریری کا روٹ بھی سمجھا دیا تھا لیکن وہ اکیلی کہیں آتے جاتے کتراتی تھی ابھی جبکہ عمر اسے آتے جاتے روٹس کے متعلق سمجھاتا رہتا تھا جس میں وہ قطعی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ عمر چاہتا تھا کہ وہ اتنی خود مختار ہو کہ کہیں بھی جانا چاہے تو آجا سکے لیکن چھ ماہ گزر جانے کے بعد بھی امائمہ ابھی تک اتنی سوشل نہیں ہو پائی تھی کہ اطمینان سے ممی کے گھر کے علاوہ کہیں جانے میں دلچسپی لیتی۔ وہ ہمیشہ عمر کے ساتھ جانے میں خوش رہتی تھی حالانکہ انکی دلچسپیاں اور شوق مختلف تھے عمر فلم تھیٹر کا دلدادہ تھا۔ اسکی دلچسپی آرٹ میں تھی۔ اسے جب وقت ملتا تھا وہ پنسل لے کر بیٹھ جاتا تھا اسے اسکیچنگ میں مزا آتا تھا۔ اس نے امائمہ کو بطور خاص چند اچھی آرٹ گیلیریز بھی دکھائی تھیں لیکن وہ اخبار یا کتاب پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اخبار میں اسے صرف کھیل کے صفحے میں دلچسپی ہوتی تھی یا وہ ان اشتہارات کو شوق سے پڑھتا تھا جن میں نئے نئے ڈرامہ اور تھیٹر کی پبلسٹی ہوتی تھی۔ ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی ایسی تھی کہ ایک دوسرے کی خاطر وہ ایک دوسرے کی دلچسپیوں میں دلچسپی لے ہی لیا کرتے تھے لیکن ہرے بھرے خوبصورت وسیع و عریض پارکس میں چہل قدمی کرنا ان دونوں کو ہی مرغوب تھا۔ گھنٹوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ لمبے لمبے راستوں پر بغیر تھکے اور اکتائے چل سکتے تھے۔ دو سو ایکٹر یا اس سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلے لندن شہر کے پارکس دنیا جہاں کی دلچسپیاں لئے ہوئے تھے۔ ان دلچسپیوں میں عمر اور امائمہ کو سب سے زیادہ پسند ان پارکس میں بنے انتہائی خوبصورت اور حیران کن راستوں یعنی واک اوے پر ٹہلنا تھا۔

رچمنڈ پارک میں وہ پہلے بھی آچکے تھے اور اب بھی امائمہ کی فرمائش پر عمر اسے یہاں لایا تھا۔ رچمنڈ کے علاقے کی خوبصورتی یہ بھی ہے کہ اس کے دو طرف دریائے ٹیمز لگتا ہے۔ دریائے ٹیمز سے چھوٹے چھوٹے تالاب ٹائپ نہریں ان گزرگاہوں سے گزرتی تھیں جن پر پل بنے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے پل بے حد قابل ستائش تھے۔ امائمہ اور عمر بھی اس وقت جب سورج کی روشنی مورچوں سے بھاگ رہی تھی۔ ایک پل پر سے دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ وہ دونوں نسبتاً کم رش تلاش کرتے اس طرف آئے تھے اور پھر ایک جگہ رک کر نیچے جھانکنے لگے۔

"میں نے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایسی زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔"

عمر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ موسم اور ماحول دونوں ہی طبیعت کو بشاش کرنے میں سازگار ثابت ہوتے ہیں اور اگر من چاہا ساتھی ساتھ ہو تو دل جھوم جھوم کر پورے وجود پہ خوشگوار اثرات مرتب کر دیتا ہے۔ پانی گدلا تھا مگر اس وقت وہ بھی بھلا لگ رہا تھا۔

"تم ہمیشہ سے میرے خواب دیکھ رہے ہو کیا؟" امائمہ نے مسکراتے ہوئے اسے چڑانا چاہا۔

"آف کورس مائی ڈیئر۔۔ میرا اور تمہارا تعلق ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے ہے۔ سنا ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے آسمانوں پر ہماری روحیں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہیں۔"

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ مجھے تمہارے اس کن انیس سو ایک کے ڈائیلاگ پر یقین کر لینا چاہیئے۔" اس کی جانب دیکھتے ہوئے امائمہ ابھی بھی شرارت کے موڈ میں تھی۔

"اوئے۔۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے اس کی جانب مڑا پھر لہجے پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"یہ ڈائیلاگ نہیں ہے۔۔ میرے دل کی آواز ہے ظالم لڑکی۔"

"اچھا۔۔ تمہارے دل کی آواز میرے بارے میں اور کیا کہتی ہے۔" ہنسی چھپاتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی حالانکہ عمر اس کے بارے میں اپنے احساسات کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ وہ کافی ایکسپریسو انسان تھا لیکن امائمہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ بار بار اس کے منہ سے سنے۔ یہ صرف انسانی فطرت کا معاملہ نہیں ہے محبت کو بھی دوہرائے جانا پسند ہے۔

"کیا سننا چاہتی ہو؟" وہ مزید اس کے قریب کھسکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"وہی جو تمہارے دل کی آواز ہے۔" امائمہ کے چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ بڑھ رہی تھی۔

"اچھا؟" عمر نے سابقہ انداز میں کہا پھر رخ موڑ کر سیدھا ہوا تھا۔ اب وہ اس انداز میں کھڑا تھا کہ امائمہ تو نیچے جھانک رہی تھی مگر عمر سیدھا کھڑا تھا۔

"تو سنو پھر میرے دل کی آواز" امائمہ نے اچانک بے حد قریب سے اسکی آواز سنی تھی۔

"دھک دھک۔۔۔ دھک دھک۔۔۔ دھک دھک۔" وہ اس کے کان میں پہلے سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی اور آخر میں اسکی آواز کافی بلند ہو گئی تھی۔ امائمہ نے پہلے ناک سکیڑی پھر مصنوعی انداز میں اسے گھورا۔ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹا تھا۔ عمر نے اس ساتھ دیا۔

"تم شاید کچھ اور سننا چاہ رہی تھی؟" ہنسی روک کر اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔۔۔ یہی کافی ہے۔" امائمہ کی ہنسی رکی نہیں تھی

"نہیں سیریسلی۔۔۔ اگر ایسی بات ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو۔" وہ چڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔ امائمہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ منہ سے کچھ نہیں بولی مگر چہرے پر اندرونی خوشی کی سنہری کرنیں تھیں۔ عمر بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا سر اس کے سر سے ٹکرایا۔

"یہی خواب دیکھا کرتا تھا میں کہ تم ہمیشہ ایسے ہی میرے ساتھ ہنستی مسکراتی رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔ میرے لئے یہ بہت معنی رکھتا ہے کہ تم خوش ہو۔۔ میرے ساتھ خوش ہو۔ تمہارے چہرے کی یہ مسکراہٹ مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔"

امائمہ نے خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔ عمر کی یہی محبت تھی جو اسے ہلکا پھلکا کر دیتی تھی اور پھر کہنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا

تھا۔اب بھی وہ مخمل رہی تھی لیکن اس کا دل اس کارواں رواں اس محبت پر رب کا شکر گزار ہو رہا تھا۔

"اب خاموش ہی رہنا ہے کیا؟" عمر نے اس کا ہاتھ تھام کر قدم آگے بڑھانے کا اشارہ کیا تھا۔

"نہیں۔۔۔میں سوچ رہی تھی کہ اگر اس لمحے میں تمہیں آئی لو یو کہوں تو تمہیں بہت گھسا پٹا لگے گا۔۔۔ہے نا؟"

شرارتی سی مسکراہٹ امائمہ کے لبوں پر مستقل ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔وہ واپسی کے لئے چل رہے تھے لیکن رفتار دونوں کی آہستہ تھی۔

"جی نہیں۔۔۔بالکل نہیں لگے گا۔" عمر نے ہونٹ بھینچ کر انکار کیا۔

"اس کا مطلب کہہ دوں؟" وہ ہنسی روک کر پوچھ رہی تھی۔

"آف کورس۔" عمر کے لہجے میں قطعیت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"آر یو شیور؟" اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

"اوہو۔۔۔کہنا ہے تو کہہ دو۔۔۔نہیں کہنا تو مت کہو۔۔۔ایک آئی لو یو کہنے میں جتنی دیر تم لگا رہی ہو نا، اتنی دیر میں یہاں طلاق بھی ہو جایا کرتی ہے۔۔۔تو بہ کیسی سست لڑکی ہے۔۔۔" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

"میری سستی پر توبہ کرنے کی بجائے یہاں کے لوگوں کی تیزی پر افسوس کرو۔ہمارے مشرق میں ایسا نہیں ہوتا۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

"اس کا مطلب سارے مشرق کی لڑکیاں آئی لو یو کہنے میں اتنی ہی دیر لگاتی ہیں۔۔۔اور وہ بھی اپنے شوہروں کو۔۔۔"

"ہاں نا۔۔۔حیا بھی کوئی چیز ہے۔یہ کوئی بات ہے کہ بلاوجہ ان سینسرڈ باتوں کرتے رہو۔"

"مائی گاڈ۔۔۔امائمہ کی بچی اس میں ان سینسرڈ کیا ہے؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔انداز ایسا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی احمقانہ بات پہ ہنس رہا ہو۔

"یہی تو بات ہے جو تم مغرب والے کبھی نہیں سمجھو گے۔" وہ اٹھلا کر بولی تھی اور فخر سے کندھے بھی اچکائے تھے۔

"ارے توبہ معاف کرو بی بی! ہمیں نا سمجھ ہی رہنے دو۔" عمر نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن امائمہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

اسی دوران ان کے آگے بازوؤں میں بازو ڈال کر چہل قدمی کرتا جوڑا رک گیا تھا۔ان دونوں کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی تب ہی وہ لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔وہ دونوں مقامی تھے لڑکی سکرٹ میں ملبوس تھی جس کی لمبائی کافی کم تھی لیکن یہ معمول کی بات تھی۔لڑکی کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق تھی۔

امائمہ نے عمر کا چہرہ دیکھا۔وہ بھی اس جوڑے کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔وہ لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

"ہائے مارتھا!" عمر نے خود ہی انہیں مخاطب کرنے میں پہل کی۔وہ لڑکی آگے بڑھ آئی اور بڑے تپاک انداز میں اس سے ملنے لگی عمر نے بھی اسے گلے لگایا اور اسکا ہاتھ تھام کر باتیں کرنے لگا۔۔۔اس کے ساتھ کھڑا لو کا بھی مسکراتے ہوئے ان دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔وہ دونوں چند منٹ آپس میں ہی باتیں کرتے رہے جس سے امائمہ کو یہ سمجھ آیا کہ وہ دونوں کلاس فیلوز رہے تھے۔ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے بعد

انہیں اپنے پارٹنرز کا خیال آیا تھا۔

"شی از مائی وائف مارتھا۔" عمر نے امائمہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔ مارتھا عمر کا ہاتھ چھوڑ کر امائمہ کی طرف چلی آئی پھر وہ اسی انداز میں اس سے ملی جیسے عمر سے ملی تھی۔

"ہی از مائی ہسبنڈ۔" اپنے ساتھ کھڑے لڑکے کا تعارف کروانے کا بھی خیال بھی بالآخر اسے آ گیا تھا۔ یہاں تک ساری صورتحال ٹھیک تھی۔ اصل مسئلہ تب ہوا جب ولز کا بھی آگے بڑھا اور بیوی کی طرح امائمہ کو گلے لگا کر اور گال چوم کر شادی کی مبارک باد دینے لگا۔

تم بہت خوش قسمت ہو مسٹر عمر کہ تمہیں اتنی خوبصورت وائف ملی ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کو دیکھ کر میری دھڑکنیں رک گئی تھیں۔ ایشین لڑکیاں بہت دل موہ لینے والی ہوتی ہیں۔"

وہ دل کھول کر تعریف کر رہا تھا۔ امائمہ کا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ شخص اس سے اس طرح سے ملے گا۔

"میری قسمت پر تو مجھے کبھی شبہ نہیں رہا۔۔۔" عمر اس تعریف پر پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ اس کی باچھیں چری گئی تھیں۔ امائمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔

"مجھے گھر جانا ہے عمر!" امائمہ نے اکتا کر کہا تھا۔ عمر نے ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر پھیلی بیزاری کو دیکھا پھر اس نے ان دونوں سے معذرت کر لی تھی۔ واپسی کے سفر میں عمر کو محسوس ہو گیا تھا کہ اس کا موڈ کچھ آف ہے لیکن وہ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا۔

"اچھا۔۔۔ وہ تم کیا کچھ آئی لو یو جیسا بولنے کی بات کر رہی تھی۔" صرف اس کا موڈ خوشگوار کرنے کے لئے عمر نے دوبارہ بارودیں سے بات شروع کرنا چاہی تھی۔

"دفع کرو بیکار کی باتوں کو۔" امائمہ نے جھنا کر کہا تھا اور اس سے دو قدم آگے چلنا شروع کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کیا ہوا ہے جس نے تمہارا موڈ اتنا آف کر دیا ہے۔" عمر نے بہت اکتا کر بالآخر پوچھ لیا تھا۔ وہ جب سے پارک سے واپس آئے تھے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ عجیب کشیدگی کا ماحول تھا۔ امائمہ کے دل کا حال اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ کافی خفا لگ رہی تھی جبکہ عمر کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ ایسا ہوا کیا ہے کہ جس نے امائمہ کا مزاج برہم کر دیا ہے۔ عمر نے چند ایک مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ہونٹ سیئے چپ چاپ بیڈ پر لیٹی رہی۔ عمر کو اکتاہٹ ہونے لگی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں امائمہ! اتنی ال مینرڈ لگتی تو نہیں ہو تم۔۔۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم کم سے کم جواب تو دو۔"

وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔ امائمہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تلخی کے رنگ بے حد نمایاں تھے۔

"تمہارے جیسے شخص کو اگر ویل مینرڈ کہتے ہیں تو میں ال مینرڈ ہی ٹھیک ہوں۔ تم مجھے اپنے جیسا بنانے کی کوشش مت کرو۔"

اس کے منہ سے الفاظ نہیں شعلے نکلے تھے۔ عمر اس کی بات سن کر ساکت رہ گیا چند لمحوں کے لئے تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اس کے

فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ امامہ اس قدر غصے میں کیوں ہے لیکن اس کے انداز دیکھ کر وہ بھی غصے میں آ گیا تھا۔

"میں تمہیں اپنے جیسا بنانے کی کوشش نہیں کر رہا۔۔۔ میں اس بات کو پسند ہی نہیں کرتا تو میں ایسی اسٹوپڈ کوشش کروں گا ہی کیوں۔"

وہ بہت اونچی آواز میں نہیں بولا تھا لیکن اس کی آنکھیں اور اسکا انداز، اس کے دل کی حالت کی چغلی کھا رہے تھے۔ امامہ ایک بار پھر خاموش ہو کر مراقبے میں چلی گئی۔ عمر چند لمحے اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اُسکا غصہ بڑھ رہا تھا اور فی الحال برداشت بھی۔

"امامہ! تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو کہ آخر ہوا کیا ہے۔۔۔ گھنٹہ بھر پہلے تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی تم۔" وہ بہت ضبط سے کام لے کر تحمل سے پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے؟۔۔۔ کیا ہوا ہے عمر؟۔۔۔ یہ تم خود سے پوچھو نا۔۔۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" امامہ نے سلگتے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"ڈیم اِٹ۔۔۔ تم کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا۔۔۔ تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتی؟" وہ جھنجھلایا تھا۔ امامہ نے جھلستی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے عمر تمہارا اصل پرابلم کیا ہے۔۔۔ یہی کہ تمہیں خود سے کبھی کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ تمہیں ہر بات بتانی پڑتی ہے، سمجھانی پڑتی ہے۔۔۔ حالانکہ۔۔۔ تمہیں پتا ہونا چاہیئے۔۔۔ کوئی اور مرد ہوتا تو آگ بگولا ہو جاتا مگر تم۔۔۔" وہ رکی تھی۔

"۔۔۔ تم منہ اٹھا کر دیکھتے رہے۔۔۔ تمہارے سامنے کوئی تمہاری بیوی کو گلے لگا کر، چوم کر چلا گیا اور تمہاری پیشانی پر لکیر تک نہیں آئی۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی ہے اور تم ہو کہ بس کھڑے مسکراتے رہے، نا صرف مسکراتے رہے بلکہ چائے کافی کی دعوتیں دینے لگے۔۔۔ اور اب تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ مجھے غصہ کس بات کا ہے۔"

وہ چبا چبا کر بولی تھی۔ اس دوران عمر نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ جب اس کی بات مکمل ہوئی تو وہ حیران لگ رہا تھا۔

"واٹ ربش۔۔۔ اتنی سی بات پر تم اتنا مس بی ہیو کر رہی ہو مجھ سے۔۔۔ حالانکہ اس ساری اسٹوپڈ چیز کا ذمہ دار بھی میں نہیں ہوں۔۔۔ وہ الو کا پٹھا تم سے جس طرح ملا۔ جس طرح گریٹ کیا وہ اس کا طریقہ تھا، اس کے مینرز تھے۔۔۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ اس کے مینرز نہیں تھے۔۔۔ تمہارے تھے۔ تم نے پہلے اس کی بیوی کو اس طرح گریٹ کیا تھا۔ تمہیں احساس ہونا چاہیئے تھا کہ اگر تم کسی کی بیوی کے ساتھ ایسا بی ہیو کرو گے تو آف کورس وہ بھی تمہاری بیوی کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرے گا۔"

"کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو تم۔۔۔ وہ مجھے کیوں فالو کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ تمہارا لاہور نہیں ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی تقلید میں پاگل ہو جائیں۔ یہاں سب کے اپنے انداز ہیں۔ سب کو پتا ہے کہ کہ اس نے دوسرے شخص سے کس طرح ملنا ہے۔ تمہیں کھا تو نہیں گیا وہ جو تم اتنی ہائپر ہو رہی ہو۔۔۔ وہ تمہیں ریسپکٹ کر رہا تھا۔۔۔ اتنی سی بات نہیں سمجھ میں آتی تمہیں۔"

امامہ کو اس کی بات سن کر بے حد افسوس ہوا۔

"اتنی سی بات تمہیں سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ مجھے ریسپکٹ نہیں کر رہا تھا۔ ایک مسلمان عورت کو اس طرح گریٹ کرنے کا مطلب اس کی ڈس ر

ریسپیکٹ کرنا ہے۔ یہ اس کی انسلٹ ہے اور مجھے یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا ہے عمر۔۔۔تم۔۔۔تم۔۔۔"

اس سے بولا ہی نہیں گیا تھا۔ عمر نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ اسے احساس تو تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی لیکن اسے یہ اندازہ بھی تھا کہ امائمہ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ اس سارے قصے میں قصوروار وہ تو نہیں تھا۔

"میری بات سنو امائمہ!۔۔۔اب تو یہ ہو چکا۔۔۔اب تو کچھ نہیں ہو سکتا نا۔" اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ امائمہ غرائی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا کچھ۔۔۔تم اسے ایک بار بتا سکتے ہو کہ اس نے کیا غلطی کی ہے اور تم خود کو تو یہ سکھا سکتے ہو کہ کسی غیر عورت سے ملنے کے کیا آداب ہوتے ہیں۔۔۔اور اس اسٹوپڈ کو بھی کہ ایک مسلمان عورت سے کس طرح بات کرتے ہیں۔"

"واٹ ربش۔۔۔تمہارا کیا خیال ہے مجھے اسے یہ سب بتانا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے میری بیوی رات کے اس پہر بلاوجہ مجھے ایک اسٹوپڈ ایشو کے لئے ٹیز کر رہی ہے، جھگڑ رہی ہے مجھ سے۔۔۔اونہہ مسلمان عورت۔۔۔جیسے پورے لندن میں تم اکیلی مسلمان عورت ہو۔" وہ حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ امائمہ کا مزید پارہ چڑھ گیا۔

"کیا کہا تم نے۔۔۔دوبارہ سے کہنا۔۔۔یعنی۔۔۔مائی گاڈ۔۔۔تم۔۔۔تم۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بیڈ سے اتری اور تن فن کرتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تم۔۔۔تم عمر احسان۔۔۔تم مسلمان ہی نہیں ہو۔۔۔سچ تو یہ ہے کہ تم مسلمان ہی نہیں ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ہاں میں مسلمان ہی نہیں ہوں۔۔۔ایک تم مسلمان ہو۔۔۔خالص، سچی اور کھری۔۔۔ایسا کرو تم ماتھے پر ایک ٹیگ لگوا لو جس پر بڑا بڑا کر کے لکھا ہو کہ تم ایک مسلمان عورت ہو اور باقی سب لوگ تم سے دس قدم کا فاصلہ رکھ کر چلیں یا جہاں تم نظر آ جاؤ، وہاں سے راستہ بدل لیں۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور طریقہ نہیں ہے لوگوں پر یہ جتانے کا کہ محترمہ امائمہ ہی بس مسلمان ہیں اور باقی لوگ مردود و فرعون کی اولاد ہیں۔"

وہ دونوں بہت غصے میں آ چکے تھے۔ کوئی ایک فریق بھی چپ ہونے کو تیار نہیں تھا۔

"مجھے کسی ٹیگ کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔سمجھے تم۔۔۔میں ایسی چیزوں کے بغیر بھی بہت اچھی ہوں۔۔۔میری فکر کرنے کی بجائے تم اپنی فکر کرو۔" وہ چڑا کر بولی تھی۔

"اتنی ہی اچھی ہو تو تم ہی کچھ کر لیتی۔۔۔اس وقت کھڑی تو تم بھی منہ دیکھتی رہی۔۔۔اگر اتنا برا لگا تھا تو تم نے کیوں اس ایڈیٹ کو اسی وقت نہیں ٹوک دیا۔۔۔اتنا برا لگا تھا تو اس کا منہ توڑ دیتی کم از کم مجھے تو اس وقت اپنا دماغ نہ خرچ کرنا پڑ رہا ہوتا۔"

عمر کا انداز بھی اس کے جیسا ہی تھا۔ ان کے منہ سے لفظ نہیں گویا پٹرول ابل رہا تھا جو لگی ہوئی آگ کو مزید بھڑکا دیتا تھا۔

"واہ۔۔۔بہت خوب۔۔۔مطلب اس کو میں روکتی تو تم جو میرے محرم بن کر اس وقت میرے ساتھ تھے؟۔۔۔تم کس لئے میرے ساتھ تھے؟ اور۔۔۔اور۔۔۔وہ تمہارا دوست تھا۔۔۔اتنی بات تمہیں سمجھ نہیں آتی عمر دی گریٹ کہ اس کو روکنا تمہارا کام تھا۔" اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ایک بار پھر ماتھے پر ہاتھ مارا تھا۔

"میں اس کا پرسنل ایڈوائزر نہیں ہوں جو اسے لوگوں سے ملنے کے طریقے سکھاؤں یا مشورے دوں۔ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنے ہے یہ اس کا پرسنل میٹر ہے اور مجھے تو اس کے کسی طریقے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا نا۔۔۔ اعتراض تھا تم کو تو تمہیں ہی اس کو ٹوک دینا چاہیے تھا۔"

"وہ اگر نیکسٹ ٹائم مجھ سے اس طرح ملے گا تو میں اس کو ٹوکوں گی نہیں۔۔۔ اس کے منہ پر تھپڑ ماروں گی کہ وہ بھی نہیں تم بھی یاد رکھو گے۔" امائمہ انگلی سے اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"یہ دیکھو۔۔۔" عمر نے زچ ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔۔۔ میری جان چھوڑ دو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

عمر کے اس جملے نے امائمہ کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"عمر۔۔۔ یو آر سک۔۔۔ سک، سک، سک۔۔۔" وہ بھنا کر بولی پھر بیڈ پہ پڑا تکیہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"یس آئی ایم۔۔۔ آئی ایم سک اینڈ آئی ایم پراؤڈ آف مائی سیلف۔۔۔ سمجھیں۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔"

عمر نے اسے باہر نکلتے دیکھ کر با آواز بلند کہا تھا۔ وہ کافی دیر تک کمرے میں غصے سے چکر کاٹتا رہا پھر وہ بیڈ پر چت لیٹ گیا تھا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ دوسری طرف امائمہ بھی نیچے آ کر کشن پر آڑی ترچھی گر گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔

یہ ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا جھگڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں آپ کے بغیر رہنا سیکھ چکا ہوں گرینی۔۔۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ میرے بغیر رہنا سیکھ چکی تھیں یا نہیں لیکن میری دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔"

ہاتھ میں پکڑا سفید واحد پھول میں نے گرینی کی قبر پر رکھ دیا۔ ہوا میں خنکی ہی نہیں نمی بھی تھی۔ فضا میں پھولوں، سبزے اور آنسوؤں کی مہک گھلی ملی تھی لیکن یہ میرے آنسو نہیں تھے۔ میری آنکھوں کے گوشے خشک تھے لیکن میرا دل رو رہا تھا۔ جب آنکھیں اور دل مل کر روئیں تو دکھ ہوتا ہے لیکن جب دل روئے اور آنکھیں اس کا ساتھ نہ دیں تو بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے۔

میں بھی بہت زیادہ دکھی تھا۔ گرینی ہر معاملے میں عجلت پسند واقع ہوئی تھیں۔ اپنی موت کے ساتھ بھی انہوں نے تمام تر معاملات بڑی جلدی جلدی طے کر لیے تھے۔ میں ویک فیلڈ واپس آیا تو وہ بستر پر ملی تھیں۔ ان کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی چند دن بعد ہی وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی تھیں۔ تو ہوا اپنی بیماری کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ جب گرینی بالکل بستر سے لگ گئی تھیں تو وہ مجھے لے کر آئی تھی اور میں سابقہ کی طرح بس دیکھتا رہ گیا تھا۔ ابھی تو میں کوئی اچھا سا جملہ ہی ذہن میں ترتیب نہیں دے پایا تھا جو میں گرینی سے کہہ کر ان کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ ان سے جھگڑنے کی انہیں طعنے دینے کی تمام تر آرزوئیں تو انہیں بستر پر دیکھ کر ہی دم توڑ گئی تھیں اور اگر کوئی کسر باقی تھی تو وہ ان کی موت نے رہنے نہیں دی تھی۔ اب وہ اپنی قبر میں سکون سے سو رہی تھیں۔ میں کب تک خود کو بے سکون رکھتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔کوہو اور مسٹر ایرک بھی میرے ہمراہ تھے مجھے دیکھ کر وہ بھی کھڑے ہو گئے۔میں نے گہری سانس بھری اور اپنے سن گلاسز آنکھوں پر رکھ لئے۔

اب تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ میں نے نہیں کیا تھا اور مزید جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی میں نے نہیں کرنا تھا۔میں نے وہ سبق سیکھ لیا تھا جو مسٹر ایمرسن مجھے سکھانا چاہ رہے تھے۔میں واقعی قدرت کو زیر نہیں کر سکتا تھا تو پھر اس پر کڑھنے کا فائدہ کیا تھا۔ہم سب واپسی کے لئے قدم بڑھا چکے تھے۔کوہو اور مسٹر ایرک گرینی کی یادیں دہرا رہے تھے جبکہ میں بالکل خاموش تھا۔کبھی کبھی خاموش رہنے میں زیادہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میگی ہمیشہ تمہارے بارے میں فکرمند رہتی تھی۔۔۔وہ تمہیں زندگی میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی اس لئے اس نے تمہیں کرسٹین کے پاس بھجوا دیا تھا تاکہ تم وہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرو۔۔۔مجھے امید ہے کہ کرسٹین تمہارے لئے اچھی ماں ثابت ہو رہی ہو گی۔"

مسٹر ایرک کہہ رہے تھے۔کوہو ان کے سامنے بیٹھی تھی اور میں ان کی بائیں جانب تھا۔مجھے اُن کے موقف سے اتفاق نہیں تھا اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ کوہو کے چہرے پر بھی ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بظاہر لاتعلق بیٹھی تھی۔ممکنہ طور پر کل اسے واپس چلے جانا تھا۔ہم ڈنر کے بعد کافی پی رہے تھے جب مسٹر ایرک نے یہ بات شروع کی۔

"آپ میرے بارے میں غلط اندازہ لگا رہے ہیں مسٹر ایرک! میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔بل بھی میرے ساتھ خوش اور مطمئن نہیں رہا۔"

کوہو نے صاف گوئی سے کہا۔میں نے اس کی تردید کی نہ ہی تائید۔میری نگاہیں ہال کے گلاس ڈور پر تھیں۔تاریک رات نے برف کی سفید چادر اوڑھنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ریڈیو پر بھی برفباری کی پیش گوئی کی جا رہی تھی اسی لئے میرا اندازہ تھا کہ کوہو جلد از جلد واپس جانے کا سوچ رہی ہو گی۔

"بل ابھی بچہ ہے کرسٹین۔۔۔اتنا عرصہ وہ میگی کی نگرانی میں رہا ہے اسے تمہارا عادی ہونے میں وقت درکار ہے۔۔۔مجھے امید ہے یہ جلد تمہاری معیت میں رہنا سیکھ لے گا۔۔۔اور خوش اور مطمئن رہنا بھی۔" مسٹر ایرک نے کافی کا سپ بھرا۔وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گئے تھے۔

"اتنا تردد کرنے کی ضرورت کیا ہے مسٹر ایرک۔۔۔بل اب یہاں ہی رہے گا اس فارم ہاؤس میں پہلے کی طرح۔وہ ویسے بھی اپنے اسکول سے مطمئن نہیں ہے۔۔۔کیوں بل تم کیا کہتے ہو؟"

کوہو نے اپنی رائے دی۔مسٹر ایرک کافی کا مگ لبوں تک لے جا رہے تھے یکدم رُک گئے۔

"او کم آن کرسٹین۔۔۔غیر ضروری باتیں مت کرو۔۔۔یہ میگی کی آخری خواہش تھی کہ بل لندن میں رہے۔۔۔یہ اس کی آئندہ زندگی کے لئے سودمند ثابت ہو گا۔"

وہ میری جانب دیکھنے لگے تھے۔میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔میری نگاہیں مقابل پیس پر پڑے ٹائم پیس پر تھیں۔یہ ایک بڑا خوبصورت ٹائم پیس تھا جو گرینڈ پا نے اٹلی سے خریدا تھا۔اس میں بظاہر اٹلس نظر آتا تھا جیسے اٹلس نے پوری دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہو لیکن دراصل یہ ایک بچہ

تھا جو فٹ بال کو ہاتھوں اور کندھوں کے ذریعے اوپر کو اچھال رہا تھا۔ یہ فٹبال ہاتھ لگانے سے چمک اٹھتا تھا اور اس پر وقت نمایاں ہونے لگتا تھا۔

ابھی اس پر دس بجے کا وقت تھا جبکہ میرے ساتھ موجود دونوں نفوس کے چہروں پر سوا نو کا سپاٹ وقت ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر بھی رہے تھے اور نہیں بھی کر رہے تھے۔ میرا خود کو فی الحال لاتعلق رکھنا ہی ضروری تھا اور بہتر بھی۔

"یہ میگی کی آخری خواہش تھی بل۔۔۔ مجھے امید ہے تم اس پر غور کرو گے۔" مسٹر ایرک نے مجھے گفتگو میں گھسیٹنا چاہا۔ میں نے اٹلس والے ٹائم پیس پر سے نظریں ہٹائیں۔ کو ہو نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے عادت ہی پڑ گئی ہوئی تھی میری سخت گیر کزن کی اداکاری کرنے کی۔

"آپ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ وہ ابھی بچہ ہے۔۔۔ بچے ایسے معاملات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔۔۔ میں بحیثیت اس کی ماں یہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہوں کہ یہ یہاں رہے گا۔۔۔ اور میرا فیصلہ ہے کہ یہ یہیں رہ کر اپنی پڑھائی مکمل کرے گا۔۔۔ بہتر مسٹر ایرک۔"

اس کا انداز بالکل دوٹوک تھا۔ مسٹر ایرک نے مگ تپائی پر رکھ دیا۔

"مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔۔۔ میں بل کا نگران بھی ہوں۔ میگی کا شوہر ہونے کے ناطے میری ذمہ داری ہے کہ میں بل کے معاملات دیکھوں۔۔۔ اس لئے۔۔۔"

"بل میرا بیٹا ہے۔۔۔ قانونی اور اخلاقی طور پر اسے آپ جیسے کسی معاون یا نگران کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔"

کو ہو نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی جبکہ مسٹر ایرک اس سے بھی زیادہ تڑپے تھے۔

"کرسٹین! یہ تمہاری ذات پر سجتا نہیں ہے کہ تم قانونی اور اخلاقی باتیں کرو۔ تم کیا ہو کیسی ہو میں بخوبی جانتا ہوں۔۔۔ یہ تم ہی ہو جس کی وجہ سے میگی کبھی مطمئن نہیں رہی۔"

"میری ذات کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھئے۔۔۔ دراصل یہ آپ ہیں جس کی پریشانی آنٹی میگی کو موت کے منہ میں لے گئی۔ آپ کی وجہ سے وہ کبھی مطمئن نہیں رہیں تھیں۔ وہ آپ کے ساتھ شادی کے فیصلے پر پچھتانے لگی تھیں۔ انہیں آپکی سازش سمجھ میں آ گئی تھی۔ آپ جونک بن کر ان کی ہستی سے چمٹ گئے تھے۔۔۔ وہ آپ تھے مسٹر ایرک جس نے آنٹی میگی کو بیمار کر ڈالا تھا۔"

کو ہو ہانپنے لگی تھی۔ ماحول بالکل بدل گیا تھا۔ میں ان دونوں کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہونے لگا تھا۔

"بکواس بند کرو کتیا۔۔۔ تمہیں کسی سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے۔ میگی ٹھیک کہتی تھی کہ باب نے اپنے لئے دنیا کی خود غرض ترین عورت کا انتخاب کیا تھا۔۔۔ کاش قدرت بل کے لئے تمہاری جیسی ماں کا انتخاب نہ کرتی۔ مجھ پر الزام لگا رہی ہو تا کہ بل کو مجھ سے متنفر کر سکو۔۔۔ تم اسے یہ کیوں نہیں بتاتی کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھنے کا اچھا خاصہ معاوضہ میگی سے وصول کیا کرتی تھی۔ یہ بھی تو بتاؤ نا کہ دراصل جونک تم تھی جو دولت کی ہوس میں اپنی اولاد کو ماں کا پیار نہیں دے سکیں۔۔۔ تمہاری خود غرضی نے کبھی تمہیں اپنی ذات کے علاوہ کبھی کچھ سوچنے ہی نہیں دیا۔۔۔ اونہہ۔۔۔ اپنے شوہر کو بھی تم کھا گئیں اور اب بیٹے کو کھانے کی تیاری میں ہو۔"

مسٹر ایرک نے فرش پر تھوکتے ہوئے گالی دی تھی۔ کو ہو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ دونوں ہال میں میری موجودگی کو بھلا چکے تھے۔

"اس دولت پر میرا حق ہے۔۔۔ یہ میرے شوہر اور میرے بیٹے کی دولت ہے میں نے اس کے باوجود بھی کسی چیز پر حق نہیں جتایا۔۔۔ میں محنت کرتی ہوں اور اپنا پیٹ پالتی ہوں۔۔۔ آنٹی میگی مجھے بل کے لئے جو رقم دیتی تھیں وہ بل ہی کی دولت میں سے تھی، اسی کے لئے اسی کی ذات پر خرچ ہوتی تھی۔۔۔ آپ بتائیے آپ اتنے بڑے فارم ہاؤس کے مالک بننے کے خواب کیوں دیکھنے لگے تھے۔ اپنی خود غرضی، سفاکی اور عیاری کا بھی تو ذکر کیجیے۔۔۔ آپ نے کتنی ہوشیاری سے آنٹی میگی کو انکل جیک کی موت کے بعد قابو کیا۔۔۔ پہلے انہیں انکے بڑھاپے کا احساس دلانا شروع کیا۔۔۔ ان کی بیماری کو ان پر حاوی کر دیا۔۔۔ وہ جب خود کو لاچار محسوس کرنے لگیں تو خود کو ان کا سب سے بڑا ہمدرد ثابت کرنے میں جت گئے۔ آپ نے انہیں احساس دلایا کہ بل انکے بڑھاپے پر بوجھ ہے۔ آپ نے دادی اور پوتے کو علیحدہ کیا اور پھر آنٹی میگی سے شادی رچالی۔ آپ نے کیوں یہ سب کیا۔۔۔ مان لیجیے مسٹر ایرک۔۔۔ دولت کی وجہ سے۔۔۔ آپ بھی فرشتہ نہیں ہیں۔۔۔ معصوم بننے کی اداکاری اور اپنے آپ کو سراہنا بند کیجیے پھر اس کے بعد اپنا اور میرا تقابل کیجیے۔۔۔ یقین کیجیے آپ ہی فاتح ہوں گے۔۔۔ خود غرضی کا ٹیگ ہی نہیں ٹائٹل بھی آپ کو ہی ملے گا۔"

وہ خفا رہی تھی۔ مسٹر ایرک کچھ دبے ہوئے محسوس ہوتے مگر ابھی شاید ان کے ترکش میں کچھ تیر باقی تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھے۔ میں بے حد حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن چپ تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مار پیٹ نہ شروع کر دیں۔

"اتنا کافی ہے کرسٹین۔۔۔ کافی بول چکی ہو تم۔۔۔ میں بھی تمہاری طرح اس طرح کی گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کر سکتا ہوں لیکن میں کم ظرف نہیں ہوں۔۔۔ بہتر ہے تم میری بات مان لو۔۔۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ میں میگی کی خواہش کے مطابق بل کی دیکھ بھال میں معاونت کا ذمہ دار ہوں۔۔۔ اور میں اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھاؤں گا۔"

"میں آپ کو آپ کی ذمہ داری کے متعلق کوئی نصیحت کروں گی نہ اپنی ذمہ داری کے متعلق آپ کی کوئی نصیحت سنوں گی۔۔۔ بل یہیں رہ کر پڑھے گا یہ میرا اور میرے بیٹے کا مشترکہ فیصلہ ہے۔"

مسٹر ایرک نے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے کوہو کو بھی اپنی آواز سست کرنی پڑی۔ وہ دونوں میری جانب بہت کم دیکھ رہے تھے۔ میرا کافی والا مگ خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اسے میز پر رکھ دیا۔

"وہ یہاں اکیلا کیسے رہے گا۔۔۔ اتنا بڑا فارم ہاؤس ہے اور بل ابھی بچہ۔۔۔ میری مخالفت اور ضد میں آ کر احمقانہ فیصلے مت کرو۔"

مسٹر ایرک اب یقیناً ناصحانہ انداز اپنا رہے تھے۔

"آپ کو کس نے کہا وہ اکیلا رہے گا۔۔۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی۔۔۔"

کوہو کے فیصلے نے مجھے چونکایا۔ مسٹر ایرک بھی اس کا چہرہ تکنے لگے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تم اپنی ملازمت، اپنی سماجی زندگی، اپنی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے یہاں اس دور افتادہ فارم ہاؤس میں رہو گی۔۔۔ رہ لو گی؟"

وہ استہزائیہ انداز میں کہہ رہی تھے۔ کوہو نے فلمی ویمپ کے جیسا اونچا مصنوعی قہقہہ لگایا۔

"آپ بھی تو اپنی سرگرمیاں ترک کر کے بوڑھی مارگیٹ جیک گرانٹ کے لئے یہاں آ گئے تھے نا۔۔۔آپ بھی یہاں رہ رہے ہیں نا۔۔۔ میں بھی رہ لوں گی۔۔۔میری فکر میں ہلکان مت ہوں۔"

مسٹر ایرک چند لمحے خاموشی سے کھڑے رہے شاید کچھ سوچنے لگے تھے۔میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔میرا اُن کے درمیان کوئی کام نہیں تھا۔

"کرسٹین! میرا خیال ہے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنے کی بجائے اس بچے سے پوچھ لینا چاہیے کہ اس کا کیا فیصلہ ہے۔۔۔بتاؤ بل ۔۔۔تم کیا چاہتے ہو؟"

مسٹر ایرک کو شاید یکدم احساس ہوا تھا کہ میں بھی موجود ہوں۔کوہو نے میری جانب دیکھا۔اسے یقین تھا کہ میں بھی اس کے اس گھر میں جا کر نہیں رہنا چاہوں گا جبکہ مسٹر ایرک کو گمان تھا کہ شاید میں اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دوں گا۔میں نے گہری سانس بھری۔اب جا کر بہت سی کڑیاں مل گئی تھیں۔ان دونوں کو مجھ سے مطلب نہیں تھا بلکہ اس دولت سے تھا جو گرینڈ پا نے میرے لئے چھوڑی تھی۔کوہو میری ماں تھی اور گرینی نے مسٹر ایرک کو اپنے بعد میرا نگران مقرر کر دیا تھا۔میں نے ایک اور گہری سانس بھری اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کارڈیگن کی جیب میں ہاتھ اُڑس لئے۔

کیا یہ اہمیت رکھتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟

کیا میں اپنے لئے کوئی فیصلہ کرنے کے لئے آزاد بھی تھا کہ نہیں؟

کیا اس وقت کیا گیا میرا کوئی بھی اہم فیصلہ میری آئندہ زندگی میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں میری جانب ہی دیکھ رہے تھے۔میں نے اپنے پاؤں کو دیکھا۔سمت کا تعین ہمیشہ دماغ کرتا ہے لیکن ہمیں اس سمت کی جانب لے کر ہمیشہ ہمارے پاؤں جاتے ہیں۔

"تم بتاؤ۔۔۔تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" کوہو میری خاموشی سے اکتائی۔میں نے اپنے کارڈیگن کے ہڈ کو سر پر رکھا تھا۔

"سوئمنگ۔۔۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔میں نے تقدیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

میں کیا کرنا چاہتا تھا میں نے انہیں بتا دیا تھا اور وہ کیا کر سکتے تھے یہ انہوں نے چند دن بعد بتایا۔ایک ہفتہ بعد مسٹر ایرک اور کوہو نے شادی کر لی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہاں رہتا ہوں میں" نور محمد نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔وہاں ملگجا سا اندھیرا تھا۔دروازہ کھلتے ہی سیڑھیوں میں لگے بلب کی روشنی بلا اجازت اندر داخل ہوئی تھی اور پھر نور محمد اور احمد نے بھی یہی کیا تھا۔کمرے کی ابتر حالت اس ذرا سی روشنی میں اور بھی زیادہ ابتر محسوس ہو رہی تھی۔نور محمد کو شرمندگی ہوئی۔

"آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں" احمد نے پوچھا تھا۔ان کی درمیانی رفاقت نے بڑی تیزی سے آگے کا سفر طے کیا تھا احمد کی شخصیت میں ایک اسرار تھا جو نور محمد کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔نور محمد کی کسی اجنبی علاقائی شخص کے ساتھ انسیت اس کے اردگرد رہنے والوں کے لئے ایک بڑا ہی انوکھا

واقعہ تھی۔ وہ نا صرف حیران تھے بلکہ کچھ لوگ متجس بھی تھے کہ یہ اجنبی جسے یہاں آتے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے آخر ایسی کونسی خصوصیات کا حامل تھا کہ نور محمد اس کے استنے قریب آ گیا تھا اگرچہ احمد معروف نے اپنے رویے سے سب کے دل جیت لئے تھے۔ وہ عمدہ خوشبو، نفیس گفتگو اعلیٰ لباس اور اچھے اطوار کے باعث بہت جلد واقعی سب میں معروف ہو گیا تھا۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔ اس لئے اس دوستی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔

نور محمد اور احمد معروف ظاہری حلیے میں ہی نہیں عادتاً بھی ایک دوسرے سے متضاد تھے انکا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا بول چال سب ہی مختلف تھے مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گھل مل گئے تھے کہ دن رات کی طرح لازم و ملزوم لگنے لگے تھے۔

احمد معروف بہت مشفق شخص تھا۔ اس نے نور محمد کو بصد اصرار اپنے حلقہ یاراں میں شامل کیا تھا لیکن نور محمد اس دوستی سے خود بھی کافی خوش اور مطمئن تھا اسی لئے وہ اسے اپنا ٹھکانہ دکھانے لے آیا تھا۔ اس کے روم میٹس ابھی موجود نہیں تھے لیکن انکی نشانیاں سب جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ وہ سب لوگ عجیب تھے۔ اپنا کام ساتھ ساتھ سمیٹنے کی بجائے سب ویک اینڈ کے منتظر رہتے۔ اسی لئے نور محمد ان سے بعض اوقات بہت اکتا بھی جاتا تھا لیکن وہ منہ سے کسی سے کوئی شکوہ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ اعتراضات کرنے کی بجائے خاموش رہنا پسند کرتا تھا اسے نجانے کیوں ہر جائز کام میں بھی جھجھک محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر اپنے روم میٹس کے کپڑے اٹھا کر لانڈری میں رکھ دیتا۔ ان کے لحافوں اور بستروں کو درست کر دیا کرتا۔ ان کے جوٹھے برتن کچن میں رکھ دیا کرتا تھا جس روز وہ یہ کام نہ کرتا اس روز کمرے کی حالت اسی طرح ابتر رہتی تھی جس طرح آج ہو رہی تھی...... ابھی بھی کمرے میں رات کو پی گئی کافی کے مگ اور کھائے گئے ابلے انڈوں کے چھلکے دروازے کے عین قریب موجود تھے۔ صبح کو ڈیوٹی کے یونیفارم پہننے کی غرض سے اتارے گئے پاجامے بنیانیں بھی بستروں پر پڑی تھیں۔ نور محمد کو دل ہی دل میں بے پناہ شرمندگی ہوئی۔ احمد اسکی بہت عزت کرتا تھا اور یہ عزت اسے حد سے زیادہ محتاط بنا دیتی تھی۔ وہ اس حد درجہ عزت سے خوفزدہ رہنے لگا تھا اور حیرانی والی بات یہ تھی کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

ایک کمزور اور وضع دار انسان کے لئے عزت کی غلامی بڑی الجھا دینے والی ہوتی ہے۔

خواہ مخواہ کی عزت سے زیادہ بے عزت کر دینے والی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔ اس کے چھن جانے کا خوف اور اسکو قائم و دائم رکھنے کے جتن بعض اوقات انسان کے کندھوں کو بوجھ کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ نور محمد کے کندھے بھی فی الوقت جھکتے جھکتے سے نظر آنے لگے۔ دوسروں کا کچرا سمیٹنا اسکی ذمہ داری نہیں تھی لیکن وہ اس کام کو ذمہ داری کی طرح ہی سرانجام دینے لگا۔

"نہیں...... ایک دو لوگ اور بھی ہیں"

اس نے کمرے کی لائٹ آن کر کے جلدی جلدی لحاف سمیٹنے شروع کئے تھے اور ساتھ ہی پوچھے گئے سوال کا جواب بھی دیا تھا۔ احمد نے سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بہت نیچی چھت والا تنگ سا کمرہ تھا۔ گھٹن کا احساس ہر چیز پہ حاوی تھا۔ اسے یہ جگہ پسند نہیں آ رہی تھی نور محمد نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

"آپ پریشان مت ہوں یہ جگہ بہت اچھی ہے میرے ساتھ رہنے والے سب لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ آپ ایک دو دن میں سب کے

ساتھ گھل مل جائیں گے اور پھر یہ جگہ مسجد سے بے حد قریب ہے تو آنے جانے میں بھی آسانی رہے گی"

اس نے نور محمد سے کہا تھا کہ اس کے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے اور جس جگہ وہ رہتا ہے وہ مسجد سے کافی دور ہے اس لئے اگر کوئی نزدیک میں جگہ مل جائے تو وہ بڑا مشکور رہو گا۔ نور محمد نے اسے اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی تھی جسے احمد نے قبول کر لیا تھا۔

"یہاں بہت گھٹن ہے، کھڑکی بھی نہیں ہے کوئی" احمد نے اسکا ساتھ دینے کے لئے ایک لحاف اٹھایا تھا۔

"موسم ہی اتنا اچھا ہوتا ہے کہ ہوا کے لئے بھی کھڑکی کی ضرورت نہیں پڑتی"

نور محمد نے اسکی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ آنکھوں کو کم ہی استعمال کر رہا تھا وہ۔

بلی کو دیکھ کر کبوتر موت سے بچنے کے لئے آنکھوں سے جو کام لیا کرتا ہے، وضعدار شخص وہی کام شرمندگی سے بچنے کے لئے لیتا ہے۔

"کھڑکیاں صرف ہوا کی آمدورفت کا ذریعہ ہی نہیں ہوتیں" احمد شاید اس کے انداز کو سمجھ گیا تھا اس لئے اس نے بھی اسکی جانب دیکھے بنا تہہ لگانے کے لئے ایک اور لحاف اٹھایا تھا۔

"روشنی، دھوپ۔۔۔زندگی۔۔۔کھڑکیوں سے اور بھی بہت کچھ ملتا ہے" اس نے لحاف کو تہہ لگانی شروع کی تھی۔

"کھڑکیاں دروازے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ انسان کی تنہائی کو بانٹنے میں یہ بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں ورنہ انسان اکیلا ہی رہ جائے جبکہ انسان اکیلا رہنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا اسے سب کے ساتھ رہنا ہوتا ہے اس دنیا میں اور دنیا ہمیشہ کھڑکیوں دروازوں کے دوسری جانب سے شروع ہوتی ہے یہ اونچی لمبی دیواریں تو انسان نے اپنی حفاظت کے لئے بنائی ہوتی ہیں۔ ان کے پار دیکھنے کے لئے ان کے اندر سے راستے بنانے پڑتے ہیں۔ دیواروں کے پار جھانکنے کے لئے انسان نے جو راستہ بنایا ہے جو آلہ ایجاد کیا ہے کھڑکی اسی آلے کا نام ہے۔ یہاں سے دنیا محسوس ہوتی ہے نظر آتی ہے اپنا پتا دیتی ہے" احمد نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا فلسفی جیسی باتیں گلاب جامن کے انداز میں کر جایا کرتا تھا

""دنیا"۔۔۔دنیا کی ضرورت کسے ہے؟" نور محمد نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری نہیں تھی لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اسے کہیں نہ کہیں چھپا رہا ہے وہ اسکی جانب پشت کر کے اپنے پلنگ کے نیچے سے کچھ گھسیٹنے لگا تھا۔

"کیوں۔۔۔دنیا کی ضرورت نہیں ہے آپکو" احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں۔۔۔مجھے اس دنیا سے کوئی غرض ہے نا اسکی کوئی ضرورت ہے" اس نے پلنگ کے نیچے سے ایک فولڈ کیا ہوا میٹرس نکالا تھا۔

"کیوں" احمد لحاف بستر پر رکھ کر اسکی جانب آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا کہ نور محمد بھی حیران ہوا۔ وہ اتنا متجسس کیوں ہو رہا تھا۔ نور محمد نے سوچا تھا پھر اسے احمد کی لاعلمی پر تاسف ہوا۔

"مومن کو دنیا سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔۔۔مومن کو دنیا کی طلب نہیں ہوتی" نور محمد نے ملامت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں" وہ ایک بار پھر پوچھ رہا تھا۔ اسی انداز میں کہ نور محمد زچ ہوا۔

"جسے اللہ کا دین کافی ہو اسے دنیا کی ضرورت کیا ہے" اس نے زور دے کر سمجھانے والا انداز اپنایا تھا۔

"اللہ کا دین۔۔۔؟ تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے" احمد معروف کے اس سوال نے نور محمد کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ لاجواب ہو کر چپ سا ہو گیا۔ کیا احمد معروف اس کے عقائد، اس کے تصورات کی بلند و بالا مضبوط عمارت کو متزلزل کرنے کے لئے آیا تھا۔

میرا تو خیال ہے یہ "دین" انسان کا ہے جو اللہ نے اسے دان کر دیا ہوا ہے اور "دنیا" اللہ کی ہے جو اس نے ایک دن واپس لے لینی ہے یہ اللہ سبحان تعالیٰ کی "امانت" ہے جو ایک نا ایک دن آپکو واپس کرنی ہوتی ہے۔ اللہ پاک انسان سے اسکا دین واپس نہیں لیں گے۔ ہر مسلمان کی یہ حسرت اور خواہش ہوتی ہے کہ مرتے دم اسے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے جانِ فانی اس کے سپرد کرنے کا موقع ملے اسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ آخری وقت تک جو چیز ساتھ لے جا سکتا ہے وہ "دین" ہے "دین" کا اقرار ہے جبکہ دنیا اور اس کی ہر چیز کو وہ یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ اسکا مطلب یہی ہوا نا کہ یہ دنیا اللہ پاک واپس لے لیتے ہیں تو وہ چیز جو اللہ آپ سے واپس لے گا وہ آپ کے پاس مرتے دم تک "امانت" ہے۔۔۔ آپ کیسے اللہ کی "امانت" سے منکر ہو سکتے ہیں۔

نور محمد اپنے ہی بچھائے ہوئے میٹرس پر دھم سے گرا تھا۔ احمد معروف نے اس کے سامنے سوچ کا ایک نیا دروازہ کھول ڈالا تھا۔

"مجھے اسلام کی سب سے اچھی بات ہی یہ لگتی ہے کہ اس میں "دنیا" کا انکار نہیں ہے کوئی انسان دنیا سے منکر ہو کر مومن نہیں ہو سکتا۔ یہ نا کہیں دین میں سکھایا گیا نا قرآن میں بتایا گیا اور نا ہی نبی آخر الزماں نے ایسا کیا جب ہمارے نبی تارک الدنیا نہیں تھے تو ہم کیسے ہو سکتے ہیں۔۔۔ ہم کیسے ہو جائیں تارک الدنیا۔۔۔"

احمد معروف نے سوال کیا تھا۔ نور محمد کے سینے سے دبی دبی سانس خارج ہوئی، اس کے سامنے بیٹھا شخص غلط تو کچھ نہیں رہا تھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں" وہ نا سمجھی کے عالم میں سب کچھ سمجھتے بوجھتے ہوئے بھی سوال کر رہا تھا۔

میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس دنیا کو حقارت کی نظر سے مت دیکھیں۔۔۔ یہ مومن کا مقام نہیں ہے۔۔۔ یہ خیانت ہے۔ میرے رب نے "دنیا" کو بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اسے محبت نہیں دے سکتے، مت دیں،،، اسکی عزت تو کریں۔۔۔ یہ بھی اللہ سے منسوب ہے اور جو چیزیں اللہ سے منسوب ہوتی ہیں انکی عزت کی جاتی ہے۔ انہیں نفرت سے دیکھنا، کمتر سمجھنا حقیر گردانا انسان کو اچھا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا" نور محمد چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ جو اس سے سیکھنے آیا تھا، وہ اسے سکھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم وہی ہو نا جس نے بورڈ میں تیسری پوزیشن لی ہے؟" ایک لمبے قد اور فربہی وجود کی مالک لڑکی اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ بلاشبہ یہ حوالہ بہت قابلِ فخر تھا لیکن پھر بھی اس نے کسی قدر جھجک کر سر ہلایا۔ یہ عاجزی نہیں بلکہ اپنی ذات پر عدم اعتمادی تھی جو اسے اپنی خوبیوں پر ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"کانگریٹس۔۔۔ میں صبا ہوں۔۔۔ اسی اکیڈمی میں پڑھتی ہوں۔۔۔ شاید تم نے میرا نام سنا ہو۔۔۔ میری بورڈ میں گیارھویں پوزیشن بنی ہے۔"

وہ خود ہی اپنے متعلق بتا رہی تھی جبکہ اس نے ایک بار پھر ہونقوں کی طرح سر ہلایا۔

"میٹرک میں ففتھ پوزیشن تھی میری۔۔۔اس بار میں توقع کر رہی تھی کہ پہلی تین پوزیشنز میں سے کوئی ایک ضرور آئے گی۔ میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے مگر لاہور بورڈ میں بہت دھاندلی ہوتی ہے۔ یہاں محنت کرنے کے باوجود آپ پُر امید نہیں ہوتے کہ آپ کتنے مارکس اسکور کر پاؤ گے۔۔۔گوجرانوالہ بورڈ میں ایسا نہیں ہوتا۔۔۔میں نے وہاں سے میٹرک کیا ہے نا۔۔۔سر انتظار کہہ رہے تھے ری چیکنگ کرواؤ۔۔۔دراصل مجھ سے زیادہ میرے ٹیچرز شاکڈ ہیں پر پھر بھی میں نے ری چیکنگ نہیں کروائی۔۔۔میں مطمئن ہوں۔۔۔پارٹ ٹو میں انشاءاللہ میں پوزیشن ری گین کرلوں گی۔ ری چیکنگ کا کوئی فائدہ تو ہوتا نہیں ہے۔۔۔پہلے دھاندلی سے پیپر چیکنگ میں پچاس پچاس نمبروں کی گڑبڑ کرتے ہیں پھر ری چیکنگ میں پانچ سے دس مارکس بڑھا کر احسانِ عظیم کر دیتے ہیں اس کے علاوہ جو بار بار بورڈ آفس کے چکر لگانے پڑتے ہیں وہ الگ بندے کو عاجز کر دیتے ہیں۔۔۔خیر میں اب خوش ہوں جس دن رزلٹ اناؤنس ہوا اس دن تو میرا رونا ہی بند نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اس لئے زیادہ رونا آرہا تھا کہ میں نے گوجرانوالہ سے ہی انٹر کیوں نہ کرلیا وہاں کم از کم اتنی دھاندلی نہیں ہوتی وہاں۔۔۔مجھے بس شوق ہو گیا تھا کہ لاہور سے ہی ایف ایس سی کروں گی۔۔۔اپنے کالج میں تو خیر میں نے ہی ٹاپ کیا ہے۔۔۔میں کوئین میری سے ہوں۔۔۔تم کس کالج سے ہو؟"

بالآخر اسے اپنی گفتگو میں وقفہ دینے کا خیال آگیا تھا۔ صبا نورین نامی وہ لڑکی اتنی روانی اور اتنی تیزی سے گفتگو کر رہی تھی مگر اسے سانس نہیں چڑھا تھا جبکہ وہ جو فقط سن رہا تھا ہانپنے لگا تھا۔

"میں۔۔۔؟" اس نے پوچھنا مناسب سمجھا پھر دھیمی سی آواز میں اپنے کالج کا نام بتا دیا۔

"میں۔۔۔وہ۔۔۔وہ تو ڈبہ کالج مشہور ہے۔۔۔مطلب وہاں کوئی پڑھائی وڑھائی نہیں ہوتی اور تمہارا میرٹ تو ایف سی، جی سی تک کا تھا پھر۔۔۔؟"

صبا نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا تھا پھر اس کو بولنے کا موقع دیئے بغیر کہنے لگی۔

"ویسے ایک بات ہے خود پڑھائی کے لئے سیریس ہونا چاہیئے کالج کی خیر ہے۔۔۔اب تم نے اسی کالج میں پڑھ کر پوزیشن لی ہے۔۔۔اچھا یہ بتاؤ تم نوٹس کس کے استعمال کرتے ہو۔۔۔میرا مطلب اسی اکیڈمی کے ٹیچرز جو دیتے ہیں وہ استعمال کرتے ہو یا کسی اور اکیڈمی سے لیتے ہو؟"

اسکا لہجہ اور آواز ایک دم سے رازدارانہ سی ہو گئی تھی۔

"میں اپنے نوٹس خود بناتا ہوں۔" اس نے آہستہ آواز میں بتایا تھا۔ یہ اس کے لئے واقعی قابلِ فخر بات تھی کیونکہ وہ بہترین ہوتے تھے۔ صبا نورین کے چہرے پر متجسس مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ شاید یہی راز جاننے کے لئے آئی تھی۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔۔۔میں بھی اپنے نوٹس خود بناتی ہوں۔۔۔یہاں کے نوٹس تو ایویں ہی ہوتے ہیں۔۔۔مجھے یہ اکیڈمی اتنی پسند نہیں۔۔۔دراصل میرے گھر کے قریب ہے نا۔۔۔اس لئے۔۔۔انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں یہاں سے نہیں کروں گی۔۔۔اچھا تم مجھے اپنے نوٹس دکھاؤ گے۔۔۔بائیالوجی کے۔۔۔چیپٹر نائن کے۔۔۔ابھی نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔۔۔کل لے آنا۔۔۔ابھی تو ویسے بھی سر آنے والے ہیں۔۔۔ٹھیک۔۔۔کل لے آنا یاد سے۔"

کتابوں کو ایک بازو سے دوسری بازو پر منتقل کرتے ہوئے وہ اسی روانی و تیزی سے بولی تھی مگر لہجے میں ایک کھوج تھی جو یقیناً ان نوٹس

کے لئے تھی جن کے باعث اسکے سامنے کھڑا لڑکا بورڈ میں تیسری پوزیشن لینے میں کامیاب ہوا تھا۔ صبا نورین نے تاکیدی انداز میں انگلی لہرا کر کہا تھا پھر ہاتھ سے بائے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی اسی وقت طلحہ اور راشد ایک ساتھ اکیڈمی داخل ہوئے تھے۔ ان دونوں نے ہی صبا کو اس کے پاس کھڑے اور پھر "بائے" کا اشارہ کر کے آگے بڑھتے دیکھا تھا۔ طلحہ کی آنکھوں میں شرارت چمکی، اسے چڑانے کے لئے اس نے وسلنگ شروع کر دی اس لمحے صبا نے مڑ کر دیکھا پھر طلحہ کو وسلنگ کرتا پا کر سخت نگاہوں سے گھورا تھا۔ اس لڑکی کا انداز اتنا پُر اعتماد تھا کہ طلحہ خائف ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"بڑی موجیں ہو رہی تھیں۔" اس کے قریب آ کر طلحہ نے آنکھیں مٹکائیں تھیں اس نے پہلے بھی صبا نورین کو دیکھ رکھا تھا۔

"تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔ اتنی دیر۔۔۔؟ وہ ان دونوں کے ساتھ چلتے ہوئے اس حصے کی طرف آنے لگا تھا جہاں لڑکوں نے اپنی موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں وغیرہ پارک کی ہوئی تھیں۔ یہ حصہ مرکزی داخلی دروازے اور اکیڈمی کے ریسپشن سے ذرا ہٹ کر تھا۔

"دیر کہاں ہوئی یار۔۔۔ جلدی کہو۔۔۔ ہم نہ آتے کچھ دیر اور تو تمہیں بات کرنے کا بہادہ ملا رہتا۔۔۔ اب ہماری وجہ سے۔۔۔"

طلحہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور آنکھیں گھمانے لگا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بے حد برا لگتا تھا مگر اسے احساس نہیں تھا۔ راشد نے ایسی باتوں میں حصہ لینا کافی کم کر دیا تھا۔ رزلٹ اور پھر اینٹری ٹیسٹ کا ہوّا اب اس پر زیادہ سوار رہنے لگا تھا۔

"وہ صبا نورین تھی۔۔۔ مبارکباد دے رہی تھی۔۔۔ اس نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے مگر بورڈ میں گیارہویں پوزیشن بنی ہے اس کی۔۔۔ یہی سب بتا رہی تھی۔"

اس کے دماغ میں غلاظت نہیں تھی اس لئے عام سے انداز میں اس نے کہا تھا ویسے بھی اس لڑکی کے پُر اعتماد انداز نے اسے متاثر کیا تھا۔ وہ ذہین تھا لیکن اسے ذہانت اتنی پسند نہیں تھی۔ اسے پُر اعتمادی پسند تھی کیونکہ وہ اس چیز کی شدید کمی کا شکار تھا۔

"بس یہی بتایا اس نے۔۔۔ اور کچھ نہیں؟" طلحہ واقعی ایک ڈھیٹ لڑکا تھا۔ کبھی کبھی وہ چالاک عورتوں کی طرح آنکھیں مٹکا مٹکا کر اس طرح بات کرتا کہ سامنے کھڑا شخص اپنے آپ کو بدھو سمجھنے لگتا اور وہ تو واقعی بدھو تھا۔

"نہیں اور بھی بتا رہی تھی۔۔۔ وہ گوجرانوالہ سے آئی ہے۔۔۔ مجھ سے بائیالوجی کے نوٹس مانگ رہی تھی۔"

اس کا انداز ابھی بھی سادہ تھا مگر دل ہی دل میں وہ زچ ہو چکا تھا۔

"تم نے بھی کچھ مانگ لینا تھا۔۔۔ مثلاً فون نمبر۔۔۔ یا گھر کا ایڈریس وغیرہ۔"

"اوئے خبیث انسان۔۔۔ تجھے کوئی اور بات آتی ہے کہ نہیں۔۔۔ ہر وقت یہی فضولیات۔" راشد کچھ چڑ کر بولا۔ فزکس کی کلاس پہلے ہونی تھی اس لئے اس نے ہاتھ میں فزکس کے نوٹس پکڑے ہوئے تھے اور کچھ رٹنے کی کوشش ان دونوں کی گفتگو میں حائل ہو رہی تھی اسی لئے اس نے طلحہ کو ٹوکا تھا۔

"میں تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہا۔۔۔ تم لگا دو رٹے۔۔۔ حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔"

طلحہ کا انداز پڑھائی کے معاملے میں آجکل ناک سے مکھی اڑانے کے برابر رہ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے لئے یہ سب چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل بھی نہیں رہیں تب ہی راشد اس پر زیادہ غصہ کرنے لگا تھا۔

"کیوں فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ابھی اینٹری ٹیسٹ کا سہارا تو ہے نا۔۔۔میرے سیونٹی پرسینٹ آئے ہیں۔۔۔پارٹ ٹو میں اگر ایٹی فائیو آ جاتے ہیں تو باقی کی کمی اینٹری ٹیسٹ میں پوری ہو جائے گی۔۔۔انشاء اللہ۔۔۔تم میرا دل جلانے کی بجائے اپنی فکر کرو۔" کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے رک کر راشد نے اسے جواب دیا جس پر طلحہ نے پھر قہقہہ لگایا۔عجیب مذاق اڑانے والا انداز تھا۔

"میری فکر میرے والد محترم کریں۔۔۔ان کی اتنی اپروچ تو ہے نا۔۔۔ذاتی قابلیت سے زیادہ ایسی چیزیں کام آتی ہیں۔" طلحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راشد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اپروچ صرف پریکٹیکل میں کام آتی ہے جہاں آپ ٹیچرز کے تھرو پریکٹیکل لینے کے لئے آنے والے پروفیسر سے سفارش کر سکتے ہیں یا لیب اٹینڈینٹ کی مٹھی گرم کر کے چیٹنگ کر سکتے ہیں۔۔۔پریکٹیکل کے صرف پچیس مارکس ہوتے ہیں باقی کے پچھتر مارکس لینے کے لئے تو پڑھنا پڑتا ہے نا۔"

طلحہ اور راشد اسے نظرانداز کرتے ہوئے اب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔اس نے شکر کا سانس لیا کہ اس پر سے توجہ ہٹی ان دونوں کی۔

"کوئی پڑھنا وڑنا نہیں پڑتا۔۔۔ہم لوگ پڑھ بھی لیں تب بھی سیونٹی فائیو یا زیادہ سے زیادہ ایٹی پرسنٹ حاصل کر پاتے ہیں۔۔۔پوزیشن تو حاصل کرتے ہیں پروفیسرز کے بچے ٹیچرز کے بچے۔۔۔ظاہر ہے ان کی اپروچ اتنی پاورفل ہوتی ہے کہ ان کے بچوں کو باقاعدہ نقلیں کروائی جاتی ہیں، انکی مرضی کے نگران متعین کئے جاتے ہیں حتیٰ کے ان کی جوابی کاپیوں کی مارکنگ بھی ان کے سامنے ہوتی ہے اور اب جو یہ اینٹری ٹیسٹ کا شوشہ چھوڑ دیا ہے اس سے بھی انہیں لوگوں کا فائدہ ہوگا۔۔۔جب ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے تو بلا وجہ ان کتابوں میں سر کھپانے کا فائدہ۔"

طلحہ کی اپنی دلیل تھی۔اس نے اسٹھ فیصد مارکس لئے تھے۔وہ امتحان میں کامیاب ہوا تھا لیکن میڈیکل کے میرٹ کے حساب سے وہ بہت پیچھے تھا مگر اسے کوئی بے اطمینانی نہیں تھی۔وہ اب کلاس روم میں داخل ہو چکے تھے۔

"لازمی نہیں کہ پوزیشن ٹیچرز یا پروفیسرز کے بچے ہی حاصل کریں۔۔۔اس بار جس لڑکی نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے وہ ایک امام مسجد کی بیٹی ہے اور پھر۔۔۔" راشد بات کرتے رکا تھا اور پھر اس نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"اب اس کی بات مت کرو۔۔۔یہ تو سائیں لوگ ہے۔۔۔ایسے لوگوں پر اللہ کا خاص کرم ہوتا ہے۔۔۔اب یہی دیکھ لو کہ ہمیں تمہیں آج تک کسی لڑکی نے مخاطب نہیں کیا اور اس کے پاس آ کر لڑکیاں نوٹس مانگ کر لے جاتی ہیں بلکہ کالج کا نام بھی بتا جاتی ہیں۔"

طلحہ کی ذہنی رو ہمیشہ بہکی رہتی تھی۔اچھا بھلا سنجیدہ باتیں کرتا وہ ایک بار پھر اس موضوع کی طرف پلٹ آیا تھا۔

"طلحہ چپ کر جاؤ اب۔" اس نے اسے ٹوکا تھا کیونکہ وہ کلاس روم میں داخل ہو چکے تھے وہاں کافی لوگ موجود تھے اور ایک بات یہاں پتا چل جاتی تو پھر سب تک پہنچ جاتی تھی۔

"ارے یار ہو جاتا ہوں چپ۔۔۔نہیں بتاتا کسی کو کہ تمہاری ایک گرل فرینڈ بھی ہے۔" طلحہ با آواز بلند بولا تھا کہ ان کی رو کے کئی لڑکے ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔وہ ان سب کی نظریں خود پر محسوس کر کے رونے والا ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ فزکس کے تمام چیپٹرز کے سولوڈ پرابلمز ہیں۔" صبا نورین نے فوٹو اسٹیٹ کاغذوں کا ایک پلندہ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس نے وہ پلندہ پکڑ لیا مگر کھول کر نہیں دیکھا۔ اسے ان پرابلمز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ان پرابلمز کو خود حل کرتے ہوئے کبھی کوئی وقت نہیں ہوئی تھی اور باقی کلاس فیلوز کی طرح وہ کبھی کوئی گائیڈ بک بھی اس ضمن میں استعمال نہیں کرتا تھا تو پھر وہ صبا نورین کے ان نوٹس کا کیا کرتا۔ وہ یہ بات اس لڑکی سے کہنا چاہتا تھا مگر اپنی ازلی جھجک اور مروت کی وجہ سے وہ بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جلد از جلد جانا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی اپنے ان نوٹس کے بدلے میں اس سے کون سے نوٹس کا مطالبہ کرتی ہے۔

"تمہارے بائیالوجی کے نوٹس بس ٹھیک ہی ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تمہارے نوٹس باقی لوگوں کے نوٹس سے کچھ مختلف ہوں گے... مگر..."

وہ لاپروائی بھرے لہجے میں کہتی لمحہ بھر کے لئے رکی۔ وہ اب تک اس سے تقریباً سب ہی چیپٹرز کے نوٹس لے چکی تھی مگر ایک بار بھی اس کے منہ سے تشکر بھرا یا تعریفی جملہ سننے کو نہیں ملا تھا حالانکہ اس کے نوٹس کی تعریف اس کے ٹیچرز بھی کرتے تھے اور کچھ ٹیچرز تو اس کے نوٹس میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے انہیں طلبہ کو "مختلف مگر موثر" بتا کر روپے بھی کما رہے تھے۔

"نوٹس بنانے کے لئے بھی ٹیکنیک چاہیے ہوتی ہے ورنہ تو لاتعداد کتابیں، گائیڈ بکس، ٹیچرز کے دیے ہوئے ہینڈ آؤٹس وغیرہ سبھی کے پاس ہوتے ہیں انہیں میں سے نقل کر کے لوگ اپنے نوٹس بناتے رہتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ میں نوٹس بناتے وقت اپنا مواد، اپنے الفاظ استعمال کرتی ہوں۔"

وہ اسے شروع دن سے ہی اپنی محبت میں مبتلا محسوس ہوئی تھی۔

"میرے بائیالوجی کے نوٹس تمہارے نوٹس سے زیادہ اچھے ہیں۔ تمہیں چاہئیں تو میں کل لا دوں گی۔" اس کے لہجے میں عظیم سخاوت کی خوشبو جھلکنے لگی۔ اسی دوران طلحہ اور جنید اکیڈمی کے ریسپشن کی طرف آتے دکھائی دیے تھے۔ صبا اور وہ اسی سمت میں کھڑے بات کر رہے تھے۔ طلحہ کے چہرے پر وہی ذومعنویت تھی جس سے وہ خار کھاتا تھا جبکہ جنید جو انہی کا کلاس فیلو تھا اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

"نہیں... شکریہ... مجھے کوئی نوٹس نہیں چاہئیں... مجھے یہ بھی نہیں چاہئیں۔" اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے فزکس کے نوٹس بھی اسے واپس کر دینے چاہے۔ وہ فوراً وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔

"اوہو... گھر جا کر اطمینان سے دیکھنا... کاپی کروانا چاہو تو کروا لینا پھر مجھے واپس کر دینا۔ میں آج کل بائیالوجی اور کیمسٹری پر زیادہ زور دے رہی ہوں اس لئے مجھے ان نوٹس کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا تم کل کیمسٹری کے پہلے پانچ چیپٹرز کے نوٹس لے کر آنا۔ میں بھی لے کر آؤں گی۔ پھر ہم کمپیئر کر کے دیکھیں گے کہ..."

"ہاں ٹھیک ہے... میں لے آؤں گا۔" اس نے صبا کی بات کاٹ کر کہا پھر مزید کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس پر جھنجھلاہٹ اور گھبراہٹ اس قدر حاوی تھی کہ وہ مزید وہاں رکا نہیں بلکہ عجلت میں اپنی سائیکل نکال کر بڑے گیٹ سے باہر نکل گیا حالانکہ ابھی اکیڈمی کا ٹائم ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ آجکل چونکہ پڑھائی کا بوجھ ذرا کم تھا اس لئے لڑکے بہت جلد فارغ ہو کر کلاس روم میں یا باہر بیٹھ کر گپ شپ وغیرہ میں مصروف رہتے

تھے۔ وہ لڑکے جو پڑھائی کے لئے سنجیدہ تھے اور وقت ضائع کرنے کے خلاف تھے وہ لیب میں جا کر فزکس کے پریکٹیکل کرنے لگتے تھے۔ کوئی کاکروچ یا مینڈک وغیرہ لیب میں مل جاتا تو ڈائی سیکشن کرنے والوں کا بھی ہجوم لگ جاتا۔ اسے مینڈک کی چیر پھاڑ کا اچھا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے آج راشد اپنے گھر سے ایک مینڈک ڈھونڈ ڈھانڈ کر لایا تھا لیکن طلحہ کے رویے اور جنید کی مسکراہٹ نے اسے اتنا پریشان کر دیا کہ وہ وقت ختم ہونے سے پہلے ہی گھر کی جانب چل پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طلحہ کے کسی قسم کے ریمارکس جنید کو مشکوک کریں۔ طلحہ اگر دوستوں میں منہ پھٹ مشہور تھا تو جنید پوری اکیڈمی میں منہ پھٹ مشہور تھا حالانکہ اکیڈمی کا ماحول اس قدر گھٹا ہوا نہیں تھا لڑکے لڑکیوں کی کلاس الگ الگ ہونے کے باوجود اس کی آپس میں بات چیت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ اور بات کہ زیادہ تر لڑکیاں ایوریج اور نکمے اسٹوڈنٹ سے زیادہ مخاطب ہونے کی بجائے ذہین لڑکوں سے بات کرنا پسند کرتی تھیں۔ صبا کو بھی اس میں اتنی ہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کے نوٹس لینا چاہتی تھی لیکن طلحہ اس چیز کو ایک رنگین داستان قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔

جنید کی مسکراہٹ سے ایک نئے خدشے میں مبتلا ہو کر اس نے سوچا تھا کہ وہ طلحہ سے بات کرے گا کہ وہ اس مذاق کو یہیں ختم کر دے مگر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ مذاق مذاق میں بات بہت دور تک نکل گئی تھی اور اس کا اندازہ اسے چند روز بعد ہوا۔

☆ ☆ ☆

ان دونوں کے درمیان ہونے والے اس پہلے جھگڑے نے ان کے تعلق کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کی محبت میں گم ہر چیز سے لاپروا تھے لیکن اس سنگین نوعیت کے جھگڑے نے بالآخر انہیں حقیقت کی پہلی سیڑھی پر لاکھڑا کیا تھا جس کے اختتام پر انہیں کے سامنے زندگی کا چہرہ مزید واضح ہو جاتا۔ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کے لئے فرشتہ تھے لیکن اس جھگڑے نے انہیں باور کروا دیا تھا کہ ان دونوں میں خوبیاں ہی نہیں خامیاں بھی ہیں۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ محبت کی عینک لگا کر دیکھنے سے انسان فرشتہ نظر آتا ہے، اصل میں ہوتا نہیں ہے۔

وہ رات ان دونوں نے جلتے کڑھتے ہوئے گزاری۔ ایک دوسرے کے خلاف اس جھگڑے نے ان کے دل میں اتنی بیزاری پیدا کر دی تھی کہ وہ خود کو ہی کوستے رہے۔ عمر کو خود پر غصہ تھا کہ اس نے امائمہ جیسی بدتمیز لڑکی کا انتخاب لائف پارٹنر کے طور پر کیا ہی کیوں جبکہ امائمہ دل ہی دل میں اپنی امی سے جھگڑتی رہی کہ انہوں نے عمر جیسا ضدی لڑکا اس کے لئے پسند کیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کیے گئے وعدے اور دعوے یکدم ہی تاش سے بنے محل لگنے لگے تھے۔

عمر اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بڑبڑاتا رہا جبکہ وہ نچلے کمرے میں جا کر بڑبڑانے کے ساتھ آنسو بھی بہاتی رہی۔ آنکھوں میں نیند اتر آنے تک وہ خیالوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کرتے رہے، ایک دوسرے کو غلط کہتے رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بات نہ کرنے کا عہد کرتے رہے۔

اگلی صبح ان کے اس چھوٹے سے گھر کی ایک عجیب صبح تھی۔ ان دونوں پر ہی نہیں سارے ماحول پر بیزاری چھائی ہوئی تھی مگر اس چیز کو تسلیم کرنے کے لئے وہ دونوں ہی تیار نہیں تھے۔ امائمہ کی آنکھ کھلی تو عمر پہلے سے کچن میں موجود ناشتہ بنا رہا تھا۔ امائمہ نے کھٹ پٹ کی آوازوں سے اندازہ لگا کر مندی مندی آنکھوں سے اس کا مکمل جائزہ لیا تھا۔ وہ آفس جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔

"اونہہ۔۔۔ کیسے ہیرو بن کر کھڑا ہے جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔ میری کتنی انسلٹ کی محترم نے رات کو مگر چہرہ دیکھو کتنا فریش لگ رہا ہے۔ شرٹ بھی وہ ہی پہن لی ہے جس میں کچھ زیادہ ہی ہینڈسم لگتا ہے۔۔۔ مرد ہے نا، اس کو کیا احساس کسی کے دل کا۔۔۔ ایکسکیوز نہ کرے مگر بندہ شرمندہ تو نظر آئے۔"

امائمہ نے کڑھ کر سوچا اور خفگی سے منہ موڑ کر کروٹ بدل لی۔ عمر نے اس کو کروٹ بدلتے دیکھ لیا تھا اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نیم آنکھوں سے اسکا جائزہ لے چکی ہے۔ وہ منہ کا زاویہ بگاڑ کر الیکٹرک کیٹل سے ابلتا ہوا پانی کپ میں انڈیلنے لگا۔

"اونہہ۔۔۔ مہارانی کے نخرے دیکھو، ابھی بھی بوتھا ایسے سجایا ہوا ہے جیسے ساری غلطی میری ہی ہے۔ رات بھر مزے سے سوتی رہیں ہیں محترمہ اور ابھی بھی کروٹ ایسے بدلی ہے جیسے میں نے انہیں بہت ڈسٹرب کر دیا ہو۔۔۔ کتنی بے حس عورت ہے۔۔۔ ایکسکیوز نہ کرے مگر شرمندہ تو نظر آئے۔"

ٹی بیگ کو ابلتے پانی میں ڈبکیاں دیتے ہوئے وہ ناک منہ پھلا کر سوچ رہا تھا۔ ناشتہ بنا کر وہ ٹرے اٹھائے دوبارہ کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ امائمہ اس کی اس حرکت سے مزید جل بھن گئی تھی۔ اسکا بدلہ اس نے اس انداز میں لیا تھا کہ عمر کے آفس جانے تک وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی اور سوتی بنی رہی تھی۔ عمر کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ تن فن کرتی اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اپنے لئے چائے بنائی، ٹی وی لگا کر دیکھا، پرانے اخبار میگزین دیکھتی رہی مگر کچن میں دوبارہ جھانکنا پسند بھی نہیں کیا۔ وہ خود کو مصروف رکھتی رہی مگر ذہن بار بار عمر اور اس کے رویے کے متعلق سوچ سوچ کر کڑھنے پر مجبور کرتا رہا۔ جلنا کڑھنا اتنا برا عمل نہیں ہے جتنا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اندر کی بھڑاس کو باہر نکال کر انسان کو ہلکا پھلکا کر دیتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے پریشر ککر کے اوپر رکھی سیٹی ہٹا دو تو اس کے اندر کا پریشر بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے بالکل اسی طرح جلنا کڑھنا بھی غصے کے لئے بھاپ کا کردار ادا کرتا ہے۔ سارا دن جلنے کڑھنے کے بعد امائمہ کا غصہ کافی کم ہو گیا تھا۔ دوسری جانب عمر آفس میں بھی امائمہ کے رویے پر ناراض رہا منہ پھلائے، بولیگز، کسٹمرز اور کلائنٹس کو ڈیل کرتا رہا مگر دھیان لمحہ بھر کے لئے بھی امائمہ کی جانب سے نہیں ہٹا تھا۔ امائمہ کا خیال آتے ہی اسے غصہ آنے لگتا اور پھر وہ جلنا کلسنا شروع کر دیتا اور یوں ان دونوں نے نا چاہتے ہوئے بھی جلتے، کڑھتے، کلستے اپنا اپنا غصہ کافی کم کر لیا تھا۔

گھر واپس آ کر عمر نے اپنے آپ کو "پرسکون" رہنے کا مشورہ دیا تھا سو وہ غصے کا اظہار کرنے کی بجائے روٹین کی طرح فریش ہو کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا مگر اس نے امائمہ کو روزانہ کی طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ امائمہ بھی اپنے آپ کو "تحمل" کا مشورہ دے چکی تھی سو اس نے بھی عمر کو بنا مخاطب کئے کہ جو اس کی روٹین تھی، کافی کا مگ ٹرے میں رکھ کر اس کے سامنے رکھا اور اپنا مگ لے کر کشن پر آ بیٹھی۔

پہلے چند سپ تک وہ دونوں خاموش رہے۔ کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ایک دوسرے کی چوری پکڑ لی اور منہ کے زاویے بگاڑ بگاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سب سے آخر میں وہ دونوں خود کو مسکرانے سے روک نہیں سکے تھے۔

ثابت ہوا محبت میں لڑنے جھگڑنے کا عمل تخریبی نہیں تعمیری ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"تم اگر چاہو تو مجھ سے ایکسکیوز کر سکتی ہو۔" رات کو بیڈ پر لیٹے اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلاتے ہوئے عمر نے شرارتی انداز میں کہا تھا۔ ان کے درمیان گزشتہ جھگڑے کے موضوع پہ ہونے والی یہ پہلی بات تھی۔ امائمہ اس کی بات کے ردعمل میں چند لمحے خاموش رہی۔ گزشتہ

رات انہوں نے جھگڑا تو لیا تھا لیکن صبح سے لے کر اب تک کہیں نہ کہیں وہ دونوں ہی شرمندہ ہوتے رہے تھے لیکن جھگڑے کا ذمہ دار بننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ اسی لئے عمر کے اس طرح کہنے سے امائمہ فوراً کچھ نہیں بولی۔

"میں کر لیتی ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ الجھی الجھی ہوئی تھی اسی لئے درمیان میں رک گئی مگر پھر نجانے کیا سوچ کر بولی۔

"اوکے۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ میں ہائپر ہو گئی تھی۔" عمر کو ایکسکیوز کرنے میں اس کا پہل کرنے کا عمل بے حد بھایا۔ مرد مشرق کا ہو یا مغرب کا، عورت کی فرماں برداری، صلح جوئی اسے بھاتی ہی ہے۔ عمر نے اس کی طرف رخ موڑ لیا تھا۔ ان دونوں نے ایک ہی تکیے پر سر رکھا ہوا تھا۔

"می ٹو سوری یار۔۔۔ میں بھی ہائپر ہو گیا تھا۔۔۔ میں نے کافی مس بی ہیو کیا تم سے۔"

عمر کا لہجہ، امائمہ کے بالوں میں گھومنے والی اس کی انگلیوں سے بھی نرم تھا۔ یہ رات کا فسوں تھا، کمرے میں پھیلی نیلی خوابناک روشنی کا اثر کہ جس نے عمر کے دل سے خفگی کے تمام اثرات مٹا ڈالے تھے۔ یہ صرف امائمہ کی سمجھداری تھی کہ اس نے رات کے اس پہر انا کے زعم میں آ کر ایکسکیوز کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ تب ہی عمر کا موڈ پہلے سے کہیں زیادہ خوشگوار ہو گیا۔

"گزشتہ چوبیس گھنٹے میری زندگی کے خراب ترین چوبیس گھنٹے تھے امائمہ۔۔۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کون سا وقت اپنی زندگی میں دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تو میں انہیں چوبیس گھنٹوں کا نام لوں گا۔۔۔ میں زندگی میں دوبارہ کبھی جھگڑا نہیں چاہتا امائمہ۔۔۔ تم سے تو کبھی بھی نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں بھی تم سے دوبارہ جھگڑا کبھی نہیں کرنا چاہتی عمر لیکن پلیز تم مجھے کبھی دوبارہ اپنے کسی فرینڈ سے مت ملوانا۔ اگر تمہارا کوئی فرینڈ مجھے دوبارہ بھی اسی طرح گریٹ کرنے کی کوشش کرے گا تو میں۔۔۔ میں پھر سے ہائپر ہو جاؤں گی۔ میں ایسی بدتمیزی دوبارہ برداشت نہیں کر سکتی۔" امائمہ نے اپنی بات مکمل کر ہی لی تھی۔ وہ ماحول کو کشیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس وقت عمر پر اپنا موقف واضح کرنا بھی ضروری تھا۔

"وہ میرا فرینڈ نہیں تھا۔۔۔ وہ میری فرینڈ کا ہزبینڈ تھا اور وہ اتنا برا نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ بار تو نہیں ملا لیکن جتنی بار بھی ملا ہوں میں نے اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ وہ بہت نائس ہے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے تم سے اس انداز میں پیش نہیں آنا چاہیے تھا ورنہ وہ محتاط رہتا۔"

عمر نے اسے اپنے انداز میں اپنے دوست کی صفائی دی تھی۔ امائمہ کا مزاج ایک دفعہ پھر برہم ہونے لگا تھا۔

"ہاں بہت نائس تھا وہ۔۔۔ تعارف ہوتے ہی گلے ملنے کو دوڑ پڑا۔۔۔ اسٹوپڈ۔۔۔ اسے آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ مسلمان عورتیں ہاتھ نہیں ملاتی مردوں سے، بجائے انہیں گلے لگانا۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ اس کے سامنے اس کا مسلمان شوہر تھا تب ہی وہ بار بار اسی بات کا حوالہ اتنے آرام سے دے پا رہی تھی۔ اس کی اپنی فیملی کا کوئی مرد ہوتا تو اسی بات کا بار بار حوالہ دینے پر جذباتی ہو جاتا مگر یہ عمر تھا وہ جذباتی نہیں ہوا تھا مگر زچ ہو گیا تھا۔

"کیا تم اس بات کو بھول نہیں سکتیں۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ہم ایک بیکار بحث میں الجھ رہے ہیں۔۔۔ ایک بار پھر۔۔۔" عمر نے اکتا کر کہا تھا۔

"بیکار کی بحث۔۔۔؟۔۔۔ یہ بیکار کی بحث ہے عمر۔۔۔ مجھے تو ابھی بھی سوچ کر گھن آتی ہے کہ کیسے۔۔۔" وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔

"عمر اسے اتنا احساس تو ہونا چاہیے تھا نا کہ ایک مسلمان عورت۔۔۔"

"گڈ لارڈ۔۔۔ یار تم اس بات کو ختم کرو اب۔۔۔ مسلمان عورت۔۔۔ مسلمان عورت۔۔۔ تم بار بار اس بات کو کیوں درمیان میں لے آتی ہو۔ یہ کوئی مذہبی معاملہ تو نہیں ہے نا اور مذہب کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا۔"

عمر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ عمر نے اپنی اکتاہٹ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ مذہبی معاملہ ہی تو ہے اور مذہب ماتھے پر ہی لکھا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے انداز و اطوار بتا دیتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔" امامہ نے اپنے لہجے کو دھیما رکھا تھا۔ ان کے درمیان یہ باتیں عام انداز میں ہو رہی تھیں۔ ماحول کو وہ دونوں ہی کشیدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"مائی ڈیئر امامہ عمر! میں آپ کو، اگر آپ چاہیں تو کچھ ایسے مسلمانوں سے ملواؤں گا کہ آپ نا صرف حیران بلکہ پریشان ہو جائیں گی۔ مسلمان اب نام کے مسلمان رہ گئے ہیں محترمہ۔۔۔ وہ تمام الٹی سیدھی ایکٹیویٹیز کے بعد بھی خود کو فخر سے مسلمان کہتے ہیں۔۔۔ آپ ایک دین ولن کو دیکھ کر خفا ہیں۔ میں آپ کو ایسے ایسے اللہ دتہ اور غلام مصطفیٰ دکھاؤں گا کہ آپ اپنے کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔"

اس نے امامہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ امامہ چند لمحے چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"خامیاں یا خوبیاں انسانوں میں ہوا کرتی ہیں مذاہب میں نہیں۔ مذاہب سچے ہوتے ہیں، اچھے ہوتے ہیں۔ ان کو ماننے والے سچے ہوتے ہیں، اچھے ہوتے ہیں مگر مذاہب کسی شخص کی برائی یا اچھائی کے ضامن نہیں ہوتے۔ اسی طرح اسلام کا ہر ماننے والا واقعی ماننے والا ہے یا نہیں یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔"

امامہ بے حد نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔ گفتگو کا رخ کہیں سے کہیں چلا گیا تھا۔ عمر نے اس کی بات کو سُن تو لیا تھا مگر جواباً وہ سوچ میں پڑ گیا تھا پھر چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد وہ بولا تھا۔

"میں زیادہ اچھا مسلمان نہیں ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔"

"اسلام میں ہر بات بہت کلیئر ہے۔ یہ سالن میں ڈالے جانے والا نمک مرچ یا چائے میں ڈالی جانے والی پتی نہیں ہے کہ اس کی تھوڑی یا زیادہ مقدار سے کسی قسم کی گریڈنگ کی جا سکے۔ مسلمان یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔ اسلام ہمیں کچھ طور طریقے بتاتا ہے، کچھ اصول وضع کرتا ہے اور زندگی گزارنے کے کچھ آئین یعنی "دین" دیتا ہے۔ اب طور طریقوں کو ماننے والا، ان اصولوں کو اپنانے والا اور اسلامی آئین یعنی دین کے رستے پر چلنے والا شخص ہی مسلمان کہلانے کا حقدار ہے۔"

"بات بہت سادہ ہے اور بہت پیچیدہ بھی ہے۔۔۔ ہم اگر یہ کہیں کہ اللہ ایک ہے اور نبی پاک ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور اس کے بعد ہم یہ کہیں کہ ہم پانچ نمازیں پڑھے بغیر بھی مسلمان ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسلامی مدار میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ایسا دوغلا تضاد اللہ کو پسند نہیں۔ اس طرح سے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ اللہ کے احکامات سے منکر ہیں۔ آپ اللہ کو مانیں اور اس کے احکام کو نہ مانیں اور پھر بھی آپ یہ کہیں کہ آپ مسلمان ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسلام میں اللہ ہے، رسول ہے، قرآن ہے، سنت ہے اور حدیث ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہے فقط نرمی ہے، آسانی ہے، راحت ہے، سکون ہے۔

اللہ نے جن چیزوں کو لازم قرار دیا اور "فرض" ٹھہرا دیا، ہم کسی طور ان سے منکر نہیں ہو سکتے اور جب چیزوں کو اللہ کے رسول نے اپنا کر ہمیں رستہ دکھا دیا، اس کے خلاف جا کر ہم مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں۔۔۔ اس لئے تم مسلمان ہو تم میں بہت سی ایسی اچھی عادتیں ہیں جن کو اپنانا نبی پاکؐ نے لازم قرار دیا اس لئے تم مسلمان ہو لیکن تم عبادت گزار نہیں ہو کیونکہ تم نماز تو کبھی کبھار ہی پڑھتے ہو۔۔۔ اس لئے اگلی دفعہ بات کرتے ہوئے تم خود کو "اچھا مسلمان" یا "کم اچھا مسلمان" مت کہنا بلکہ اچھا "عبادت گزار" یا "کم اچھا عبادت گزار" کہنا۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ عمر نے اس کی بات کو پوری طرح سنا تھا جبکہ عمر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔" عمر نے سنجیدگی سے کہا تھا اس کے انداز پر امامہ ذرا سا مسکرائی۔ اسے احساس تھا وہ غصے میں کافی برا بھلا کہہ گئی تھی اسے۔ اس نے عمر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تم نے کل ایک بہت غلط بات کہی تھی تم سنڑولس کو ڈیفینڈ کیوں کر رہے تھے، تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

عمر نے بہت نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے ہٹا لیا تھا۔

"اس کے باوجود۔۔۔ اس کے باوجود امامہ، تمہیں کیٹیگرائز کرنے کا حق نہیں ہے کہ میں مسلمان ہوں یا نہیں ہوں کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان سے اس کے مذہب کا ثبوت مانگے بعض اوقات تم مجھے بہت "ریجڈ" لگتی ہو۔ جیسے کہ تم نے کل برتاؤ کیا۔ میں حیران ہو گیا تھا۔ میں کل بھی کسی کو ڈیفینڈ نہیں کر رہا تھا میں آج بھی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اتنا کنزرویٹو، اتنا ریجڈ مت بنو۔ یہ سر ڈھکنا اسکارف پہننا، بار بار دوسروں کو مسلمان نا ہونے کا طعنہ دینا۔۔۔ یہ غلط ہے۔۔۔"

عمر نے اس کے چہرے کے گرد نادیدہ دائرہ کھینچتے ہوئے لمحہ بھر کا توقف کیا"

ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولتا ہوا عمر اس لمحے امامہ کو بہت عجیب لگا۔ اس کے لئے عمر کا یہ روپ نیا ہی نہیں عجیب بھی تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر ایک نقطے پر اٹک گئی۔ اس نے عمر کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی

"تمہیں میرے سر کور کرنے پر اعتراض ہے۔۔۔ مطلب یہ تمہیں اچھا نہیں لگتا۔" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بہت حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔ ایک اور جھگڑے والا ماحول بن رہا تھا۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن۔۔۔ ہاں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا تم اس کے بغیر زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔" وہ اعتراف کر رہا تھا۔ امامہ کا منہ بن گیا۔

"تم نے پہلے کبھی نہیں کہا۔۔۔ یعنی کبھی روکا نہیں مجھے۔۔۔ آج سے پہلے۔" اس کا لہجہ ایک بار پھر روکھا ہو گیا تھا۔

اوہو۔۔۔ میں کیوں روکوں گا تمہیں۔۔۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، یہ میرا پرسنل معاملہ ہے اور تم اس کو پہنتی ہو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔ تمہیں اگر یہ پسند ہے تو تم کو اسے استعمال کرنے کا پورا حق ہے۔"

عمر کو اس کے چہرے سے اس کی خفگی کا اندازہ ہو رہا تھا اس لئے وہ قدرے اکتا کر بولا۔ وہ گفتگو کو ایک اور جھگڑے پر ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

امائمہ بھی یہ نہیں چاہتی تھی، اس نے ہونٹ بھینچ کر چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنا چاہا۔

"تھینک یو سوچ۔۔۔ یہ واقعی میرا پرسنل معاملہ ہے۔۔۔ تمہارے کہنے پر میں اسے ترک نہیں کر سکتی" کوشش کے باوجود وہ خود کو نارمل نہیں کر پائی تھی۔

"آف کورس۔۔۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں تمہیں۔۔۔ اور پلیز اب اس ٹاپک کو یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہے۔"

امائمہ چند لمحے خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اس کو یہی بہتر لگا کہ فی الوقت وہ بات کو طول نہ دے سو وہ چپ ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ کسی روز عمر کو سمجھا سکتی ہے مگر بعد میں وہ خود ہی بھول گئی تھی۔ عمر نے بھی دوبارہ کبھی اس کے لباس کے متعلق اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان دونوں کو ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ان کے درمیان خفگی کا باعث بن سکتا ہے سو وہ اسے دوبارہ چھیڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

تم کوئی صحت وحت بناؤ یار تمہاری باڈی بہت اسٹکی ہے۔ جم جایا کرو، باڈی بلڈنگ کرو، ورک آؤٹ کرو ورنہ تمہارا کپل بہت عجیب لگے گا کہاں وہ موٹو سیافورین اور کہاں تم۔"

جنید کے اس مشورے پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ اس وقت طلحہ، راشد اور جنید کے علاوہ بھی کچھ لڑکے کلاس میں ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ سب ہی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی وہ اسے باور کروا رہی تھی کہ وہ جنید کے مشورے کے پس منظر سے بخوبی واقف ہیں مگر کیسے اور کیوں۔۔۔ انہیں یہ سب کس نے بتایا تھا۔ اس نے یکدم طلحہ کی جانب دیکھا۔

"ہاں یار جنید اسے کوئی ٹوٹکہ بتاؤ موٹے ہونے کا یہ بھی تمہاری طرح کوئی ڈولے شولے (مسلز) بنالے" طلحہ بجائے شرمندہ ہونے کے جنید سے کہہ رہا تھا۔

"ایک موثر ٹوٹکہ ہے روزانہ تھوڑا ورک آؤٹ کرو اور صبح نہار منہ ایک گلاس دودھ میں کچا انڈہ پھینٹ کر ڈالو پھر آنکھیں بند کر کے غٹاغٹ پی جاؤ۔"

جنید نے ٹوٹکہ بتانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ وہ ان سب میں سب سے مضبوط کاٹھی کا مالک تھا اور اپنی عمر سے کافی بڑا لگتا تھا۔

"آنکھیں بند کر کے پینا ضروری ہے کیا؟" سلیم نے دلچسپی سے پوچھا۔ وہ ان سب میں سب سے لمبا تھا اور دبلا پتلا ہونے کے باعث عجیب سا لگتا تھا۔

"کچا انڈہ پینا آسان نہیں ہوتا بیٹا۔۔۔ بہت ہیک آتی ہے اور کافی دیر تک متلی کی کیفیت رہتی ہے لیکن آہستہ آہستہ عادت ہو جاتی ہے اور پھر فائدہ کتنا ہوتا ہے۔ مردانہ باڈی بنانے کے لئے اتنی مشقت تو کرنی ہی پڑے گی" جنید اپنے مسلز کو نمایاں کرتے ہوئے مزید کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے تنومند جسم پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا۔

"یخ ایسی مردانہ باڈی جس میں مردکو الٹیاں ہی لگی رہیں" سلیم نے ناک چڑھایا تھا۔

"تمہیں بتا کون رہا ہے۔۔۔میں تو اپنے اس چوزے کو بتا رہا ہوں جس نے بھینس جیسی لڑکی سے دوستی کی ہے۔" جنید نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"وہ میری دوست نہیں ہے۔" اس نے جنید کا ہاتھ جھٹک دیا۔اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔اسے اتنا غصہ آرہا تھا کہ اس کا دل چاہا وہ جنید کا منہ نوچ لے مگر اس کے اندر ہمت کی کمی تھی اور غصے کے باعث اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ کسی نے دھیان ہی نہیں دیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"بچا انڈہ پینے اور الٹیاں کرنے سے بہتر ہے انسان گرل فرینڈ بدل لے۔۔۔اکیڈمی میں سمارٹ لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے۔"

رمیض پہلی دفعہ بولا تھا۔سب ہنستے ہوئے تائیدی انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگے اور یہی وہ لمحہ تھا جب نجانے کیسے اس میں اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل جنید کو دے ماری جسے جنید نے مذاق سمجھ کر کیچ کر لیا تھا۔

"تم سب اپنی بکواس بند کرو۔۔۔میں نے کہا نا ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

وہ خرا کر بولا تھا تب ہی سب لڑکوں کو احساس ہوا تھا کہ وہ برا منا رہا ہے۔

"ہم بھی کن فضول باتوں میں پڑ گئے ہیں۔۔۔چلو کل کے ٹیسٹ کے متعلق سر رضوان سے پوچھتے ہیں۔۔۔تو اں چیپٹر بہت لمبا ہے۔۔۔آدھا کل کر لیں گے اور آدھا پرسوں۔۔۔ٹھیک؟" راشد نے اس کا انداز بھانپ کر سب سے پہلے موضوع تبدیل کرنا چاہا تھا۔وہ در پردہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہ رہا تھا لیکن جنید نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔

"کر لیں گے کل کا ٹیسٹ ڈسکس۔۔۔پہلے یہ بات ختم ہو جائے۔۔۔ہاں بھئی تم بتاؤ ہم سے کیوں چھپا رہے ہو۔۔۔ساری اکیڈمی کو پتا ہے کہ صبا تمہاری گرل فرینڈ ہے۔"

جنید ہٹ دھرمی سے بولا تھا جس سے وہ مزید تپ گیا حالانکہ وہ بہت دھیمے مزاج کا لڑکا تھا جو کسی کی بھی اونچی آواز اور سخت لہجے سے خائف ہو جاتا تھا مگر اس وقت اسے اتنا غصہ آرہا تھا کہ وہ جنید جیسے بھاری تن و توش کے مالک لڑکے سے بھڑ گیا تھا۔

"میں نے کہا نا وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔تم اپنی بکواس بند کیوں نہیں کرتے۔" وہ جنید کے بالمقابل کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں کرتا بکواس بند۔۔۔وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔۔۔وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔۔۔وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔۔۔کر لو جو کرنا ہے۔"

جنید پر اس کے منمناتی آواز کا خاک اثر ہونا تھا الٹا وہ زیادہ بدتمیزی پر اتر آیا تھا۔اس نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور جنید کو دھکا دے دیا تھا۔ جنید نے عقب میں پڑے ڈیسک کا سہارا لیا اور ہاتھ میں پکڑی اسی کی فائل اس کے سر پر دے ماری تھی۔اس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا بلکہ ساتھ ہی دو چار گھونسے بھی اس کے چہرے اور پیٹ میں مارے تھے۔وہی لڑکے جو ان کے ساتھ بیٹھے تھے اس کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے سے ڈر کر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔راشد نے باہر نکلنے میں پہل کی تھی جبکہ طلحہ اور رمیز، جنید کو روک رہے تھے۔جنید کے بھاری ہاتھوں سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہلکی نیلی قمیص سرخ خون سے داغدار ہو گئی تھی۔

"زیادہ ہی شوخی میں آ گیا تھا، اس کو سبق سکھانا ضروری تھا۔" جنید نے زمین پر تھوکتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔وہ غصہ جو اس کے

دماغ کو چوھا تھا وہ جنید کے چند گھونسوں نے لمحہ بھر میں اتار دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس غبارے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس میں ہوا بھرتے ہی وہ پھٹ گیا ہو۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" یکدم داخلی دروازے سے ایک سخت گیر آواز سنائی دی تھی۔ باہر نکلنے والوں لڑکوں میں سے کسی نے شکایت کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

پھٹے ہوئے غبارے کے منہ سے مزید خون بہنے لگا۔

☆ ☆ ☆

میری زندگی کا پندرہواں سال۔۔۔

کو ہو اور مسٹر ایرک عمروں اور مزاج کے تفاوت کے باوجود تقریباً ایک ڈیڑھ سال سے خوشحال شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے۔ ہمارے فارم ہاؤس پہ انکا مکمل قبضہ تھا اور فارم ہاؤس میں جو کچھ تھا مجھ سمیت اب ان کے اختیار میں تھا۔

وہ دونوں ایسے باہم شیر وشکر ہو گئے تھے کہ بعض اوقات میں ان کو دیکھ کر حیران ہوتا کہ یہ پہلے اپنی اصلی روپ میں تھے یا اب ان کا اصل روپ میرے سامنے آیا تھا۔ وہ دونوں خود غرض تھے، لالچی، من موجی اور فضول خرچ بھی تھے۔ میں نے دوبارہ کبھی انہیں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے دیکھا وہ۔ کبھی میرے سامنے جھگڑے۔

کو ہو خوبصورت تھی۔ ماڈلنگ اور اداکاری اسکا جنون تھا۔ اُسے سوسائٹی بٹر فلائی بن کر رہنا اچھا لگتا تھا۔ وہ جی جان سے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے اپنے اس جنون کو پورا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ مہینے کے زیادہ دن گرینڈ پا کے لندن والے گھر میں گزارتی۔ اسکا حلقہ احباب پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ اس کے سینکڑوں چاہنے والے تھے اور اس کے پرستاروں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اب وہ ڈیزائنرز کپڑے پہنتی تھی۔ مہنگی ایسیسریز استعمال کرتی تھی جس سے اس کی شخصیت مزید دمکنے لگی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُر اعتماد ہو گئی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ابھی تک اسے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ملا تھا جس سے وہ پائے کی اداکار بن کر سامنے آسکتی۔ اس نے مشہور جریدوں کے لئے ہزاروں پاؤنڈز خرچ کر کے بہترین شوٹس کروائے تھے۔ لیکن وہ منزل جس کی اسے تلاش تھی ابھی بہت دور تھی۔

مسٹر ایرک کو ہو سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ ان کا شوق بھی میرے گرینڈ پیرنٹس کی دولت کا محتاج تھا۔ وہ سوٹڈ بوٹڈ ہو کر منہ میں پائپ لے کر اپنے حلقہ احباب میں سب سے منفرد اور اٹیکچول نظر آنے کے شوقین تھے۔ انہیں کسینو جانے، بڑی بڑی رقموں پر جوا کھیلنے اور پھر ہار جانے کا خبط تھا۔ وہ ڈربی میں گھوڑوں پر بھی لمبی رقمیں خرچ کرتے اور خوش رہتے۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کبھی جیتتے بھی تھے یا نہیں لیکن وہ اکثر ہارتے تھے۔ مجھ سے وہ دونوں ہی اپنے معاملات زیرِ بحث نہیں لاتے تھے لیکن میں اب بڑا ہو رہا تھا اُس کے رہن سہن اور شاہانہ طرزِ زندگی سے۔ بہت سی باتیں مجھے خود بخود سمجھ آنے لگی تھیں۔ قدرت نے مجھے ایسی زبردست قوتِ مشاہدہ عطا کی تھی کہ میں ایک نظر سے۔ بہت سی باتیں ان سنے، ان کہے بنا جان لیتا تھا۔

میرے لئے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے گرینڈ پیرنٹس کے پاس اتنی وافر دولت تھی تو ہمارا طرزِ زندگی اتنا سادہ کیوں رہا تھا۔ ہمارے گھر

کا ماحول، ہمارے درمیانے درجے کے دوست، عام رہن سہن کسی نے بھی کبھی مجھے احساس نہیں دلایا تھا کہ ہم کوئی ہائی پروفائل خاندان کا حصہ ہیں۔ گرینڈ پا اور گرینی کے دوست ملکوں ملکوں بکھرے تھے۔ لیکن گرینی بھی کبھی خود کو شاہی فرد نہیں سمجھتی تھیں۔ مجھے ہمیشہ اپنا کام خود کرنے اور محنت سے کرنے کا درس دیا گیا۔ انہوں نے جہاں میری لاتعداد خواہشات پوری کی تھیں وہیں بہت سی خواہشات پر صبر کرنے کی تلقین بھی کی تھی جبکہ کو ہو کے رنگ ڈھنگ کسی مہارانی سے کم نہیں تھے۔ اور یہی حال سٹرایرک کا بھی تھا۔ وہ دونوں شاہی افراد سے بھی زیادہ شاہی طرز زندگی اپنا چکے تھے۔

ایک بات کا اعتراف میں ضرور کروں گا کہ ان کی قسمت میں کچھ نا کچھ جادوئی عنصر ضرور تھا۔ ان دونوں کے ملنے سے ہماری دولت کو خمیر لگ گیا تھا اور وہ تیزی سے پھلنے پھولنے لگی تھی جبکہ میں جس کے پھلنے پھولنے کی عمر تھی ان کے سائے میں کمہلا رہا تھا۔

ایک مشروم کی طرح جو درختوں کے سائے میں اگتی پھلتی پھولتی ہیں اور پھر دھیرے دھیرے مرجھا جاتی ہے۔ میں اسی طرح ان کے سائے میں پل رہا تھا۔ میں بظاہر آزاد اپنی مرضی کی خود مختار زندگی گزار رہا تھا مگر میری ہر حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی۔ وہ ہر بات کے متعلق سوال کرتے تھے اور ہر چیز پر ٹوکتے تھے۔ میں ان کی باتوں سے اکتا تا تھا لیکن میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ قانونی طور پر میں ان کا محتاج ہوں اس لئے ان کی مرضی کے تابع رہنا مجبوری تھی۔

میری زندگی میں دلچسپی کا دائرہ اب میرا اسکول اور میری کتابیں تھیں۔ میں نے اپنا پرانا اسکول "کیو ای جی ایس" جوائن کر لیا تھا۔ میں اپنے ہم عمر دوستوں سے کچھ پیچھے رہ گیا تھا لیکن میرا پڑھائی کا جنون بہت آگے تھا۔ گرینڈ پا کی ذاتی لائبریری اب میرے مصرف میں تھی۔ یہ لائبریری سٹرایمرسن کی لائبریری کی طرح شاندار تو نہیں تھی لیکن میرے شوق کی تسکین کا باعث بن رہی تھی۔ مجھے نت نئی چیزیں سیکھنے کا شوق تھا اور مطالعہ کا جنون۔۔۔ میں زندگی کے چلن پر راضی اور اُس کے طریق پر مطمئن ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ میری گرل فرینڈ کی دوست ہے۔" ایلینور نے میری نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر کہا تھا۔ میں واقعی اس سمت سے جیسے چیک کر رہ گیا تھا جہاں وہ دو لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ میری نظروں کا مرکز براؤن رنگت والی لڑکی تھی اور یہ چیز ایلینور نے بھانپ لی تھی۔ ہم دونوں دراصل اسی کی کزن کی برتھ ڈے پارٹی میں شریک تھے۔ ایلینور کی فیملی سے ہمارے دیرینہ مراسم تھے۔ اس کے ڈیڈی اور انکل، گرینڈ پا کو انکل کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہم ایک ہی علاقے میں رہتے تھے اور ہمارے اسکول بھی مشترک تھے۔ وہ "کیو ای جی ایس" میں بارہویں کلاس میں تھا جبکہ میں چونکہ ایک سال کھو اچکا تھا اس لئے عمر میں اس کے برابر ہونے کے باوجود اسکول میں اس کا جونیئر تھا۔ اُس کی کزن راکیل سے بھی میری اچھی دوستی تھی لیکن اس پارٹی میں ایلینور مجھے گھسیٹ کر لایا تھا۔ راکیل بھی ہمارے ہی اسکول میں تھی لیکن گرلز ونگ چونکہ ہمارے ونگ سے الگ تھا اس لئے ہم اپنی کلاس فیلوز کو زیادہ جانتے نہیں تھے۔ ایلینور کا خیال تھا اس پارٹی میں ہمیں بہت سی ایسی کلاس فیلوز سے ملنے کا موقع ملے گا جو کبھی بہت پہلے جونیئر ونگ" مالبیری ہاؤس" میں ہمارے ساتھ لنچ شیئر کیا کرتی تھیں۔ وہ لڑکی جسے میں دیکھ رہا تھا اسے میں نے پہلے کبھی راکیل کے ساتھ" کیو ای جی ایس" کے مشترک ایونٹس میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھے جانے کیوں شناسا سی لگتی تھی۔ مجھے شک تھا کہ شاید وہ" مالبیری ہاؤس" میں ہمارے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ شاید اس کا چہرہ کسی اور چہرے کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا جو مجھے فی الحال نہیں یاد آ رہا تھا۔

"اس کا نام کیا ہے ایلینور۔۔۔ یہ" مالیبری ہاؤس" میں تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے اسنیکس والی ٹرے میری جانب بڑھائی۔ میں نے اس میں اس میں سے ایک پیزٹ اٹھالیا۔

"نہیں۔۔۔ یہ رکوی کی کوئی نئی دوست ہے۔۔۔ بڑی باکمال لڑکی ہے۔۔۔ بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔"

وہ اپنے پیزٹ کو بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت منہ میں منتقل کر رہا تھا۔ وہ شکل صورت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی حرکتیں اور عادات بہت بے ڈھنگی تھیں۔

"اس کا نام تو بتاؤ؟" میں نے بھی ایک لقمہ لیا۔

"ٹیا۔۔۔ لڑکی تو اچھی ہے لیکن بہت نخریلی ہے۔۔۔ موڈ اچھا ہو تو اچھے طریقے سے بات کرتی ہے لیکن اگر موڈ اچھا نہ ہو تو دیکھتی بھی نہیں ہے۔"

اس نے اپنا لقمہ چباتے چباتے مجھے بتایا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔۔۔ مجھے ان سب باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ میں تو کوئی ایسی بات پوچھنا چاہ رہا تھا جس سے اپنے دماغ میں چلتی کشمکش کو اس کی پہچان دے سکوں۔

"ٹیا۔۔۔" میں نے دہرایا۔ میں نے یہ نام پہلی بار سنا تھا۔ اسی دوران میوزک کی بیٹ اور والیوم چینج کر دی گئی تھی۔ اب بہت تیز میوزک چلنے لگا تھا۔ سب لوگ ہال میں قریب ہونے لگے۔

"آؤ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔" ایلینور نے میرا ہاتھ گھسیٹا۔ ٹرے ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ تیز میوزک کی وجہ سے مجھے اس کی آواز سننے میں مشکل ہوئی تھی۔ وہ رکوی کے قریب چلا گیا جبکہ میں وہیں کھڑا رہا۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی۔ مجھے زندگی نے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی کہ میں کسی لڑکی کو متاثر کرنے کے گر سیکھ سکتا اور میری شخصیت ایسی تھی کہ کبھی کسی لڑکی نے مجھ سے دوستی میں پہل کی ہی نہیں تھی۔ سب لوگ جوڑوں کی شکل میں ناچنے لگے پھر ہانپنے لگے۔ وہ لوگ جو زیادہ پُرجوش تھے ابھی بھی سلسلہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ تھک جانے والے دائرے کی صورت میں پیچھے ہٹنے لگے جبکہ تین چار لوگ اس دائرے کے اندر ابھی بھی پُرجوش تھے۔ انہی میں وہ لڑکی بھی تھی جس کا نام ایلینور نے "ٹیا" بتایا تھا۔

وہ بیک لیس بلاؤز اور تنگ اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے پاؤں میں ہائی ہیل شوز تھے لیکن کوئی بھی چیز اس کی مہارت میں رکاوٹ پیدا نہیں کر رہی تھی۔ سب ہی لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کر اسی کا ساتھ دے رہے تھے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اتنا ہی اچھا ناچ سکتا اور اس کا ساتھ دے سکتا لیکن مجھ میں ایک جھجک سی تھی میں تو تالیاں بھی نہیں بجا رہا تھا۔ میں تو صرف اپنا بئیر والا ہاتھ بلند کر کے اس توانائی والے ماحول کے ساتھ لمحہ بھر کے لئے مکس اپ ہونے کی کوشش کرتا اور پھر خود ہی خود کو ہونق محسوس کر کے ہاتھ نیچے کر لیتا۔ میری نظروں کا مرکز و محور وہی لڑکی تھی اور اسی دوران جب وہ اپنے کندھوں سے نیچے آتے سیاہ گھنگھریالے بالوں کو جھٹکا دے کر گھومی تو مجھے اس کے پُرکشش چہرے میں وہ چہرہ یاد آگیا جسے میں کب سے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تھا تھیا تھیا۔۔۔ تھیا تھیا۔۔۔ تھا تھیا۔۔۔" میرے ارد گرد چٹیا میں گندھے بال اور گھنگھرو ایک دم واضح ہوئے تھے۔

"میتاراؤ۔۔۔" مجھے یاد آگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تمہیں ایک نظر میں پہچان لیا تھا۔" نیا نے اپنے پرکشش چہرے سے بالوں کی لٹ کو ہٹایا۔ میں شرمندہ ہو کر مسکرایا اور کندھے اچکائے۔ وہ مزید مسکرائی۔

"تم ابھی تک ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔" اس نے منہ میں دبی ببل گم کو چبا کر ببل گم پھلایا جو ٹھک کر کے پھٹ گیا۔ اسٹرابیری کی مہک میرے اردگرد پھیل گئی۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی اسٹرابیری کے رنگ کی تھی۔۔۔ خوشنما۔۔۔ خوش کن۔۔۔

"نہیں۔۔۔ اب کچھ بہتر ہو گیا ہوں۔" میں نے سابقہ کی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا حالانکہ یہ غلط تھا۔ میں اس کے سامنے خود کو آج بھی احمق ہی محسوس کر رہا تھا جبکہ وہ تو وہ تھی ہی نہیں۔۔۔ سر سے لے کر پاؤں تک، مزاج سے لے کر عادات تک حتیٰ کہ اس نے نام بھی بدل لیا تھا۔ میری بات پر اس نے مختصر سا قہقہہ لگایا۔

"پہلے سے کیوٹ ہو گئے ہو۔" اس نے میرے چہرے کو انگلی سے چھوا۔ میں یکدم جیسے ہوا میں معلق ہو گیا۔

"شکریہ۔۔۔ تم بہت بدل گئی ہو۔" میں نے بے ساختہ کہا تھا۔ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ مجھے امید ہی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے اس طرح کھڑی ہو کر بات چیت کرے گی بجائے التفات سے بات کرنا۔ وہ ڈانس کے بعد بہت سی نگاہوں کا مرکز تھی۔

"ہاں۔۔۔ میں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہوں۔" میں نے بلاوجہ دانت نکالے۔ وہ میرے قریب ہو گئی تھی۔ اس کا تنفس تیز تھا اور رقص کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بہت اچھا پرفیوم لگا رکھا تھا۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" میری خاموشی سے اس نے شاید یہ مفہوم لیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔" میں نے فوراً کہا۔

"تمہیں تو ٹھیک سے ایک لڑکی کی تعریف بھی نہیں کرنی آتی۔۔۔ احمق۔۔۔" وہ میرے سامنے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹ کر پونی کی شکل دی پھر کلائی پہ بندھا بینڈ اتار کر بالوں کو اونچا کر کے باندھ لیا۔ اس کی گردن، شانے اور ہنسلی کی ہڈیاں مزید نمایاں ہونے لگیں۔ بالوں کی کچھ لٹیں گردن کے گرد محو رقص تھیں۔ پسینے کی چند بوندیں بھی گردن پر چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شوخ ہوئی۔

"مجھے غور سے دیکھو۔۔۔ کیا میں بہت خوبصورت نہیں ہوں؟" گردن کو اکڑا کر اس نے زعم بھرے انداز میں دریافت کیا۔ میں تو چاروں شانے چت ہو گیا۔

"تم اگر خوبصورت نہیں ہو۔۔۔ تو میں اندھا ہوں۔"

میں نے جملہ مکمل کیا اور اس نے قہقہہ۔

☆ ☆ ☆

"ویک فیلڈ کے لوگ انتہائی خشک ہیں۔۔۔ میں یہاں آ کر سخت پچھتا رہی ہوں۔" نیا نے میرے ساتھ چلتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا۔ ایلینور کی پارٹی کے بعد یہ ہماری دوسری ملاقات تھی جو بظاہر حادثاتی تھی لیکن میرا دل جانتا تھا کہ یہ معجزاتی تھی۔

میں لائبریری سے واپس آرہا تھا جب انتھونی ملا اور باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ٹیا اس کی بہن سے ملنے گھر آئی ہوئی ہے۔ میں اس سے جان چھڑوا کر آگے بڑھا تھا اور اپنا راستہ بدل کر اس کے گھر کی طرف ہو لیا تھا۔ میں تب تک اس کے گھر کے عقب میں کھڑا رہا تھا جب تک میں نے ٹیا کو بیرونی داخلی دروازے سے باہر نکلتے نہ دیکھ لیا تھا اور جب وہ واپسی کے لئے بڑھی تو میں نے فوراً اس کو جا لیا تھا لیکن اس نے ناپسندیدگی ظاہر کرنے میں لمحہ بھی نہ لگایا تھا۔

"تم ہندوستان سے کب آئی؟" میں نے کھسیانہ سا ہو کر یہ پوچھ لیا حالانکہ میں پوچھنا شاید کچھ اور چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ چلنے سے عجیب سا سحر مجھ پر طاری تھا میں سوچ کچھ اور رہا تھا بہہ کچھ اور رہا تھا۔

"عرصہ ہو گیا۔۔ کافی سال گزر گئے۔۔۔ ڈیڈی کا ٹرانسفر بہت پہلے ہو گیا تھا یہاں جب تمہارے گرینڈ پا ابھی روپ نگر میں ہی ہوا کرتے تھے۔۔۔ ہم اٹلی میں بھی رہے ہیں دو سال۔۔۔ اب تو عرصہ ہو گیا یہاں یو کے میں ہیں۔ چھٹیوں میں ہی جا پاتے ہیں انڈیا۔"

اس کا انداز پہلے سے زیادہ اکتایا ہوا تھا۔ میں نے کن اکھیوں سے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے حلیے، چال ڈھال اور اندازِ گفتگو میں کہیں سے بھی روپ نگر والی میتا راؤ نہیں تھی۔ وہ صرف ٹیا تھی۔

"تم بھی سالوں سے یہاں ہو اور بھی سالوں سے ہی پچھتا رہی ہو۔"

میرے منہ سے ایک بار پھر بے معنی و بے مقصد جملہ پھسلا۔ میں شاید اپنے حسِ مزاح کا استعمال کر کے اسے ہنسانا چاہ رہا تھا۔ وہ مسکرائی تک نہیں تھی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔

"اتنے سالوں سے ہم اس فضول ویک فیلڈ میں نہیں رہ رہے تھے۔ یہاں تو مجھے ڈیڈی کی وجہ سے آنا پڑا ورنہ میں اور میرے بھائی کارڈف میں رہتے تھے۔ میرے سب دوست وہاں ہیں۔ میرے بھائی بھی یہاں نہیں آئے۔ وہ وہیں ہیں۔ اسی لئے میں پچھتا رہی ہوں۔"

وہ سابقہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور راز کھلا۔ مرد کے لئے یہ بہت بڑا طعنہ ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی عورت اکتاہٹ کا شکار ہو۔ عورت کی ایک مسکراہٹ کی خاطر وہ ڈگڈگی والا بندر یا سرکس کا ہاتھی گھوڑا بھی بننے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں بغل میں دبی کتابیں منہ میں دبا لوں اور گھٹنے کے بل بیٹھ کر یا ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر اس کو کوئی کرتب دکھا سکوں تا کہ وہ مسکرانے لگے اور تالیاں بجانے لگے۔ عورت کی قربت کس قدر روحانی خلل کا باعث بن سکتی ہے ٹیا عرف میتا راؤ کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا تھا اور خود کو کسی احمقانہ بات سے روکا تھا۔ ویسے قصور میرا بھی نہیں تھا سترہ سال کا ہو جانے کے باوجود مجھے آج تک کسی لڑکی نے سمرائز نہیں کیا تھا۔ یا اس کی شخصیت کی کشش تھی جو مجھ پر سحر طاری کر رہی تھی۔

"تمہیں ابھی زیادہ دوست نہیں ملے ہیں اس لئے شاید تم اکتاہٹ کا شکار ہو رہی ہو۔۔۔ جب تمہارے فرینڈز بن جائیں گے تب تمہاری ساری بیزاری دور ہو جائے گی۔۔۔ ویک فیلڈ کے لوگ بہت ملنسار اور محبت کرنے والے ہیں۔" میں اسے تسلی اور در پردہ دوستی کی پیشکش ایک ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے بنا تاثر ظاہر کئے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے ہاتھ ڈال کر ایک ببل گم برآمد کی، اسکا ایک ٹکڑا اس نے اپنے منہ میں ڈالا اور دوسرا میری جانب بڑھا دیا جسے میں نے شکریے کے ساتھ وصول کر لیا۔

"یہاں میرے دوست خاک بنیں گے۔۔۔ یہاں کے لوگوں سے میرا مزاج ہی نہیں مل رہا۔۔۔غیر ضروری طور طریقے مجھے غیر فطری لگتے ہیں۔۔۔چھوٹی سی ببل گم بھی ایک لمبے اونچے شخص کو گردن جھکا کر شکریہ ادا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔میں کسی سے ایسی دوستی نہیں کر سکتی کہ ہمہ وقت شکریہ، بہت اچھا،یا بہت خوب کی عملی تفسیر بنی رہوں۔تم لوگ انہیں مہذب طور طریقے کہتے ہو میں انہیں غیر ضروری تکلفات کہتی ہوں۔۔۔یہ کیسی ملنساری اور محبت ہے۔" ببل گم چباتے ہوئے وہ، بہت اکتائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔میری ببل گم ابھی ہاتھ میں ہی تھی۔میں نے جھینپتے ہوئے اس کا ریپر اتارا اور اُسے منہ میں ڈال لیا جبکہ ریپر کو فٹ پاتھ پر پڑے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

"یہ میں نے پھینک دیا اپنے شکریہ کو ڈسٹ بن میں۔۔۔تم اس کو ملنساری اور محبت کہتی ہو؟" اس نے میری جانب دیکھا اور پہلی بار مسکرائی۔۔۔صد شکر مسکرائی۔میری مردانگی کو عجیب سی تسکین پہنچی۔من پسند عورت کے چہرے پر مسکان لانا کسی معرکے سے کم نہیں ہوتا۔

"تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم میرے ساتھ دوستی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے راہ میں آنے والے پتھر کو ٹھوکر ماری تھی۔

"تم مجھے ابھی بھی اس قابل نہیں سمجھتی۔۔۔؟ میرا شکریہ ڈسٹ بن میں پڑا ہے۔"

میں نے مصنوعی حیرانی سے کہا اور پیچھے کی جانب اشارہ کیا جہاں ڈسٹ بن تھا اس نے میری جانب دیکھا اور کھل کر مسکرائی۔

"یہ کتابیں ڈسٹ بن میں ڈال سکتے ہو؟" اس نے لائبریری کی کتابوں کی جانب اشارہ کیا جو میری بغل میں دبی تھیں۔وہ چلتے چلتے رک گئی تھی، مجھے بھی مجبوراً رکنا پڑا۔ہر مرد کی راہ کا پہلا پڑاؤ عورت ہی ہوتی ہے۔میرے سامنے نیا نہیں تھی میرا پہلا پڑاؤ تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا جن میں کتابیں تھیں اور ان کتابوں میں میرا دل تھا جبکہ سامنے ایک عورت کھڑی تھی جس کی ہنسی کتابوں سے کہیں زیادہ دلفریب تھی اس کے چہرے پر میرا امتحان لیتی ہوئی آزمائش تھی۔ایسی مسکراہٹ۔ایسی چمک ایسی لپک کتابوں کے چہرے پر چمکتی کب دیکھی تھی میں نے۔میری مزاحمت کمزور ہونے لگی تھی۔میرا پہلا پڑاؤ،میری پہلی دلدل،میری پہلی عورت۔۔۔فیصلہ ہو چکا تھا۔میں پیچھے کی جانب بھاگا اور کتابیں بھی ڈسٹ بن میں ڈال دیں پھر میں نے ہاتھ جھاڑ کر اس کے سامنے پھیلائے تھے۔اس نے قہقہہ لگایا۔میں شانت ہو گیا۔

من پسند عورت کا قہقہہ،قہقہہ نہیں ہوتا ڈگڈگی ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

میرے ڈیڈی، بھائی، کزنز اور انکلز۔۔۔سب کے سب مجھڑے ہیں۔یہ ہمیشہ تالیاں بجانے والے بنے رہنا چاہتے ہیں۔۔۔انہیں چڑ ہوتی ہے اگر کوئی اور ان کے لئے تالیاں بجائے۔۔۔مجھے اسٹیج پر ناچتا دیکھ کر ان سب کو ویسے ہی موت پڑ جاتی ہے۔۔۔ان کے خاندانی رتبے کو ٹھیس پہنچتی ہے۔۔۔اونہہ بھاڑ میں جائیں سب۔" نیا نے ہمیشہ کی طرح اپنے گھر والوں کا ذکر آتے ہی ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"اس لئے انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا؟" میں نے دل ہی دل میں اس کے گھر کے مردوں کی تنگ نظری پر تاسف محسوس کیا۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نہیں نکالا۔۔۔میں ہی انہیں چھوڑ کر یہاں آگئی ہوں۔۔۔میں تمہاری طرح چھوٹا نابالغ بچہ نہیں ہوں۔۔۔دودھ پینے والا۔۔۔میں اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔"

وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔اس کی نظریں میری کریم کافی کے کپ پر تھیں جبکہ وہ خود بلیک کافی پی رہی تھی۔اب وہ بالکل پہلے والی میتا راؤ لگ رہی تھی جس کے ہر عضو سے خود پسندی چھلکا کرتی تھی مگر وہ پہلے کی نسبت زیادہ باتونی ہوگئی تھی اور اپنے بارے میں بولنے کے لئے تو ہمیشہ تیار ہو جاتی تھی بالخصوص شخصی آزادی کی بات آتی تو وہ اپنے آپ کو اسکا سب سے بڑا علمبردار ظاہر کرتی تھی اور اس نے بالآخر مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے ممی ڈیڈی سے ناراض ہو کر کارڈف سے ویک فیلڈ اپنی کسی سہیلی کے پاس آئی ہے اور اسی کے گھر میں پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہ رہی ہے۔اس کے بقول اس کا خاندان اسے پابندیوں میں جکڑ کر رکھنا چاہتا ہے۔اس کے خاندان کے بارے میں پہلے سے ہی میں گرینڈ پا سے کافی کچھ سن چکا تھا۔

اس کا تعلق ہندوستان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سیاسی گھرانے سے تھا۔اس کے بہت سے انکل ہندوستانی سیاست کا اہم رکن تھے یا پھر تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے۔ان کے یہاں بھی وہ شعبے تھے جو رواج کی طرح ان کے رہن سہن کا حصہ بن چکے تھے لیکن تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس کے خاندان میں ذہنی پسماندگی پائی جاتی تھی جس کا اظہار میتا کی باتوں سے ہو رہا تھا وہ رقاصہ کے طور پر اپنا آپ منوانا چاہتی تھی جس کی اجازت اس کے گھر والے اسے نہیں دیتے تھے۔اس کا یہ خواب ایک بغاوت سے کم نہیں تھا۔اس نے گھر والوں کی ضد میں پڑھائی بھی ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"تمہاری ممی نے بھی تمہاری حمایت نہیں کی؟" میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"ممی ڈیڈی سے بھی زیادہ دقیانوسی اور اشتعال دلانے والی ہیں۔۔۔وہ مجھے تمہارے ساتھ ان کپڑوں میں بیٹھا دیکھ لیں نا تو انہیں دوسری سانس مشینوں پر دلوانے کے لئے ہاسپٹل لے جانا پڑے۔"

اس نے اپنی جانب اشارہ کر کے بات مکمل کی۔وہ بغیر آستینوں والی شرٹ کے ساتھ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔مجھے اس کی ممی کی سوچ پر بھی افسوس ہوا۔

"ہم لوگ دراصل اونچی جاتی کے ہندو ہیں۔میرے خاندان کے لئے ذات پات بہت اہمیت رکھتا ہے۔وہ مجھے رقص کرنے کی اجازت اس لئے نہیں دیتے کہ ان کے نزدیک یہ ہمارا مقام نہیں کہ ہم ناچیں اور لوگ تالیاں بجائیں۔"

اس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔میں نے سر ہلایا۔ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔دھوپ کی حدت کچھ پھیکی سی تھی لیکن میتا کے چہرے پر مجھے بہت مٹھاس محسوس ہو رہی تھی حالانکہ وہ بہت اکتائے ہوئے لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات پر مجھ سے اس طرح کھل کر بات کر رہی ہے۔میں نے کافی کے ڈسپوزیبل کپ کو مضبوطی سے تھاما۔وہ لاپروائی سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے جھولا جھولتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں رقص کرنا بہت پسند ہے نا" میں نے بلاوجہ پوچھ لیا حالانکہ اس کا جواب مجھے پتا تھا۔

"پسند بہت چھوٹا لفظ ہے دوست۔۔۔یہ میرا شوق ہے،میرا جنون،میری لگن" یہ موضوع اس کی توانائی کو بحال کر دیتا تھا۔

"ڈیڈی یہ بات سمجھتے ہیں۔۔۔وہ بہت مثبت سوچ کے مالک ہیں لیکن اپنی بات منوانے کے لئے خاندان بھر سے ٹکر لینے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔وہ مجھے رقص کرنے سے نہیں روکتے،سراہتے بھی ہیں مگر پبلک پلیس میں رقص کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔۔۔ان کے اپنے ہی

عجیب و غریب سے تحفظات ہیں۔۔۔ بہر حال مجھے پرواہ نہیں۔۔۔" اس نے سر جھٹکا تھا۔

" میں کسی ایکس، وائی، زی کے کہنے پر اپنے شوق سے، اپنے جنون سے منہ نہیں موڑ سکتی۔۔۔ میں اپنی لگن سے، اپنے آپ سے غداری نہیں کر سکتی۔۔۔ میں غدار نہیں ہوں۔۔۔ میں نان ویج نہیں کھاتی۔۔۔" وہ مگن انداز میں کہہ رہی تھی۔ میں چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ یہ نیا نہیں تھی۔ یہ تو وہی پرانی میتا راؤ تھی۔

" میں نان ویج کھاتا ہوں۔۔۔ مگر غدار نہیں ہوں۔" میرا لہجہ سپاٹ تھا۔ دل جیسے لرزنے لگا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے اسی پرانے ڈھکوسلے کو ساتھ لے کر چل رہی تھی۔

"تم تو رہنے ہی دو دوست! تمہیں کتاب سے محبت ہے نا، شوق سے کتاب پڑھتے ہو نا، اپنے شوق کو اپنی لگن تو بنا نہیں پائے تم۔ ایک لڑکی کے کہنے پر اپنے شوق کو، اپنی لگن کو کچرے میں پھینک دیا تم نے۔۔۔ مجھے دیکھو میرے جنون کی راہ میں جو بھی آیا میں نے پرواہ نہیں کی۔۔۔ اپنے ممی ڈیڈی کو بھی چھوڑ دیا مگر اپنی لگن سے منہ نہیں موڑا۔۔۔ میں نے کہا نا میں غدار نہیں ہوں۔"

اس کے لہجے کی سفاکی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔۔۔ 73ء کا زمانہ بدلا تھا، روپ نگر کا علاقہ۔



کانچ کا مسیحا

"کانچ کا مسیحا" محمد فیاض ماہی کا تحریر کردہ یہ خوبصورت ناول عشقِ مجازی سے لے کر عشقِ حقیقی تک کے سفر کی انوکھی داستان ہے۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے امیر زادے کی جو اپنا گھر بار، دولت، زمین جائیداد سب کو ٹھوکر مار کر حق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ معرفت کے اس راستے میں اُس نے کیسے کیسے امتحان دیے، کبھی پاؤں میں گھنگرو باندھ کر گلی گلی ناچا اور کبھی کشکول اٹھا کر در بدر کی خاک چھانی۔ رانی، ایک ہندو لڑکی جو اپنے مذہب سے بیزار اور حق کی پرستار ہے۔ وہ خالقِ حقیقی کو پانے کی جستجو میں سرگرداں اس نوجوان تک پہنچ جاتی ہے اور پھر تقدیر ان دونوں کو ایک انوکھے اور پاکیزہ بندھن میں باندھ دیتی ہے۔

"کانچ کا مسیحا" کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

"دنیا کے ساتھ وہ مت کیجئے جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا"

نور محمد کو لگا جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔ احمد معروف نے اس کو ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ کیوں "دنیا" سے اس درجہ متنفر ہو گیا تھا کہ اس نے ہر چیز سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ "دین" میں اسکی اجازت نہیں تھی۔ اللہ کو یہ پسند نہیں تھا اور نبیؐ اس رستے پر چلے نہیں تھے تو وہ کس کے کہنے پر یہ سب اختیار کر چکا تھا۔ وہ کیسے "تارک الدنیا" ہو گیا تھا۔ وہ کیسے "تارک الدنیا" ہو سکتا تھا۔

اس نے تو دنیا کو ایک عرصہ ہوا نظر بھر کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا وہ "دنیا" کو اس قابل ہی کب سمجھتا تھا۔ دنیا میں اس کے لئے رکھا ہی کیا تھا۔ اس نے گہری گہری چند سانسیں بھری تھیں۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ دنیا میں اس کے لئے کیا رکھا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر دونوں گھٹنے سینے سے لگا لئے تھے۔ وہ ذہنی طور پر بہت تکلیف میں تھا۔ احمد معروف نے اسکو اسکی دنیا یاد دلا دی تھی۔

"دنیا کے ساتھ وہ مت کیجئے جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا"

اس کے سینے پے جیسے بوجھ بڑھ گیا ہو۔ عجیب سا احساس تھا وہ اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چھوٹے سے کمرے میں بالکل تاریکی تھی۔ روشنی کا کوئی منبع یا ماخذ نہیں تھا مگر اسے نظر آ رہا تھا۔ تاریکی میں آنکھیں چند لمحے بعد کیسے دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں کیونکہ تب انسان کے اندر کی روشنی اسکی مدد کو آجاتی ہے۔ جس کے اندر جتنی روشنی ہوتی ہے اتنی ہی اس کے اندر تاریکی کے خلاف لڑنے کی سزا حمت ہوتی ہے۔۔ وہ بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے روم میٹس سوئے ہوئے تھے۔ سناٹا اور سرد خاموشی میں انکی سانسیں ہی تھیں جو ان کے زندہ ہونے کا احساس دلاتی تھیں۔ اس نے اس جانب دیکھا جہاں احمد معروف سو رہا تھا وہ اسکو اسقدر بے چین کر کے خود کیسے سو سکتا تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے زمین پر بچھے میٹرس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

"احمد معروف،، احمد معروف اٹھیے۔۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے" اس نے اپنی آواز کو بے حد پست رکھ کر اسے جگایا تھا۔ احمد معروف نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس طرح جگائے جانے کے باعث پہلا تاثر پریشانی کا ہی ابھرا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں مجھے نہیں جگانا چاہیے تھا آپکو۔ لیکن۔۔۔ میں ایسے نہیں سو سکتا"

"کیا ہوا ہے آپکو۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا" احمد کے لہجے میں پریشانی کا تناسب بڑھ رہا تھا۔

"احمد معروف کیا واقعی۔۔۔ دنیا بھی اللہ ہی کی ہے" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا اور وہیں ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کے دل کی عجب حالت ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اسے ایسا سوال اس سے نہیں پوچھنا چاہیے۔ وہ اسے کم عقل کم فہم سمجھے گا لیکن اس لمحے اسکی بے چینی کا علاج فقط اسی کے پاس تھا۔ وہ اور کسی سے اتنی باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی دوستی کو لاٹری کی رقم کی طرح کمایا تھا لیکن وہ اسے محنت کی کمائی کی طرح احتیاط کے ساتھ سوچ سوچ کر خرچ کرتا تھا۔ ابھی بھی اس نے بہت جھجک کر سوال کیا تھا۔ وہ ریشم کے تھان کی طرح جلدی جلدی کھل جانے والا شخص ہی نہیں تھا لیکن اب جب کہ وہ کھل چکا تھا تو وہ ریشم کا تھان بن چکا تھا اسے سمیٹنا

آسان نہیں رہا تھا۔

"یہ بات آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔۔۔ یہ بات آپکو معلوم نہیں ہے کیا۔۔۔ یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے" اس کے چہرے پر جواب دیتے ہوئے ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو نور محمد کے لئے بہت نئی تھی۔

"میں۔۔۔ میں کیسے بھول گیا۔۔۔ میں بھول گیا کہ دنیا کے ساتھ وہ نہیں کرنا جو ابلیس نے انسان کے ساتھ کیا تھا۔۔۔ مجھے بھولنا نہیں چاہیے تھا۔۔۔ نہیں بھولنا چاہیے تھا"

الفاظ اس کے منہ سے پھڑ پھڑا کر نکل رہے تھے۔ اسکا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ احمد نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟؟" وہ اس کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔ بس بعض اوقات بہت بے بس کر دیتا ہے۔ نور محمد نے بہت برداشت کیا۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اسکی ہمت جواب دے گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ یہ صورتحال احمد کے لئے بہت عجیب تھی۔

"نور محمد۔۔۔ آپ کو میری بات سے تکلیف پہنچی ہے۔۔۔" وہ بے چین ہو کر مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے ساتھ لیٹے وجود میں کسمساہٹ ہوئی تھی۔

"کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے رات کے اس پہر۔۔۔ پہلے ہی مجھے اتنی مشکل سے نیند آئی ہے۔۔۔ تم لوگوں کو یہ سب تماشے کرنے ہیں تو کمرے سے باہر نکل جاؤ" نور محمد کے ایک روم میٹ نے سنگدلی اور نیند کے غلبے میں ڈوبی آواز میں انہیں ٹوکا تھا۔ نور محمد نے اپنی آواز کو دبانے کے لئے ہاتھوں کو منہ پر رکھ لیا تھا۔ احمد معروف کو دلی افسوس ہوا۔ اسے وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ جانے انجانے نور محمد کے کرب کا باعث بنا تھا۔ اس نے تو بس "بات" کی تھی مگر نور محمد نا جانے اسقدر جذباتی کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے نور محمد کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔ یہ کمرہ مزید گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور اس لمحہ نور محمد کو دل کا حال سنانے کے لئے کسی سامع کی اشد ضرورت تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ کتنا بھی اچھا اسٹوڈنٹ کیوں نہ ہو، لیکن میں اس کی خاطر اتنے برسوں میں بنائی اپنی ساکھ خراب نہیں کر سکتا۔ ایک اچھا طالب علم تو ایک سال میں بنایا جا سکتا ہے مگر ایک ادارے کو بنانے میں دس سال لگ جاتے ہیں۔ میں کسی کو بھی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میری دس سال میں بنائی ہوئی عزت کو دس منٹ میں قدموں تلے روند کر رکھ دے۔"

حمید کاوانی کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ وہ اسکی اکیڈمی کے چیئرپرسن تھے اور اس کے ابو سے مخاطب تھے جنہیں فون کر کے اکیڈمی بلوایا گیا تھا اور سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ اس نے اس روز دیکھا کہ رائی کا پہاڑ آخر بنتا کیسے ہے۔ ایک لڑکی جس کا نام رابعہ نورین تھا اور جسے وہ صرف اس حوالے سے جانتا تھا کہ وہ اس کی کلاس فیلو تھی جو اس کے پاس چند ایک بار اسے نیچا دکھانے اور اس سے نوٹس مانگنے کی غرض سے آئی تھی وہ یکدم اس کی زندگی میں

ایک اہم نقطہ بن گئی تھی۔ اکیڈمی میں موجود سب لوگوں نے جنید کی باتوں کو سچائی کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ سب مکمل سچ بے شک نہیں ہوگا لیکن سب جھوٹ بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ حقیقت کہیں نا کہیں ہوتی ہے تو افسانہ جنم لیتا ہے۔۔ میں بہت مایوس ہوا ہوں مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ کا بیٹا بھی اس قسم کی حرکتوں میں ملوث ہو سکتا ہے"

حمید کادوانی اس کے ابو کے سامنے یہ سب کہہ رہے تھے۔ اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعویٰ کرنے والے حمید کادوانی کیا اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے کہ ٹیبل کے پیچھے کھڑے اس بزدل، ڈرپوک اور احمق نظر آنے والے لڑکے کی آنکھوں میں چھپی حقیقت کو پرکھ سکتے۔ طلحہ اور جنید ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھے۔ انہوں نے کلاس روم میں ہونے والے جھگڑے کو تین کی بجائے سات بنا کر حمید کادوانی کو سنا دیا تھا جبکہ وہ سچا ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ ثابت ہو گیا تھا سچ اور جھوٹ میں فقط انداز بیاں کا فرق ہوتا ہے۔ انداز بیاں نے جھوٹوں کو سچا ثابت کر دیا تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعویٰ کرنے والے چڑیا اور کوے میں فرق نہیں کر سکتے تھے پر گننا تو دور کی بات تھی۔ کادوانی صاحب فرد جرم عائد کر کے اب اس کے ابو کی شکل دیکھ رہے تھے۔ وہ سننا چاہتے تھے کہ اس کے ابو اس کی صفائی میں کیا کہتے ہیں اور صرف کادوانی صاحب ہی نہیں وہ خود بھی سننا چاہتا تھا کہ اس کے ابو اس کی صفائی میں کیا کہتے ہیں۔

ذلت کیا ہوتی ہے اس نے پہلی بار سمجھا تھا۔ یہ سب کچھ جو آج اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے حواسوں پر بم کی طرح پھٹ چکا تھا۔ دراصل بات بہت تیزی سے پوری اکیڈمی میں پھیل گئی تھی۔ وہ لوگ جو اسکی حمایت اور صفائی میں کچھ کہہ سکتے تھے وہ اچانک غائب ہو گئے تھے۔ جنید اور طلحہ کے والدین کو بھی بلوایا گیا تھا مگر انہوں نے اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کی بجائے فوراً اسے قصوروار ٹھہرایا تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو گئے تھے اس وقت اسے بھی اپنے ابو کی آغوش کی ضرورت تھی۔ ان کے کندھے کی جس پر سر ٹکا کر وہ خود کو ہر غم سے آزاد کر لیتا مگر ہمیشہ کی طرح ان کی آنکھوں میں لاتعلقی تھی، سفاکی تھی، بے رحمی تھی۔ ان کی آواز میں اس درجہ سرد مہری تھی کہ جب وہ بولے تو اس نے اپنی آنکھوں کے گیلے گوشوں کو برف بنتا محسوس کیا۔

"کادوانی صاحب! غلطی پہلی ہو یا آخری، غلطی ہوتی ہے اور میرے یہاں غلطی کی معافی نہیں ہے۔" انکے جواب نے اسے صرف حیران نہیں کیا تھا باقی سب کچھ کر دیا تھا۔ حمید کادوانی نے اس کے ابو کا انداز دیکھنے کے بعد اپنا فیصلہ برقرار رکھا تھا۔ وہ مزید اسے اپنے ادارے میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے اگرچہ جنید اور طلحہ کو بھی فارغ کر دیا گیا تھا مگر ان کے لئے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ہر قسم کے احساسِ جرم سے عاری تھے۔ حمید کادوانی اپنا فیصلہ سنا کر فارغ تھے ایک طالبعلم وہ ایک سال میں بنا سکتے تھے سو انہیں ایک اچھے طالبعلم کی ضرورت کیا تھی۔ بیٹے تو اداروں میں نہیں بنتے سو اس کے ابو کو تو اس کی ضرورت ہونی چاہیے تھے۔

"میرے ابو کو بیٹے کی ضرورت ہونی چاہیے۔۔۔ مگر نہیں ہے۔۔۔ کیوں؟"

لرزتے دل اور جھکی آنکھوں کے ساتھ وہ اپنی کتابیں سمیٹ کر اکیڈمی کے گیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ ابو اس سے کچھ دیر پہلے باہر نکلے تھے اور پھر اس کا انتظار کئے بغیر اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیئے تھے۔ اس نے انہیں لمحہ بھر بعد ہی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ بوندیں برسنے لگیں۔ اس کے ذہن سے جیسے سب کچھ مٹ رہا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا یا شاید وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔

وہ سائیکل پر بیٹھنے لگا تھا مگر اسکا ذہن بالکل ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اسے بھول رہا تھا کہ اسے کس سمت جانا ہے یا پھر شاید وہ اس سمت جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسکا دل ذلت خوف اور بے بسی کے عفریتوں نے جکڑ رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوئے کوتگو! ریل گاڑی میں پہلی بار بیٹھا ہے نا تو۔۔۔" جانے کس سمت سے آواز آئی تھی۔ کون پوچھ رہا تھا۔ وہ احمقوں کی طرح منہ اٹھا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ایک ننگ دھڑنگ، عجیب و غریب حلیے والا لڑکا کھڑا تھا جو پُر تجسس نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا اور اُلٹے ہاتھ سے وہ بھٹہ کھانے میں مصروف تھا۔ اس کا حلیہ اس قدر غلیظ تھا کہ اُس کو کھاتے دیکھ کر دیکھنے والے کو کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ بھکاری تھا اس لڑکے کی آنکھوں میں ایسی کھوج تھی کہ اس کا دل سہم سا گیا۔ دل کی حالت تو پہلے ہی بے حد عجیب ہو رہی تھی۔ سارے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اسے خود بھی نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے یا کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ فقط ہر چیز سے خود کو چھپا لینا چاہتا تھا۔ اسے کسی ایسے گوشے کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ اپنے ہاتھوں سے خود کو دنیا کے چہرے سے مٹا ڈالتا۔ دنیا کی ہر چیز یا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی یا وہ خود ہر چیز کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا مگر وہ یہ سب کر نہیں پا رہا تھا۔ وہ پوزیشن ہولڈر مگر سرٹیفائیڈ احمق تھا۔

رابعہ نورین والے واقعے نے اسے اس قدر ذلت سے دو چار کیا تھا کہ اُس کے حواس معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اکیڈمی کے گیٹ سے اپنے ابو کے چلے جانے کے بعد اپنی سائیکل پر بیٹھ تو گیا تھا مگر کتنی دیر اس کے پاؤں پیڈل پر مضبوطی سے جمنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کی آنکھیں لبالب پانی سے بھری تھیں۔ تارکول کی سڑک آنسوؤں کے لئے دو آبِ جو بن چکی تھی۔ وہ سائیکل چلا نہیں پا رہا تھا اسے لگا وہ شاید ڈوب رہا تھا۔

اس نے خود کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ کوشش وہ تب کرتا جب اسے سمجھ ہوتی کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ اسے حقیقتاً کچھ نظر آ رہا تھا نا سمجھ میں آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ سائیکل کے پیڈلز کو تیزی سے گھمانے لگا تھا۔ ہر ایک سیکنڈ بعد اس کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں؟" اس کے ذہن میں اسی ایک جملے کی تکرار تھی۔ ایسی ذہنی حالت کے ساتھ جانے کیسے وہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گیا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ یہاں سے دور چلا جانا چاہتا تھا اسی لئے وہ اسٹیشن تک آیا تھا لیکن یہاں آ کر وہ بالکل ہی دماغی طور پر ختم ہو گیا تھا۔ اسکا ذہن مزید کام کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن اس کے لئے ایک نئی جگہ تھی۔ وہ پہلے کبھی اس جگہ نہیں آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی لاتعداد چہرے بھانت بھانت کی آوازوں نے اسے مزید بوکھلا دیا تھا۔ ایک ہجوم بیکراں اسکی سائیکل کو اپنے ہمراہ لئے آگے بڑھ گیا۔ وہ کب، کس کے کہنے پر ٹرین میں سوار ہوا اسے کچھ پتا نہیں چلا تھا وہ فرار چاہتا تھا مگر ایسے نہیں۔ اسے اپنے آپ سے نفرت تھی مگر زندگی سے نہیں۔۔ یہ طے تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور گھر سے بھاگ جانے کے متعلق تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا تو وہ ٹرین میں سوار کیوں ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جس مخدوش ذہنی حالت میں اکیڈمی سے نکلا تھا۔ یہ ساری صورتحال اسی ذہنی حالت کا نتیجہ تھی۔ وہ ابو سے ڈرتا تھا انکے رویے سے خفا بھی تھا اور خائف بھی اسی لئے وہ ایک کے بعد ایک الٹی حرکت کرتا چلا جا رہا تھا جب اس بھکاری لڑکے نے ٹٹولتی نظروں سے اس سے سوال کیا تو وہ کافی بوکھلا گیا تھا۔

ٹرین نے ابھی چلنا شروع کیا تھا۔ ٹرین آگے اور ارد گرد کی چیزیں پیچھے کی جانب سرکنے لگی تھیں۔ وہ دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔

ٹرین کی رفتار تیز ہوتے ہی وہ ہجوم کی وجہ سے لڑکھڑاتے ہوئے دروازے تک جا پہنچا۔ گرد آلود ہوا کے تیز جھکڑ اس کے منہ پر تھپیڑوں کی طرح برسنے لگے تھے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بھکاری لڑکا اس سے انکوائری کرتے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ اس لڑکے کی آواز نے ہی اسے جیسے ہوش دلایا تھا۔

اس کا دل چاہا تھا کہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر رو دے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا۔ زندگی میں پہلی بہادری اس نے اسٹیشن تک آ کر کی تھی۔ دوسری بہادری اس کا ٹرین میں سوار ہو جانا تھا۔ تیسری بہادری یہ ہوتی کہ وہ حقیقت کا ادراک ہونے پر ٹرین سے چھلانگ لگا دیتا مگر وہ یہ کر نہیں پایا تھا۔ ٹرین کے دروازے سے آتی بدتمیز و بدہیئت ہوا اتنی خوفناک تھی کہ وہ دروازے کی جانب دیکھ ہی نہیں پا رہا تھا کجا کہ وہ چھلانگ لگاتا۔۔۔ اس نے بے حد وقت سے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور وہ بے خبر تھا۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے، میرے ابو کو بے شک میری ضرورت نہ ہو مگر میری امی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

"میں نے پوچھا تو ریل گاڑی میں پہلی بار بیٹھا ہے نا۔" اسی لڑکے نے سوال دہرایا تھا۔ اب کی بار اس کا انداز بے حد بارعب تھا کہ وہ بلاوجہ ہی اثبات میں گردن ہلا گیا۔

"تجھے پتہ ہے یہ ریل گاڑی کہاں جا رہی ہے؟" بھٹہ ٹرین کے دروازے سے باہر اچھالتے ہوئے دوسرا سوال پوچھا گیا۔ اس نے گردن نفی میں ہلائی تھی۔

"ساہیوال۔۔۔ ساہیوال جائے گا تو؟" بھکاری جانے کیوں ٹرین کا اینکر پرسن بن رہا تھا۔

"نا۔۔۔ نہیں۔۔۔" اس کی بہت سہمی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔

وہ جس بوگی میں سوار تھا وہ ٹرین کی آخری بوگی تھی۔ تمام مسافر اپنی وضع قطع سے دیہاتی اور پسماندہ حال لگ رہے تھے۔ رش بھی اس قدر تھا کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں تھی اور شور اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر بھکاری لڑکے کو انٹرویو کا شوق چرایا تھا۔

اس کے سہمے ہوئے "نہیں" پر وہ لڑکا چند لمحے آنکھیں سکیڑ کر اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اس نے تن پر لٹکائی پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیض کی جیب سے گولڈ لیف کی ڈبیہ نکال کر اپنے زخمی ہاتھ کی مدد سے ایک سگریٹ کھینچا تھا۔ سگریٹ سلگا کر بے حد اطمینان سے کش لگانے کے بعد اس کی جانب جھک کر اس نے آواز کو دباتے ہوئے پوچھا تھا۔

"گھر سے بھاگا ہے نا تو؟"

یہ سوال سن کر اس کی الجھی بکھری سانسیں رک سی گئیں تھیں۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے سامنے کھڑا ننگ دھڑنگ، وضع قطع سے بھکاری دکھنے والا وہ لڑکا کوئی عام لڑکا تو نہیں تھا۔ وہ تو کوئی درویش تھا، پیر تھا، ولی اللہ تھا جو چہرے دیکھ کر دل کا حال جان لیتا تھا۔ اس نے بے حد عقیدت سے "پیر و مرشد" کی طرف دیکھا اور پھر روتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

☆ ☆ ☆

"تم پڑھے لکھے لڑکے ویسے ہوتے ہی نخری ہو۔۔۔آدھے گھوڑے، آدھے کھوتے۔۔۔ہوتے کچھ ہو، نظر کچھ اور آتے ہو، کہنا کچھ اور ہوتا ہے اور کہہ کچھ اور جاتے ہو، چاہتے کچھ ہو ظاہر کچھ اور کرتے ہو۔۔۔میری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں نا۔۔۔"

سلیم نامی وہ بھکاری لڑکا بھنی ہوئی مرغی کی ٹانگ کو جبڑوں میں رکھ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔منہ بھرا ہوا ہونے کے باعث اس کی بات واقعی واضح طور پر کچھ نہیں آئی تھی۔وہ سلیم کی ہمراہی کو اپنے لئے ایک محفوظ سائبان سمجھنے کے باوجود دل ہی دل میں کچھ گھبرانے لگا تھا۔لاہور سے بھائی پھیرو اتر جانے تک سلیم اس سے سب اگلوانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب ایک تھڑی پر مشتمل چھوٹے سے ڈھابے میں مرغی کو ادھیڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی دھجیاں بھی اڑا رہا تھا۔

"جب اماں ابا کو پیچھے چھوڑ دیا تو پھر اب منہ لٹکانے کی کیا ضرورت ہے۔اچھی بھلی شکل کو تو ہینگا چبا فریم بنائے رکھتا ہے۔ایک بات سن میری۔۔۔تیرا پیو اچھا انسان ہوتا تو تجھے اس حال میں نہ پہنچاتا۔اس نے تجھے بھری محفل میں ذلیل کیا۔۔۔تیرا ساتھ بھی نہیں دیا اور تو اسے یاد کر رہا ہے۔۔۔قسمے میرا ابا ایسا ہوتا نا تو اسے ذبح کر کے کسی جنگل میں پھینک آتا۔"

سلیم کے انداز میں قطعیت بھری حقارت تھی۔اسے برا لگا۔

"میرے ابو نے مجھے اس حال میں نہیں پہنچایا۔۔۔وہ بہت اچھے ہیں۔یہ سب میری غلطیوں کی سزا ہے۔مجھے جنید، طلحہ اور راشد جیسے لڑکوں کو دوست نہیں بنانا چاہیے تھا۔وہ اچھے لڑکے نہیں ہیں۔"

"او تیرا باپ ان لڑکوں کا پیو تھا یا تیرا۔۔۔اسے سب کے سامنے کہنا چاہیے تھا کہ میرا پتر ایسا نہیں ہے اور ان دونوں لڑکوں نے جو بکواس کی وہ غلط ہے۔۔۔تیرا پیو اگر ایک بار تیرا ساتھ دیتا تو مجال ہے جو کوئی تجھے ذلیل کر جاتا۔میری ایک بات یاد رکھنا کہ یہ جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں نا یہ ہمیں بڑا ذلیل کرتے ہیں لیکن یہی اپنے کسی اور کو ہمیں ذلیل کرنے بھی نہیں دیتے۔تیرا باپ تجھے گھر کے جا کر جتنا مرضی مار لیتا مگر سب کے سامنے ایک دفعہ تیرے موڈھے (کندھے) پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا۔۔۔چل کھبا (بایاں) ہی رکھ دیتا مگر تیرا حوصلہ تو بڑھ جاتا۔۔۔ان خبیثوں کے منہ تو بند ہو جاتے۔"

سلیم بات کرتے دوران کھانے سے بھی خوب انصاف کر رہا تھا جبکہ وہ تو اس کی باتیں سن سن کر نئی نئی دنیائیں دریافت کرنے میں مگن تھا۔اسے سلیم کی باتیں سچی لگیں واقعی اسے بھی اس بات کا دکھ تھا کہ ابو نے اس کے بھروسے کا مان نہیں رکھا۔اسے سلیم کی باتوں نے احساس دلایا کہ وہ ابو کی مار پیٹ کے ڈر سے گھر سے نہیں بھاگا تھا بلکہ یہ ان کی آنکھوں میں چھپی نفرت اور حقارت تھی جس نے اس کی حیات کو مفلوج کر دیا تھا۔جنید اور طلحہ کے والدین بھی حمید کا دوانی کے بلانے پر اکیڈمی آئے تھے لیکن انہوں نے اپنے بیٹوں کو غلط نہیں کہا تھا جبکہ اسکے ابو نے سچائی کو پرکھا بھی نہیں تھا اور فرض کر لیا تھا کہ وہ جھوٹا ہے۔

"اوئے نخرا! اب منہ لٹکا کر مت بیٹھ۔۔۔روٹی ختم کر۔۔۔یہی زندگی ہے۔۔۔جن کو تیری پرواہ نہیں تجھے بھی انکی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔"

سلیم نے اخبار سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ایلومینیم کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جبکہ اس نے چند لقموں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا حالانکہ سلیم نے مرغی کے علاوہ بطور خاص اس کے لیے آلو قیمہ کا سالن بھی منگوایا تھا۔سلاد اور رائتے کا لطف بھی تھا مگر گھر سے دوری کا

احساس، آرام دہ بستر کا تصور اور سب سے بڑھ کر امی کے پیار بھرے لمس کی خواہش اسے پچھتاووں کا احساس دلا رہی تھی۔

"میری امی بہت اچھی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ وہ بہت پریشان ہو گئی ہوں گی۔۔۔رو بھی رہی ہوں گی۔"

اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ سلیم نے ناک پھلا کر اسے گھورا۔

"اوئے یہ مائیں بھی باپوں کی چمچیاں ہوتی ہیں۔ ان سے کوئی اچھی امید نہیں رکھنا۔ یہ باپوں کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔۔۔انہیں اولاد سے سواہ (راکھ) محبت ہوتی ہے۔۔۔چل میرا یار ایویں دل خراب نہ کر۔۔تیری ماں روتی ہو گی تو تیرا ابو ہے نا اس کے پاس آپی چپ کروا دے گا۔ چل میرا بھائی تو روٹی کھا لے۔۔۔اتنی نعمتیں تیرے آگے پڑی ہیں تو ناشکری مت کر۔۔۔پیٹ بھر لے۔۔۔کیا پتہ کل ملے نہ ملے۔۔۔آج تو اوپر والے کا بڑا کرم تھا۔۔۔اچھی دیہاڑی ہو گئی تھی۔۔۔"

سلیم کی ہوشیاری و تیز طراری، باتیں کرنے کا انداز اور اس کا شاہانہ ٹھاٹ باٹھ سب کچھ اسے بہت فطری لگا تھا۔ اسے لگا تھا کہ شاید اس طبقے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ فلمیں نہیں دیکھتا تھا، اخبار و رسائل بھی نہیں پڑھتا تھا۔ اس کا سوشل سرکل بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے کیسے کیسے لوگ بکھرے ہوئے ہیں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ اسے سلیم کی محبت اور ہمدردی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ جس طرح اس کا خیال رکھ رہا تھا، اسے بار بار کھانا کھانے کی تلقین کر رہا تھا اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بہلنے لگا تھا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" اس نے بچی ہوئی روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"گھر۔۔۔؟ گھر سے بھاگ کر آ گیا ہے اور اب مجھ سے گھر کا پوچھ رہا ہے۔۔۔ارے بیٹا یہ گھر ور کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں روٹی ملے کھا لو، جو پہننے کو ملے پہن لو، جہاں سونے کو جگہ ملے وہاں سو جاؤ۔۔۔یہی زندگی ہے۔۔۔اسے خوامخواہ کی کشمکش میں کیوں ضائع کرتا ہے؟" سلیم کا لہجہ مطمئن تھا۔ وہ اپنی شلوار کی جیب سے دو تین والٹ نکال کر اب ان میں موجود چیزوں کو ایک جگہ جمع کر رہا تھا۔ روپے ایک جگہ اور باقی چیزیں ایک جگہ رکھنے کے بعد اس نے روپوں کو گننا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک نوٹ اس کی جانب بڑھایا۔

"تم بہت اچھے ہو سلیم۔۔۔" وہ ممنون لہجے میں بولا پھر منہ میں لقمہ رکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے روپوں کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔مجھے تم جیسے دوست کی ضرورت ہے۔"

دیکھ پتر۔۔۔سلیم کسی کا دوست ووست نہیں ہے۔۔۔تو مجھے بڑا معصوم لگا ہے بس اس لئے تیری مدد کر رہا ہوں۔ مجھے رشتوں سے بڑی نفرت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو مجھ سے کوئی رشتہ جوڑے۔ میں تیرا خیال رکھ رہا ہوں، تیرے بھلے کی باتیں کر رہا ہوں تو ان کو غنیمت سمجھ۔۔۔تو میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو بے شک رہ لے مگر مجھے اپنا چاچا، ماما مت سمجھ۔"

سلیم نے نوٹ اس کی مٹھی میں دبایا اور باقی کی رقم دوبارہ سے جیب میں اڑس لی۔ اس کا دل سلیم کی باتوں پر ایک دفعہ پھر خوفزدہ ہوا تھا۔ وہ سلیم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ پہلی دفعہ اتنی رات کو گھر سے بلکہ شہر سے بھی باہر تھا۔ اس کو ڈھارس تھی تو بس سلیم کی۔ یہ سلیم کا حوصلہ ہی تھا کہ وہ پوری روٹی کھا گیا تھا۔ روٹی ختم کر کے اس نے پانی کا جگ اٹھانا چاہا تھا جب اسے احساس ہوا کہ سلیم کے چہرے کے

تاثرات بدل رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"اوئے کھوتے بھاگ۔۔۔" سلیم نے نعرہ لگایا تھا۔ وہ حیران پریشان اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا کسی نے اس کی گردن کو دبوچا تھا۔

"پکڑو ان حرامزدوں کو۔۔۔"

سلیم آناً فاناً کوٹھڑی کی کھڑکی سے باہر کود گیا تھا جبکہ وہ ہکا بکا مٹھی میں دبے نوٹ کو دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپکا بیٹا ایک بہت منظم گروہ کا آلۂ کار بننے سے بال بال بچا ہے۔ ہمارے مخبر کی اطلاع پر ہم پکڑنے کسی اور کو گئے تھے اور پکڑ کسی اور کو لائے۔ سلیم نامی وہ بھکاری نا صرف جیب کترا ہے بلکہ بہت بڑا ٹھگ بھی ہے وہی آپ کے بیٹے کو ورغلا کر لاہور سے بھائی پھیرو لے آیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کو بھی اپنے گروہ میں شامل کر لیتا۔ پولیس کی کامیاب کاروائی سے ہم اس کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔"

سب انسپکٹر بہت فخر سے اپنی کارگردگی ابو کو بتا رہا تھا جبکہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کہیں دور چلا جائے۔ چند گھنٹوں میں اس کی زندگی میں اتنا کچھ ہوا تھا کہ وہ سوچتا تھا تو اس کا سر دردسے پھٹنے لگتا تھا۔ وہ بے حد سہما ہوا تھا۔ سب انسپکٹر نے سلیم کو فرار ہوتا دیکھ کر کوئی کاروائی نہیں کی تھی لیکن اس کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ اس پر تشدد بھی کیا گیا تھا پھر جانے کیسے سب انسپکٹر کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ اسی نے اس کا فون نمبر لے کر اس کے ابو کو لاہور سے بلوایا تھا اور اب وہ ایک بوسیدہ کرسی پر ابو کے ساتھ بیٹھا سب انسپکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ ابو کے آ جانے سے اسے بے پناہ تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے اسے حسبِ معمول گلے نہیں لگایا تھا لیکن وہ چہرے سے پریشان لگ رہے تھے۔ ان کو پریشان دیکھ کر وہ مزید شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میں نے ابھی اوپر اطلاع نہیں دی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شریف لوگ ہیں۔ پولیس کیس ہینڈل کرنا آپ لوگوں کے لئے مرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے میں نے آپ کو فوراً فون کروا دیا جی۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ معاملہ طریقے سلیقے سے نبٹ جائے۔۔۔ آپ پوچھ لیں اپنے بیٹے سے ہم نے اسے ایک بھی تھپڑ نہیں مارا۔۔۔ آپ تسلی کر لیں۔۔۔ مجھے بھلے انسان لگتے ہیں آپ۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کے لئے یہ سب کچھ کس قدر پریشان کن ہے۔"

اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سب انسپکٹر اس کے ابو کو تسلی دے رہا تھا۔ اس نے ابو کی جانب دیکھا۔ ان کی نظریں بھی لمحہ بھر کے لئے اس کی طرف اٹھی تھیں۔ کیا نہیں تھا ان کی نظروں میں۔۔۔ اس نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر کو اترتے ہوئے محسوس کیا ان کا لہجہ بے حد سرد مہری لئے ہوئے تھا۔

"آپ کی مہربانی محترم۔۔۔ اپنا مطالبہ بتائیے۔۔۔" سب انسپکٹر سے بات کرتے ہوئے بھی ان کا چہرہ سرد مہری لئے ہوئے تھا۔

"آپ خود سمجھدار ہیں جناب"۔۔۔ میں منہ سے کہہ کر کیوں گنہگار بنوں۔۔۔ جو آپ کو مناسب لگے وہ عطا کر دیجئے۔ آپکا بچہ ہو یا ہمارا۔۔۔

بات ایک ہی ہے۔۔۔ آپ کو شکر کرنا چاہیئے کہ یہ ہمارے ہتھے چڑھ گیا ورنہ آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس کے ابو نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر سب انسپکٹر کی ٹیبل پر عین اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سب انسپکٹر نے فوراً لفافہ جھپٹ کر اپنی ٹیبل کی دراز میں رکھ لیا۔

"مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ ایک سمجھدار انسان ہیں۔" سب انسپکٹر کی لن ترانی عروج پر تھی۔ اس کے ابو نے بے حد حقارت سے اس کو دیکھا اور اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اوئے حوالدار۔۔۔ انہیں باہر تک چھوڑ آؤ۔" سب انسپکٹر اپنی کرسی پر لڑھکتے ہوئے بولا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں نے کبھی اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔۔۔ کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لئے مجھے کسی کی غلط بات۔ برداشت کرنی پڑی ہو۔۔۔ پچھتانے کے لئے کبھی میرے پاس ایک ذرہ بھی نہیں رہا۔۔۔ کبھی کسی کو رشوت دی نہ لی۔۔۔ مگر آج۔۔۔ آج اس منحوس کی خاطر یہ قبیح فعل سر انجام دینا پڑا۔۔۔ کاش یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔۔۔ کم از کم آج کا دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔۔۔ یہ ہوتی ہے اولاد اور یہ ہوتے ہیں اس کے کرتوت۔۔۔ ایسی اولاد سے بہتر ہے انسان بے اولاد مر جائے۔۔۔ تمہاری اولاد نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کسی گاڑی سے ٹکرا کر ختم ہو جاؤں، ندی میں کود جاؤں یا زہر کھا لوں۔۔۔ اسے کہو میرے سامنے سے دفع ہو جائے۔۔۔ میرے دل میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

اس کے ابو اس کی امی کے سامنے با آواز بلند اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کی بہن دروازے کے عقب میں دبکی کھڑی تھی جبکہ وہ ابو کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹوں بعد گھر آیا تھا اور آتے ہی وہ کٹہرے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ ابو نے بھائی پھیرو سے لاہور تک کے رستے میں اسے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ اس سے مخاطب بھی نہیں ہوئے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اونچی آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ امی کی اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اسے گلے لگا لیتیں مگر ان کی آنکھیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ بہت زیادہ روتی رہی ہیں۔ اسے بے پناہ پچھتاوے کا احساس ہوا تھا۔ ابو کی باتوں نے اس کے احساس جرم میں اضافہ کیا تھا۔ اسے خود سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ دنیا کا بدترین بیٹا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں ابو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

وہ ان کے قدموں میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن ابو نے اسے ٹھوکر مار دی تھی۔

"غلطی۔۔۔؟ یہ غلطی تھی؟ یہ گناہ تھا اور جسے گناہ کی عادت پڑ جائے اسے معاف کر دینا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں نہ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم آج سے یہ بات نوٹ کر لو میں تمہارے لئے مر چکا ہوں۔ میرا تم سے کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں۔"

وہ ہمیشہ اسے دھتکارتے آئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بھل بھل پانی بہنے لگا۔

"ایسے مت کہیں ابو۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔۔۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔۔۔ ایسے مت کہیں ابو۔"

اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی امی نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ابو نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر اپنے

کمرے کی جانب چل دیئے تھے۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کے ابو نے اس پر غلطی کے باوجود ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن جو کچھ وہ کہہ کر گئے تھے وہ کسی بھی طرح ایک طمانچے سے کم نہیں تھا۔ اس کے گال بنا تھپڑ کھائے دہکنے لگے تھے۔ اس کا سارا جسم جیسے آگ میں جل رہا تھا اور آنکھیں اشک بہا رہی تھیں۔ آگ پانی کے اس سنگم نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کندھوں سے لے کر گردن اور سر کے پچھلے حصے کی رگیں جیسے تن کر تار سی بن گئی تھیں۔ درد کی عفریت نے اسے جیسے پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔

"امی۔۔۔امی۔۔۔" سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے اس نے انہیں پکارنا چاہا تھا۔

"اس سے بہتر تھا نور محمد! تو مر جاتا۔۔۔" اس کی امی اس کی حالت سے بے خبر لاچاری سے بولی تھیں۔ ہوش سے بے ہوشی کے سفر میں اس نے یہی آخری جملہ سنا تھا۔ اس کے حواس بالکل ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مرنا اور کیا ہوتا ہے۔ وہ مر ہی تو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مرنا اور کیا ہوتا ہے احمد معروف۔۔۔میں واقعی مر گیا تھا۔" نور محمد نے آستین سے آنکھیں صاف کی تھیں۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اپنے بارے میں زبان کھولی تھی اپنے بارے میں اپنے منہ سے کسی کو بتایا تھا۔ سارے زخم جیسے ہرے ہو گئے تھے۔ گال پہ امی کا وہ لمس جیسے ابھی تازہ تھا۔ احمد معروف نے اس کے زخموں کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ وہ بلاوجہ تو بیزار نہیں ہوا تھا اس دنیا سے، وہ جان بوجھ کر تو تارک الدنیا نہیں ہوا تھا۔ کتنے اسباب تھے اس کے دل میں مدفن جو اس کی اس حالت کے ذمہ دار تھے۔ وہ جیسے تھک گیا تھا۔ اس نے احمد معروف کو سب بتا دیا تھا۔

"اور آپ مرے ہوئے شخص کو بتاتے ہیں کہ دنیا کی قیمت ہے، اہمیت ہے، ضرورت ہے۔۔۔" وہ اتنا رو رہا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ احمد معروف کا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔ اس نے بہت سے الفاظ جمع کیے تھے۔ وہ نور محمد کو مطمئن کرنے کے لئے مکمل تیاری کر کے آیا تھا مگر اس کی آہ و زاری نے جیسے اس کے اپنے زخموں پہ موجود سخت کھرنڈوں کو کھرچ ڈالا تھا۔ وہ خود اس لمحے جیسے ایک مشکل ساعت کی گرفت میں تھا۔ اسکا اپنا دل قطرہ قطرہ سسک رہا تھا بلک رہا تھا۔ وہاں بھی بہت سے راز دفن تھے۔ بہت سے ان کہے لفظ تھے لیکن وہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا کبھی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔۔۔ سو اس نے اپنے سب الفاظ جمع کر لئے تھے۔۔۔

☆ ☆ ☆

وہ میری زندگی کی بری راتوں میں سے ایک رات تھی۔

میں کب سے بستر پہ لیٹا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک عجیب سی بیزاری تھی جو مجھے اندر ہی اندر لاحق تھی۔ ثنیا کی باتوں نے نا صرف مجھے دکھی کیا تھا بلکہ غصہ بھی دلا دیا تھا۔ غصہ مجھے اپنے آپ پر آیا تھا۔ میں اتنا احمق کیسے ہو گیا تھا کہ اس کے کہنے پر کتابیں کچرے میں پھینک دیں اور جس کی بناء پر اسے دوبارہ یہ موقع مل گیا کہ وہ جتا سکے کہ میں وفادار نہیں ہوں۔ اسی لئے میرا دل اتنی شدت سے چاہ رہا تھا کہ میں اپنی زندگی کو ریوائنڈ کر کے عین اس لمحے جا رکوں جب میں نے کتابیں ضائع کرنے کے لئے کچرے میں پھینک دی تھیں۔

مجھے بے شک اس بات سے اتفاق بالکل نہیں تھا کہ ہماری خوراک ہماری اچھائیوں یا برائیوں کی ذمہ دار ہو سکتی ہے لیکن اس کی یہ بات

مجھے سو فیصد درست لگی تھی کہ اپنی لگن یا شوق سے کسی دوسرے انسان کی خاطر دست بردار ہو جانا دراصل غداری ہے۔ اس نے بہر حال مجھے غدار ثابت کر ڈالا تھا اور میں اس کے ساتھ وفا نبھانے کے شوق میں اتنا مرا جا رہا تھا کہ مجھ سے حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ یہ تھی میرے اندر کی وہ بھڑاس جو مجھے کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا اور مجھے نیند بھی بائیں کروٹ پر جلدی آتی تھی لیکن اس رات مجھے بائیں کروٹ بھی نیند کی منت سماجت کرنی پڑ رہی تھی۔

مجھے ثنا کی فلاسفی پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ جو سوچتی تھی، جو کرنا چاہتی تھی، یہ اس کا حق تھا، اسکا اپنا فیصلہ تھا۔ اسے جو کھانا تھا یا جو نہیں کھانا تھا یہ اس کی اپنی پسند تھی، میں اس پر معترض نہیں تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ میں کوئی اعتراض کرتا لیکن مجھے اس بات پر بہت بے دلی اور اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے مجھے میرے ایک اقدام سے ایک بار پھر وہ ثابت کر ڈالا تھا جو میں قطعاً نہیں تھا اور سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ گھر آتے ہی مہمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ رکو ہونے مجھے بتایا تھا کہ اگلے ہفتے عوف بن سلمان آرہا تھا۔

عوف بن سلمان کا تعلق سعودی عرب سے تھا۔

اس سے میری پہلی ملاقات الریاد میں ان کے گھر پر ہوئی تھی جہاں بطورِ خاص میرے گرینڈ پیرنٹس کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کافی سال پہلے کی بات ہے۔ عوف بن سلمان کا تعلق کافی امیر کبیر خاندان سے تھا۔ وہ کوئی شہزادہ تو نہیں تھا مگر ان کا رہن سہن کسی شاہی خاندان کے رہن سہن کو مات دینے کے لئے کافی تھا۔

ہمارے خاندانوں کے درمیان پہلے پہل کوئی دوستی نہیں تھی۔ دوستانہ تعلقات بہت بعد میں استوار ہوئے۔ دراصل گرینڈ پا نے اپنی وفات سے قبل اپنے ایک مسلمان سعودی دوست کی پارٹنرشپ میں ایک ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی کھولی تھی۔ یہ کمپنی خلیجی ریاستوں کو اشیائے خورد و نوش ایکسپورٹ کرتی تھی۔ گرینڈ پا نے جب بزنس کا دائرہ بڑھا کر سعودی عرب کو بھی ایکسپورٹ شروع کی تو عوف بن سلمان کے والد نے ان کی بہت مدد کی تھی۔ وہ خود بھی گرینڈ پا کے بڑے کسٹمرز میں سے ایک تھے۔ ان کے درمیان کاروباری تعلقات آہستہ آہستہ دوستانہ روابط میں بدل گئے تھے۔ عوف بن سلمان اور اس کے بہن، بھائیوں، کزنز وغیرہ کی اسکولنگ لبنان اور فرانس میں ہوئی تھی۔ وہ سب بہت اچھی فرینچ بول سکتے تھے گرینڈ پا اکثر ان کا ذکر کرتے تھے۔ گرینڈ پا کی تدفین کے بعد سلمان بن ہشام نے مجھے فون بھی کیا تھا۔ گرینی کی وفات پر ان کی اہلیہ کے تعزیتی خطوط بھی آئے تھے۔ سلمان بن ہشام صاحب سال چھ مہینے بعد مجھے فون بھی کر لیا کرتے تھے۔ عوف بن سلمان مجھ سے دو ایک سال بڑا تھا اور لندن میں پڑھ رہا تھا۔ رچمنڈ میں ان کا ذاتی گھر تھا۔ عوف طبیعتاً مہم جو اور فطرت کا دلدادہ تھا۔ وہ اچھا فوٹو گرافر تھا اور اسے ویک فیلڈ بالعموم اور ہمارا وسیع و عریض فارم ہاؤس بالخصوص بہت پسند آیا تھا۔ اس نے نجانے کیسے خود کو میرا دوست فرض کر لیا تھا۔ وہ مجھے فون بھی کرتا تھا اور اس کے پوسٹ کارڈ بھی موصول ہوتے رہتے تھے۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کا ہر دو مہینے بعد مجھ سے ملنے آنا مجھے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میں انسانوں سے بیزار رہنے والا انسان تھا اور عوف بن سلمان جیسے انسان کے ساتھ وقت گزارنا تو بہت مشکل تھا حالانکہ وہ ایک مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ قد کاٹھ کے معاملے میں اسے اوپر والے نے بہت نوازا تھا۔ باسکٹ بال کے متعلق اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ وہ ایسے کپڑے پہنتا تھا جو اس کی شخصیت کے سحر کو کئی گنا بڑھا دیتے تھے اور "پرفیومری" کا ایسا بڑا ذخیرہ اور اسکا بے دریغ استعمال اسے سچ مچ کا شہزادہ ثابت کرتے تھے۔ اس کی طبیعت میں بھی شاہانہ انداز جھلکتا تھا۔ خود پسندی اور

غرور اسکی عادات میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی جبکہ مجھے وہ بیحد ناپسند تھا اور وہ خود کو میرا دوست کہتا تھا۔ اسی لئے اس کی آمد کا سن کر میرا مزاج مزید خراب ہونے لگا تھا کیونکہ مجھے زندگی میں خوشامد نہ کبھی آئی تھی اور نہ کبھی بھائی تھی۔

میں اکتا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سینے پر بوجھ بڑھ رہا تھا مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی وہ ایک داستان یاد آئی جس میں ایک شخص کسی شہزادے کے خوفناک ہیبت والے کانوں سے واقف ہو کر اپنے دل کی بھڑاس کو ایک گڑھے میں نکال دیتا ہے اور پرسکون ہو جاتا ہے۔ دراصل ہم سب کو ایک ایسے ہی گڑھے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے جسے ہم اگلدان کی طرح استعمال کر کے خود ہلکے پھلکے ہو سکیں۔ میں نے بھی ایسا ایک گھڑا ڈھونڈ لیا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ قلم تھام لیا۔ میرے سینے کا بوجھ جب بھی بڑھ جاتا تھا میں اپنے اسی گھڑے کو دراز سے نکال لیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟" نیا نے فرنچ فرائز کا فنگر لک ساس میں بھگو کر میری جانب بڑھایا۔ ہم ایک اوپن ائیر کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ موسم میں بڑی میٹھی سی حدت تھی جو بھلی محسوس ہوتی تھی۔ اس حدت سے بھی زیادہ میٹھاس اس لمحے مجھے نیا کی ادا میں محسوس ہوئی۔ ساری خفگی جیسے برف کی طرح پگھل کر پانی بن چکی تھی۔ میں نے وہ فنگر پکڑنا چاہا تو اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اسے مجھے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں وہ فنگر اس کے ہاتھ سے کھاؤں۔ میں نے اس پر قربان ہوتے ہوتے فنگے کا آدھا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ لیا تھا بقیہ بچ جانے والے حصے کو اس نے اپنے منہ میں رکھ لیا۔

نیا میں مجھے نجانے کیا کشش محسوس ہوتی تھی لیکن ایک بات طے تھی کہ میرا ہر عہد اس کے معاملے میں تاش کے پتوں کا محل ثابت ہوتا تھا۔ میں اس سے دور رہ سکتا تھا نہ خفا۔ اس نے فون کر کے بس مجھے ملنے کے لئے کہا تھا میں اس کی ساری دل دکھانے والی باتیں بھول کر کاٹھ کے الو کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی کاٹھ کا الو بننے میں بھی کتنا سرور آتا ہے یہ صرف محبت کرنے والا دل جان سکتا ہے۔ میں بھول گیا کہ اس نے مجھے گزشتہ بار غدار کہا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ اسکی وجہ سے میں ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا۔

"میں نے پوچھا تھا تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔ اس کی آنکھوں پر ٹن گلاسز تھے لیکن ان میں شرارت کا عکس واضح محسوس ہوتا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری رائے ہے یا اندازہ؟" میں نے ایک اور سوال پوچھا۔

"رائے نہ اندازہ۔۔۔ یہ میرا یقین ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی پھر اس نے جوس کا ایک سپ بھرا اور مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر گویا ہوئی۔

"زندگی کی جتنی بھی اچھی چیزیں ہیں نا۔۔۔ ان کے متعلق تمہارا جواب کرسس کے درجہ حرارت کی طرح ہوتا ہے۔۔۔ یعنی ہمیشہ منفی۔"

اس کے چہرے پر شرارت نہیں تھی لیکن میں نے خود ہی فرض کر لیا کہ وہ یہ بات مذاق میں کہہ رہی ہے۔ محبت میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبوب کی آدھی باتیں تو ہماری خود ساختہ ہوتی ہیں۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔۔۔تم مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور فرنچ فرائز کا ایک ٹکڑا بغیر ساس لگائے منہ میں رکھا۔ مجھے لہسن کی یہ ساس ناپسند تھی۔

"اچھا؟" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر ٹیبل پر جھکتے ہوئے میرے ذرا قریب ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم نے کبھی ڈرائیونگ کی ہے؟" میں نے قہقہہ لگایا۔ اس کا جواب بھی کرسس کا درجہ حرارت ہی تھا۔

"جانے بھی دو ثیا۔۔۔میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔" وہ گہری سانس لے کر دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔میں چودہ سال کی عمر سے ڈرائیونگ کر رہی ہوں۔" اس نے جتایا اور پھر ناک چڑھائی۔

"کبھی اسموکنگ کی ہے تم نے؟"

"اونہہ۔۔۔دھوئیں سے الرجی ہے مجھے۔۔۔کھانسی ہونے لگتی ہے۔" میں ناگواری سے بولا تھا۔

"اس لئے کہ تم نے ابھی تک پنگھوڑے میں سونا چھوڑا اور نہ فیڈر پینا۔۔۔تم نے اسموکنگ نہیں کی تو پھر تمہیں کیا پتا کہ مورفین اور میری جوانا کن جادوگرنیوں کے نام ہیں، ان میں کیا سحر چھپا ہے اور زمین میں بیٹھ کر آسمان کو چومنے کا کیا مطلب ہے۔ زندگی کی سب اچھی چیزیں تمہیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم ہر خوشی کو اپنے لئے حرام کر کے بیٹھ گئے ہو۔ میں تمہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تم جوہڑ کی مچھلی ہو کیونکہ اس کا بھی کوئی نا کوئی وژن ہوگا۔۔۔تمہیں برا تو لگے گا مگر میں پھر بھی کہوں گی کہ تم بالٹی کے پانی کا خوردبینی کیڑا ہو۔۔۔بالٹی بھی وہ جو اندھیرے کمرے میں پڑی ہوتی ہے۔ تم ایسی ہی بالٹی کے اندر گھوم گھوم کر زندگی گزارتے رہنا چاہتے ہو۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے فضا میں انگلی کو گھمایا تھا۔ وہ مجھے دائرہ بنا کر دکھا رہی تھی۔

"ارے یار۔۔۔نکلو اس بالٹی سے۔۔۔کب تک گول گول گھومتے رہو گے۔۔۔یہ بالٹی تمہیں چکرا کر رکھ دے گی۔۔۔دنیا تمہارا ساتھ دینے کے لئے اس بالٹی میں نہیں اترے گی تمہیں ہی اس بالٹی سے نکل کر دنیا میں اترنا ہوگا۔۔۔تم سمجھتے ہو کتابیں تمہیں سب سکھا دیں گی۔۔۔ایسا نہیں ہوتا دوست۔۔۔تم جتنی دیر میں کتاب ختم کرتے ہو نا میرے جیسے لوگ اتنی دیر میں اسی کتاب کے پتوں کا جہاز بنا کر دنیا گھوم آتے ہیں۔۔۔سمجھ رہے ہو میری بات؟"

وہ ہاتھ میرے چہرے کے سامنے لا کر پوچھ رہی تھی۔ میں واقعی چونک گیا۔ مجھے اس کی باتوں سے اتفاق تھا۔ مجھے اس کی صاف گوئی بھائی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی اس کی شخصیت میں کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ جو انسان آپ کو اچھا لگتا ہو اس کو بھی آپ صرف اچھا ہی اچھا نظر آنا چاہتے ہیں۔

"میری بات کا برا نہ منانا۔۔۔مجھے تم اچھے لگتے ہو اس لئے مجھے تمہاری فکر ہے، پروا ہے۔"

اس نے جوس کے گلاس سے ایک لمبا سپ لیا تھا۔ اس کا جملہ زمین کو میرے قدموں تلے سے کھینچ لے گیا تھا اور وہ بھی اتنی نرمی و لطافت سے کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں اب کھڑا یا بیٹھا نہیں تھا بلکہ اُڑ رہا تھا سبک روی سے، سکون سے۔ میں اُسکے سحر سے اتنا مدہوش تھا کہ سانس بھی مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے کانوں میں صرف ایک فقرے کی تکرار ہو رہی تھی۔

"مجھے تم اچھے لگتے ہو اس لئے مجھے تمہاری فکر ہے، پروا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"تم تو بالکل نہیں بدلے۔۔۔ ویسے کے ویسے ہو" عوف نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے بظاہر دوستانہ انداز میں کہنے کے ساتھ ساتھ اپنی تھوڑی اور بائیں گال پر ہاتھ پھیر کر جتایا تھا کہ میں نے اب تک شیو کرنا شروع نہیں کیا۔ وہ گزشتہ بار بھی مجھے یہ احساس دلا چکا تھا۔ مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ خواہش کے باوجود میرے چہرے پر ابھی اتنی نشانیاں ظاہر نہیں ہوئی تھیں کہ میں باقاعدہ شیو کر سکتا۔ میں جلے دل کے ساتھ مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ کاؤچ کی پشت سے ٹیک لگا کر اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔

"اب تم کچھ بڑے ہو جاؤ دوست۔۔۔ دنیا تم سے دس قدم آگے چل رہی ہے۔"

وہ ہمیشہ سے دوستانہ استحقاق کا مظاہرہ کرتا آیا تھا۔ میں نے اس کے انداز میں کسی اور کے انداز کی جھلک محسوس کی۔

"میں بچپن سے بڑا ہوں۔۔۔ بڑے ہونے کا تعلق شخصیت کی ظاہری خوبیوں سے نہیں ہوتا۔۔۔ یہ کچھ ایسی چیز ہے جو یہاں ہوتی ہے۔"

"میں نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر اسے دو بار بجایا۔ وہ مزید مسکرایا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔ میں کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ میں اس سے اتنا خار کیوں کھاتا ہوں حالانکہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ میرے لئے بہت سے تحائف لایا تھا اور اس کے انداز میں اپنائیت بھی تھی۔ وہ رات کو پہنچا تھا اور اب صبح ہو چکی تھی۔ میں جان بوجھ کر اس کی آمد کے چودہ گھنٹے بعد اس سے مل رہا تھا۔ وہ شاور لے کر آیا تھا اور اس نے ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر شرٹ پہنا تھا جو یقیناً کسی مشہور برانڈ کا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے جمے تھے اور زبردست قسم کے فرانسیسی او ڈی ٹوائلٹ کی مہک آس پاس بکھری ہوئی تھی۔ چہرے پر ہلکی داڑھی بڑھا لینے کے باعث اس کا چہرہ مزید بھرا بھرا لگنے لگا تھا۔ مجھے عادت نہیں تھی یہ شاید میرا شوق تھا کہ میں لوگوں کا اور اپنا موازنہ کرتا رہتا تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا پورا وجود بہت گیا گزرا سا لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا احساس کمتری مجھ پر حاوی ہو جاتا میں نے اس کے سامنے پڑی تپائی پر رکھا اخبار اٹھا لیا۔ اخبار اچھی ڈھال ثابت ہو سکتا تھا اس کے سامنے تپائی پر خشک میوہ جات، تازہ کیک اور خوبانی کی مٹھائی بھی رکھی تھیں۔ اس نے مجھے اخبار اٹھاتے دیکھ کر خود ایک اخروٹ کا ٹکڑا اٹھا لیا تھا۔

"ابھی بھی کتابیں شوق سے پڑھتے ہو؟" اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ اب کتابوں نے مجھے شوق سے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔"

اس نے مختصر مگر تہذیب یافتہ قہقہہ لگایا۔

"میں تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے تمہیں کافی پسند کرتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔؟" میں مسکرایا اور اخبار کو اپنے سامنے پھیلایا۔

"حالانکہ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے اکثر لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔"

"لوگوں کی فکر مت کرو دوست۔۔۔ ہیرے کی قدر جوہری کو ہوتی ہے یا پھر خود ہیرے کو۔۔۔ تمہاری لفظوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت اس قدر بے مثال ہے کہ میں اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔"

اس کا مزاج کافی خوشگوار ہو رہا تھا۔ میں نے اخبار دیکھتے ہوئے اس کے پسندیدہ موضوع تلاش کرنا شروع کیا تھا۔

"تمہاری فوٹو گرافی کیسی چل رہی ہے؟"

"زبردست۔۔۔ میں تمہیں دکھاؤں گا اپنا کام۔۔۔ تم میرا کیمرہ ورک دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ کیمرے کی آنکھ اس قدر طلسماتی ہوتی ہے کہ انسان اس کے سحر سے نکل نہیں سکتا۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہے، ایک الگ زاویہ۔۔۔"

اس نے محبت بھری نظروں سے اپنی ساتھ والی نشست کی جانب دیکھا جہاں اس کا کیمرہ پڑا تھا۔ یہ کیمرہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے کیمرے کو بھی شاید اسی شاہی پروٹوکول کی عادت سی پڑ گئی ہوئی تھی۔

"مجھے حیران کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے فوٹو گرافی پسند نہیں۔"

"زندگی کی سب اچھی چیزوں کو دشمن بنا رکھا ہے تم نے۔۔۔ اس میں تمہارا قصور نہیں دوست۔۔۔ یہ تمہاری کم علمی ہے اکثر کم فہم لوگوں کو فوٹو گرافی ناپسند ہوتی ہے۔"

اس نے کیمرہ ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی اس لئے نہیں کہ اس کی بات مجھے اچھی لگی تھی بلکہ اس لئے کہ مجھے اس نے ثنا کی یاد دلا دی تھی۔ ثنا بھی تو میرے بارے میں یہی رائے رکھتی تھی۔

"فوٹو گرافی کو ناپسند کرنا اگر کم فہمی ہے تو مجھے اپنی اس خوبی پر فخر ہے۔"

میں نے اخبار میں گم ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اپنے کیمرے کے عدسے کو گھما رہا تھا۔

"ہر چیز ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی۔۔۔ شیر گوشت کھاتا ہے گدھا گھاس کھاتا ہے۔ شیر گھاس نہیں کھا سکتا اور گدھے کو گوشت میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔۔۔ یہ کم علمی، کم فہمی نہیں یا شباب۔۔۔ یہ بدقسمتی ہے۔۔۔ اب اس پر فخر محسوس کرنے مت لگ جانا۔"

وہ کیمرے کو آنکھ سے لگا کر لینس ایڈجسٹ کرنے لگا تھا۔ میں اخبار کے آخری حصے میں پہنچ گیا تھا جہاں سیاسی تبصرے تھے۔۔۔ میں چونکہ عوف بن سلمان کے ساتھ باتوں میں بھی مصروف تھا اس لئے یکسوئی سے پڑھ نہیں پا رہا تھا۔

"یہ فوٹو گرافی ہے یا کچی عمر کی پہلی محبت۔۔۔ اتنی عقیدت تو محبت میں ہی ہوتی ہے۔"

میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

"میرے لئے فوٹو گرافی محبت بھی ہے، عقیدت بھی۔۔۔ یہ میرا شوق نہیں میرا جنون ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ تم حرفوں کے بنے ہو۔۔۔ لٹریچر کے آدمی ہو۔ آرٹ کیا ہے اور کیا کیا کر سکتا ہے یہ سمجھنے کے لئے تمہیں دو زندگیاں چاہئیں۔"

اس کے ساتھ میری سماعتوں نے کیمرے کی کلک کلک کو بھی سنا۔ مجھے ایک بار پھر ثنا کی یاد آئی۔ مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ میری زندگی کا یہ ایک ایسا روشن باب تھا کہ جس کا خیال ہی مجھے ہائی وولٹیج بلب بنا دیتا تھا۔

"زندگی تو ایک ہی بہت ہے دوست۔۔۔ آرٹ سمجھ میں نہیں بھی آیا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا محبت کو میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

میں نے کہتے کہتے نظریں اخبار کی جانب ہی رکھی تھیں۔ اس نے کیمرہ دوبارہ اپنے ساتھ والی نشست پر رکھا پھر بغور مجھے دیکھا۔

"اتنا بڑا دعویٰ مت کرو۔۔۔یہ حرافہ تو دلیوں کو سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ہم تم کیا چیز ہیں۔"

وہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔بن یافع کافی لے کر آگیا تھا۔بن یافع سلمان نیگرو تھا۔موٹے ہونٹوں اور کرخت ہاتھوں والے اس شخص کو بطور خاص عوف کی وجہ سے ملازم رکھا گیا تھا

☆ ☆ ☆

"یہ ٹیا ہے۔۔۔" میں نے پرشوق انداز میں ٹیا کو دیکھتے ہوئے عوف سے اسے متعارف کروایا تھا۔وہ بھورے اور سرخ رنگ کے فراک میں ملبوس اپنے سیاہ بالوں کو پشت پر پھیلائے اس وقت بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔میرا دل احساس تفاخر سے بھر گیا۔یہ تھا میرا وہ قابل فخر حوالہ جس سے میں عوف بن سلمان کو چاروں شانے چت کر سکتا تھا۔میرے دل میں نجانے کیوں ہر وقت یہ خواہش مچلتی رہتی تھی کہ عوف بن سلمان کو شکست سے دوچار کرسکوں۔میں اعتراف نہیں کرتا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں اس سے حسد کرتا تھا۔ٹیا سے ملوانا بھی اسی لئے چاہتا تھا کہ اسے دکھا اور جتا سکوں کہ دیکھو میری گرل فرینڈ کتنی طرح دار ہے۔میں اور عوف اپنی اپنی بائیکل پر سوار راؤنڈ کے لئے جا رہے تھے۔میں نے پہلے ہی ٹیا کو بتا رکھا تھا کہ میں اسے لینے کے لئے آؤں گا اس لئے وہ تیار ہو کر دروازے پر کھڑی تھی۔

"میرے فرینڈز مجھے پیار سے ٹی کہتے ہیں۔" ٹیا مسکراتے ہوئے بالکل سامنے آگئی۔عوف نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا۔

"حالانکہ انہیں تمہیں کافی کہہ کر بلانا چاہیے۔" وہ بائیکل سے اترتے ہوئے بولا تھا۔میں نے اور ٹی نے ایک ساتھ استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔عوف نے کندھے اچکائے۔

"کامن سینس۔۔۔تم ہو ہی اتنی براؤن براؤن، کریمی کریمی سی۔"

میں نے اور ٹیا نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ہم دوبارہ بائیکل پر سوار ہونے کے بجائے دھیرے دھیرے چلنے لگے تھے۔ہم فارم ہاؤس سے ذرا دور جانا چاہتے تھے۔عوف نے کیمرے کو گلے میں لٹکا رکھا تھا۔وہ آج کھل کر اس کا استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔

"تمہارے دوست تمہیں "آف" (عوف) کی بجائے "آن" کہتے ہیں کیا؟" ٹیا بے تکلفی سے بولی تھی۔میں نے پہلے ہی اسے عوف کے متعلق بتا رکھا تھا۔عوف نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر بولا۔

"عون (آن) میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔"

"تمہارے بھائی کا نام آن (عون) ہی ہو سکتا تھا۔" ٹیا نے بے ساختہ کہا پھر کندھے اچکا کر بولی۔"کامن سینس۔۔۔آف (عوف) کے بعد آن (عون) ہی ہوتا ہے نا۔۔۔آف، آن، آف، آن۔"

اس نے بائیکل پر لگے بٹن کو دبا کر پچھلی اور سامنے کی طرف والے چھوٹے بلب کو جلاتے بجھاتے ہوئے وضاحت کی۔مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔عوف نے کھل کر مسکراہٹ کا مظاہرہ کیا۔میرا دل چاہا میں ٹیا کو بانہوں میں بھر کر گول گول گھماتے ہوئے تین چار چکر دے ڈالوں۔وہ خوبصورت اور طرحدار ہی نہیں تھی۔اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ گفتگو کے فن سے بھی آشنا ہے۔

"بہت خوب۔۔۔تو مس "ٹی" اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔میرا مطلب ہے اپنی ان خوبیوں پر روشنی ڈالئے جن کی بنا پر بل نے آپ کو

اپنا دوست بنایا۔" عوف نے میری طرف اشارہ کر کے اسے مزید بولنے پر اکسایا۔

"مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے دراصل یہ بلی ہے جس میں بہت سی خوبیاں ہیں اور مجھے فخر ہے اس پر اور اسی لئے میں نے اسے دوست بنایا ہے۔"

اس نے چلتے چلتے میرا ہاتھ تھام تھا۔ مجھے لگا اب کی بار میں خود ہی گول گول گھومنے لگا ہوں۔ سیب گرا تو نیوٹن نے قانون بنا ڈالا۔ گلیلیو خود گرا تو ایک نئی دریافت کر ڈالی۔ میں اگر سائنسدان ہوتا تو اس لمحے میں بھی کوئی نئی تھیوری ضرور پیش کر دیتا اور وہ یہ کہ محبت میں کوئی ایسی طاقت ہے کہ یہ آپ کے وزن کو بالکل زیرو کر دیتی ہے اور آپ اتنے ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں کہ روئی کی طرح ہوا میں ادھر اُدھر اُڑتے پھرتے ہیں۔ ثیا نے اس لمحے مجھے بہت اہم اصول سے متعارف کروا ڈالا تھا۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پا کر تشکر بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

"ثیا بہت اچھا رقص کرتی ہے۔"

میں نے محبت بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم چلتے چلتے درختوں کے جھنڈ تک آگئے تھے۔ عوف نے بنا کوئی تاثر ظاہر کئے گردن ہلائی۔ وہ اپنے کیمرے کو سیدھے رخ سے پکڑ رہا تھا۔

"تم سے مل کر اچھا لگا ثیا۔" اس کا انداز رسمی تھا۔ ثیا نے بھی رسمی انداز میں گردن ہلائی۔ عوف درختوں کے سائے میں چھپی کسی نادیدہ چیز کو فوکس کرنے کے لئے رک گیا تھا۔ ثیا چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر اس نے اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ یقیناً بور ہو رہی تھی۔ اس نے عوف بن سلمان کو اگنور کرتے ہوئے میرے ہاتھ کو تھام لیا تھا اور مجھے اس کا احتقاق بے قابو کرنے لگا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر دائرے میں میرے گرد گھومنے لگی تھی۔ اس نے رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہولے ہولے کسی موسیقی کے بغیر بھی وہ ہوا کی طرح جھوم سکتی تھی، چند لمحوں میں ہی وہ ایک عجب سماں باندھ چکی تھی، وہ خود گا رہی تھی اور رقص کر رہی تھی عوف جو پہلے اس کی جانب ذرا بھی متوجہ نہیں تھا اب بس اسی کی جانب دیکھنے میں مگن تھا پھر میں نے اس کے کیمرے کو حرکت میں آتے دیکھا۔ وہ ثیا کو اپنے کیمرے میں نہیں اپنے طلسم میں قید کر رہا تھا۔ میں ایک جانب کھڑا دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

حسد اور رقابت کے بارے میں مجھے صحیح طریقے سے اسی دور میں سمجھ میں آیا تھا۔ اس سے پہلے میں گرینی اور اپنی نام نہاد ماں کی محبت کو دوسروں کے ساتھ بانٹ کر استعمال کر چکا تھا۔ لاتعلقی کو میں اپنی ذات پر بہت مرتبہ برت چکا تھا لیکن ثیا کے ساتھ میرا ایسا رشتہ بن چکا تھا کہ اس کا ذرا سا نظر انداز کیا جانا مجھے سخت چبھ رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے نظر انداز کر کے گھل مل گئے تھے۔ یہ چیز میرے لئے بہت بے چینی کا باعث تھی۔ مجھے ثیا پر بھروسہ تھا، اس کی محبت پر بھروسہ تھا لیکن عوف بن سلمان بدنیت انسان تھا۔ اسے ہر چیز بالخصوص اچھی چیز پر دسترس حاصل کرنے کا شوق تھا۔ وہ لڑکیوں کو پھانسنے کا ماہر تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلانے لگتی تھیں۔

اس دن بھی اس نے ثیا کی لاتعداد تصویریں اتاری تھیں اور ثیا بھی اس کی گرمجوشی کا جواب مثبت انداز میں دیتی رہی تھی۔ مجھے افسوس ہوا مجھے ان دونوں کو ملوانا نہیں چاہیے تھا۔ عوف چند دنوں کے لئے تو آیا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں ان دونوں کی ملاقات کرواتا۔ میری چھٹی حس نے الارم بجانا شروع کر دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" عوف نے مجھے دیکھتے ہی بے تابی سے کہا تھا۔ میں نے سر دلگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ صبح سے غائب تھا اور ثیا بھی موجود نہیں تھی۔ میں نے تین چار بار اس کو فون کرنے کی کوشش کی تھی اور ہر بار اسکی کرخت لینڈ لیڈی نے مجھے ڈانٹ کر فون بند کر دیا تھا۔

میرے اعصاب جیسے تھک سے گئے تھے۔ عجیب کشمکش تھی جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا میرا اندازہ درست تھا کہ عوف۔ بن ہشام میری گرل فرینڈ کو اپنی شخصیت اور دولت کی چکا چوند سے بہلانے، پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شاید وہ اس کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔

"تم آؤ میرے ساتھ۔" اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے ہمراہ ہو لیا تھا۔ ہم ہال اور پھر بڑے سے کوریڈور سے نکل کر احاطے میں آ گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح باہر کی تمام چھوٹی بڑی غیر ضروری لائٹس آن تھیں۔ فوارہ روشنیوں میں نہایا ہوا تھا اور گرم پانی کی بوچھاڑ مسلسل ہو رہی تھی۔ اس کے قریب گزرنے پر چند بوندیں مجھ پر بھی گریں۔ دل چاہا پانی کو آگ لگا دوں۔ ہر چیز میرا تمسخر اڑاتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم خاموشی سے اینیکسی میں آ گئے تھے۔ بن یافع آتشدان میں حرارت بڑھانے کا سامان کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مودب انداز میں کھڑا ہو گیا۔ عوف نے اسے کافی کے لئے کہا اور مجھے اپنے بیڈ روم میں آنے کا اشارہ کیا۔

"میں تمہیں کچھ ایسا دکھانا چاہتا ہوں کہ تم ساکت رہ جاؤ گے۔" اس کا لہجہ پر اسرار تھا۔ میرا دل بالکل ڈوب گیا۔

اس نے سابقہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے ایک فائل کھول کر بستر پر کچھ پھیلا کر رکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے بغور دیکھا۔ مجھے صورتحال کو ٹھیک سے سمجھنے میں کچھ لمحے لگے تھے۔

"تم آرٹ کو بیکار سمجھتے ہو نا۔۔۔ شاید یہ تمہارے موقف کو بدلنے میں معاون ثابت ہوں۔"

اس نے مطمئن سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ میں بستر کے قریب ہوا جہاں جابجا ثیا کی مختلف تصویریں بکھری تھیں۔ تصویروں کا سائز مختلف تھا اور تصویریں بھی کچھ مختلف سی تھیں۔ میں بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ہی لباس میں ایک جگہ پر کھینچی گئی تصویریں تھیں۔

"یہ دیکھو۔۔۔ سحر خود سحر زدہ دکھتا ہے کبھی۔۔۔ نہیں دیکھا تو یہ تصویریں دیکھو۔"

وہ ایک کے بعد ایک تصویر میرے ہاتھ میں دینے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے تین چار فلم ایک ساتھ خرچ کر ڈالی تھیں۔ وہ رقص کے دوران لی گئی تصویریں تھیں اور کیا تصویریں تھیں۔ میری نگاہیں جیسے واقعی ان پر جم سی گئی تھیں۔۔۔ میں نے ایک تصویر کو پکڑے رکھا اور باقی بستر پر پھیلا دیں۔

ثیا سفید رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی جو پھڑ پھڑاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی برہنہ بازو اور پنڈلیاں اس کے ریشمی ملائم لباس کی طرح نمایاں ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سفید رنگ کیا چھپا پاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ باطن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ ثیا کے جسم کا ہر وہ حصہ بھی کسی قدر نمایاں تھا جسے اس سفید رنگ نے بظاہر چھپانے کی کوشش کی تھی۔ قدرت نے ثیا کو جتنی خوبصورتی عطا کی تھی، عوف نے اسے ایک کلک میں قید کر دینے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ ثیا کا چہرہ، اس کا جسم، اس کا ریشمی لباس ہر چیز کیمرے نے اتنے دل موہ لینے والے انداز میں قید کی تھی کہ آنکھیں اپنا زاویہ لمحہ بھر کے لئے بھی بدلنے کو تیار نہیں تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم میرا کام دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔۔۔ میں نے کہا تھا نا کہ کیمرے کی آنکھ طلسماتی ہوتی ہے کہ انسان اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔" عوف کا انداز پرجوش تھا۔

یہ دیکھو۔۔۔ دیکھو تو سہی۔۔۔ میں نے اسے اتنی مہارت سے قید کیا ہے کہ ہر رنگ نمایاں ہے۔۔۔ ثیا کا، اس کے لباس کا، اس کی آنکھوں کا اور اس کی رقص پر مہارت کا۔۔۔ اس کا چہرہ دیکھو، اس کے تاثرات دیکھو۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے رونے لگی ہے یا روتے روتے مسکرا دی ہے، اس کی آنکھوں میں جو نمی نمایاں ہے۔۔۔ وہ غم کے آنسوؤں کی ہے یا خوشی کے آنسوؤں کی۔۔۔ کیمرہ ورک میرے دوست۔۔۔ کیمرہ ورک۔"

وہ بے پناہ خوش تھا۔ میرے ہاتھوں میں اس کی تھمائی ہوئی تصویریں لرزنے لگی تھیں۔ ثیا کہیں سے بھی ثیا نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کوئی دیوی تھی۔ اس لباس میں نجانے کیا تھا کہ ثیا ملبوس ہونے کے باوجود بے لباس محسوس ہوتی تھی۔ سفید گاؤن نے کیا کیا واضح کر دیا تھا۔ میں نے سینے میں قید اپنی سانس کو بہت ہمت سے آزاد کیا تھا۔ مجھ پر ایک طلسم طاری ہو رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ثیا ان تصویروں میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی بلکہ اس لئے کہ ثیا کا یہ روپ میں نے کئی بار اپنے خوابوں میں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کے مسکراتے تاثرات، بند آنکھوں کے ساتھ میں نے لاتعداد بار دیکھے تھے۔ عوف کا کیمرہ کیا جادو کر چکا تھا۔ وہ میرے خواب کو مجسم میرے سامنے پیش کر رہا تھا۔

"ثیا بہت باکمال اور منفرد ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ عوف نے میرے ہاتھ سے تصویریں پکڑ لیں اور انہیں بستر پر ترتیب سے پھیلا کر رکھنے لگا تھا۔

"ثیا باکمال یا منفرد نہیں ہے۔۔۔ اسے جس آرٹ فارم پر مہارت حاصل ہے نا وہ یقیناً باکمال اور منفرد ہے۔ رقص میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔۔۔ وہ ایسے رقص کرتی ہے جیسے وہ انسان نہ ہو، ہوا ہو، پانی ہو۔ میں نے ثیا کو نہیں اس ہوا کو اس لہر کو کیمرے میں محفوظ کیا ہے۔ میں نے ثیا کے رقص کے جنون کو اس کیمرے میں محفوظ کر لیا ہے۔ کیا کوئی اور ایسا کر سکتا تھا۔۔۔ میں بہت خوش ہوں میرے دوست۔۔۔ میں نے ایک نئی چیز کر دکھائی ہے۔۔۔ یہ معجزہ ہے معجزہ۔۔۔ آرٹ وداِن دا آرٹ۔۔۔ شعلے کے اندر شعلہ بھڑک رہا ہے۔۔۔ میرے ہنر نے ثیا کے ہنر سے مل کر کیا تخلیق کر ڈالا ہے۔ میرا جنون اس کے جنون سے باہم مل گیا ہے اور نتیجتاً یہ تصویریں تمہارے سامنے ہیں۔ یہ کسی بھی انسان کے ہوش اڑا سکتی ہیں۔۔۔"

اس نے ایک تیسری تصویر تصویروں کے پلندے سے نکال کر مجھے پکڑا دی تھی۔ وہی ثیا، وہی بے لباسی کا موجب لباس، وہی قاتلانہ آنکھیں اور وہی کپکپی طاری کرتا اس کا گداز جسم، چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ۔ میں نے تصویر سے نظریں ہٹا کر لمحہ بھر کے لئے عوف کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی تصویروں کو ترتیب سے بستر پر رکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی سحر کے اثر میں محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ کیا جو میری کیفیت تھی وہی کیفیت عوف پر بھی طاری تھی۔ میں نے بے دلی ہو کر وہ تصویریں بیڈ پر رکھ دی۔ کچھ ایسا تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ تم اب یہ کہنے کے قابل نہیں ہو کہ تمہیں آرٹ میں دلچسپی نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آرٹ کا طلسم ہوتا کیا ہے۔۔۔ یہ صرف آرٹ نہیں ہے۔۔۔ یہ "سائنس" ہے۔۔۔ جادو ہے، کرشمہ ہے۔۔۔ مٹی سے گندھا جسم بیک وقت آگ، پانی اور ہوا بن جاتا ہے اور میرا ہنر ان چاروں حالتوں کو ایک ساتھ قید کر لیتا ہے۔۔۔ کمال ہے یار۔۔۔ کمال ہے۔"

وہ تصویروں کو دیکھ دیکھ کر قربان ہوا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی آنکھیں نوچ لوں جو چند حیائی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس دوران بن یافع دستک دے کر اندر چلا آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کی ٹرے تھی۔ اس نے دبے پاؤں آگے آ کر ٹرے میرے آگے کر دی تھی۔ میں نے مگ اٹھا لیا۔ وہ میری طرف سے ہو کر بیڈ کے دوسری جانب گیا تھا اور اس نے عوف کی جانب ٹرے کی تھی تا کہ وہ اپنا مگ اٹھا سکے۔ مجھے یہ سوچ کر برا لگا کہ وہ بھی نیاکی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ میری نظروں کا محور اب بن یافع تھا۔ اس نے اپنا ٹرے والا ہاتھ عوف کے آگے سے ایک انچ بھی نہیں سرکایا تھا جب تک اس نے اپنا مگ اٹھا نہیں لیا۔ وہ چونکہ تصویروں میں مگن تھا اس لئے میری نسبت اس نے مگ اٹھانے میں کچھ دیر کر دی تھی۔ بن یافع نے صرف ایک بار بستر پر رکھی تصویروں کو دیکھا پھر میں نے اس کی آنکھوں کو پھیلتے دیکھا۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ میں نے بن یافع کی آنکھوں میں پہلے تحیر، پھر ناپسندیدگی اور آخر میں تاسف کو ابھرتے دیکھا۔ ایک نظر ڈالنے پر اس کی آنکھیں تین طرح کے تاثرات سے دوچار ہوئی تھیں اور ان میں سے کوئی تاثر بھی وہ نہیں تھا جو میری یا عوف کی آنکھوں میں ان تصویروں کو دیکھ کر ابھرا تھا۔ اسی ایک لمحے میں میں نے بن یافع کو کچھ بڑبڑاتے دیکھا۔ وہ خالی ٹرے لے کر واپس چلا گیا تھا جبکہ میں خود خالی سا ہو کر وہیں بیٹھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا کہا۔۔۔ کیا کرنا چاہتی ہو تم اپنی تصویروں کے ساتھ؟" میں نے کچھ ہکا بکا سا ہو کر پوچھا تھا۔ وہ اپنے مخصوص دلربا انداز میں مسکرائی۔

"تم بس دیکھتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ۔۔۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کو۔ اپنے آپ کو منوانے کا طریقہ سمجھ میں آگیا ہے۔"

اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ میں جیسے پگھل کر بہنے لگا۔ وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو اُس کے معاملے میں جتنا سمجھاتا تھا اتنا ہی بے بس پاتا تھا۔ میں خود کو نصیحتیں کر کر کے بھی تھک گیا تھا۔ وہ میری گرل فرینڈ تھی، میری جاگیر نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے معاملے میں میرا احساس ملکیت بے حد توانا اور طاقتور تھا۔ میں نے کبھی اپنی جاگیر پر حتی کہ اپنی ماں پر بھی کبھی حق نہیں جتایا تھا لیکن نیا میں کچھ ایسی بات تھی کہ اسے کہیں حفاظت سے اپنی تحویل میں رکھوں جبکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آزاد فضاؤں کا پرندہ تھی۔ اسے بلندی عزیز تر تھی۔ اسے محدود ہو جانے کا مشورہ دینے کا مطلب تھا اس کی خفگی کو ہوا دینا جس سے میرا دل بہت ڈرتا تھا مگر وہ جو کرنے والی تھی اسے سوچ کر بھی دل کو اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"ان تصویروں کو کسی مقابلے میں بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

"کیوں۔۔۔ یہ اتنی اچھی ہیں۔۔۔ اتنی دلفریب۔۔۔ کوئی ایک نظر دیکھ لے تو پلک جھپکنے کے لئے ترسے۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی عورت کو مجسم ہوا دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ میں بغیر پروں کے ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ میں اچھی رقاصہ ہوں مگر عوف بن سلمان نے ثابت کیا میں بہت اچھی، بہترین رقاصہ ہوں۔ میں اپنے اس ہنر کو دنیا کے سامنے لانا چاہتی ہوں۔"

اس کے انداز میں رعونت کے ساتھ ساتھ مستقل مزاجی بھی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آیا۔ اسے کوئی اندازہ تھا کہ یہ تصویریں کس قسم کی تھیں۔ وہ ان میں بالکل بے لباس لگتی تھی اور وہ اس کو اپنا ہنر سمجھتی تھی۔ وہ اور عوف ان تصویروں کو ایک جوائنٹ وینچر کے طور پر فرانس میں ہونے والے کسی تصویری مقابلے

میں بھیج رہے تھے۔ یہ مقابلہ مظاہرِ قدرت کو اس کی اصل حالت میں قید کرنے کے عنوان کے تحت منعقد کیا جا رہا تھا اور ان دونوں کو خیال تھا کہ یہ تصویریں سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے مقابلے میں صفِ اول پر آجائیں گی۔ انہوں نے اس مقابلے کے لئے عنوان بھی سوچ لیا تھا اور وہ مجھے اب بتا رہی تھی۔ میں ایک رات پہلے بہت دیر تک گرم پانی کے پول میں سوئمنگ کرتا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ ثیا اور عوف کے درمیان کوئی ٹیلی پیتھی نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بھی نہیں ہیں اور مجھے اس سلسلے میں کسی قسم کے عدم تحفظ کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوئمنگ ہمیشہ میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی تھی اور مجھے اس سے بہت ذہنی سکون ملتا تھا لیکن ثیا نے اب ایک اور کچوکہ لگا دیا تھا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی تصویروں کے ساتھ جو مرضی کرے لیکن پتا نہیں دل کا کون سا حصہ تھا جو تڑپ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ثیا کو روکا جائے۔

"مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔" بالآخر میں نے کہہ دیا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھا پھر ناک چڑھائی۔

"مجھے پتا ہے تم جیسے بورنگ انسان کو ہر وہ چیز بری لگتی ہے جس میں مزہ ہو، لطف ہو، گرمجوشی ہو۔۔۔ تم انسان نہیں ہو۔۔۔ سادھو ہو۔" اس کے لہجے میں اعتدال تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے میری بات بری نہیں لگی تھی۔

"تم کچھ بھی کہو۔۔۔ میں برا نہیں مانوں گا۔۔۔ لیکن میں تمہیں ان تصویروں کو کسی مقابلے میں بھیجنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔" میں نے محبت اور مان بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اس نے یکدم میری جانب رخ کیا اور میں نے اس کے چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا۔ تحیر اور تمسخر باہم متماثل تھے۔

"او بدخو۔۔۔ میرے ڈیڈی بننے کی کوشش مت کرو۔۔۔ میں نے تم سے کب اجازت مانگی ہے۔"

میں نے اس کی بات پر دکھی ہونے کے باوجود یہی تاثر دیا کہ میں دکھی نہیں ہوا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"تم میری گرل فرینڈ ہو۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں میں بھی تمہارا برا چاہ سکتا ہوں۔۔۔ بتاؤ۔۔۔"

میں نے بات کی ابتداء کی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم میرے اچھے دوست ہو۔۔۔ دوست بن کر رہو۔۔۔ میرے باپ مت بنو اور تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی اپنے باپ کی بھی پرواہ نہیں کی۔۔۔ محبت کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مالک بن جاؤ۔۔۔ مجھ پر اپنی مرضی مسلط کرو۔ میری زندگی پر صرف ایک انسان کی مرضی چل سکتی ہے اور وہ میں خود ہوں۔ تم دوستی کے دائرے سے تجاوز کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بھڑک کر بولی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں تھا کیونکہ میری نگاہ سامنے دروازے پر پڑ چکی تھی جہاں عوف کھڑا تھا۔ وہ شاید کچھ لمحے پہلے ہی آیا تھا۔ اس نے یقیناً میری اور ثیا کی باتیں سن لی تھیں۔ میرے ماتھے پر تیوریاں نمایاں ہونے لگیں۔

"اتنا بھڑکنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ کیا بحیثیت بوائے فرینڈ میں تمہیں تمہارا اچھا برا بھی نہیں سمجھا سکتا۔"

میں نے اسے کہا تھا اور کھا جانے والی نظروں سے عوف کی جانب دیکھا تھا۔ یہ سارا اسی کا کیا دھرا تھا۔

"بوائے فرینڈ؟" ثیا نے دہرایا اور میری جانب مڑی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ ایسا تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔

"بوائے فرینڈ، بوائے فرینڈ کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔۔۔ میں نے تم سے کب کہا کہ تم میرے بوائے فرینڈ ہو۔"

وہ جھنجھلا کر بولی تھی۔ مجھے مزید دھچکا لگا۔ وہ دروازے میں ایستادہ عوف کو دیکھ چکی تھی۔

"مجھے معاف کیجیے گا۔۔۔ میں مخل ہوا۔۔۔ میں پھر آ جاؤں گا۔" عوف نے صورتحال کو سمجھتے ہوئے فوراً معذرت کی۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ اور اداکاری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میرے سینے سے دبی دبی سانس خارج ہوئی۔ ثیا کے بدلے اور اکھڑے رویہ کا ذمہ دار یہی شخص تھا۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ یہاں کچھ ایسا نہیں چل رہا کہ تم شرمندگی محسوس کرو بلکہ تمہاری مداخلت اور معاونت اچھی رہے گی۔۔۔ تم یہاں آؤ اور اپنے دوست کو سمجھاؤ۔۔۔ اسے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔" ثیا کے انداز میں اس کے لئے ملاطفت جبکہ میرے لئے بے پناہ اکتاہٹ تھی۔ میں نے پلکوں کو تین چار بار جھپکا۔ میں ایسا نہ کرتا تو میرے گال بھیگنے لگتے۔

"ثیا۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔ ایسا مت کہو۔۔۔ تم ناراض مت ہو۔۔۔ تمہیں اگر میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔۔۔ تم وہی کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے مگر پلیز تم مجھ سے ناراض مت ہو۔۔۔ اوکے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ فوراً مجھ سے چھڑوا لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اکتائی ہوئی لگنے لگی تھی۔

"بچوں کی طرح بی ہیو مت کرو احمق۔۔۔ مجھے تمہاری اسی بات سے چڑ ہوتی ہے۔۔۔ تم اب نکل آؤ اپنے ڈرامائی ورلڈ سے۔۔۔ بڑوں کی طرح سوچنا سمجھنا شروع کرو۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی کورٹ شپ نہیں چل رہی کہ تم مجھے ایسے عاشقوں کی طرح رو رو کر دکھاؤ۔۔۔ ہم اچھے دوست ہیں۔۔۔ میں تمہاری دوستی کی قدر کرتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہاری ہر حماقت میں حصہ دار بن جاؤں۔ تم ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لو۔۔۔ میں تمہاری گرل فرینڈ نہیں ہوں۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔"

اس کے خشک انداز نے میری آنکھوں کی نمی میں اضافہ کر دیا۔ اب کی بار میں اپنے گالوں کو بھیگنے سے بچا نہیں پایا تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں ثیا۔۔۔ بہت محبت کرتا ہوں۔ میری محبت کو اس طرح ٹھکراؤ مت۔۔۔ مجھے پتا ہے تمہیں اس شخص نے ورغلایا ہے۔۔۔ تم اس کی باتوں میں آ کر مجھے دھتکار رہی ہو نا۔" میں اب باقاعدہ رونے لگا تھا۔ دھندلی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی پتا چل رہا تھا کہ عوف جا چکا ہے لیکن پھر بھی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ بہت گھٹیا انسان ہے ثیا۔۔۔ یہ تمہیں مجھ سے متنفر کر رہا ہے۔۔۔ مجھے پہلے ہی اس پر شک تھا۔۔۔ چھچھورا شخص ہے یہ۔۔۔"

اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ناگواری سے مجھے دیکھا۔

"تمہیں صرف غلط فہمی ہی نہیں ہے۔۔۔ تمہیں یقیناً کوئی نفسیاتی بیماری بھی ہے۔۔۔ کوئی عارضہ بھی لاحق ہے تمہیں۔۔۔ تم اپنا علاج کرواؤ۔۔۔ پاگل ہو تم۔۔۔ میں نے چند دن ہنس کر تم سے بات کیا کر لی۔۔۔ تم اپنے آپے سے باہر ہو گئے۔۔۔ تم نے سب کچھ خود ہی فرض کر لیا۔۔۔ غور سے میری بات سنو۔۔۔ میرے دل میں تمہارے لئے ایسے کوئی محسوسات نہیں ہیں۔۔۔ ارے یار۔۔۔ ہو بھی کیسے سکتے ہیں تم اپنی جانب دیکھو۔۔۔ اپنی اوقات دیکھو۔۔۔

اپنی شکل۔۔۔اپنے طور طریقے۔۔۔تم ابھی بھی اس قابل نہیں ہو کہ کوئی جوان اور خوبصورت لڑکی تمہیں اپنا بوائے فرینڈ کہہ سکے۔۔۔میں تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے زمین سے اٹھا سکھا رہی تھی، اٹھا سکھا رہی تھی اور تم۔۔۔تم اس بات کا انتقام لینا چاہتے ہو مجھ سے یا مجھے سزا دینے کا ارادہ ہے۔"

وہ بولتی چلی جا رہی تھی اور میں گنگ ہو گیا تھا۔ مجھے مناسب الفاظ ہی سمجھ نہیں آرہے تھے۔ وہ مجھ سے اس قدر متنفر ہو گئی تھی کہ میری محبت کو میری غلط فہمی کہہ رہی تھی۔

"ثیا۔۔۔! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔۔۔بہت زیادہ۔۔۔میں تمہاری خاطر کچھ بھی کرنے سہنے کو تیار ہوں ثیا۔۔۔ایسے مت کرو ثیا۔"

میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کی تھی۔ ثیا کے چہرے کے تاثرات بے حد سرد تھے لیکن میرا دل اس کی سرد مہری سے خائف نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ثیا کو عوف نے بہکا دیا ہے۔

"چپ کرو بیوقوف انسان۔۔۔کیسے بچوں کی طرح رو رہے ہو۔۔۔تمہارا رویہ مجھے مزید غصہ دلا رہا ہے۔ تم ابھی جاؤ یہاں سے۔۔۔تمہارا دماغ ٹھکانے آجائے تو واپس آجانا۔۔۔میں تمہیں ساری صورتحال دوبارہ سے سمجھا دوں گی۔" وہ بے انتہا تپ کر بولی تھی اور میں لاچار کھڑا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ سب میری وجہ سے نہیں ہوا۔۔۔میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نے اسے ورغلایا ہے نہ ہی پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ میں ایسا کروں گا ہی کیوں۔۔۔یہ میرا معیار نہیں ہے۔۔۔تمہیں سن کر حیرانی ہوگی اور شاید برا بھی لگے کہ مجھے وہ لڑکی اچھی ہی نہیں لگتی۔۔۔ذرا سی بھی نہیں۔۔۔وہ خود پسند اور بناوٹی بھی ہے۔ اسے جھوٹ بولنے کی عادت ہے اور وہ اپنے مفاد کی خاطر انسانوں کو ٹرمپ کارڈ کی طرح استعمال کرتی ہے۔"

عوف نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے سپاٹ انداز میں کہا تھا۔ اس نے میرا ہر الزام مسترد کر دیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دوں یا گلا دبا ڈالوں۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ یہاں سے دفع ہو جائے لیکن وہ پہلے سے ہی اپنی چیزیں اکٹھی کر رہا تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے بن یافع کو وہاں سے باہر بھیج دیا تھا۔

"تم چوبیس چوبیس گھنٹے اس کی تصویریں بناتے ہوئے گزارتے ہو، اس کے ساتھ فرانس جانے کی تیاری کرتے ہو اور پھر کہتے ہو وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔۔۔جھوٹے۔۔۔بہت جھوٹے ہو تم۔"

میں نے غرا کر کہا۔ میرا گلا روتے رہنے کے باعث پہلے ہی کافی تکلیف میں تھا۔ وہ میری جانب مڑا۔ اس کے ہاتھ میں فوٹو البم تھا جسے اس نے بیڈ پر پھینک دیا۔ پہلی بار وہ برہم محسوس ہوا۔

"میں جھوٹا نہیں ہوں۔۔۔ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لو۔۔۔میں جس خطے سے تعلق رکھتا ہوں وہاں جھوٹ بولنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اگر وہ لڑکی اچھی لگتی تو میں کہہ دیتا لیکن اگر میں کہہ رہا ہوں کہ وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تو تم بھی مان لو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں گا۔ میں اس کے ساتھ وقت گزارتا ہوں نہ اس کے ساتھ کوئی منصوبہ بندی کی ہے۔ میری دلچسپی اس کی ایک صلاحیت میں ہے جو قدرت نے اسے عطا کی ہے۔ میرے دوست میں اس کا نہیں اس کے ہنر کا دلدادہ ہوں۔ ایک آرٹسٹ ہونے کی بناء پر میں صرف اس کے آرٹ کا قدر دان ہوں۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ مجھے اس کی بے تکی وضاحت پر مزید غصہ آیا۔

"مجھے تمہاری اس تھیوری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے بھی غرض نہیں کہ تم سچ بولتے ہو یا جھوٹ۔۔۔ ایک بات میں بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تم ایک بدنیت انسان ہو۔ اپنی بدنیتی کو آرٹ کا لبادہ پہن اوڑھ کر چھپانے کی کوشش مت کرو۔"

اپنی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے اس کے چہرے کے رنگوں کو بدلتے دیکھا۔ وہ بہت غصے میں آچکا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ اگلتی محسوس ہونے لگیں۔

"تمہیں آرٹ کی سمجھ ہے نہ ہی تم اس کا احترام کر سکتے ہو۔۔۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ تم جیسوں کو آرٹ کو سمجھنے کے لئے دو زندگیاں چاہیے ہوتی ہیں۔۔۔ تمہیں تو وہ بھی ناکافی ہوں گی۔۔۔ تم میرے جذبات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں ذہنی طور پر اتنا سستا نہیں ہوں کہ کوئی بھی بھوری لڑکی مجھے بدنیتی پر مجبور کر دے۔ میں نے اس کی جانب جب بھی غور سے دیکھا۔ کیمرے کی نظر سے دیکھا۔ مجھے جب بھی اس کی شخصیت میں کشش محسوس ہوئی، کیمرے کی وجہ سے ہوئی۔ کیمرہ وہ پل ہے جو ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان رہا لیکن تم کہاں سمجھو گے۔ اس ایک لڑکی نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ میرے لئے وہ ایک اوبجیکٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں ایک جھینگر کی تصویر بناتا ہوں تب بھی ایسے ہی خوش ہوتا ہوں جیسے اس لڑکی کی تصویر کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ مجھے تمہاری باتوں سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔ تم میرے بارے میں ایسے الفاظ استعمال بھی کیسے کر سکتے ہو۔"

وہ واقعی یکدم رنجیدہ سا لگنے لگا۔ میں اس کی بات سن کر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے ابھی بھی اپنے ٹوٹے دل کا ذمہ دار لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، دروازہ یکدم کھلا تھا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟" اندر آنے والی شخصیت نے مجھے بالکل نظر انداز کر کے اس سے پوچھا تھا۔ عوف بن سلمان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مجھے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں جا رہے ہو تم۔۔۔ تم نے رات کہا تھا کہ تم مزید ایک ہفتہ ٹھہر جاؤ گے۔۔۔ مت جاؤ ابھی۔۔۔ میں نے تمہارے لئے کچھ اچھی چیزیں پلان کی ہیں۔۔۔ بہت مزہ آئے گا۔۔۔ مت جاؤ میری جان"

کہنے والے کے انداز میں لجاجت تھی اور مان بھرا اصرار بھی۔ میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

وہ میری ماں تھی۔ اس کے انداز میں عوف کے لئے کچھ ایسا تھا کہ میرے زمین آسمان ہل گئے تھے۔ مجھے لگا میں کھڑا کھڑا زمین بوس ہو گیا ہوں۔ مجھے لگا میں مر گیا ہوں۔

☆ ☆ ☆

"تمہارا کیا خیال ہے یہ دنیا رہنے کے لئے کیسی جگہ ہے؟" میرے ساتھ بیٹھے لوئی نما لڑکے نے پوچھا تھا۔ میں نے آنکھوں کو پھیلا کر کھلا رکھنے کی کوشش کی۔ میرا سر بھاری سا ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہو رہی تھیں۔ یہ شاید الکحل کی زیادہ مقدار اپنے اندر انڈیلنے کے باعث ہو رہا تھا۔ یہ میرا شراب پینے کا پہلا موقع تھا بلکہ میں کسی بھی بار میں اس مقصد کے لئے پہلی بار ہی آیا تھا۔ میں اپنے آپ کو، اپنے قریب رہنے

والوں کو، اپنے سے وابستہ رشتوں کو، اپنے دکھوں کو، اس دنیا کو، سب کو بھول جانا چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا لوگ بار میں جا کر پیتے تھے تو سب کچھ بھول کر ہی نکلتے تھے۔ مجھے ڈرگز ملتی تو میں وہ بھی لے لیتا لیکن جو میرے بس میں تھا میں وہی کر رہا تھا۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ اپنے آپ سے انتقام لیتا رہتا۔ میں ٹیا کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ عوف بن سلمان سے بھی بغض ختم ہو چکا تھا کو ہونے تو مجھے کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ میں اس کے ساتھ کوئی رشتہ وابستہ کر سکتا۔ میں صرف اپنی ذات کو تکلیف پہنچا سکتا تھا۔ مجھے نفرت ہو گئی تھی اپنے آپ سے، اس دنیا سے اور اپنے آپ کے اس دنیا میں ہونے سے۔

میں نے آنکھوں کو مزید پھیلاتے ہوئے دوبارہ اس لڑکے کی جانب دیکھا۔ اس کے بال لمبے تھے اور اس نے ناک میں بالی پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر میک اپ کے اثرات ختم ہو چکے تھے جو میں پہلے بار کے اندر بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ اس کا نام سیم تھا۔ سیم وہ پہلا شخص تھا جس نے میرے لیے پہلی ڈرنک آفر کی تھی۔ ٹرنکو یلا کے ساتھ سرکے والے کھٹے چپس میرے لئے اس نے ہی منگوا کر دیے تھے۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ چپس کھاتے رہنے سے ہمیں شراب کا نشہ آہستہ آہستہ چڑھتا ہے، ہم زیادہ الکحل پی سکتے ہیں اور دنیا کو گالیاں بکنے کے لئے زیادہ وقت مل جاتا ہے۔ میں نے اتنی الکحل اپنے اندر ڈال لی تھی کہ میں بے قابو ہو گیا تھا۔ میں نے بار کے اندر بیٹھے ابکائی کر دی تھی جس کی بناء پر ویٹرس نے مجھے گارڈز کو بلوا کر بار سے باہر پھینک دیا تھا۔ سیم کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا تھا جو وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آیا تھا اور اب ہم دونوں فٹ پاتھ پے بیٹھے تھے۔

"یہ دنیا رہنے کے لئے اچھی جگہ نہیں ہے۔" اس نے میری خاموشی سے اکتا کر خود ہی کہا تھا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ میرے ذہن میں مختلف چیزیں ایک ساتھ چل رہی تھیں لیکن نشہ اتنا ہو چکا تھا کہ اب کچھ سوچنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے گھر جانا تھا۔ میں اور کہاں جاتا؟

"مجھے تمہارا انداز اچھا لگا۔۔۔ تم کمپرومائزنگ ہو۔۔۔ اپنے باپ کی طرح۔"

"ایک بات یاد رکھنا۔۔۔ کامیابی تب ملتی ہے جب انسان سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں سوچے۔"

"میں بحیثیت اس کی ماں یہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہوں کہ وہ کہاں رہے گا۔"

یہ کو ہو تھی۔ میری ماں یا ماں کے نام پر دھبہ۔۔۔ مجھ سے چند سال بڑے لڑکے کی گرل فرینڈ۔ دکھ بڑا ہی نہیں تھا، ناقابل بیان بھی تھا۔ مجھے اس بات کا صحیح ادراک بھی نہیں تھا کہ مجھے کیا چیز زیادہ دکھ دے رہی ہے۔ ٹیا کا رویہ اور کو ہو کی گندی فطرت دونوں ہی مجھے اندر سے توڑ گئی تھیں۔ میں ٹیا کی وجہ سے آبلہ بن گیا تھا اور کو ہو نے مجھے پھوڑ ابنا ڈالا تھا۔ میرے سر میں درد کی پہلے سے زیادہ شدید لہر اٹھی۔ میں نے جھکی ہوئی پشت کے ساتھ مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قدم ہر قدم پر لڑکھڑاتے تھے۔ سیم مجھے پکار رہا تھا کہ میں وہیں سڑک پر بیٹھ جاؤں۔ میرا وزن یکدم میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا مگر باقی جسم اتنا ہلکا پھلکا ہو رہا تھا کہ لگتا تھا کہ گر جاؤں گا۔

"تم مجھے چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو۔۔۔ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔" سیم ہچکولے کھاتے میری جانب آ رہا تھا۔ میں جلتی بجھتی ٹیوب لائٹ جیسی آنکھوں کے ساتھ رک گیا تھا۔

"تمہیں مجھ سے کچھ کام ہے؟" میں نے بمشکل زبان ہلائی تھی۔ مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں بس اب گھر جانا

چاہتا تھا جہاں سے نکلتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ کاش یہ میرا گھر نہ ہوتا۔ میرے ذہن سے اب تفکرات کا غلبہ ہٹ رہا تھا۔ عوف بن سلمان اور دنیا اب مزید میرے دماغ سے چمٹے ہوئے نہیں تھے۔ کو ہو بھی جیسے کہیں کھو رہی تھی۔ وہ نیند جو روٹھی ہوئی محسوس ہوتی تھی اب آنکھوں کے کناروں پر آ ٹکی تھی۔ میں وہیں کہیں گرنے والا ہو رہا تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟" سیم میرے قریب آ کر بولا تھا میں نے پلکیں پٹپٹا کر اسے دیکھا تھا۔

"یہ دنیا رہنے کے لئے کیسی جگہ ہے؟" اس نے دہرایا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ وہیں سڑک پر بٹھا دیا۔

"یہ دنیا رہنے کے لئے بالکل میرے جوتے جیسی ہے۔۔۔ کاٹتی ہوئی۔۔۔ ہے نا؟"

وہ میرا چہرہ دیکھتے ہوئے نجانے پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا۔ میرے مثانے پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔

"سیم مجھے جانا ہے۔۔۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے پھر نیند کو آنکھوں سے بھگانے کی کوشش کی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

"دنیا بے شک جوتے کے جیسی ہو۔۔۔ کاٹتی ہو، تکلیف دیتی ہو۔۔۔ لیکن میرے جیسے دوست کا ساتھ ہو تو ہر مشکل، ہر تکلیف آسان ہو جاتی ہے۔۔۔ آزما کر دیکھو۔"

وہ میرے ہاتھ سہلانے لگا تھا۔ میں نے بہت شدت سے نیند کو بھگانا چاہا۔ مجھے نجانے کیوں سیم کے لمس سے کچھ غیر معمولی احساس ہوا تھا جس کی مجھے ایک دم سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ ہاتھ کو سہلاتا ہوا بازو کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

"مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔۔۔ کل ملتے ہیں سیم۔" میں نے زمین پر ڈھیر ہوتے ہوئے وجود کو سنبھالنا چاہا تھا۔

"کل بھی مل لیں گے دوست۔۔۔ آج بھی مت چھوڑ کر جاؤ۔۔۔ کتنا سکون ہے یہاں۔"

وہ بھی مدہوشی کے زیر اثر محسوس ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں نرمی کا تاثر غالب ہو رہا تھا۔ وہ اب میری پشت سہلانے لگا تھا۔ میرے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ نیند کا غلبہ بھاری تھا میں مزاحمت کر رہا تھا لیکن مجھ پر نشہ اس قدر سوار ہو چکا تھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر اختیار ختم ہو رہا تھا۔ سیم نے میری پشت سے میری گردن تک کا سفر کر لیا تھا۔ مجھے انتہائی گندگی کا عجیب سا احساس ہوا۔ سیم کیا چاہتا تھا۔ انسان کا ضمیر مرنے سے پہلے مزاحمت ضرور کرتا ہے۔۔۔ میں نے سیم کو دھکا دیا تھا۔ میں وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ میرا جسم نا جانے کیوں میرا نہیں رہا تھا۔ میں زمین کے سینے پر گر گیا تھا اور سیم مجھ پر۔۔۔۔

☆ ☆ ☆

"شہروز سے بات ہوئی؟"

ممی کے سوال پر اسکا دل چاہا اپنا سر دیوار میں دے مارے۔ وہ جانتی تھیں کہ شہروز کراچی گیا ہوا ہے اور اس کی کالز لے رہا ہے نا میسجز کا جواب دے رہا ہے لیکن پھر بھی وہ پاپا کے سامنے اس سے شہروز کے متعلق استفسار کر کے کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھیں۔ پاپا اس کے چہرے کی جانب

دیکھنے لگے تھے۔اسے بے پناہ کوفت ہوئی۔

"آپکی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے انکی خیریت دریافت کی تھی۔انکی طبیعت گزشتہ رات سے کچھ خراب تھی۔انہوں نے سر ہلا یا وہ بولنے کے معاملے میں کافی کفایت شعار تھے جہاں "جملے" کی ضرورت ہوتی تھی وہاں وہ "لفظ" اور جہاں "لفظ" چاہئے ہوتا تھا وہاں وہ فقط اشاروں سے کام لے کر بات سمجھادیا کرتے تھے۔وہ بہتر محسوس کررہے تھے اس لئے انہوں نے اثبات میں گردن ہلادی تھی ٹھیک محسوس نہ کررہے ہوتے تو چپ رہ کر بتادیتے کہ ابھی بھی بہتر نہیں ہیں۔

"الحمدللہ۔۔صدیقی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی آج۔آپکی خیریت دریافت کررہے تھے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا حالانکہ وہ کافی الجھی ہوئی تھی وہ فی الفور انکی توجہ شہروز کے موضوع سے ہٹانا چاہتی تھی۔انہیں ذیابطیس تھی اور وہ عارضہ قلب میں بھی مبتلا تھے گزشتہ کچھ عرصہ سے انہیں آرتھرائٹس کی تکلیف بھی ہوگئی تھی حالانکہ وہ خود ایک اچھے پیڈیا ٹریشن تھے لیکن ذیابطیس نے انکو بڑا ہی اور زود درنج قسم کا بنادیا تھا۔وہ کچھ مہینوں سے اس بات پر بضد رہنے لگے تھے انکی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور یہ کہ انکے پاس وقت کم ہے اور اب شہروز اور زارا کی شادی ہوجانی چاہئے۔یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں تھا کہ اس پر بحث چھڑتی زارا انکی اکلوتی بیٹی تھی اسکی شادی کی عمر بھی ہوچلی تھی دوسری جانب شہروز بھی گھر کا آخری بیاہنے والا فرد رہ گیا تھا اسکے ماں باپ کے علاوہ اس کے بھائی بھابیاں بھی بے چینی سے گھر کی اس آخری شادی کے منتظر تھے مگر شہروز ذاتی طور پر ابھی مزید ایک ڈیڑھ سال شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کرلیا تھا۔ایک اچھا صحافی بننا اسکا خواب تھا اور اس خواب کی تکمیل کے لئے وہ بہت پر جوش تھا۔اس نے انٹرن شپ کے بعد اسی اخبار کو جوائن کیا تھا جہاں سے انٹرن شپ کی تھی اور جلد ہی اسی اخبار کے چینل میں ملازمت مل جانا اس کے لئے بہت معنی رکھتا تھا۔اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔زارا کے منہ سے شادی کی بات سنتے ہی وہ اس بات پر اصرار کرنے لگا تھا کہ زارا پھپھو کو تب تک اسکے ڈیڈی سے بات کرنے سے روک کر رکھے جب تک کہ وہ اسے گرین سگنل نہیں دے دیتا۔یہ بات زارا نے ممی کو تو بتادی تھی مگر پاپا کو بتانے کی اس میں ہمت تھی نہ اسکی ممی میں جبکہ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ٹال مٹول شاید زارا کی جانب سے ہورہی ہے اور یہ بات انکے لئے کہیں نہ کہیں پریشانی کا باعث بن رہی تھی اسی ایک موضوع کی ٹال مٹول زارا کی ذہنی پریشانی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔اسی لئے زارا کوشش کرتی تھی کہ ان کے سامنے شہروز کا ذکر کم سے کم ہو۔شہروز نے جب سے نیوز چینل جوائن کیا تھا وہ ویسے ہی انکی گڈ بک میں نہیں رہا تھا۔انہیں اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ چینل کی وجہ سے وہ زیادہ کراچی میں رہے گا تو فیملی کو کہاں رکھے گا۔زارا انکی اکلوتی بیٹی تھی وہ اسے شادی کے بعد اپنے قریب لاہور میں ہی دیکھنا چاہتے تھے انکا خیال تھا کہ وہ اپنا کیریئر بنانے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے بہتر ہوتا کہ خاندانی بزنس جوائن کرتا۔وہ اسقدر وہمی ہوچکے تھے کہ انکا خیال تھا کہ شہروز کے گھر والے بھی اسی لئے اس کا ساتھ دے رہے ہیں کہ اس کے بھائی چاہتے ہیں وہ خاندانی بزنس سے دور رہے۔یہ وہ خدشات اور اعتراضات تھے جو وہ گاہے بگاہے کرنے لگے تھے اسی لئے زارا ان کے سامنے شہروز کا ذکر کرنے سے گریز کررہی تھی۔اس وقت تو زارا ممی پاپا کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہوگئی تھی مگر رات کے کھانے پر پھر یہی مسئلہ زیر بحث آگیا تھا۔

"زارا میں اب مزید تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔تمہارے پاپا کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔وہ چاہتے ہیں میں فوراً سے پیشتر منور

بھائی سے شادی کی بات کروں وہ پہلے ہی مشکوک ہو رہے ہیں کہ میں اسقدر ٹال مٹول کیوں کر رہی ہوں۔ میں اور منور بھائی دونوں تمہارے اور شہروز کی وجہ سے تمہارے پاپا کی نظر میں برے بن رہے ہیں۔"

ممی نے اپنی پلیٹ میں پڑے پلاؤ میں موجود چکن کے قتلے کو کانٹے کی مدد سے سامنے کیا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے زارا کو سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے چکن کے قتلے کو نہیں اسکی ذات کو اپنے سامنے کر لیا ہے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"ممی وہ کراچی گیا ہوا ہے کچھ دن میں واپس آئیگا تو بات کرونگی اس سے" اس نے انکی جانب دیکھے بنا چاول والی ڈش اپنی جانب سرکائی تھی۔ وہ بہت شوق سے کھانے کی میز پر آئی تھی۔ چاول دیکھ کر بھوک بھی دوبالا ہو گئی تھی مگر ممی کے ایک سوال نے اسکا موڈ خراب سا کر دیا تھا۔ اسکا پروفیشن اس قسم کا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بہت تھک جاتی تھی۔ ہاسپٹل کے کتنے مسائل تھے۔ دوسرے پروفیشنز کی طرح میڈیکل کے پروفیشن کی بھی اپنی ہی ایک کھینچا تانی تھی کولیگز میں کھینچا تانی، سینئرز کی ڈانٹ ڈپٹ پھر مریضوں کے ساتھ سارا دن کی سر کھپائی، وہ کونسا سارا دن جھولا جھول کر گھر واپس آتی تھی اس کی اپنی کتنی بے شمار الجھنیں تھیں جبکہ اس کے مسائل کو کبھی کسی نے مسائل سمجھا ہی نہیں تھا وہ جب بھی اپنا کوئی مسئلہ زیرِ بحث لانا چاہتی تھی یا اپنے کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی اسے جذباتیت اور حساسیت کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ اسقدر الجھ جاتی کہ وہ اپنے مسائل کے بارے میں کس سے بات کرے، اپنے ذہنی خلجان کو کس کے ساتھ بانٹے۔ اسکی زندگی میں دوست احباب تھے ہی کہاں۔ اس نے بہن بھائیوں دوستوں سہیلیوں کے روپ میں ہمیشہ کزنز ہی دیکھے تھے۔ اسکے اکلوتے پن نے اس کے والدین کو اسکے بارے میں بے حد حساس بنا دیا تھا ممی کو ہمیشہ یہی وہم رہتا تھا کہ وہ اپنی معصومیت میں دوستوں کے ہاتھوں بیوقوف نہ بن جائے سو اسکے دوستوں کے متعلق وہ اتنی احتیاط برتتی رہی تھیں کہ اگر اسکے کوئی دوست بن بھی جاتے تو ممی کی وہمی طبیعت کے باعث خائف ہو کر خود ہی راستے سے ہٹ جاتے۔ وہ اسے کزنز کے ساتھ مصروف دیکھ کر مطمئن رہتی تھیں پھر جب سے اسکی اور شہروز کی انگیج مینٹ ہوئی تھی اسے خود ہی دوستوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ منگنی سے پہلے بھی وہ اپنے سکول کے، پڑھائی کے مسئلے اسی سے ڈسکس کرتی تھی پھر منگنی کے بعد تو جیسے وہ ہی شہروز کی ہو گئی تھی۔ اسے کوئی دوسرا نظر آتا تھا نہ اسے کبھی ضرورت محسوس ہوئی تھی لیکن اب جب شہروز اس درجہ مصروف ہو گیا تھا تو اسے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ اسکی زندگی میں بہن بھائی کی کمی تو تھی ہی دوست نہ بنا کر اس نے اس کمی کو مزید بڑھا لیا تھا اور بالخصوص اب جب وہ اپنے والدین اور شہروز کے درمیان پنگ پانگ بنی ہوئی تھی تو اسے یہ کمی زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ممی کو آجکل اسکو دیکھتے ہی شہروز کی یاد آجاتی تھی جبکہ شہروز کے پاس اب وقت ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کو آمادہ کر پا رہی تھی نہ ممی کو مطمئن اور خود تو وہ بے چین تھی ہی جس کا کسی کو احساس ہی نہیں تھا۔

"یہ بات تو تم گزشتہ کئی دن سے کہہ رہی ہو، آخر تم اس سے صاف بات کیوں نہیں کرتی"

"ممی آپ ۔۔۔۔۔" زارا نے زچ ہو کر انکی جانب دیکھا تھا۔

وہ اسے اطمینان سے کھانا بھی نہیں کھانے دینا چاہتی تھی۔ اس نے پلیٹ میں چاول نکالنے کے لئے وہ چمچ جو ہاتھ میں پکڑا تھا اٹھا کر دوبارہ ڈش میں رکھ دیا۔

"آپ سب کچھ جانتی تو ہیں پھر کیوں ایک ہی بات بار بار پوچھتی ہیں۔"

اس نے اپنی اکتاہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے انہیں مطمئن کرنا چاہا تھا۔

"زارا مجھے صاف صاف بتاؤ سب ٹھیک ہے نا۔۔۔ تم دونوں کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟ اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ۔ میں روز روز تمہارے پاپا کے سامنے بہانے نہیں بنا سکتی" وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔

"ممی اب ایسی بھی جھگڑالو نہیں ہوں میں، پہلے میرے اور شہروز کے کونسے جھگڑے ہوتے رہے ہیں کہ اب جھگڑے کی نوبت آئی ہو گی۔ وہ واقعی مصروف ہے اور میری کالز نہیں لے رہا" اس نے اپنی جانب سے بے حد تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"تم کس قدر صلح جو ہو اور شہروز کس قدر مصروف ہے یہ دونوں باتیں مجھے مت بتاؤ تم۔ میں تمہاری ماں ہوں تم جو کتابیں اب پڑھ رہی ہو نا یہ میں تم سے کافی عرصہ پہلے پڑھ چکی ہوں۔ میں ضرب الامثالوں اور محاوروں سے مطمئن ہونے والا انسان نہیں ہوں۔ میں نے آج روبینہ بھابھی سے بات کی تھی وہ تو کہہ رہی تھیں شہروز پرسوں رات واپس آگیا تھا" ممی نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ زارا نے حیرانی سے انکا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی نہیں جانتی تھی کہ شہروز واپس آچکا ہے۔ اس نے صبح سے کئی بار کال کی تھی مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ زارا کا خیال تھا کہ وہ کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا ہوا ہے تو یقیناً اسی کی مصروفیت میں کال نہیں ریسیو کر رہا۔

"شہروز واپس آچکا ہے کیا؟ آر یو شیور ممی؟" اسے یقین نہیں آیا تھا اور دوسری جانب ممی کا بھی یہی حال تھا۔

"اب تم کہہ دو تمہیں یہ بات نہیں پتا تھی" ان کے لہجے میں اب کی بار طنز ہی نہیں بے یقینی اور خفگی بھی تھی۔

"ممی واقعی یہی بات ہے۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا قسم سے۔۔" اسے اب رونا آنے ہی والا تھا ممی نے اسکی بات کاٹ دی۔

"زارا خدا کے لئے جھوٹ بولنا بند کر دو اور مجھے صاف صاف بتا دو اگر تم دونوں کے درمیان کوئی ایشو چل رہا ہے تو۔۔۔"

"ممی میری بات سے آپکو تسلی نہیں ہو رہی تو آپ خود شہروز سے بات کر لیں مگر خدارا مجھے معاف کر دیں۔ میں اکتا گئی ہوں اس بحث سے اب۔۔۔ شہروز سے بات کروں تو وہ آپکو بہلانے کے لئے کہتا ہے آپ سے بات کروں تو آپ کہتی ہیں شہروز کو سمجھاؤ۔ میں آپکو یہ یقین تو دلا نہیں سکتی کہ مجھے واقعی شہروز کی واپسی کا علم نہیں تھا میں شہروز کو یہ نہیں سمجھا سکتی کہ پاپا میری وجہ سے پریشان رہنے لگے ہیں۔ میں تھک چکی ہوں اس کھینچ کھینچ سے۔۔۔ مجھے کچھ نہیں پتا، آپ لوگوں کی مرضی ہے، جو مرضی کریں مگر مجھ سے اب کوئی بات نہ کرے"

اس نے بمشکل آنسو روکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زیادہ رونا تو یہ سن کر آنے لگا تھا کہ شہروز واپس آچکا تھا مگر اس نے اسے فون کرنے کی زحمت تک نہیں کی تھی۔ ممی نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکی نہیں تھی اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم یقین کرو یار اتنا مصروف ہوں کہ کئی دن سے گھر میں اطمینان سے بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا" شہروز نے چیز کیک کا بڑا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ کیک کچھ نرم ہو چکا تھا اسی لئے احتیاط کے باوجود اسکے کچھ ذرے شہروز کی تھوڑی پر لگ گئے تھے۔ زارا نے آگے بڑھ کر ٹشو پیپرز کے ڈبے میں سے ٹشو پیپر کھینچ کر اسکی جانب بڑھایا تھا۔ وہ کبھی اتنی عجلت میں کھانے کا عادی نہیں رہا تھا۔ وہ اگر کہہ رہا تھا کہ وہ بہت مصروف ہے تو اسکا ہر عمل اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ اپنی ممی کو ان کے گھر لے گیا تھا مگر زارا کو نا پا کر اس نے اسے میسج کیا تھا کہ وہ ہاسپٹل کے قریب واقع کافی

شاپ پہ آ جائے۔ زارا گھر جانے کے لئے نکل رہی تھی اسکا ٹیکسٹ دیکھ کر اسے زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناراضی کا اظہار بھی کرنا چاہتی تھی مگر شہروز کے مقابلے میں ہمیشہ اسکا دل اسکا حریف ثابت ہوتا تھا۔ وہ خود کو اسکے بتائے کافی شاپ میں پہنچنے سے روک نہیں پائی تھی اور اسکو دیکھ کر تو سارا غصہ لمحہ بھر میں غائب ہو گیا تھا۔

"میں صرف تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہوں ورنہ آجکل تو میرے پاس خود کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں ہے" وہ جتا نہیں رہا تھا زارا جانتی تھی اسکے تعلق میں ایسی چیزوں کی گنجائش کبھی نہیں رہی تھی۔ اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ شہروز کو دیکھ کر خوش ہی نہیں مطمئن بھی تھی۔ جن سے محبت ہو انکا ذرا سا التفات بھی مسرور و مشکور کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس آجکل خود کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں جبکہ آجکل وہ کس قدر دیکھنے کے قابل ہو رہا تھا، اسکی شخصیت کتنی نکھرتی جا رہی تھی۔ اسے الیکٹرانک میڈیا جوائن کئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اسکے مثبت اثرات اسکے پورے وجود کا احاطہ کرنے لگے تھے۔ زارا نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ وہ کیسی ظاہری شخصیت کا مالک ہے۔ وہ تب سے اسکی محبت میں مبتلا تھی جب انسان کو اپنے خدوخال کی صحیح پہچان نہیں ہوتی تو بھلا کسی دوسرے کے بارے میں کیسے جانچا جا سکتا ہے اور پھر ایک عام فہم سی بات ہے کہ دنیا کا خوبصورت سے خوبصورت انسان بھی آپ کے محبوب سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتا۔ شہروز زارا کے لئے دنیا کا وجیہہ ترین مرد تھا۔ اس کے باوجود وہ محسوس کر سکتی تھی کہ شہروز کے کپڑوں اور گلاسز سے لے کر پاؤں میں موجود سلیپرز تک ہر چیز جیسے اس کی شخصیت کے چارم میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ واقعی نکھرتا جا رہا تھا۔

"تم اب کیا میری بلائیں لیتی رہو گی یا کچھ ارشاد بھی فرماؤ گی" شہروز نے بھانپ لیا تھا کہ وہ اسکا جائزہ لینے میں مگن ہے۔

"شہروز تم کتنے ہینڈسم ہو گئے ہو" اس نے تعریف کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے بالکل بھول چکا تھا کہ وہ اس سے کال ریسیو نہ کرنے کا گلہ کرنیوالی تھی اور کچھ ناراضی بھی ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا واقعی۔۔۔ اسکا مطلب بھابھی کی بات کا یقین کر لینا چاہیئے۔۔۔ وہ بھی صبح یہی کہہ رہی تھیں" اس نے زارا کے آگے پڑی پلیٹ میں موجود کیک کا بھی ایک بڑا بائٹ فورک کی مدد سے اٹھایا تھا۔ زارا نے اپنی پلیٹ بھی اس کے سامنے رکھ دی۔

"کیا کہہ رہی تھیں بھابھی؟" زارا نے کافی کا مگ اٹھایا۔ اس نے بھی لنچ نہیں کیا تھا مگر شہروز کو رغبت سے کھاتا دیکھ کر اسکا اپنا پیٹ جیسے بھر گیا تھا۔

"بھابھی کہہ رہی تھیں کہ شہروز تم نے انگیج مینٹ کرنے میں جلدی کی ورنہ اب ایک سے ایک خوبصورت لڑکی تمہیں مل سکتی تھی۔"

وہ اسی انداز میں کھاتے ہوئے بول رہا تھا۔ زارا کو حیرانی ہوئی تھی نہ غصہ آیا تھا۔ یہ اس کے لئے کسی بوسیدہ میگزین میں پڑھے گئے بوسیدہ سے لطیفے کی طرح تھا ایسی باتیں مذاق میں وہ ایک عرصہ سے سن رہی تھی۔

"میں نے کہا مجھے خوبصورتی کے ساتھ بونس میں محبت بھی چاہیئے۔ میرے لئے زارا کافی ہے" وہ اب مسکرا رہا تھا گویا اسے اندازہ ہو کہ زارا اسکی یہ بات سن کر خوش ہو گی۔ زارا کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بلاوجہ وضاحتیں دینے کے لئے پر تول رہا ہے حالانکہ اس نے اس سے ابھی تک اس کے گزشتہ رویے کا گلہ نہیں کیا تھا۔

"تم بول کیوں نہیں رہی ۔میں مان لیتا ہوں کہ میں ہینڈسم ہو گیا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھے دیکھتی ہی رہو۔اپنی زبان کو بھی زحمت دو یار۔۔۔اس میں کہیں زنگ تو نہیں لگ گیا" زارا کے حصے کا کیک بھی ختم کر کے اب وہ بھی کافی کا مگ اٹھا چکا تھا۔

"زنگ تو لگتا ہی تھا اسکو ،استعمال جو نہیں ہوتی یہ۔۔۔"اس نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔

"اتنی کسر نفسی سے بھی کام مت لیں خاتون۔۔۔اگر آپکی زبان پے زنگ لگ چکا ہے تو آپکا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ ز میں آسکتا ہے کیونکہ آپ دنیا کی واحد لڑکی ہونگی جن کی زبان نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہو گا" وہ مزاحیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

میں واقعی کم بولنے لگی ہوں شہروز ،کس سے کتنی باتیں کر سکتی ہوں میں اور پاپا تو شروع سے ہی کم گو ہیں تم جانتے ہی ہو اور پھر تم بھی کتنے دن کے لئے کراچی چلے جاتے ہو کس سے بات کیا کروں میں۔۔۔" وہ چپ سی ہو گئی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی اور کچھ لفظ اکٹھے کیے تھے۔

"میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں اور اکیلا تو ریڈیو یا ٹی وی ہی بجتا اچھا لگتا ہے"۔۔۔اس کے جملے میں گلہ تھا ،شکوہ ،بس جیسے کوئی اپنی کسی محرومی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ آزردہ سا ہو جاتا ہے ایسا ہی رنگ اس کے چہرے پے بکھرا تھا اور لحہ بھر میں غائب بھی ہو گیا تھا۔

آئم سوری یار پر میں بھی کیا کروں مصروفیت ہی اتنی ہے۔ابھی تھوڑا ٹریننگ سیشن ہے نا اس لئے محنت بھی بہت کرنی پڑ رہی ہے کچھ عرصہ میں سب بیلنس ہو جائیگا پھر میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دونگا روز فون کر لیا کرونگا مگر پلیز ناراض مت ہو۔

"شہروز نے اس کے ہاتھ پے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

زارا نے چونک کر اسکی جانب دیکھا یعنی وہ ابھی بھی صرف فون کرنے کی بات کر رہا تھا اسکا مطلب یہ تھا کہ وہ پھر واپس کراچی جانیوالا تھا اور اسکی پلاننگ میں ابھی شادی نہیں تھی۔اس نے گہری سانس بھری۔

شہروز کو بھی محبت تھی اس سے ،اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔اسے بھی زارا کے چہرے کے ہر رنگ سے آشنائی کا دعویٰ تھا۔وہ جانتا تھا کہ وہ ناراض ہو گی اور وہ اسکی ناراضی کو اہمیت بھی دیتا تھا لیکن کیا اتنا کافی تھا۔زارا نے اسکی جانب دیکھا پھر وہ کچھ کہتے کہتے رک بھی گئی تھی۔وہ جانتی تھی وہ بولے گی تو آنسو بہنے لگیں گے۔ممی نے اسے صبح الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ شہروز سے کھل کر بات کرے ورنہ وہ اپنے بھائی سے بات کریں گی۔دوسری جانب اس کے پاپا کا شوگر لیول کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اسکی وجہ ٹینشن اور ڈپریشن ہے۔صبح بھی وہ بہتر محسوس نہیں کر رہے تھے جسکی وجہ سے ممی اسے جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔

"زارا ایسے مت کرو یار ،میں خود کو بلاوجہ مجرم محسوس کرنے لگتا ہوں۔تم بولنا نہیں چاہتی تو مت بولو مگر جھگڑا تو کر لو۔مجھے سکون ملے گا"

اسکی خاموشی سے تنگ آ کر وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے رکھے بولا تھا اور یہی وہ لحہ تھا جب زارا کا سارا ضبط ختم ہو گیا تھا۔آنسو ٹپ ٹپ کر کے بہنے لگے۔

"مائی گاڈ" شہروز حق و دق رہ گیا تھا۔اسکی ہمدردی کو اتنی بیدردی سے وصول کیا جائیگا اس نے سوچا نہیں تھا۔وہ سامنے سے اٹھ کر اس کے ساتھ والی چیئر پر آ بیٹھا تھا۔

"آئم سوری زارا۔پلیز ایسے مت کرو" وہ اسکی دلجوئی کر رہا تھا جبکہ یہ دلجوئی ہی زارا کو مزید رلا رہی تھی۔وہ جانتی تھی وہ بہت اچھا ہے۔

اسے یقین تھا وہ اسکی پرواہ کرتا ہے اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ بار بار نہ بھی کہے تب بھی وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے مگر وہ کیا کرتی وہ عجیب کشمکش میں گھری تھی۔ ممی پاپا اور شہروز وہ تینوں اگر تکون تھے تو وہ اس تکون کے درمیان نکتہ بن گئی تھی۔ اسے بار بار اپنے منہ سے شادی کی بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بے شک کزنز تھے ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلف تھے مگر وہ ان باتوں کو بنیاد بنا کر ایک ہی بات مسلسل نہیں کر سکتی تھی۔ اسکی نسوانیت ہرٹ ہوتی تھی۔

"اچھا آئی پرامس نیکسٹ ٹائم میں کبھی تمہیں کال کرنا نہیں بھولونگا اور ہمیشہ وقت پر تمہارے میسجز کا جواب دونگا۔" اس نے جیسے یقین دہانی کروائی تھی اور ساتھ ہی اسکی جانب ٹشو پیپر بڑھایا تھا۔

"اٹس او کے شہروز۔۔۔ میں دراصل پاپا کی وجہ سے بھی کچھ پریشان ہوں۔ انکا شوگر لیول کنٹرول میں نہیں آ رہا" اس نے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔ صد شکر اسکے پاس آنسو بہانے کی معقول وجہ تھی۔ قدرت کے بھی عجیب ہی کام ہیں۔ اس نے عورت نام کی مخلوق کے جذبات بناتے وقت پتا نہیں کیا سوچا تھا۔ عورت کے جذبات عجیب تضادات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ عورت بے شک مرد کی وجہ سے آنسو بہا رہی ہو مگر ہر بار اس امر کا اعتراف کرنا اسے اچھا نہیں لگتا کم از کم اس مرد کے سامنے نہیں جس سے اسے محبت کا دعویٰ بھی ہو جبکہ المیہ یہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ رونا بھی اسی مرد کے سامنے آتا ہے جس سے اسے محبت کا دعویٰ ہوتا ہے۔

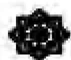
"انشاءاللہ ٹھیک ہو جائینگے وہ۔۔۔ تم خود ایک ڈاکٹر ہو تم جانتی ہی ہو شوگر جیسا مرض آہستہ آہستہ ہی کنٹرول میں آتا ہے۔ تم پریشان مت ہو پلیز" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ زارا نے گہری سانس بھری تھی۔ اس سے مزید وہ بات کرنا فضول تھا جو وہ کرنا چاہتی تھی۔

"جسے بیٹھا ہوا شخص نظر نہیں آتا اسے کھڑا ہوا بھی کہاں نظر نہیں آئیگا" اس نے کسی کے منہ سے یہ جملہ بھی سنا تھا آج اس جملے کی عملی تفسیر دیکھنے کو بھی مل گئی تھی۔

گھر پہنچ کر بھی اس کا دل بہت بیزار تھا۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی تھی۔ اسکا دل فی الوقت کسی کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسے زندگی میں کبھی بے اعتبار کہلایا جانا پسند نہیں رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی تھی کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ اسے الجھن ہوتی تھی جب بھی کبھی اسے ممی مشکوک نظروں سے دیکھتی تھیں اور ایسی صورتحال میں وہ ہمیشہ ان سے ناراض ہو جایا کرتی تھی مگر بھلا ہو اس محبت کا جو اس کے دل میں شہروز کے لئے تھی جو اس کو اسکے اپنے والدین کی نظر میں بے اعتبار بنا رہی تھی اور وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اکتائے ہوئے انداز میں بستر پر گر گئی تھی۔ اسکی زندگی میں عجیب سا خلا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے خود اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ ایک طرف اسکے پاپا تھے جو اپنی بیماری کی وجہ سے اتنے وہمی ہو گئے تھے کہ ان کے لئے اب آدھا بھرا ہوا گلاس بھی بھرا ہوا نہیں رہا تھا۔ وہ ہر چیز کا منفی رخ دیکھتے ہی نہیں تھے بلکہ اسے دل میں بسا لیتے تھے۔ ممی کے لئے وہ ابھی بھی ایک چھوٹی بچی تھی اور انکا خیال تھا کہ ساری دنیا سارا وقت بس ان کی بیٹی کی معصومیت سے فائدہ اٹھانے اور اسے بیوقوف بنانے کی پلاننگ کرتی رہتی ہے۔ شہروز کا رویہ بھی اسکی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ پتا نہیں واقعی مصروف تھا یا اس سے کنی کترا رہا تھا۔ زارا کے لئے یہ صورتحال سخت ذہنی اذیت کا باعث بن رہی تھی اور المیہ یہ تھا کہ وہ اس کے متعلق کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ ممی سے بات کرتی تو شہروز انکی نظر میں مزید برا بنتا تھا شہروز سے بات کرتی تو وہ خود بری بنتی تھی۔ یہاں ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ کسی کے سامنے اپنا دل ہلکا کر لیتی مگر بہت یاد کرنے پر بھی

کوئی ایسا غمگسار یاد نہیں آرہا تھا جو اس کے دل کی بات سن اور پھر سمجھ بھی لیتا۔ زندگی کو اگر چار دیواروں والا بند کمرہ تصور کرلیا جائے تو "دوستی" اس چہار دیواری میں ایک چھوٹا سا روزن ہوتی ہے جہاں سے آنے والی تھوڑی سی روشنی بھی انسان کے لئے بعض اوقات بڑی اہم ہوتی ہے۔ وہ اسکو تاریکی میں صحیح سمت کا تعین کرنے میں مدد کرتی ہے۔ زارا کو ایسے ہی ایک روزن کی فی الوقت اشد ضرورت تھی۔ اس نے خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنا موبائل اٹھالیا تھا اور وہیں لیٹے لیٹے اس میں سے اپنی کونٹیکس لسٹ چیک کرنے لگی تھی۔ نمبرز چیک کرتے کرتے اس نے ایک نمبر پر توقف کیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی تھی پھر اس نے آپشن نکال کر کال کے آپشن پر انگلی رکھ دی تھی۔

ثمینہ کو کال جا رہی تھی۔



اسکا سارا انہماک اپنے لیپ ٹاپ میں تھا۔لفظ اسکے سامنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر عاجزی سے جیسے بکھرے پڑے تھے۔وہ جس قدر انہیں چنتا تھا اتنا ہی گم ہوتا جاتا تھا۔

"ایک دنیا تھی جو مکمل نہیں ہوتی تھی اور ایک دین تھا جو کب سے مکمل تھا۔اکملیت کی تلاش میں بھٹکتا انسان اپنے دل میں کیوں نہیں جھانکتا۔وہ اندر کہیں مکمل نہیں ہے تو پھر باہر بھی اسے اکملیت نہیں ملنے گیا اور اگر وہ اندر کہیں مکمل ہے تو اسے باہر کی اکملیت کی ضرورت کیا ہے"

"واہ" اس نے بے ساختہ سراہا تھا۔منہ میں جیسے چاشنی سی گھل گئی تھی۔بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے وہ کس قدر مطمئن انداز میں ایک نئے جہان کو تسخیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔یہ صرف حرفوں سے گندھے لفظ نہیں تھے یہ کسی کی زندگی تھی اور ان میں زندگی کے جتنی ہی کشش تھی اسرار تھا لطف تھا۔وہ جتنی پرتیں کھولتا تھا اتنا ہی سر دھنتا تھا۔لفظ رنگ نہیں تھے کہ تصویر بن جاتے اور رنگ لفظ نہیں تھے کہ کتاب بن جاتے مگر لکھنے والے نے ایسے لکھا تھا کہ وہ رنگ اور لفظ دونوں کو محسوس کر سکتا تھا۔وہ تصویر اور کتاب دونوں کا لطف لے رہا تھا۔دل بوجھل تھا مگر مضطرب نہیں تھا۔اسے بہت پہلے سے یقین تھا کہ جب وہ ان رنگوں جیسے لفظوں کو تہہ در تہہ کھولنے میں کامیاب ہو جائیگا تو کچھ ایسا ضرور ہوگا جو اسے چونکا دے گا اور اب وہ ہر سطر پر چونک رہا تھا۔اسے اپنی کئی سالوں کی محنت وصول ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹون۔ٹون" سارا تسلسل جیسے سیل فون نے توڑ ڈالا ہو۔اس نے ناپسندیدگی سے اس جانب دیکھا تھا۔فون سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔اس نے ناگواری سے فون اٹھایا تھا۔ارادہ تھا صرف دیکھے گا کہ کال کرنے والا کون ہے اور گھنٹی بند کر کے دوبارہ سے اسے سفر پر نکل جائیگا جہاں سے کھینچ کر اسے لایا گیا تھا لیکن چمکنے والا نام دیکھ کر اسکی آنکھیں بھی جیسے چمکنے لگی تھیں۔

"ڈاکٹر زارا" اس نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے گہری سانس بھری تھی۔وہ اب فون سننے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔اسکا انہماک ختم ہو چکا تھا۔

اللہ نے دنیا میں کچھ لوگ بنائے ہی اس لئے ہیں کہ وہ آپ کے ارادوں کو سومنات کے مندروں کی طرح توڑتے پھوڑتے رہیں۔سومنات کے مندروں نے بھی ٹوٹ جانے کے بعد اتنا سکون محسوس نہیں کیا ہوگا جتنا اس لمحہ وہ کر رہا تھا۔اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے فائل کو بند کرنا شروع کیا تھا۔لیپ ٹاپ کے ایک کارنر میں آج کی تاریخ نمایاں تھی۔2012 کا تیسرا مہینہ اور گیارہویں تاریخ تھی۔لمحہ بھر میں پہلا صفحہ اسکرین پر چمکنے لگا تھا جس پر بڑا بڑا لکھا تھا۔۔"عہد الست"

اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اعداد ہماری زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ہمارا آنا ہمارا جانا۔۔۔یہاں اس دنیا میں قیام سب کچھ کہیں نا کہیں ہندسوں کے تحت متعین کیا جاتا ہے۔ہندسے ہمارے اردگرد بکھرے ہیں۔۔اللہ ایک،منکر نکیر دو،ادوار تین،کتابیں چار،نمازیں پانچ"

احمد معروف نے بے حد ملامت سے کہا تھا۔ نور محمد کی آنکھیں ابھی بھی بھیگی بھیگی سی تھیں حالانکہ وہ رو نہیں رہا تھا وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر ہال میں آبیٹھے تھے۔ رات کافی گہری تھی اور احمد معروف کے پاس کرنے کے لئے رات سے بھی زیادہ گہری باتیں تھیں۔ ٹھنڈ بھی ہو چلی تھی۔ چند دن گزرتے لوگ کرسمس کی تیاریوں میں لگ جاتے۔ دو ہزار چھ کا سورج بہت جلد دو ہزار سات سے حلف لے کر اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاتا۔ ایک اور سال گزر جاتا۔ ایک اور سال آجاتا۔

"دین اور دنیا کی حقیقت اعداد بہت اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں"

وہ بہت نرمی سے اپنا نقطہ نظر بیان کر رہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ دین سیدھا "راستہ" ہے جبکہ دنیا گول "دائرہ" ہے۔ اول الذکر "ایک" ہے جبکہ موخر الذکر بڑا سا "صفر"۔ آپ تسلیم کریں یا نا کریں مگر یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ آپ "ایک" ہو کر نہیں جی سکتے کیونکہ یہ آپکی اوقات نہیں۔ "یکتائی" صرف رب کائنات کو جچتی ہے جبکہ "صفر" آپکا مقام نہیں اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب مقرر کیا ہے کیا وہ "صفر" کو اپنا نائب مقرر کریگا۔ صفر کا مطلب کچھ نہیں اور اللہ نے فرشتوں سے سجدہ "کچھ نہیں" کو نہیں کروایا ہو سکتا اس لئے آپکو ان دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ یہی ہے وہ طریقہ جو اللہ نے بتایا اور نبی پاکؐ نے سکھایا۔ آپ کو اسے اپنانا پڑتا ہے۔ آپ کو "دس" ہونا پڑتا ہے یعنی ایک اور صفر ایک ساتھ۔ اکٹھے۔۔ باہم۔۔۔ آپ دین کو چھوڑ کر دنیا میں ضم ہو جائیں یہ بھی ناپسندیدہ اور دین کے ہو کر دنیا سے کنارہ کرلیں یہ بھی ناپسندیدہ۔۔۔ آپکو دس کا راستہ اپنانا پڑتا ہے"

"یہ آسان کام نہیں ہے احمد معروف۔۔۔ آپ "اکملیت" کی بات کر رہے ہیں۔۔ یہاں دو ہندسے ملتے ہیں۔ ایک اور دس۔۔ دس اکملیت ہے۔ اکملیت انسان کا نصیب ہی نہیں ہے۔ اکملیت ہماری زندگیوں میں کہیں ہے ہی نہیں"

نور محمد کو اسکی باتوں سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔

میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ یہ ہماری زندگیوں میں ہے۔۔۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم نا "دس" ہوتے ہیں نا "دس" ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکملیت ہمارا نصیب نہیں ہے یا ہماری زندگی میں کہیں نہیں ہے۔" احمد معروف اس کے قریب ہوا تھا نور محمد اسکا چہرہ تکنے میں مگن تھا۔ وہ احمد معروف کے سامنے خود کو کبھی کبھی بالکل احمق سمجھتا تھا۔

"آپ نے زندگی میں کسی کو دیکھا ہے جو مجسم "دس" ہو۔۔۔؟" اس نے پراسرار سے لہجے میں سوال کیا۔ احمد معروف نے مسکرا کر گردن ہلائی۔

"ماں"۔۔۔ وہ حاملہ ماں جو پورے دنوں سے ہوتی ہے۔۔ وہ مکمل "دس" ہوتی ہے۔ اسکا وجود "ایک" اور اس کے وجود میں چھپی اسکی اولاد ایک بڑے سے "صفر" کے روپ میں اس کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ "بچہ" کائنات کی سب سے خوبصورت چیز ہوتی ہے۔ اس بچے سے زیادہ خالص چیز دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتی۔ یہ جزدان میں لپٹے کسی صحیفے کی طرح مقدس ہوتا ہے اور ایک ماں اس صحیفے کی طرح کے وجود کو اپنے وجود میں نو مہینے تک سمیٹ کر رکھتی ہے۔ ماں ہی وہ مکمل روپ ہے جس میں ہم مجسم "دس" دیکھ سکتے ہیں۔ اکملیت کی اس سے بہتر مثال کہاں ملے گی۔ ماں ہی وہ پہلی ذات ہے جو اس ننھے وجود تک رسائی رکھتی ہے جو اللہ کا کلمہ حق پڑھ کر اس دنیا میں آتا ہے جو اسقدر خالص ہوتا ہے کہ خود اللہ نے اس سے اپنی

وحدانیت کا عہد لیا ہوتا ہے۔" وہ عہد الست" میں بندھ کر سیدھا ماں کے وجود میں آجاتا ہے۔" بچہ" اللہ کا سب سے خوبصورت تحفہ ہے جو اس کائنات کو عطا کیا جاتا ہے۔ وہ بچہ" دین حق" کا عہد کر کے اس دنیا میں آتا ہے۔ اتنی خالص اور اتنی پاکیزہ چیز شاید ہی کوئی اور ہوتی ہو اور وہ وجود جو اس خالص تحفے کو اٹھائے پھرتا ہے اس سے زیادہ مقدس کیا ہوگا۔ یہ ہے وہ مجسم" دین" جو ہم اس دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ماں ہی ہے جو دین اور دنیا کے درمیان پل کی طرح ہوتی ہے اللہ جب ایک عورت کو" ماں" کے درجے پر فائض کرتا ہے تو انسانیت کی تکمیل کر دیتا ہے۔ ایسی عورت کا درجہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ماں کی دعا اللہ جلدی سنتا ہے اور رد وہ۔ میں تو دعا رد نہیں کی جاتی۔ دین اور دنیا کا مکمل مجسم روپ ایسی عورت کی شکل میں نظر آتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ دین اور دنیا کے درمیان ربط اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنا ہی دراصل وہ راستہ ہے جو ہمیں ہماری اس منزل تک پہنچائے گا جسے" جنت" کہتے ہیں۔ انسان کا کام دین میں گم ہو جانا ہے تاکہ اسے سیکھ کر اس دنیا میں گم نا ہونے کے طریقے سیکھ سکے۔ اس ربط کو اس گتھی کو سیکھنے اور سلجھانے والا ہی دراصل کامیاب انسان۔۔۔ حضرتِ انسان ہے جس کے لئے یہ کائنات بنائی گئی" احمد معروف نے رک کر گہری سانس بھری تھی۔

یہ ربط اور ہم آہنگی" سکھانے والی سب سے پہلی ہستی ہوتی ہے" ماں" کیونکہ وہ خود اس ربط کی چلتی پھرتی مثال ہوتی ہے۔۔۔ جس کی ماں یہ ربط سیکھ جاتی ہے اسکی اولاد خود بخود یہ ربط سیکھ جاتی ہے۔ اللہ عورت کو ماں بناتا ہے اور پھر ماں کو" دین" بنا دیتا ہے۔ یہ ہی اصلیت ہے۔"

وہ خود بھی اور ہی ذہنی کیفیت میں تھا۔ نور محمد نے اسکا چہرہ دیکھا پھر اس نے آستین سے آنکھیں صاف کی تھیں۔

" ماں تو ہر شخص کو ملتی ہے احمد معروف لیکن ہر شخص مکمل نہیں ہوتا"

" نہیں نور محمد۔۔۔ ہر عورت" ماں" نہیں ہوتی۔ کسی کسی کو صرف ماں نام کی عورت ملتی ہے۔۔ ایسی عورت جس کے دل میں اخلاص نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ماں وہ ہوتی ہے جس کے دل میں ممتا ہوتی ہے جس کے دل میں ممتا نہیں ہوتی وہ ماں بھی نہیں ہوتی۔ ممتا بے حد خالص جذبہ ہے۔ اللہ اس جذبے کو انسان کے لئے محسوس کرتا ہے۔ وہ جب انسان سے اپنی محبت کا ذکر کرتا ہے تو پلڑے میں ممتا نام کا ترازو رکھ کر اسے ستر گنا سے زیادہ دفعہ تولتا ہے۔ اللہ کی اس محبت کا ایک گنا جس ماں کے دل میں ہو بس پھر وہی" ماں" ہے۔" احمد معروف نے اسکا چہرہ دیکھا۔ نور محمد کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

" ماں" اس نے دوہرایا۔ اسے یاد آیا اسکی بھی کوئی ماں تھی۔ اسے یاد آیا اس کے سینے میں چبھن جیسی چیز کا نام" ماں" تھا۔

اسے سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ رات کے اس پہر کیوں اس قدر بے چین تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اسے دنیا میں یاد کرنے والی ہستی کون تھی۔ وہ یکدم پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

" اسے کب پرواہ تھی کہ دنیا میں کوئی اسے ایسے مانگتا ہے جیسے بھوکا پیٹ روٹی مانگتا ہے۔

کوئی اس کے لئے ایسے بلکتا ہے جیسے شیر خوار ماں کی آغوش کے لئے بلکتا ہے۔

اس نے کب سوچا تھا کہ کسی کو اسکی ایسے خواہش ہو سکتی ہے جیسے کسی نفس کو سورج کی تپتی جہنمی آگ جیسی شعاعوں سے بچنے کے لئے سائے کی خواہش ہوتی ہے۔

اسے کب پرواہ تھی کہ وہ کسی روزہ دار کے لئے وقتِ افطار پانی کا پہلا گھونٹ ہو سکتا ہے۔

اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ عالمِ نزع میں سسکتے تڑپتے وجود کا کلمہ حق ہو سکتا ہے۔

وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگا تھا۔

"آپ کون ہیں احمد معروف۔۔۔آپ کہاں سے آگئے ہیں مجھے میرا ماضی یاد دلانے۔۔میں تو سب بھول چکا تھا۔آپ کیوں مجھے سب یاد کروا رہے ہیں" وہ بلک رہا تھا

اسے بالا آخر وہ ماں یاد آگئی تھی جو اسے کبھی بھولی نہیں تھی۔احمد معروف نے اس کے آنسوؤں کو پونچھ دیا تھا۔اس کے چہرے پر گہری ہوئی مسکراہٹ تھی۔اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔

"میں بلس گرانٹ ہوں۔۔۔میرے دوست مجھے بلی کہتے ہیں" اس نے دھیمی سی آواز میں کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دنیا بہت گندی ہے بن یافع۔۔۔" میں نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔بن یافع نے ملامت کا بھرپور تاثر آنکھوں میں سموتے ہوئے گردن ہلائی۔

"آپ جس چیز کو کل رات پیتے رہیں ہیں۔۔۔اس چیز سے زیادہ گندی نہیں ہے دنیا!"

میں نے منہ اٹھا کر اسے دیکھا۔اس کے سیاہ رنگ اور بھدے خدوخال کی تہہ میں نجانے وہ کیا خوبصورت،مہربان سا چھپا بیٹھا تھا کہ میرا دل چاہا کہ میں بن یافع کی گود میں سر رکھ کر اپنا سارا درد بیان کر ڈالوں۔

میں نے کل رات سے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی۔میں اس کے ذائقے اور خوشبو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔میں نے اس کے اثرات کے بارے میں سنا تھا لیکن یہ اس قدر بد اثرات ہو سکتے تھے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔یہ حادثات کا باعث بن سکتے تھے میں نے یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا کل رات شراب کے نشے میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا،اس سے زیادہ برا زندگی میں مزید کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔میں نجانے کتنی دیر اس سڑک پر ہوش و حواس سے ماورا پڑا رہا تھا۔جب حواس بیدار ہوئے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ میں ذلت کی کس انتہا تک ہو آیا تھا۔میرے کپڑوں پر سڑک پر پڑے کچرے کی غلاظتوں کے علاوہ بھی آلائشیں تھیں۔واش روم جانے کی بجائے میں نے سڑک کو ہی ٹوائلٹ کے طور پر استعمال کر لیا تھا اور مجھے اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ میں اس چیز کا ادراک کر پاتا۔میں نے ابکائی بھی کی تھی جس کی بنا پر میری قمیض بالکل غلاظت سے بھر گئی تھی۔میرے وجود سے بساند اٹھ رہی تھی جو اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ مجھے دوبارہ سے ابکائی آنے لگی تھی۔مجھے صفائی سے عشق تھا،گندگی ہمیشہ سے میرے لئے باعث آزار تھی اور شراب کے نشے نے میرے پور پور کو گندگی میں ڈبو ڈالا تھا۔ہوش میں آجانے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کوہ،عوف۔بن سلمان اور ڈیانے مل کر میرے ساتھ اتنا برا نہیں کیا جتنا برا میں نے خود اپنے آپ کے ساتھ کر ڈالا تھا۔سیم نے میرا غلط استعمال کیا تھا اور میں نشے میں مزاحمت کرنے کے باوجود اسے روک نہیں پایا تھا۔مجھے انتہائی دکھ تھا کہ یہ سب نشے کی وجہ سے ہوا تھا ایسا بھی کیا ہو گیا تھا کہ میں آدمیت کے مقام سے ہی گر گیا تھا۔میں بہت مشکل سے گھر پہنچا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنے رہائشی حصے کی جانب جاتا۔میں ملازمین کے سامنے اس

حلیے میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتا تھا اسی لئے میں چپ کر کے ٹیکسی کی طرف گیا تھا۔ میرا خیال تھا وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ بن یافع شاید عوف کے ساتھ ہی رخصت ہو چکا ہوگا لیکن بن یافع یہاں موجود تھا اور یہ اس شخص کا مہربان رویہ تھا کہ میں نے بے بس ہو کر اپنے ساتھ بیتنے والی ہر بات اُسے بتادی تھی۔ میرے اعصاب اس قدر مجبور ہو چکے تھے کہ اگر میں بن یافع سے یہ سب نہ کہتا تو شاید پھٹ جاتا۔ کوہ عوف۔ بن سلمان اور ضیا۔۔۔۔ میں نے ایک ایک شخص کو ایک ایک کر کے بن یافع کے سامنے کھول ڈالا تھا۔

بن یافع نے میرے لئے کپڑوں اور نہانے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں اب ان کے سامنے پشیمان بیٹھا تھا۔

"مجھے شراب نہیں پینی چاہیے تھی۔۔۔ میں اس کے منفی اثرات کو برداشت کرنے کے لئے بہت چھوٹا ہوں ابھی۔"

میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کو واقعی نہیں پینی چاہیے تھی۔۔۔ کسی کو بھی نہیں پینی چاہیے۔۔۔ اس کے اثرات کو برداشت کرنے کے لئے ساری عمر چھوٹا رہتا ہے انسان۔۔۔ آپ یہ لیموں پانی لیجیے۔۔۔ سر درد میں افاقہ ہوگا۔"

"مجھے لیموں پانی نہیں چاہیے بن یافع۔۔۔ آپ مجھے زہر لا دیجیے۔" میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"زہر۔۔۔؟" اس نے دہرایا۔ اس کے لہجے میں تحیر تھا۔

"ایک حرام چیز آپ رات پی کر آئے ہیں اور ایک آپ اب مانگ رہے ہیں۔ آپ بار بار کیوں چکھنا چاہتے ہیں سر۔۔۔ یہ کام تو ایک بار ہی کافی ہوتا ہے۔"

"مجھے کیا اپنی مرضی سے مرنے کا حق بھی نہیں حاصل۔۔۔ جب مجھے یہ دنیا راس نہیں آئے گی تو میں اس کو چھوڑنے کی ضد ہی کروں گا نا۔"

میں نے تنک کر کہا جیسے چھوٹا بچہ پسند کی چیز نہ دلوانے پر کہتا ہے۔

"ضد، زہر۔۔۔ آپ کو ہر وہ چیز پسند ہے جو دکھ دینے کا باعث بنتی ہے۔"

بن یافع نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ کو یہ سب چیزیں ناپسند ہیں۔"

"میرے دین میں یہ سب چیزیں ناپسندیدہ ہیں۔۔۔ بلکہ میرا دین انہیں حرام قرار دیتا ہے۔"

بن یافع نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس لیموں پانی والے گلاس کو زبردستی مجھے تھما دیا تھا۔

"ہر وہ چیز جو کائنات کے تسلسل کو ذرا سا بھی خراب کرنے کا باعث بنے، ہر مذہب میں ناپسندیدہ اور حرام ہوتی ہے۔" وہ خود ہی وضاحت کر رہا تھا جو مجھے پسند نہیں آئی۔

"میں اس کائنات کے سامنے چیونٹی سے بھی گیا گزرا ہوں۔۔۔ میں اس کا تسلسل کیا خراب کروں گا۔۔۔ میرا اپنا تسلسل ہی ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ آپ کی سوچ ہے سر۔۔۔ آپ اس زمین کے چہرے پر موجود ہیں، اس دنیا کا حصہ ہیں تو آپ یقیناً اس کائنات کے تسلسل کے ذمہ دار

ہیں، اس کے لئے جوابدہ ہیں۔۔۔آپ کا یہاں موجود ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس کائنات کے تسلسل میں کس قدر اہم ہیں۔"

وہ اب مودب کھڑا جواب دے رہا تھا۔ میں نے ناسمجھی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھا۔ مجھے مزید وضاحت درکار تھی۔ اس نے میرا چہرہ دیکھا اور شاید پڑھ بھی لیا۔ وہ قابل آدمی تھا۔

سر انسان کی دنیا ایک دائرہ ہوتی ہے۔ اس دائرے میں وہ اکیلا نہیں ہوتا، اس سے وابستہ لاتعداد لوگ بھی اس دائرے میں ہوتے ہیں۔ انسان کا کیا جانیوالا کوئی بھی ناپسندیدہ یا حرام عمل اس دائرے میں موجود لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے پھر ان انسانوں کی زندگیوں میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے یہ بگاڑ ان سب انسانوں کے اپنے اپنے دائروں میں موجود دوسرے انسانوں پر بھی اثر ڈالتا ہے تو سوچیں ایک انسان کا چھوٹا سا حرام عمل ختم نہیں ہوتا، چھپتا نہیں ہے۔ وہ کائنات کے تسلسل کو بگاڑنے لگتا ہے۔ یہ یورینیم کی افزودگی سے زیادہ بڑا اور خطرناک عمل ہے سر اسی لئے میرے دین میں حلال حرام کی واضح تفریق ہے"۔

"حلال حرام۔۔۔؟" میں نے پھر استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"بہت آسان سی بات ہے سر۔۔۔حلال وہ جو اللہ نے جائز قرار دیئے اور حرام وہ جو اس نے ناجائز قرار دے دیئے۔۔۔موت برحق ہے ایک نا ایک دن آہی جاتی ہے یعنی موت حرام نہیں ہے لیکن خودکشی حرام ہے۔ آپ نے فنا ہو جانا ہے دونوں صورتوں میں لیکن ایک چیز جائز ہے جبکہ دوسری جائز نہیں ہے۔ ایک کام میں اللہ کی رضا ہے جبکہ دوسری میں نہیں ہے۔ حرام اور حلال کے درمیان یہ جو فرق ہے نا یہ تکلیف سے بچانے کی چیز ہے۔ ہر وہ چیز جو ابتداء میں ناپسندیدہ ہے، اپنی انتہاء پر حرام بن جاتی ہے کیونکہ یہ ابتداء میں تکلیف دہ اور انتہاء پہ باعث ذلت بن جاتی ہے انسان حرام چیز کو اپناتا ہے تو سمجھئے کائنات کے تسلسل میں بگاڑ کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ سارے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے گھڑی کو الٹا چلانے کی کوشش میں جو بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے وہی بگاڑ حرام کو حلال بنا لینے سے ہوتا ہے۔ جگسا پزل کی مثال لے لیجئے۔ ایک غلط ٹکڑا لگا لینے سے ہر ٹکڑا غلط ہو جاتا ہے آخر تک کوئی چیز اپنے تسلسل پر نہیں آپاتی۔ حرام کا استعمال بھی اسی طرح پہلے انسان اور پھر اسکی کائنات کے تسلسل کو بالکل بگاڑ دیتا ہے۔

انہوں نے بات مکمل کر کے میرا چہرہ دیکھا کہ آیا میں ان کی بات سمجھا ہوں یا نہیں۔ میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مجھے چیزیں دیر سے سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن بعض اوقات دل چاہتا تھا کہ چیزوں کو مزید واضح کیا جائے۔

""حرام"۔۔۔کا لفظ بہت مختصر، اس کا مفہوم بہت واضح لیکن اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔۔۔ہر وہ چیز، جس کے اثرات برداشت کرنے کے لئے پہلے انسان کا حوصلہ اور پھر وہ خود چھوٹا پڑ جائے، ہر وہ چیز جو اپنی ابتداء میں تکلیف یا خلجان اور اپنی انتہاء پر کرب یا ذلت کا باعث بنے۔۔۔حرام ہے۔۔۔حرام ہے۔۔۔" وہ ابھی بھی سابقہ انداز میں کھڑے تھے۔

"شراب، موسیقی، زناکاری، خودکشی۔۔۔اور عشق" آخری لفظ ادا کرنے میں اس نے کچھ توقف کیا تھا۔ میں آخری لفظ پر ہی چونکا تھا۔

"عشق۔۔۔؟" میں نے خود ہی اپنی آواز کی سرسراہٹ کو محسوس کیا۔ ٹیا کا چہرہ ذہن کی سکرین پر چمکنے لگا تھا۔

"عشق۔۔۔؟" میں نے دہرایا تھا۔ اب کی بار میرا انداز سوالیہ تھا۔

بن یافع کے چہرے کے خدوخال میں نرمی کا عنصر بڑھ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ مہربان لگنے لگا تھا۔

"عشق ایک جذبہ ہے بن یافع۔۔۔آپ اسے کیا ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ یہ خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے" میں نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

انہوں نے گردن ہلائی۔

خدا تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ "محبت" ہے۔ وہ محبت جو فردِ واحد سے نہیں جو انسان سے نہیں بلکہ انسانوں سے کی جاتی ہے۔ خدا صرف انسانیت سے محبت کرنے سے ملتا ہے۔ "محبت" جذبہ ہے سر۔۔۔ "عشق" تو اس جذبے کو بدنام کر کے دیا جانیوالا نام ہے۔ شاعروں ادیبوں کی اصطلاح ہے۔ انہوں نے محبت کو بگاڑ بگاڑ کر عشق بنا دیا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ محبت سرکہ ہے اور عشق شراب ہے ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے یعنی سرکہ حلال ہے، شراب حرام ہے۔ محبت میں جب وہ مقام آجائے کہ محبوب خدا لگنے لگے اور آپ اسے اپنے لئے ضروری سمجھنے لگیں تو وہیں رک جانا چاہئے۔ محبت کو عشق میں ضم نہیں ہونے دینا چاہئے۔ عشق انسان کو کم ظرف بنا دیتا ہے۔ اسکی سوچ کو محدود کر دیتا ہے۔ وہ "معشوق" کے گرد طواف کرنے کو جائز قرار دینے لگتا ہے۔ عشق میں گم انسان پھر انسان نہیں رہتا۔ وہ انسانیت کے لئے ناکارہ ہونے لگتا ہے۔ میں نے کہا نا ہر وہ چیز جو آپکو انسانیت کے مقام سے گرا دے وہ حرام ہے تو عشق میں بھی یہی ہوتا ہے۔ انسان ہوش وخرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے اسے اپنے جیسے مٹی گارے سے بنے انسان کی ایسی لگن لگ جاتی ہے کہ اسے کچھ اور بھائی نہیں دیتا۔ اس سے بڑی بت پرستی کیا ہوگی کہ مٹی کا باوا مٹی کے باوے کے لئے مجنون ہو جائے۔ عشق مجنون کر دیتا ہے۔ مجنون پاگل کو کہتے ہیں اور پاگل پن سے خوف کھانا چاہئے کیونکہ اللہ مجنون سے اتنا لاپرواہ ہوتا ہے کہ وہ پانچ نمازیں جو کسی حال میں معاف نہیں ہوتیں مجنون کو وہ بھی معاف ہو جاتی ہیں۔ عشق تو سرطان سے بھی بڑا مرض ہے۔ یہ عشق۔ عشق حقیقی، عشق مجازی یہ صرف الفاظ کا ردو بدل ہے۔ یہ انسان کو مجنون بنا دینے کی چیزیں ہیں۔ اصل جذبہ "محبت" ہے اور محبت کبھی آپکو آپ کے مقام سے نہیں گراتی۔ وہ آپکو کبھی پاگل پن تک نہیں لاتی اس لئے محبت اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ میرا اللہ ننانوے ناموں سے مخاطب کیا جا سکتا ہے اور ان ننانوے ناموں میں کوئی ایک بھی "عاشق" نہیں ہے۔ ننانوے نام کھنگال کر دیکھ لیں وہ "محب" ہے وہ "عاشق" نہیں ہے۔"

مجھے انکی سب باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن جتنی بھی آرہی تھیں وہ بے حد نئی اور دلچسپ تھیں۔ میں دینِ اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن سکول میں مذاہب کے متعلق پڑھتے ہوئے میں نے نماز اور مسجد کے بارے میں پڑھا تھا۔ یہ باتیں اتنی ضروری نہیں تھیں۔ میرے لئے جو ضروری تھا وہ مجھے سمجھ میں آگیا تھا کہ کائنات کے تسلسل میں ہر انسان اہم ہوتا ہے۔ انسان کو سیدھے راستے کا انتخاب کرنا ہوتا ہے ورنہ غلط راستہ اسے بھٹکا دیتا ہے اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ قدرت کو سدھ بدھ کھوئے انسانوں کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس مقصد کے لئے اس نے جانور بنا رکھے ہیں۔ اس رات میں نے سیکھ لیا تھا کہ بحیثیت انسان مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں خود کو جانور بننے سے روک کے رکھوں اور یہ تب ہی ممکن تھا جب میں حرام اور حلال میں واضح طور پر تخصیص کرنے کے قابل ہوتا۔۔۔ میں نے سیکھ لیا تھا کہ ہماری خوراک کہیں نا کہیں ہماری فطرت کو بنانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ انسان کو خوراک کے متعلق محتاط ہونا چاہیئے۔

"شراب، موسیقی، زناکاری، خودکشی اور عشق" میں نے دل ہی دل میں دوہرایا تھا

☆ ☆ ☆

بن یافع۔۔۔میں۔۔۔میری زندگی کا اکیسواں سال۔۔۔

ہم گزشتہ کچھ سالوں سے ایک ساتھ تھے۔بن یافع میری زندگی میں آنے والے بدترین دوستوں کا بہترین تحفہ تھے۔انہوں نے میری زندگی کو متوازن بنانے اور میری شخصیت میں نکھار پیدا کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔مجھے یہ دعویٰ نہیں تھا کہ میں انسانوں کو پرکھنے کے قابل ہو گیا ہوں لیکن یہ ضرور تھا کہ میں اب اچھے برے میں تمیز کر سکتا تھا۔مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی میں سب کچھ سب کے لئے نہیں ہوتا لیکن جو بھی ہوتا ہے وہ ہی بہترین ہوتا ہے۔

مجھے زندگی گزارنے کا یہ فلسفہ جس شخص نے سکھایا تھا اس کا نام بن یافع تھا۔میرے دل میں ان کے لئے بے حد احترام تھا۔بہت عزت تھی۔مسٹر ایمرسن کے بعد بن یافع وہ دوسرے شخص تھے جن سے کوئی رشتہ نا ہونے کے باوجود وہ مجھے رشتے دار محسوس ہوتے تھے۔میں پہلے کی نسبت ان سے زیادہ احترام سے،زیادہ محبت سے پیش آتا تھا۔وہ میرے ساتھ ہر جگہ کہنے کو میرے ذاتی ملازم کے طور پر موجود ہوتے تھے لیکن میرے لئے وہ ملازم سے زیادہ میرے دوست بلکہ میرے استاد تھے۔

وہ سیاہ فام تھے مگر ان کے وجود سے سنہری روشنیاں پھوٹتی تھیں۔وہ بولتے تھے تب بھی کوئی اچھی بات ہی سکھاتے تھے اور جب خاموش رہتے تھے تب بھی کچھ نا کچھ سیکھنے کو مل جاتا تھا۔

میں آکسفورڈ یونیورسٹی لاء کالج میں پڑھ رہا تھا۔میرے اردگرد بہترین دماغوں کا ہجوم تھا۔میرے کلاس میٹس ذہانت میں بے مثال تھے اور استاد باکمال تھے لیکن دل کو جو خوشی بن یافع سے سیکھ کر ہوتی تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔وہ میرے ساتھ لندن میں ہی رہتے تھے۔میں گروپ اسٹڈی کے لئے جب ہاسٹل میں شفٹ ہوتا تب بھی ان سے تقریباً ہر روز ملاقات کی کوشش ضرور کرتا تھا۔

مسٹر ایرک اور کوہوا ابھی بھی ایک ساتھ تھے۔مسٹر ایرک اب کافی بیمار اور لاچار رہنے لگے تھے جس سے کوہو مزید خود مختار ہو گئی تھی۔مسٹر ایرک کی سوشل لائف ختم ہو کر رہ گئی تھی جبکہ کوہو رات ہی نہیں دن بھی نائٹ کلبز میں گزارنے لگی تھی۔وہ پہلے سے زیادہ بری روش اختیار کر چکی تھی۔اسے اپنی صحت کی بھی پرواہ نہیں تھی۔جہاں مجھے ایک دفعہ میں ہی الکحل کے برے اثرات نے عقل سکھا دی تھی وہیں میری ماں کے لئے الکحل جدید زندگی کو گزارنے کا بہترین ہتھیار تھی۔کوہو میری زندگی میں اب مزید دردِ سر نہیں رہی تھی کیونکہ میں اب اس سے مکمل لاتعلق ہو چکا تھا۔میں نے یہ سیکھ لیا تھا کہ کہ وہ اپنی مکمل حیثیت میں ایک الگ وجود تھی۔مجھے یہ حق نہیں تھا کہ میں اس سے توقعات باندھتا اور ان کے پورے نہ ہونے پر اس سے بدگمان ہوتا۔مجھے سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ میری "ماں" تھی "یزدان" نہیں تھی۔اس نے مجھے جنم دیا تھا،پیدا نہیں کیا تھا،پیدا کرنے والی ذات کوئی "اور" تھی۔بن یافع کی معرفت سے،توسط سے میں سیکھ گیا تھا کہ پیدا کرنے والے ہم سے بے پرواہ ہو سکتا ہے مگر لاپرواہ نہیں ہو سکتا۔مجھے یقین ہو گیا تھا کہ خدا مجھ سے لاپرواہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کیوں جانا چاہتے ہیں بن یافع۔۔۔مجھے چھوڑ کر واپس۔۔۔"

میں نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔مجھے لگ رہا تھا میں ایک بار پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔بن یافع نے مجھے مزید سرد سرفراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔وہ یورپ چھوڑ کر واپس جا رہے تھے۔

میری بات سن کر بن یافع کی معتبری مسکراہٹ میرے اردگرد پھیل گئی۔

"میں چالیس سال کا ہو رہا ہوں سر!مزید کتنے سال زندہ رہوں گا میں۔۔۔میرے گھر والے چاہتے ہیں میں اب اُن کے ساتھ رہوں۔۔۔وہ چاہتے ہیں میں شادی کرلوں۔"

میں ان کی بات سن کر مزید جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا۔

"آپ کو مزید محنت کرنی چاہیے۔بن یافع۔۔۔میں متاثر نہیں ہوا۔۔۔یہ شادی والا بہانہ کچھ موزوں نہیں لگا مجھے۔۔۔"

بن یافع کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"مسکرائیے مت۔بن یافع۔۔۔شادی آپ یہاں بھی کر سکتے ہیں۔۔۔آپ کو اپنی ہی کمیونٹی کی کوئی بہت اچھی لڑکی یہاں بھی مل سکتی ہے۔"

میں نے چڑ کر کہا۔مجھے دل ہی دل میں اب غصہ آنے لگا تھا۔بن یافع پھر مسکرائے۔قدرت کی ایک عطا ء تو تھی ان پر۔۔۔اُن کی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہمیشہ سخت چٹانوں سے ابلتے میٹھے چشموں کا خیال آتا تھا۔

"شادی۔۔۔؟"انہوں نے استفہامیہ انداز میں دہرایا پھر اپنا رخ مکمل میری جانب موڑ لیا۔وہ ہمیشہ خود کو میرا ملازم سمجھتے تھے اور میں نے انہیں ہمیشہ اپنا استاد مانا تھا۔

"شادی اہم نہیں ہے سر۔۔۔موت بھی کہیں میرا انتظار کرتی ہوگی۔میرا ماننا ہے شادی اور موت اپنے ملک میں اپنی مٹی میں ہونی چاہیے۔۔۔مٹی کا بہت حق ہوتا ہے سر۔۔۔انسان وہ حق کبھی ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کوشش ترک کر دینی چاہیے۔"

میں نے بن یافع کا چہرہ دیکھا۔اُن کی کوئی بھی وضاحت مجھے مطمئن نہیں کر رہی تھی۔

"انسان جہاں شادی کرتا ہے اس کی اولاد وہیں پلتی ہے اور جس جگہ انسان پیدا ہوتا ہے،پلتا بڑھتا ہے وہاں سے اسے ہمیشہ ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔مٹی کی فطرت میں وفاداری ہے،کشش ہے۔یہ ہمیشہ اس انسان کو اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے جو اپنی ماں کی گود سے اتر کر اس کے سینے پر قدم قدم چلنا سیکھتا ہے۔مجھے اس جگہ سے ہمیشہ صدا آتی ہے سر میں جہاں پلا بڑھا تھا،جہاں پیدا ہوا تھا۔۔۔میں چاہتا ہوں میرے بچے وہیں پیدا ہوں۔۔۔وہاں کی فضاؤں میں اپنا پہلا سانس لیں۔۔۔"

انہوں نے توقف کیا تھا۔مجھے اسی ایک لمحے کا انتظار تھا کہ وہ خاموش ہوں تو میں اپنی بات شروع کروں۔

"بن یافع میرے ساتھ یہ مت کریں۔۔۔میری الجھن کو مت بڑھائیں۔۔۔آپ جائیں،اپنے گھر والوں کی مرضی سے شادی کریں اور دوبارہ یہاں واپس آجائیں۔"میں نے مشورہ دینا ایک بار پھر ضروری سمجھا۔

"میں نے آپ سے کہا نا شادی ہی اہم نہیں ہے۔۔۔میں اپنا باقی وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنی مٹی میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

"باقی وقت۔۔۔؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں آپ۔۔۔بہت سال جینے والے ہیں آپ۔"

"بہت سے سال یا چند سال۔۔۔ایک بات طے ہے سر۔۔۔یہاں سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔۔۔میں اب واقعی واپس چلے جانا چاہتا ہوں۔۔۔میں نے کچھ رقم جمع کر لی ہے۔ میں واپس جا کر اپنے لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ ہے۔ بن یافع۔۔۔" میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ پہلے ایک بات کا تعین کر لیجیے۔۔۔آخر آپ واپس جانا کیوں چاہتے ہیں؟ شادی، موت یا سوشل ورک۔۔۔؟ ایک کے بعد ایک بہانہ کیوں تراش رہے ہیں آپ۔۔۔" ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں سر۔۔۔میری مٹی مجھے بلا رہی ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اس کی مٹی اسے بلانے لگتی ہے۔ مادی چیزوں میں اگر کوئی آپ سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تو وہ مٹی ہی ہے۔ مٹی کے دل میں آپ کی طلب بڑھتی ہے تو آپ کے دل میں بے چینی بڑھنے لگتی ہے۔۔۔میری مجبوری کو سمجھیں سر۔۔۔میں بہت بے چین ہوں۔" وہ درخواست کرنے لگے تھے۔ میری تھکن میں اضافہ ہوا۔ میں نے گہری سانس بھری اور گویا ہتھیار ڈال دیئے شاید مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری کوئی درخواست کوئی التجا بن یافع کو اپنے وطن واپس جانے سے نہیں روک سکتی۔ بہت ضبط کے باوجود میری آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

"مجھے کسی کا نہیں پتا بن یافع۔۔۔لیکن اگر اس دنیا میں کوئی آپ سے بہت محبت کرتا ہے تو وہ میں ہوں۔۔۔میرے دل میں آپ کا جو مقام ہے نا وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میری کوئی بھی دلیل بے اثر ہے۔۔۔میں آپ کو نہیں روکوں گا۔۔۔مجھے دکھ ہے کہ آپ کو اپنی مٹی سے زیادہ محبت ہے اور میرے لئے شاید آپ کے دل میں کچھ بھی نہیں۔"

میں اپنے آپ کو ایک بار پھر چھوٹا جذباتی بچہ محسوس کر رہا تھا۔

"میں کم عقل ناچیز ایک ان پڑھ انسان ہوں۔۔۔میرے پاس دلیل کہاں سر! میں تو ہمیشہ سے دل کی سنتا آیا ہوں۔۔۔میں نے آپ سے کہا نا میرا دل بے چین ہے۔۔۔مجھے خدشہ ہے یا ایسے کہہ لیجیے کہ مجھے وہم لاحق ہو گیا کہ میرے لئے وقت کے پاس اب گنجائش کم رہ گئی ہے۔ میری خواہش ہے سر کہ مجھے میری مٹی میں دفنایا جائے۔ مٹی انسانی بدن کا عنصر ہے سر! ہم مٹی سے بنے ہیں۔۔۔مٹی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کا بڑا حق ہوتا ہے۔۔۔میں بحیثیت انسان اپنی مٹی کے لئے کچھ نہیں کر سکا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے لئے کوشش ترک کر دوں۔" انہوں نے اپنے ہی لفظ دہرائے تھے

"مٹی کا حق؟" میں نے دہرایا۔ بن یافع بہت کم لمبی گفتگو کرتے تھے لیکن جب بھی کرتے تھے ان کی گفتگو کہیں محفوظ کر لینے کو چاہتا تھا۔ بن یافع نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں اہمیت صرف روح کی ہوتی ہے جسم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی حالانکہ جسم کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی کہ روح

کی ہے۔ یہ اہمیت تب اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم مر جاتے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جسم کی اہمیت شروع ہی تب ہوتی ہے جب ہماری روح قبض کر لی جاتی ہے۔ روح ہمارے اعمال ہمارا سب کچا چٹھا لے کر عالم برزخ کی طرف چلی جاتی ہے۔ جسد خاکی یہاں ہی رہ جاتا ہے اور دنیا کے کام آتا ہے۔ ہم مسلمانوں میں جسد خاکی کو صاف ستھرا کر کے مٹی کے سینے میں دبایا جاتا ہے۔

دنیا سمجھتی ہے میت مٹی میں چلی گئی۔۔۔کام ختم۔۔۔نہیں۔۔۔۔انسانی بدن مرنے کے بعد مٹی میں مل جانے کے بعد دنیا میں بسنے والے انسانوں کے زیادہ کام آتا ہے۔۔۔سائنس ثابت کرتی ہے کہ کمپوزیشن بھی کوئی چیز ہے۔ایک ایسا عمل جس میں توانائی خارج ہوتی ہے اور مٹی کی خاصیت، قابلیت اور قدرت کو بڑھا دیتی ہے۔ سادہ سی بات ہے سر! مٹی یعنی انسانی جسم ڈی کمپوزیشن کے عمل میں تحلیل ہوا اور مٹی میں جذب ہو گیا۔ اچھی مٹی، اچھی توانائی۔۔۔گندی مٹی، گندی توانائی۔۔۔روح صرف اعمال نامہ لے جاتی ہے۔۔۔عمل اور عمل کرنے والا بدن یہاں ہی رہ جاتا ہے۔اللہ سبحان تعالیٰ فرماتے ہیں، زور دیتے ہیں کہ نیک عمل کرو، نیک عمل کی تلقین کرو۔۔۔میرے رب کی کبھی ہر بات میں حکمت ہے سر! اس نے کچھ بھی بیکار نہیں بنایا حتیٰ کہ مردہ جسم بھی جو دنیا والوں کے لئے ذرا بھی اہمیت کا حامل نہیں لگ رہا ہوتا۔مٹی کا سینہ اتنا فراخ بنایا ہے۔ بنانے والے نے کہ وہ بیکار مردہ بدن کو بھی اپنے آنچل میں چھپا لیتی ہے اور ڈی کمپوزیشن کے بعد اس بیکار مواد کو کھاد کے طور پر استعمال کر لیتی ہے۔مٹی پردہ رکھنا جانتی ہے سر اسی لئے تو اسے" ماں" کے برابر درجہ دیتا ہے انسان"

بن یافع خاموش ہوئے تھے۔ اُن کی بات نے ایک بار پھر میرے دماغ کو گھما ڈالا تھا۔

" آپ کی اس تھیوری کا آپ کی واپسی سے کیا تعلق ہے۔بن یافع!" میں مزید اکتا گیا تھا۔

" میں اپنی تعریف نہیں کر رہا سر لیکن میں نے آج تک دانستہ کسی کا دل نہیں دکھایا، میں نے ہمیشہ وہی کام کرنے کی کوشش کی جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔میں نے اپنے کانوں کو برا سننے سے، آنکھوں کو برا دیکھنے سے اور اپنے ہاتھوں کو برا کرنے سے ہمیشہ روکے رکھا ہے۔میں نے خود کو ہمیشہ برائی کی مخالف سمت میں چلایا ہے۔میں کتنا گنہگار ہوں یا کتنا نیکوکار ہوں یہ تو میرا اللہ جانتا ہے۔جس کے ہاتھ میں جزا و سزا ہے، اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔میں صرف وہ کر سکتا ہوں جس کی میرے مالک نے مجھے قابلیت، اہلیت اور حکمت دی ہے۔میں نے اپنے جسم کو ہر برائی سے بچا کر اس کی توانائی کو مثبت انداز میں محفوظ کیا ہے۔میں چاہتا ہوں میری یہ توانائی میرے وطن کے کام آئے۔میں اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں سر"

وہ ایک بار پھر چپ ہوئے اور میرا چہرہ دیکھا۔

" کیا میں نے زیادہ بڑی خواہش کر لی ہے سر!" بن یافع نے ایک اور وقفہ کیا تھا۔

" مجھے اپنے وطن سے محبت ہے سر! یہ میرا گناہ نہیں، میری فطرت ہے۔مٹی سے بنا انسان مٹی سے محبت نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ فطرت سے غداری تو جانور بھی نہیں کرتے اور جو انسان ایسا کرتے ہیں میری نظر میں وہ جانور سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔" میں نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ کیا یہ ضروری تھا کہ فطرت اور وفاداری کا سبق مجھے پھر پڑھایا جاتا۔ میں چپ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کے ہاتھ بہت باکمال ہیں۔ان میں کوئی ایسا جادو ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔آپ ان سے کوئی اچھا کام کیجیے گا۔قدرت آپ کی بہت مدد کرے گی مگر ایک بات یاد رکھیئے گا ہاتھوں کا عقیدہ بہت مضبوط ہونا چاہیئے۔ایمان دل سے پہلے ہاتھ سے شروع ہوتا ہے کیونکہ ماں کے پیٹ میں دل کہیں بہت بعد میں بنتا ہے۔۔۔شہادت کی یہ انگلی سب سے پہلے وجود میں آجاتی ہے۔اسی انگلی کو اٹھا کر ہم اللہ کی وحدت کا اقرار کرتے ہیں اور وحدانیت پر ہمیشہ یقین رکھیں۔میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ اپنا عقیدہ بدل کر مسلمان ہو جائیں۔اللہ سبحان تعالیٰ موجود ہے، تھا اور رہے گا۔۔۔بے شک۔۔۔آپ اقرار کریں یا نہ کریں مگر اپنے دل میں اپنا عقیدہ ضرور مضبوط رکھیں۔آپ کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوں اس پر دل سے ایمان لائیں کیونکہ اس سے ایک نہ ایک دن آپ اللہ کو پہچان جائیں گے"

بن یافع سومالیہ چلے گئے تھے۔جانے سے پہلے یہ انکی آخری نصیحت تھی۔اسی سال میں نے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر بالآخر اپنے سب درازوں کو کھنگال کر وہ ڈائریاں نکالیں جنہیں میں گڑھا کہتا تھا اور جس میں میری زندگی دفن تھی۔مجھے لفظوں کو اپنا ہنر بنانے کا ہنر آگیا تھا۔میں نے کوئی "کریٹو رائیٹنگ" کی کلاس نہیں لی تھی۔مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہو گیا تھا۔مجھے پتا تھا کہ میں لکھ سکتا تھا۔میں اخبارات میں مراسلے بھیجتا رہتا تھا۔میرے اساتذہ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اخبارات کے ایڈیٹرز کی جانب سے بھی اچھی آراء ملتی تھی۔میں نے اس ساری توانائی کو مجتمع کرتے ہوئے بالآخر اپنی زندگی کی کہانی لکھ ڈالی تھی۔

"مٹی اور موت" یہ میرے پہلے ناول کا نام تھا۔یہ میری سوانح حیات تھی جسے میں نے ناول کی شکل دی تھی۔اس ناول کا مرکزی کردار میں تھا یہ کردار جب بوڑھا ہوا تو وہ بن یافع کے روپ میں ڈھل گیا تھا کیونکہ میں انہی کے فلسفہ حیات کو اپنانا چاہتا تھا۔میں چاہتا تھا کہ بن یافع جو بڑے تھے بھی نہیں تھے میں بالکل ویسا بن جاؤں اس لئے میں نے اپنے ناول میں اپنی خواہشات اور تشنہ آرزوؤں کا کھل کر اظہار کیا تھا۔میں نے جب وہ ناول مکمل کیا اور اسے دوبارہ پڑھا تو مجھے حقیقی خوشی حاصل ہوئی۔میری انگلیوں میں جو جادو تھا وہ مجھے سمجھ میں آگیا تھا۔مجھے الفاظ کو مہارت سے استعمال کرنے کا انداز آگیا تھا۔

اس ناول کو پبلشر کے پاس بھیجنے سے بھی پہلے میں خوابوں میں تعریفوں کے بے پناہ خطوط وصول کر چکا تھا۔

مگر تین مہینے بعد میرا ناول "مٹی اور موت" پبلشر کی جانب سے معذرت کے ساتھ مسترد کر دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔۔۔بلاشبہ۔۔۔آپ یہ بات جانتے ہیں لیکن مجھے اس فلسفے پر اعتراض ہے جو آپ نے اس ناول میں بیان کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار ہے یا کوئی مذہبی پیروکار۔۔۔ہر صفحے پر ایک نصیحت۔۔۔کوئی رنگ نہیں۔۔۔کوئی گرل فرینڈ نہیں۔۔۔کوئی تھرل نہیں۔۔۔یہ پڑھے گا کون۔۔۔؟"

مسٹر میکنزی نے اپنے فربہی مائل وجود کو میز کے پیچھے سے سنبھالتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا۔میرا دل ان کے انکار کے باعث ٹوٹا ہوا تھا مگر ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔مسٹر میکنزی وہ تیسرے پبلشر تھے جو مجھے انکار کر رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔۔۔ یہ سب باتیں آپ مجھے فون پر بتا چکے ہیں۔" میں نے اپنی اکتاہٹ چھپا کر کہا تھا۔

مسٹر میکنزی نے سر ہلایا۔ کرسی کو آگے دھکیلا اور خواہ مخواہ دوبارہ سے میز پر پڑے کاغذات کو ادھر اُدھر کرنے لگے۔

"میں اسے چھاپ سکتا ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔؟" یہ بھی احسان کرنے کا ایک حربہ تھا کہ بات کرتے کرتے رُک گئے۔

"مگر۔۔۔؟" میں نے دہرایا۔

"اسے تھوڑا تبدیل کرو۔۔۔ کوئی محبت ڈالو۔۔۔ گرل فرینڈ ڈالو۔۔۔ ٹوٹے دل کی داستان ڈالو۔"

"گرل فرینڈ کا ذکر ہے مسٹر میکنزی۔۔۔ آپ نے شاید غور سے نہیں پڑھا۔۔۔ وہ براؤن لڑکی جو ہیرو کو انڈیا میں ملی تھی اور بعد میں یہاں" یوکے" میں بھی وہ ساتھ تھی مگر جس نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔"

میں نے بے چین ہو کر وضاحت کی۔

"اسی محبت کے ذکر کو پھیلاؤ میری جان۔۔۔ آخری صفحے تک لے کر جاؤ کہ لڑکے کو کامیاب دیکھ کر لڑکی واپس آگئی، شرمندہ ہوئی، معافی مانگی۔۔۔ ایسے رو رو کر معافی مانگی کہ عوام پاگل ہو گئی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ" وہ اب پیپر ویٹ کو میز پر گھمانے لگے تھے۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔؟" میں نے اکتا کر کہا پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ ناول میرے حالات زندگی پر مبنی ہے۔

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔۔۔ تم سوچو۔۔۔ تم لکھ سکتے ہو۔۔۔ بلکہ اچھا لکھا ہے تم نے مگر اپنی سوچ کا زاویہ تبدیل کرو تو یہ جو میرے سامنے فقط ایک کاغذات کا پلندہ نما مسودہ ہے۔۔۔ یہ ایک" ایپک" ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرائے۔

"میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔۔۔" انہوں نے سامنے پڑا مسودہ کھولا تھا پھر نجانے کونسا صفحہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ دیکھو۔۔۔ یہاں۔۔۔" وہ کچھ نقاط بتانے لگے تھے۔ میں نا چاہتے ہوئے بھی ہمہ تن گوش تھا۔

☆ ☆ ☆

مسٹر میکنزی نے میرے ناول میں بہت سارے الفاظ واضح کیے۔ وہ چاہتے تھے میں اسے تھوڑا سا تبدیل کر کے اپنا زاویہ نظر پیش کروں۔ وہ میری زندگی کی کہانی کو ایک نئے رُخ سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ باتیں بہت اچھے طریقے سے مجھے سمجھائیں۔

"یہ ناول تمہارا ہے، تمہارا تھا تمہارا ہی رہے گا، مگر جب تک یہ تمہارے شیلف پر موجود رہے گا، جب تم ارادہ کرو گے کہ تم اسے پبلک کے لئے شائع کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے اس پر اپنے احساسِ ملکیت کو ختم کرنا پڑے گا۔ تمہیں اس رخ پر سوچنا ہی پڑے گا جو پڑھنے والے کی آنکھ دیکھنا چاہتی ہے تب تمہیں غیر جانبدار ہونا ہی پڑے گا۔ ایک ناولسٹ کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنا زاویہ نظر بالکل غیر جانبدار ہو کر پڑھنے والوں کے سامنے رکھے۔"

ان کی اس بات میں مجھے بہت دم محسوس ہوا۔ میں لکھتے ہوئے اپنی پسند اور ناپسندیدگی کو جس طرح مرضی ظاہر کرتا، پڑھنے والے اُسے اپنی مرضی کے معنی پہنانے کے معاملے میں آزاد تھے۔ غیر جانبدار ہونا یقیناً ایک لکھنے والے کے لئے ایک اچھی خصوصیت ہو سکتا تھا۔ میں ابھی اسی نہج پر

سوچ رہا تھا کہ مسز میکنزی نے ایک الگ موقف پیش کیا۔

"یہ تو ہو گی وہ خوبی جو کسی بھی تحریر کو کامیاب بنا سکتی ہے مگر لکھنے والوں کو کامیاب کرتی ہے ایک اور خوبی۔۔۔وہ ہے اس کی قلم کی مضبوط دلیل۔۔۔اس کا پُراثر انداز۔۔۔وہ جو بات لکھے اس انداز میں لکھے کہ پڑھنے والا اسے ہی درست، حقیقت اور حتمی سمجھے۔۔۔پڑھنے والوں کو پتا بھی نہیں چلے کہ لکھنے والے نے کیسے اس کے دماغ کو گھما کر اس میں اپنا موقف انڈیل دیا ہے۔ یہ خوبی آفاقی ہوتی ہے اور اس کا استعمال صرف عقلمند لکھاری ہی کر سکتا ہے۔ ایک عقلمند لکھاری ہی جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر اس طرح پیش کر سکتا ہے کہ پڑھنے والے اسکی رائے سے سو فیصد متفق ہو جائے۔ اس لئے اس ناول میں سے منفی کرداروں کو ختم کر دو۔"

وہ بہت مطمئن انداز میں اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو بڑا مشکور محسوس کیا۔

"مجھے اچھا لگا۔۔۔میں آپ کا شکر گزار ہوں۔۔۔میں آئندہ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھوں گا۔"

میں نے ممنون ہوتے ہوئے کہا۔

"آئندہ کیوں۔۔۔ابھی کیوں نہیں؟" انہوں نے بھنویں اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ جو تبدیلیاں چاہتے ہیں میں وہ کروں گا۔۔۔وہ کردار جو کسی قدر منفی رنگ لئے ہوئے ہیں، میں اس منفی رنگ کو کم کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔مگر میں اسے بالکل ختم نہیں کر سکتا۔۔۔دنیا میں گنہگار ابھی ختم نہیں ہوئے۔۔۔وہ ہر دور میں موجود ہوتے ہیں کیونکہ گناہ ہر دور میں شکل بدل بدل کر سامنے آجاتا ہے۔"

میں نا چاہتے ہوئے بھی ان کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں تمہاری بات رد نہیں کروں گا۔۔۔مجھے بھی اچھا لگا کہ تم میری بات مان کر اپنی تحریر میں تبدیلیاں کرنے پر راضی ہو۔۔۔یہ آسان نہیں ہوتا کہ اپنے لکھے ہوئے الفاظ کو کسی کے کہنے پر ایک اور ہی زاویہ نظر کی طرف لے جانا۔۔۔میں لکھتا نہیں ہوں مگر روز میرا واسطہ بہت سے لکھنے والوں سے پڑتا ہے۔۔۔میں اچھے لکھنے والے کی دل سے مدد کرتا ہوں اور اچھی تحریر کا میں دل سے قائل ہوں۔ اچھی تحریر ذہنوں پر اچھا اثر چھوڑتی ہے۔۔۔یہ بڑا مقدس کام ہے۔۔۔اس کی اہلیت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔۔۔تم میں ہے۔"

وہ تمہید باندھ کر تعریف کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے مگر مجھے ان کی تعریف اچھی لگی۔ تعریف کسے بری لگتی ہے۔

"آں۔۔۔یہ جو ایک کردار ہے۔" انہوں نے عینک کو ناک پر سیٹ کرتے ہوئے کاغذ پر انگلی رکھی جہاں تمام کرداروں کی لسٹ انہوں نے چن کر خود ہی مرتب کی ہوئی تھی۔

"بن یافع۔۔۔" انہوں نے اس نام پر انگلی رکھی۔ یہ وہ واحد نام تھا جو میں نے ناول میں تبدیل کئے بغیر لکھا تھا۔

"بن یافع کے کردار کو ختم کر دو۔" وہ یکدم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے دھچکا لگا۔ "بن یافع" اس ناول کا بہترین کردار تھا۔ میں نے بن یافع کی تمام تر خصوصیات کو تحریر کے قالب میں ڈھالتے ہوئے اپنے ہنر کا زبردست استعمال کیا تھا۔

"یہ سارے ناول کی جان ہے مسٹر میکنزی۔۔۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

"ایک سیاہ فام۔۔۔ جو کہ مسلم بھی ہے۔۔۔ اسے ہیرو بنا کر پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

میں نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔

"وہ ہیرو نہیں ہے۔۔۔" میں ابھی یہی کہہ سکا تھا کہ انہوں نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں مجھے دیکھا۔

"ہیرو اس کے گرد پورے ناول میں بھنورے کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ وہ مرکزی کردار سے زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ ہیرو اسے پوری تحریر میں آئیڈیلائز کر رہا ہے۔۔۔ کیوں؟"

وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"کیوں نہیں؟" میں نے اکتا کر پوچھا۔

"ابھی تمہیں اس بات کی افادیت کا اندازہ نہیں ہے کہ فین فولوئنگ نہ بڑھنے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔۔۔ فین فولوئنگ تب بڑھے گی جب تمہارے لکھے ہوئے میں لوگوں کا اپنا رنگ ہوگا۔ اپنا عکس نظر آئیگا۔ پہلا ناول کم از کم ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو براہ راست ہٹ کرے۔ یہ ناول اگر تم اپنے لوگوں کے لئے لکھ رہے ہو تو وہ تمہارے جیسے ہی ہوں گے۔۔۔ وہ سیاہ فام ہوں گے نہ ہی مسلم۔۔۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو میں "راسزم" کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا پھر جیسے اکتا کر میں نے اس کے سامنے پڑے مسودے کو دیکھا۔

"مجھے ایسے مت دیکھو۔۔۔ میں تمہیں کامیابی کے گُر سکھا رہا ہوں۔۔۔ اسے ہماری زبان میں تکنیک کہتے ہیں۔۔۔ تم نے لکھ لیا، لوگوں نے پڑھ لیا۔۔۔ کام ختم۔۔۔ یہ تکنیک نہیں ہے۔۔۔ تکنیک یہ ہے کہ تم ایسے لکھو کہ لوگ اسے اپنی کہانی سمجھ کر پڑھیں اور صدیوں نا بھول سکیں پھر تم نا صرف شہرت بلکہ دولت بھی کما سکو گے۔۔۔ میں تمہیں پروفیشنلزم ہی نہیں مارکیٹنگ بھی سکھاؤں گا۔"

وہ اب بغور میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی انگلی کے نیچے دبے لفظ کو دیکھا تھا۔

"بن یا فنیح" میرا دل سسک رہا تھا مگر مسٹر میکنزی کی بات ماننے میں میرا ہی فائدہ تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے چند مہینے میں ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے ناول پہ کام کرتا رہا جو مسٹر میکنزی نے مجھے سمجھائے تھے۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ بہت ساری چیزیں ایسی تھیں جو میری منشاء اور حقیقت کے برخلاف تھیں اور جن پر میرا دل راضی نہیں تھا مگر پھر بھی میں ان کو اپنے ناول میں شامل کرتا چلا جا رہا تھا۔ اب یہ ناول میری زندگی کی کہانی نہیں تھا۔ یہ بہت تبدیل ہو چکا تھا مگر میں بھی کیا کرتا۔۔۔ بار بار میرے ناول کا مسترد کیا جانا میرے اعصاب پر بہت بھاری پڑ رہا تھا۔ مجھے ناکامی کا احساس تھکا نہیں رہا تھا بلکہ توڑ رہا تھا۔ میں نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی اور میں ادیب کے طور پر بھی اپنی پہچان بنانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ مجھے دولت کی ہوس نہیں تھی لیکن میں مشہور ہونا چاہتا تھا۔ میں اپنا آپ منوانا چاہتا تھا۔ میں دنیا کو

اپنی اہمیت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا احساسِ کمتری لاوا بن کر پکنے لگا تھا۔ میں اٹھتے بیٹھتے بس ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے ادیب بن کر دکھانا تھا۔ میرا جنون مجھ پر حاوی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی۔ میں ایک شام او بن ایئر کیفے ٹیریا میں بیٹھا کافی کے سپ لے رہا تھا جب مجھے احساس ہوا کہ جیسے میں کسی کی نگاہوں کی زد میں ہوں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی شناسا جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا۔ میں دوبارہ کافی کے کپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب کسی نے انگلیوں سے میز کی سطح کو بجایا۔

"ہیلو... کیا میں آپ کے ساتھ کافی شیئر کر سکتا ہوں؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا اچھا، جوان توانا شخص تھا۔ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے نگاہ دوڑائی۔ بہت سے میز خالی تھے مگر پھر بھی وہ شخص جانے کیوں میرے ساتھ بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کندھے اچکا دیئے۔

"اوہ شکریہ... آپ سے مل کر اچھا لگا... میں ٹیڈ نیل ہوں۔"

میں نے گردن ہلائی۔ اس کے ہاتھ میں بھی اسٹار بکس کیچینو کافی کا بڑا ڈسپوزیبل مگ تھا۔ اس نے میرے کپ سے اپنے کپ کو ذرا سا ٹکرایا۔ اب کی بار گردن ہلانے کے ساتھ مجھے مسکرانا بھی پڑا۔

"آج موسم کافی خوشگوار ہے... مزاج پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔" وہ کافی بے تکلف طبیعت کا مالک لگتا تھا۔ میں نے گردن ہلا دی۔ مجھے جلدی جلدی لوگوں سے بے تکلف ہو جانے کی عادت نہیں تھی۔

"میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو آپ لکھاری ہیں... ہیں نا؟" اس شخص کے نئے سوال نے مجھے چونکا دیا اور یہ سوال اس قدر بے ساختہ تھا کہ میں اپنی حیرانی کو چھپا نہیں پایا۔

"میں نے آپ کو مسٹر میکنزی کے آفس میں دو ایک بار دیکھا ہے... آپ حیران مت ہوں۔"

وہ خود ہی مسکرایا۔

"آپ بھی لکھتے ہیں؟" بالآخر مجھے بھی پوچھنے کے لئے ایک سوال مل گیا تھا۔

"ارے نہیں..." اس نے کافی کے کپ والا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے انکار کیا۔

"میرا بس ایک شوق ہے... اچھی کتاب پڑھنا اور پھر اسے دوستوں کو تحفتاً دینا... مسٹر میکنزی میرے ذاتی دوستوں میں سے ایک ہیں... اُن سے اکثر ملاقات رہتی ہے۔"

سن کر اچھا لگا... کتاب پڑھنا بہت سے لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے... اچھی کتاب پڑھنے والے کم کم ہی ملتے ہیں۔"

میں نے رسمی سے انداز میں کہا۔ وہ مسکرایا۔

"میں نے سنا ہے آپ کو بہت سی زبانیں آتی ہیں؟" اس نے پھر ایک چونکا دینے والا سوال کیا۔

"نہیں جناب یہ تو کسی نے بے پر کی اڑا دالی۔۔۔ تھوڑی بہت شدھ بدھ کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بہت سی زبانیں آتی ہیں۔

میں نے اپنی الجھن چھپا کر جواب دیا۔

"آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں شاید۔۔۔میں جانتا ہوں آپ ہندی، عربی اور فرانسیسی بول سکتے ہیں۔"

اس نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ میں دل ہی دل میں اس کی معلومات پر کافی حیران ہو رہا تھا۔ یہ سچ تھا مجھے یہ تینوں زبانیں آتی تھیں لیکن یہ بھی سچ تھا کہ فرانسیسی کے علاوہ مجھے باقی دونوں زبانوں پر عبور حاصل نہیں تھا۔

"میں نے وہ مسودہ پڑھا ہے جس پر آپ آج کل از سرِ نو محنت کر رہے ہیں۔"

وہ میز کی سطح پر جھکا تھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"ناول لکھ لینا اتنا بڑا کام نہیں۔۔۔ بڑا کام اسے پبلک میں پروجیکشن دلوانا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں پہیلیاں بوجھنے میں بہت نکما ہوں۔۔۔ بچپن سے۔۔۔" میں نے اکتا کر کہا۔ وہ شخص جو چاہتا تھا اسے بتانے کے لئے اتنے معمے سلجھانا اتنا ضروری نہیں تھا۔

"میں آپ کو پروجیکشن دلوا سکتا ہوں۔۔۔ تمام مشہور بڑے اخبارات میں آپ کے ناول کے متعلق مقالے چھپوا سکتا ہوں۔۔۔ بڑے بڑے نقادوں کی آراء سے آپ کے ناول کے پچھلے صفحات کو بھر سکتا ہوں۔ ٹی وی پروگرامز میں آپکی تعریف میں خبر چلوا سکتا ہوں۔ آپ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جائیں گے۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے ناسمجھی کے عالم میں پوچھا۔ وہ میز کی سطح پر جھک آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"لوگ دیکھ رہے ہیں اپنا منہ بند کر لیں۔"

☆ ☆ ☆

"میں اپنی زندگی سے اکتا چکی ہوں" اس نے سامنے کسی نادیدہ چیز کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ٹیپو نے بھٹے کے دانوں کو منہ میں گھماتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ وہ کیسی پھیکی پھیکی سی لگتی تھی۔ اس پر ماحول کا بھی کوئی مثبت اثر نہیں پڑا تھا۔ 2012 کی مارچ کے نوخیز دن بھی اسے خوش نہیں کر پا رہے تھے حالانکہ ہر چیز کتنی مکمل تھی۔

سورج کی نرم کرنیں نئی دلہنوں کی طرح رو پہلی چنریاں اوڑھے شرمائی شرمائی پھرتی تھیں۔ انکی جولانی عروج پر نہیں تھی لیکن زوال کا سماں بھی نہیں تھا۔ موسم سردیوں سے گرمیوں کی جانب جاتے ہوئے بہار کے اڑن کھٹولے پر سوار خوشگوار ہواؤں کے لبادے میں مست ہوا پھرتا تھا۔ بہار کا سنہرا سنہرا رنگ آنکھوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ گھاس کا سبز رنگ درختوں کے سبز پتے اور اسکا اپنا سبز کرتا بہار کے اس سنہرے عکس سے جھلملائے

جاتے تھے۔ رنگ برنگے پھول اپنا سارا مال و متاع فضاؤں کو خوشبودار بنانے میں قربان کئے دے رہے تھے۔ جو اس جیسے کہیں گم ہوئے جاتے تھے۔
دل کو پتا نہیں کس چیز سے بنایا گیا ہے یہ اچھے رنگوں سے اچھی خوشبو سے اچھے لفظوں سے اچھی آوازوں سے مچلنے لگتا ہے لیکن یہی دل جس "چیز" کے لئے بنایا گیا ہے اگر اسکی جانب سے بادِ نسیم جیسی ٹھنڈی ہوا نا آتی ہو تو پھر یہی دل اچھے رنگوں سے اچھی خوشبو سے نا اچھے لفظوں سے اور نا ہی اچھی آواز سے بہلایا جا سکتا ہے۔ اسکا دل بھی ضدی ناراض بچے کی طرح بائیں پہلو میں بائیں کروٹ پر منہ بسورے اکتایا ہوا پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کی اتنی بے رنگی تھی کہ ساتھ بیٹھے ٹپو سے بھنے کھانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں سے زیادہ اسکا چہرہ پھیکا لگتا تھا۔ ٹپو انگلیوں کی پوروں سے دھیرے دھیرے دانے الگ کرتا تھا پھر جب مٹھی میں دس بارہ جمع ہو جاتے تو انہیں پھانک لیتا۔ اس نے اسکی ہر بات کو تحمل سے سن لیا تھا۔

"مجھے زندگی میں کبھی ڈاکٹر نہیں بننا تھا۔ مجھے یہ پروفیشن پسند ہی نہیں ہے۔ میں فطرتاً مسیحائی کے قابل نہیں ہوں۔"

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی اور پھر درمیان یہاں پر ہوا۔

"ممی مجھے آج تک سمجھ نہیں سکیں۔ ان کے لئے میں ہمیشہ احمق ہی رہوں گی۔ وہ مجھ سے خفا ہی رہتی ہیں" اور اختتام اس جملے پر ہوا تھا۔

"شہروز کو میری پرواہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کے لئے میرے علاوہ سب اہم ہیں" ساری باتیں سن لینے کے بعد ٹپو نے حتی الامکان اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہر شخص مسیحا بن بھی نہیں سکتا لیکن اسکا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ یہ کوشش ترک کر دے۔ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ مسیحائی نبیوں کا شیوہ ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ جو نبیوں کا شیوہ رہا ہے وہ تمہارا پیشہ ہے" وہ منہ میں موجود دانے نگل کر درمیانے قصے پر آیا تھا۔

"مائیں کبھی اولاد سے خفا نہیں ہوتیں۔۔۔ انکی کتابوں میں خفگی نام کے چیپٹر کی جگہ خالی ہوتی ہے ڈاکٹر" آخری بات کے لئے اسے مطمئن کرنا ٹپو کا کو مشکل لگا تھا۔

"تمہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے کہ تم شہروز کے لئے اہم ہو یا نہیں۔ تمہیں بس اس بات کی پرواہ ہونی چاہیئے کہ شہروز کے علاوہ باقی سب تمہارے لئے غیر اہم ہیں"

"میں اپنی زندگی سے اکتا چکی ہوں۔" زارا نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا تھا۔

"وحشت تیرے کی۔ یعنی ابھی بھی دیں بھائی پھیرو کے بے رنگ و روغن ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہو۔۔۔ زندگی بھی کہاں خوش ہو گی تم سے" اس نے ہاتھ میں بھرے بھٹے کے دانے اس کے ہاتھ میں دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے جل کر کہا تھا۔ زارا نے بھی ہاتھ پھیلا کر وہ دانے لے لئے۔ ٹپو پھر سے بھٹے کے دانے ادھیڑنے لگا تھا۔

زارا کا دل چاہا اپنا بیگ اٹھائے اور وہاں سے چلی جائے۔ وہ نوے منٹ کی ڈرائیو کر کے لاہور سے رائیونڈ ایسی باتیں سننے نہیں آئی تھی۔ ایسی باتیں سنانے والے تو لاہور میں بھی بہت تھے۔ ٹپو کے ساتھ اسکی علیک سلیک کافی پرانی تھی۔ سال ڈیڑھ سال قبل انکی پہلی ملاقات سروسز ہاسپٹل میں ہوئی تھی۔ ٹپو چند مریضوں کو ایمرجنسی وارڈ لایا تھا اور ڈاکٹرز تب پہلی دفعہ ہڑتال پہ بیٹھے تھے۔ ایمرجنسی وارڈز کھلے تھے لیکن جونیئر ڈاکٹرز زیادہ تعاون کرنے پر تیار نہیں تھے۔

"جب مریض تم لوگوں کے پاس آتا ہے نا تو وہ علاج کروانے نہیں آتا وہ شفاء پانے کے لئے آتا ہے جو تم لوگ نہیں دے سکتے۔تم لوگ خود بھی جانتے ہو کہ ڈاکٹرز صرف علاج کر سکتا ہے، شفاء اللہ کی ذات دیتی ہے۔۔۔۔ ذرا سوچو اگر اللہ کہہ دے کہ مجھ سے مت مانگو میں بھی ہسپتال پر ہوں۔۔۔ڈر نہیں لگتا تم لوگوں کو ایسے وقت سے۔۔۔اونہہ، مسیحا کہتے ہو خود کو۔"

ٹپو نے وارڈ میں موجود دو تین ڈاکٹرز کو اچھی خاصی سنا ڈالی تھیں وہ سب ڈاکٹرز لڑکیاں تھیں سو فوراً ان کے دل پسیج گئے تھے۔ان ڈاکٹرز میں ایک زارا بھی تھی۔دوسری ملاقات مرید کے کے ایک فری کیمپ میں ہوئی تھی جہاں ٹپو والنٹیر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔وہ زارا کو سادہ سا ہنس مکھ انسان لگا۔یہیں ان دونوں کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہوا تھا اور علیک سلیک بڑھی تھی۔ٹپو اکثر مریضوں کو ہاسپٹل لاتا رہتا تھا۔اسے ریفرنس کے لئے بھی اکثر زارا کو کال کرنا پڑتی تھی۔وہ کبھی کبھی بلاوجہ بھی ایک دوسرے کو فون کر لیتے تھے۔زارا کو بھی وہ مخلص سادہ سا انسان اچھا لگتا تھا۔اسکی سب سے اچھی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک بہترین سامع تھا۔اسے لوگوں کی باتیں سننے اور انہیں برداشت کرنے کا ہنر آتا تھا۔اس کی شخصیت میں کوئی ایسی صلاحیت تھی کہ اس کے سامنے دل کھول کے رکھ دینے کو دل چاہتا تھا۔زارا کو اس سے بات کر کے ہمیشہ اچھا لگتا تھا اور چونکہ وہ اس کے سرکل کا نہیں تھا اس لئے اس سے پرسنل ڈسکس کرتے ہوئے اسے کبھی یہ خدشہ لاحق نہیں ہوا تھا کہ بات ممی تک پہنچے گی۔وہ ایک بار پہلے اس کے گاؤں فری کیمپ کے لئے بھی آئی تھی لیکن اس بار وہ صرف اپنی خاطر آئی تھی۔اسے لگتا تھا اسے ذہنی طور پر ماحول بدلنا راس آسکتا تھا سو وہ اسی لئے یہاں آئی تھی اور ٹپو طنزیہ باتیں کر کے اسکا دل جلا رہا تھا۔

"تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے۔۔تم کھانا نہیں کھاتی۔۔تمہارے اندر کمزوری ہے۔" ٹپو نے پھر اس کے ہاتھ میں دانے دینے چاہے تھے۔زارا نے ایک دانہ بھی منہ میں ڈالا تھا۔اس نے پہلے سے موجود دانے بھی ٹپو کے ہاتھ میں واپس رکھ دیئے۔

"میرا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ میں واقعی پاگل ہوں۔۔میں ان لوگوں میں ہمدرد ڈھونڈتی پھرتی ہوں جنہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ میں چاہتی کیا ہوں" وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ارے۔۔۔اچھا مجھے بتاؤ تم چاہتی کیا ہو ڈاکٹر۔۔۔" اس کا ارادہ بھانپ کر ٹپو نے کہا تھا وہ دونوں لہلہاتے کھیت کے ایک طرف پگڈنڈی سے نیچے اتر کر ایک چبوترے نما بینچ پر بیٹھے تھے۔زارا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔اسے مزید وقت ضائع کر کے کیا حاصل ہو جانا تھا۔

"ایسے ناراض ہو کر مت جاؤ۔مہمان ناراض ہو کر چلا جائے تو سارے گاؤں والے تھو تھو کرتے ہیں۔۔ناک کٹ جاتی ہے بندے کی" وہ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔زارا نے ایک نظر اسے دیکھا اور نرم پڑ گئی۔ٹپو کی ایسی ہی عادت تھی۔

"میں بس اتنا چاہتی ہوں مجھے آپ جیسے لوگ ایسے ٹریٹ کرنا چھوڑ دیں جیسے میں بیوقوف ہوں۔وہ میری عزت کریں۔میرا احترام کیا جائے۔میری خوشنودی کو خیال رکھا جائے۔میرے رونے کو سوپ سیریل نا سمجھا جائے۔مجھ سے محبت کی جائے میرے سینئرز میری تعریف کریں کہ میں سب سے اچھی ڈاکٹر ہوں۔وہ مجھے حقارت کی نظر سے نا دیکھیں ممی مجھے بیوقوف سمجھنا چھوڑ دیں۔شہروز مجھے اہمیت دے،صرف مجھ سے محبت کرے،مجھے ہر چیز پر ترجیح دے۔اسے میں ہی میں نظر آؤں۔اس کے دل پہ صرف میرا قبضہ ہو" وہ چلتے چلتے بول رہی تھی۔ٹپو بھی ساتھ چلنے لگا،اسکی خواہشات کا

ایک طویل سلسلہ تھا۔ بچو کے چہرے کے تاثرات ہر خواہش پر تبدیل ہو رہے تھے۔ آخری خواہش پر وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کرید رکھ کر آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا پھر سر ہلا کر چپ ہو گیا۔ وہ پہلے سے جانتا تھا زارا کو "شہروز" نام کا عارضہ لاحق ہے۔

"میں تمہیں ایک کام کی بات بتاؤں۔۔ تمہیں بہت ساری چیزیں چاہئیں اور زندگی میں اپنی من پسند چیز حاصل کرنے کا ایک گر ہے۔ جس چیز کی طلب ہے اسے بانٹ دو اسے اپنے پاس چھپا کر نا رکھو، دوسروں کو دے دو۔ اس طرح وہ چیز پلٹ کر آپ کے پاس واپس آجائے گی یعنی علم چاہئے تو جو علم اللہ نے آپکو دیا ہے اسے اللہ کے بندوں میں بانٹ دو محبت چاہیئے تو اللہ کے بندوں میں محبت بانٹ دو عزت چاہیئے تو اللہ کے بندوں کو عزت دو یعنی جو چاہیئے وہ اللہ کے بندوں کو دینا شروع کر دو۔ محبت دولت عزت علم رزق جو بھی چاہیئے ہو اسے اپنے پاس نا رکھو۔ اسے محدود نا کرو۔ اسکا راستہ نا روکو۔ اسے راستہ دو تاکہ وہ اسی راستے پر پلٹ کر دوگنا چوگنا ہو کر آپ تک واپس آجائے۔" زارا نے چلتے چلتے اسکا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ مسکرایا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ عام سا کم پڑھا لکھا انسان لیکن زارا کے کام ہمیشہ آجاتا تھا۔

"اب بتاؤ کیا چاہتی ہو ڈاکٹر" وہ پوچھ رہا تھا۔

"سکون۔۔۔۔۔۔ مل جائیگا کیا؟" زارا کو پتا تھا اسے کس چیز کی کمی ہے۔ بچو نے اسکا چہرہ دیکھا پھر یکدم اس کے سامنے آگیا ایسے کہ اسکا رستہ رک گیا تھا۔

"بے شک۔۔۔ اللہ کے بندوں کو بے سکون کرنا چھوڑ دو" وہ اسکا چہرہ دیکھتے ہوئے پر اسرار سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"ادھر میری طرف دیکھو" وہ بولا تھا۔ زارا پہلے ہی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

اس نے اس کے چہرے کی جانب اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں گھمانی شروع کی تھی جیسے جادوگر فلموں میں گھمایا کرتے ہیں جب کوئی منتر پڑھا جا رہا ہو۔ وہ سنجیدہ انداز میں مسکراتے ہوئے چند لمحے ایسے ہی کرتا رہا۔ زارا پہلے حیرانی سے اسے دیکھتی رہی پھر خود بخود اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی تھی۔ اس کے لئے یہ ایک بچگانہ طرزِ عمل تھا جس لمحہ زارا مسکرائی اسی لمحے بچو نے اپنی مٹھی بند کر لی تھی جیسے کوئی تتلی دبوچ لی ہو پھر اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر زارا کا ہاتھ پکڑا تھا اور اس میں وہ نادیدہ دبوچی ہوئی چیز رکھ کر اس کی ہتھیلی بند کر دی تھی۔

"یہ لو۔۔۔ یہ تمہاری ساری بے سکونی میں نے تمہاری ہتھیلی میں بند کر دی ہے۔ گھر جا کر دو رکعت نماز پڑھنا اور قبلہ کی طرف منہ کر کے اس ہتھیلی پر پھونک مار دینا ساری بے سکونی اللہ کے سپرد کر دینا اور کہنا یا اللہ مجھے معاف کر دے میں تیرے بندوں کے لئے کبھی بے سکونی کا موجب نہیں بنوں گی۔ انشاء اللہ تمہارا سکون تمہیں مل جائیگا اور یاد رکھنا اللہ کا شکر ادا کرنا نا بھولنا۔ شکر ادا کرنے کی اہلیت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ شکر گزاری ایک خصوصیت ہے۔ جس کے بطن سے سکون جنم لیتا ہے اس لئے کثرت سے شکر ادا کرنا کیونکہ اللہ کچھ باتوں میں اپنے بندوں کی طرح ہوتا ہے اسے بھی جو چیز پسند ہے وہ اسے بانٹ دیتا ہے تاکہ اس کی کثرت میں اضافہ ہو۔ وہ انسان کو شکر گزار ہونے کے بے تحاشا مواقع دیتا ہے کیونکہ اسے کثرت سے ملنے والی شکر گزاری پسند آتی ہے" زارا نے اس عام سے انسان کا چہرہ دیکھا تھا جہاں بہار کے سنہرے رنگ سے بھی زیادہ سنہرا رنگ تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو مزید سختی سے بند کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سفر ایک ہی سمت میں ہو، پرسکون ہو اور من پسند ساتھی کی ہمراہی میں ہو تو بہت آسانی اور روانی سے کٹ جاتا ہے۔ عمر اور امامہ نے بھی آٹھ مہینے بخیر و خوبی ایک ساتھ گزار لئے تھے۔ نیت میں کھوٹ نہیں تھا اس لئے ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی محبت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

امامہ ان آٹھ مہینوں میں ماحول اور آب و ہوا کی مکمل عادی ہو چکی تھی اور عمر اس کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی ہمراہی میں بہت خوش تھے۔ امامہ کو اپنی زندگی پر بعض اوقات جنت کا گمان ہوتا تھا۔ وہ گھر پر رہتی تھی، ٹی وی دیکھتی تھی، میگزین پڑھتی تھی، امی سے فون پر گپیں لڑاتی تھی، شہروز اور رزارا سے موبائل ایس ایم ایس کے ذریعے رابطہ رکھتی تھی اور ان سب چیزوں کے بعد وہ صرف عمر کا انتظار کرتی تھی۔ وہ ایسی گرہستن بھی بھی نہیں تھی جیسی اب ہو گئی تھی۔ امامہ بھی کبھی اپنا لائف اسٹائل دیکھ کر خود حیران ہو جاتی تھی۔ وہ خود کو بہت پریکٹیکل سمجھا کرتی تھی شادی کے بعد بھی کتابوں کے ساتھ ان ٹچ رہنے کے دعوے کرنے والی کسی اچھے اخبار یا چینل پر جاب حاصل کرنے کی خواہش مند امامہ کو اب اپنے شوہر کے لئے بننے سنورنے اور اس کے لئے کیک، پزا ایک کرنے میں زیادہ لطف محسوس ہوتا تھا۔

وہ اپنے حال مست، بہت مطمئن زندگی گزار رہی تھی اور شاید ایسے ہی گزارتی چلی جاتی جو اُسے اس روز امی فون پر جھنجھوڑ نہ ڈالتیں۔

"تم بہت بدل گئی ہو امامہ۔۔۔" امی کے لہجے سے اتنا تاسف جھلک رہا تھا کہ امامہ فون کان سے لگائے شرمندگی میں ڈوب گئی مگر اسے پتہ تھا کہ وہ امی کو منا لے گی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں تمہیں یہ جملہ کہوں گی۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں سب شوہروں کو پیاری ہو جاتی ہیں مگر تمہارے جیسا حال کسی کا دیکھا نہ سنا۔۔۔ غضب خدا کا۔۔۔ ایسا تو فلموں میں بھی نہیں ہوتا۔"

امی اسے لتاڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے ساتھ مسکراہٹ بھی چمکنے لگی تھی۔

"اس کا مطلب آپ نے فلمیں دیکھنا شروع کر دی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ اس کا مقصد ان کے مزاج کو خوشگوار کرنا تھا۔ امی نے سرد آہ بھری اتنی سرد کہ میلوں کوسوں دور بیٹھی امامہ کا دل منجمد سا ہو گیا۔

"میری اپنی زندگی فلم بن گئی ہے۔۔۔ مجھے کیا دلچسپی عام فلموں میں۔" وہ اپنے لہجے کا درد چھپا نہیں پائی تھیں۔ امامہ کو دلی افسوس ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو بھی کوسنے دے ڈالے۔

"تم نے دیکھی ہے کبھی ایسی فلم کہ جو ایک بوڑھی عورت کے گرد گھومتی ہو حالانکہ اس عورت کی زندگی میں فقط "انتظار" کے اور کچھ بھی نہ ہو۔ وہ انتظار سے اکتا چکی ہو تھک چکی ہو لیکن انتظار اس سے اکتایا ہو نہ ہی تھکا ہو۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھیں اور ان کا ایک ایک لفظ امامہ کے دل پر بجلی بن کر گر رہا تھا۔

"امی۔۔۔ ایسے تو مت کہیں، آپ تو بہت باہمت ہیں، بہت حوصلہ مند۔۔۔" وہ ان کو حوصلہ دینا چاہتی تھی مگر دے نہیں پائی۔ اسے خود ہی اتنی شرمندگی ہو رہی تھی۔

"بے کار کی باتیں ہیں امامہ۔۔۔ میرے دل کی جو حالت ہے نا، ایک باہمت اور حوصلہ مند عورت کا دل ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ تم ماں نہیں ہو نا اس لئے بھی نہیں سمجھ پاؤ گی۔" وہ طنز کر رہی تھیں مگر آواز میں سنجیدگی اور دکھ غالب تھا۔

"امی۔۔۔ پلیز۔۔۔ اتنا مت تھکائیں خود کو۔۔۔آپ۔۔۔" اس کے پاس تو لفظ ہی ختم ہو گئے تھے جو وہ امی کو تسلی دینے کے لئے بول سکتی۔

"میں واقعی تھک گئی ہوں۔۔۔ بہت تھک گئی ہوں۔۔۔ امائمہ، بہت سال ہو گئے ہیں، بہت سال۔۔ اسکا کچھ پتا نہیں۔۔۔ کوئی ایک جھوٹی خبر ہی آجائے کہیں سے تو سکون آجائے۔۔۔ تم میری حالت کا اندازہ تو کرو، ایک ماں کے دل سے سوچو تو سہی۔ کسی نے جلتے توے پر بٹھا رکھا ہے مجھے۔"

امی کی باتیں اسے کچوکے لگا رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا حال نہیں پوچھا تھا۔ اس کی زندگی کے متعلق کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی مطلب کی بات کر رہی تھیں۔

"امی مجھے اندازہ ہے۔۔۔ میں کوشش بھی کر رہی ہوں۔۔۔ مگر۔۔ امی۔۔۔ یہ بھی تو سوچیں کیا پتہ۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا پتہ مت کہو امائمہ۔۔۔ یہ لفظ تو بولو ہی مت۔۔۔ اس "کیا پتہ" کے بعد میرا سارا حوصلہ ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ مرے ہوئے کو نہیں مارا کرتے میری بیٹی۔۔۔"

ان کے الفاظ نہیں تھے، سیاہ بادل تھے، کڑکتی بجلی تھے۔ امائمہ کی آنکھوں سے بارش برسنے لگی۔

"تم یہ سب مت کہو۔۔۔ یہ سب باتیں مجھے، بہت بودی لگتی ہیں۔۔۔ تمہاری شادی نے مجھے ایک نئی امید دی تھی۔ میں پچھلے تین چار سالوں سے اسی امید کو پال پوس کر زندہ ہوں۔ مجھ سے میری امید مت چھینو۔۔۔ اتنی خود غرض مت بنو۔"

امی کے دل پر اس کے آنسوؤں نے خاک اثر کرنا تھا وہ تو خود رو رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دیں امی۔۔۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

وہ ہچکیوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ امی کے لئے یہ دوہرا دکھ تھا۔ انہوں نے اپنی عزیز جان بیٹی کو رلا دیا تھا۔ وہ انہیں اتنی عزیز تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں اور آج وہ ان کی وجہ سے رو رہی تھی مگر وہ بھی کیا کرتیں۔ وہ بہت مجبور ہو کر اپنی بیٹی کے سامنے ہی دل ہلکا کر سکتیں تھیں اور یہ بات امائمہ سے بہتر کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ امی کے پاس دکھ کہنے کے لئے صرف وہی تو تھی اور اس نے بھی عرصہ ہوا امی کے دکھ سننے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی برا بھلا کہہ رہی تھی۔

"معافی مت مانگو میری جان۔۔۔ بس اپنا وعدہ پورا کر دو۔۔۔ ایک بار۔۔۔ میری خاطر۔۔۔ پلیز۔۔۔ یہ میری ریکوئسٹ ہے تم سے۔۔۔ پلیز امائمہ۔۔۔ میرے بچے کو ڈھونڈ لاؤ۔"

امی کے لہجے کی التجا سن کر امائمہ کا دل چاہا کہ وہ پگھل کر زمین پر گر جائے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ امی اس سے اس طرح درخواست کریں گی۔ وہ اس کی ماں تھیں اور ان کا درمیانی تعلق ماں بیٹی کے تعلق سے بھی بڑھ کر تھا اور آج یہ دن آ گیا تھا کہ امی کو اسے یاد کروانا پڑ رہا تھا۔

"میں اپنا وعدہ پورا کروں گی امی۔۔۔" اس نے بھیگی آواز کے ساتھ ان کو ایک بار پھر تسلی دی تھی۔

سلیپنگ بیوٹی بالا آخر آٹھ مہینے کی گہری نیند سے کسی بھی لمس کے بغیر بیدار ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

امائمہ کو وہ دن یاد تھا جب نور محمد کو برین ہیمبرج ہوا تھا تب امائمہ اگر چہ اتنی سمجھدار یا باشعور نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ دن اسکی یادداشت سے کبھی نہیں نکل سکا تھا۔ نور محمد تکلیف سے تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ امی سمجھیں تھیں کہ وہ مر گیا ہے۔ وہ بے تحاشا رونے لگی تھیں، وہ سب گزشتہ دو دن سے روہی رہے تھے لیکن نور محمد کی اس حالت نے جیسے خون ہی خشک کر ڈالے تھے۔ اسے ہاسپٹل لے جایا گیا۔ وہ بظاہر بچ گیا تھا لیکن اس کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی اور اصل آزمائش تب ہی شروع ہوئی تھی۔ اگلے دو سال وہ تقریباً مر اہی رہا تھا اس کی حالت نہ زندہ جیسی تھی نہ ہی مردہ جیسی۔ برین ہیمبرج کے سخت ترین حملے نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن پھر بھی دھڑکتا دل اسے مردہ ثابت نہیں کرتا تھا۔ اچھے علاج نے اسے بچا لیا تھا مگر اسکے اندر زندہ رہنے کی خواہش بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کی حیات بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہوں۔ وہ بولتا تھا نہ گھر سے باہر جاتا تھا بلکہ گھر سے باہر نکلنا تو دور کی بات وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں آتا تھا۔ امی اس کے سامنے کھانا رکھ کر انتظار کرتی رہتی تھیں کہ وہ کچھ کھائے گا مگر وہ ایک لقمہ بھی نہیں لیتا تھا۔ اس کی بھوک نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ کبھی بھی دن کپڑے نہیں بدلتا تھا۔ اس کے منہ سے لفظ "امی" سننے کے لئے امی کے کان ترس جایا کرتے تھے مگر وہ گونگوں کی طرح بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے کمرے میں بھی بس خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو تکنے میں مگن رہتا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق امائمہ اسے بار بار مخاطب کرتی، بلاوجہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہتی لیکن وہ ٹس سے مس نا ہوتا۔ امی اسے بار بار بھائی کے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کی نصیحت کرتی رہتی تھیں لیکن امائمہ کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی پھر وہ بھی تھک ہار کر اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتی لیکن وہ نارمل ہو کر نا دیا۔

امی اس کی کتابیں اس کے آگے اٹھا کر رکھ دیتیں تو وہ رونے والا ہو جاتا۔ کتابیں دیکھ کر اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ منہ سے تھوک اور آنکھوں سے اشک بہنے لگتے۔ یہ بہت کڑا وقت تھا۔ امی نے نور محمد کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا۔ انہیں سب کچھ بھول گیا تھا۔ یاد رہا تو صرف یہ کہ انکا ایک بیٹا تھا جو اپنے باپ کے رویے کی وجہ سے زندوں اور مردوں کے درمیان والی کیفیت میں آ گیا تھا۔

ابو بھی اس کے کمرے میں نہیں آئے تھے لیکن اس کی بیماری نے ان کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔ امائمہ کو کبھی کبھی ابو پر سب سے زیادہ ترس آتا۔ اسے لگتا وہ خود احتسابی کی ایسی جنگ لڑتے رہتے تھے کہ جس کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن یہ بات سب نے خود فرض کر لی تھی کہ نور محمد اس حال کو انہی کی وجہ سے پہنچا تھا۔ امی ان کو بہت کم مخاطب کرتی تھیں۔ امائمہ ہی تھی جو سب کے درمیان پل بنی رہتی۔ اپنے بھائی کے جلدی ٹھیک ہو جانے کی دعا کرتی وہ ابو کا بھی خیال رکھتی اور امی کا بھی لیکن کبھی کبھی وہ بھی ہمت ہار جاتی مگر یہ امی تھیں جو ہمہ وقت نور محمد کے گرد پروانے کی طرح منڈلاتی رہتی تھیں اور یہ ان کی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ بالآخر دو سال بعد نور محمد کسی قدر نارمل ہو گیا تھا۔ امی کی محنت اور دعائیں رنگ لائی تھیں۔

اس نے ضرورتاً ہی سہی مگر امی کو مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان کی باتوں پر مسکرانے لگا تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر کھانا بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی کتابوں کو اب لاتعلقی سے نہیں تکتا رہتا تھا بلکہ وہ ان میں تھوڑی، بہت دلچسپی بھی لینے لگا تھا۔ وہ مختلف کتابوں میں تخصیص کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے بائیولوجی، فزکس، کیمسٹری اور میتھس میں فرق کرنا آ گیا تھا۔ اسے مکمل طور پر ٹھیک ہونے میں مزید ڈیڑھ سال لگ گیا تھا۔

امی اس کی حالت میں بہتری پر بے انتہا خوش تھیں۔ امامہ کو احساس تھا کہ فطری طور پر امی کو اپنی پہلوٹھی کی اولاد سے زیادہ محبت تھی لیکن وہ امی کی توجہ کے لئے تڑپنے کے باوجود نور محمد کو ان سب چیزوں کا قصوروار نہیں سمجھتی تھی اسے اپنے بھائی پر ترس آتا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے پر امی نے نور محمد کو پڑھنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے ڈایا گرام سے آگے کے نقاط کی اہمیت پر لیکچر دیتی نظر آتی تھیں۔ انہوں نے گھر پر ہی اس کے لئے ایک ٹیوٹر کا انتظام کر دیا تھا۔ اگلے ایک سال میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ دوبارہ سے انٹر پری میڈیکل کا امتحان دے سکے۔ وہ پہلے کی طرح نہیں پڑھ پاتا تھا لیکن وہ سب یہ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ وہ اس قدر ذہین ہے کہ ایک خوفناک بیماری کو شکست دینے کے بعد وہ کم از کم اس قابل تھا کہ پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکے۔ ایگزامز کے بعد وہ دل و جان سے میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے اینٹری ٹیسٹ کی تیاری میں جت گیا تھا۔

اسکا رزلٹ پہلے کی طرح شاندار تو نہیں تھا مگر اس نے 89٪ مارکس لے کر ثابت کر دیا تھا کہ جینئس ہر حال میں جینئس ہوتا ہے۔ ابو پہلے کی طرح اس کی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے لیکن انہیں اطمینان تھا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ ان کا انداز ابھی بھی پہلے کی طرح نارمل رہتا تھا۔ وہ اسے کبھی شاباش نہیں دیتے تھے، کبھی سراہتے بھی نہیں تھے حتیٰ کہ وہ اس کے رزلٹس بھی چیک نہیں کرتے تھے لیکن امامہ جانتی تھی ابو اندر سے اسکی حالت دیکھ کر مطمئن تھے۔

آزمائش مگر ابھی ختم نہیں بلکہ اصل آزمائش تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ ان سب گھر والوں کو تب ہوا جب تمام تر تیاری کے باوجود نور محمد میڈیکل اینٹری ٹیسٹ میں فیل ہو گیا۔ اس کے ارد گرد رہنے والوں کے لئے یہ ایک بہت انہونی سی بات تھی۔ اس کے ابو کو چھوڑ کر باقی تمام زمانہ اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا فرق بس یہ تھا کہ باقی زمانہ اس کے حالاتِ زندگی سے بے خبر تھا۔ بیماری نے اس کے اعصاب کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ یہ ناکامی اس کے لئے بہت مہلک ثابت ہوئی۔ وہ جو بہت پر سکون رہنے والا انسان تھا اس روز اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اینٹری ٹیسٹ کا رزلٹ پتا چلتے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں امی کے دلاسہ دینے پر اسے غصہ آنا شروع ہو گیا تھا پھر جانے کیا ہوا اس نے اپنی تمام کتابیں، نوٹس، گائیڈ بکس کمرے سے لا کر صحن میں پھینکنا شروع کر دیں۔

"مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں جہنمی ہیں۔ میرے سکون کی سب سے بڑی دشمن۔۔۔ میں ان کو آگ لگا دوں گا۔۔۔ جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

وہ کتابیں صحن کے بیچوں بیچ پھینک کر انہیں پاؤں سے کچلتے ہوئے بول رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک اس نے اپنی ساری بک ریک خالی کر دیا تھا۔ اس وقت ابو کے پاس ان کے کچھ اسٹوڈنٹس آئے ہوئے تھے۔ ابو سمیت وہ سب بھی یہ شور سن کر صحن میں جمع ہو گئے۔

"چھوڑ دو مجھے۔۔۔ میں سب کو مار ڈالوں گا۔۔۔ میں نفرت کرتا ہوں سب سے۔۔۔ تم سب میرے دشمن ہو۔۔۔ اور تم میرے قاتل ہو۔۔۔ مجھے قتل کر کے اب تو سکون آ گیا ہو گا تمہیں۔۔۔"

وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بائیالوجی کے نوٹس کا پلندہ اٹھا کر اپنے ابو کے منہ پر مارا تھا اور اس کے بعد ایک کے بعد ایک کئی کتابیں ان کی جانب اچھالیں تھیں۔

"اب خوش ہو تم۔۔۔خوش ہو۔۔۔خوش ہو"

اس کے منہ سے لفظ کم نکل رہے تھے اور تھوک زیادہ۔ایک ہی بات کی تکرار کرتے وہ کتاب زمین سے اٹھاتا تھا اور اپنے ابو کو دے مارتا تھا۔اس کی ذہنی حالت اتنی مخدوش ہو چکی تھی کہ اسے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ جب وہ کتاب اٹھانے زمین پر جھکتا ہے تو اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔وہ کب سے اپنے ابو کی جانب خالی ہاتھ اچھال رہا تھا۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔۔۔پاگل ہے یہ۔۔۔واقعی پاگل ہو گیا ہے۔" اس کے ابو کے پاس پڑھنے والے لوگ ان کے گھر ضرور آتے تھے لیکن وہ ان کے گھر کے فرد نہیں تھے۔وہ باتیں کرنے اور اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرنے میں مگن تھے۔غرض جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق یہ خبر گھر سے باہر نکل گئی تھی۔

"پروفیسر آفاق علی کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے۔"

پروفیسر صاحب پہلے خفا ہوئے پھر پریشان پھر حیران اور سب سے آخر میں پشیمان ہوئے۔انسان یہی کرتا ہے۔جو کام اسے پہلے کر لینا چاہیئے وہ سب سے آخر میں کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"آپا مجھے آپ لوگوں سے یہی امید تھی۔۔۔جس طرح کا رویہ آپ نے بچے کے ساتھ اپنا رکھا تھا اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔۔۔توبہ توبہ اتنی بڑی نعمت کی ایسی ناقدری۔۔۔کبھی دیکھی نہ سنی۔"

یہ امائمہ کے ماموں تھے جو تقریباً پانچ سال بعد روپڑ بل سے واپس آئے تھے۔انگلینڈ کے اس چھوٹے سے قصبے میں وہ ایک ان پڑھ ہونے کے باوجود کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔یہی ماموں امی کو اکثر نصیحت کرتے تھے کہ بچے کو پڑھائی کے لئے اتنا پریشرائز کرنا ٹھیک نہیں۔ابو ماموں کی نصیحت کو ہمیشہ ایک ان پڑھ انسان کا احمقانہ مشورہ قرار دیتے تھے اور اب یہی ماموں امی کو ان کے پچھتاووں کا احساس دلا رہے تھے۔

"یہ آپکا بیٹا میرے لئے کبھی بھانجا نہیں رہا بلکہ یہ میرے لئے ایک تعویذ تھا جسے میں اپنی اولاد کو دکھا دکھا کر حوصلہ لینے کی تلقین کرتا تھا۔آگے بڑھنے کی طاقت دیتا تھا۔یہ میرے لئے عام بچہ نہیں تھا بلکہ گلوکوز کی بوتل تھا آپا! میرے بچے اس کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔اس کا نام لینے سے ہمیں توانائی ملتی تھی۔ہم ہر ایک کو فخر سے بتایا کرتے تھے کہ ہمارے خاندان میں ایک ایسا بچہ ہے جو بڑے ہو کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان بنے گا۔۔۔یہ آپ لوگوں نے کیا کر دیا آپا۔۔۔"

"میں ڈاکٹر عبدل قدیر خان بنوں گا۔۔۔میں ڈاکٹر عبدل قدیر خان بنوں گا۔۔۔"

ماموں نور محمد کی جانب دیکھ کر رو ہی پڑے۔اس کی امی کی آنکھیں تو رہتی ہی نم تھیں جبکہ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور پھر تالیاں بجانے لگا اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو چکی تھی۔وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔تالیاں بجانا ہنستے رہنا یا کبھی کبھی رونے لگ جانا۔۔۔انہی علامتوں کے باعث اب وہ پورے محلے میں پاگل مشہور ہو چکا تھا۔خاندان کے سب گھر بھی اس بات سے آگاہ تھے۔یہ امائمہ کے لئے بہت صبر آزما وقت تھا۔نور محمد کی اس

حالت نے ان کے گھر کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے گھر میں اب کوئی ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کرتا تھا۔ امی ابو کے تعلقات تو بالکل بیگانوں جیسے تھے۔ امی نے جیسے نورمحمد کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ انہیں امامہ نام کی بیٹی کبھی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ وہ بس بیٹے کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایسی صورتحال میں ماموں کی ہمدردی امی کے لئے بڑی حوصلہ افزا تھی۔

"بیٹے مفت ملتے ہیں کیا آپا یا درختوں پر اگتے ہیں کہ جب دل چاہا خرید لیا یا توڑ لائے۔ نہیں آپا! بیٹے اتنے آرام سے نہیں ملتے اور ایسے بیٹے تو بالکل نہیں۔ یہ آپ نے کیا کر دیا آپا! میرا دل بھی رو رہا ہے اس کی حالت پر۔۔۔ میں کیا کہوں۔۔۔"

ماموں سے تو اس کی حالت ہی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ ایسی لاچاری ایسی بے بسی انہوں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی نورمحمد کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ تالیاں بجانا ہنستے رہنا یا کبھی کبھی رونے لگ جانا۔۔۔ انہی علامتوں کے باعث اب وہ پورے محلے میں پاگل مشہور ہو چکا تھا۔ خاندان کے سب گھر بھی اس بات سے آگاہ تھے۔

"آپ لوگوں نے اب اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔۔۔ بالکل ہی پاگل سمجھ لیا ہے؟ اسے پاگل خانے میں پھینک دیں گے؟"

اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے انہوں نے ایک نئے عزم سے سوال کیا تھا امی ناخنوں سے کھیلنے لگیں۔

"اس کی حالت اب نہیں سنبھلے گی۔ ڈاکٹر بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ تم سمجھتے ہو میں اس کی حالت کے لئے پریشان نہیں ہوں۔۔۔ ایسا نہیں ہے میرے بھائی۔۔۔ بہت کچھ کر کے دیکھ لیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پانچ سال ہو چکے ہیں مجھے اس کے ساتھ سر کھپاتے ہوئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ خود ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتا۔ اس کی جو حالت تم دیکھ رہے ہو یہ مستقل ایسا نہیں ہے۔ کبھی کبھی یہ ٹھیک بھی ہو جاتا ہے تب اس کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ۔۔۔ یہ نارمل نہیں ہے مگر جب۔۔۔ جب دورہ پڑتا ہے تو کئی کئی دن یہ نارمل نہیں ہوتا۔ کمرے میں بند خود سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں کیا کروں اور اس کے لئے۔۔۔ میرے اللہ کی یہی رضا ہے۔۔۔"

امی پشیمانی سے گھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ماموں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھری۔

"یہ اللہ کی رضا نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی سزا ہے۔ جب اس کی نعمتوں کی قدر نہیں کریں گے تو یہی ہوگا نا۔۔۔ بہرحال۔۔۔ آپ کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کل بھی میرے لئے قابل فخر تھا اور آج بھی ہے۔ آپ اس کو بھول جائیں۔ یہ آج سے میرا بیٹا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ یوکے لے جاؤں گا۔"

ماموں کا لہجہ حتمی تھا۔ یہ سن دو ہزار کی بات تھی نورمحمد ماموں کے ساتھ روچڈیل چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کوئی کام وام نہیں کرتے؟" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ یہ ٹھیک نواں دن تھا اور وہ ایک بار پھر رائیڈ موجود تھی۔ اس بار وہ پہلے کی طرح بے چین ہو کر نہیں آئی تھی بلکہ اس بار وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھی۔ شہروز نے نا صرف اس کی کال ریسیو کی تھی بلکہ کال کے بعد بھی وہ کافی دیر تک اسے ٹیکسٹ کرتا رہا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے اسے ٹیکسٹ کیا تھا۔

"مرحبانیبے۔۔۔آئی مس یو" زارا کے بے چین دل کو قرار آ گیا تھا۔اب وہ کافی دن تک مسرور رہ سکتی تھی اور اسی لئے وہ ٹیپو کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔اس کا مشورہ تھا کہ لوگوں کو بے سکون کرنا چھوڑ دو۔گزشتہ پورے ہفتے اس نے شہروز کو طعنہ دیتا ہوا ایک بھی میسج نہیں کیا تھا تا کہ اسے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسکی پرواہ نہیں کرتا۔اسکا خیال تھا کہ اسی لئے شہروز نے اس کی کال فوراً لے لی تھی۔اسی خوشی کو شیئر کرنے وہ یہاں آ گئی تھی دراصل گزشتہ بار ٹیپو نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ گاؤں میں کچھ مریض عورتوں کو دیکھ سکے تو اسے خوشی ہوگی۔اسکا آف بھی تھا اور ممی مصروف تھیں سوا سے ڈر نہیں تھا کہ وہ ٹوکیں گی۔اسی لئے وہ موقع ملتے ہی آ گئی تھی۔فارماسیوٹیکل کمپنیاں سیمپلز کے طور پر لاتعداد ادویات ڈاکٹرز کو دیتی تھیں۔زارا اپنے ساتھ ایسی ادویات لائی تھی جو بے ضرر تھیں۔بینڈ ایجز، پائیوڈین، ٹشو پیپرز وغیرہ بھی تھے۔اس نے ٹیپو ہی کی فرمائش پر کچھ مریضوں کو نسخے بھی لکھ کر دیئے تھے کچھ کو مزید چیک اپ کے لئے ہاسپٹل آنے کا بھی کہا تھا۔سب کاموں سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر کھیتوں کی سیر کو نکل آئے۔ٹیپو کے ہاتھ میں ایک درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ تھی جسے وہ ہوا میں لہراتا ہوا اچھل رہا تھا۔

"کرتا ہوں نا" وہ اسکی جانب دیکھے بنا بولا تھا۔

"کیا؟" زارا نے اس کے عدم دلچسپی والے انداز کو محسوس کیا۔

"کیا بتاؤں۔۔تمہاری طرح ڈاکٹر تو ہوں نہیں کہ فخر سے بتا دوں۔۔چھوٹی موٹی نوکری ہے اسکا کیا تذکرہ کرنا" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

"آپکو اپنی نوکری پسند نہیں ہے" زارا نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔آج دھوپ ذرا کڑک تھی۔پیدل چلنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"پسند ہے۔۔۔لیکن میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں" اسکا انداز سابقہ تھا۔وہ اب کھیتوں کے درمیانی راستے سے نکل کر ذرا بڑی پگڈنڈی پر ہو گئے تھے۔ٹیپو اس بات کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا شاید اسی لئے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولا تھا۔

"میں آج بہت خوش ہوں" اور اسی لمحے زارا نے بھی پر جوش ہو کر کہا تھا۔

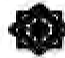
"میں آج بہت خوش ہوں" وہ دونوں ہی ہنس دیئے۔

"بزرگ کہتے ہیں کہ جب دو لوگ ایک ساتھ کوئی اچھا جملہ بولیں تو فوراً کوئی خواہش ظاہر کرنی چاہیئے۔۔۔کیونکہ وہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے" ٹیپو نے کہا تھا۔زارا کے چہرے پر مسکراہٹ کا زاویہ پھیلا تھا۔وہ دونوں چلتے چلتے رک گئے تھے۔

"واقعی۔۔۔اچھا تو میری خواہش ہے کہ شہروز کے دل پر میرا قبضہ ہو جائے۔۔اسے دن رات بس میں ہی میں نظر آؤں" وہ پر جوش ہو کر بولی تھی۔ٹیپو اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔اس کی بات سن کر وہ چلنا شروع ہو گیا اور اس سے چند قدم آگے جا کر اسکی جانب مڑ کر الٹی چال چلتا ہوا بولا۔

"میری خواہش یہ ہے کہ میرے پاس زیادہ ساری بکریاں آجائیں اور میں انکو چراتا پھروں۔۔۔وہ میرے آگے آگے چلیں اور جیسے ہی کوئی بکری ریوڑ سے باہر نکلے تو میں عقب سے آواز دوں۔۔۔اے چھوری۔۔۔ٹخ ٹخ۔۔شش۔۔شش۔۔۔اور بکری فوراً واپس ریوڑ میں شامل ہو جائے" وہ نا صرف الٹی چال چل رہا تھا بلکہ راستے میں آنے والے درختوں کی لٹکتی شاخوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی شاخ سے مارتا ہوا آگے کی سمت جا رہا تھا۔زارا نے ناک چڑھائی۔

"یہ کیسی احمقانہ خواہش ہے؟ ٹھپو نے جواباً اس سے زیادہ بری شکل بنائی۔
"کیوں جب تم یہ خواہش کرتی ہو کہ تمہارا شہروز کے دل پر قبضہ ہو جائے تو یہ احمقانہ نہیں لگتا"
"اس میں احمقانہ کیا ہے۔۔میں اس سے محبت کرتی ہوں۔۔یہ میرا حق ہے کہ اسے ہر طرف میں ہی میں نظر آؤں" وہ دو بدو بولی تھی۔
"ارے جس سے محبت کرتی ہو اس کا برا کیوں چاہتی ہو۔۔۔دل وہ جگہ ہے جہاں اللہ قیام کرتا ہے۔انسانی دل پر حکمرانی کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے اس لئے جس سے محبت کرو اس کے لئے دعا کرو کہ یا اللہ میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں، میں اسکا بھلا چاہتی ہوں۔تو اس کے دل پر قابض ہو جا تو اس کے دل میں بسیرا کرلے۔یہ ہے اصل محبت اور تم خواہش کرتی ہو کہ تم اس کے دل پر قابض ہو جاؤ۔
۔۔۔اونہہ بات کرتی ہو محبت کی۔۔۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔زارا ششدر رہ گئی تھی۔ٹھپو ایسی باتیں کر کے اسے ہمیشہ لاجواب کر دیتا تھا۔
"مجھے بکریاں چرانا اس لئے پسند ہے کہ یہ انکو بہت پسند ہے جن سے میں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں" وہ اب سیدھا ہو کر چل رہا تھا۔زارا اسکی پہلی بات کے اثر سے نکلی نہیں تھی اس لئے پست سی آواز میں بولی۔
"کون ہیں وہ، جن سے آپ بہت محبت کرتے ہیں؟"
"وہ، وہ ہیں جو تم سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں" ٹھپو اب اسکی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔
"کون شہروز؟" وہ ترنت پوچھ رہی تھی
"آآآآآآآآآآآآ۔۔۔" ٹھپو چلایا تھا پھر اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولا۔
"وہاں سے کوئی پتھر اٹھاؤ اور میرے سر میں مار دو۔۔۔میں مزید زندہ نہیں رہنا چاہتا۔۔یا اللہ تو کیسے کیسے انسان بنانے لگا ہے آجکل"
زارا مزید چڑ گئی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ ٹھپو نے ایسے کیوں کیا ہے۔
"ایک صرف شہروز نہیں ہے جو تم سے محبت کرتا ہے، کوئی اور بھی ہے" وہ اسکی جانب مڑا تھا۔زارا نے حیرانی سے اسکا چہرہ تکا۔
"اور کون؟ وہ پوچھ رہی تھی
ٹھپو نے اسکا چہرہ دیکھا پھر مسکراتے ہوئے اس نے وہ نام زارا کو بتا دیا تھا۔زارا دنگ رہ گئی تھی۔۔۔



رات سیاہ تھی مگر خوبصورت تھی۔ آسمان کے وسیع گھیر دار سیاہ لباس پے ننھے موتیوں جیسے چمکیلے تارے ٹکے تھے۔ ننھے معصوم بچوں جیسے تارے نجانے کونسے کھیل کھیل رہے تھے کہ جب پکڑے جاتے تھے تو ہنستے ہنستے دوہرے ہوجاتے تھے اور اسی لئے ٹمٹمانے لگتے تھے۔

زارا کب سے آسمان کو تکنے میں مگن تھی اور شاید آسمان اسے، یہ ان کے بچپن کے کھیل تھے۔ وہ جب چھوٹی تھی تب بھی آسمان پے بکھرے تاروں کو دیکھتی اور اس میں وہ چہرے کھوجتی رہتی جن کی یاد اسے ستایا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے محبوب لوگوں کو یاد کرنے میں بڑا وقت بتایا تھا۔ بچپن میں ممی کی نائٹ شفٹ ہوتی تو ممی کا انتظار کرتے کرتے آسمان پے بکھرے تاروں کو کھوجتے کب نیند آجاتی پتا ہی نا چلتا۔ ممی گھر پے ہوتی تو پاپا کی شفٹ ہوتی اور وہ انہیں یاد کرتی رہتی پھر شہروز ان یادوں میں نا جانے کیسے حصے دار بن گیا۔ شہروز اس کی پچیس سالہ زندگی میں پورے بیس سالوں پر قابض تھا۔ وہ پانچ سال کی تھی جب پاپا ممی اسپیشلائزیشن مکمل کر کے آسٹریلیا سے لاہور شفٹ ہوئے اور تب ہی سے ماموں کا گھر جیسے اسکا اپنا گھر ہو گیا اور ماموں کے بچے اسکے بہن بھائی ہو گئے۔ شہروز کے ساتھ اسکی شروع سے جمتی تھی، وہ باقی کزنز کی طرح اسکا مذاق نہیں اڑاتا تھا، اسے چڑاتا نہیں تھا۔ اسکا خیال رکھتا تھا اسکی دلجوئی کرتا تھا۔ اس کی بہتی ناک اور بہتے آنسوؤں کو پونچھ دیا کرتا تھا۔ اس کی ہوم ورک میں مدد کرتا، اس کی پسندیدہ کھانے کی چیز میں حصہ رکھنا، اسکے ساتھ سائیکل چلانا، اس کے گلے شکوے سننا، اسکے مسئلے حل کرنا۔ شہروز نے کیا کیا نا کیا تھا اس کے لئے، تو پھر وہ کیسے اسکی محبت میں مبتلا نا ہوتی۔ وہ کیسے اسکے سحر سے نکلتی۔ وہ کیسے یہ سمجھ لیتی خود کو کہ اسکے علاوہ بھی شہروز کے لئے کچھ اہم ہو سکتا تھا اور اب ٹھو نے اس پر کیا منتر پڑھ کر پھونک ڈالا تھا کہ اسے خود بخود سب سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے محبت کو محبت سے کرنا آ گیا تھا۔ وہ "محبت" کو پہچان گئی تھی۔

ٹھو کی باتیں اس کے ذہن میں جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے ایک ایک لفظ جیسے ازبر تھا۔

"صرف شہروز نہیں ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔ کوئی اور بھی ہے" ٹھو نے کہا تھا۔ پگڈنڈی پے بکھرے نیلے آسمان کے نیچے وہ اسے دنیا کی حقیقت بتا رہا تھا۔

"اور کون؟" زارا نے پوچھا تھا۔

"حضرت محمد ﷺ" اور زارا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ٹھو کے جواب نے اس پر حقیقی معنوں میں ٹھنڈا پانی انڈیل دیا تھا۔ اسے بڑی شرمندگی ہوئی اور یہ وہ شرمندگی نہیں تھی جو انسان دوسرے انسان کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ شرمندگی تھی جو انسان اپنے آپ سے محسوس کرتا ہے۔ یہ شرمندگی شاہ رگ سے اوپر اٹھتی ہے اور پھر دماغ سے ہوتی ہوئی سب حواسوں پر چھا جاتی ہے۔ سلو پوائزن کی طرح دھیرے دھیرے خون میں منتقل ہوتی ہے اور پھر لاچار کر دیتی ہے۔ اس لمحے زارا کو احساس ہوا کہ جب انسان کا ضمیر اسے شرمندہ کرنے پر آتا ہے تو پھر ادھ موا کر کے چھوڑتا ہے۔

"آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں نا" وہ سر جھکا کر دھیمی سی آواز میں بولی تھی۔

ارے یہ کب کہا میں نے" وہ حیران ہوا، زارا کو اسکی مصنوعی حیرانی ذرا بھی نہیں بھائی تھی۔

"آپ یہی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں جبکہ میں۔۔۔۔" وہ چپ ہوئی تھی پھر لاچار ہوتے ہوئے بولی۔

"میں آپ جیسی نہیں ہوں۔۔۔ میں بہت عام انسان ہوں"

ملجو نے تڑپ کر اسکی جانب دیکھا۔

"میں بھی بہت عام انسان ہوں ڈاکٹر زارا۔۔۔ بلکہ میں تو عام سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوں۔۔۔ لیکن کیا عام لوگوں کو "خاص محبت" کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ محبت کرنا ہر انسان کا حق ہے۔ میں نے بھی پورے استحقاق کے ساتھ محبت کی ہے لیکن میں نے زندگی میں ایک سبق سیکھ لیا ہے، میں کسی جذبے کے ہاتھوں استحصال کا شکار نہیں ہوسکتا اور جذبہ بھی وہ جو میرے دین کا کل خلاصہ ہے۔" وہ چپ ہوا تھا پھر اسکی جانب سوالیہ انداز میں اسکی جانب دیکھا۔

"محبت کیا ہے" وہ اس سے پوچھ رہا تھا پھر خود ہی بولا۔

"محبت دنیا کا سب سے خوبصورت جذبہ ہے۔ لوہا جس طرح تپ کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح محبت جب اپنی خالص ترین شکل میں ڈھلتی ہے تو "ممتا" بن جاتی ہے اور ممتا وہ جذبہ ہے جو کائنات کو متحد رکھنے میں جوڑنے میں اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ کام آتا ہے۔ ممتا ہی ہے جو انسانوں کو انسانوں سے جوڑتی ہے کیونکہ یہ خود غرض نہیں ہوتی۔ ماں کیا کرتی ہے وہ اولاد میں فنا ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے اولاد پہلے اور وہ خود بعد میں ہو جاتی ہے یعنی ممتا اپنی ہستی کو بالائے طاق رکھ کر کسی دوسرے کی خاطر جائز طریقے سے کچھ کرنا اور ایسے کرنا کہ اس میں کوئی ذاتی طلب اور غرض نا ہو، کا نام ہے۔ ماں کے لئے اولاد ہی مقدس اور اولاد ہی مقدم ہو جاتی ہے۔۔۔۔ یہ ہے محبت کی تعریف اور اسکی تفصیل ہے میرے نبیؐ کی ذات ۔۔۔ میں جب دنیا بھر کے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہوں تو اور کسی ذات کو اتنا خالص نہیں پاتا۔ بے شمار برگزیدہ بندے ہیں انبیاء ہیں صوفیاء ہیں اولیاء ہیں جو انسانوں سے محبت کرنے آئے اور کر کے چلے گئے لیکن حضرت محمد ﷺ جیسی محبت انسانیت سے کسی اور نے نہیں کی۔ اور میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں نا تو اپنی ماں کا اپنے لئے سب سے خالص پاتا ہوں لیکن روز قیامت میری شفاعت میری ماں بھی نا کروا سکیں گی۔ میری شفاعت میرے نبی ﷺ کروائیں گے۔ تم انؐ کے بارے میں سوچو تو سہی کہ اللہ ایک انسان کو مکمل بناتا ہے، بہترین بناتا ہے افضل بناتا ہے اور وہ انسان اپنی ساری امت کو خود سے مقدم سمجھتے ہوئے دمِ آخر تک امت کی رہبری کرتے رہتے ہیں۔ جب ہاتھ اٹھاتے ہیں امت کیلئے اٹھاتے ہیں۔ جب کچھ مانگتے ہیں امت کیلئے مانگتے ہیں اور جب التجاء کرتے ہیں امت کیلئے کرتے ہیں۔ دنیا میں اتنا بے غرض انسان کوئی اور نہیں تھا۔ اتنی خالص اتنی بے غرض محبت کسی نے کسی سے نہیں کی ہوگی جتنی میرے آقا ﷺ نے اپنی امت سے کی ہے" ملجو نے اسکی جانب سے لمحہ بھر کے لئے بھی نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

"میرے پیارے نبی کی ساری تعلیمات کا کل خلاصہ انسانیت سے محبت ہے۔ ان کا علم محبت ہے، ان کا عمل محبت ہے تو انسان اگر اس دنیا میں محبت کرنے کیلئے ہی بھیجا گیا ہے تو پھر ان سے محبت کیوں نا کرے جو دنیا میں سب سے زیادہ باظرف تھے سب سے زیادہ بہترین تھے سب سے کامل تھے سب سے افضل تھے کیونکہ ان سے محبت کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے ان سے محبت کرنے سے آپکو اللہ کی قربت ملتی ہے، اللہ کی قربت ملے گی تو ہی انسان "عہدِ الست" کا حق ادا کر پائے گا ورنہ اللہ سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں ہوگا۔ وعدہ پورا نہیں ہوگا تو جنت کیسے ملے گی۔" وہ پھر رک گیا تھا۔

"مجھے ایسے مت دیکھو۔ میں بے حد عام انسان ہوں میں صرف محبت نہیں کرتا میں تو تجارت بھی کرتا ہوں۔ ان سے محبت کرنے میں نفع بہت ہے اور انسان مفاد پرست ہے اسی لئے میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن چونکہ وہ سب انسانوں سے محبت کرتے ہیں تمام جہانوں کے لئے رحمت العالمین ہیں تو ان تک پہنچنے کے لئے میں انسان سے محبت کا پابند ہوں۔ یہ پابندی میرا مذہب نہیں ہے یہ عین میری فطرت ہے۔ میں جتنا ان سے محبت کرتا ہوں اتنا ہی تمام انسانیت سے محبت کرنے کیلئے خود کو مجبور پاتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم میری بات سے اتفاق کرو لیکن میری عقل یہی کہتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی محبت بحیثیت مسلمان ہمارے خون میں ہے۔ ہم اس محبت سے روگردانی کرتے ہیں تو اپنی فطرت سے بغاوت کرتے ہیں۔ فطرت سے بغاوت ہمیں جنونی کر دیتی ہے اور جنون انسان کو تھکا دیتا ہے۔" زارا نے تھکی تھکی سانس بھری تھی۔

"ڈاکٹر زارا محبت تھکن کا نام نہیں ہے۔ محبت صرف آسانی ہے۔ اللہ کی عطاء ہے۔ انسان اگر کائنات کی عمارت میں اینٹوں کی طرح ہے تو محبت ان اینٹوں کو جوڑنے کے لئے سیمنٹ کا کام کرتی ہے لیکن ہم لوگوں نے محبت کو بدعت بنالیا ہے۔ محبت اس لئے نہیں ہے کہ آپ کو لاچار کر دے زچ کر دے۔ آپ کو وہ نا رہنے دے جو آپ ہیں۔ محبت بوجھ نہیں ہے تو اسے کندھوں پر لاد کر کیوں پھریں۔ یہ طوق نہیں ہے تو گردن میں کیوں لٹکایا جائے۔ محبت باعث آزار نہیں ہے۔ اس لئے ڈاکٹر زارا اسے محدود کر کے اپنے لئے باعث آزار مت بناؤ۔ یہ تمہیں تھکا دے گی اور تھکا ہوا انسان کائنات کے لئے بے کار ہوتا ہے۔ اس لئے محبت کرنی ہے تو خالص محبت کرو وہ محبت جو تمہیں طاقت دے اور اسے بھی طاقت دے جس سے تم محبت کرتی ہو۔ مٹھو کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ ابھری تھی کہ زارا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی باتوں میں روشنی اتنی تھی کہ اسکا پورا وجود چکا چوند ہوا جاتا تھا اور ابھی بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی سیاہ آسمان کو تکتے ہوئے ان باتوں کے اثر میں ڈوبی تھی۔

"انسانیت سے محبت کرو آنسہ زارا... بے غرض، بے لوث محبت... انسانیت سے محبت نا کرو تو میرے نبی ﷺ کی محبت نہیں ملتی کیونکہ جسے نبی کی محبت نہیں ملتی اسے پھر کسی کی محبت نہیں ملتی" مٹھو نے کہا تھا۔

زارا نے دیکھا آسمان پہ تارے بھی جیسے معطر ہوتے جاتے تھے۔ چاند بھی مسرور تھا اور آسمان بھی سیاہ ہونے کے باوجود سنہرا لگتا تھا۔ جب ہر چیز خالص محبت کو پہچانتی تھی تو وہ کیسے بے خبر تھی... اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا۔ ایک، تنہا، اکیلا آنسو... پرسکون، مسرور خوشی کا آنسو...

☆ ☆ ☆

نور محمد کی دوبارہ آنکھ کھلی تو بھی وجود جیسے بیدار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سارا بدن تھکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ کمرے کی چھت بھی دھندلی ہوئی جاتی تھی۔ وہ ابھی تک اس خواب کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کرتا تھا جو اس نے رات دیکھا تھا۔ وہ اس عورت کے ہاتھ ابھی بھی اپنے گریبان پر محسوس کر سکتا تھا۔ اور اس جیسے ملتے جلتے خواب اسکی بے چین راتوں کو ایک عرصہ سے مزید بے چین کر رہے تھے۔ وہ بے خوابی کے مرض میں تو مبتلا تھا ہی لیکن کچھ عرصہ سے ایسے خواب اس کی بے آرام راتوں میں اضافے کا باعث بنے ہوئے تھے۔

وہ بہت ہمت سے بستر سے اترا آیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہی کاغذات کا پلندہ اسکی توجہ کا مرکز تھا جسے اس نے رات کو بستر کے ایک جانب رکھ دیا تھا۔

"عہد الست" اس نے ایک ہی نگاہ ڈالی تھی اور پھر دوبارہ دیکھنے کا اسکا دل ہی نہیں چاہا تھا۔ وہ لفظوں سے خائف تھا۔ اسے لگتا تھا اس کاغذات کے پلندے سے لفظ نکلیں گے اور اسے ایک سانس میں نگل لیں گے۔ اس نے دوبارہ اس سمت میں نگاہ ڈالے بغیر اپنے سلیپرز پہنے تھے اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ باتھ روم کے دروازے کے باہر والی دیوار کے ساتھ کیلنڈر آویزاں تھا۔ اس نے اس کیلنڈر پر تاریخ کو درست کیا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ اس کے سینے سے خارج ہوئی تھی۔

2012 اپنی نصف سے زیادہ زندگی پوری کر چکا تھا۔ کتنا وقت گزر گیا تھا اور وہ ابھی بھی اس ایک حادثے کے زیر اثر تھا۔ وقت اگر واقعی مرہم تھا اور زخموں کو بھر سکتا تھا تو اس کے معاملے میں یہ مرہم نجانے کیوں اثر نہیں کر رہا تھا۔ اس نے باتھ روم میں جاتے ہوئے خود کو پہلے سے زیادہ عمر رسیدہ اور لاچار محسوس کیا تھا۔

پانی تو زندگی ہے۔۔۔ زندگی سے ڈرتے ہو" واش بیسن کے نل سے بہتا پانی بھی آج اسے کسی کی یاد دلا رہا تھا۔ اس کے دل میں کیا کیا نہیں مدفن تھا اپنا دل اسے اب دل نہیں قبرستان لگتا تھا۔ اس نے منہ پر چند چھینٹے ہی ڈالے تھے اور باہر آ گیا تھا۔ اسکی میز پر اسکا لیپ ٹاپ اسی طرح کھلا پڑا تھا کیونکہ اس نے رات اسے ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے کوئی کام نہیں کیا گیا تھا اسے جیسے پھر سے ایک عجب سی بے چینی لاحق ہونے لگی تھی۔ اس نے میز پر پڑی عینک اٹھا کر آنکھوں پر رکھی تھی اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ کی اسکرین دیکھنے لگا تھا۔ پہلی ای میل بہت دن پہلے جا چکی تھی پہلا سندیسہ بہت پہلے اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے سینے سے دبی دبی سانس خارج ہوئی۔ دوسرا سندیسہ بھیجنے کے لئے پہلے والے سے زیادہ ہمت درکار تھی۔ پہلے والے میں دین تھا اور دنیا بھی تھی جبکہ دوسرے حصے میں یہ دونوں باہم ضم ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے لیپ ٹاپ کی جانب دیکھا تھا۔

"عہد الست" اس کی زندگی بھر کا خلاصہ تھا۔

"عہد الست ہر انسان کی زندگی کا خلاصہ ہے" اس نے آخری جملہ لکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں بلس گرانٹ۔۔۔ میری زندگی کا چالیسواں سال۔

" آپ بے مثال ہیں، باکمال ہیں۔ آپکی انگلیاں جادو کرنا جانتی ہیں" یہ مسٹر آرتھر تھے جنھوں نے میرا پہلا ناول شائع کرنے سے انکار کیا تھا یہی مسٹر آرتھر ڈرنک کا گلاس لئے میرے سامنے کھڑے کہہ رہے تھے۔ میں پیشہ ورانہ انداز میں سر جھکا کر مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کی مجھے اب بخوبی عادت ہو گئی تھی۔ ناپسندیدہ لوگوں سے کس طرح ملنا ہے یہ مجھے اچھی طرح آتا تھا۔ میں انہیں وہاں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ میرے مداحین کا ایک مجمع تھا۔ کچھ یونیورسٹی طلباء میری سمت چلے آئے۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنا گلاس تھما دیا۔ مجھے آٹو گرافس دینے کا پرانا تجربہ تھا میرا قلم تیزی سے نیک تمناؤں کے پیغامات لکھنے لگا۔ ایک احساسِ تفاخر تھا جو میری گردن کے زاویے کو نوے سے نیچے نہیں آنے دیتا تھا اور آنے دیتا بھی کیوں۔ میں ناکامی کے بوجھ تلے دبا اب پہلے والا بلی نہیں تھا۔ میں اب ایک مشہور و معروف ناول نگار تھا، محقق تھا نقاد تھا۔ میری ہر کتاب بیسٹ سیلر تھی۔ مجھے ہر جگہ ہاتھوں

ہاتھ لیا جاتا تھا۔ میرے مقالے اخباروں میں چھپتے تھے۔ میں اعزازی لیکچر دیتا تھا۔ ٹی وی شوز میں شرکت کرتا تھا اور فلموں کے اسکرپٹ لکھتا تھا۔ وہ بلی جو بیس سال کی عمر میں اپنی ناکامیوں کی گٹھڑی اپنی پشت پر لادے خوار ہوا پھرتا تھا، میرے اندر ہی کہیں پگھل پگھل کر ختم ہو گیا تھا۔ اب میں بلس گرانٹ تھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ منتظر رہتے تھے۔ جس کے قلم سے لفظ نکلتے تھے تو تہلکہ مچ جاتا تھا۔ میں نے یہاں تک کا سفر بہت تیزی سے طے کیا تھا۔

میرے پہلے ناول نے ایسی دھوم مچائی تھی کہ سب تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ بیسٹ سیلر ثابت ہوا تھا۔ تمام اخبارات کے ادبی صفحے پر اس ناول کے تذکرے ہوئے تھے۔ نقادوں نے اسے ایک اچھوتی اور انوکھی کاوش قرار دیا تھا۔ میرا ناول سال کا بہترین ناول قرار پایا تھا۔ اس سال مجھے بیسٹ ٹیلنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس ناول کی اشاعت نے میرے حوصلے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اگلے دو سالوں میں میرا ایک اور ناول مارکیٹ میں آ گیا تھا اور اس ناول نے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ اس کی اشاعت سے مجھے بین الاقوامی سطح پر شہرت ملی کیونکہ اس ناول کا پرتگالی اور جرمن زبان میں ترجمہ بھی ہوا، چند سال بعد اس ناول کی کہانی پر فلم بھی بنائی گئی جو کافی مقبول ہوئی اس کے بعد میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا کوئی بھی نہیں دیکھا کرتا۔ جب آگے اتنا روشن راستہ ہو تو پیچھے کون دیکھتا ہے اور پیچھے تھا بھی کون جسے مڑ مڑ کر دیکھنے کی چاہ ہوتی۔ مسٹر ایرک کا انتقال ہو چکا تھا اور ڈوروتھی کی مجھے کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ عوف والے واقعہ کے بعد اس عورت سے میری نفرت مزید بڑھ گئی تھی۔ میں اس سے مکمل طور پر لاتعلق ہو گیا تھا۔ میں کئی سالوں سے اپنے آبائی گھر نہیں گیا تھا۔ میں مستقل بنیادوں پر لندن رہائش اختیار کر چکا تھا۔ میں ایک مطمئن خوش باش شخص تھا۔ ایک مکمل، کامیاب شخص۔۔۔ ایک ایسا شخص جیسا ہونے کے میں نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔

"بلس گرانٹ" میرا نام پکارا گیا تھا۔ میرے نام کی پکار پر زوردار تالیاں بجی تھیں۔ یہ میری پسندیدہ موسیقی تھی یہ مجھے احساس دلاتی تھی کہ میں کون ہوں۔

"بلس گرانٹ۔۔۔ کائنات کے تسلسل کی اہم کڑی"



یہ سال 2000 کی بات تھی ان دنوں میں ایک فلم کے سکرپٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس کے موضوع کو میں نے ابھی تک پبلک نہیں کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی بھی میرے ناولز کی کہانیوں کی طرح بہت سنسنی خیز تھی۔ یہ ایک روسی خاندان کی کہانی تھی جس کا سربراہ روسی خفیہ ایجنسی کے جی بی کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔

اس شخص نے روسی حکومت کی کرپشن سے تنگ آ کر تمام تر کرپشن اسکینڈلز پبلک کر دیے تھے جس کی بناء پر اسے خدشہ تھا کہ اسے سیاسی قتل کر دیا جائیگا۔ اس لئے یہ شخص اب اپنے خاندان کے ہمراہ برمنگھم میں رہتا تھا اور سیاسی اسائلم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس شخص کو پلونیم چائے کے کپ میں ڈال کر پلا دیا گیا تھا جس سے وہ سسک سسک کر مر گیا تھا۔ اس کی اہلیہ اور بچہ بھی متاثر ہونے کے خدشے کے بناء پر سخت نگرانی میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ یہ ایک ظالمانہ اقدام تھا جس کی ہر سطح پر مذمت کی گئی تھی۔ سیاسی ایوانوں میں بھی اس واقعے کے چرچے رہے تھے۔ میں اسی کی کہانی پر کام کر رہا تھا۔

اس شخص کی بیوہ مسز لیتھووسکی برمنگھم میں رہتی تھیں سو میرے سیکرٹری نے ان کے ساتھ میری خصوصی ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے روسی زبان کی ذرا سمجھ بوجھ نہیں تھی لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ مسز لیتھووسکی کے پاس مترجم کی سہولت موجود تھی۔ میں وقتِ مقررہ پر ان کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔

"خوش آمدید سر۔۔ ہمیں آپکا ہی انتظار تھا۔ مسز لیتھووسکی بے چینی سے آپ کی منتظر ہیں۔۔۔ تشریف لائیے"

آواز تھی یا شدید جھٹکا۔ میں نے چونک کر سامنے والے کا چہرہ دیکھا۔ سادہ سے لباس میں اس سے بھی زیادہ سادہ چہرہ لئے وہ بھوری عورت جس کی آواز جس قدر مانوس تھی چہرہ انتہائی اجنبی۔ میں نے ایک کے بعد ایک دوسری اور تیسری گہری نظر ڈالی۔ اس چہرے میں اس وجود میں کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا جو مانوس لگتا لیکن دل یکدم ایسے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی برسوں پرانا شناسا دیکھ لیا ہو۔

"نیا" میرے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

☆ ☆ ☆

"روسی حکومت اقتدار کے نشے میں انسانیت کے سب اسباق بھول چکی ہے۔ بربریت کے ایسے ایسے قصے دفن ہیں میرے سینے میں کہ سنانے لگوں تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ روسی حکومت نے میرے شوہر کو قتل کروایا ہے تاکہ وہ ان کی کرپشن کی داستان دنیا کو نا سنا سکیں لیکن میں ابھی زندہ ہوں اور میں چپ نہیں رہونگی میں دنیا کو بتا کر رہونگی کہ روسی حکومت کیسے انکی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے اور مجھے اپنے اس عزم کو پورا کرنے کے لئے آپ جیسے معتبر، مدبر لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپ بہت قیمتی بہت بڑے لکھاری ہیں۔ میں نے آپکی بہت تعریفیں سنی ہیں۔ آپ انگریزی زبان کا سرمایہ ہیں"

نیا مسز لیتھووسکی کے روسی زبان میں بولے گئے جملوں کو وقفے وقفے سے انگلش میں ترجمہ کر کے مجھے بتا رہی تھی۔ انہوں نے میری تعریف میں جو جملے بولے تھے انہیں ترجمہ کرتے ہوئے نیا کے چہرے کے تاثرات مزید سپاٹ اور مصنوعی ہو گئے۔

"تم اتنے برے منہ کیوں بنا رہی ہو۔ یہ میری تعریف میں جو بھی کہہ رہی ہیں کم کہہ رہی ہیں۔ میں اتنے مختصر لفظوں کا مستحق نہیں ہوں۔۔ میں کہیں بہت آگے کی چیز ہوں" میں نے جتایا تھا۔ میری گردن مزید اکڑ گئی تھی۔ اسکی بیچاری سی حالت دیکھ کر دل کو جو تسکین حاصل ہو رہی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے میری بات سن کر مزید برا سا منہ بنایا۔ مسز لیتھووسکی خاموش ہو کر سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"تم اگر کم بولو اور اپنی تعریف سے زیادہ اپنے کام پر دھیان دو تو مزید آگے جا سکتے ہو" اس نے منہ بھینچ کر مجھے کہا پھر مسز لیتھووسکی کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے روسی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ مسز لیتھووسکی گردن ہلاتے ہوئے اسکی بات سنتی رہیں پھر چند لمحوں بعد میں نے انکی ملازمہ کو آئس کیوب لاتے دیکھا۔ نیا نے میرے ڈرنک والے گلاس میں کیوبز ڈال دی تھیں۔ مسز لیتھووسکی پھر سے اپنی زبان میں کچھ بولنے لگیں۔

"اپنی مادام کو کم بولنے کا مشورہ کبھی نہیں دیا تم نے۔۔۔۔ دینا چاہیے تھا"

مسز لیتھووسکی کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے انگلش میں نیا سے کہا اور دیکھتا سامنے کی جانب ہی رہا۔ مسز لیتھووسکی خاموش ہو کر منتظر نگاہوں سے نیا کو دیکھنے لگیں۔ نیا جزبز ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے گدگدی ہوئی۔

"وہ پہلے ہی کافی کم گو ہیں۔ انہیں اس لئے زیادہ بولنا پڑ رہا ہے کیوں کہ تم انکی باتوں کو توجہ سے نہیں سن رہے۔ تمہارا درمیان میں بار بار بولنا انکی گفتگو میں خلل کا باعث بن رہا ہے۔ تم جب بھی ٹوکتے ہو وہ سمجھتی ہیں کہ تم ان سے کچھ پوچھ رہے ہو" اس نے دبے ہوئے لہجے میں چبا چبا کر کہا تھا مگر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کو غائب نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے مزید گدگدی محسوس ہوئی۔ دل چاہا اسے مزید چڑاؤں۔ میں نے اپنے تجربے سے سیکھا تھا کہ ادھیڑ عمر ہو کر انسان مزید نوعمر ہو جاتا ہے۔

یہ سب ابھی ابھی کہا ہے انہوں نے تم سے؟" میں نے سوال برائے سوال کیا تھا۔

"نہیں ابھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ تم بخوشی وائن انجوائے کرو، وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لئے چند لمحے انتظار کر سکتی ہیں" وہ مسز لیتھووسکی کی جانب دیکھتے ہوئے عاجزانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"میں نے وائن کی بات نہیں کی۔۔۔۔ مجھے یہ نہیں چاہیئے" میں نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ اسے چڑانے میں مزا آرہا تھا۔

"وائن کے لئے میں نے کہا تھا۔ تم جس طرح مجھے ٹوک رہے ہو۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھنے لگتی ہیں۔ میں انکو کیا کہوں کہ تم بار بار مجھ سے کیا کہتے ہو۔ اس لئے میں نے کہا کہ تم انکی بات سن کر رنجیدہ ہو اور اپنا گلا تر کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔ سمجھے" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔ تمہیں غلط بیانی نہیں کرنی چاہیئے تھی" میں نے قطعیت سے کہا تھا اور گلاس دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ مسز لیتھووسکی نے استفہامیہ انداز میں ثیا کا چہرہ دیکھا۔ وہ مکمل طور پر میری جانب متوجہ ہو چکی تھی اور اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر محنت کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ اکتاہٹ کا شکار تھی اور یہ اسکے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا۔ جبکہ مسز لیتھووسکی لاچاری سے ہمیں دیکھتے ہوئے صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"میں نے غلطی کر لی ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں۔ تم اب کیا چاہتے ہو میں اس سامنے والی دیوار سے اپنا سر دے ماروں۔" وہ واقعی بے حد زچ ہو چکی تھی۔

"یہ غضب نا کرنا۔۔۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا مضبوط دل نہیں ہے میرا" میں نے سہمنے کی اداکاری کی۔

"کہیں میں تمہاری بات کا یقین کر ہی نا لوں۔۔۔" وہ کھا جانے والے انداز میں غرائی تھی۔

یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا۔ میں نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی تھی۔ گفتگو کو اس رخ پر میں نے ارادتاً نہیں موڑا تھا۔ مسز لیتھووسکی نے ثیا کا انداز دیکھ کر مداخلت کی تھی۔ وہ پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے انہیں اپنی زبان میں ثیا سے کچھ پوچھتے دیکھا اور سنا بھی۔

"اب ان کو کیا جواب دوں میں" وہ ساتھ انداز میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے زعم بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے گہری سانس بھری۔

"تم ان کو کہو کہ یہاں نزدیک میں ایک اچھا کافی شاپ ہے اور میں تمہیں وہاں لے جانا چاہتا ہوں۔۔۔ اجازت ہے؟"

☆ ☆ ☆

"جنون کسی بھی شکل میں ہو، اگر وہ انسان کے اختیار میں نہیں ہیں تو پھر وہ پہلے بہکاتا ہے اور پھر بھٹکا دیتا ہے" ثیا نے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ یہ ہماری چوتھی ملاقات تھی اور میرے بے حد اصرار پر وہ اپنے حالات زندگی بتانے پر رضامند ہوئی تھی۔

"میں نے زندگی میں یہی سیکھا ہے کہ کبھی اپنے جنون کے حصول میں اس مقام تک نا آؤ کہ اپنا مقام ملنا مشکل ہو جائے۔ میرا ہنر میرا رقص تھا اور ہنر کسی بھی شکل میں ہو اگر اسے ستائش کی لت لگ جائے تو پھر اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی لت لگ گئی تھی کہ جب میں اپنا ہنر آزماؤں تو دنیا سر جھکا کر واہ واہ کرے اور مجھے دیوی سمجھے۔ ہمارے دھرم میں اچھی رقاصہ دیوی ہی ہوتی ہے اور ایسا سمجھا جاتا ہے کہ رقص میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ رقص کی دیوی انسان کے بدن میں حلول کر جاتی ہے اور وہ مقام رقص کرنے والے کو مکمل کر دیتا ہے اس مقام پر انسان کو سرور حاصل ہوتا ہے، اتنا سرور کہ انسان ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ وہ زمین سے اونچا ہو جاتا ہے اسے اپنی اوقات بھولنے لگتی ہے اور انسان جب اپنی اوقات بھول جاتا ہے تو پھر خدا اسے کم کے مقام پر راضی نہیں ہوتا۔ ایسا رقص کرتی تھی میں۔ میں جب رقص کرتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ دنیا میری ٹھوکر کی زد پر آگئی ہے اور زمین سورج کے گرد نہیں میرے گرد چکر لگاتی ہے۔ مجھے نظر آتا تھا کہ جب میں رقص کرتی ہوں تو میرے سامنے بیٹھے لوگ مسحور ہونے لگتے تھے۔ انکی آنکھوں میں میرے لئے جو رنگ اتر آتے تھے نا میں انکا نشہ بیان نہیں کر سکتی۔ میں سمجھتی ہوں رقص صرف ہنر نہیں ہے یہ ایک علم ہے۔۔۔ اپنے سامنے موجود دوسرے انسانوں کے حواسوں کو ٹیلی پیتھی یا ہپناٹزم کی طرح اپنے قابو میں کر لینے کا علم ہے۔ میں اپنے آپکو جادوگرنی سمجھتی تھی میں رقص کرتی تھی تو میرے سامنے بیٹھے انسان مدہوش ہونے لگتے تھے، انکے حواس قائم نہیں رہتے تھے۔ وہ بے قابو ہونے لگتے تھے میں نے انسانوں کو اپنے قدموں میں جھکتے، جانوروں کی طرح لوٹتے دیکھا ہے۔ مجھے انسان کا جھکا ہوا سر اچھا لگتا تھا۔ بد بخت ہوتا ہے وہ انسان جسے دوسرے انسانوں کا جھکا ہوا سر دیکھ کر لذت حاصل ہونے لگے۔ میں "بد بخت" ہو رہی تھی اور مجھے خبر نہیں تھی شاید اسی طرح زندگی گزرتی چلی جاتی اگر مجھے رمیش نا مل جاتا۔"

وہ اور میری سانس ایک ساتھ لمحہ بھر کے لئے رکی۔

اس کی زندگی میں "کوئی" تھا یہ خیال نجانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے کرسی پر اپنی نشست درست کر کے بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ سے ہٹالی تھی۔ ساتھ والی میز پر ایک ماں اپنے روتے ہوئے بچے کو چپ کروانے میں مگن تھی۔ وہ مسلسل کسی بات کے لئے ضد کر کے اودھم مچا رہا تھا۔ لیکن ٹیا کو اس کے شور و غل نے بھی اس کے ماضی سے حال میں نہیں کھینچا تھا۔

"رمیش کے بعد کیا ہوا؟" میں نے اسے بولنے کے لئے اکسایا۔ میں رمیش سے آگے کے واقعات سننا چاہتا تھا۔

"رمیش بہت بڑا فنکار تھا" وہ ابھی بھی ساتھ انداز میں بولی تھی۔ میں نے برداشت کرنے کے لئے گہری سانس بھری۔ مجھے رمیش میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"اس کی میری ملاقات یہیں لندن میں ہوئی تھی۔ وہ میرا ہم وطن تھا، ہم زبان ہم مذہب تھا۔ اسے میرے رقص سے عشق تھا۔ میں جب بھی کہیں رقص کرتی کسی پروگرام میں حصہ لیتی وہ میرے ساتھ ہوتا، میری معاونت کرتا، وہ مجھے سراہتا نہیں تھا، بلکہ وہ میری پرستش کرتا تھا اور یہ بات مجھ پر نشہ طاری کر دیتی۔ یہ رمیش تھا جس نے میری تعریفوں میں ایسے ایسے قلابے ملائے کہ میں مزید بہکنے لگی۔ میں واقعی خود کو کسی دیوی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے آگے دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔ مجھے اپنے ماں باپ اپنے اس ہنر کے آگے غیر اہم لگتے تھے۔ مجھے یاد ہے میری ماں میرے آگے ہاتھ جوڑتی تھی کہ گھر پلٹ آؤ اور میں کہتی تھی "ماں خدا چار دیواری میں نہیں رہ سکتا، دنیا کو میرا فیض حاصل کرنے دو۔" میں اپنے آپکو بھگوان سے کم نہیں سمجھتی تھی۔

تمہیں پتا ہے، ہمارے دھرم میں ہم جسے خدا سمجھتے ہیں اسے مٹی سے خود تخلیق کرتے ہیں اور میں اتنی خود پرست تھی کہ میں نے کبھی دل سے اس پتھر کو خدا نہیں سمجھا تھا بلکہ میں اپنے آپ کی پرستش میں مبتلا تھی۔ میرا جنون مجھے کھانے لگا تھا اور مجھے اس کی خبر نہیں تھی 1990 میں رمیش مجھے روس لے گیا۔ وہ کہتا تھا وہاں اسکا بہت بڑا کاروبار ہے۔ وہ ان چند ہندوستانیوں میں سے تھا جو روس میں کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ وہاں واقعی اسکا بہت بڑا کاروبار تھا، اتنا بڑا کہ میرا جنون چھوٹا پڑنے لگا۔ وہ لڑکیوں کو برہنہ کر کے اپنے ہوٹل میں نچواتا تھا اور کماتا تھا۔ یہ بات جب مجھے پتا چلی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں پوری طرح اس کے قابو میں آ چکی تھی۔ روس میں دو چیزوں کی بہتات ہے، ایک عورت دوسرا عورت کا حسن۔ خوبصورت اتنی کہ پریشان کر دے اور سستی اتنی کہ پشیمان کر دے۔ روس میں جتنی ارزاں میں نے عورت دیکھی اتنی ارزاں تو منہ کی رال بھی نہیں ہوتی جسے انسان اگالدان میں بنا سوچے سمجھے پھینک دیتا ہے۔ روس میں عورت اس سے بھی گزری تھی اور پھر میں تو ایک بھوری قیدی عورت تھی جو اپنے جگت کی قید میں تھی۔ اس نے مجھے تشدد کر کے اپنے ہوٹل میں برہنہ رقص پر مجبور کرنا شروع کر دیا عورت کی اس سے بڑی تذلیل کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے بدن کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کرنے کے لئے مجبور کیا جانے لگے۔ میں نے اسکی بات ماننے سے انکار کیا تو وہ مجھ پر تشدد کرنے لگا اور تب بھی بات نا بنی تو مجھے برہنہ باتھ روم میں بند کر دیا جانے لگا۔ روس میں اتنی سردی پڑتی ہے کہ لباس کے ساتھ بھی انسان ٹھٹھرتا رہتا ہے اور وہ میرے جسم پے لباس بھی نا رہنے دیتے تھے اور پھر مجھے انکی رضا کے آگے سر جھکانا پڑا۔ میں رقص کو اپنا جنون سمجھتی تھی پھر میرے رقص نے مجھے اپنا جنون بنا لیا اور جنون انسان کو تھکا دیتا ہے۔ میں تھکنے لگی اور پھر میں نے دعائیں مانگنا شروع کیں کہ اے دنیا کے بنانے والے تو پتھر کا نہیں ہو سکتا کیونکہ تو اگر پتھر کا ہوتا تو میرے گھر کے کونے کونے میں تو تھا اور میری ماں ایک عرصے سے میری خاطر تجھے پکار رہی ہے تو اگر پتھر کا ہوتا تو میری ماں کی دعا سن کر مجھے بھٹکنے سے بچا چکا ہوتا اس لئے تو پتھر کا نہیں ہے اور اگر پتھر کا نہیں ہے تو میری عرض سن لے، ایک عورت کو اس تذلیل سے بچا لے اور تب ایک روز میری پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں اب رقص نہیں کر سکتی تھی۔ رمیش نے مجھے کچرے کی طرح اپنی زندگی سے باہر پھینک دیا اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ انسان کچرا بن کر بھی خوش ہو سکتا ہے۔ میں اب کچرا ہی ہوں اور مجھے انسان کی حقیقت سمجھ میں آ گئی ہے۔ وہ رکی تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا اور اس کے ہونٹوں پر آسودگی والی مسکراہٹ تھی۔

"انسان کی فطرت میں سربسجودگی ہے، وہ کائنات کی قوتوں کے آگے جھک کر سکون حاصل کرتا ہے یہ سکون اسے آگ کی طرح بھڑکا کر جھاگ کی طرح بٹھاتا ہے اور خاک بنا دیتا ہے اور خاک آپکو آپکی اوقات بھولنے نہیں دیتی۔ وہ آپکو مٹی پر کھڑے رہنا کا حوصلہ دیتی ہے لیکن وہ آگ جو آپکو خاک نا بنا سکے وہ آپکو جلا کر بھسم کر دیتی ہے اور پھر وہ مقام آجاتا ہے جب انسان اپنے جنون کا غلام بن جاتا ہے اور جو اپنے جنون کے آگے جھکتا ہے تو پھر وہ بہک جاتا ہے بھٹک جاتا ہے اور بھٹکا ہوا انسان کائنات کے تسلسل کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔" اس نے بات ختم کی تھی اور میں جیسے شل کر رہ گیا تھا۔

"کائنات کا تسلسل؟" میں نے دوہرایا تھا۔ کیا میں پہلے بھی اس کے بارے میں کچھ سن چکا تھا، میں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یاد نہیں آیا تھا۔۔۔

☆ ☆ ☆

"مجھ سے شادی کرو گی" ہماری تیسری مڈ بھیڑ کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد کی بات ہے کہ میں نے بالا آخر نیا کو پرپوز کر دیا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا تھا لیکن یہ فیصلہ میں نے کیوں کیا تھا اس کی مجھے خود بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے تیسری بار اس سے راہ و رسم اس لئے بڑھائی تھی کہ میں اسے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ میں اس پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے دھتکار کر اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کی تھی۔ میں اس کو جتانا چاہتا تھا کہ اسکی زندگی مجھے چھوڑ دینے کی وجہ سے اتنی قابل ترس ہوئی تھی۔ وہ واقعی کسی حد تک قابل ترس ہو چکی تھی۔ اسکا حلیہ چال ڈھال سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس کی چال ایک پرانے فریکچر کی وجہ سے غیر متوازن تھی۔ میرے پاس ایک سے بڑھ کر ایک بہانہ تھا جو اس پر میری شخصیت اور میری کامیابیوں کا رعب ڈال کر اسے میرے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں جتنا اس سے راہ و رسم بڑھاتا چلا گیا اتنا ہی اس سے مرعوب ہوتا چلا گیا۔ وہ ظاہری طور پر بے شک قابل رشک نہیں رہی تھی لیکن اتنا مالا مال باطن بھی اپنے اردگرد رہنے والی کسی اور عورت میں نہیں نظر آیا تھا مجھے۔ اس نے میرے پراجیکٹ میں میری مدد کی تھی اور اس دوران میں ہفتے میں دو تین بار اس سے ملتا تھا۔ وہ ایک لاپرواہ لاابالی لڑکی سے ایک ذمہ دار احساس کرنے والی عورت کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا شادی کا فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا۔ یہ قدرت کا فیصلہ تھا۔ ہم خود بخود ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگنے لگا۔ میں چالیس سال کا تو ہو چکا تھا، کامیاب تھا اور کسی مستقل ساتھی کی ہمراہی کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور مجھے نیا مل گئی تھی۔

"نہیں" اس نے میری توقع کے برخلاف لمحے بھر میں انکار کر دیا۔ میری انا پر کاری ضرب تو لگی مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ پہلی دفعہ تو ہوا نہیں تھا۔ میرا دل توڑنے میں نیا ڈگری ہولڈر تھی۔ ہم دونوں ایک کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔

"اتنی جلدی انکار مت کرو۔۔۔ کچھ دن بعد سوچ کر جواب دے دینا"

میں نے کافی کے مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے اپنی دلی کیفیت چھپا کر کہا تھا۔ اس نے مگ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ تم سے شادی کے بارے میں سوچا جائے" اس نے سپ بھرا اور اطمینان سے اگلا سوال داغا۔ میں نے انگلی پر لگ جانے والی کافی کو زبان سے صاف کیا اور کرسی پر ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"میں محبت کرتا ہوں تم سے" میں نے زور دے کر کہا تھا۔ اس نے گردن ہلائی تھی۔

"کیا شادی کے لئے یہ ایک وجہ کافی ہوتی ہے" اس نے پھر کپ تھام لیا تھا۔

"میں اگر کالج میں پڑھنے والا بیس سال کا نوجوان ہوتا تو اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیتا مگر میں بیس سال سے چند سال آگے نکل گیا ہوں" میں نے اطمینان سے کہا تھا اگر یہ معاملہ بحث کے ذریعے ہی حل ہونا تھا تو پھر میری کامیابی یقینی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی اور غائب ہو گئی۔

"مجھے "محبت" سے نفرت ہے بل۔۔۔ یہ انسانیت کا استحصال کرنے کا مہذب طریقہ ہے۔ مجھے محبت کی رنگین تتلی کے پروں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے یہ حرافہ لگتی ہے" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"تیا میں محبت کا دعویٰ نہیں کرتا۔۔۔لیکن تمہیں بحیثیت عورت مجھ سے جو بھی چاہیے ہو گا میں تمہیں وہ ضرور فراہم کروں گا۔۔۔پھر وہ محبت ہو دولت یا عزت۔۔۔" میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے عورت کو کیا چاہیے ہوتا ہے مرد سے" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"محبت۔۔۔میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ ہر عورت محبت ہی کا مطالبہ کرتی ہے" میں نے ہونٹ بھینچے تھے۔

"محبت نہیں۔۔۔اہمیت۔۔۔۔۔۔عورت اہمیت چاہتی ہے اور محبت اہمیت نہ دے سکے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی" وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔

"اہمیت کیا ہے" میں اس کی بات پر حیران ہو گیا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔۔۔میں تو خود اسکی تلاش میں ہوں" وہ بے بس نظر آئی۔

"آؤ پھر اسکو مل کر تلاش کر لیتے ہیں" میں نے کہا تھا۔ تیا پرسوچ انداز میں میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

2002 میں تیا نے اور میں نے باقاعدہ شادی کر لی۔ اس شادی کے لئے ہم دو سال سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ دو سال میں ہم ایک دوسرے کو مزید اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور اپنے آپ کو اس رشتے کو ذمہ داری سے نبھانے کے لئے حقیقتاً طور پر تیار تھے۔ تیا کے ساتھ میرا تعلق دنیا کا عجیب ترین تعلق تھا۔ میں اس کے لئے اپنے دل میں کونسا جذبہ محسوس کرتا تھا یہ بات مجھے کبھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن یہ بات طے تھی کہ اس کو دوبارہ مل لینے کے بعد ہمیشہ میرا دل اس کے دور جانے کے خیال سے ڈر جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہماری شادی کی تقریب بے حد سادہ تھی جس میں بہت خاص اور قریبی لوگوں کے علاوہ کوئی مدعو نہیں تھا۔ تیا ہال میں سامنے کھڑی ویڈنگ اسپیچ کر رہی تھی۔ اس نے سرخ اور سفید امتزاج کا لباس پہن رکھا تھا اور میرا دل اس کو اپنی نصف بہتر کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن تھا۔

"بل گرانٹ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ زندگی میں اگر کبھی میں نے شادی کی تو ایسے ہی شخص سے کروں گی اس لئے نہیں کہ مجھے اس سے محبت تھی بلکہ اس لئے کہ یہ میرے سامنے ہمیشہ چپ کر جاتا تھا میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہ اچھا شوہر بن سکتا ہے" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں نے اپنا گلاس تھوڑا سا اونچا کر کے اپنے احباب کی مسکراہٹوں کا جواب دیا۔

"ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے محبت کا دعویٰ نہیں کیا میں سوچتی ہوں کہ زندگی میں ایک ساتھ رہنے کے لئے محبت اتنی بھی اہم نہیں ہوتی اگر آپ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کی غلطیوں کا معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کی خامیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکتے ہیں تو آپ اچھے ہمسفر بن سکتے ہیں۔ بل نے میرے لئے رچمنڈ میں ایک خوبصورت گھر خریدا ہے۔ یہ عام بات نہیں ہوتی۔ مشرق کی عورت کے لئے گھر بہت بڑی بات ہوتی ہے اور میرے لئے یہ بات بہت معنی رکھتی ہے کہ جب مرد کسی عورت کے لئے گھر بناتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو عزت دے رہا ہے، وہ اسے اسکی زمین فراہم کر رہا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جو مرد عورت کو زمین دے سکتا ہے نا وہ

آسمان پر بھی اسکا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھے گا اور دنیا اور آخرت میں ہمیشہ اسکا ہو کر رہے گا۔ میرے لئے وفاداری بہت اہمیت رکھتی ہے اور میں سمجھتی ہوں میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ وفا نبھانے والا شخص نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ زمین پر جتنا میرا ہے آسمان پر بھی اتنا ہی میرا ہوگا۔ میں بل گرانٹ کی ممنون ہوں کہ اس نے مجھے اپنی نصف بہتر کے طور پر چنا۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہال میں بیٹھے لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں۔ میں نے اپنی انگلیاں چوم کر اسکی جانب اچھالی تھیں۔ مجھے وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگی۔ میرا سینہ فخر کے احساس سے بھر گیا تھا۔ مجھے لگا آج ثابت ہو گیا ہے کہ میں غدار نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم شہروز منور ہو" رضوان اکرم نے اسکی جانب دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔ شہروز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آؤ آؤ۔۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ بہت کام کے نوجوان ہو تم" انہوں نے اسے خوشگوار انداز میں اسے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ شہروز گویا ہوا کے رتھ پر سوار ہو کر ان کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ ایک مسرور کر دینے والی کیفیت نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ یہ اس کے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ باس کو اسکا نام یاد تھا اور وہ اسے سراہ بھی رہے تھے۔ اسے چینل جوائن کئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے اور اس کے کریڈٹ پہ چند ایک چھوٹے موٹے آرٹیکل اور ایک پروگرام کی معاونت کے علاوہ اور تھا ہی کیا۔ وہ تو ابھی چلنا سیکھ رہا تھا، اور برق رفتاری سے اڑنے والوں نے نا صرف اسے دیکھا تھا بلکہ پیار سے دیکھا تھا۔

"کافی لو گے" انہوں نے اسے درمیانی میز کی طرف آتا دیکھ کر پوچھا تھا۔ انکا اپنا دھیان سامنے پڑی فائلوں میں گم تھا۔ ان کی آنکھوں کا اشارہ بھانپ کر شہروز ان کی طرف جانے کی بجائے ایک جانب پڑے کاؤچ کی سمت آ گیا تھا، وہاں چھوٹی سی تپائی پر کافی کے لوازمات موجود تھے۔

"میرے لئے ود آؤٹ شوگر۔" وہ جب اپنی نشست سنبھال چکا تو وہ اسکی جانب لمحہ بھر کے لئے دیکھ کر بولے تھے پھر دوبارہ سے اپنے سامنے پڑے صفحات پلٹتے ہوئے بولے۔

"تم تو دو چمچ سے کم پر راضی ہونے والے نہیں ہو" شہروز نے انکی جانب حیرت سے دیکھا پھر مسکرایا۔ یہ بات تو سچ تھی۔ وہ چینی کے بغیر کافی پینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اسکی اس عادت کا سارے آفس کو پتا تھا۔ رضوان صاحب کسی قدر عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔

"آپکو کیسے پتا چلا کہ میں دو چمچ شوگر لیتا ہوں" اس نے مگ میں کافی انڈیلتے ہوئے پوچھا تھا۔ رضوان اکرم مسکرائے۔ شہروز نے بھی ہونٹوں کے زاویے کو مستقل مسکراہٹ پہ سیٹ کر لیا تھا۔ باس کا مزاج خوشگوار تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ باس کی مسکراہٹ محبوب کی مسکراہٹ کی طرح دل چیر دینے والی ہوتی ہے۔ شہروز نے اتنا ہلکا پھلکا خود کو پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے مستقل گدگدی ہو رہی تھی۔

"اتنی کڑوی کافی کوئی شوگر کے بغیر پی کیسے سکتا ہے۔۔۔ کوئی احمق ہی ہوگا" انہوں نے بالآخر فائلز بند کر دی تھیں پھر اس کے ساتھ کاؤچ پر آ بیٹھے۔

"مجھے ایسے مت دیکھو۔۔ میں احمق نہیں ہوں۔۔ صحافی ہوں۔۔ صحافت میں آنے سے پہلے میں کبھی کڑوی کافی نہیں پی سکتا تھا۔ یہ تو اس

ظالم جادوگرنی جیسی نوکری نے مجھے مٹھاس سے دور کر دیا ہے" انہوں نے ایک بازو کاؤچ کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔شہروز مسکرایا۔اسے لگتا تھا بس آج وہ یہی کرنے اس کمرے میں آیا ہے۔اس نے ان کے آگے مگ رکھا تھا۔کافی کے مگ سے دھواں ان کے چہرے کی جانب اڑنے لگا تھا۔

"اسموکنگ کرتے ہو؟" اب وہ سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال رہے تھے۔شہروز نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

"نو سر" وہ اپنے مگ میں کافی انڈیل رہا تھا۔اس کے بعد اس نے چینی دان اٹھانا چاہا تھا،اسے حیرت ہوئی تھی۔میز پر چینی موجود نہیں تھی۔رضوان اکرم نے سر ہلایا اور سگریٹ سلگا لی پھر دھواں سامنے کی جانب اچھال کر مزید بولے۔

"شادی کب کرو گے؟" اب کی بار اسے خفیف سا جھٹکا لگا۔یہ وہ موضوع تھا جس سے وہ چھپتا پھرتا تھا۔امی بھابھی پھپھو اور زارا کے بعد اب ڈیڈی نے بھی اسے کہہ دیا تھا کہ اس سال کے آخر میں وہ اپنی اس" ذمہ داری" سے فراغت چاہتے ہیں۔زارا کے پاپا کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ نے سب کو اس موضوع پر متحد کر دیا تھا اور اب باس بھی یہ بات کر رہے تھے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے سر کہ میری شادی ہوئی ہو" اس نے اپنی کیفیت چھپائی تھی۔

"میں پر یقین ہوں کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی"

آپ کو کیسے پتا میری شادی نہیں ہوئی؟" اس نے کافی کا مگ ہاتھ میں تھام لیا تھا۔چینی کے بغیر کافی پینے کا یہ اسکا پہلا تجربہ تھا۔

"سادہ سی بات ہے۔۔۔سگریٹ نہیں پیتے ہو۔۔۔اسکا مطلب تمہاری زندگی میں بیوی نام کی ٹینشن نہیں ہے۔آدمی بلا وجہ کنوئیں میں چھلانگ تھوڑی لگاتا ہے۔ہر بیوقوفی کے پیچھے ایک زیادہ بڑی بیوقوفی ہوتی ہے۔" انہوں نے سگریٹ اسے دکھاتے ہوئے ایک اور کش لگایا تھا اور دھوئیں کے مرغولے پھر شہروز کے آس پاس ناچنے لگے تھے۔

"کیا سوچا ہے زندگی کے بارے میں۔۔کیا کرنا چاہتے ہو۔۔۔رینگتے ہی رہنا ہے یا اڑنا بھی چاہتے ہو" وہ پہلے جس قدر عجلت میں لگتے تھے اب اتنے ہی پرسکون ہو کر بیٹھ گئے تھے جیسے کوئی کام نا ہو۔

"سر میں کینچوا نہیں ہوں۔۔۔اقبال کا شاہین رینگنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا" اس نے کافی کا سپ بھرا تھا اور پھر بدمزا ہو کر مگ کی جانب دیکھا تھا۔اسے کافی زیادہ پسند نہیں تھی اور چینی کے بغیر تو بالکل نہیں،اس کے باوجود وہ اسے برداشت کرنے کو تیار تھا۔باس کی تقلید کر کے وہ نجانے کیا ثابت کرنا چاہتا تھا۔ان کے آفس میں کافی بہت استعمال ہوتی تھی۔وہ زبردستی اپنے آپکو اس کا عادی بنا رہا تھا۔

"اسکا مطلب اڑنا چاہتے ہو۔۔۔اچھی بات ہے۔۔۔مجھے کیڑے مکوڑے پسند بھی نہیں ہیں۔۔۔انسان اپنے عوائم سے پہچانا جاتا ہے۔عوائم اونچے ہوں تو انسان بلندی پر پہنچ سکتا ہے اور بلندی سے دنیا بہت دلفریب،بہت خوبصورت لگتی ہے۔اتنی خوبصورت کہ اس کے سامنے محبوبہ کا چہرہ بھی پھیکا لگنے لگتا ہے۔"

انہوں نے سگریٹ اسکی جانب بڑھایا تھا۔اس نے تذبذب کے عالم میں اسے تھام لیا۔

"کش لگاؤ۔۔۔سوچ کیا رہے ہو۔۔۔صحافی کو جھکنا چاہیئے نا جھجکنا چاہیئے۔۔۔اپنے عوائم بلند رکھو اور ان عوائم کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن

کوشش کرو، ہر رکاوٹ عبور کرو اور ہر شخص کو پیچھے چھوڑ دو۔۔۔ وقت گزر جانے کے بعد پچھتانے کے لئے صرف لکیر رہ جاتی ہے اور لکیر پیٹنے والے کے ہاتھ کچھ نہیں آیا کرتا۔" انہوں نے کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا تھا اور با آسانی اسے اپنے اندر منتقل کر لیا تھا۔

شہروز نے چھوٹا سا کش لگایا اور اپنے منہ سے نکلنے والے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔ یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں تھا کہ اس نے کش لگایا تھا۔ دوستوں میں ہنسی مذاق میں ایک آدھا کش لگا ہی لیا کرتا تھا۔ اسے مشکل نہیں ہوئی تھی دھوئیں کو حلق میں اتارتے ہوئے، مشکل اسے انکی بات سمجھنے میں ہوئی تھی۔ کیا وہ اسے پر عزم نہیں سمجھتے تھے، کیا انہیں اسکی محنت میں کوئی کمی دکھائی دیتی تھی۔

"میں نے تمہارا آرٹیکل پڑھا تھا۔ اچھا ہے" وہ بغور اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شہروز مسکرایا لیکن اس مسکراہٹ میں جھینپتی ہوئی رنگینی تھی۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی رضوان اکرم اس کے منہ پر اس کے آرٹیکل کی بات کریں گے جبکہ وہ تو تعریف بھی کر رہے تھے۔ شہروز نے خود کو بہت مشکور و ممنون محسوس کیا۔ اس کے آرٹیکلز کو پہلے دن سے سراہا جا رہا تھا اور رضوان اکرم کے منہ سے تعریف سننا عام سی بات نہیں تھی۔ انکا تاثر ہی ایسا تھا۔ وہ سارے عالم میں مغرور اور خود سر لیکن بے باک اور نڈر مشہور تھے۔ انہیں ان کے موقف سے ہٹانا نا ممکن تھا۔ وہ شہروز کو سراہ رہے تھے تو یہ چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ چھوٹے موٹے ورکرز سے تو رک کر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ مسکرا کر بات کرنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ شہروز اگر آج ان کے آفس میں نا آیا ہوتا تو شاید اس کے لئے رضوان اکرم ایک مغرور باس ہی رہتے۔ اس کی گردن اکڑنے لگی تھی۔ اسے ستائش تو مل ہی رہی تھی، بہت سے لوگ سراہ رہے تھے مگر باس کا سراہنا کسی انرجی ڈرنک سے کم نہیں تھا۔ اس کے حواس معطر اور بشاش ہو رہے تھے۔

"تم میں ایک اسپارک ہے۔۔۔ تم بہت آگے جاؤ گے۔ تم میں اچھے صحافیوں والی ساری خصوصیات ہیں" وہ مزید کہہ رہے تھے۔ شہروز نے سر ہلایا۔ اس کی مسکراہٹ کوشش کے باوجود نہیں چھپ رہی تھی۔ یہ اسکی استطاعت سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اتنی تعریف سنبھالنے کی گنجائش نہیں تھی اس میں۔

"اچھا صحافی پتا کیسا ہوتا ہے؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"اچھا صحافی خوبانی کی طرح ہوتا ہے۔ باہر سے دیکھو تو نرم لگتا ہے اندر سے سخت گٹھلی کی طرح اور حقیقت میں گٹھلی کے اندر چھپے میٹھے بادام جیسا لذیذ۔۔۔ اچھا صحافی سچ کا علمبردار ہوتا ہے اور سچائی تلخ ہوتی ہے۔ یہ اچھے صحافی کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تلخی کو پی کر اس انداز سے پیش کرے کہ وہ اس کے پڑھنے والوں کے لئے قابل برداشت بن جائے۔ تلخی کو نرمی سے پیش کرنا ہی اصل گر کا کام ہے لیکن اس کے لئے اپنی نرمی برقرار رکھنی پڑتی ہے اور صرف ایک سچا صحافی ہی اس قدر بہادر ہو سکتا ہے کہ تلخ سچائی کو پی کر بھی اندر سے میٹھے بادام کی طرح اپنی لذت کو برقرار رکھ سکے۔" انہوں نے اپنے مگ سے آخری گھونٹ بھی تیزی سے اپنے اندر انڈیل لیا اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ شہروز نے انکی بات سنتے ہوئے پھر سر ہلایا تھا۔

"مجھے بادام پسند ہیں اور تمہارے اندر کا میٹھا بادام مجھے نظر آ رہا ہے" انہوں نے اپنے ہاتھ کی انگلی میں موجود قیمتی پتھر کی انگوٹھی کو ہلایا تھا۔

شہروز نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہ واقعی اس تعریف پر خود کو ممنون محسوس کر رہا تھا۔

"میرے ساتھ دبئی چلو گے؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ شہروز نے اپنے اندر فخر کی ایک نئی لہر محسوس کی۔ اس نے اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ دبئی

میں افغانستان کے حالات کو ڈسکس کرنے کے لئے جو کانفرنس اگلے مہینے متوقع تھی اس میں شرکت کے لئے اسکا نام لیا جا رہا ہے۔

جی سر۔کیوں نہیں۔۔۔یہ تو میرے لئے باعث اعزاز ہوگا" وہ مسکرا رہا تھا

☆ ☆ ☆

"کیسی ہو" اس نے فون ریسیو کیا تو شہروز کی چہکتی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"حیران پریشان ہوں ابھی تو۔۔۔سورج اور مشرق والا محاورہ یاد آرہا ہے" زارا نے گاڑی کا دروازہ لاک کر کے اندر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ایک ہاتھ سے فون کانوں سے لگائے دوسرے سے بیگ مل اوور اور اسٹیتھو اسکوپ پکڑے وہ واقعی حیران حیران ہاسپٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔یہ ایک پوش علاقے میں بنا ایک مہنگا ترین ہاسپٹل تھا۔چار بج رہے تھے اس لئے رش بالکل بھی نہیں تھا۔وہ ریسپشنسٹ کو ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنی آمد کی اطلاع دیتی کاریڈور کی جانب ہو گئی تھی۔

"محاوروں کو یاد کرنے سے اچھا ہے تم مجھے یاد کیا کرو۔" وہ کافی خوش لگ رہا تھا زارا کو اسکی آواز سے اندازہ ہوا تھا۔یہ شاید مہینوں بعد ہوا تھا کہ شہروز نے اسے خود کال کی تھی۔وہ یا تو کال ریسیو کرتا تھا یا کال بیک کرتا تھا۔

"تمہیں۔کبھی نہیں بھولتی میں۔۔۔تم سے میری انگیج مینٹ ہوئی ہے۔۔۔بھلا منگیتر کو کون بھولتا ہے" اس نے اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا۔

"زارا کی بچی کتنی باتیں کرنی آگئی ہیں تمہیں" وہ ہنس رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔تم باتیں لکھ لکھ کے صفحے کالے کرتے رہو اور ہم بات بھی نا کریں" اس نے اپنی سب چیزیں میز پر رکھ دیں۔معطر سا ماحول اور میٹھی سی آواز نے مزاج پر بڑا اچھا اثر ڈالا تھا۔وہ خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔

"تم نے میرا نیا کالم پڑھا۔۔۔کبھی کبھی پڑھ لیا کرو یار۔۔۔میں جانتا ہوں تمہیں ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے لیکن میری خاطر کبھی کبھی نظر ڈال لیا کرو۔۔۔بڑے بڑے لوگ سراہ رہے ہیں مجھے" وہ پر جوش ہوا تھا۔باس کے ساتھ کانفرنس اٹینڈ کرنے کا خیال ہی بہت خوش کن تھا۔زارا نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"میں پڑھونگی انشاءاللہ۔۔۔آجکل ذرا فرصت ہی نہیں ملتی اور مجھے پڑھے بغیر بھی اندازہ ہے کہ تم دنیا کے بیسٹ کالمسٹ ہو" وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ایسے اندازے پڑھے بغیر ہی لگائے جاتے ہیں۔ویسے اسے اردو میں اقربا پروری کہتے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"اسے محبت کہتے ہیں شہروز۔" زارا نے طمانیت سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھاااا۔۔ یعنی اب تمہیں محبت کی بھی سمجھ آنے لگی ہے" وہ چڑا رہا تھا۔

"ابھی ہی تو آنے لگی ہے" وہ بشاشت سے مسکرائی تھی،شہروز کو اس کے لہجے کی کھنک میں کچھ عجیب سے رنگ چھلکتے محسوس ہوئے۔

"واقعی۔۔۔مجھے بھی بھاڈ دینا پھر" وہ بولا تھا۔

"شہروز محبت باعث آزار نہیں ہوتی۔۔۔یہ خوشی ہوتی ہے، دل کا سکون ہوتی ہے۔ یہ "تم" ہوتے ہوئے "میں" ہوتی ہے۔ یہ "ہم" ہوتی ہے۔ تم خوش ہو مجھے کال کر رہے ہو، تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گئی ہوں اور آج میں "خوشی" تقسیم کرونگی۔ یہ محبت کی سادہ سی تعریف ہے کہ آپ جب اسے محسوس کریں تو آپ کا وجود روشنی بن جائے اور آپکے اردگرد سب انسان اس روشنی سے روشن ہو جائیں پھر یہ روشنی رکے نہیں بلکہ پھیلتی چلی جائے۔" وہ نرم سے لہجے میں بولی تھی۔ شہروز نے بے حد حیرانی سے اس کی بات کو سنا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا پھر اسے لفظ نہیں ملے تھے۔ یہ زارا تھی۔ یہ اسی کی زارا تھی۔ وہ واقعی حیران تھا۔

"آئی لو یو" وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔ یہ شاید دوسری دفعہ تھا کہ اس نے زارا کو یہ الفاظ کہے تھے لیکن حقیقت میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس نے اتنے جذب سے یہ لفظ کہے تھے۔ اسے سب بھول گیا تھا کہ اس نے زارا کو کیا بتانے کے لئے فون کیا تھا۔

"زارا کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کے ایک ایک ذرے نے کلمہ شکر ادا کیا تھا۔ اس نے شہروز کے لہجے کی صداقت کو پہلی بار پرکھا نہیں تھا۔ اسے پرکھے بغیر یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ وہ مطمئن تھی۔ اس نے ابھی خالص محبت کا پہلا سبق ہی ازبر کیا تھا اور اسکے مثبت رنگ نظر آنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں کھانا کس نے بنانا سکھایا تھا" عمر نے چیڈر چیز کرش کرنے کے لئے ریک سے پلیٹ اٹھائی تھی۔ امائمہ کا رخ برنر کی طرف تھا۔ وہ سبزیوں کو فرائنگ پین میں ڈالے چمچ سے ادھر ادھر ملا رہی تھی۔ اس کے ہر عضو پر سستی چھائی ہوئی تھی۔ امی کی آواز سن کر وہ اتنی افسردہ ہو گئی تھی کہ اس سے کوئی کام ہی نہیں کیا گیا تھا۔ روتے رہنے کے باعث آنکھیں بھی سوجی ہوئی لگتی تھیں۔ عمر کے واپس آنے سے کچھ دیر قبل ہی اس نے شاور لے کر فریش ہونے کی کوشش کی تھی اور اب وہ کچن میں کھڑی آملیٹ بنا رہی تھی۔ عمر بھی اسکے ساتھ کچن میں ہی آ گیا تھا اور اب اسکی مدد کروا رہا تھا۔

"امی نے ہی سکھایا تھا۔۔۔مائیں ہی سکھاتی ہیں ایسے کام" اس نے سبز پیاز کے رنگ کو سنہرے رنگ میں تبدیل ہوتے دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔ چمچ جس مقام پر تھا وہاں سے ہلا کر نہ دیا۔

"ارے نہیں، میرے تو ڈیڈ نے سکھایا تھا مجھے۔۔۔وہ بہت اچھا کھانا بنا لیتے ہیں۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا نا تو ممی ایک بوتیک پہ جاب کیا کرتی تھیں اور اکثر لیٹ ہو جایا کرتی تھیں تو ابو ہمارے لئے ڈنر تیار کیا کرتے تھے۔"

عمر اپنے کام میں منہمک بول رہا تھا۔

"میں چونکہ سب میں بڑا تھا اس لئے ابو کی مدد کیا کرتا تھا۔ ان کو دیکھ دیکھ کر کافی کچھ خود ہی بنانا آ گیا تھا۔ ابو سینڈوچ کی فلنگ بناتے میں تب تک بریڈ پر مایونیز، کیچپ لگا لیتا۔ وہ کیک مکس سے کیک بناتے تو میں دودھ انڈے پھینٹ کر پڈنگ بنا چکا ہوتا" عمر فخریہ لہجے میں بتا رہا تھا۔ وہ واقعی ایسی چیزیں بنانے میں ماہر تھا۔ امائمہ نے بے دلی سے سر ہلایا۔

سبز پیاز۔ سبز مٹر اور سبز دھنیا، سب ہلکے سنہرے سے گہرے سنہرے رنگ میں ڈھل رہے تھے۔

"یہ تو آسان آسان کھانے ہیں عمر" اس نے بات برائے بات کی تھی تا کہ عمر اس کی عدم توجہی پر ٹوک نا دے۔

"ارے تو تم کیا سننا چاہتی ہو میرے ابو بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد گھر آ کر بریانیاں دم دیا کرتے تھے، حلیم گھوٹا کرتے تھے۔۔۔ میں تو انکو کہا کرتا تھا کہ کچھ مت کریں ہم کارن فلیکس کھا لیں گے یا بریڈ جیم چیز وغیرہ مگر ابو پھر بھی کچھ نا کچھ بنا دیتے تھے۔ تم سوچو ذرا کتنی سخت ڈیوٹی ہوتی تھی، پھر آ کر کچن میں کھڑے ہونا آسان نہیں ہوتا" وہ جتا کر بولا تھا۔ امائمہ نے فرائنگ پین سے نظر ہٹائی پھر گہری ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"تم بہت محبت کرتے ہو نا اپنے ابو سے" اس نے اتنی یاسیت خود بھی شاید اپنے لہجے میں پہلی دفعہ محسوس کی تھی۔ امی کا گلوگیر لہجہ پھر یاد آ گیا تھا۔ فرائنگ پین میں موجود سبز پیاز، سبز مٹر اور سبز دھنیا، سب ہلکے سنہرے سے گہرے سنہرے رنگ میں ڈھل رہے تھے۔

"یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔۔۔ تم نہیں کرتی اپنے ابو سے محبت" اس کی جانب دیکھے بنا اس نے سوال کیا تھا پھر باقی ماندہ چیز کو باکس میں رکھ کر فریج میں رکھنے کے لئے مڑا تھا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ فریج کے ساتھ ہی الیکٹرک کیتل پڑی تھی جس کا سوئچ ساکٹ میں لگا تھا۔ اس نے سلیب کی طرف مڑنے سے پہلے اسے آن کر دیا تھا سارے میں سبزیوں کے فرائی ہونے کی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

"کرتی ہوں۔۔۔ لیکن میں تو بیٹی ہوں۔۔۔ بیٹیاں تو باپ سے محبت کیا ہی کرتی ہیں" اس کی رو بہکی ہوئی تھی۔ سبزیاں تیزی سے بھوری ہو رہی تھیں۔

"بیٹے بھی محبت کرتے ہیں یار۔۔۔ تمہیں نا جانے یہ غلط فہمی کیوں رہتی ہے کہ میں اپنے ابو سے محبت نہیں کرتا۔ تم اکثر ایسے سوالات کرتی رہتی ہو" وہ اسکے قریب آ گیا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے چمچ پکڑ لیا تھا پھر سبزیوں کا رنگ دیکھ کر عجلت میں باؤل اٹھایا تھا جس میں اسی نے کچھ دیر پہلے انڈے پھینٹے تھے۔ امائمہ ایک طرف ہو گئی تھی پھر اسکی جانب سے پشت کر کے سامنے دیکھنے لگی۔

"سب بیٹے اپنے ابو سے محبت کرتے ہیں عمر؟" آنسوؤں کو گھرک کر اپنی حدود میں رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ عمر چونک کر اسکی طرف دیکھنے لگا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ عمر سے اسکا بجھا ہوا انداز مخفی رہ پاتا۔

"امی۔۔۔ یو او کے۔۔۔ کچھ گڑبڑ ہے کیا۔۔۔ طبیعت زیادہ خراب ہے۔۔۔" امائمہ سنبھلی تھی پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بہ عجلت بولی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ ٹھیک ہوں میں۔۔۔ یونہی پوچھ لیا تھا" وہ کیبن سے مگ نکالنے لگی تھی۔ عمر نے فرائنگ پین سے براہ راست تھوڑا سا آملیٹ اٹھا کر منہ میں رکھا تھا پھر مطمئن ہو کر چولہا بند کرتے ہوئے بولا۔

"آف کورس یار بیٹے بھی بہت محبت کرتے ہیں اپنے ڈیڈز سے۔۔۔ دراصل تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے نا اس لئے تم پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو" وہ آملیٹ کو اس پلیٹ میں ڈالنے لگا تھا جس میں چیز موجود تھی۔ امائمہ کا وجود جیسے ٹھنڈا ہو گیا تھا اس سے اگلا جملہ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ وہ عمر کو نہیں کہہ سکتی تھی کہ

"تمہیں نہیں پتا میرا ایک بھائی بھی ہے اور دراصل میں نے تم سے شادی اسی بھائی کی وجہ سے کی تھی۔"

وہ یہ بات کیسے منہ سے نکال لیتی۔ وہ نہیں نکال سکتی تھی۔ عمر اور اسکی فیملی کو یہی پتا تھا کہ امائمہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ عمر میں

بہت سی خصوصیات تھیں لیکن یہ بھی ایک مصدقہ امر تھا کہ وہ ایک جذباتی انسان بھی تھا۔ وہ اگر اس بات کو سر پر سوار کر لیتا کہ امامہ نے اس سے یہ بات کیوں چھپا کر رکھی تھی تو وہ غصہ بھی کر سکتا تھا امامہ نے اپنے آپکو بہت مشکل صورتحال میں گھرا محسوس کیا۔ اسے پہلی بار اس سارے معاملے میں اپنے کردار سے الجھن ہوئی۔ امی نے اسے مشکل میں پھنسا دیا تھا یہ امی ہی تھیں جنہوں نے اسے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم کسی عمر احسان کو جانتی ہو؟" سرسوں کے تیل سے بھری ہتھیلی اس کے بالوں میں انڈیلتے ہوئے امی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔ ان کے سوال میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ وہ اکثر کلاس فیلوز کا ذکر امی سے کرتی رہتی تھی یا جن بھی لوگوں سے وہ ملتی جلتی تھی امی کو ان کے بارے میں پتا ہی ہوتا تھا۔ وہ نیا پن ان کے انداز میں تھا جس نے ان کے سوال کو امامہ کے لئے مشکوک بنا دیا تھا۔

"کون؟" اس نے پلٹ کر پوچھا مگر وہ امی کے چہرے کی جانب نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ اس کے مڑنے پر انہوں نے اس کی گردن کا رخ دوبارہ سامنے کی جانب کر دیا تھا۔ وہ بظاہر بہت دلجمعی سے اس کے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں۔

"عمر۔۔۔ عمر احسان" انہوں نے دہرایا۔ امامہ نے لمحہ بھر کے لئے سوچا۔ اس نام کے کسی شخص کو وہ نہیں جانتی تھی۔

"اوں ہوں۔۔۔" اس نے فقط ہنکارا بھرا۔

"تمہاری ملاقات ہو چکی ہے اس سے۔۔۔ شہروز کا کزن ہے۔۔۔ تمہارے کلاس فیلو شہروز کا کزن۔۔۔"

وہ شہروز اور اس کی فیملی کے بارے میں جانتی تھیں اس لئے اسی کا حوالہ دیا۔

"ملاقات۔۔۔؟" اس لفظ نے امامہ کو چونکایا لیکن اسے یاد آ گیا تھا کہ امی کس کا پوچھ رہی ہیں۔

"ہاں ہاں۔۔۔ یاد آیا۔۔۔ شہروز کا ایک کزن آجکل یونیورسٹی آتا جاتا ہے۔۔۔ اس کا نام عمر ہے؟" اس نے تصدیق کرنی چاہی کیونکہ وہ واقعی بھول چکی تھی کہ شہروز کے اس بدتمیز کزن کا نام کیا ہے۔

"کیسا لڑکا ہے؟" امی نے ایک اور سوال کیا تھا۔ امامہ کا منہ بن گیا۔

"پہلے کبھی آپ کو لوگوں کے بارے میں میری رائے اچھی لگی ہے۔" اس نے تنک کر پوچھا تھا۔

"تم نے کبھی کسی کو اچھا کہا بھی ہے۔۔۔ دنیا کے ستر فیصد لوگ تمہاری نظر سے دیکھے جائیں تو برے ہی نکلیں گے۔"

امی کا انداز بھی اس کے ہی جیسا تھا۔

"اور آپ۔۔۔؟" وہ ان کی طرف پلٹنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

"آپ کو تو ہر دوسرا شخص اچھا لگ جاتا ہے۔ قصور آپ کا نہیں ہے۔ آپ کی اور میری کیمسٹری کا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ امی نے دوبارہ اس کا رخ موڑا۔ اس کے لمبے بالوں میں تیل لگانے میں وہ کافی محنت صرف کرتی تھیں۔

"قصور کیمسٹری کا ہو یا فزکس کا، ایک بات تم ذہن میں بٹھا لو بی بی! اب تمہیں سیریسلی کسی نہ کسی کے بارے میں میری رائے سے متفق ہونا ہی

پڑے گا۔ تمہارے ابو اب زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔" انہوں نے اس کے بالوں میں تیزی سے انگلیاں گھماتے ہوئے بالآخر جتا دیا تھا کہ وہ یہ ساری انکوائری کیوں کر رہی ہیں۔ امامہ کچھ مشکوک سی تو تھی مگر ان کے واضح طور پر کہنے سے چونک سی گئی۔ شہروز کے کزن کا پرپوزل اس کے لئے واقعی ایک چونکا دینے والی بات تھی۔

"اس لئے آپ مجھ سے شہروز کے اس ہینڈسم کزن کا پوچھ رہی تھیں۔۔۔ مطلب۔۔۔ واقعی؟" وہ اچنبھے سے بولی تھی۔ اسے اس لڑکے کے تمام انداز یکدم ہی یاد آنے لگے تھے۔ وہ جب بھی اس سے ملی تھی اس کا امپریشن برا ہی پڑا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"شکر ہے مجھے اپنے منہ سے نہیں بتانا پڑا۔۔۔ کچھ سمجھداری تو باقی ہے میری بیٹی میں۔" وہ مسکرا رہی تھیں۔ امامہ کو ان کا لہجہ کھنکھناتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے بھائی کے چلے جانے کے بعد اس کے اور امی کے درمیان تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے تھے اور اس میں تمام تر محنت خود امامہ کی ہی تھی۔ امامہ نے انہیں زندگی کی طرف لانے میں بڑی محنت کی تھی۔ وہ واقعی ایک پل بن گئی تھی جو ابو اور امی کے تعلقات کو مضبوطی سے قائم رکھنے میں سب سے اہم رکن تھی۔ نور محمد کے بعد ابو امی کے تعلقات بھی نارمل شادی شدہ جوڑے والے نا رہ سکے تھے۔ امی نے بیٹے کے بعد جیسے ابو سے سارے تعلقات ختم کر لئے تھے۔ وہ ضرورت کے علاوہ بھی ابو کو مخاطب نہیں کرتی تھیں انہوں نے کبھی ابو کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ ان کو جیسے اپنی زندگی سے نکال چکی تھیں۔ اس صورتحال میں امامہ ہی تھی جس کی ضروریات، خوشیاں کامیابیاں اور کارنامے انہیں جوڑنے کا باعث تھے۔ اس لئے امامہ کا ہر پروپوزل گھر کے سناٹے میں ہلچل تو مچاتا تھا لیکن آج امی ضرورت سے زیادہ خوش تھیں حالانکہ یہ اس کا پہلا پرپوزل نہیں تھا۔ بہت زیادہ تو نہیں مگر چار، چھ مہینے بعد کوئی نا کوئی کہلوا دیا کرتا تھا۔ اس لئے امامہ کو ان کے رویے پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔

"مسز منور کافی تعریف کر رہی تھیں اس بچے کی۔ بی بی اے کیا ہوا ہے۔ آٹھ سو پونڈز یا شاید اٹھارہ سو پونڈز والی جاب کر رہا ہے۔ پان، سگریٹ جیسی کوئی بری عادت نہیں۔ انگلینڈ کی پیدائش ہے۔ وہیں پلا بڑھا ہے مگر بہت سلجھا ہوا سمجھدار بچہ ہے۔ مسز منور تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ گورا چٹا اونچا لمبا ہے۔ اسمارٹ ہے، ہینڈسم بھی۔۔۔" وہ اس ان دیکھے شخص کا حلیہ اس طرح بیان کر رہی تھیں جیسے اسے دیکھ رکھا ہو۔ امامہ کے چہرے کے تاثرات ان کے ہر لفظ پر بدل رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئیں تو امامہ کو بولنے کا موقع مل گیا۔

"آپ جو مرضی کہتی رہیں۔۔۔ میں اس لڑکے سے شادی نہیں کرنے والی۔" وہ سپاٹ انداز میں کھنک کر بولی۔

"وجہ؟" امی ناگواری سے بولی تھیں ساتھ ہی اس کے بالوں میں گھومتے پھرتے ہاتھوں میں سختی آئی۔

"اسکے بعد آپ "وجہ" کا نام، اس کا بائیو ڈیٹا اور اسکی فیملی کے بارے میں پوچھیں گی پھر پوچھیں گی "وجہ" سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔" امامہ خفگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"جی نہیں۔۔۔ مجھے پتا ہے ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔" امی بظاہر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ان کو بیٹی سے زیادہ اپنی تربیت پہ بھروسہ تھا۔ امامہ جواباً کچھ نہیں بولی۔ امی کافی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں پھر جیسے ہار مان کر بولیں۔

"امامہ اس میں خفا ہونے والی کون سی بات ہے؟" امامہ ابھی بھی خاموش رہی۔ امی نے اس سر کا مساج مکمل کر کے اس کے بالوں کو جوڑے کی شکل دے کر چھوڑ دیا تھا۔

"میں نے یہ پروپوزل فائنل تو نہیں کر دیا جو تم نے اتنا منہ پھلا لیا ہے۔۔۔ اچھا بابا جو مرضی کرو۔۔۔ میں اب تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔"

اس کے انداز دیکھ کر وہ چڑ کر بولی تھیں۔ امائمہ نے اپنا رخ ان کی جانب موڑا۔

"مجھے وہ لڑکا اچھا نہیں لگا۔" اس نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ "وہ بہت اچھورا ہے، لاپرواہ اور غیر ذمہ دار۔ اسے اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی لڑکی سے کس طرح بات کرتے ہیں۔ مجھے ایسے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے میچور لڑکے اچھے لگتے ہیں امی۔"

اپنی امی کے ساتھ گزشتہ کچھ سالوں میں اس کی بہت بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ان کے سامنے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتی تھی۔ امی نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پر رکھا تھا پھر دوسرے ہاتھ سے اسے سہلاتے ہوئے بولیں۔

"میں تم پر اپنی مرضی مسلط کروں گی نا ہی تمہیں مجبور کروں گی۔۔۔ بس کچھ باتیں ہیں میں چاہتی ہوں کہ تم انہیں غور سے سن لو۔"

ان کا ناصحانہ انداز بھی ہمیشہ دوستوں والا ہوتا تھا۔ امائمہ نے ان کا چہرہ دیکھا۔ انکے خدوخال میں یاسیت اور مایوسی کہیں چھپ کر بیٹھی رہتی تھی۔

"مسز منور بتا رہی تھیں اس لڑکے کی عمر اٹھائیس سال ہے۔ اس عمر میں اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے لڑکوں میں، تمہاری عمر بائیس سال ہے۔ تمہارے لئے یہ اٹھائیس سال کا شخص ہی بہتر رہے گا۔ جیسی میچورٹی تم چاہتی ہو نا، بیتس پینتیس سال سے پہلے نہیں آتی اور پینتیس سال کا شخص لڑکا نہیں مرد ہوتا ہے۔ کیا کرو گی ایک میچور ڈ مرد سے شادی کر کے۔ اسے تمہاری چھوٹی چھوٹی باتیں حماقتیں لگیں گی، تمہاری پسند ناپسند کو وہ بے وقوفی قرار دے گا۔ وہ تمہارے زندگی گزارنے کے طریقے کو آلتو فالتو سا کہے گا۔ تمہیں اس کے ساتھ چلنا نہیں دوڑنا پڑے گا۔ تم تھک جاؤ گی اور، بہت جلد بوڑھی ہو جاؤ گی۔ ابھی وہ تمہیں چھچھورا اور للو لگ رہا ہے کل کو تم ایک میچور ڈ مرد سے شادی کر کے چھچھورا اور للو لگنے لگو گی۔"

وہ بہت پیار سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ امائمہ بغور ان کو سن رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ وہ ان کی بات سے اتفاق نہیں کرتی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے سب سے زیادہ بھروسہ اپنی ماں کی پسند پر تھا۔

"ایک بات میں تمہیں سچ سچ بتا دینا چاہتی ہوں۔" انہوں نے بلاوجہ لحہ بھر کا توقف کیا۔ "مسز منور کو میں کافی عرصہ سے جانتی ہوں۔ مسز تنویر (زارا کی امی) سے میرے کافی اچھے مراسم ہیں۔ تمہاری وجہ سے زارا اور شہروز سے بھی علیک سلیک رہی ہے۔ بہروز اور مہروز کو تمہارے ابو کافی اچھے سے جانتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس ساری فیملی سے ہماری واقفیت ہے۔ میں اس فیملی کو کافی پسند کرتی ہوں، بظاہر ان میں کوئی خامی خرابی نہیں ہیں۔ اپنے فیملی اسٹیٹس کو بھی تم اچھی سے جانتی ہو۔ خالہ تمہاری کوئی ہے نہیں، ماموں کے بیٹوں کو تم میں کوئی دلچسپی ہے نہیں، چاچوں کے بیٹے تمہارے جوڑ کے نہیں۔ ایسی صورتحال میں تمہاری شادی خاندان سے باہر ہی ہوگی۔ اپنے ابو کو تم جانتی ہو، ان کا سرکل بہت وسیع ہے لیکن جس سرکل میں آپ کا احترام زیادہ ہو وہاں آپ اپنے بچوں کی شادی کی بات نہیں چلا سکتے۔ جھوٹی انا آڑے آتی ہے۔ اب تم خود بتاؤ ایسا پروپوزل جو خود گھر چل کر آئے اور بصد احترام، بہت اصرار، بہت محبت سے میری بیٹی کا ہاتھ مانگے تو میں کس منہ سے انکار کروں۔۔۔ ان سارے پلس پوائنٹس کے باوجود اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں مسز تنویر کو صبح ہی فون کر کے منع کر دوں گی۔ ان کو انکار کرنے میں مجھے زیادہ سہولت رہے گی۔ تم اچھی طرح سوچ لو پھر مجھے بتا دینا میں تمہارے ابو تک بات پہنچانے سے پہلے ہی ختم کر دوں گی۔"

امائمہ کو پتا تھا کہ وہ جیسا کہہ رہی ہیں ویسا ہی کریں گی۔ ان کی باتیں اس کے لئے کسی قدر ہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان کافی بے تکلفی تھی۔ وہ ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتی تھیں لیکن اتنے واضح انداز میں انہوں نے اسے کبھی نہیں سمجھایا تھا۔ وہ کچھ حیران بھی ہوگئی تھی۔ حالت اتنی خراب بھی نہیں تھی جتنی انہوں نے بیان کی تھی۔ اس سے پہلے بھی اس نے کچھ اچھے پر پوزلز کو اسی طرح چوں چراں کرکے امی کے سامنے ریجیکٹ کردیا تھا لیکن تب امی نے اسرار نہیں کیا تھا اور اب بلاواسطہ ہی سہی لیکن ان کی یکطرفہ پسندیدگی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ امائمہ سے صبر نہیں ہوا تھا۔

"امی آپ کو یہ پرپوزل کچھ زیادہ ہی پسند نہیں آگیا۔" اس نے بالا آخر پوچھ ہی لیا تھا کیونکہ ابھی امی اس لڑکے سے ملی بھی نہیں تھیں۔ وہ شہروز اور اس کے بھائیوں کو جانتی تھیں لیکن یہ جاننا بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ اُنکے کزن کیلئے اس طرح پُرجوش ہوجاتیں۔ امائمہ کو کھوج سی لگ گئی تھی۔

"مجھے زیادہ پسند نہیں آیا۔۔۔ یہ پرپوزل ہے ہی بہت اچھا۔۔۔" انہوں نے گہری سانس بھری۔

"جس کا پرپوزل ہے نا، اس سے آپ کبھی نہیں ملیں، اسے کبھی دیکھا بھی نہیں حتیٰ کہ کبھی فون پر بھی بات نہیں کی اور بات ایسے کررہی ہیں جیسے بچپن سے اسے جانتی ہیں۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ امی بلاوجہ اسے ٹال رہی ہیں۔ امی کا رویہ اس کے لئے حیران کن تھا۔

"تمہیں میری پسند پہ بھروسہ نہیں ہے؟" وہ امائمہ کے انداز کا برا مان گئی تھیں۔

"بھروسہ ہے امی!۔۔۔ مگر میں چاہتی ہوں۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے سچ بولیں۔" رک رک کر اس نے بات مکمل کرلی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ امی جھوٹا قرار دیئے جانے پہ خفا نہ ہوجائیں گی۔ امی اُس کی بات پہ چُپ کی چُپ رہ گئی تھیں پھر انہوں نے گہری سانس بھری تھی۔ ان کے چہرے پہ عجیب سی پُراسرار چمک تھی۔

"وہ تمہیں شادی کے بعد لندن لے جائے گا امائمہ۔۔۔!"

اور امائمہ ان کی بات سن کر ششدر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کسی بھوکی بلی کی طرح چوکنی ہو کر دیواریں پھلانگتی ہوئی گزر رہی تھی۔ امائمہ کی آنکھیں رونے کے باعث اور اب نیند نہ آنے کے باعث درد کرنے لگی تھیں۔ اس کے کندھے بھی جیسے اکڑ گئے تھے اگرچہ وہ چپ چپ کر روتی رہی تھی لیکن عمر کو اندازہ تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ وہ اس سے اس کی بے دلی کی وجہ پوچھتا رہا تھا اور اس کو بہلاتا بھی رہا تھا لیکن تھکا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ سوچکا تھا۔ امائمہ کو دکھ اور پریشانی دونوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا امی نے سمجھ لیا تھا۔

یہ رشتہ نظریہ ضرورت کے تحت ہی ہوا تھا اور یہ بات امائمہ اچھی طرح جانتی تھی اگرچہ ابو نے مخالفت کی تھی۔ وہ امائمہ کی شادی ملک سے باہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کو پاکستان میں کوئی بہت اچھا لڑکا مل جائیگا جو عمر سے کہیں زیادہ اچھا ہوگا مگر امی ڈٹ گئی تھیں۔ ڈٹ بھی کیا گئی تھیں۔ انہوں نے بس کہہ دیا تھا کہ امائمہ کی مرضی اس رشتے میں شامل ہے اور ابو خاموش ہوگئے تھے۔ نور محمد کے بعد اس نے کبھی اپنے ابو کو کسی چیز کے لئے امی کو مجبور کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ طاقتور تناور دیمک زدہ درخت تھے اور یہ بات صرف امائمہ کو نظر آتی تھی۔ امی کو پرواہ نہیں

تھی۔ وہ ابو کے کردار کو انکی شخصیت کو ہمیشہ اپنے بیٹے کی کسوٹی پر پرکھتی تھیں اور افسوس والی بات یہ تھی کہ ابو اس کسوٹی پر ہمیشہ فیل ہو جاتے تھے۔ وہ اس ذکر سے اتنا کتراتے تھے کہ انہوں نے اپنے سرکل میں یہی کہہ رکھا تھا کہ انکی ایک ہی بیٹی ہے۔ انکو جاننے والے تھوڑے نہیں تھے اور ان کے بیٹے کے قصے بھی کبھی لوگوں کو ازبر تھے لیکن کوئی تذکرہ نہیں کرتا تھا۔

"اسکا کسی لڑکی کے ساتھ افیئر تھا۔ اکیڈمی میں جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اس لڑکی کے بھائیوں نے اس کی درگت بنا ڈالی تھی پروفیسر صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے اس پر کافی تشدد کیا جس پر انکا بیٹا گھر سے بھاگ گیا۔ پولیس کے ذریعے اسے بازیاب کروایا گیا اور پھر پروفیسر صاحب نے اسے گھر میں قید کر دیا جس کی بناء پر اسکا ذہنی توازن کھو گیا تھا۔ آجکل کسی پاگل خانے میں ہے" یہ وہ بات تھی جو نور محمد کے لئے پہلے محلے میں پھر ان کے پورے سرکل میں مشہور ہو گئی تھی۔ باشعور لوگ ہمیشہ سے دنیا میں قلیل ہی رہے ہیں سو جو لوگ صورتحال سے صحیح معنوں میں واقف تھے وہ بہت کم تھے۔ زیادہ تر کو مرچ مصالحے والی چاٹ ہی پسند تھی سو یہ معاملہ بہت ہی شرمندگی والی بات بن کر رہ گیا تھا۔ ابو نے اتنی چپ سادھ لی تھی کہ وہ کسی کو بتاتے ہی نہیں تھے کہ انکا کوئی بیٹا بھی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نور محمد قصہ پارینہ بن گیا تھا لیکن عمر کے گھر والوں سے یہ بات دانستہ چھپائی نہیں گئی تھی بس وہی حال تھا کسی نے پوچھا نہیں، ہم نے بتایا نہیں۔ امی ابو نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ چونکہ یہ اپنے جاننے والے لوگ ہیں سو انکو سب خبر ہو گی۔ اس لئے کھلم کھلا اس موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔

امائمہ کا عمر کے ساتھ رشتہ ہو جانے کے بعد بھی حالات سازگار نا ہو سکے تھے۔ عمر کا بیگانہ رویہ دیکھتے ہوئے امائمہ کو یقین تھا کہ یہ رشتہ ختم ہو جائیگا لیکن امی نجانے کونسے وظیفے کرتی رہتی تھیں کہ حالات جب بھی بگڑے، انکا انجام سنگین نہیں نکلا۔ انکا نکاح بھی آناً فاناً ہوا تھا اور نکاح کے بعد امی نے امائمہ کو خود ہی سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ عمر کے سامنے نور محمد کی کوئی بات نہیں کرے گی۔

"نئی نئی رشتے داری میں بڑی پردہ داری ہوتی ہے" وہ اسے سمجھاتی تھیں کہ پہلے تم عمر کے دل میں جگہ بنا لو پھر یہ معاملہ حل کر لیں گے۔ اب جگہ تو بن گئی تھی لیکن یہ بات کرتے ہوئے امائمہ کو ڈر لگتا تھا۔ عمر کو اگر یہ غلط فہمی ہو جاتی کہ امائمہ نے اس رشتے کی ابتداء میں ہی صرف اپنی ضرورت کو مدنظر رکھا تھا تو وہ خفا ہو سکتا تھا اور امائمہ کو اس شخص سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ وہ اسکو ناراض نہیں کر سکتی تھی پھر سسرال کا معاملہ بھی تھا۔ اس کے ساس سسر اسکی ہی نہیں اس کے والدین کی بھی بے حد عزت کرتے تھے۔ اس کے سسر اسکے ابو کا ذکر اتنے اچھے لفظوں میں کرتے تھے۔ اس کی ساس امائمہ کی تعریف کرتی تھیں تو اس کے ابو کی تربیت پر فخر کرتی تھیں۔ وہ کیسے اپنے اس بھائی کا ذکر کر دیتی جو چھوٹا کر کے بھی معتوب ٹھہرایا گیا تھا اور دوسری جانب امی کو کیسے سمجھاتی کہ ایسے حالات میں اور پھر اتنے بڑے انگلینڈ میں بھائی کو ڈھونڈنا آسان نہیں رہا تھا۔ وہ بھائی جو ماموں کے گھر سے بھاگ گیا تھا اور اس بات کو وجہ بنا کر ماموں کی فیملی ان سے تعلقات ختم کر چکی تھی۔ ایک مسئلہ تو نہیں تھا کہ وہ حل کر لیتی۔ اس ذکر سے بے شمار سوالات تھے جو خود بخود اٹھ کھڑے ہو سکتے تھے۔ وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ بلی کے ڈر سے کبوتر بنے رہنے کا وقت گزر چکا تھا لیکن شیرنی بننے کی ہمت بھی نہیں تھی اس میں اور امی چاہتی تھیں وہ شیرنی بن کر دکھائے۔

☆ ☆ ☆

"یار کتنی بوریت پھیلا رہی ہو تم!" عمر نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تھی۔ امائمہ چونک کر اسکی شکل دیکھنے لگی۔ وہ کافی دیر سے اسے اکنور کیے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے میں مگن تھی۔ عمر کی آنکھوں میں مصنوعی ناراضی لیکن آنکھوں میں بہت نرم سا تاثر تھا جسکی بناء پر اسے سنبھلنے میں کافی آسانی ہوئی۔

"مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے تم" بدقت مسکراتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔ عمر کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

ہائیں۔۔۔اسکا مطلب تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں" اس نے منہ پھلایا تھا۔ امائمہ نے مسکراہٹ کا نقاب مزید پھیلایا تھا۔

"تم باتیں بھی تو کتنی بورنگ کر رہے تھے" وہ جتا کر بولی تھی حالانکہ اس نے واقعی نہیں سنا تھا عمر کس متعلق بات کر رہا تھا۔ وہ ابھی بھی بات اس سے کر رہی تھی لیکن دیکھ کن انکھیوں سے سامنے کی جانب رہی تھی۔

"میری باتیں اس بورنگ شکل سے تو زیادہ اچھی ہیں جسے تم اتنی دیر سے گھور رہی ہو" عمر کے منہ سے نکلے لفظوں نے امائمہ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ عمر اسے اتنے دھیان سے اس کا جائزہ لیتا رہا ہے کہ اسکی نگاہوں سے اسکا سامنے بیٹھے شخص کو محویت سے تکنا مخفی نہیں رہا تھا۔ اسے دل میں بے پناہ شرمندگی محسوس ہوئی۔

"کیا وہ بہت ہینڈسم ہے۔۔۔ ذرا مجھے دوبارہ سے دیکھنے دو" وہ اب رخ موڑ کر پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شرارت کا عنصر اس کے ہر عضو سے چھلک رہا تھا۔

"نہیں یار۔۔۔ اتنا خاص نہیں ہے۔۔۔ بیڈ چوائس" وہ ایک بار پھر اسکی طرف دیکھ کر بیدحا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ امائمہ اب کی بار بھی بمشکل مسکرائی لیکن وہ مطمئن ضرور ہوئی تھی کیونکہ عمر کا انداز کھوجتا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ اسے چڑا رہا تھا۔

"میں معافی چاہتی ہوں اگر تمہیں میری پسند اچھی نہیں لگی۔۔۔ لیکن میں تمہیں اپ ڈیٹ ضرور کرنا چاہونگی کہ میں اسے اسکی وجاہت کی بناء پر نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ مجھے پاکستانی لگ رہا تھا۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ تم نے مان لیا کہ تم اسے دیکھ رہی تھیں اور میں بھی تمہیں اپ ڈیٹ کر دوں کہ پاکستانی نہیں ہے وہ" عمر نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اس شخص کی جانب دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کا عام سا شخص تھا جس کی ساری توجہ اپنے سامنے رکھے ڈونٹس اور کافی پر مرکوز تھی۔ اسے کوئی پرواہ نہیں تھی کہ اس کے ساتھ والی میز پر بیٹھا جوڑا اسے نا صرف تکنے میں مگن ہے بلکہ اس کے متعلق گفتگو بھی کر رہا ہے۔ ان کے اردگرد کافی رش تھا۔ ویک اینڈ تھا اور وہ دونوں بھی کافی پینے آئے تھے۔

"اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو تم" امائمہ نے اس کے انداز پر حیرانی کا اظہار کیا۔

"اسکی پی کیپ اور ٹی شرٹ دیکھو۔۔۔ دونوں پر وینز ویلا کا جھنڈا بنا ہے۔ اسکا رنگ دیکھو۔۔۔ ایسا رنگ روپ لاطینی امریکیوں کا ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر اسکا ایٹی ٹیوڈ دیکھو۔۔۔ اتنی دیر سے ایک خوبصورت لڑکی اسے دیکھ رہی تھی لیکن اسے ذرا پرواہ نہیں ہے، کب سے کھانے میں مگن ہے۔ کوئی پاکستانی اتنا بدذوق نہیں ہو سکتا۔" عمر کا بے بڑا ہے اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے گویا اسکی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا، امائمہ نے برا سا منہ بنایا

"بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہو تم۔۔۔ غلطی ہو گئی مجھ سے جو اس کی جانب دیکھ لیا۔۔۔ایویں شک ہوا تھا کہ شاید میرا ہم وطن ہے" اس نے وضاحت دیتے ہوئے ناگواری کا اظہار کیا۔

"میں بھی تو تمہارا ہم وطن ہوں، ہم وطن ہی نہیں ہم سفر بھی ہوں،۔میری طرف تو اتنے پیار سے کبھی نہیں دیکھا تم نے" وہ ابھی بھی چڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔

"اوہو عمر۔۔میں اسے پیار سے نہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔تم بھی نا۔۔" وہ زچ ہوئی تھی۔الفاظ بھی منہ میں ہی رہ گئے تھے۔عمر نے اس کے انداز پر قہقہہ لگایا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔۔منہ کے ایسے اینگل بناتی ہوئی۔۔۔تمہیں دیکھ کر مجھے زارا کی یاد آگئی۔۔وہ بھی میری باتوں پر ایسے ہی چڑ جایا کرتی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔امائمہ نے اطمینان بھرا سانس لیا،موضوعِ گفتگو تبدیل ہونے جا رہا تھا۔

"ہاں۔۔وہ اکثر ذکر کرتی رہتی ہے تمہاری اور شہروز کی بدتمیزیوں کا" امائمہ نے کرسی کی پشت سے کمر ٹکائی تھی۔اس کا دل بے حد اکتایا ہوا تھا۔اسے ہر وقت عجیب بیزاری اور بے سکونی محسوس ہوتی رہتی تھی اور اسے چھپانے کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔وہ ایک مصروف شاہراہ پر واقع ایک کافی شاپ کے اوپن ایئر حصے میں بیٹھے تھے اور کافی بھی پی چکے تھے لیکن کیفے ٹیریا سے اٹھنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا۔شام کا رنگ دمکتا ہوا نیلا تھا۔امائمہ یہاں پہلے بھی آ چکی تھی لیکن آج اسکی نظریں ہر چیز کو کھوجنے میں لگی تھیں۔گزشتہ کچھ دنوں سے وہ شام میں باہر گزار رہے تھے۔عمر آفس سے تھکا ہوا واپس آتا تھا لیکن اسکی فرمائش پر اسے باہر لے جانے کے لئے تیار رہتا تھا۔

"بدتمیزی۔۔۔خیر بدتمیزی تو کبھی نہیں کی میں نے۔۔۔شہروز کرتا ہوگا۔۔میں تو شرارت کرتا تھا کیونکہ مجھے اسے چڑانے میں مزا آتا تھا اور وہ ہے بھی تو اتنی ڈفر کہ ہر بار میری شرارت کا نشانہ بن جاتی تھی لیکن میں اسے مس بہت کرتا ہوں۔۔اسے بھی اور شہروز کو بھی۔۔اب پاکستان جائیں گے تو بہت مزا آئیگا کیونکہ تم بھی ساتھ ہوگی" وہ اس کے چہرے کی جانب بغور دیکھ رہا تھا۔امائمہ مبہم سا مسکرائی۔اسکا دھیان عمر کی جانب ابھی بھی کم ہی تھا اور یہ باتیں تو عمر اکثر کرتا رہتا تھا۔امائمہ کو نکاح کے بعد ہی عمر کی زندگی میں شہروز اور زارا کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔وہ تینوں اچھے دوست تھے اور امائمہ کو بھی انکی دوستی اچھی لگتی تھی۔وہ دونوں یاد آئے تو امی کی یاد بھی آگئی اور ذہن کے نقشے پر انہی کا چہرہ جم کر رہ گیا۔

"میں بچت کر رہا ہوں۔سنا ہے انکی شادی جلد ہونے والی ہے میرا ارادہ ہے کہ تحفتاً انکو یہاں کا وزٹ کروائیں گے،سکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ چلیں گے۔انکو ویزہ ایشو نہ ہوئے تو اٹلی فرانس بھی جایا جا سکتا ہے۔بہت مزا آئیگا ہے امی" وہ بلاوجہ ہی ابھی سے خوش ہو رہا تھا۔

"تم کافی پسند کرتے ہو شہروز کو" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔اسکا انداز ایسا تھا جیسے تھکی ہوئی مصروف ماں بچے سے اسکے سکول کے پرجوش قصے سنتی ہے۔

"پسند۔۔چھوٹا لفظ ہے۔۔مجھے محبت ہے اس بندے سے۔۔۔اس کے میرے درمیان ایسا تعلق ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔میں نے اس سے اور اس نے مجھ سے آج تک کوئی بات نہیں چھپائی۔ہم جتنا مرضی لڑیں،ایک دوسرے سے خفا رہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے" امائمہ پھر مسکرائی تھی۔وہ جانتی تھی عمر اور شہروز کے روابط بہت ٹھوس تھے۔

"ایک دلچسپ بات بتاؤں چار پانچ سال پہلے کا ذکر ہے کہ میرے ابو چاہتے تھے کہ شہروز کی شادی صبا سے کر دیں۔" اس نے اپنی بہن کا ذکر کیا۔ امائمہ نے اب کی بار اس کی بات میں دلچسپی لی تھی۔

دراصل اسکا ہائی اسکول ختم ہونے جا رہا تھا۔ ابو نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی برٹش دیسی کو داماد کے طور پر چنیں تو انہوں نے شہروز کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں نے تو گھر میں واویلا مچا دیا جبکہ ابو حیران تھے کہ میں اپنے بیسٹ فرینڈ کی اتنی مخالفت کیوں کر رہا ہوں حالانکہ میں اسکی حمایت کر رہا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا وہ زارا کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ بچپن سے اس اسٹوپڈ کو پسند کرتا تھا اگرچہ دونوں کے جھگڑے بھی ہوتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ دراصل زارا بڑی معصوم سی بھولی سی واقع ہوئی تھی۔ ہر گیم میں ہار جایا کرتی تھی تو سب کو خوب تنگ کیا کرتے تھے تب بھی شہروز صاحب رومال لے کر اسکے آنسو صاف کرتے نظر آتے، کبھی آنسو پونچھتے کبھی اسکے بال ٹھیک کرتے اسکا دل بہلاتے رہتے۔ میں تب سے جانتا تھا کہ یہ معاملہ ٹلنے والا نہیں ہے اور وہی ہوا ابو نے گھر میں صبا اور شہروز کے رشتے کی بات کی میں نے فوراً پاکستان فون کر کے شہروز کو خبردار کر دیا کہ یہاں یہ کھچڑی پک رہی ہے۔ اس نے استاد واویلا مچایا کہ پھپھو اور تایا ابو کو انکی باقاعدہ نسبت طے کرنی پڑی کیونکہ بچپن سے ہی سب کو یہ آئیڈیا تو تھا یہ دونوں پسندیدگی رکھتے ہیں سو اس سے پہلے کہ ابو تایا ابو یا پھپھو سے کوئی مشورہ کرتے انہوں نے خود ہمیں فون کر کے اس رشتے کی خبر دی۔ ابو کیا کر سکتے تھے ان کے لئے صبا اور زارا ایک برابر تھیں۔ اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ خوشی صبا کو ہوئی کیونکہ وہ خاور (خالہ زاد) کو پسند کرتی تھی۔ مجھے اپنی بہن کے دل کی بھی خبر تھی سو سارا معاملہ عمر دی گریٹ کی وجہ سے حل ہو گیا۔" وہ خود کو سراہ رہا تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت فراخ دل تھا۔ امائمہ نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلایا مگر اسکا دھیان ابھی بھی اپنے بابل کے آنگن میں کہیں کسی دکھی داستان کے اوراق میں دبی سسکیاں سن بھی رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا۔

"یہ کونسا ایریا ہے عمر" اس نے اتنی دلچسپ باتوں کے دوران انتہائی غیر دلچسپ اور غیر متعلقہ سوال پوچھ لیا تھا کہ عمر حیران ہو کر اسکی شکل دیکھنے لگا

"گرین اسٹریٹ۔۔۔ کیوں، خیریت؟" اس نے اپنی ناگواری اور حیرت چھپا کر جواب دیا تھا۔ اسے برا لگ رہا تھا کہ امائمہ اسکی باتوں سے زیادہ اردگرد کے لوگوں اور چیزوں میں دلچسپی لے رہی تھی اور یہ بات وہ گزشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔ اسکی ذات میں مبہم سی تبدیلیاں آ رہی تھیں اور وہ چڑچڑی ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ مشکوک بھی ہوتی جاتی تھی۔

"یہاں سب شاپس پاکستانیوں کی ہیں" اس نے اونٹ کی طرح گردن اٹھا کر دیکھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ انڈینز اور بنگالیوں کی بھی ہیں۔۔۔ سری لنکن بھی کافی ہیں" عمر کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"پاکستانی شاپس کونسی ہیں" امائمہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہیں کچھ خریدنا ہے امائمہ" عمر نے اکتا کر کہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے تو۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔" وہ جس طرح اچانک اٹھی تھی اسی طرح بات ادھوری چھوڑ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔۔۔ بالکل جھاگ کی طرح۔

"کیا پرابلم ہے یار۔۔تم کچھ دنوں سے عجیب سی نہیں ہوتی جارہی۔" اب کی بار وہ اپنی ناگواری چھپا نہیں پایا تھا۔امامہ نے منہ اٹھا کر اس کی شکل دیکھی پھر پلکیں جھپکی تھیں۔آنسوؤں کو چھپانے کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی۔بہت سا پانی یکدم ابل کر آنکھوں سے باہر آیا تھا۔

"مجھے اپنے امی ابو کی بہت یاد آرہی ہے عمر" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"مائی گاڈ" عمر اتنا ہی کہہ سکا پھر تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا۔اس کا غصہ آنسو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یار اس قدر خبیث انسان ہو تم۔۔۔ایک کال نہیں کر سکتے تھے۔۔۔" موبائل فون کان سے لگاتے ہی عمر کی چیختی چلاتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔وہ تکیے کے سہارے تھوڑا سا اٹھ کر بیٹھ گیا اور وال کلاک کی جانب دیکھا۔۔۔ بارہ بج رہے تھے۔اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس وقت لندن میں کیا ٹائم ہوگا۔

"ایک کال تو کر سکتا تھا۔۔۔یقیناً کر سکتا تھا۔۔؟" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا تھا۔عمر کی آواز سن کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔وہ جس طرح اپنے کریئر کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ترقی کی منزلیں جس تیزی سے طے کر رہا تھا اس کے پاس عمر کو بتانے کے لئے بہت کچھ تھا۔

"جانے دو یار۔۔۔تم ایک کال کرنے کے قابل بھی نہیں ہو۔تمہیں محبت نبھانے کا حوصلہ آتا ہے نہ تم میں یہ صلاحیت ہے۔۔۔یہ میں ہی ہوں جو تمہارے پیچھے خوار ہوتا رہتا ہوں۔"

عمر کا انداز نیم مزاحیہ سا تھا۔شہروز کو ہنسی آگئی۔اتوار کا دن تھا اس لئے وہ کافی فراغت سے بات کرنے کے موڈ میں تھا۔شہروز کو اندازہ تھا کہ آج اس کی اچھی کلاس ہونے والی ہے۔

"اتنا اداس مت ہو انارکلی۔۔۔سلیم آج بھی تمہارا ہی ہے۔" شہروز نے اس کے انداز میں اسے چڑانا چاہا تھا۔

"سلیم کے بچے۔۔۔کہاں رہتے ہو تم آج کل۔۔۔مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ دبئی جا رہے ہو۔میں تمہاری راہ تکتے تکتے انارکلی سے تربوز کلی ہو گیا مگر تمہاری کوئی خیر خبر ہی نہیں۔خود تم کبھی کال نہیں کرتے۔ایسی بھی کیا بے مروتی عالم پناہ۔۔۔بہت بدل گئے ہیں آپ۔"

عمر کی آواز میں شکوے کا گہرا تاثر تھا۔شہروز خجل سے انداز میں مسکرایا۔

"بدلا نہیں ہوں دوست۔۔۔بخدا نہیں بدلا ہوں۔۔۔ہاں مصروف بہت ہو گیا ہوں۔۔۔لٹرلی سر کھجانے کی فرصت نہیں۔۔۔ میں کیا کروں،میری جاب کی نوعیت ہی ایسی ہے،دن اور رات کا فرق ختم ہو گیا ہے۔۔۔اخبار اور نیوز چینل کے ساتھ کام کرنے کا یہی نقصان ہے۔"

اس نے مصروفیت کا جواز پیش کیا تھا۔

"تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا دونوں چیزوں میں ایک ساتھ سر کھپانے کا۔۔۔چینل جوائن کر کے کونسا معرکہ مار لیا جناب نے۔۔۔جھوٹوں کے گینگ میں ایک اور جھوٹے کا اضافہ ہو گیا۔"

عمر اب اسے چڑا رہا تھا۔شہروز ہنسا تھا۔

"یہ میرا شوق ہے یار بلکہ میرا جنون ہے۔ اخبار اور چینل اب لازم و ملزوم ہیں۔ یہ دونوں صحافت کا لازمی جز ہیں اور تم سے مجھے جھوٹا کہو یا جھوٹوں کا سردار۔۔۔ میں یہ سب چھوڑ نہیں سکتا۔ میں یہ جاب حاصل کرنے کے لئے ڈیڈی کو ناراض کیا، بھائیوں کو مایوس کیا۔ زارا کا دل توڑا۔ میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔۔۔ یہ میری پہلی محبت ہے۔"

شہروز نجانے کیوں اسے وضاحت دینے لگا۔

"اس دوسری محبت کی سناؤ۔۔۔ وہیں کھڑی ہے یا پاؤں پاؤں چلنا شروع ہو گئی ہے۔" عمر کی بات پر شہروز نے قہقہہ لگایا۔ وہ زارا کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اس نے کھل کر ہنسنے کے بعد مصنوعی گہری سانس بھری۔

"کیا یاد کروا دیا دوست۔۔۔ تمہیں شاعری سے ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو اس وقت تمہیں فیض صاحب کا ایک زبردست قطعہ سناتا مگر تم شاعری کی طرف سے تم ذرا فارغ ہو اس لئے رہنے دو۔۔۔ دوسری محبت کھڑی ہے نہ پاؤں پاؤں چل رہی ہے۔۔۔ دوڑ رہی ہے میری رگوں میں"

"دوڑ رہی ہوتی تو اب تم بال بچوں والے ہوتے۔۔۔ میرے سامنے فلسفہ بگھار رہے ہوتے۔"

عمر جل کر بولا تھا۔ عمر اور شہروز کی ایسی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے خود بال بچوں والے ہو گئے ہو حالانکہ تمہاری محبت اڑ رہی تھی۔" شہروز نے اسے طعنہ دینا ضروری سمجھا تھا۔

"کسی کے زخموں پر نمک چھڑکتے شرم نہیں آتی۔۔۔ اللہ پوچھے گا تمہیں۔" عمر نے گہری مصنوعی سانس بھری۔ "میں نے سادہ سے الفاظ میں زارا کا حال پوچھا تھا۔۔۔ جواب میں کتنے طعنے دے ڈالے تم نے مجھے۔"

"آئی سوئیر یار! بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔ آتے ہوئے بھی اسے بس دومنٹ کی کال کر سکا وہ بھی ایئر پورٹ سے۔۔۔ بتا تو رہا ہوں، بہت مصروفیت ہے۔"

"دومنٹ بھی بہت ہیں اس کے لئے۔۔۔ اس سے زیادہ دیر بات کر کے یا ملاقات کر کے کیا ہو جانا تھا۔۔۔ وہی روتی بسورتی سڑی ہوئی شکل۔۔۔" عمر اسے چڑا رہا تھا۔

"میں بتاؤں گا اسے کہ تم ایسے کہہ رہے تھے۔۔۔ اچھی خبر لے گی تمہاری۔" شہروز نے ہنستے ہوئے در پردہ اسے ڈرانا چاہا تھا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم بدل گئے ہو ورنہ ایسی لگائی بجھائی پہلے کب کرتے تھے تم۔۔۔" عمر نے ترت جواب دیا تھا۔

"پہلے میں صحافی بھی تو نہیں تھا نا یار" شہروز نے تسلیم کیا تھا۔

"ایک صحافی دوسرا ڈاکٹر۔۔۔ کیا بنے گا تم لوگوں کا۔" عمر نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

شہروز جواباً ہنستا رہا۔ عمر کی شوخیاں عروج پر تھیں۔

"ویسے مجھے یقین نہیں آتا شہروز کہ اپنی زارا خیر سے واقعی مکمل ڈاکٹر بن چکی ہے۔۔۔ علاج ولاج کر لیتی ہے وہ۔۔۔ انجکشن وغیرہ لگاتے ہوئے ہاتھ تو نہیں کانپتے اس کے۔"

"میری ہونے والی اہلیہ کو جتنا ڈفر سمجھتے ہیں نا آپ۔۔۔ اتنی ڈفر ہے نہیں وہ۔۔۔ اور آپ کی معلومات میں اضافہ کر دوں کہ انجکشن وغیرہ لگانا ڈاکٹر کا کام نہیں ہوتا۔ اس کام کے لئے نرس موجود ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صرف معائنہ کرتے ہیں، مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور نسخہ لکھ دیتے ہیں۔۔۔ دیٹس آل۔۔۔"

شہروز نے بات کرتے ہوئے سر بھی کھجایا تھا۔ عمر کی کال طویل ہو رہی تھی۔

"تمہارے لئے کوئی نسخہ نہیں لکھا اس نے؟" عمر اسے زچ کرنے پر تلا تھا۔

"مجھے کیا ہوا اسٹوپڈ۔۔۔ اور پھر وہ مردوں کی ڈاکٹر نہیں ہے۔" شہروز نے برا سامنہ بنایا تھا۔

"وہ جانوروں کی ڈاکٹر ہے اسی لئے تم سے یہ سوال پوچھا ہے۔" بات مکمل کر کے اس نے خود ہی قہقہہ لگایا تھا۔ شہروز کو اس برسوں پرانے لطیفے پر ہنسی نہیں آئی تھی۔

"یہی بوریت پھیلانی ہے یا کام کی کوئی بات بھی کرنی ہے۔" اس نے چڑ کر پوچھا تھا۔

"شادی کب کر رہے ہو تم دونوں؟" عمر کے اگلے سوال نے شہروز کو مزید بور کیا تھا۔ اسے پہلے ہی خدشہ لاحق تھا کہ عمر نے اس موضوع کو ہی زیر بحث لانا ہو۔ اسے پتا تھا کہ آجکل گھر میں سب ہی اس بات پر بضد ہیں کہ اب شہروز اور زارا کی شادی ہو جانی چاہیے جبکہ وہ اپنی مصروفیات کی بناء پر اگلے سال تک ٹال رہا تھا۔

"جب تم پاکستان آؤ گے تب ہی شادی کریں گے ہم۔۔۔ جب تم پاکستان سے گئے تھے۔۔۔ یہی فیصلہ ہوا تھا۔۔۔ میں تمہاری طرح بے وفا نہیں ہوں عمر احسان اسی لئے اپنی بات پر قائم ہوں۔"

شہروز نے جتایا۔

"میں نے یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ ہم پاکستان آنے کی پلاننگ کر رہے ہیں۔۔۔ تم لوگ کوئی ڈیٹ وغیرہ فائنل کرلو۔"

وہ کافی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ شہروز کو یقین ہو گیا تھا کہ زارا نے ہی عمر سے کوئی بات کی تھی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"میری شادی کوئی ڈور بیل نہیں ہے کہ انگلی رکھی اور بجادی۔۔۔ اپنے خاندان کا آخری چشم و چراغ ہوں، میرے اماں ابا بہت دھوم دھام سے مجھے بیاہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔۔۔ تمہاری طرح نہیں کہ چھ گھروں سے دو، دو لوگ بلا کر ولیمہ کر لیا اور فارغ ہو گئے۔"

وہ تنک کر بولا۔ اسے عمر کا آئیڈیا ذرا بھی نہیں بھایا تھا۔

"ہم برٹش ہیں بھئی۔۔۔ سوفسٹی کیٹڈ اور امن پسند۔۔۔ ہم نے چکن بھی حلال کرنی ہو تو سلاٹر ہاؤس میں کرتے ہیں۔۔۔ بجلی کا جھٹکا دے کر۔۔۔ خاموشی سے اور پھر شادی تو پورے ایک فرد کی قربانی ہوتی ہے۔" عمر کا انداز استہزائیہ تھا۔

"ارے جناؤ۔۔۔ ایسی قربانی ہمیں دل و جان سے منظور ہے۔۔۔ یہ قربانی ہے تو میں بخوشی دو نہیں بلکہ چار بار قربان ہونے کو تیار ہوں۔"

دونوں نے اس بات پر قہقہہ لگایا تھا۔

"زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں بتاؤں گا زارا کو کہ یہ ارادے ہیں جناب کے۔۔۔" عمر نے اسے ڈرانا چاہا۔

"میں زارا سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

"یہ بات تو اب آمنے سامنے بیٹھ کر ہوگی۔" عمر نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

"تم واقعی پاکستان آنے کی پلاننگ کر رہے ہو؟" شہروز کو اس کے لہجے میں سنجیدگی کا عنصر بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔

"یہی تو بتا رہا تھا میں تمہیں کہ کرسمس کی چھٹیوں میں فائنل کر لو۔۔۔ ہم آ رہے ہیں۔"

"خیریت۔۔۔ پہلے یہ بات نہیں بتائی تھی تم نے۔" شہروز کو مزید الجھن ہوئی۔ دل میں زارا کے خلاف غصہ شدید تر ہوا تھا اسے اب مکمل یقین ہو چکا تھا کہ اسی نے عمر کو مجبور کیا ہے کہ وہ شہروز کو راضی کرے۔ اسے زارا اور عمر پر غصہ آ رہا تھا۔

"اب بتا رہا ہوں نا۔۔۔ تم پاکستان پہنچ کر کچھ فائنلائز کر کے ہمیں بتاؤ۔" عمر ایک ہی بات کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"اس سال تو ممکن نہیں۔۔۔ اگلے سال دسمبر میں ڈن کرتے ہیں" اس نے منہ پھلا کر کہا تھا۔ عمر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن اسے اتنا غصہ آ گیا تھا کہ اس نے نا صرف کال کاٹ دی بلکہ فون بھی بند کر دیا تھا۔ اسے زارا پہ اتنا غصہ آ رہا تھا کہ شاید زندگی میں کبھی نا آیا ہوگا۔



" پیشنٹ کیسی ہے؟ مریم نے پوچھا تھا، اس نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا پھر دوبارہ سینی ٹائزر ہتھیلی پر انڈیلنے لگی۔

" فٹ ہے۔۔۔" اس نے گہری سانس بھری پھر انگلیوں کی درمیانی جگہ اور ہاتھوں کی پشت کو سینی ٹائزر سے رگڑتے ہوئے اپنی جگہ پر آبیٹھی۔

" میم ندا بتارہی تھیں کچھ پرابلم ہوگئی تھی۔" مریم نے اپنا بیگ اور اسٹیتھواسکوپ اس کے قریب میز پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ میں بن کا پیکٹ بھی تھا۔ زارا نے اس کے سرسری انداز میں چھپے تجسس کو محسوس کیا۔ ہر پیشے کی طرح اس کے پیشے میں بھی لابیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی ٹانگ کھینچنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ زارا کی مریم سے دوستی تو تھی لیکن مریم سینئرز کی اس لابی کی نور نظر تھی جنہیں جونیئر ڈاکٹرز کی غلطیاں پکڑنے اور ان غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا شوق تھا۔ وہ اپنی غلطیوں کی پردہ پوشی کی خاطر اکثر دوسری کولیگز کی شکایات لگاتی رہتی تھی۔ میم ندا موسٹ سینئر سرجن تھیں اور ایک زمانے میں زارا کی ممی کی حریف رہی تھیں۔ وہ لیڈی ولنگٹن میں اپنی زارا کی جگہ اپنی کسی رشتہ دار کو اپائنٹ کروانا چاہتی تھیں۔ زارا بھی انکی گڈ بک میں نہیں رہی تھی۔ وہ اسکی ہر غلطی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادی تھیں۔ اسے انکی روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ کا اکثر سامنا کرنا پڑتا تھا۔

" پیشنٹ کا فرسٹ بے بی تھا اور وہ کوآپریٹ نہیں کر رہی تھی۔ بے بی بہت ہیلتھی تھا تو اس کا ہیڈ سرویکل میں پھنس گیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے بچیاں گھبرا جاتی ہیں۔۔۔ بہت چھوٹی سی ہے۔۔۔ اٹھارہ کی بھی نہیں ہے۔۔۔ فوری سرجری کرنا پڑی" زارا نے بجھے ہوئے انداز میں کہا۔ اس کا دل ابھی بھی قابو میں نہیں آرہا تھا۔ لیبر میں کبھی کبھی اتنی مشکل صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ دل لرزنے لگتا تھا۔ وہ ایک سی سیکشن کر کے فارغ ہوئی تھی۔ چوہنگ (قصبہ) سے لائی گئی وہ مریضہ بہت چھوٹی اور دبلی پتلی تھی مزید براں وہ کافی تاخیر سے لائی گئی تھی جس کی بناء پر اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ وہ خوفزدہ بھی تھی اور اسکے ہمراہ آنے والی خواتین نے شور مچا مچا کر اس بچی کو مزید ڈرا دیا تھا۔ اس نے بالکل ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے تھے۔ لیبر میں موجود سرجن نہیں آن ڈیوٹی زارا بھی پریشان ہوگئی تھی۔ اسی بناء پر سرجری کرنا پڑی جبکہ ساتھ آئی ہوئی دیہاتی خواتین نے بڑا آپریشن بڑا آپریشن کر کے وہ واویلا مچایا تھا کہ زارا اکتا گئی تھی۔ زارا کو ویسے بھی ابھی تک اپنی حساس طبیعت پر قابو پانا نہیں آیا تھا۔ بیماروں کی آہ وزاریاں سن کر وہ خود رونے والی ہو جاتی تھی اور اس کا رنگ زرد پڑنے لگتا تھا یہ اسکی غلطی تھی۔ اسے خود پتا تھا کہ اس نے کانپتے ہاتھوں سے سرجری کی تھی جو کہ ایک ڈاکٹر کے لئے بہت غیر ذمہ دارانہ رویہ تھا۔

ایسی چیزیں میم ندا کو مزید شہہ دیتی تھیں۔

" ارے یہ واقعی بڑا مسئلہ ہے۔۔۔ کچھ پیشنٹس اتنا تنگ کرتے ہیں کہ ایک تھپڑ لگانے کو دل چاہتا ہے۔" مریم کیبن سے پینٹ بٹر اور چیز کے جارز نکال کر میز پر رکھ رہی تھی۔ ٹی بریک ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اکثر ناشتہ کئے بغیر آتی تھیں تو ٹی بریک میں باہر سے کچھ آرڈر کر دیتی تھیں یا اسی طرح بن پر پینٹ بٹر یا چکن اسپریڈ وغیرہ لگا کر کھا لیا کرتی تھیں۔ زارا چائے بنانے کی غرض سے الیکٹرک کیٹل کے قریب آگئی تھی۔ مریم نے اسے ایک بن تیار کر کے تھما دیا تھا۔

پیشنٹ کو تو نہیں پر آج اس کی اماں کو تھپڑ لگانے کا بہت دل چاہا میرا۔۔۔اس نے تو رونا ہی تھا، تکلیف جو تھی مگر اماں نے الگ واویلا مچا رکھا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہی تھی۔ ہائے شبلا ہائے شبلا کرتی جا رہی تھی۔۔آتنی بار کہا کہ باہر چلی جاؤ مگر ٹل ہی نہیں رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد ہائے ہائے کرتی اندر آجاتی تھی اور پھر سرجری کے بعد تو وہ دماغ کھایا میرا کہ نجمی سی بچی تھی ہماری اسکا پیٹ کیوں چیر ڈالا۔ لیبر سے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کیا تو بس ساتھ آنے والی ساری عورتیں چلانے لگیں۔ میم ندا نے آکر سب کی طبیعت صاف کی تو ذرا سکون ہوا ورنہ ہٹ ہی نہیں رہی تھی" زارا نے مگ میں ٹی بیگز رکھے تھے پھر بن کا پائٹ بھرتے ہوئے مریم کی جانب دیکھا۔ وہ یہ بات گول کر گئی کہ میم ندا نے اس کو بھی ڈانٹا تھا۔

"یہ اچھی ڈرامہ بازی شروع کر دیتی ہیں عورتیں۔۔۔ انکا خیال ہے ڈاکٹرز کو بیکشن کرنے میں مزا آتا ہے اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں اور پھر خدانخواستہ پیشنٹ کو کچھ ہو جائے تو بھی ڈاکٹر کو کوستے ہیں کہ مریض کی جان لے لی۔ تم ایک تھپڑ لگا کر باہر نکال دیتی نا سب کو۔۔ایسے لوگوں کے ساتھ ذرا سختی سے پیش آنا چاہیے ورنہ یہ بہت مسئلے پیدا کر دیتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی پیشنٹ کے رشتہ داروں کے لیبر روم میں آنے کے سخت خلاف ہوں۔ اتنا جمگھٹا لگا دیتی ہیں عورتیں۔۔۔اور پھر لیبر کو مشورے بھی دیتیں ہیں کہ ایسے کرو ویسے کرو۔۔۔ ڈاکٹر کو تو پاگل کر دیتی ہیں۔۔۔ وہاں یورپ امریکہ میں تو ایسا نہیں ہوتا۔۔ میری بھابھی ہیں سعودیہ کنگ فہد ہاسپٹل میں ہوتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ وہاں کسی کو لیبر میں آنے نہیں دیتے۔۔۔یہ گورنمنٹ لاء ہے۔۔۔شوہر کے علاوہ کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ لیبر روم میں یا سرجری کے وقت آسکے۔ پاکستان میں الٹے ہی قوانین بنا رکھے ہیں"۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ زارا سر ہلاتے ہوئے چائے کے کپ میز پر رکھنے لگی تھی۔ اسی دوران سیل فون کی بیپ بجنے لگی۔ اس نے بیگ سے فون نکالا پھر شہروز کا نام دیکھ کر خوش ہوئی۔

تم زیادہ سویٹ ہو گئے ہو یا یہ میری نظر کا دھوکہ ہے۔۔ آجکل جلدی جلدی فون کرنے لگے ہو" اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا تھا پھر ہاتھ میں پکڑا سینڈوچ ساسر میں رکھ کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ شہروز کو کونسا اس سے بہت طویل بات کرنی تھی یہ سوچ کر اس نے پرائیویسی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ تو تم بتاؤ زارا" اس نے شہروز کی آواز میں سرد مہری کو فورا محسوس کیا تھا۔ اس نے مریم کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا جو اسے ہی شرارتی نظروں سے تک رہی تھی۔

"میں تو خیر ہوں ہی بہت سویٹ" اس نے شہروز کے انداز پر الجھنے کے باوجود اپنے لہجے کی بشاشت کو برقرار رکھا تھا۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی زارا۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ میں ہمیشہ تمہاری ہر مشکل میں ہر الجھن میں ہر مسئلے میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوا ہوں اور اب جب مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت پڑی ہے تو تم ہاتھ جھاڑ کر سائیڈ پر کھڑی ہو گئی ہو" شہروز کے انداز میں بے حد بیزاری تھی۔

"شہروز۔ کیا ہوا۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا" اس نے اپنی حیرت چھپائی تھی۔ شہروز نے اس انداز میں اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس بات پر اس سے شکوہ کر رہا ہے۔ وہ مریم کے سامنے یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنا بن ساسر سے اٹھایا اور مریم کو اشارہ کر کے باہر نکل آئی تھی۔

"زارا۔کم آن اب اتنی معصوم بھی مت بنو" وہ سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تم خفا ہو مجھ سے۔۔۔لیکن کیوں۔۔۔میں نے تو کچھ نہیں کیا" وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔گزشتہ کئی دن ہوئے وہ شہروز کو بالکل تنگ نہیں کرتی تھی۔اس نے اسے بے وقت بلاوجہ کالز نہیں کی تھیں۔افسردہ، تھکے ہوئے دل جلے میسج نہیں کیے تھے اور اپنے کسی مسئلے کے متعلق رونا رو کر بھی نہیں دکھایا تھا۔وہ بن ہاتھ میں پکڑے فون کان سے لگائے چلتی چلتی نرسنگ اسٹیشن تک آ گئی تھی۔وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ٹی بریک کی وجہ سے سب تتر بتر ہوئے تھے۔وہ کاؤنٹر کے گرد چیئر پر آ بیٹھی تھی۔

"تم سے میں نے صرف اتنی ریکویسٹ کی ہے کہ تم اپنے پاپا کو چند مہینے ٹھہر جانے کا کہہ دو۔۔۔میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا کہ تم لوگوں نے شادی شادی کی رٹ لگا دی ہے۔تمہارا میرا رشتہ دو دن یا دو مہینے پرانا تو نہیں ہے نا کہ مجھے اپنا اعتبار قائم رکھنے کے لئے اتنے پاپڑ بیلنے پڑیں۔" وہ انتہائی سرد مہر لہجے میں بول رہا تھا۔زارا کے لئے اس کا انداز ہی نہیں الفاظ بھی بہت نئے تھے۔وہ اس کے پاپا کے لئے پہلی بار انکل کا لفظ استعمال کئے بغیر بات کر رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے شہروز" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"تمہیں عمر سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی" وہ پوچھ رہا تھا۔

"کیا بات۔۔۔کونسی بات شہروز" وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ہاتھ میں پکڑا بن اسی طرح سالم موجود تھا۔

"زارا پلیز۔۔۔ختم بھی کرو اب۔۔۔یہ ہماری آپس کی بات تھی کہ ہم پھپھو کو شادی کی بات کرنے سے کچھ عرصہ روک کر رکھیں گے۔تمہیں کسی تیسرے شخص سے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔میں اتنا آکورڈ محسوس کر رہا تھا جب عمر نے مجھ سے یہ بات کی۔۔۔" زارا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔میری تو عمر سے کافی دیر ہوئی طریقے سے بات ہی نہیں ہوئی۔۔۔اور پھر میں اس سے یہ بات کیوں کروں گی۔۔کیا اس نے تم سے کہا کہ میں نے اس سے یہ بات کی ہے"

"اس نے تمہارا نام نہیں لیا لیکن اس کو الہام ہوتے ہیں کیا جو اس نے یکدم شادی کی بات کی کہ وہ پاکستان آ رہا ہے سو ہم شادی کی ڈیٹ کا فیصلہ کر لیں۔۔۔اس نے پہلے تو نہیں کہا تھا ایسا۔۔۔اب یکدم اس کو یہ خیال اچانک آ گیا۔اس کو ہی نہیں سب کو ہی خیال آنے لگے ہیں اچانک۔۔۔خاندان میں جس کو دیکھو میری شادی کے متعلق بات کر رہا ہے۔۔دبئی آنے سے پہلے بہروز بھائی بھی اشاروں کنایوں میں مجھ سے پوچھنے لگے۔۔۔پھر سمجھانے لگے کہ سنجیدگی سے سوچو یہی وقت ہے۔۔عمر کی مثال دے رہے ہیں،مہروز بھائی کی مثال دے رہے ہیں کہ سب کی شادیاں لگ بھگ اسی عمر میں ہوئی تھیں اور جانتی ہو انہوں نے مجھے کہا کہ اگر میں اخراجات کی وجہ سے پریشان ہوں تو مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔وہ مجھے کہتے ہیں کہ شہروز ڈیڈی کا بزنس اور تمہارے بھائیوں کے دل اتنے چھوٹے نہیں کہ لاڈلے بھائی کے اخراجات نا اٹھا سکیں۔۔۔زارا تمہیں احساس ہے کہ مجھے کتنی شرمندگی ہوئی۔۔۔"

"لیکن اس بات سے یہ اندازہ کیسے ہوا تمہیں کہ میں نے ان کو کچھ کہا ہے یا میرے پیرنٹس نے کوئی بات کی ہوگی" زارا نے بڑی دقت سے جملہ ادا کیا تھا۔اس کو ایسی صورتحال میں جانے کیوں رونا آنے لگتا تھا۔

تم نے نہیں کی تو کچھو نے کی ہوگی ورنہ وہ مجھے اس طرح نصیحتیں کبھی نہیں کرتے۔ بہروز بھائی وہ واحد انسان ہیں جو میری جاب کرنے پر معترض نہیں تھے اور اب وہی مجھے کہہ رہے ہیں کہ اس خالی خولی شوشا والی جاب میں معاشی طور پر مستحکم زندگی گزارنا مشکل محسوس ہو رہا ہے تو میں ڈیڈی کا بزنس جب چاہوں جوائن کر سکتا ہوں۔۔۔ اپنے کریئر کی خاطر زارا میں دن رات ایک کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں سب لوگ کہیں کہ شہروز نے جاب جوائن کرنے سے پہلے اگر کچھ بن جانے کا عزم کیا تھا تو کچھ غلط نہیں کیا تھا اور تم لوگوں کی وجہ سے اب مجھے یہ سننے کو مل رہی ہے کہ میں نے بزنس نا کر کے غلطی کی ہے۔۔ یہی بات میں سننا نہیں چاہتا تھا اور یہی بات سننے کو مل گئی۔ مجھے اب سمجھ میں آگئی ہے زارا کہ تم میری خاطر بھی کچھ نہیں کرو گی۔ میں یہ امید نا ہی کروں کہ تم میری کسی مشکل میں میری مدد کرنے آؤ گی۔ اس کے ایک ایک لفظ میں اکتاہٹ بھری تھی۔ زارا نے بدقت آنسو پیئے۔ وہ ہاسپٹل میں تھی۔ ٹی بریک ختم ہو چکی تھی۔ نرسز وارڈ بوائز اس کے کولیگز اپنے اپنے کیبنز سے نکلنے لگے تھے۔ وہ رو کر تماشہ نہیں بنوا سکتی تھی۔

"شہروز میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ایک نرس اس کے بے حد قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

جی سلیمہ۔۔ اینی پرابلم؟" سلیمہ سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی سو اسے سیل کان سے ہٹا کر پوچھنا پڑا۔

"ڈاکٹر! دو نئے پیشنٹ آئے ہیں" اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا تھا یعنی اسے واپس جانے کے لئے کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی آنکھوں میں چھپی نمی کو محسوس نا کرلے۔ سلیمہ سر ہلاتی واپس چلی گئی تھی۔

"تم کام کرو زارا اور فرصت ملے تو خود کو میری جگہ رکھ کر سوچنا۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ جن سے محبت کی جاتی ہے جب وہ ہرٹ کرتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔۔۔ اور کچھ نہیں کہنا مجھے لیکن ایک بات یاد رکھنا میں تم سے اب کوئی فیور نہیں مانگوں گا۔۔۔ کبھی نہیں۔"

اس نے اپنی بات پوری کی تھی اور کال کاٹ دی تھی۔ زارا کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ لوگ ہرٹ کرتے ہیں جن سے انسان بہت محبت کرتا ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے بن کی جانب دیکھا جس کا ایک ہی لقمہ کھایا گیا تھا اس سے۔ وہ خود کو رونے سے روک نہیں پا رہی تھی آنسو ٹپ ٹپ گر کے اپنی بے بسی کا احساس دلانے لگے تھے۔ اس نے اپنے گال رگڑ کر صاف کیئے۔ سلیمہ ایک بار پھر سامنے سے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دو تین گہری سانسیں بھریں اور اپنے کیبن سے چیزیں اٹھانے کیلئے اس سمت چل دی۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں بچے پسند ہیں" میں نے نیا سے پوچھا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بچوں کو دیکھ کر بہت پرجوش ہو جاتی تھی اور انکو گود میں لینے کے لئے مچلنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ بدلنے لگتے تھے اور وہاں بڑا میٹھا سا تاثر ابھرنے لگتا تھا۔ ہم اپنے طویل ہنی مون کے آخری حصے میں پرتگال آئے ہوئے تھے۔ پرتگال میں سیاحت کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور نیا کی ہمراہی میں اور بھی مزا آ رہا تھا۔ پرتگال سیاحوں کے لئے کسی جنت سے کم نہیں۔ ہم الگریو میں تھے جہاں کے ساحل اور خوبصورت قدرتی مناظر دل موہ لینے والے تھے۔ یہاں ساتوں رنگ اتنے باکمال امتزاج سے ایک دوسرے سے ملتے تھے کہ انسان کو بعض اوقات اپنی آنکھوں دیکھے منظر پر کسی زبردست فن پارے کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے گزشتہ سالوں میں بہت سیاحت کی تھی لیکن الگریو جیسے ساحل اور مناظر مجھے کہیں اور نہیں ملے تھے۔ یہ دل کھینچ لیتے تھے اور آنکھوں کو چندھیا دیتے تھے۔ قدرت کی

خوبصورتی اور من پسند ساتھی کی ہمراہی مجھے مسرور کئے دے رہی تھی لیکن ثیا کو مناظر سے زیادہ وہاں موجود دوسرے سیاحوں میں دلچسپی تھی بالخصوص وہ گنے چنے سیاح جن کے ہمراہ بچے تھے، ثیا کی خصوصی توجہ کا مرکز تھے۔

اسی لئے میں نے ثیا کی جانب دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا تھا۔

"بچے بھی کسی کو ناپسند ہو سکتے ہیں" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"مجھے ناپسند ہیں۔۔۔تم کوئی بچہ دیکھتی ہو تو دیوانی ہو جاتی ہو، مجھے نظر انداز کر کے اس کی جانب راغب ہو جاتی ہو۔ مجھے حسد محسوس ہوتا ہے" میں نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ہم الگریو میں تھے۔ سامنے تاحد نظر نیلا آسمان تھا جو غروب آفتاب کے بعد اپنا لباس بدل چکا تھا اور اس کے سیاہ لباس کی کشش نیلے سے کہیں زیادہ تھی اور سیاہ آسمان کی آغوش میں سمندر کسی بچے کی طرح اٹھکیلیاں کرتا مطمئن خوش باش نظر آتا تھا اور یہ حرارت بڑا معتدل سا تھا۔ بدن کو حرارت ملتی تھی تو خون جوش کھانے لگتا تھا۔ میں اپنے آپکو اپنی عمر سے دس سال چھوٹا محسوس کرتا تھا۔

ہم الگریو کے مشہور ریزورٹ بیلا وسٹا کے اوپن ائیر حصے میں اپنی مختص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ میڈیٹیرین کھانوں کی خوش بو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے تلے ہوئے جھینگوں کے ساتھ ٹماٹر کی سلاد کا آرڈر دیا تھا۔ عمدہ وائن، یہاں کی مشہور پیسٹریز اور بیلا وسٹا کا مشہور زمانہ کیولنری آرٹ ہماری میز پر دل لبھا لینے کے لئے موجود تھا اور ثیا کی ساری توجہ ساتھ والی میز پر بیٹھے اس آسٹریلین جوڑے پر تھی جن کے ساتھ نو دس مہینے کی بچی موجود تھی اور اسکی قلقاریاں سارے ہال میں گونج رہی تھیں۔

"حسد۔۔۔؟" اس نے بچی سے نظریں ہٹا کر میری جانب دیکھتے ہوئے تحیر بھرے انداز میں سوال کیا تھا پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولی تھی۔

"معصوم بچوں سے کون حسد کرتا ہے۔۔۔جب ہمارے بچے ہونگے تو کیا تم ان سے بھی حسد کرو گے" مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ مجھے بچوں کی خواہش کبھی نہیں رہی تھی۔ میں نے کبھی بچوں کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے کبھی اپنے دل میں باپ بننے جیسی کسی خواہش کو محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ میرے لئے انوکھی سی بات تھی۔

"میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا ثیا۔ میرا خیال ہے ابھی ہم اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں۔ اس بارے میں دس پندرہ سال بعد بات کریں گے" میرا لہجہ عام سا تھا۔

"میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے بل۔ میں بہت جلدی ماں بننے کی خواہش رکھتی ہوں۔ عورت کے لئے ماں بننے سے زیادہ بڑا درجہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں اس درجے پر فائض ہونا چاہتی ہوں۔ تمہیں نہیں پتا بل۔۔۔میرے اندر ایک خلاء ہے، مجھے لگتا ہے جب میری گود میں میرا اپنا بچہ آجائیگا تو شاید یہ خلاء پر ہو سکے۔ ہماری ویدوں میں لکھا ہے کہ بچہ ماں کو مکمل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ میں نے سنا ہے ہر مقدس کتاب میں ماں اور اس کی اولاد کے درمیان کسی ہم آہنگی کا ذکر ملتا ہے۔ عورت کی زندگی میں کوئی پہیلی ہوتی ہے جو اولاد نام کی چیز سلجھا کر اسے ماں بنا دیتی ہے۔ اولاد عورت کا دوسرا جنم ہوتی ہے۔ اولاد عورت کو اپنے آپ میں گم کر کے ماں کے روپ میں ڈھال دیتی ہے لیکن ماں اپنی اولاد میں فنا ہو کر بھی ختم نہیں ہوتی مجھے یقین ہے اولاد کہیں نا کہیں عورت کی اکملیت کا ذریعہ ہے۔ میں مرنے سے پہلے مکمل ہونا چاہتی ہوں بل" اس نے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں

اس ذکر سے گویا چمکنے لگی تھیں۔ مجھے اس کی بات میں وزن نہیں لگا تھا میں نے "ماں" نام کی ایک بھیانک چیز کو اپنی زندگی میں برتا تھا مجھے اس لفظ میں یا اس جذبے میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے خیالات کو اس تک پہنچانا ضروری سمجھا تھا۔

"تم ابھی بھی مکمل ہو نیا۔۔۔ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے جب تم خود کو نامکمل سمجھتی اور کہتی ہو۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہیں میری زندگی میں اب کوئی تشنگی نہیں ہے۔ محبت انسان کو مکمل کر دیتی ہے جب میں تمہارے ساتھ خود کو مکمل سمجھتا ہوں تو پھر تمہیں کیوں خلا محسوس ہوتا ہے۔ میری محبت کی ایسی ناقدری مت کرو۔" نیا نے مسکراتے ہوئے میری بات سنی پھر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

تمہاری محبت میرا اثاثہ ہے، میری دولت ہے۔ میں اتنی قیمتی چیز کی ناقدری نہیں کر سکتی۔" اس کے لہجے میں صداقت ہی صداقت تھی۔ میرا دل خوشی کے احساس سے بھر گیا تھا۔

"میں اس محبت میں اضافے کی خواہاں ہوں بل" اس نے کہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا وہ اولاد کو محبت میں اضافے کا باعث قرار دے گی۔ میں اتنے اچھے ماحول میں بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔اولاد کے بارے میں فیصلہ کرنا یا اولاد کی خواہش کا ہونا نیا کا بنیادی حق تھا نیا کی خواہش کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے زندگی کی ہر وہ خوشی دونگا جو وہ چاہتی ہوگی سو اگر وہ اولاد چاہتی تھی تو مجھے بھی اولاد چاہیے تھی۔

"مجھے تمہاری بات سن کر خوشی ہوئی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور اسکو کھانے کی جانب راغب کرنے کے لئے وائن کا گلاس اٹھایا تھا۔ کھانا بہت لذیذ تھا اور ہم نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ کھانا ختم کر کے ہم اٹھنا چاہ رہے تھے۔ ہمیں واپسی کی تیاری کرنی تھی لیکن ایک اجنبی شخص مسکراتے ہوئے میری جانب آیا تھا۔

"میں اس خوبصورت جوڑے کے درمیان خلل کا باعث بننے کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن میں خود کو روک نہیں پا رہا۔ میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو آپ مشہور ادیب بل گرانٹ ہیں" اس نے بہت شائستگی سے کہا تھا۔ وہ شستہ انگریزی بول رہا تھا۔ ایک ہم زبان کا مل جانا کوئی حیرانی کی بات تو نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اچھا لگا۔ میں نے سر ہلایا تھا فخر کا ایک مخصوص احساس میرے اندر پیدا ہوا تھا، مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔

میں لنڈنر (لندن میں رہنے والا) نہیں ہوں۔ میری پیدائش بیڈ فورڈ لوٹن کی ہے لیکن میں پلا بڑھا لندن میں ہی ہوں آپکی طرح۔۔۔اور کتابیں میرا بھی پہلا پیار ہیں آپکی طرح۔۔۔میں نے بی بی سی پر آپکی ڈاکیومینٹری میں یہ باتیں سنی تھیں اور میں نے آپکی سب کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ آپ انسان نہیں جادوگر ہیں" وہ لمبی بات کرنے کا شوقین تھا۔ میں مزید مسکرایا، ایسے سینکڑوں مداح ملتے رہتے تھے لیکن بیرون ملک کسی مداح کا مل جانا زیادہ خوشی کا باعث بنتا تھا۔

"آپکو ناگوار نہ گزرے تو میں آپکا کچھ وقت لے سکتا ہوں۔" اس نے لجاجت بھرے لہجے میں درخواست کی تھی۔ میں نے نیا کی جانب دیکھا۔ اس نے مسکرا کر گردن ہلائی تھی۔ میں نے اس شخص کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اور ہاں میں آپکو اپنا نام بتانا بھول ہی گیا۔۔۔میں ٹیرن ہوں۔۔۔کیا آپ نے کبھی یو پی ایل کا نام سنا ہے" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔



میں مایوس نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں چالیس سال کا ہو جانے کے بعد اولاد کا حصول مشکل ہو جاتا ہے لیکن میری ساری زندگی مشکلات سے عبارت ہے۔ میں جانتی ہوں مجھے میری من پسند چیزیں تاخیر سے ملتی ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مجھے جو بھی چیز تاخیر سے ملتی ہے وہ بے حد قیمتی اور انمول ہوتی ہے۔" ٹیا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ہماری شادی کو ایک سال سے زیادہ ہونے والا تھا اور ہم ابھی بھی اپنے خاندان میں اضافہ نہیں کر پائے تھے۔ میں تو کسی پریشانی کا شکار نہیں تھا لیکن ٹیا اس معاملے میں عجلت چاہتی تھی۔ اسکا کہنا تھا کہ اس کی بڑھتی عمر مزید مسائل کا باعث بن سکتی ہے سو اسے جلدی اولاد چاہیے تھی۔ میں نے اسی کے اصرار پر لندن کے بہترین گائنا کولوجسٹ سے اپائنٹمنٹ لی تھی۔ ڈاکٹر پال آرمسٹرونگ ایک بہت اچھے گائنا کالوجسٹ تھے۔ پہلے ہم بارٹ ہاسپٹل میں ان سے مل چکے تھے پھر ہم نے پرائیویٹ اپائنٹمنٹ لی تھی۔ انہوں نے ہمیں پرسکون رہنے کا مشورہ دیا تھا اور ہمیں سمجھایا تھا کہ ہم تحمل سے قدرت کی مہربانی کا انتظار کریں۔ انہوں نے ٹیا کے لئے چند طاقت کے کیپسولز تجویز کر دیے اور ہمیں پر امید رہنے کی تلقین کرتے ہوئے رخصت کر دیا تھا ڈاکٹر پال سے مل کر ٹیا خوش تھی اور میں اس کی خوشی میں خوش تھا۔ ہماری ازدواجی زندگی مکمل طور پر سیٹ ہو چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بے حد کامیاب تھے۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی۔

یہ 2003 کی بات ہے۔ میں نے اپنے نئے ناول پر کام شروع کرنے کے لئے ہوم ورک شروع کر دیا تھا۔ مجھے ذہنی طور پر بہت اطمینان تھا۔ میرا نیا ناول میرے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں نے اس موضوع پر یا اس طرح کے موضوع پر ابھی تک کوئی کام نہیں کیا تھا۔ میں نے ابھی تک ٹیا سے بھی اس ناول کے متعلق بات نہیں کی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب ہر وقت اولاد کے جلد از جلد حصول کے لئے نجانے کون کون سی مذہبی رسومات کی ادائیگی میں مصروف رہتی تھی۔ وہ چند مہینوں کے لئے انڈیا بھی گئی تھی۔ اس نے آئیوریدک علاج بھی کروایا تھا مگر پھر بھی تاخیر ہو رہی تھی اور اسکی وجوہات نامعلوم تھیں۔ ٹیا اور میں جب بھی فراغت سے مل بیٹھتے وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند کرتی تھی۔ یہ امر میرے لئے اکتاہٹ کا باعث بھی بن جاتا تھا لیکن میں اسے کہتا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا ایک عورت کے لئے یہ بہت حساس موضوع ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ ادھیڑ عمری کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھ رہی تھی لیکن ہم اس سلسلے میں بے بس تھے جبکہ ٹیا یہ بات سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی تھی حالانکہ میں اسکو خوش رکھنے کا ہر جتن کرتا تھا لیکن میری کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے نئے ناول کے لئے چند حیرت انگیز کتابیں خریدی تھیں۔ میں ان کے متعلق ٹیا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی بھی کتاب پڑھنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن وہ میری باتوں میں دلچسپی ضرور لیتی تھی اور مجھے یہ اچھا لگتا تھا لیکن ٹیا اولاد کے مسئلے پر اتنا الجھی ہوئی رہتی تھی کہ اس کا ذہن کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ دنیا مذاہب کی وجہ سے جس قدر اذیت کا شکار ہو رہی ہے اتنا شاید ہی کسی اور عنصر نے دنیا کو برباد کیا ہو۔ مذاہب بالخصوص تنگ نظر شدت پسند مذاہب نے ہماری نسلوں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے اور یہ بات کس سے ڈھکی چھپی ہے کہ مذہب اسلام جسے نام نہاد امن کا مذہب کہا جاتا ہے دنیا کا سب سے تنگ نظر مذہب ہے۔ آپ ان کے مردوں کو دیکھیں تو انتہائی دوغلے، دھونس جمانے والے ہر شخص کو جہنم کی آگ سے ڈرانے والے ۔۔۔ حلال حرام کی تسبیح پڑھ پڑھ کر ہر فطری تقاضے کو مارنے کا درس دینے والے ۔۔۔ اپنی عورتوں کو ٹینٹ پہنا کر پھراتے ہیں جبکہ ہماری چھوٹی بچیوں

کو ہراساں کرنے سے بعض نہیں آتے۔ آپ بیڈفورڈ یا رو چڈیل کا چکر لگا ئیں آپکو ہر غیر قانونی کام میں مسلمان ملوث نظر آئیں گے اور المیہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے ملک کو یرغمال بنالیا ہوا ہے۔ ان علاقوں میں پولیس بھی ان پر ہاتھ جلدی نہیں ڈالتی کہ پھر یہ مذہب کو آڑ بنا کر فساد برپا کرتے ہیں اور ہماری حکومت سو رہی ہے اس کو اتنی فرصت نہیں کہ امیگریشن کی کوئی ٹھوس پالیسی ترتیب دے لے۔ ہر سال ہزاروں لوگوں کو پلیٹ میں رکھ کر برطانوی شہریت تحفے میں دینے کا مقصد کیا ہے۔ مجھے تو کبھی یہ سمجھ میں نہیں آسکا یہ لوگ اپنے ملکوں میں کیوں جا کر نہیں رہتے۔ ہم کیوں ان طفیلیوں کو اپنی نسلوں کے خون پر پال رہے ہیں" مسٹر رابنسن کی آواز رندھ گئی تھی اور ان کا گلا سوکھا ہوا لگتا تھا۔

آپ کبھی لوٹن آئیں سر آپکو لوٹن میں اور لاہور میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ اتنے مسلمان ہیں کہ لگتا ہے ہم ان کے مقدس شہر مکہ میں موجود ہیں۔ یہ کالے کالے لمبے لمبے گارمنٹ پہنے عورتیں نظر آئیں گی مرد ہیں تو وہ چہروں پر جھاڑ جھنکار بڑھائے رعونت سے ہماری سرزمین پر ہماری گلیوں میں ہمارے بچوں کو شریعت کے نفاذ کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ مجھے بتائیں مسٹر گرانٹ یہ کیسا امن کا مذہب ہے۔ جو عورت کو دیکھ لینے پر جہنم کی آگ میں جھلس جانے کا ڈراوا دینے لگتا ہے۔ جو بچیوں کو ان کی پسند کا لباس پہننے پر لتاڑتا ہے۔ جہاں مرضی کی شادی نہیں کر سکتے۔ من پسند عورت کا ہاتھ شادی سے پہلے نہیں پکڑ سکتے اسے گلے نہیں لگا سکتے۔ ایسی تنگ نظری کہ عورت کو ابارشن کروانے پر گنہگار قرار دیا جاتا ہے۔ عورت اپنی مرضی سے اپنا لائف پارٹنر نہیں چن سکتی۔ مسلمان وائن پی لے یا پورک کھالے تو اسکا عمل حرام ٹھہرتا ہے"

"اتنی تنگ نظری، اتنی گھٹن کسی اور مذہب میں نہیں ہے اور ستم ظریفی یہ کہ مسلمان یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ سے التجا ہے میری کہ کبھی انکے علاقوں کا ان کے اسکولز کا معائنہ کریں۔ آپ پریشان ہو جائیں گے۔ آپکو ایسی ایسی کہانیاں سننے کو ملیں گی کہ اپنے کانوں پر یقین نہیں آیگا۔ ان کی اسی سوچ کی وجہ سے ان کے ملکوں میں جرائم کا ریٹ باقی تمام دنیا سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ خودکش بمبار، یہ دہشت گرد یہ حقوق پامال کرنے والے، یہ دھوکے باز" یہ مسٹر رابنسن کی آواز تھی۔ اشتعال ان کے ہر ہر لفظ سے عیاں تھا۔ یہ ایک چار رکنی گروپ تھا جو لوٹن کے رہنے والے تھے اور یو پی ایل سے وابستہ تھے۔ یو پی ایل ایک سفید فام لوگوں کی بنائی ہوئی تنظیم تھی اور ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ تنظیم "المہاجرون" کو کڑا جواب دینے کے لئے بنائی تھی۔ "المہاجرون" افغانستان پر نیٹو فورسز کے حملے کے بعد ریڈیکل مسلمز کی جانب سے بنائی گئی تھی۔ میں نے اس تنظیم کے بارے میں اخبار میں پڑھ رکھا تھا کہ یہ تنظیم آئے دن احتجاج کرتی تھی اور یہ لوگ علاقے میں خوف و ہراس کا باعث بن رہے تھے۔ اخبارات کی جانب سے اس تنظیم کو فاشسٹ قرار دیا جا رہا تھا۔ اسی لئے یو پی ایل سے وابستہ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ سب مجھ سے میرے نئے ناول کے سلسلے میں ملنے کے لئے آئے تھے۔ مسٹر ہیرن وہ شخص تھے جن سے میری ملاقات پرتگال میں ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے لوٹن کے متعلق چند بہت خوفناک باتیں بتائی تھیں اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ان مسائل کو ہائی لائٹ کرتے کے لئے اپنے اگلے ناول میں لوٹن اور اسکی نوجوان نسل کو موضوع بناؤں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے ہی ملک میں اقلیتوں کی طرح رہنے پر مجبور ہیں۔ ہماری پہلے بھی ایک ملاقات ہو چکی تھی اور اب یہ لوگ لندن میں مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ میں نے باضابطہ طور پر ان سے ہامی نہیں بھری تھی لیکن میں رضامند تھا کہ یہ موضوع مجھے بھی اچھا لگا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا تا کہ یہ جانچ سکوں کہ یہ میرے لئے کتنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

"ہم راشسٹ نہیں ہیں۔۔ہم اسلام کے خلاف بھی نہیں ہیں۔وہ لوگ جو لبرل سوچ کے مالک ہیں اور ہمارے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں ہم انہیں ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں، ہمارا اختلاف صرف اور صرف ان مسلمانوں کے ساتھ ہے جو تنگ نظر ہیں، دہشت گرد ہیں اور ہر وقت شریعہ (شریعت) کے نفاذ کے متعلق درس دیتے ہیں۔ان سب فاشسٹ مسلمانوں سے میرا صرف ایک سوال ہے کہ یہ لوگ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں کیوں آتے ہیں۔ہر گزرتے دن کے ساتھ انکی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور سب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ہمیں کوئی تو بتائے کہ یہ کیوں آتے ہیں۔یہ اپنی تنگ نظری، اپنی گھٹن زدہ سوچ کے ساتھ وہیں کیوں نہیں رہتے۔ہماری نسلوں نے اس مقام تک آنے میں بہت محنت کی ہے۔ہم کسی کا استحصال کئے بغیر ترقی کی ان منزلوں تک پہنچے ہیں جبکہ یہ مسلمان ہماری ٹانگیں کھینچ کر اس ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔یہ خود محنت کیوں نہیں کرتے۔یہ خود کیوں اپنے آپ کو کسی قابل نہیں بناتے۔یہ الٹے سیدھے ہتھکنڈوں سے کب تک ہمیں نقصان پہنچاتے رہیں گے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیسے ان دہشت گرد مسلمانوں کو اپنی نسلوں کو تباہ کرنے کی اجازت دیں۔یہ ہمارے بچوں کو اپنی غلط روایات کے شکنجوں میں کس رہے ہیں۔آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان علاقوں میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ہمارے بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ حرام حلال کیا ہے۔یہاں کے اسکولز میں بچیوں کو حجاب کی اہمیت پر لیکچر دیئے جاتے ہیں۔لوٹن میں جتنی بھی فاسٹ فوڈ چینز ہیں وہاں پر حلال میٹ استعمال ہوتا ہے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ خود تو ہماری لڑکیوں سے تعلقات بڑھاتے ہیں لیکن اپنی مسلمان لڑکیوں کے ہمارے لڑکوں سے ملنے پر مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔دوغلا پن یہ ہے کہ یہاں ہماری بچیاں اپنی پسند کے لباس میں باہر نہیں نکل سکتیں۔یہ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں کہ اپنے فطری تقاضوں کو مار کر زندہ رہنا سیکھو اور پھر توقع کرتے ہیں کہ ہم بھی اپنے بچوں کو ایسی تنگ نظری کے ساتھ تربیت کریں۔ہم بہت مشکل میں ہیں۔ہمیں آپ جیسے بڑے لوگوں کی معاونت چاہیئے۔ہم نے ابھی کچھ نہیں کیا تو اگلے چند سالوں میں یہاں ایک نئی اینگلو مسلم نسل تیار کھڑی ہوگی اور تب ہمیں رونے اور منہ چھپانے کے لئے دیوار کا سہارا بھی نہیں ملے گا۔"

وہ بتا رہے تھے اور رونگٹے میرے کھڑے ہو رہے تھے۔میں "اسلام" کے بارے میں اتنا زیادہ نہیں جانتا تھا۔میری زندگی میں بہت پہلے کچھ لوگ آتے رہے تھے جن کے ساتھ میرے روابط رہے تھے۔انکی بہت سی باتوں نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میں وہ باتیں بھولتا چلا گیا تھا۔6 اسٹینڈرڈ میں سکول میں ایک پراجیکٹ کیا تھا اور اپنی کلاس ٹیچر کے ساتھ مسجد دیکھنے بھی گیا تھا۔اتنی سی ہی معلومات تھیں میری، اسی لئے یہ باتیں میرے اوسان خطا کئے دے رہی تھیں۔اتنی بری صورتحال کے بارے میں تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔یہ حقیقت تھی کہ لوٹن میں کچھ عرصے سے جرائم کی شرح بڑھ گئی تھی اور نت نئی خبریں سننے کو مل رہی تھیں لیکن جتنی خوفناک باتیں یہ لوگ بتا رہے تھے اسکا تصور بھی نہیں کیا تھا میں نے۔۔۔

"ہم آپ سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ایک ناول لکھیں جس میں ان تمام مسائل کی نشاندہی کریں۔" مسٹر ٹیرن نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"سر! صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کرنی اسکا حل نکالنا ہے اسکی جڑ کو پکڑنا ہے۔" مسٹر فلاں جو ساری گفتگو کے درمیان چپ بیٹھے رہے تھے، بولے

"جڑ؟" میں نے انکا چہرہ دیکھا۔وہاں عجیب سے تلخ رنگ بکھرے تھے۔مجھے لگا میرا سارا وجود کڑوا ہونے لگا ہے۔

☆ ☆ ☆

"تم اچھا نہیں کر رہے" مجھے اپنے عقب سے چبھتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میری پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئی تھیں۔

"میں نے کچھ برا ابھی نہیں کیا" اپنے سامنے پڑے کاغذات کے پلندے کو غیر دماغی سے دیکھتے ہوئے میں نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

مجھے غصہ آیا ہوا تھا۔ میں بہت چاؤ سے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے سب کام نپٹا کر بیٹھا تھا اور وہ ٹی وی پر عورت اور اس کی صحت سے متعلق کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ ایک گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے صرف وہ پروگرام ہی دیکھا تھا اور میرے اصرار پر بھی ثنیا نہیں اٹھی تھی۔ میں کہیں باہر جانا چاہتا تھا جبکہ اس کی ساری دلچسپی ٹی وی میں تھی اور اب جب میں اکتا کر اسٹڈی میں آگیا تھا تو وہ مجھ سے شکوہ کرنے آگئی تھی۔ میں اگر اس کے پاس بیٹھا رہتا تب بھی اس نے یہی باتیں کرنی تھیں کہ ہم کب صاحب اولاد ہوں گے، قدرت ہم پر کب مہربان ہوگی، اولاد ہماری تکمیل کا ذریعہ ہے وغیرہ وغیرہ اور میرے پاس ان سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ میرے پاس اب ان سوالوں کو سنتے رہنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ انسان ایک ہی موضوع پر کب تک توجہ مرکوز رکھ سکتا ہے۔ یہ حقیقت تھی میں واقعی اکتا چکا تھا۔

"تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو بل۔۔۔ مت کرو ایسا میرے ساتھ" وہ اکتائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔ میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے بحث کر کے ہار جاتا تھا۔ میں اسے سمجھا نہیں سکتا تھا کہ میں اسے نظر انداز نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ مجھے نظر انداز کر رہی تھی۔ میں اس کی زندگی میں کہیں نہیں رہا تھا۔ "اولاد" اس کی زندگی کا نیوکلئس بن چکی تھی اور نیوکلئس تو ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ صبح شام اسی ایک موضوع پر بات کرتی تھی۔ اس کے متعلق سوچتی رہتی تھی۔ ہماری شادی کو چوتھا سال شروع ہو چکا تھا اور وہ اولاد جسے ثنیا اپنی تکمیل کا ذریعہ سمجھتی تھی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ ہم نے آذرویدک علاج کروایا تھا۔ ہم ہومیو پیتھی آزما چکے تھے۔ تیسرے مرحلے پر روحانی علاج کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں تھکنے لگا تھا۔ میری ذہنی صحت بگڑ رہی تھی۔ ثنیا میری بات سمجھتی نہیں تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میرا کام کس قدر ذہنی توجہ اور ارتکاز مانگتا ہے۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے اپنے نئے پراجیکٹ پر کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ میں جب بھی لکھنا چاہتا تھا میری ذہنی رو بھٹک جاتی تھی۔ میں عجیب مشکل میں پھنسا تھا۔ میرے ساتھ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میرا ذہن اس قدر منجمد ہوا ہو۔ ذہنی انجماد میرے لئے بہت پریشانی کا باعث تھا۔ میرا ہنر میرا پیشہ نہیں تھا لیکن میرا اوڑھنا بچھونا، میرا جینا مرنا ضرور تھا۔ میرا دلی سکون میرے لکھنے سے مشروط تھا۔ ایک طرف میں ذہنی بانجھ پن کا شکار ہو رہا تھا تو دوسری طرف ثنیا الگ مجھے بے سکون کر رہی تھی۔ ہم ہر وقت اسی موضوع پر بات کرتے تھے بلکہ بات تو وہ کرتی تھی میں تو صرف خاموش رہ کر سنا کرتا تھا۔ ثنیا مجھے ذہنی طور پر لاچار کر رہی تھی۔ ہمارے درمیان جھگڑے بڑھ گئے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی موجودگی سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ ثنیا اس کیلئے مجھے ذمہ دار ٹھہراتی تھی جبکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ اولاد کی خواہش کیلئے بے صبری کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سب کچھ قدرت پر چھوڑ دے تو ہمارے درمیان پہلے جیسے تعلقات ہو سکتے تھے۔

"میں تمہیں نظر انداز کر رہی ہوں؟ تمہیں پتا بھی ہے نظر انداز کرنا کیا ہوتا ہے؟ تم کبھی ان کتابوں کی دنیا سے نکلو تو تمہیں پتا چلے کہ تمہارے ارد گرد بسنے والے انسان تمہاری توجہ کے منتظر ہیں۔" ثنیا کی آواز ابھی بھی عقب سے سنائی دی تھی۔ اس کی آواز میں طنز کی آمیزش تھی۔ مجھے یکدم جانے کیا ہوا۔ اس کا طعنہ نیا نہیں تھا۔ وہ یہ بات پہلے بھی کہتی رہتی تھی لیکن مجھے اتنا برا پہلی بار لگا تھا میرے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں۔ میرے بدن میں جیسے بجلی

دوڑ گئی تھی۔ میں نے اپنے سامنے میز پر پڑی ساری کتابیں اور کاغذات ہاتھ مار کر گرا دیئے تھے۔

ثیا۔۔۔ تمہیں میری کتابوں سے اتنی چڑ ہے تو تم چھوڑ دو مجھے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں تھک گیا ہوں تم سے۔۔۔ تم نے میری زندگی کو آزار بنا کر رکھ دیا ہے۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کسی جوہڑ سے کم نہیں ہے۔ تم مجھے گندے پانی کا خوردبینی کیڑا کہا کرتی تھی، حقیقت یہ ہے ثیا کہ میں اب تم سے شادی کے بعد خوردبینی کیڑا بن چکا ہوں" میں غرا کر بولا تھا۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ میرے کانوں اور جبڑوں میں درد کی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"تم نے اولاد کی گردان کر کر کے مجھے عجیب سے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ رہنے لگا ہوں۔ تم کو اگر اولاد کا اتنا ہی شوق تھا تو تم تیس سال کی عمر میں شادی کر لیتی۔ اس بڑھاپے میں شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی" میں نے مزید کہا تھا۔ ہمارے معالج کا یہی کہنا تھا کہ تاخیر کی وجہ ثیا کی ادھیڑ عمری ہے۔ میرے سر میں درد کی اتنی لہریں اٹھ رہی تھیں کہ مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے ثیا کو اپنے قریب آتے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ میرے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

بل تم ٹھیک ہو نا۔۔۔ تم بیٹھ جاؤ۔۔۔ یہاں بیٹھ جاؤ تم" ثیا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے کہا تھا۔

"تم پانی پیو بل" اس نے مجھے گلاس تھمایا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے غائب دماغی کی حالت میں گلاس تھام لیا تھا۔ ثیا میری پشت سہلانے لگی تھی۔ مجھے نہیں پتا وہ کب تک ایسا کرتی رہی تھی۔ میری حالت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی تھی۔ میں نے آنکھیں پھیلا کر ثیا کا چہرہ دیکھا۔ وہ ابھی بھی خوبصورت تھی۔ وہ ابھی بھی میرے دل کے قریب تھی۔

"مجھے معاف کر دو ثیا۔۔۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مجھے معاف کر دو" میں لاچاری کے عالم میں بولا تھا۔ ثیا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"تم ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے بل۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں" وہ میرے لئے بے حد پریشان تھی۔ مجھے بے پناہ شرمندگی ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا ثیا۔۔۔ مجھے کیا ہوا تھا؟" میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ مجھے واقعی نہیں پتا تھا کہ مجھے یکدم کیا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے بعد اگلے کئی دن میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ کسی شخص سے نہیں ملا تھا۔ میں اپنی زندگی میں ہونے والی ان تبدیلیوں پر غور کرتا رہا تھا جو گزشتہ چوبیس پچیس مہینوں میں بہت تیزی سے رونما ہوئی تھیں۔ میں جسمانی اور روحانی طور پر کچھ مسائل کا شکار تھا لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس سے اس متعلق بات کروں۔ میرے لئے یہ امر بہت تکلیف دہ تھا کہ میں لکھ کیوں نہیں پا رہا تھا۔ پہلے تو میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ میں ایسا کوئی کام کروں اور اگر میں زبردستی کچھ لکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا تو میرے دماغ کی رگیں تن جاتی تھیں، مجھے خوامخواہ غصہ آنے لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا میں اپنی سب چیزوں کو آگ لگا دوں۔ میں ہائپر ٹینشن ہو رہا تھا۔ اسی لئے میں نے سوچا تھا کہ اب میں کچھ عرصہ اپنی ساری روٹین سے جان چھڑا کر پرسکون رہنے کی کوشش کروں گا۔ میں ثیا کے ساتھ اپنے برے رویے کا ازالہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہم

دونوں نے ایک دوسرے سے معافی مانگی تھی اور نئے سرے سے زندگی کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ہم نے ایک نئے معالج سے رابطہ کیا تھا۔ انہوں نے ہمیں کم سوڈیم اور کم چکنائی والی غذاؤں کے استعمال کا مشورہ دیا تھا اور ساتھ ہی انہوں نے ہمیں ایک صوفی کلینک کا پتا بتایا جہاں روحانی اور نفسیاتی علاج کیا جاتا تھا۔ ان سے مل کر ہماری امید بندھی تھی کیونکہ انہوں نے ہمیں آئی وی ایف (غیر مصنوعی طریقہ تولید) کی تجویز دی۔ یہی تجویز پہلے معالج نے مسترد کر دی تھی اور وجہ یہی تھی کہ تیا کی عمر چالیس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس کی کامیابی کے امکانات کافی کم تھے اس کے باوجود ہم نے ہر حال میں پر سکون رہنے کا تہیہ کیا تھا۔ اگلے چند مہینے بہت مطمئن اور پر سکون گزرے تھے۔ آئی وی ایف کے طویل اور صبر آزما سائیکل شروع ہو گئے تھے اور یہ چھٹا سائیکل تھا جب بالآخر قدرت کو ہم پر ترس آ گیا تھا۔ تیا ماں بننے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا کر رہے ہو؟" تیا نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی میرے پاس آ کر بیٹھی تھی۔ میں مسکرایا۔ ابھی ابتدائی مہینے تھے مگر وہ ایسے چلتی تھی جیسے ملکائیں دھیرے دھیرے قدم اٹھایا کرتی ہیں۔ اس کے وجود پر حاملہ عورتوں والے کوئی اثرات ظاہر نہیں ہونا شروع ہوئے تھے مگر وہ اپنے آپکو پورے دنوں کی حاملہ عورت کی طرح سنبھال سنبھال کر استعمال کر رہی تھی۔ وہ اتنی پر سکون لگتی تھی کہ مجھے اسے دیکھ دیکھ کر اطمینان ہونے لگتا تھا۔ کیا وہ واقعی مکمل ہونے جا رہی تھی۔

ہم دونوں بہت خوش تھے۔ میرا ذہنی ارتکاز لوٹ رہا تھا۔ میرا اپنے کام میں دل لگنے لگا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اپنی چیزیں نکال کر میز پر سجالی تھیں۔ میں اپنے نئے ناول پر کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ تنگ نظر شدت پسند مذاہب دنیا کے لئے واقعی ناسور تھے۔ میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ میں اب تمام تر مواد کو لفظوں کو روپ دے کر دنیا کے سامنے لانے کے لئے تیار تھا۔ میری نئی تخلیق میرے بچے کی آمد پر دنیا کے سامنے لانے کے لئے مجھے تمام کام تیزی سے کرنا تھا سو یہ وقت مناسب تھا کہ میں کام شروع کر دیتا۔ یونی ایل بھی چاہتی تھی کہ میں اس سال کے اختتام تک یہ ناول مکمل کر لوں۔ ان کا دباؤ بھی بڑھ رہا تھا۔

"میں نے نئے ناول پر کام شروع کر دیا ہے" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ میں خوش ہوں کہ تم اپنے کام کو وقت دے پا رہے ہو۔۔۔ اس ناول کا کیا عنوان ہے" وہ پوچھ رہی تھی۔

"میں نے ابھی نہیں سوچا۔۔۔ میں پہلے کام مکمل کروں گا اس کے بعد عنوان کا فیصلہ ہو گا۔۔۔ تم کچھ مدد کرنا چاہو گی" میں نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"تم نے مجھے ابھی تک اس کے موضوع کے بارے میں کچھ نہیں بتایا" اس نے کہا تھا۔

"صحتمند معاشروں کو لاحق سب سے بڑی بیماری، سب سے بڑا ناسور۔۔۔ تنگ نظر مذاہب۔۔۔ میرے اس ناول کا موضوع ہے۔ میں اس ناول میں دنیا کو بتاؤں گا کہ انہیں مذاہب کے چنگل سے نکل کر انسانیت کو اپنانا پڑے گا" میں نے پر جوش انداز میں بتایا تھا۔

"میں ایک بہت منفرد طریقے سے لوگوں کو اس جھنجھٹ سے نکلنے کا طریقہ سمجھاؤں گا۔ یہ ناول مسلمانوں کے بارے میں ہے اور میں بہت

پر امید ہوں کہ یہ دنیا بھر میں سراہا جائے گا۔" میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ میری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"دلچسپ لگ رہا ہے۔۔۔تفصیل سے بتاؤ" ٹیا نے کہا تھا۔ میں نے اپنے اندازِ نشست کو آرام بناتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ میں تو خود منتظر تھا کہ وہ پوچھے تو میں اس کے ساتھ چیدہ چیدہ نکات زیرِ بحث لا سکوں۔

"یہ ناول مسلمانوں کے آخری نبیؐ (حضرت محمد ﷺ) کے بارے میں ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ کچھ روز بعد کی بات ہے، ہر چیز ٹھیک چل رہی تھی، میرا لکھنے کا کام تیزی سے جاری و ساری تھا۔ ٹیا کی صحت بھی ٹھیک تھی۔ وہ ادویات اور خوراک کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ ہم اور ہمارا معالج سب مطمئن تھے کہ اچانک جو امید بندھی تھی، ختم ہو گئی۔ ٹیا رات کو پرسکون نیند لے رہی تھی مگر صبح بیدار ہونے پر اس نے ناسازیٔ طبیعت کا بتایا۔ میں اسے کلینک لے گیا اور بس سب ختم۔۔۔۔ یہ کوئی اتنی غمناک بات نہیں تھی لیکن ایک ادھیڑ عمر جوڑے کے لئے جو فرٹیلیٹی کلینکس کے چکر لگا کر اس خوشی کو حاصل کر پایا ہو۔ اس کے لئے یہ غم اندوہناک تھا۔ میں کچھ دنوں میں سنبھلنے لگا مگر ٹیا سنبھل نہیں پائی تھی۔ وہ اگلے چند ہفتوں میں جیسے بالکل ٹوٹ کر رہ گئی۔ میں ذہنی طور پر اس کی وجہ سے بے اطمینان تو تھا مگر میں نے اسے حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اسی لئے میں ان دنوں تیزی سے لکھ رہا تھا۔ میں جلد از جلد کام ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی ذہنی رو کو بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ ای ڈی ایل انتظامیہ بھی مزید مہلت دینے کو تیار نہیں تھی لیکن میرا پرانا مسئلہ پھر عود کر آیا تھا۔ میں رات بھر لکھتا تھا اور دن کو غیر مطمئن ہو کر اسے تلف کر دیتا تھا۔ میرے لفظ اپنی کشش کھو رہے تھے، میرا ہنر زنگ آلود ہو رہا تھا جبکہ دوسری جانب ٹیا نے میری زندگی کو مشکل ترین بنا دیا تھا۔ اس کا رونا ہی ختم نہیں ہوتا تھا۔ ہر تیسرے روز پینک اٹیک اسے لاغر کر رہے تھے۔ وہ اپنے ہر مسئلے کے لئے مجھے موردِ الزام ٹھہراتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک بار پھر فاصلہ اور جھگڑے بڑھنے لگے تھے پھر ایک روز ایک عجیب بات ہوئی۔ سارے جھگڑے، مسئلے ایک دم ختم ہو گئے۔

ٹیا نے خودکشی کر لی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں، ہم سب گواہ بنتے ہیں تا کہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نا کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔"

وہ آواز اتنی خوبصورت تھی کہ ایک لمحے کے لئے میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ ہمیں سیشن سے پہلے بتا دیا گیا تھا کہ آج ایک مسلم لیکچر ہو گا مجھے اتنا تو سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ شخص مسلمانوں کی مقدس کتاب (قرآن کریم) کی تلاوت کر رہا تھا لیکن اس تلاوت کا مفہوم مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ اس آواز نے مجھے ٹرانس میں لے لیا تھا مجھے بہت عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ میں اس وقت بلیک برن کی اسی سوفی کلینک میں موجود تھا جہاں کا پتا ہمیں ہمارے گائنا کالوجسٹ نے دیا تھا۔ ٹیا کی زندگی میں بھی ہم اس کلینک پر آتے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز جگہ تھی۔ ہم ہفتے میں ایک بار ہی یہاں آپاتے تھے لیکن اس کے لیکچرز اور یوگا سیشنز کا اثر اتنا مثبت تھا کہ ہم بہت عرصہ اسی سحر انگیز کیفیت میں رہتے تھے۔

اس کلینک کی اچھی بات یہ تھی کہ یہاں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آتے تھے لیکن کوئی نامی گرامی لوگ اپنے گھسے پٹے تجربات بیان نہیں کرتے تھے بلکہ عام لوگ اپنے عام سے انداز میں اپنی کمزوریوں مجبوریوں اور پھر اس کے بعد ملنے والی کامیابیوں کا تذکرہ کر کے سب کی ہمت بندھاتے تھے۔ نیا کی خودکشی نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ مکمل ہونے چلی تھی اور میں نے اسے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی تھی۔ یہ احساس مجھے سونے نہیں دیتا تھا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میری ذہنی حالت مخدوش ہو چکی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے بے ہوشی کی کیفیت محسوس کرنے لگتا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو جاتا تھا جبکہ میری میڈیکل رپورٹس ثابت کرتی تھیں کہ میں بالکل فٹ ہوں۔ میری حالت عجیب ہو گئی تھی۔ میں کچھ لکھنے کے قابل نہیں تھا۔ میرا ہنر کھو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر وہی پرانا بارہ سال والا بلی تھا۔ نامکمل شکست خوردہ تھکا ہوا مایوس۔۔۔ خواب جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ آنکھ جیسے کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلی تھی تو روشنی ہونی چاہیے تھی مگر روشنی نہیں تھی۔۔۔ میرے اردگرد اتنی تاریکی کیسے ہو گئی تھی۔ میں روشنی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا اس جگہ آیا تھا لیکن کیا روشنی تلاش کرنے سے مل جایا کرتی ہے۔ یہ سیشن خاص طور پر ڈپریشن کے مریضوں کے لیے مختص تھا۔

ہمارے سامنے ایک بیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔ وہ جب ہال میں آیا تھا تو اس کی شخصیت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ ڈرپوک بزدل سا انسان لگتا تھا لیکن جب اس نے تلاوت شروع کی تو ہم سب مسحور ہونے لگے تھے۔ ہال میں نیلگوں اور دودھیا روشنی کے درمیان مؤدب ہو کر بیٹھنے اور اس کلام کو سننے میں عجب سا سکون پورے وجود میں اترتا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس لڑکے نے عربی کے بعد انگلش میں ترجمہ سنانا شروع کیا تھا۔

ترجمہ کو سن کر مزید دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لڑکا اپنا کام ختم کر کے وہاں سے اٹھ گیا تھا پھر ایک عربوں کے مخصوص جبے میں ملبوس ایک شخص ہمارے سامنے آ بیٹھے تھے۔

اس آیت میں "عہدِ الست" کا ذکر ہے۔ وہ کہہ رہے تھے۔۔۔

آپ میں سے بہت سے لوگوں نے اس لفظ کو شاید پہلی بار سنا ہو لیکن آپ نہیں جانتے کہ آپ اس "عہد" سے ازلوں سے واقف تھے۔ عہدِ الست وہ عہد ہے جو اللہ رب العزت نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بعد ان کی پشت سے ہونے والی تمام اولاد سے لیا تھا۔ اللہ رب العزت نے تمام اولادِ آدم کو اپنے سامنے پھیلایا اور ان سے پوچھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" سب نے جواب دیا "کیوں نہیں، ہم سب رب ہونے کی گواہی دیتے ہیں" وہ شخص بے حد سادہ مگر پُراثر انداز میں بولا تھا۔

"اس عہد کا ایک مطلب تو واضح ہے کہ دنیا کا ہر بچہ دینِ حق پر پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ خالص ہوتا ہے، معصوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کی ذمہ داری اس کے والدین کی ہے وہ اسے جو مرضی بنا دیں۔ رب کی ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت میں ہے۔ یہی عہدِ الست انسان کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اللہ سبحان تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو "حنیف" پیدا کیا گیا ہے یعنی وہ فطرتاً پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہونے والا ہے لیکن شیطان اسے گمراہ کر کے دینِ فطرت سے ہٹا دیتا ہے۔ یہی دینِ فطرت عہدِ الست ہے۔ اسے ہی دینِ حق کہتے ہیں جو ہر دور میں حق تھا، ہے اور رہے گا۔ اس سے دوسری بات جو سمجھ میں آ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا رب روزِ محشر اس عذر کو قبول نہیں کرے گا کہ ہم لاعلم تھے۔" انہوں نے خاموش ہو کر ہال میں بیٹھے تمام لوگوں کو دیکھا۔ مجھے بیزاری محسوس ہوئی۔ دنیا بھر

میں لوگوں نے ڈپریشن کے مسئلے کا یہی حل نکالنا شروع کر دیا تھا کہ مذہب کی طرف راغب ہو جاؤ۔ یہ بات تو مجھے پہلے سے پتا تھی۔ میں اس سیشن میں وہ باتیں سننے نہیں آیا تھا جو میں نے پہلے بھی سن رکھی تھیں۔ میں بے دلی سے ہال سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمیں آپ کے نقصان کا احساس ہے۔۔۔ یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔۔۔ زندگی کے ساتھی کا اس طرح ساتھ چھوڑ جانا بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مسٹر ٹیرن کہہ رہے تھے۔ میں نے فقط سر ہلایا۔

"اب اس بات کو کافی وقت گزر چکا ہے اور یہ بے حد مناسب وقت ہے۔ آپ اپنے نئے پراجیکٹ پر دھیان دیجئے۔ آپ کو توجہ اور ارتکاز دوسری چیزوں کی جانب مرکوز کرنا چاہیئے۔ مسٹر روزبیری بولے تھے، وہ خصوصاً مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں چپ رہا تھا، میرا بولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

2004 اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ ٹیا کو اس دنیا سے گئے کافی مہینے ہو چکے تھے۔ میں کملا چکا تھا، میرے دل میں ٹیا کی طرح خودکشی کرنے کا خیال آنے لگا تھا اور یہ چیز مجھے ڈرانے لگی تھی۔ میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔

"میں یہی نہیں کر پا رہا اسی لئے تاخیر ہو رہی ہے۔۔۔ میں بس کام شروع کرنے ہی والا ہوں" میں نے دھیمی سی آواز میں کہا تھا۔ مسٹر ٹیرن اٹھ کر میرے ساتھ والے کاؤچ پر آ گئے۔

آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک بار ہمارے ساتھ لوٹن چلیں۔۔۔ یہ سب چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔۔۔ خود تجزیہ کریں۔ اس سے آپکو لکھنے میں آسانی ہوگی اور مزید مواد بھی ملے گا۔ آپ کے پڑھنے والے بے چینی سے منتظر ہیں" وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ میری بات مان کر دیکھیں۔۔۔ آپکو ایسے ایسے شعبدہ باز دکھاؤں گا کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔" مسٹر ٹیرن پھر بولے تھے۔

"میں کافی ریسرچ کر چکا ہوں۔۔۔ مواد کی فکر نہیں ہے دراصل میرے ساتھ ہونے والے حادثے نے مجھے ذہنی طور پر لاچار کر دیا ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ میں زود رنج ہو گیا تھا۔

"ایسی صورتحال میں آپ کو ضرور ایک دفعہ لوٹن آنا چاہیئے۔ آپکو دوسروں کے دکھ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ وہ مائیں جن کی اولادیں ان ریڈیکلز نے بگاڑ کر رکھ دی ہیں ان کی حالت آپکو اپنے دکھ بھلا دے گی۔ آپ کا دل ان کے لئے نرم پڑنے لگے گا جو جادوگروں کے ہتھے چڑھ کر سدھ بدھ کھو چکے ہیں" وہ اصرار کرنے لگے تھے۔ میں نے استفہامیہ انداز میں ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں کیا آپ نے نہیں سنا کہ مسلمان جادوگر ہوتے ہیں جو جانے کون کون سے منتر پڑھ کر ہوشمندوں کو دیوانہ کر دیتے ہیں۔ یہ تو ان کے پرانے ہتھکنڈے ہیں" مسٹر ٹیرن کی آنکھوں میں نفرت تھی۔

"کیا لوٹن میں بھی ایسے لوگ ہیں" میں نے پوچھا تھا۔ مسٹر ٹیرن نے سر ہلایا۔ سامنے بیٹھے مسٹر فلپ اس دوران پہلی بار بولے تھے۔

"ان کو نور محمد کے بارے میں بتائیے" انہوں نے مسٹر ٹیرن کو کہا تھا۔

"نور محمد تو بہت ہی بڑا شعبدہ باز ہے۔۔۔ حلیے سے پاگل لگتا ہے۔ جامعہ مسجد میں موذن ہے۔۔۔ موذن پتا ہے آپکو کسے کہتے ہیں؟" وہ مجھے کسی شخص کے بارے میں بتانے لگے تھے۔

"نور محمد" میں نے دل ہی دل میں دوہرایا۔ میں نے یہ نام پہلے بھی سن رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میرے ساتھ کام کرنے میں کیا قباحت ہے" اس نے رضوان اکرم کو کہتے سنا۔۔۔ کانفرنس کا آخری دن تھا۔ ان کے وفد میں بارہ لوگ تھے جن میں سے دس شام کی فلائٹ سے واپس جا رہے تھے۔ شہروز کی اگلے دن صبح کی فلائٹ تھی جبکہ رضوان صاحب دو دن بعد لندن جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے مزید ایک دن ٹھہر جانے کا کہا تھا اور اپنے ساتھ کافی پینے کے لئے بلایا تھا۔ شہروز کے مزاج پر کسلمندی سی طاری تھی۔ عمر سے بات کرنے کے بعد وہ جہاں اچھا محسوس کر رہا تھا وہیں اس کی آخری بات نے اسے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اگر رضوان صاحب نے نا بلایا ہوتا تو شاید وہ کانفرنس کے بعد سارا دن کمرے میں ہی پڑا رہتا۔ اس نے زارا کو فون کر کے اسے کافی سخت باتیں سنا تو دی تھیں مگر اب افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اس کا مزاج کافی خراب تھا لیکن پھر بھی وہ کافی پینے آگیا تھا۔ رضوان صاحب کے ساتھ دو اور لوگ بھی براجمان تھے۔ ایک تو طاہر وارثی صاحب تھے جو سیاست دان تھے شوقیہ کالم نگاری بھی کرتے تھے اور ایک اخبار کے ساتھ بھی وابستہ تھے۔ ان کی رضوان اکرم سے بہت دوستی تھی جبکہ دوسرا شخص سلمان حیدر تھا۔ اسے شہروز یونیورسٹی کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ ان سے کافی سینئر تھا لیکن ان کے ماسٹرز کے دوران وہ ایم فل کر رہا تھا اور اسی وجہ سے شہروز اسے جانتا تھا۔ وہ تیسرے چوتھے سمیسٹر میں ان کی کلاس کو کبھی کبھی ایکسٹرا لیکچر دینے کے لئے آیا کرتا تھا۔ انسان تو بے حد ذہین تھا فری لانسنگ کرتا تھا مگر بہت منہ پھٹ اور بے لچک انسان تھا۔ شہروز اور اس کے دوست اسے ایلٹی کہا کرتے تھے کیونکہ اس کی خودسری کے باوجود ٹیچرز اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے اور شہروز کے ٹولے کو اس کی وجہ یہی نظر آتی تھی کہ وہ ٹیچرز کی خوشامد کرتا تھا اور ان کے ساتھ چپکا نظر آتا تھا۔ وہ چاروں رٹز کارلٹن کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ برنچ ٹائم تھا لیکن بھیڑ بالکل نہیں تھی۔ ان کے علاوہ ایک آدھ سفید فام جوڑا نظر آ رہا تھا۔

"آپ کس کے لئے کام کر رہے ہیں" اس نے پوچھا تھا۔

"یہ تمہارا کنسرن نہیں ہے۔۔۔ تم میرے سوال کا جواب دو" رضوان صاحب نے پوچھا تھا۔

"میں مجبور ہوں۔" شہروز نے اس کے جواب کو سنا پھر خاموشی سے رضوان صاحب کا چہرہ دیکھا۔ انکا چہرہ سپاٹ تھا۔ اسے نجانے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان تینوں کے درمیان وہ مس فٹ تھا۔ اس کے دونوں قابل احترام سینئرز سلمان حیدر کو اس کی نسبت زیادہ قابل سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ شہروز کے مقابلے میں زیادہ شاندار شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ شہروز نے اسے ہمیشہ عام سے حلیے اور کپڑوں میں ہی دیکھا تھا۔

"جس کام میں مجھے فائدہ نا نظر آتا ہو۔۔۔ وہ کام مجھ سے نہیں کیا جاتا سر!" سلمان اپنے مخصوص دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ تمہیں فائدہ نہیں ہو گا" رضوان صاحب نے بھنویں اچکائی تھیں۔

"آٹو میٹک سسٹم ہے سر۔۔۔ نقصان کے سگنلز دور سے پکڑتے ہی میرے اندر الارم بجنے لگتے ہیں۔۔۔ سلمان بیٹا محتاط ہو جاؤ کی آواز میں

میرے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگتی ہیں" اس نے جوس کا گلاس ہاتھ میں پکڑا تھا اور اپنی نشست پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا تھا۔ "سلمان یہ خود فریبی کی عینک اتار کر دیکھو۔۔۔ یہ چھوٹی آفر نہیں ہے۔۔اپنی خوش قسمتی پر ناز کرو اور اوکے بول دو۔۔۔ بہت بڑا پراجیکٹ ہے۔سو پچاس لوگوں کی ٹیم تو عام سی بات ہے۔۔تم نے دیکھا نہیں، ہزاروں لوگوں کا روزگار لگ گیا ہے۔" رضوان صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔

"مجھے کیا ملے گا؟" اس کی سوئی ایک انچ نہیں ہلی تھی۔شہروز کو اکتاہٹ محسوس ہوئی۔وہ نہیں جانتا تھا وہ کس متعلق بات کر رہے تھے۔

"تم نے کب سے تاجروں والے سوال شروع کر دیئے؟" یہ وارثی صاحب کا سوال تھا؟

"تجارت کوئی بری چیز نہیں ہے وارثی صاحب۔۔۔میں نے تو آپ جیسے لوگوں سے ہی سیکھا ہے جو بھی سیکھا ہے" رضوان صاحب مسکرائے۔

"یہ طنز کر رہا ہے وارثی صاحب۔۔۔اس دشت کی سیاحی میں یہ بھی سیاہ ہوتا جاتا ہے"

"ارے بخدا نہیں۔۔۔میں سچ بول رہا ہوں۔۔۔میری مجال کہ طنز کروں۔یہی حقیقت ہے۔جو میں نے بیان کی ہے۔۔۔میں تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے صحافی کا ٹیگ کالر پہ لگا کر گھومنا شروع ہوا ہوں۔یہ تجارت یہ طنز یہ نفع نقصان کی باتیں تو اس دشت کی سیاحی میں پہلے قدم پر ہی سیکھ لیتا ہے انسان۔۔۔عمر گزاریں گے تو نکھر جائیں گے جناب" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ چمکتی ہی رہتی تھی۔اس کی اس خصوصیت سے شہروز پہلے سے آگاہ تھا۔اسے بلاوجہ اطلقی نہیں کہتے تھے وہ دوست۔

"میری بات سنو سلمان۔۔تم نے جتنا نکھرنا تھا نکھر لیا۔۔۔رضوان صاحب نے خود تمہارا نام لیا ہے۔انہیں تم میں کوئی اسپارک نظر آیا ہوگا تو تمہیں اس پراجیکٹ کی آفر کر رہے ہیں۔یہ ایک ترقیاتی پروگرام ہے اور صرف پاکستان میں نہیں ہو رہا۔دنیا بھر میں یو ایس ایڈ تعلیم اور غربت مٹانے کے لئے فنڈنگ کرتی ہے۔برٹش ایڈ بھی تعلیم کی مد میں خرچ جائیگی۔یو ایس ایڈ اور دوسری فارن ایڈز بھی تعلیم ہی کے ضمن میں پیسہ پانی کی طرح بہائیں گے۔تم بھی تر جاؤ گے۔۔۔سب کی خشکی ختم ہوگی۔رضوان کی بات پر غور کرو۔تم قابل بندے ہو۔تم کر سکتے ہو تمہیں پچاس صحافیوں میں سے شارٹ لسٹ کیا گیا ہے تو کوئی بات ہی ہوگی نا۔" وارثی صاحب ہمیشہ بحث ختم کرنے کے لئے میدان میں اترتے تھے۔

"مجھے آج واقعی خود پہ فخر محسوس ہو رہا ہے۔۔۔وارثی صاحب نے میری تعریف میں ساڑھے سات جملے بولے ہیں۔مجھے آج رات نیند نہیں آئیگی۔۔۔حسن والے تعریف سن کر نا جانے کیسے لمبی تان کر سو جاتے ہیں" اس کا انداز غیر سنجیدہ تھا۔

"دھت تیرے کی۔۔۔یہ آدمی ہاتھ سے نکل چکا ہے رضوان۔۔۔اس پہ محنت مت کرو۔۔اس کے سگنلز واقعی پہلے سے ایکٹو ہو چکے ہیں" وارثی صاحب مزاحیہ انداز میں بولے تھے۔

"تمہیں اعتراض کیا ہے" رضوان صاحب نے پوچھا تھا۔شہروز صرف خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ان کے اشارے کنائے اس کے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔اسے صرف اتنا پتا تھا کہ یو ایس ایڈ پروگرام اور دوسری جتنی بھی ایڈز ملک میں آ رہی تھیں وہ صرف تعلیم کی مد میں خرچ ہونی تھیں۔انکا چینل اس پراجیکٹ کے لئے ایک کمپین چلا رہا تھا جس کی پبلسٹی پر خوب پیسہ خرچ ہو رہا تھا لیکن یہ پراجیکٹ تو اس کے علم کے مطابق اب سے کچھ عرصہ پہلے شروع ہوا تھا۔گزشتہ کچھ سالوں میں کئی دوسری این جی اوز صرف تعلیم عام کرنے کے نیک مقصد کے لئے رجسٹر ہوئی تھیں۔

"مجھے اس پراجیکٹ کی نیت پر اعتراض ہے۔۔۔" اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وارثی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس ملک میں جب بھی کسی نے کوئی تعمیری کام کرنا چاہا ہے تو تمہارے جیسے لوگوں نے اس پر ناک ہی چڑھائی ہے۔۔۔آئی ایس آئی تمہیں ایسی باتوں کے الگ پیسے دیتی ہے یا اسی پانچ صفر والی تنخواہ میں ہی سارا کچھ بول دیتے ہو" رضوان صاحب کے چہرے پر بھی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔سلمان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔وہ آپس میں کافی بے تکلف لگتے تھے۔شہروز کو اب کی بار پھر بے چینی سی محسوس ہوئی۔اس سے ابھی تک کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

"جان دیو سر جی۔۔۔آپ کو بھی سب پتا ہی ہے کون کہاں کہاں سے تنخواہ لیتا ہے۔۔۔مجھ معصوم پر تو یہ الزام آئی ایس آئی والے بھی لگا دیتے ہیں جب میں ان کو کوئی عقل والی مت دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ تم امیریکن ایجنٹ ہو۔۔۔حالانکہ میں سب کچھ ہو سکتا ہوں صرف ایجنٹ نہیں ہو سکتا۔میں فنڈنگ پر پلنے والی مخلوق نہیں ہوں" وہ سفاک لہجے میں کہہ رہا تھا۔

او کم آن۔۔دنیا کے ہر ملک میں فنڈنگ آتی ہے۔۔۔ہر ملک شرائط کے ساتھ اس فنڈنگ کو قبول کرتا ہے۔" رضوان صاحب نے ناگواری سے کہا تھا۔

"میں آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن پاکستان شاید واحد ملک ہے جو فنڈنگ لے کر اسے اپنی بربادی کا سامان بنا لیتا ہے" سلمان ابھی بھی اپنے نکتے پر ڈٹا تھا۔

"انڈیا کو بھی تو فنڈنگ ہو رہی ہے تم دیکھو انکی ترقی کا عالم۔۔۔" رضوان صاحب کی بات اس نے کاٹ دی تھی۔

"انڈیا کی بات مت کریں۔۔۔وہ تعلیم کے لئے فنڈنگ نہیں لیتے۔وہ کبھی اپنے نقصان کا سودا نہیں کرتے۔۔مثال کے طور پر وہ فنڈنگ لیتے ہیں انڈین گبھرو جوان اور پاکستانی خوبصورت مگر عقل سے پیدل لڑکی کی رومینٹک فلم بنا کر کشمیری اور پاکستانی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اور پاکستان نے فنڈنگ لی وہ بکواس فلمیں چلانے کے لئے۔۔۔ایسا ہوتا ہے کہیں کہ نیشنل ٹی وی اپنے نیشنل انٹرسٹ کا سودا کریں۔۔۔یہ اس ملک میں ہوتا ہے کیونکہ آپ انکو تعلیم کے نام پر ایسی چیزیں پڑھانے کی باتیں کر رہے ہیں جو دو قومی نظریے کی نفی کرتے ہیں۔"

"یا خدا تم بہت بحث کرتے ہو سلمان۔۔۔یہاں انڈیا کا کیا ذکر۔۔۔یہ ترقیاتی فنڈ کی بات ہو رہی ہے کاموں میں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔یہ بربادی کیسے ہو گئی" وارثی صاحب اکتا رہے تھے اور یہی حال شہروز کا تھا۔

"وارثی صاحب اب آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اس بات سے لاعلم ہیں۔یہ اچھا مذاق کیا آپ نے۔۔۔فنڈز آنے سے پہلے ایک کمپین چلائی جاتی ہے اور ملک بھر میں یہ شور مچ جاتا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم فرسودہ ہے اور ہماری کتابوں میں صرف دہشت گردی اور بربریت کو سکھانے والی باتیں ہیں۔اس کے بعد ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ یہ نصاب سعودی آغوش میں پرورش پانے والے جرنیل کی سازش تھی جو طالبان اور القاعدہ کا حامی تھا اس کے بعد اس ملک میں غیر ملکی تنظیمیں آتی ہیں اور ہمیں بتاتی ہیں کہ ہمارے بچے عدم برداشت کا سبق پڑھ رہے ہیں اور ہمارے اساتذہ بچوں میں جارحیت کو بڑھا رہے ہیں۔ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے اسکولز اور مدرسوں میں جنگجو پیدا ہو رہے ہیں اسکے بعد نصاب از سرِ نو مرتب کیا جاتا ہے اور پھر

اپنی مرضی کے نکات شامل کروالئے جاتے ہیں۔ ایسا نصاب ترتیب دیا جاتا ہے جس میں جہاد، سود، پردہ اور دوسری اسلامی اقدار پر بات کرنا آؤٹ ڈیٹڈ قرار پاتا ہے اور زنا، شراب، رقص و سرود مذہب کی خلاف ورزی نہیں بلکہ کلچرل ویلیوز قرار پاتے ہیں۔ ہماری نسلیں یہ کتابیں پڑھیں گی اور اب جو ان نکات پر اعتراض کرے گا اس پر بنیاد پرست ملا ہونے کا الزام لگا دیا جائے گا اور ملا ہونا اس ملک میں گالی ہے۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لئے چپ ہوا تھا۔

"الزام۔۔۔ یہ الزام نہیں ہے۔۔۔ حقیقت ہے میری جان۔۔۔ اس ملک میں ہر اچھے کام پر بنیاد پرست ملا چیخنے لگتے ہیں اور اگر وہ نا چیخیں تو پھر تم جن کے انڈر کور ایجنٹ ہو وہ چلانے لگتے ہیں۔۔۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارا نظامِ تعلیم فرسودہ ہے۔۔۔ ہمارے نصاب کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی ضرورت تھی۔۔۔ آخر ہم اپنی نسلوں کو کب تک پتھروں کے زمانے کی چیزیں پڑھاتے رہیں۔"

"بنیاد پرست ملائیت کوئی چیز ہی نہیں ہے سر، یہ جتنے بھی مولانا حضرات الٹی سیدھی اسلام کے نام پر غیر اسلامی باتیں پڑھاتے یا بتاتے ہیں یہ خود فنڈنگ اور ایڈز لے لے کر اپنے گھر چلانے والے لوگ ہیں۔ یہ سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں اور یہ دلیل بھی تو پتھروں کے زمانے کی ہے سر جو آپ دے رہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے سے ہم جدیدیت اور اندھی ترقی کے سہانے سپنے دکھا دکھا کر لوٹے گئے ہیں۔ مغربی قومیں ایسے ہتھکنڈوں کا استعمال کرتی رہی ہیں۔ جب برصغیر کے ساحلوں پر ان کے جہاز لنگر انداز ہوئے اور انہوں نے اپنے فائدے کے اسباب پا لئے تو اگلے جہازوں سے عیسائی مشنری آنے لگے۔ میٹھی میٹھی زبانوں میں عیسائیت کی کتابیں تعلیم کے نام پر پڑھائی جانے لگیں۔ ہمیں بتایا جانے لگا کہ ہم چھری کانٹے سے کھانا نا کھا کر کس قدر غلط کر رہے ہیں۔ مخلوط تقریبات کو وقت کی ضرورت اور عوامی مطالبہ قرار دیا جانے لگا۔ ہمارے آباء نے بھی یہ طعنے سنے ہیں اور ہم بھی سن رہے ہیں۔"

"یار تم تو جذباتی ہی ہو گئے ہو،،، اتنا دماغ ہے میرا نا وقت کہ تم پر خرچ کروں۔۔۔ تمہیں سمجھ ہی نہیں آ رہی میری بات۔۔۔ وہ اور وقت تھے جب عوام بیوقوف بن جاتی تھی اب لوگ سیانے ہو گئے ہیں۔۔۔ انہیں آگاہی کی ضرورت ہے، یہ انکی خواہش ہے۔۔۔ یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے، نصاب میں تبدیلی وقت کی ہی نہیں لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔ اب ایک کلک سے دنیا آپ کی آنکھوں کے سامنے کھلتی جاتی ہے ایسی صورتحال میں ہم کب تک انہیں وہی گھسی پٹی ویلیوز پڑھاتے رہیں گے۔ سیدھا بیٹھ، چپ کر جا، پانی پی، شور نا کر یہ باتیں اب بچوں کو سکھانے کا وقت نہیں رہا۔ نصاب بدلنا کوئی غیر ملکی ایجنڈا نہیں ہے تم کیوں نہیں سمجھ پاتے کہ یہ واقعی عوامی مطالبہ ہے۔"

"یہ نصاب نہیں عقیدہ بدلنے کی کوششیں ہیں سر۔ قومیں عقیدوں کے سہارے ترقی کرتی ہیں اور عقیدے ختم تو ہو سکتے ہیں لیکن بدلے نہیں جا سکتے۔۔۔ آپ اپنی نسلوں کو پلنے بڑھنے کے لئے پکی مٹی پر کھڑا کر دیں وہ تناور درخت بن جائیں گی۔ انہوں چٹانوں پر کھڑا کر دیں وہ میٹھے چشمے بن کر بہنے لگیں گی لیکن انہیں دلدل میں مت پھینکیں۔۔۔ وہ دھنس جائیں گی۔" وہ سفاک سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

وارثی صاحب نے اکتائے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔

"اچھا تم کیا چاہتے ہو پھر۔۔۔ ہم غاروں کے زمانے کی لکھی کتابیں الف انار ب بابا پڑھاتے رہیں۔۔۔ تم چاہتے ہو جب دوسری قومیں خلاؤں میں اترنے کی باتیں کریں تو ہمارے بچے پتنگ بنانا اور ہماری بچیاں سوئی میں دھاگا ڈالنے کے طریقے سیکھتے رہیں۔" وارثی صاحب نے کہا تھا

یہ بھی چاہتا ہے۔۔۔اور المیہ یہ ہے کہ ایسے لاتعداد لوگ اس ملک میں موجود ہیں جو کنوئیں کے مینڈک ہیں اور جنہیں ترقی کی باتیں سن کر مجلی ہونے لگتی ہے۔بندہ خدا تم زمانے کا چلن تو دیکھو۔۔دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی یہ اکیسویں صدی ہے۔۔اقوام عالم کی ترقی کا معیار دیکھو اور اپنے واویلے دیکھو۔وہ جتا کر بولے تھے۔

"ترقی...کس نے کی ہے ترقی۔۔۔مجھے بتائیں تو سہی ترقی آخر کہتے کسے ہیں۔۔مصنوعی بادلوں سے بارش برسانے کا نام ترقی ہے یا لیبارٹری کے بنکر میں جانور نما انسان پیدا کرنا ترقی کہلاتا ہے۔۔کونسی قوم نے ترقی کی ہے۔۔۔مجھے بھی تو پتا چلے کہ اقوام عالم نے کون سا ایسا کام کر لیا جو پاکستانی نہیں کر پائے۔آپ چائنہ کی ترقی کی بات کر رہے ہیں؟ مجھے بتائیں کیا ترقی کی ہے اس قوم نے۔۔۔کتے بلی تک تو چھوڑتے نہیں ہیں ٹڈیاں مینڈک کا کروچ سب کھا جاتے ہیں جو چوبیس میں سے بائیس گھنٹے صرف اس لئے کام کرتے ہیں کہ یہ کام ان سے جبراً لیا جا رہا ہوتا ہے۔امریکہ نے ترقی کی ہے جہاں ہر تیسرا انسان اپنے باپ کے اصل نام کو جاننے کے لئے ڈی این اے ٹیسٹ کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے جہاں جانور کو ٹارچر کرنے کی سزا عورت کو ٹارچر کرنے کی سزا سے زیادہ ہے۔۔۔یا پھر برطانیہ اور یورپ نے ترقی کی ہے جہاں ماں باپ اٹھارہ سال کے بعد بچوں کی شکلیں دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ کب ہمارے گھروں سے دفعان ہوں گے اور اولادیں ماں باپ کو ریٹائر ہوتے ہی اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ آتی ہیں۔جہاں بچوں کو ایڈاپشن کے لئے گورنمنٹ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بول رہا تھا۔شہروز نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں سینئرز کو سلمان کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اسے کچھ سی خوشی ہوئی۔اگرچہ اسے سلمان کی دو ایک دلیلوں میں دم لگا تھا۔

"یہ سب بیکار کی باتیں ہیں سلمان۔۔۔تم موضوع سے ہٹ رہے ہو" رضوان صاحب نے کہا تھا۔

نہیں سر یہ بیکار کی نہیں۔۔۔ایک قلمکار کی باتیں ہیں۔۔۔یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔۔۔یہ وہ باتیں ہیں جو یہاں نا ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں نا اخبارات میں چھپوائی جاتی ہیں۔ایک ملک معاشی طور پر خوشحال ہو لیکن وہاں ویلیوز نا ہوں تو آپ اسے ترقی کرنا کہتے ہیں تو پھر میری طرف سے ایسی ترقی کو سات سلام"

بہت خوب تو پھر تم بتاؤ ترقی کس نے کی ہے؟" وارثی صاحب بولے۔

یہ اب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام لے گا۔۔۔جو دنیا بھر میں دہشت گرد بنانے والی فیکٹری کے طور پر بہت ترقی کر چکا ہے۔" رضوان اکرم نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔

بے شک میں پاکستان کا نام لونگا۔یہاں ہی ہوئی ہے ترقی۔۔۔آپ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر اب تک ذرا جائزہ لیں۔۔۔ہم کہاں کمزور پڑے۔۔۔ہم نے اپنے محدود ترین وسائل میں کیا نہیں کر کے دکھایا ہم نے فیکٹریاں لگائیں۔ہم نے اسپورٹس گڈز بنائیں ہم نے سرجیکل گڈز بنائیں ہم نے لیدر گڈز بنائیں۔ہمارے پاس بہترین میزائل سسٹم ہمارے پاس اٹامک پاور۔۔۔کیا کیا نہیں ہے اس ملک کے پاس لیکن یہ وہ باتیں ہیں جو کبھی ہائی لائٹ نہیں کی جاتیں۔یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ہماری مختاراں مائی دکھا دیتے ہیں ہماری عافیہ صدیقی نہیں دکھاتے۔معاشی طور پر کمزور ملک ہونا کوئی برائی تو نہیں ہے۔برائی یہ ہے کہ آپ اخلاقی طور پر کمزور ترین اقدار رکھتے ہوں۔ہم اخلاقی طور پر قطعاً کمزور نہیں تھے۔ہمیں اخلاقی

طور پر تباہ کیا گیا ہے اور مسلسل کیا جا رہا ہے اور یہ اس ملک میں تب سے ہونا شروع ہوا جب ہم نے اپنی اولادوں کی تربیت کی ذمہ داری غیروں کے سپرد کر دی۔ ہم نے اپنی پالیسیز ڈالر اور پاؤنڈز لے کر بنانا شروع کیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو امدادی پروگراموں کے سہارے چھوڑ دیا۔ ہم نے اپنے بچوں کو سکھایا کہ تمیز سے بولنا ضروری نہیں ہے، انگریزی بولنا ضروری ہے۔ آپ کے اندر خوبصورتی نا ہو تو کوئی بات نہیں لیکن آپ کا رنگ گورا ہونا چاہیئے۔ لڑکوں کو سکھایا کہ مضبوط ہونا اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ موبائل پر ستر لڑکیوں سے دوستی ہو جن سے رات رات بھر عقل کی باتیں سیکھی اور سکھائی جا سکیں ٹیکنالوجی کو سستا کر دیا ٹی وی کو نام نہاد کلچرل آئی کون بنا کر مشرف بہ اسلام کر دیا۔ دو قومی نظریے کا تیا پانچہ کر دیا۔ وہ اقدار جن پر کسی بھی صحت مند معاشرے کا ڈھانچہ کھڑا ہو سکتا ہے وہ ہم نے اپنے ہاتھوں ختم کر دیں۔ تباہی یہ نہیں ہوتی سر کہ ایک ملک میں میکڈونلڈز، کے ایف سی، ہارڈیز، نانڈوز یا ڈنکن ڈونٹس کی آوٹ لیٹس نہیں ہیں، تباہی یہ ہوتی ہے کہ آدھا ملک یہ سب کھا کر سکون سے سو سکتا ہے اور باقی آدھا ملک بھوک سے بلکتے بچوں کو سوکھی روٹی پانی سے نرم کر کے کھلانے پر مجبور ہوتا ہے اور سوکھی روٹی کھا کھا کر پلنے والا کب تک تر نوالہ کھانے والے کو خوشی سے دیکھتا رہے گا۔ ایک دن آپکا کہ وہ پھٹ پڑیگا۔ المیہ ہے سر المیہ کہ ہم نے اپنی نسل کو چھوٹے چھوٹے پریشر ککر بنا کر رکھ دیا ہے۔" وہ کافی جذباتی ہو چکا تھا۔

اوہ بھائی اوہ بھائی۔۔۔ اوہ میرے بھائی یہ میرے ہاتھ دیکھ، تیرے آگے جوڑتا ہوں، یہ کسی فوڈ چین کا یا ٹیکنالوجی ریفارمز کی ایڈ نہیں ہے۔ یہ سراسر تعلیمی پروگرام ہے۔ جس کا مقصد تعلیم اور فلاح و بہبود ہے۔ یہ یہاں پر جدید طرز کے اسکولز بنا رہے ہیں۔ سلمان حیدر تمہیں بھی عادت ہی پڑ گئی ہے نارووال جانیوالی ٹرین کو چک جھمرہ لے جاتے ہو۔ ہر بات پر اعتراض کرنے لگتے ہو نئے نئے اسکولز کھلنے سے علم و ہنر بڑھے گا تو آگہی بڑھے گی۔ یہ ترقی کا زینہ ہے تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہر بات پر اعتراض کرنے لگتے ہو" طاہر وارثی صاحب نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"میں آپ کو سچ بتاؤں تو واقعی مجھے ہر بات پر اعتراض ہے۔۔۔ آپ کو پتا ہے میں تعلیم کے خلاف ہوں۔۔۔ میں ہر اس کمپین کے خلاف ہوں جو تعلیم کے فروغ کے لئے چلائی جاتی ہے" شہروز کو پہلی بار سلمان کا اطمینان مصنوعی لگا۔

"تعلیم کوئی چیز نہیں ہے۔۔۔ اصل چیز علم ہے اور علم حاصل کرنے کے لئے مہنگے اسکولز کھول کھول کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ سب لوگ۔۔۔ غریب کو پڑھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ و بس اونچے اونچے گھروں میں پوچا لگانے والی مخلوق ہے۔ وہ آپ کے بچوں کے جوتے سیدھے کرنے کے لئے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ میں اس تعلیمی طبقاتی فرق کے سخت خلاف ہوں، یہ اسی فرق کی وجہ سے ہے کہ ہماری پڑھی لکھی نسل باہر بھاگ رہی ہے۔ ہمارا ملک برین ڈرینج کا شکار ہے۔ ہمارا قیمتی اثاثہ لٹ رہا ہے، یہ سارے پروگرام ہماری محرومیوں میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ یو ایس ایڈ ہو یا برطانوی تعلیمی گرانٹ ان سب کا مقصد صرف ہماری محرومیوں کو بڑھانے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ یہ ہماری نسلوں کے لئے جونکوں کی طرح ہیں۔ آپ اگر اسی نام نہاد تعلیم کے حامی ہیں تو معذرت کے ساتھ اس ملک کو ایسی تعلیم نے غربت کے سوا کچھ نہیں دیا ہے۔ اس فنڈ کے آنے کے بعد یہ عجیب تماشہ شروع ہوا اس ملک میں۔۔۔ ایک کے بعد ایک نئے سے نیا اسکول کھلنا شروع ہو گیا۔ اتنی محنت اور روپیہ پرانے اسکولز کی حالت سدھارنے پر خرچ کیا جاتا تو حیرت انگیز نتائج نکلتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے زمین میں خزانے کا پتا تو ہے مگر چوروں سے بچنے کے لئے اس پر کثیر منزلہ عمارت تعمیر کر لی جائے۔ یہ پرانے اسکول کسی خزانے سے بڑھ کر تھے، ہیں اور رہیں گے اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا۔

میں تو پہلے ہی ایسے کسی پروگرام کے خلاف ہوں اور یو ایس ایڈ کے تو بہت ہی خلاف ہوں۔ یو ایس ایڈ نے آج تک جس ملک میں بھی ترقیاتی کام کئے ہیں وہاں کا بیڑا غرق ہی کیا ہے۔ یہ ترقیاتی پروگرام نہیں یہ میٹھی جو اتا ہے، مارفین ہے۔ یہ میری نسلوں کے لئے نشے سے کم نہیں ہے۔ ان کے ساتھ کام کرنا دلدل پر گھر بنانے کے مترادف ہے۔ میں فطرتاً مزدور بندہ ہوں لیکن میں دلدل پر گھر پھر بھی نہیں بنا سکتا۔ کوئی بھی نہیں بنا سکتا سر" وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن ایسا لگتا تھا اس کے پاس بولنے کے لئے ابھی بھی کافی کچھ ہے مگر رضوان صاحب نے گہری سانس بھر کر ہار مان لی۔

"اچھا ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔۔۔ میں تمہاری ستر فیصد باتوں سے اختلاف کرتا ہوں مگر اس وقت میرے پاس بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے ہار مان لی" وہ بولے تھے، سلمان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

"آپ میرے بزرگ ہیں، میرے استاد ہیں۔۔۔ میں نے آپ سب لوگوں سے ہی سیکھا ہے سر۔۔۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔۔۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ بس آپ فیصل آباد کی بس میں بیٹھے ہیں اور مجھے ساہیوال جانا تھا۔۔۔ مجھے بس بدلنی ہی تھی سر۔۔۔ میں کسی اور ملک کی خارجہ پالیسی کے وسیع ترین مفاد کی خاطر کام نہیں کر سکتا" وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ وارثی صاحب کے چہرے پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ چمکی لیکن رضوان صاحب کا انداز ابھی بھی فارمل تھا۔ سلمان حیدر نے کافی کا سپ ختم کیا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ تینوں وہیں بیٹھے رہے تھے۔

"اچھا بندہ تھا ویسے۔۔۔ کام کرنے والا۔۔۔ مگر اس کی مرضی" وارثی صاحب نے اس کے جانے کے بعد کہا تھا۔

"جب پی ہوئی ہوتی ہے تو کچھ زیادہ ہی اچھا ہو جاتا ہے۔۔۔ نشہ اترے گا تو روتا ہوا واپس آجائیگا" رضوان صاحب نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ شہروز نے تاسف سے بلاوجہ اس سمت دیکھا جس سمت میں وہ اٹھ کر گیا تھا۔

"یہ شہروز ہے اس سے ملے ہیں آپ۔۔۔ بہت کام کا بچہ ہے۔۔۔ میرا دعویٰ ہے۔۔۔ آپ یاد رکھیے گا۔ آنے والے وقتوں میں یہ ہم سب کو پیچھے چھوڑ دے گا" رضوان صاحب نے یکدم اس کی جانب دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جھینپی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ مزاج پر چھائی ہوئی صبح کی ساری بیزاری غائب ہونے لگی تھی۔



"کم آن۔۔ ہری اپ امائمہ" اس نے اکتا کر دوبارہ سے کال بیل پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ کافی دیر سے بیل بجا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا لیکن امائمہ دروازہ کھولنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے تھک ہار کر ڈپلی کیٹ چابی نکالنے کے لئے لیپ ٹاپ کا بیگ کھولا تھا۔ اس کی دو کلائنٹس کے ساتھ میٹنگ تھی۔ ان کے ساتھ بحث کر کر کے اس کے دماغ کا اچھا فالودہ بن گیا تھا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا اسی لئے وہ روٹین سے ذرا پہلے واپس آگیا تھا۔

"کہاں ہو یار۔۔۔ دیکھوں ذرا صبح جیسی چھوڑ گیا تھا ویسی ہی ہو یا اب خوبصورت ہو گئی ہو" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں بولا تھا تاکہ امائمہ اگر اوپر بیڈروم میں ہے تو سن کر نیچے آجائے۔ اس نے لیپ ٹاپ کاؤچ کے سامنے بڑی تپائی پر رکھا تھا پھر فریج سے پانی کی بوتل نکالنے لگا تھا۔ گھر میں سناٹا ہی تھا۔ باتھ روم سے بھی پانی کی آواز نہیں آرہی تھی۔

"کیا زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔۔۔اللہ۔۔۔میرے نصیب" وہ اسے چڑانے کے لئے ایسے جملے بولتا رہتا تھا۔امائمہ کا جوابی جملہ پھر بھی سنائی نہیں دیا تھا۔وہ پرسوچ انداز میں آگے بڑھا تھا۔گھر میں بے ترتیبی کا احساس ہر چیز پر حاوی تھا۔

"خوبصورت ہو گئی ہو تو نخرے بھی ہو گئے ہیں۔۔۔ملکہ عالیہ نیچے آ جائیے" وہ پھر چلایا تھا لیکن اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔اس نے لمحہ بھر سوچا تھا پھر وہ کسی اور نتیجے پر پہنچا تھا۔

"امائمہ کی بچی یہ سونے کا وقت ہے کیا؟؟" اس نے گہری سانس بھر کر چلا کر کہا تھا پھر پانی کی بوتل واپس اس کی جگہ پر رکھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا لیکن اوپر پہنچ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ امائمہ گھر نہیں ہے۔اس کا موڈ یکدم آف ہونے لگا۔امائمہ غائب تھی اور گھر کی لائٹس سب جل رہی تھیں۔

"اس لڑکی کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسی حماقتیں مت کیا کرے" اس نے غیر ضروری روشنیاں گل کرتے ہوئے سوچا تھا پھر وہ اکتا کر بستر پر گر گیا۔اس نے تنقیدی نگاہ سے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ہر چیز بکھری ہوئی تھی حتیٰ کہ بیڈ پر پڑا بلینکٹ بھی تہہ لگا کر اس کی جگہ پر نہیں رکھا گیا تھا۔اس کو سلیقے سے رکھنے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ہر چیز بے ترتیب ہو رہی تھی۔اس کا موڈ مزید خراب ہونے لگا۔امائمہ کی توجہ گھر سے بالکل ہٹتی جا رہی تھی۔وہ پہلے کی طرح گھر کی صفائی ستھرائی پر بالکل دھیان نہیں دیتی تھی بلکہ کئی کئی دن ویکیوم کلینر کو بھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔جھاڑ پونچھ کرنا تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا حالانکہ یہی کام پہلے وہ اتنی دلجمعی سے کرتی تھی کہ عمر کو اسے ٹوکنا پڑتا تھا کہ یہاں اتنی گرد نہیں ہوتی اس لئے اتنی محنت مت کرو جبکہ امائمہ صفائی ستھرائی سے فراغت کے بعد بھی ہاتھوں سے نادیدہ گرد صاف کرتی نظر آتی تھی اور اب عمر کو ٹوکنا پڑتا تھا کہ کچرا جمع ہو رہا ہے، ڈسٹنگ نہیں ہوئی۔عمر جس روز ٹوک دیتا اس روز امائمہ کچھ صفائی ستھرائی کر لیتی تھی ورنہ کئی کئی دن ایسے ہی گزر جاتے تھے۔عمر کو یہ سب باتیں شاید اتنی ناگوار گزرتیں نا ہی محسوس ہوتیں اگر اس نے امائمہ کو یہی سب بہت محنت اور دھیان سے کرتے نا دیکھا ہوتا۔وہ بہت سلیقہ مند تھی اور ایسی بے ترتیبی اسکی طبیعت کا حصہ نہیں تھی تو پھر اب ایسا کیا ہو گیا تھا یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔وہ کچن کے کاموں سے بھی جان بچاتی نظر آتی جبکہ یہی کام پہلے اس کو بہت پسند تھے۔وہ اس سے اس کی پسند پوچھ پوچھ کر کھانے بنایا کرتی تھی اور اب ہفتہ ہو چلا تھا وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ کالے چنوں کا گاڑھے گاڑھے شوربے والا سالن بنا کر کھلا دو تو وہ بھول جاتی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے اب وہ کھانا پکانے سے بھی چڑنے لگی تھی۔وہ اکثر کھانا بناتی ہی نہیں تھی یا پھر بناتی بھی تو ایسی چیزیں جو جھٹ پٹ تیار ہو جاتی تھیں کھانے کی میز پر اب زیادہ تر ابلی سادی نوڈلز، تلے ہوئے مرغی یا مچھلی کے قتلے اور فرائز موجود ہوتیں۔وہ جب لندن آئی تھی تو عمر کو ٹوکتی تھی کہ ریڈی ٹو کک چیزوں سے پرہیز کیا کرو اور اب وہ گروسری خود کرنے جاتی تھی تو فریج ایسی ہی چیزوں سے بھری رہنے لگی تھی۔اس کے علاوہ اسکا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرنے لگا تھا۔پہلے جب وہ گھر سے باہر جاتے تھے تو عمر اس کو تلقین کرتا تھا کہ راستوں کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو تو وہ نظر انداز کرتی رہتی اور اب وہ اتنا باہر جانے لگی تھی کہ گھر تلپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔عمر اس پہلو کو نظر انداز کرتا چلا آ رہا تھا اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں کسی کی غیر موجودگی کو انا کا مسئلہ بنانا شخصی آزادی کی خلاف ورزی تصور کیا جاتا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتا اب یہ اکثر ہونے لگا تھا۔وہ سمجھ سکتا تھا کہ امائمہ اپنے والدین کو مس کرتی تھی اور وہ اعتراف کر بھی چکی تھی۔اسی لئے عمر نے شہروز سے بات بھی کی تھی تا کہ پاکستان جانے

کا کوئی منصوبہ بنا سکے لیکن یہ سب یکدم راتوں رات تو نہیں ہونے والا تھا مگر امائمہ کچھ سمجھتی نہیں تھی۔ اس نے اگر ایسا رویہ شروع میں اپنایا ہوتا تو عجیب نہ لگتا لیکن اب استنے مہینے گزر جانے کے بعد وہ یکدم ایسی ہوگئی تھی۔ وہ نا صرف لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہوتی جاتی تھی بلکہ زود رنج بھی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں منٹ سے پہلے آنسو آجاتے تھے اور استفسار پر صرف یہی کہتی تھی کہ امی کی یاد آرہی ہے۔ وہ اسکا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اسکی خاطر پاکستان بھی جا رہا تھا لیکن کیا یہ مسئلے کا حل تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا امائمہ کو جو مسئلہ درپیش ہے وہ اسے چھپا رہی ہے اور اسے یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی لیکن وہ اس سے خفا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے پریشان رہنے لگا تھا کیونکہ اسے اسکی فکر تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اسکی پرواہ کرتا تھا۔ اسی لئے وہ خود کو سمجھاتا تھا کہ یہ فطری سی بات ہے امائمہ اپنے والدین کے لئے اداس ہے اسی لئے لاپرواہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ بھی تو تین مہینے کے لئے پاکستان جاتا تھا تو اپنے گھر والوں بالخصوص ممی کے لئے اداس ہو جایا کرتا تھا پھر امائمہ کو تو ایک سال ہونے والا تھا اسی لئے اس کا جی گھر سے اچاٹ ہوتا جاتا ہے۔ یہی سوچ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے موزے پاؤں سے علیحدہ کرنے شروع کئے تھے۔

وہ بیڈ پر جس رخ سے لیٹا تھا وہاں سے سامنے والی دیوار پر امائمہ کی لگی بڑی سی تصویر بالکل واضح نظر آتی تھی۔ یہ تصویر بہت پرانی تھی اور عمر نے امائمہ کے آنے سے بھی پہلے یہ تصویر انلارج کروا کر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس تصویر میں نظر آنے والے چہرے کا اسیر تھا۔"

اس نے امائمہ کو پہلی بار کب دیکھا تھا؟" یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اس نے شہروز کو بھی کبھی طریقے سے نہیں دیا تھا۔ اس کے استفسار پر وہ ہمیشہ مذاق میں کہتا تھا کہ اس نے امائمہ کو خواب میں دیکھا تھا جس پر شہروز اس کا خوب ریکارڈ لگاتا تھا لیکن عمر کو لگتا تھا یہی سچ ہے۔ وہ ہمیشہ سے امائمہ جیسی لڑکی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسے خوبصورتی متاثر کرتی تھی لیکن امائمہ میں صرف خوبصورتی نہیں تھی جسے عمر نے ٹھٹھک کر رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ امائمہ سے پہلے اس کی زندگی میں دو لڑکیاں آئی تھیں جن کے ساتھ اس کا ٹھیک ٹھاک افیئر چلا تھا اور وہ دونوں بھی کافی خوبصورت تھیں لیکن ان دونوں نے اسے ایک سبق سکھایا تھا اور وہ یہ کہ عورت کے لئے صرف خوبصورت ہونا کافی نہیں ہوتا۔ یہ کچھ اور چیز ہے جو مرد کو عورت کا اسیر بنا دیتی ہے اور یہ چیز اسے امائمہ میں نظر آئی تھی۔

یہ کچھ سال پہلے کی بات تھی جب وہ گریجویشن کے بعد پاکستان گیا تھا۔ پاکستان جا کر وہ ہمیشہ خوش ہوتا تھا وہاں چاہنے والے رشتہ دار تھے اور وہاں شہروز تھا جس سے اسکی خوب جمتی تھی اور شہروز کے دوستوں کا بھی وہ دوست تھا۔ وہ سب اسے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھتے تھے جس کی بناء پر وہ کبھی بور نہیں ہوتا تھا لیکن اس سال شہروز کے ایگزامز تھے۔ وہ اور اسکے سب دوست مصروف تھے تو اس کا زیادہ وقت پھپھو کے گھر زارا کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہاں ہی اس نے ایک روز زارا کے لیپ ٹاپ پر اس کی لگائی ہوئی ایک سی ڈی پر امائمہ کو دیکھا تھا۔ وہ کالج کے کسی پروگرام کی ریکارڈنگ تھی جس میں رومیو جولیٹ پیش کیا گیا تھا۔ یہ جولیٹ کا کردار تھا جس نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ وہ لڑکی جو بھی تھی، بے پناہ خوبصورت تھی۔ اس کا لمبا سفید گھیر دار فراک، اس کے شہد رنگ گھنگھریالے لمبے بال اور اس کے سر پر ٹکا ننھا تاج ۔۔۔ ہر چیز اس کی خوبصورتی کو بڑھا رہی تھی لیکن ایک چیز جس نے عمر کو پلکیں نا جھپکنے پر مجبور کر دیا تھا وہ تھا اسکی شخصیت کا وقار، اس کے وجود سے چھلکتی تمکنت اور اس کی آنکھوں میں چھپا اپنے کچھ ہونے کا احساس۔ وہ بول رہی تھی تو اس زعم کے ساتھ کہ دنیا صرف اس کو سنے گی۔ وہ چلتی تو اس فخر کے ساتھ کہ زمانہ ساتھ چلے گا اور وہ پلکیں جھپکتی تو اس اعتماد کے ساتھ کہ روشنی

اس کی آنکھوں کی محتاج ہے۔ عمر نے بہت بار اس ریکارڈنگ کو دیکھا۔ اسے لگتا تھا امائمہ جولیٹ نہیں ہے بلکہ کوئی ملکہ ہے یا جادوگرنی جو لوگوں کو پتھر کا بنا سکتی ہے۔ ان دنوں اس کی زارا کے ساتھ اتنی زیادہ دوستی نہیں تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر نہ کر سکا کہ وہ مذاق نا اڑائے پھر انکی دادو کا اچانک انتقال ہو گیا تو ان کے دکھ میں وہ سب بھول بھال گیا لیکن واپسی میں غیر ارادی طور پر وہ سی ڈی بھی اس کے سامان میں آ گئی کیونکہ اس نے وہ زارا کو واپس ہی نہیں کی تھی بعد میں بھی وہ کبھی کبھار وہ ریکارڈنگ دیکھا کرتا تھا لیکن اس میں محبت جیسے کسی جذبے کا عمل دخل نہیں تھا بس وہ لڑکی اسے اچھی لگتی تھی اور پھر تین ساڑھے تین سال بعد اس نے اسی لڑکی کو شہروز کی کلاس میٹ کے روپ میں دیکھا۔

سردیوں کے دن تھے۔ اس نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر گلابی اسکارف، آنکھوں پر ان گلاسز کندھے پر لٹکا بیگ اور ہاتھ میں پکڑی کتابیں۔۔۔ ایسا کیا تھا جس کے قیمتی ہونے کا احساس اس لڑکی کی شخصیت میں وہ زعم پیدا کرتا تھا کہ اس کے وجود سے روشنیاں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں، یہی وہ روشنیاں تھیں جس کی بدولت عمر نے اسے فوراً پہچان لیا تھا اور تب اس نے جانا تھا کہ عورت صرف خوبصورت ہو یہ کافی نہیں ہوتا۔ اسے پر وقار ہونا چاہیئے۔ اپنے وجود پر نازاں ہونا چاہیئے اور اپنی شخصیت پر فخر ہونا چاہیئے تب ہی وہ مکمل عورت بنتی ہے۔

اس نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ وہ تب بھی اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ اسے اپنے لئے مناسب لگی تھی۔۔۔ مناسب ترین۔۔۔ ایک اچھی لڑکی۔۔۔ سواسے جو چیز اچھی لگ جاتی تھی وہ اس کے حصول کے لئے آخری حد تک جاتا تھا اور تب اسے اس بات کی پرواہ نہیں رہتی تھی کہ کوئی اسے جذباتی یا جلد باز کہے گا۔ امائمہ کے سلسلے میں بھی اس نے یہی کیا تھا۔ اس کو پا کر وہ خوش تھا مطمئن تھا۔ ان کے رشتے میں کچھ مسائل آئے بھی تو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ جھڑ کر گرتے رہے۔ وقت نے ان کو بے حد قریب کر دیا تھا اور تب عمر اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی میں استحکام آ گیا تھا اور امائمہ بھی اس کے ساتھ خوش تھی لیکن گزشتہ چند ہفتے میں جو صورتحال ہو چکی تھی وہ عمر کو مضطرب کر رہی تھی۔ وہ اس سوچ میں گم تھا کہ اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ممی آپکو ایک بار بھائی سے بات کرنی چاہیئے" عمر آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا کہ عمیر کے بولنے کی آواز باہر کوریڈور تک سنائی دی۔ اس کے پاس ہمیشہ ہی گھر کی ڈپلی کیٹ کی چابی ہوا کرتی تھی۔ اپنے گھر شفٹ ہو جانے کے بعد بھی اس نے اس گھر میں داخل ہونے کے لئے ہمیشہ اپنی ہی چابی استعمال کی تھی۔ وہ ڈور بیل بجا کر کبھی بھی اندر نہیں آتا تھا مگر آج وہ کچھ پزل سا ہو گیا تھا شاید ایسا نا ہوتا اگر وہ ممی کا اگلا جملہ نا سن لیتا۔

"تم تھوڑی دیر کے لئے خاموش نہیں رہ سکتے۔۔۔ تمہیں پتا ہے نا وہ آنے والا ہے۔ میں ابھی اس سے بات نہیں کرنا چاہتی" ممی کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی الجھی ہوئی ہیں۔ عمر تذبذب میں گھر کر سوچنے لگا کہ آیا وہ قدم چل کر اندر داخل ہو جائے یا دو قدم پیچھے ہٹ کر باہر نکل جائے۔ اسے آج سے پہلے کبھی ایسی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ممی ہمیشہ سے اسکی سہیلی رہی تھیں ممی نے کبھی اس سے کوئی بات مخفی نہیں رکھی تھی اس طرح اسے کوئی بھی بات پتا چلتی تھی تو بتانے کے لئے سب سے پہلے ممی کی ذات ہی تلاش کرتا تھا۔ وہ ابھی بھی بہت پر جوش اور خوشگوار انداز میں آیا تھا لیکن ممی اور عمیر کی باتیں سن کر وہ خوشگواریت بھی زائل ہونے لگی تھی۔

"ممی آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔۔۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے" عمیر کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنی بات میں ناکام ہو جانے پر اس طرح کا انداز اپنا لیتا تھا اور تب عمر کو اس میں اپنی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

"اب ختم بھی کرو عمیر۔۔۔ میں پہلے ہی بیزار بیٹھی ہوں" ممی کی آواز میں اب خفگی بھی تھی۔ انکی آواز اب زیادہ واضح سنائی دے رہی تھی شاید وہ کچن میں آ گئی تھیں جو داخلی دروازے کے قریب تھا۔ عمر کا حوصلہ بس اتنا ہی تھا ممی کے اس طرح کہنے پر وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو کر آگے بڑھا تھا۔

"ممی کیا پرابلم ہے؟" اس نے کچن میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال یہی کیا تھا۔ وہ دونوں چونکے تھے پھر عمیر تو دوبارہ سے نارمل ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑے باؤل میں چمچ چلانے لگا جبکہ ممی کے چہرے پر پریشانی اور اکتاہٹ کے آثار واضح تھے۔ انہوں نے چند ثانیے عمر کی شکل دیکھنے میں گزارے پھر بمشکل خود کو نارمل کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"اچھے ٹائم پر آگئے ہو۔۔۔ میں سمجھی تھی شاید دیر سے آؤ گے۔۔۔ بیٹھو۔۔۔ لنچ کر کے آئے ہو؟۔۔۔ میں نے ماش کی دال کے دہی بڑے بنائے ہیں۔ تمہارے لئے پلیٹ بنا دوں املی پودینے کی چٹنی کے ساتھ۔۔۔ بہت اچھے بنے ہیں۔۔ تمہارے ابو کافی تعریف کر رہے تھے" عمر نے چہرے کا انتہائی برا زاویہ بنایا۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ تو نہیں تھا کہ اسے ایسے ٹالنے کی کوشش کی جاتی۔ اس نے عمیر کی جانب دیکھا جو ان دونوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا لیکن اس کے دیکھنے پر فوراً نظریں ہٹا کر پھر سے کارن فلیکس کھانے لگا۔ عمر نے کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے رکھی تھی۔

"تم بتاؤ گے یا تمہارے پاس بھی املی پودینے کی چٹنی والے ماش کی دال کے دہی بڑے ہی ہیں" اسے غصہ آنے لگا تھا اور اس سے غصہ چھپایا بھی نہیں جاتا تھا۔

"ممی۔۔ بتا دوں؟" عمیر نے ممی کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔ عمر کو مزید غصہ آگیا۔

"اوکے۔۔۔ ایز یو وش۔ کھائیں آپ لوگ ماش کی دال کے دہی بڑے۔۔۔ چٹنیاں ڈال کر۔۔۔ میں چلا جاتا ہوں" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ممی جانتی تھیں کہ وہ اسی طرح ناراض ہو کر چلا بھی جائیگا۔ انہوں نے گہری سانس بھری پھر ہاتھ میں پکڑا کچن ناول سلیب پر رکھ کر اس کی جانب آ گئی تھیں۔

"تم جاؤ یہاں سے" انہوں نے عمیر کو اشارہ کیا تھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔۔۔ ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔۔۔ آپ لوگ کریں بات" عمیر تڑپ کر بولا تھا۔ اسے گھر میں کوئی بھی بڑا سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

"عمیر۔۔۔" ممی نے گھرک کر کہا تھا۔

"مجھ سے رکھ لیں سارے سیکرٹ بلکہ ایسا کریں مجھے بوتل میں ڈال کر ڈھکن لگا دیں اور فریج میں رکھ دیں" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب چل دیا تھا۔

"بیٹھو" ممی نے عمیر کے جانے کے بعد اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ جتا چکی تھیں کہ انکا مزاج برہم ہو چکا ہے۔

"ہر بات میں عجلت کا مظاہرہ کرنا چھوڑ دو عمر۔۔۔ تم اب چھوٹے بچے نہیں ہو، بڑے ہو گئے ہو۔ میں جانتی تھی اگر تمہارے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو تم اسی طرح میرا دماغ چاٹو گے۔ میں نے روکا بھی تھا عمیر کو۔۔۔ مگر وہ بھی تمہارا ہی بھائی ہے" وہ لمحہ بھر کے لئے رکیں پھر جیسے انہوں نے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا۔

"عمیر آج اپنے پراجیکٹ کے سلسلے میں لوٹن گیا تھا۔۔۔ وہاں اس نے امائمہ کو دیکھا۔۔۔ ایک کیفے ٹیریا میں۔۔۔" انہوں نے رک رک کر بات مکمل کی تھی۔ عمر کے چہرے کے تاثرات یکدم خفگی سے حیرانی میں منتقل ہوئے۔

"واٹ۔۔ کہاں دیکھا" الفاظ میکانکی انداز میں اس کے منہ سے نکلے۔

"لوٹن میں" انہوں نے دوہرایا پھر جیسے اسے نارمل کرنے کی غرض سے بولیں۔

یہ کوئی اتنی حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ امائمہ کہاں جاتی ہے، کیا کرتی ہے یہ اسکا اور تمہارا پرسنل میٹر ہے لیکن۔۔۔" وہ ایک بار اٹک گئی تھیں لیکن عمر ساکت بیٹھا ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"عمر حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ مسلمانوں کے لئے بالخصوص پاکستانیوں کے لئے برٹش پالیسی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ اس صورتحال میں ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں خود اب دور دراز کے علاقوں میں اکیلے جاتے گھبراتی ہوں حالانکہ میں کتنے سالوں سے یہاں رہ رہی ہوں اور پھر ایسی سائیڈ پہ جانے کو تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ وہاں کوئی ہے ہی نہیں ہمارا۔۔ ہمارے دوست احباب، رشتہ دار ملنے جلنے والے سب یہیں آس پاس بکھرے ہیں۔۔۔ اتنی دور جانے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔۔۔ وہ علاقہ اب زیادہ اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ اخبارات میں کتنا ذکر آنے لگا ہے۔ وہاں آئے دن کوئی نا کوئی مسئلہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ علاقہ اب باقاعدہ ریڈیکل مسلمز کا گڑھ بن چکا ہے۔۔۔ میں عمیر کو ڈانٹ رہی تھی کہ وہ وہاں کس لئے جاتا ہے تو امائمہ تو بالکل انجان ہے۔ اسے آئے تو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات" اسے خاموش پا کر انہوں نے پوچھا تھا۔ عمر بدقت مسکرایا پھر اس نے ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

"ممی آپ بھی ذرا ذرا سی بات کو بار رسوئی بنا کر رکھ دیتی ہیں۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہو رہا لوٹن میں۔۔۔ دراصل اب غیر قانونی طور پر آئے ہوئے لوگوں پر سختی شروع ہو گئی ہے تو اس لئے آئے دن وہاں کا ذکر آتا ہے اخباروں میں اور امائمہ صاحبہ بھی روز روز نہیں جاتیں اس طرف۔۔۔ آپ پریشان نا ہوں، اس نے بتایا تھا مجھے۔۔۔ اسے بیٹھے بٹھائے گھومنے پھرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ اپنا روٹ سینس بہتر بنانے کا کریز ہو گیا ہے۔ ڈے کارڈ لے لیتی ہے پھر سارا دن تجمل ہوتی ہے۔۔۔ اچھا ہے نا، گھر میں رہ کر بھی کیا کرے گی" وہ کوشش کر رہا تھا کہ ممی کو اسکا انداز نارمل لگے، ممی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

مجھے اندازہ تھا کہ ایسی ہی کوئی بات ہو گی۔۔۔ میں نے عمیر کو کہا بھی تھا۔۔۔ بہر حال تم اپنے ابو کے سامنے بات مت کرنا وہ پریشان ہوں گے اور پلیز امائمہ کو بولو کہ تھوڑا احتیاط رہے تو اچھا ہے؟" انہوں نے نصیحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔ عمر نے سابقہ انداز میں گردن ہلائی پھر بولا۔

"میرے دہی بڑے پیک کر دیں" اس نے ریموٹ اٹھا لیا تھا اور مانچسٹر یونائیٹڈ کا کوئی پرانا میچ لگا کر دیکھنے لگا تھا۔ وہ ممی سے مزید کوئی

بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اب ہمت نہیں تھی۔ وہ امائمہ کے رویے سے پہلے ہی پریشان تھا۔ وہ کچھ عجیب طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھی اور مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ اس موضوع پر بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ آیا اسے کوئی پریشانی ہے۔ اس دن بھی وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اگلوا نہیں پایا تھا۔ اس کے استفسار پر امائمہ نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ کافی پینے کے لئے گھر سے باہر نکلی تھی تاکہ کچھ تازہ ہوا بھی کھا سکے۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں گھڑی سی چلنے لگی تھی۔ ریڈیکل مسلمو کے علاقوں میں امائمہ کا آنا جانا حیرانی ہی نہیں پریشانی کی بات بھی تھی۔ اسے امائمہ کی عادت کا پتا تھا وہ مذہبی تنگ نظری کا شکار تھی۔ اسے امائمہ کے ساتھ ہونے والا اپنا جھگڑا یاد آنے لگا۔ اس نے کتنی بحث کی تھی اس کے ساتھ کہ اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے سب یاد آنے لگا تھا اور وہ الجھتا جا رہا تھا

☆ ☆ ☆

وہ بہت بے چینی کے ساتھ گھر واپس آیا تھا اور اس نے بیل بجانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اسے جیسے یقین تھا کہ امائمہ گھر موجود نہیں ہوگی مگر گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کا یقین غلط ثابت ہوا تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ باتھ روم میں تھی۔ عمر فلور کشن پر بیٹھ گیا تھا۔ وہیں زمین پر لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ یہ عمر کا پرانا لیپ ٹاپ تھا لیکن اب یہ امائمہ کے استعمال میں تھا۔ عمر کو احساسِ جرم تو محسوس ہوا لیکن اس نے پھر بھی امائمہ کا لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھ لیا تھا۔ وہ ہسٹری چیک کرنے لگا تھا جیسے جیسے وہ دیکھتا جاتا تھا اس کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات بڑھ رہے تھے پھر اس نے لیپ ٹاپ واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا اور اٹھ کر کچن کے مختصر سے شیلف کی طرف آیا تھا۔ امائمہ کا آئی فون اکثر وہیں پڑا ہوتا تھا لیکن آج وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ عمر نے بجلی کی تیزی سی سے ٹی وی کے ریک کو چیک کیا تھا۔ وہاں بھی فون نظر نہیں آیا تھا لیکن عمر کی نگاہ نے اسے فلور کشن کے قریب زمین پر پڑا دیکھ لیا تھا۔ امائمہ اسے وہیں رکھ کر اٹھ گئی تھی۔ عمر نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا تھا اور اسے بھی چیک کرنے لگا تھا۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں بڑھ رہی تھیں۔ امائمہ نے لوٹن اور روچڈیل کے متعلق لاتعداد ویب پیجز کھولے ہوئے تھے۔ اس نے فون سے بل ادا کیے ہوئے تھے۔ لوٹن تک جانے کے لئے کوچ کی بکنگ کروائی ہوئی تھی۔ عمر کو اس کی ہسٹری میں تین بار بکنگ کی ای میلز ملی تھیں۔ وہاں لوٹن اور روچڈیل کے روٹس کے نقشے محفوظ تھے۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے سب دیکھتا جا رہا تھا پھر وہ دوبارہ سے لیپ ٹاپ کی طرف آ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

"تم کب آئے" امائمہ کی آواز عقب سے سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہاں کچھ تصاویر ملی تھیں جو دیکھنے میں بہت پرانی سی لگتی تھیں۔ یہ تصاویر کسی اخبار میں سے کھینچی گئی تھیں لیکن وہ اتنی واضح نہیں تھیں۔ ایک تصویر کسی کلاس روم کے باہر لی گئی تھی۔ وہ تصویر کسی سیشن کے اختتام پر لی گئی تھی جس میں تین پوزیشن ہولڈرز کے چہرے واضح تھے ایک تصویر میں بہت سے لڑکے ترتیب سے کھڑے تھے۔ ایک لڑکے کے چہرے کے گرد دائرہ کھینچا تھا۔ عمر اس لڑکے کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے اس لڑکے کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ کھڑے لڑکے کو ضرور پہچانتا تھا۔ وہ بہروز بھائی تھے۔

"کیا کر رہے ہو عمر؟" امائمہ نے لرزتی آواز میں پوچھا تھا۔ عمر اب کی بار اس کی جانب مڑا تھا۔

"یہ تو اب تمہیں بتانا پڑے گا امائمہ۔۔۔کیا کر رہی ہو تم؟" عمر کی آواز بے حد سرد تھی۔امائمہ کے چہرے کا اڑتا رنگ اس کی نظروں سے چھپا نہیں رہا تھا۔

"امائمہ اب بول بھی دو۔۔۔بتا دو سب۔۔۔اس سے زیادہ صبر نہیں ہے مجھ میں" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔اس نے امائمہ کو چہرہ صاف کرتے دیکھا۔وہ دیوار سے لگ گئی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔

"تمہیں سن کر شاک لگے گا لیکن اب چھپانا بے کار ہے۔۔۔میرا ایک بھائی ہے۔۔۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں اتنا ہی بولی تھی کہ عمر کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر چپ ہو گئی

"نور محمد؟؟؟۔۔۔مجھے پتا ہے۔۔۔آگے بولو" عمر نے کہا تھا۔شاک امائمہ کو لگ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نور محمد کے ماموں روچڈیل میں رہتے تھے۔ماموں بہت سالوں پہلے اس چھوٹے سے قصبہ نما شہر میں آ گئے تھے۔انہوں نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں اور کئی گھنٹے اوور ٹائم کر کے کچھ رقم جمع کی اور پھر پاکستان میں اپنے آبائی گھر اور ترکے میں ملنے والی رقم اکٹھا کر کے یہاں اپنا کاروبار جمایا تھا۔ان کی ریڈی میڈ گارمنٹس کی شاپ تھی جو اچھی چلتی تھی۔

2000 میں نور محمد روچڈیل آ گیا۔وہ ایک عرصے سے دوائیاں کھا رہا تھا لیکن جگہ اور ماحول کی تبدیلی نے تریاق کا کام کیا۔وہ تیزی سے بہتر ہونے لگا۔روچڈیل آنے سے پہلے اور بعد میں بھی اس کی ذہنی رو نہیں بھٹکی تھی۔اسے دورے پڑنا بند ہو گئے تھے۔ماموں نے اسے اپنی دکان پر ہی کام دے دیا تھا۔ان کے پاس ایک پارٹ ٹائم ملازم تھا جو ہفتے میں پانچ دن آتا تھا۔نور محمد کی وجہ سے انہیں کافی سہولت ہو گئی تھی۔وہ صبح ماموں کے ساتھ ہی آ جاتا۔دکان کھولنے میں ان کی مدد کرتا۔جھاڑ پونچھ،صفائی ستھرائی کرتا اور چیزوں کو ترتیب سے رکھ دیتا۔شیلفس کو ارینج کر دیتا۔ڈسپلے پر بھی چیزوں کو ترتیب سے رکھتا جاتا۔پہلے بھی اس کی زندگی میں ڈسپلن کے علاوہ تھا ہی کیا۔۔۔سو یہی اس کے کام آنے لگا۔ماموں کو اس کے کام نے مطمئن کر دیا تھا جبکہ ان کی فیملی کو بھی اس کا الیا دیا انداز اور بلاوجہ ٹوہ لینے کی عادت پسند آئی تھی۔وہ تینوں بہن بھائی اب پہلے کی طرح نور محمد سے بے تکلف نہیں تھے ویسے بھی ان کا سامنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ماموں کا دو بیڈ کا دو منزلہ گھر تھا۔اوپر والی منزل انہوں نے چند بیچلرز کو کرائے پر دے رکھی تھی۔نور محمد کو بھی ان کے ساتھ ایڈجسٹ کر دیا گیا۔اس کو ملا کر وہ سات لوگ تھے۔سب کے سب پاکستانی تھے اور سب اپنی اپنی جگہ مشکلات کا شکار تھا۔وہ سب اپنے کام سے کام رکھتے۔ان کے پاس اپنے دکھوں پر کڑھتے رہنے کے بعد اتنا وقت ہی کہاں بچتا تھا کہ وہ نور محمد جیسے کسی شخص سے بات کرتے۔ نور محمد کو اس لئے ہی وہاں رہنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔وہ چپ چاپ اپنے آپ میں مگن رہتا۔اسے کم گوئی اس قدر رویج ہو گئی تھی کہ وہ اکثر اوقات چاہتے ہوئے بھی بول نہ پاتا تھا۔بولنے کے مواقع یوں بھی ملتے ہی کب تھے۔وہ صرف کھانا کھانے کے غرض سے رات کو ممانی کے پاس نچلے پورشن میں جاتا تھا۔ممانی نے اسے بہت جلد یہاں کے طور طریقے اور قاعدے قوانین سمجھا دیے تھے۔وہ اپنے لئے فریزر میں نگٹس اور فرائز تل سکتا تھا۔اسے مرغی مچھلی کے قتلے گرل کرنے اور کیچپ، مایونیز لگا کر سینڈوچ بنانے بھی آ گئے تھے یا بعض اوقات وہ سادہ بن میں کریم لگا کر دودھ کی بوتل کے ساتھ

ڈنر کے طور پر کھا لیا کرتا تھا۔ ممانی کا موڈ ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ بنا دیتی یا اسے بتا دیتیں کہ وہ خود کچھ بنا لے۔ نور محمد کی زندگی میں ہلچل تو پہلے بھی نہیں رہی تھی اب تو جیسے جمود طاری ہو گیا مگر اسے یہ جمود عزیز تھا۔ یہاں آنے سے پہلے کہیں نا کہیں اسے موہوم سی امید تھی کہ اس کے ابو اسے روک لیں گے لیکن انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے دل میں ابو کے لئے اب کوئی جگہ نہیں پاتا تھا۔ اسے کسی کی یاد نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی امی کی کسی کال کو نہیں سنتا تھا اور خط لکھتا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ماضی کو بھلا کر خوش تھا۔ اس کی یہ خوشی شاید اس طرح برقرار رہتی اگر اس کے ماموں اس پر اپنا ارادہ ظاہر نہ کر دیتے۔

"نیک فرماں بردار اولاد دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور میں اس نعمت کے معاملے میں بڑا ہی نامراد ثابت ہوا۔ پیسہ کما لیا، دولت جمع کر لی مگر اولاد کی طرف توجہ نہ دے سکا۔"

ماموں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے یاسیت سے کہا۔ کام ختم کر کے نور محمد نکلنے لگا تھا جب انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ملازم پہلے ہی جا چکے تھے۔ ماموں کافی دکھی لگ رہے تھے اور شاید ان کو کسی سامع کی ضرورت تھی۔ نور محمد کو ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر تکلیف ہوئی لیکن کسی کے دکھ کو کم کرنے کے لئے دلاسہ کیسے دیا جاتا ہے یہ اسے نہیں آتا تھا۔ اس نے ماموں کے گھر میں کشیدہ صورتحال کو پہلے بھی محسوس کیا تھا لیکن وہ کسی سے استفسار نہیں کرتا تھا۔ اسے ماموں کے دونوں بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کی آزادانہ روش پہ حیرت بھی ہوتی تھی مگر وہ اس بارے میں زیادہ نہیں سوچتا تھا۔ ماموں کے دکھ کے اظہار کے بعد اس نے یاد کرنا چاہا کہ اسے ان سب کے درمیان تعلقات نارمل لگتے تھے یا نہیں۔ اسے یاد آیا اس نے ان سب کو آپس میں گفتگو کرتے بہت کم دیکھا تھا۔ ماموں کے دونوں بیٹے دوکان پر بہت کم آتے تھے۔ اسی طرح ان کی بیٹی بھی بد مزاج اور نخریلی سی تھی۔ وہ آپس میں جب بھی بات کرتے اس پر جھگڑے کا گمان ہوتا۔ ممانی بھی عجیب لاپرواہی عورت تھیں۔ وہ یا تو ٹی وی دیکھتی رہتیں یا کدو کے بیج چھیل چھیل کر پھانکتی رہتیں یا اپنی جوڑوں کے درد کی بیماری کا رونا روتی رہتیں یا پھر ان کے وہ رشتہ دار جو یہاں مقیم تھے ان کے ساتھ فون پر گپیں لڑاتی رہتیں۔

نور محمد نے یہ سب یاد کرتے ہوئے ماموں کا چہرہ دیکھا تو وہ اور بھی زیادہ غمزدہ لگے۔ ماموں جب بھی پاکستان آتے تھے۔ ان کے گھر ضرور آتے۔ ان کا ہنستا مسکراتا خوش باش چہرہ اور خوشحال حلیہ انہیں دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ثابت کرتا۔ نور محمد کو ان کے خوش قسمت چہرے کے عقب میں جھول نظر آیا۔ وہ اگر یہاں نہ آتا تو کبھی یہ سب جان نہ پاتا۔

"میں اولاد سے بازپرس اور سختی کو ہمیشہ غیر انسانی قرار دیتا تھا۔ میں تمہارے ابو کو ظالم قرار دیتا تھا اور برملا اس کا اظہار بھی کرتا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ اولاد پر سختی جائز ہوتی ہے۔"

ماموں اب انگلیاں بھی چٹخا رہے تھے۔ نور محمد کا دل چاہا کہ وہ بھی یہی کرنے لگے اسے دکھ ہوا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ماموں کبھی اس کے ابو کے رویے کو جائز قرار دیں گے۔

"فہیم نعیم کو کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری کو پہچانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے زندگی اس طرح لاپرواہی سے دوستوں سہیلیوں میں گزر جائے گی اور ان کا باپ محنت کر کے انہیں پالتا رہے گا۔"

انہوں نے بیٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اکتاہٹ بھرا انداز اپنا لیا۔ نورمحمد کو پہلی بار انکے چہرے اور اپنے ابو کے چہرے میں مماثلت نظر آئی۔

"مجھے بیٹوں سے کوئی امید ہے نہ غرض مگر گڑیا کے لئے پریشانی ختم نہیں ہوتی۔ وہ لڑکی ذات ہے اس کی بہت ذمہ داری ہے مجھ پر۔۔۔ اس کی شادی ہو جائے تو میں سکون سے مر سکوں گا ورنہ شاید اولاد کا دکھ مجھے مرنے بھی نہ دے۔" ماموں جذباتیت کی انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ نورمحمد کو انکی بات سن کر بہت دکھ ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں ماموں کی بات پر "خدا نخواستہ" بھی کہا لیکن با آواز بلند وہ ماموں کو کوئی تسلی نہیں دے پایا تھا۔

"تم مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہو۔۔۔ تم سمجھدار ہو، فرماں بردار ہو۔۔۔ تمہارے لئے میرے دل میں ایک بہت ہی مخصوص جگہ ہے اور وہ جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔" ماموں بات کرتے ہوئے بہت توقف کر رہے تھے۔ نورمحمد واقعی سمجھدار ہوتا یا اس میں کوئی دنیاوی چالاکی ہوتی تو وہ اتنی لمبی تمہید کے بعد فوراً سمجھ جاتا مگر نورمحمد کو اتنی سمجھ بوجھ کہاں تھی۔ اس نے منہ اٹھا کر ماموں کو دیکھا پھر فوراً سر جھکا لیا۔ اسے تعریف وصول کرنی نہیں آتی تھی۔

"میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو۔۔۔ میرے بیٹے بن کر۔۔۔ یہاں میرے پاس۔۔۔ میرے گھر میں۔۔۔ ہمیشہ۔"

نورمحمد کو ابھی بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ یہ تو وہ پاکستان سے ہی سوچ کر آیا تھا کہ اسے اب ماموں کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ وہ بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

"تم کتنے مہینوں سے یہاں رہ رہے ہو۔۔۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہاں کی زندگی کتنی مختلف ہے۔ یہاں سکون ہے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ دقیانوسیت نہیں ہے۔ ذہنی آزادی ہے۔۔۔ تمہیں یہاں اچھا لگ رہا ہے نا۔۔۔ تم یہاں مستقل رہنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔"

ان کے چہرے کے تاثرات ذرا سی دیر کو بدلے تھے پھر پرانے سانچے میں ڈھل گئے۔ نورمحمد نے سر ہلایا۔ ماموں نے گہری سانس بھری۔ وہ چاہتے تھے کہ نورمحمد کو اب بات سمجھ میں آ ہی جائے لیکن وہ شاید ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ نورمحمد ان کی اتنی لمبی چوڑی تمہید و تفصیل کے بعد بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"نورمحمد" انہوں نے بہت آس میں گھر کر اس کا ہاتھ تھاما۔

"میری گڑیا سے شادی کر لو۔"

نورمحمد کو جھٹکا لگا۔

☆ ☆ ☆

"شادی" اس نے چت لیٹے ہوئے چھت کو تکتے ہوئے دل میں دہرایا تھا۔ اس نے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ابھی اتنا بڑا ہی کب ہوا تھا کہ ایسی باتیں سوچ سکتا۔ اس کی ذہنی عمر تو ابھی تک تیرہ چودہ کے ہندسے پر جم کر کھڑی تھی اسی لئے اس کے دل میں شادی کے نام پر کوئی ہلچل بھی نہ کوئی خوش کن خیال جاگا۔

"گڑیا سے شادی۔۔۔؟" اس نے کروٹ بدلی۔

گڑیا عمر میں اس سے کچھ بڑی تھی۔ وہ دیکھنے میں قدرے مگر خوبصورت تھی لیکن نورمحمد کو اس سے ڈر لگتا تھا۔ وہ بہت بدزبان اور غصیلی تھی۔ نورمحمد کے سامنے کئی بار اس کی اور ممانی کی جھڑپ ہو چکی تھی جبکہ نورمحمد کو تو وہ مخاطب کرنا ہی پسند نہیں کرتی تھی۔

ماموں کے بیٹے بھی اسے بہت ہی کم مخاطب کرتے تھے لیکن ان کے انداز میں اس کے لئے تمسخر اور حقارت کی بجائے لاتعلقی ہوتی تھی جبکہ گڑیا کی آنکھیں ان سب جذبات کا جوس اس پر انڈیلتی محسوس ہوتیں۔ نورمحمد نے گڑیا کے چہرے کو تصور کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ خوبصورت تو تھی۔

وہ خوبصورت نہ بھی ہوتی تب بھی شاید نورمحمد اس کے بارے میں اس رات ضرور سوچتا کیونکہ گڑیا وہ پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کی شادی کا باقاعدہ ذکر چلا تھا۔ وہ اتنا معصوم، اتنا سادہ دل انسان تھا کہ اسے گڑیا کے وجود میں یکدم ہی ایک مہربان دوست کی جھلک نظر آئی۔

"میری شادی"۔۔۔ وہ ایک بار پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ اسے لگا اس کے دل میں اندر ہی اندر کہیں ہلکی سی گھنٹی بجی ہے۔ اس کے ماموں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے سامنے یہ ذکر پہلی بار چلا تھا۔ کسی نے اس کے سامنے یہ بات پہلی بار کی تھی۔ اسے اچھا لگا۔ یہ تو خوشی کی بات تھی۔ اسے بالآخر ایک جیون ساتھی مل جاتا جو اس کے سارے دکھ سمیٹ لیتا۔ اسے واقعی ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ چھت کو تکتے ہوئے مسکرایا۔

اس رات وہ بہت دیر تک گڑیا کے متعلق سوچتا رہا۔ ایک جوان لڑکے کے لئے یہ بہت فطری سی بات تھی۔ اسے یہ سب بہت خوش کن لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں بھی کچھ نارمل ہونے جا رہا تھا۔ اس نے ماموں کو پہلے ہی "آپ کی مرضی" کہہ کر گرین سگنل دے دیا تھا۔ اسی لئے اس رات ایک نئی زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے وہ کافی مطمئن، میٹھی اور پرسکون نیند سویا۔

☆ ☆ ☆

"میں اس گھوگھوڑے سے شادی نہیں کروں گی" گڑیا کی چلاتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنے لئے چیز آملیٹ بنا کر ابھی ٹیبل کے گرد بیٹھا ہی تھا کہ ماموں کے کمرے سے آوازیں آنے لگی تھیں۔

"آہستہ بولو۔۔۔ وہ باہر کھانا کھا رہا ہے" یہ ماموں کی آواز تھی۔ نورمحمد کو جذباتی دھچکا لگا۔ وہ اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"میں کیوں آہستہ بولوں؟ میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے۔۔۔ اور آہستہ کس کے لئے بولوں۔۔۔ اس مزاحیہ الیکٹرک کھلونے کے لئے جو بولتا ہے نہ سنتا ہے۔۔۔ صرف منہ اوپر کیے سب کو ہونقوں کی طرح دیکھتا رہتا ہے۔۔۔ آپ کا دماغ چل گیا ہے جو آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔"

وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بولی تھی۔ نورمحمد نے ہاتھ میں پکڑی بریڈ کے سلائس کو پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ گڑیا نہیں مانے گی۔۔۔ یہ کب سنتی ہے کسی کی۔۔۔"

ممانی کی لاچاری آواز آئی تھی جس کے بعد ماموں کی گھرکی سنائی دی۔ نورمحمد نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات پر دھیان دینے لگا۔

"اسے سننی ہی پڑے گی۔۔۔ اسے سوچنا چاہیے تھا۔۔۔ ماں باپ کی عزت نیلام کرنے سے پہلے اسے بھی تو سوچنا چاہیے تھا۔۔۔ اسے نہیں پتا تھا کہ جو کالک میں ماں باپ کے منہ پر ملنے جا رہی ہوں اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔ یا اگر یہ سب سوچ لیتی تو میں یہ سب نہ سوچتا۔ اس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں یہ سب سوچوں اور اگر تم اس کی تربیت پر دھیان دے لیتی تو یہ دن نہ دیکھنے پڑ رہے ہوتے۔"

ماموں کی آواز آہستہ اور لہجہ سخت اور تلخ تھا۔

"کم آن ڈیڈ۔۔۔اتنا میلو ڈرامیٹک مت ہوں۔۔۔کچھ نہیں کیا میں نے۔۔۔آپ فطرت کو تال نہیں سکتے۔۔۔میں چھوٹی بچی نہیں ہوں۔۔۔بالغ ہوں۔۔۔اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں۔میں اپنی زندگی جس طرح چاہے گزار سکتی ہوں۔مجھے ایسا کرنے کا پورا حق ہے۔"

گویا چلا چلا کر بول رہی تھی۔

"بند کرو اپنی یہ بکواس۔۔۔تمہیں شرم نہیں آتی اپنے باپ کے سامنے یہ سب باتیں کرتے ہوئے۔۔۔اتنی بے حیاء ہو چکی ہو تم۔۔۔بے غیرت۔۔۔ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔۔۔دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے اس سے پہلے کہ میں تمہیں تھپڑ دے ماروں۔"

ماموں کی اتنی اونچی آواز نور محمد نے پہلی بار سنی تھی۔اس نے پلیٹ کھسکا کر پرے کی۔کرسی گھسیٹی اور اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا تاکہ اوپر جانے کے لئے عقبی سیڑھیاں استعمال کر سکے۔۔۔اس کا دل ضرورت سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔



"تم نورمحمد کے بارے میں کیسے جانتے ہو عمر؟" امائمہ کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔وہ واقعی شاکڈ رہ گئی تھی۔اس نے عمر سے سوائے اس بات کے اپنی زندگی کی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔۔۔وہ اس بات کو دل سے تسلیم کرتی تھی کہ رشتے اعتبار کی بنیاد پر مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ عمر سے یہ راز چھپا کر خوش نہیں تھی اور عمر اسے بتا رہا تھا کہ وہ یہ ڈھکا چھپا راز پہلے سے جانتا ہے۔

"کم آن امائمہ۔۔اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔۔۔ہم اس بارے میں بہت پہلے سے جانتے ہیں۔انکل آفاق میرے ابو کے بہت پرانے جاننے والے ہیں۔ابو نے بھی بتایا تھا پھر بہروز بھائی نے بھی ایک دفعہ ذکر کیا تھا" عمر کا انداز سادہ سا تھا۔وہ ابھی بھی اس معمے میں الجھا تھا کہ آخر امائمہ اس کی غیر موجودگی میں کہاں اور کیوں جاتی ہے اور امائمہ کو اپنا بھائی یاد آ گیا تھا۔

"تم نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا۔۔۔کبھی اس بارے میں سوال نہیں کیا حالانکہ میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں اکلوتی بیٹی ہوں اپنے پیرنٹس کی۔۔۔جب کبھی ہماری گفتگو میں اس بات کا ذکر بھی آیا کہ میرا کوئی بھائی ہے یا نہیں تو میں نے اس امر سے انکار کر دیا کہ میرا بھی ایک بھائی ہے تو پھر کیسے۔۔۔کیسے عمر۔۔۔"

امائمہ کے حواس ابھی بھی معطل سے تھے۔وہ اس ایک بات کے لئے کتنا پریشان رہی تھی، کتنا خوار ہوئی تھی اور کتنا شرمندہ ہوتی تھی کہ وہ عمر سے کچھ چھپا رہی ہے اور عمر اسے بتا رہا تھا کہ وہ یہ بات پہلے سے جانتا ہے۔یہ تو بہت عجیب سی بات تھی۔وہ اس کے پاس ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی تھی۔

"بہروز بھائی کے کلاس فیلو تھے تمہارے بھائی۔۔۔کالج میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں دونوں۔۔۔بہروز بھائی انکل آفاق سے ٹیوشن بھی پڑھتے رہے ہیں۔انہوں نے مجھے منگنی کے بعد بتایا تھا سب کچھ اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ایک دو بار ذکر کیا تھا۔۔۔اشاروں کنایوں میں بھی بات شروع کرنے کی بھی کوشش کی لیکن تم ہمیشہ ٹال جاتی تھی اور مجھے لگا تم اس ذکر سے اپ سیٹ ہو جاتی ہو تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہارے بھائی کا ذکر کروں پھر ابو نے بھی کہا تھا نا صرف مجھے بلکہ ممی کو بھی تاکید کی تھی کہ ہم سے کوئی بھی اس بارے میں بات نہیں کرے گا۔دیکھو امائمہ ہم اتنے ال مینرڈ لوگ نہیں ہیں یار کہ کسی کی زندگی کے ذاتی مگر کنٹروورشل ایشوز کو بلاوجہ ڈسکس کریں۔ہمارا تعلق تم سے ہے اور اگر کوئی ذکر تمہارے لئے باعث تکلیف ہے تو میں یا میرے پیرنٹس تمہارے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔میرا یقین کرو میں تمہیں دکھ دینے والا کوئی کام کبھی نہیں کروں گا۔۔۔میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا" عمر بہت تحمل بھرے لہجے میں بولا تھا۔امائمہ کو اپنا وجود ایک دم سے اتنا ہلکا پھلکا لگا کہ اس کو لگا وہ بیٹھی بیٹھی گر پڑے گی۔

"تمہیں برا تو نہیں لگا نا عمر۔۔۔تم ناراض تو نہیں ہو نا" وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

"امائمہ۔۔۔میں اس بات پر تم سے کیوں ناراض ہوں گا بھلا۔۔۔" عمر نے کہا تھا پھر اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ کر اسے دکھ بھی ہوا مگر اچھا بھی لگا کہ وہ اسکی ناراضی سے اتنا خائف ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔اس نے اسے اپنے قریب کیا تھا اور اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا تھا۔وہ اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

"میں اب اتنا بھی بدتمیز نہیں ہوں امائمہ کہ بلاوجہ اپنی اتنی اچھی بیوی سے ناراض ہوتا پھروں۔۔۔میں سمجھ سکتا ہوں کہ اگر تم اپنے بھائی کا ذکر نہیں کرتی ہو تو یہ ایک بہت ہی نارمل سی بات ہے میرا بھائی بھی اگر ایسا ہوتا جو کسی لڑکی کے عشق میں خوار ہو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا ہوتا اور جو اپنے ڈیڈ کے ٹارچر کی وجہ سے ذہنی توازن کھو دیتا اور اپنی باقی ماندہ زندگی کسی اسائلم میں گزار رہا ہوتا تو میں بھی اسکا ذکر کبھی نا کرتا۔میرے لئے بھی یہ ایک کنٹروورشل ایشو ہی ہوتا" وہ اسکے بالوں کو بھی سہلا رہا تھا۔اسے لحہ بھر میں ہی بھول گیا تھا کہ وہ امائمہ سے ناراض تھا اسے بس یہ نظر آ رہا تھا کہ اس کی عزیز از جان بیوی دگیر حالت میں اس کے پاس بیٹھی ہے جبکہ امائمہ کی آنکھیں جل جل بہنے لگیں۔عمر نے اس کی جانب دیکھا پھر اس نے اسکی بہتی آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کیا تھا۔

"امائمہ۔۔۔اس ٹاپک پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔۔ابھی میں بہت کنفیوژن کا شکار ہوں۔مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم لوٹن کیا کرنے جاتی ہو،مجھے بتاؤ۔

پلیز تمہارے وہاں کیا کنکشنز ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"میں نور محمد کو ڈھونڈ رہی ہوں عمر۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے بے یقین سے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

"لوٹن میں۔۔۔؟" امائمہ نے سر ہلایا تھا۔عمر کو اسکی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ڈیڑھ ہفتے بعد اس کی اور گڑیا کی مرضی کے بغیر ان کا نکاح ہو گیا۔یہ سال دو ہزار ایک کی ابتدا تھی۔اس سال ریکارڈ برفباری ہوئی تھی۔زندگی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ماموں نے پھر بھی پرواہ نہیں کی تھی ان کو نجانے کیا مسئلہ تھا کہ وہ اس قدر عجلت کا شکار ہو رہے تھے۔نور محمد کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے گڑیا کو کس طرح آمادہ کیا تھا۔وہ خود تو اس دن کے بعد سے اس موضوع،گڑیا اور ماموں سب سے کترا تا رہا تھا۔اس بارے میں سوچتے ہی اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی ہو۔وہ ایسی کیفیت سے بہت خوفزدہ رہتا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اسے پھر سے کسی بچہ جمورا جیسی کیفیت کا شکار کر دے۔اس لئے وہ اس موضوع سے حتی الامکان بچتا رہا تھا جو اسے کسی قسم کی ذہنی پریشانی سے دوچار کر دے۔اگرچہ ماموں نے دو تین بار اسے گڑیا کے رویے کی وضاحت دینے کی کوشش کی تھی تب وہ زیادہ دیر ان کے سامنے بیٹھا نہیں رہا تھا۔اسے ویسے بھی بولنا کب ہوتا تھا۔وہ تو صرف ایک باتیں سننے والی مشین تھی جس کو اس کے ماموں نے اس کی امی سے بہلا پھسلا کر ہتھیا لیا تھا۔انہوں نے اس باتیں سننے والی مشین کو پسند ہی اس لئے کیا تھا کیونکہ باتیں سنانے والی مشین تو پہلے ہی سے ان کی بیٹی کی شکل میں ان کے پاس تھی۔

یہ باتیں نور محمد کو اب سمجھ میں آنے لگی تھیں اور سب کچھ سمجھتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو کس طرح راضی کیا یہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔اصل میں اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔وہ ماموں کے گھر میں رہ رہا تھا،ان کے احسانوں تلے دبا تھا۔وہ ڈرپوک تھا۔اسے ماموں کو انکار کرتے ہوئے جھجک ہوئی تھی۔اس کے پاس اتنا دل جگر تھا ہی نہ اتنی چرب زبانی کہ وہ اس حساس موضوع کو ماموں کے ساتھ زیر بحث لاتا اور پھر انہیں

اپنے حق میں فیصلہ سنانے کے لئے مجبور کر لیتا اسی لئے یہ نکاح ہو گیا۔

اس نکاح سے اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے والی روٹین پر ہی چلتا رہا۔ صبح کو اٹھ کر دوکان پر جاتا وہاں کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتا رہتا اور شام کو پھر واپس آجاتا لیکن اب اس نے ماموں کے رہائشی حصے میں جانا بالکل چھوڑ دیا تھا بلکہ اب وہ اپنے روم میٹس کے ساتھ ہی کھانا کھانے کی کوشش کرتا۔ اسے کسی نے اپنی رہائش تبدیل کر کے نیچے والے پورشن میں آنے کے لئے کہا نہ ہی وہ خود آیا۔

ماموں اور ممانی نے ازراہ محبت یا پھر ازراہ مروت اسے اور گڑیا کو اکیلے وقت گزارنے کے لئے چند مواقع بھی فراہم کئے اور ان دونوں نے یہ وقت اکیلے اکیلے ہی گزارا۔ گڑیا اس کی طرف دیکھ کر راضی نہیں تھی۔ وہ اسے مخاطب کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی جبکہ وہ تو اس بدزبان بیوی نما چیز سے اسقدر خائف ہو گیا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے بھی کبھی اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

اس کے باوجود پتا نہیں کیا معجزہ ہوا کہ گڑیا نے پانچ مہینے بعد ایک صحتمند، تندرست، گل گوتھنی بچی کو جنم دے کر اسے باپ کے عہدے پر ترقی دے ڈالی۔

"قدرت کے کام ہیں سب نور محمد!" ممانی نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بچی اس کی گود میں ڈالی تھی۔

"ماشاءاللہ سے باپ بن گئے ہو تم۔۔۔ کیسی من موہنی، صحتمند بچی ہے۔" انہوں نے حسب عادت بائیں گھٹنے کو دائیں ہاتھ سے دبایا تھا۔ نور محمد کا سر مزید جھک گیا تھا۔ اس نے بچی کی جانب ایک نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ اسے لگا تھا اس کی گود میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہے۔

"وزن بہت زیادہ ہو گیا تھا دراصل اس کا۔۔۔ دس پونڈ کی ہے۔ ماں کو بڑا وخت ڈالا ہوا تھا اس نے۔ اسی لئے تو ڈاکٹر نے جلدی مچائی۔ وہ کہتا تھا زیادہ دیر کی تو گڑیا کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ ایک مہینہ پہلے کیا۔۔۔ ایک مہینہ بعد میں کیا۔۔۔ چلو خیر سے فراغت ہوئی۔۔۔ خوشی دکھائی اللہ نے۔۔۔ نور محمد! رحمت آگئی تمہاری گود میں۔"

ممانی بلا وجہ مسلسل بول رہی تھیں۔ پگھلے ہوئے سیسے نے اس کی گود میں کسمسا کر حرکت کی۔ نور محمد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ گلابی لحاف میں لپٹا گلابی گلابی وجود۔۔۔ نور محمد کو لگا اسے پھر معمول سے زیادہ پسینہ آرہا ہے۔ اس کی دل کی دھڑکن پھر بے ترتیب ہوئی تھی۔ اسے کیا واقعی گھگھو گھوڑا سمجھتے تھے وہ سب لوگ۔۔۔ وہ اسے کس اسکول میں کیا پڑھانا چاہ رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر بچی کو اس کی ننھی سی گلابی کاٹ میں لٹا دیا۔ اس سے زیادہ کی اس میں طاقت تھی نہ ظرف۔

پگھلا ہوا سیسہ کاٹ میں بند آنکھوں اور بند مٹھیوں کے ساتھ محوِ استراحت تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ اسی روز شام کی بات تھی۔ وہ دوکان سے واپس آکر اپنے اوپر والے کمرے میں بیٹھا ہاتھ میں تسبیح لئے نجانے کیا ورد کر رہا تھا جب ماموں نے اسے نیچے بلوایا۔ گڑیا کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ نور محمد کو علم تھا کہ وہ گھر آچکی ہے۔ اس لئے جب ماموں نے اسے بلوایا تو تسبیح کے دانے گراتی اس کی انگلیاں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔

اسکے اندر کسی سے بھی بات کرنے کی ہمت نہیں تھی اسی لئے وہ ماموں اور ممانی کے سامنے جانے سے کترا رہا تھا۔ وہ دونوں اسے پاگل اور خبطی سمجھ کر جانے کیا نئے سائنسی اصول متعارف کروانا چاہتے تھے جبکہ وہ اتنا پاگل اور خبطی نہیں تھا کہ ان کی کبھی ہر بات پر ایمان لے آتا مگر اتنا ہی ڈرپوک اور سادہ انسان تھا کہ ماموں اور ممانی کے سامنے انہیں ٹوک ہی نہیں پاتا تھا۔

"مبارک ہو نور محمد۔۔۔ تمہارے گھر پہلی خوشی ہوئی ہے۔۔۔ تم اس کے کان میں اذان دو۔"

وہ جب نا چاہتے ہوئے بھی ان کے پورشن میں آ گیا تو ماموں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا تھا۔ گویا اسی بیڈ روم میں تھی جس میں وہ پہلے سے رہا کرتی تھی۔ اس روم کو وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔ نور محمد نے اسے نہیں دیکھا تھا کیونکہ بیڈ روم کا دروازہ بند تھا جبکہ بچی اپنے نانا نانی کے ساتھ سنگل بال میں گلابی پرام میں آنکھیں موندے سکون سے سوئی ہوئی تھی۔ نور محمد نے اس کی ماں کی جانب کبھی ایک نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی جبکہ ماموں کے منہ سے لفظ اذان سن کر اس نے پرام کی جانب پہلی نظر ڈالی۔

"اذان۔۔۔؟" اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ وہ بہت سی باتیں دل ہی دل میں دہرا کر لیا کرتا تھا۔

اسے پتا تھا کہ نوزائیدہ بچے کے کان میں اذان دی جاتی ہے لیکن یہ کیسے کرتے ہیں یہ اسے نہیں پتا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر پرام کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں عجب عجب خدشات سر اٹھاتے رہے۔ اسے ماموں کے رویے پر بہت دکھ بھی ہوا۔ وہ اس کے ساتھ یہ سب کیوں کر رہے تھے۔ وہ بچے تھے نا نور محمد بچہ تھا پھر وہ اس کے ساتھ یہ بچگانہ رویہ کیوں اپنائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی غلطیوں اور اپنی بیٹی کی غلطیوں پر پردہ ڈال رہے تھے لیکن انہوں نے غلطیوں پر ڈالنے کے لئے اس قدر مہین پردے کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ اس پردے کے عقب سے ہر چیز واضح تھی۔۔۔ صاف، درست اور کرسٹل کلیئر۔۔۔ وہ کس کو دھوکہ دے رہے تھے۔ اسے۔۔۔ سائنس کے اصولوں کو۔۔۔ یا قدرت کے اصولوں کو۔ اسے خاموش دیکھ کر ماموں کھنکھارے۔ نور محمد نے ماموں کے گھرکی لینے پر پرام سے نظر اٹھا کر ماموں کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے یقیناً ایسا کچھ عیاں ہو رہا تھا کہ ماموں نے نگاہوں کا زاویہ ہی نہیں پہلو بھی بدلا۔

"بیٹی کی پیدائش پر دل چھوٹا مت کرو نور محمد۔۔۔" ممانی نے اسے تسلی دینے کے لئے اتنا ہی کہا تھا کہ نور محمد کو لگا اس کا صبر بس یہیں تک تھا اس نے ہاتھ اٹھایا جیسے وہ انہیں مزید کچھ کہنے سے روکنا چاہتا ہو پھر وہ پرام کی طرح گلابی ہو کر پرام کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے منہ سے ایسی آواز برآمد ہوئی تھی جیسی خراب ریڈیو کو دھمکا دھمکا کر ہلا ہلا کر برآمد کی جاتی ہے۔

"دل چھوٹا ہو تو تکلیف نہیں ہوتی ممانی۔۔۔ کردار چھوٹا ہو تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"اللہ اکبر اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر اللہ اکبر"

اس نے بچی کے کان میں پہلی صدا دی۔۔۔ پہلا کلمہ، پہلا سبق، پہلا حوصلہ، پہلی خوشخبری۔

اللہ بڑا ہے۔۔۔ اللہ بڑا ہے۔۔۔ بے شک اللہ ہی بڑا ہے۔ ایک نوزائیدہ وجود بے شک وہ غلط کاری کا ہی نتیجہ رہا ہو اسکے لئے اس سے بڑی

نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خالق ہی سب سے بڑا ہے۔۔۔۔ صد شکر کہ اس نے یہ رتبہ کسی انسان کو نہیں بخشا تھا۔

"الحمد للہ رب العالمین" اس نے دل میں کلمہ شکر ادا کیا تھا۔

نور محمد نے اذان کے کلمات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ نم آنکھوں سے اس ننھے وجود کو دیکھا۔اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔وہ اس بچی کے ساتھ ایک انوکھے رشتے میں بندھ رہا تھا۔اس کے دل میں اس بچی کے لئے ممتا یا باپتا جیسا کوئی جذبہ نہیں جاگا تھا۔وہ اس کے لئے کسی قسم کی محبت محسوس نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ کچھ اور تھا۔اس نے ہمیشہ سیکھا ہی سیکھا تھا کبھی کسی کو کچھ سکھایا نہیں تھا۔آج پہلی دفعہ وہ اس بچی کو اس کی زندگی کا سب سے اہم، پہلا اور سچا سبق پڑھا رہا تھا، سکھا رہا تھا۔اس نے اپنے دل میں ایک ذمہ داری کو محسوس کیا۔اسے پورے خلوص کے ساتھ یہ ذمہ داری پوری کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد سے وہ نور الہدیٰ کے ساتھ اس رشتے میں جڑ گیا تھا۔

"نور الہدیٰ" یہ نام اس بچی کو ماموں نے دیا تھا اور اسے یہ نام انہوں نے نور محمد کے نام کی مناسبت سے دیا تھا۔وہ اب بالکل مطمئن ہو چکے تھے۔انہیں شاید یہی پریشانی تھی کہ ان کی بیٹی رشتۂ ازدواج میں بندھ جائے اور یہ کام وہ نور محمد جیسے سادہ لوح کو پھانس کر کر چکے تھے۔اب انہیں پرواہ نہیں تھی کہ گڑیا جو چاہے کرتی پھرے۔نور محمد کو نا چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی گڑیا کے معمولات پر اعتراض ہونے لگتا۔وہ جانے کیسی سرگرمیوں میں مشغول رہتی تھی کہ اس کے گھر آنے جانے کے کوئی اوقات ہی مقرر نہیں تھے۔نور محمد اکثر اسے لیٹ نائٹ گھر آتے دیکھتا اور اس کی روش پر کڑھتا لیکن جلنے کڑھنے کا عمل زیادہ طویل نہیں ہوتا تھا۔وہ حتی الامکان اپنے آپ کو اس سے لاپرواہ اور کھنچے کے فارمولا پر عمل پیرا تھا۔گڑیا اگر اسے پاؤں کا جوتا سمجھتی تھی تو وہ بھی اسے جوتے کے تسمے برابر ہی جگہ دیتا تھا۔اصل مسئلہ تب پیدا ہوتا جب وہ نور الہدیٰ کو نظرانداز ہوتے دیکھتا۔۔۔اسے اس کے ننھے وجود سے محبت یا الفت نہیں تھی یا وہ اس کے لئے کسی قسم کی جذباتیت کا شکار نہیں تھا بس وہ اسے اپنی طرح کی بے ضرر لگتی۔اسے اس پر اتنا ہی ترس آتا تھا جتنا کہ اپنے پر۔۔۔۔ممانی اس کا بالکل خیال نہیں رکھتی تھیں۔ان کے پاس گھٹنوں کے درد کا بہانہ تھا اور وہ ٹی وی کی اس قدر رسیا تھیں کہ انہیں لمحہ بھر کے لئے بھی اس کی سکرین سے نظریں ہٹانا ناگوار لگتا تھا۔وہ نور محمد کا چہرہ دیکھتے ہی مطمئن ہو جاتیں اور کاٹ کے ساتھ بندھی ڈوری کو چھوڑ دیتیں جس کا سرا وہ صوفے پر بیٹھ کر ہلاتی رہتی تھیں تاکہ وہ بچی روئے نہیں۔نانا اور نانی نواسی کا رشتہ فقط اس ڈوری کے ہلانے تک محدود لگتا تھا اور یہی رشتہ ان سب کا نور محمد سے تھا فرق صرف یہ تھا کہ نور الہدیٰ کی ڈوری کاٹ سے بندھی تھی جبکہ نور محمد کو یہ ڈوری اپنی گردن سے بندھی محسوس ہوتی تھی۔اسی لئے اس کے دل میں کہیں نا کہیں اس بچی کے لئے ہمدردی کے جذبات پلنے لگے تھے۔

اس کے معمولات تو وہی تھے صبح دوکان اور رات گھر۔۔۔مگر اب جب وہ کھانا وغیرہ کھانے نچلے پورشن میں رکتا تو اس کی توجہ خود بخود بچی کی کاٹ کی جانب مبذول ہو جاتی۔وہ اس کی ننھی آنکھوں کی گفتگو کو سمجھنے لگا تھا۔وہ جو کسی سے بات نہیں کرتا تھا کسی کی جانب دیکھتا بھی نہیں تھا وہ اس ننھی سی بچی کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا بھی تھا۔

ممانی، نور محمد کی موجودگی میں اس کا خیال ایسے رکھتی تھیں کہ وہ اکثر سوچتا انہوں نے اپنے بچے کیسے پالے ہوں گے۔اس کا فیڈر بنانے سے

لے کر ڈائپر تبدیل کرنے تک وہ بلاوجہ تاخیر سے کام لیتیں۔ نورالہدیٰ کے رونے پر وہ اس کی کاٹ کو ہلاتی رہتیں تاوقتیکہ وہ خود نہ سو جائیں یا پھر نور الہدیٰ نہ سو جاتی۔ نورمحمد نے انہیں کبھی اس کو فیڈر بناتے نہیں دیکھا تھا۔

نورمحمد اسی لئے اس کے کام کرنے پر تیار ہوا کہ اسے اس بچی پر ترس آتا تھا۔ اسے اس کے اور اپنے حالات میں بہت مماثلت محسوس ہوتی تھی۔ ماموں اور ممانی اسے دیکھتے ہی کہتے۔

"نورمحمد!... سنبھال اپنی بیٹی کو... تجھے دیکھ کر تو یہ ہمارے پاس ٹکتی ہی نہیں ہے۔"

تب نورمحمد کو لگتا کہ وہ اسے بھی نورالہدیٰ کی طرح کاٹ میں لٹا کر جھولا جھلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور شاید وہ چاہتے ناچاہتے یہ جھولا جھولتا رہتا اگر وہ واقعہ نا ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں احساس بھی ہے یا نہیں... شرم چھو کر گزری ہے یا نہیں..."

نورمحمد نے تاسف سے گہرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ چند دن سے مسلسل گڑیا کو بے قابو ہو کر گھر آتے دیکھ رہا تھا۔ وہ چونکہ اوپر والے پورشن میں رہتا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے تک نظر پڑتی تھی۔ گڑیا کو ڈراپ کرنے ہمیشہ کوئی لڑکا ہی آتا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اس کی کزن اور نام نہاد بیوی کی سرگرمیاں کچھ مشکوک ہیں لیکن یہ تو یہاں عام سی بات تھی۔ نورمحمد کو اس پر اعتراض نہیں تھا اسے اب حیرت بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ وہاں رہتے ہوئے بہت کچھ دیکھ اور سیکھ چکا تھا۔ اس کے روم میٹس اس کے سامنے اسکی بیوی کے متعلق اشاروں کنایوں میں الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے مگر وہ چپ رہتا تھا اور برداشت کرتا تھا۔

اسے گڑیا کے معمولات کا اندازہ بہت اچھی طرح ہو چکا تھا اور وہ اسے ٹوکنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا مگر اس روز نورالہدیٰ بہت بیمار تھی۔ اسے کافی تیز بخار تھا اور مسلسل رو رہی تھی۔ اس کا جسم بہت گرم تھا اور شاید وہ درد بھی محسوس کر رہی تھی۔ نورمحمد کب سے اسے کندھے سے لگائے ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ ممانی اسے سنبھالنے کی بجائے نورمحمد کو دیکھتے ہی سونے کے لئے چلی گئی تھیں۔ نورمحمد ان کی سنگدلی پر پہلے ہی بھرا ہوا تھا اسی لئے گڑیا کو آتا دیکھ کر خود کو قابو نہ رکھ سکا۔ گڑیا نشے میں تھی۔ اس نے گڑیا کو اس قدر بے قابو حالت میں قریب سے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ قریب سے دیکھنے سے زیادہ قابل نفرت لگی تھی۔

گڑیا نے اس کی بات کو اہمیت دیئے بغیر اپنا کوٹ اتارا تھا اور اسے جھٹکے سے کاؤچ پر پھینک دیا تھا۔ کوٹ سے نیچے اس کا حلیہ دیکھ کر نورمحمد کے ہوش اڑ گئے۔ وہ اس قدر بے غیرتی کی توقع کم از کم اپنے خاندان کی کسی عورت سے مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا اسی لئے وہ چپ نہیں رہ سکا تھا اور اونچی آواز میں بول پڑا تھا۔ گڑیا قہقہہ لگا کر ہنستی ہوئی خود بھی کاؤچ پر گر گئی۔

"تمہیں بولنا آتا ہے... سن کر اچھا لگا۔"

وہ نشے میں تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اضطرابی سی تھی جیسے اسے خود پر ذرا بھی قابو نہ ہو۔

"مجھے اگر پتا ہوتا کہ تمہیں میرا بولنا اتنا اچھا لگے گا تو میں پہلے ہی بول لیتا۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ گڑیا پھر بلاوجہ ہنسی۔

"کیوں۔۔۔مینڈک۔۔۔محبت تو نہیں ہو گئی مجھ سے۔۔۔؟"

بے ربط جملہ ادا کر کے وہ ایک بار پھر ہنس دی۔ نور محمد نے اپنے وجود کو جھٹکا کھاتے محسوس کیا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"تم محبت کی بات کرتی ہو۔۔۔میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس قدر غلیظ چیز ہو تم میرے لئے۔۔۔میں اس بچی کی وجہ سے تمہیں برداشت کرنے پر مجبور ہوں۔ اس کو اتنا تیز بخار ہے اور تمہیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔۔"

نور محمد نے اپنی اس قدر بلند آواز اپنے ہوش میں کم از کم پہلی بار سنی تھی۔ دل ہی دل میں وہ خود چونک گیا تھا۔ گڑیا کا نشہ بھی شاید اسی حیرانی میں کچھ کم ہوا تھا۔

"مت برداشت کرو۔۔۔یہ بچی تمہاری تو نہیں ہے۔" وہ مڑ کر بولی تھی پھر اس کی جانب دیکھے بنا گڑیا نے اپنا بیگ کھول کر ایک بوتل نکالی تھی اور پر ام میں پڑا نور کا فیڈر کھول کر بوتل کا محلول اس میں انڈیلنے لگی تھی۔ نور محمد کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ وہ بچی کو شراب پلانا چاہتی تھی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔۔۔اس کو کیا پلانا چاہتی ہو تم۔۔۔تمہیں واقعی انسانیت چھو کر نہیں گزری۔ یہ میری بچی نہیں ہے اس لئے ہی زیادہ فکر ہوتی ہے اس کی۔۔۔میں اس کا خیال کسی رشتے کی وجہ سے نہیں رکھتا۔۔۔رشتوں سے نفرت ہے مجھے۔۔۔انسانیت نے جوڑ رکھا ہے مجھے اس کے ساتھ۔۔۔وہ انسانیت جو تمہیں چھو کر نہیں گزری"

وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔ اسے بے پناہ گرمی کا احساس ہوا۔ اسے اپنے جسم پر عجیب سی چبھن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی سانس بھی گھٹنے لگی تھی اور کوئی چیز تھی جو سر سے پاؤں کی طرف سفر کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی گفتگو بے ربط ہو رہی تھی لیکن اسے احساس نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا تھا اور وہ اسے برداشت کرنے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ کسی نئے انگزائیٹی اٹیک کا شکار ہونے والا تھا شاید۔

"تمہیں جتنی انسانیت چھو کر گزری ہے مجھے اچھی طرح سے پتا ہے۔۔۔میرے باپ کے پیسے پر پل رہے ہو اور مجھے ہی باتیں سنا رہے ہو۔ اتنی ہی انسانیت تھی تو رہتے وہاں ہی اپنے باپ کے پاس۔۔۔ان کو دکھاتے انسانیت۔۔۔پاگل انسان" گڑیا نے اس کی کندھے سے لگی نور الہدیٰ کو جھپٹ کر پکڑا تھا اور اس کے منہ میں فیڈر دے دیا تھا۔

"پاگل انسان" پر بپھرا تھا پھر بچی کے منہ میں فیڈر دیکھ کر وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑا گلدان اٹھایا تھا۔

"پاگل نہیں ہوں میں۔۔۔سمجھی تم۔۔۔پاگل نہیں ہوں میں۔۔۔آئندہ مجھے پاگل مت کہنا۔۔۔سمجھی۔۔۔کافر مردود لڑکی بے حیا، بے غیرت"

اس نے چلاتے ہوئے وہی گلدان گڑیا کو دے مارا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم اس قدر خطرناک انسان ہو سکتے ہو مجھے اندازہ نہیں تھا۔۔۔مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں یہاں لا کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ آپا سچ کہتی تھیں کہ تم لاعلاج ہو۔" ماموں اس کے پاس بیٹھے بہ رہے تھے اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا رکھا تھا۔ شدید نفرت کے باوجود وہ کبھی بھی گڑیا پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اندر اسے مارنے کی خواہش تھی نہ ہی ہمت۔۔۔ گڑیا کی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی نے اسے تپا دیا تھا اور سب سے آخر میں اس کا بچی کو فیڈر میں شراب پلانے کا عمل تابوت کا کیل ثابت ہوا تھا جس نے لمحہ بھر کے لیے ہی سہی مگر آگ لگائی ضرور تھی۔ نور محمد کا پھینکا ہوا گلدان اگرچہ اس کو چھو کر گزر گیا تھا۔ گڑیا کو خراش تک نہیں آئی تھی مگر رائی کو پہاڑ بنانے کے ہی کام آتی ہے سو وہ بن گیا تھا۔

"تم نے مجھے میرے گھر والوں کے سامنے سخت شرمندہ کروایا ہے۔ تمہاری ممانی تو غصے میں ہیں ہی فہیم نعیم بھی بہت تپے ہوئے ہیں۔۔۔ وہ یہاں پلے بڑھے ہیں مگر غیرت ان میں ابھی بھی پاکستانیوں والی ہے۔ گڑیا سے محبت کرتے ہیں وہ۔۔۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا تمہیں اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیں۔۔۔ وہ تو میں نے انہیں روکا ہوا ہے۔"

نور محمد نے سر اٹھا کر ماموں کا چہرہ دیکھا۔ اس نے دل ہی دل میں ان کے بیان کو دونوں طرف کو ملا کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ وہ کوما اور کوماز کے بغیر دونوں طرح ہی دوغلے نظر آتے تھے۔

"گڑیا نے مجھے پاگل کہا تھا ماموں۔۔۔ اور مجھے مارا بھی تھا۔"

اس کی منمناتی ہوئی آواز نکلی تھی۔ گڑیا نے جوابی کاروائی میں اسے چھوڑا تو نہیں تھا۔ اس کے منہ پر دو تھپڑ مارے تھے۔

"اس میں غلط کیا ہے۔۔۔ تم پاگل ہی ہو۔۔۔ یا نہیں ہو۔۔۔ تمہارا علاج جاری ہے نا۔۔۔ اس میں غلط کیا ہے۔۔۔ اور ہاں گڑیا نے تمہیں مارا نہیں تھا۔۔۔ اپنا دفاع کیا تھا۔ کیا ایک مسلح لڑکی کو اپنا دفاع کرنے کا حق بھی نہیں ہے؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے کیسے اسے منت سماجت کر کے روکا ہے۔ ذرا سوچو اگر وہ کمپلین کر دیتی تو کیا ہوتا۔۔۔ اونہہ۔۔۔ تم کیا سوچو گے۔۔۔ اتنا دماغ ہی کہاں ہے تمہارے پاس۔"

اس کے بعد ماموں منہ ہی منہ میں کچھ بدبدائے تھے۔ نور محمد کو تاسف نے گھیر لیا تھا۔ وہ کیسے انسان تھے۔ وہ ناسمجھ تھے یا ویسا نظر آنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں اندازہ کیوں نہیں تھا کہ ان کی بیٹی ذلت کے کس معیار تک گری ہوئی تھی۔

"ماموں وہ۔۔۔ نور الہدیٰ کو۔۔۔ وہ بچی کو شراب پلا رہی تھی" یہ بات بڑی مشکل سے اس کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔ ماموں نے اس کی بات پر سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

"او بندہ خدا۔۔۔ او کم عقل انسان۔۔۔ وہ شراب نہیں تھی۔۔۔ برانڈی تھی۔۔۔ سردیوں میں بچوں کو تھوڑی سی پلا دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔۔۔ یہ جسم کو گرم رکھتی ہے۔"

"ماموں برانڈی شراب نہیں ہوتی؟" اس نے ماموں کی جانب حیرانی سے دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ جب دوائی کے طور پر استعمال کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔۔۔ یہاں سب دیتے ہیں سردیوں میں اپنے بچوں کو۔۔۔ اسی لیے گڑیا نے بھی بچی کو پلا دی۔۔۔ وہ آخر ماں ہے اس کی۔۔۔ اس کا خیال رکھ سکتی ہے۔۔۔ بلکہ تم سے بہتر رکھ سکتی ہے کیونکہ وہ تمہاری طرح ذہنی طور پر بیمار

نہیں ہے" وہ تنک تنک کر بول رہے تھے۔ اپنی مذہبی معلومات پر وہ خود ہی فخر کرتے تھے۔

"آپ گڑیا کو کچھ نہیں کہتے۔۔۔آپ اس کی روٹین سے واقف ہیں پھر بھی آپ اسے نہیں ٹوکتے۔۔۔آپ دیکھتے ہیں وہ کتنی لیٹ آتی ہے واپس۔۔۔"

وہ ابھی بھی سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ مزید بھی کہنا چاہتا تھا مگر جانے کیوں شرم سی آ گئی۔

"نور محمد بلی کھسیانی ہو کر کھمبا ہی نوچتی ہے۔۔۔اپنے سامنے کھڑے انسان کو نہیں۔۔۔تم میں اتنی شرم تو ہو گی نا کہ بلاوجہ اپنی غلطی اس کے سر مت ڈالو۔ وہ جاب کرتی ہے جب ڈیوٹی آورز ختم ہوں گے تب ہی گھر آئے گی نا۔۔۔جی جان سے بارہ گھنٹے محنت کرو تو ہفتے کے آخر میں تنخواہ ملتی ہے اور یہاں سب ایسے ہی کرتے ہیں۔۔۔مگر تم یہ کیسے سمجھ سکتے ہو۔۔۔تمہیں یہاں آ کر تکلیفیں نہیں دیکھنا پڑیں نا، در در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں تم نے لیکن ہر کسی کا نصیب تمہاری طرح نہیں ہوتا کہ جی بس ماموں کی دوکان پہ آ گئے اور ہو گیا گزارہ۔۔۔تمہیں بھی باہر نکل کر جاب کرنی پڑتی تو پتا چلتا کہ روپے کمانے اور پاؤنڈز کمانے میں کتنا فرق ہے، کتنی محنت ہے۔۔۔ہڈیاں گل جاتی ہیں بھانجے تب کہیں جا کر روزی کمائی جاتی ہے۔۔۔اس لئے بہتر ہے فضول بحث میں مت پڑا کرو۔۔۔یہ خالی خولی نصیحتیں کرنا فارغ لوگوں کا کام ہے۔۔۔اس سے ذرا پرہیز کرو تو اچھا ہے"

وہ اپنی بات مکمل کر اٹھے تھے اور پھر بلاوجہ ادھر ادھر ہاتھ مار کر نادیدہ مٹی جھاڑنے لگے تھے۔ نور محمد کو بے اعتنائی کا احساس ہوا۔ وہ اس کی بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھے۔ الٹا وہ اسے طعنے دے رہے تھے گویا وہ سارا دن دوکان پہ مکھیاں ہی تو مارتا ہے۔ وہ بھول گئے تھے کہ نور محمد کس طرح گدھوں کی طرح ان کی دوکان کا کام سنبھال رہا تھا۔ اسے پہلی دفعہ اپنے کندھے جھکتے ہوئے محسوس کر کے دکھ ہوا تھا۔ اسے ماموں کے رویے پہ دکھ ہوا۔ وہ اسے فہیم نعیم اور گڑیا کے رویے اور غیرت کا احساس دلا کر دھمکا رہے تھے اور یہی کام کر کے انہوں نے اسے گڑیا سے شادی پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کس قدر موقع پرست واقع ہوئے تھے۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز تھا جو کہ وہ نور محمد کو اپنے پاس بلا کر اور اپنے گھر رکھ کر نکال چکے تھے۔ نور محمد اپنے کندھوں پہ نادیدہ بوجھ لے کر اٹھا تھا اور پھر ڈھیٹوں کی طرح کام میں لگ گیا تھا۔ نیا مال آیا تھا جسے اٹھا کر پچھلی جانب اسٹور میں رکھنا تھا۔ اسکول یونیفارم تھے جس میں موزے مفلر اور ٹوپیوں جیسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی شامل تھیں ان کی ایک ایک کر کے پیکنگ چیک کرنی تھی لیبلنگ ہونی تھی۔ بارکوڈز لگنے تھے، ٹیگز لگنے تھے۔۔۔کتنا کام تھا جو وہ خوشی خوشی کرتا آیا تھا اور ماموں کہہ رہے تھے کہ اسے باہر نکل کر جاب کرنی پڑتی تو اسے پتا چلتا۔ ماموں نے اسے کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اسے تنخواہ کے نام پر اب دھمکیاں دینا چاہتے تھے شاید۔ نور محمد کا دل بوجھل اور سر بھاری ہوا جا رہا تھا۔ اس کے سر میں کافی درد رہنے لگا تھا اب اور وہ اس درد کی وجہ سے پریشان بھی تھا۔

"گڑیا سے معافی مانگ لینا۔۔۔میں نے اسے کافی سمجھایا ہے۔۔۔وہ تمہیں معاف کر دے گی۔۔۔دل کی بری نہیں ہے۔۔۔ذرا جذباتی ہے۔۔۔ابھی بچی ہے نا۔۔۔سمجھ جائیگی آہستہ آہستہ۔۔۔"

ماموں نے اسے الجھتا دیکھ کر اب رسانیت بھرا لہجہ اپنایا تھا۔ نور محمد خاموش رہا۔ وہ ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل میں ان سب کے لئے شدید نفرت محسوس کرتا تھا۔ ماموں اس کو نصیحت کر کے دوکان سے باہر چلے گئے تھے اور وہ اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔ نور محمد

کے بھروسے پر وہ کئی کئی گھنٹے دوکان سے باہر رہتے تھے اور وہ اسے نور محمد کا احسان نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ نور محمد پر احسان کر رہے ہیں۔ماموں کے نکلتے ہی وہ جیسے تھک کر بیٹھ گیا تھا۔اسے رونا آنے لگا تھا۔وہ کھل کر رونا چاہتا تھا۔اس نے خود پر جبر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ اپنی رضامندی سے رو رہا تھا ورنہ بہت بار ایسا ہوا تھا کہ اسے خود پتا نہیں چلتا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔

وہ بے آواز رو رہا تھا بے شمار رو رہا تھا۔اس کے دل میں ایک دعا کا ورد تھا۔

"یا اللہ۔۔۔میں اگر اتنا ہی بے جواز ہوں تو مجھے اس دنیا میں ختم کر دے اور اگر نہیں کرنا چاہتا تو اس دنیا کو مجھ میں ختم کر دے"

☆ ☆ ☆

وہ کمرہ بالکل بند تھا۔ہوا کے سب روزن بند تھے لیکن پھر بھی اس شخص کو لگا یکدم جیسے ہوا کا کوئی جھونکا اسے چھو گیا ہو۔اس نے گہری سانس بھری تھی۔۔۔ٹوٹی پھوٹی تھکی ہوئی مرجھائی ہوئی سانس۔۔۔دل کے مقام پر سینہ جیسے جلنے لگا تھا۔اس نے وہاں ہاتھ رکھ کر سہلایا۔وہاں درد نہیں تھا لیکن درد کا احساس تھا اور اس شخص کو اس احساس سے خوف آتا تھا۔اس نے اپنے کندھوں کے گرد بڑی شال کو مزید پھیلا لیا تھا جیسے خود کو اس احساس سے بچانا چاہتا ہو۔

ایک دم سے چھناکے کی آواز آئی تھی۔اس شخص نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا پھر اس نے ایک اور گہری سانس بھری۔یہ اب معمول کی بات ہو چلی تھی۔گلاس ٹوٹنے کی آواز، پلیٹ گرنے کی آواز بھی کے چلانے کی آواز رونے کی آواز ہنسنے کی آواز قہقہے لگانے کی آواز۔۔۔اس کے ارد گرد آوازیں ہی آوازیں۔۔۔یہ آوازیں اس کے کسی کام کی نہیں تھیں۔وہ ان آوازوں سے خار کھاتا تھا۔اسے ان آوازوں سے چڑ ہوتی تھی۔وہ ان آوازوں سے ڈرتا بھی تھا اور وہ ان آوازوں کے لئے ترستا بھی تھا۔اس کا لاشعور انہی آوازوں کے سہارے آباد تھا۔

رات بہت ہو چلی تھی اور نیند اسکی آنکھوں سے روٹھ کر ایک کونے میں بیٹھی تھی۔وہ ایک عرصے سے ایسے ہی بیٹھی تھی۔اسے تو اب یہ بھی بھول گیا تھا کہ نیند اس سے ناراض تھی یا وہ نیند سے ناراض تھا لیکن ان دونوں نے ایک دوسرے سے مفاہمت کر لی تھی۔وہ دونوں اب ایک دوسرے سے نظر ملانا پسند نہیں کرتے تھے۔وہ اکٹھے تب ہی نظر آتے جب تھک ہار جاتے تھے اور تھکے ہوئے وجود ایک دوسرے کو کوئی توانائی نہیں دے پاتے۔وہ نیند کے لئے اور نیند ان کے لئے ایک چبھتے ہوئے رشتہ دار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

"جب آپ جانتے ہیں کہ آپکو نیند کی ٹیبلٹ کے بغیر نیند نہیں آتی تو پہلے ہی کھا لیا کریں نا۔۔۔کب سے اسی طرح کرسی کو آگے پیچھے جھلا رہے ہیں۔۔۔میں اس کی آواز سے ٹھیک سے سو بھی نہیں پاتی" اس کے کمرے میں موجود اسکی اہلیہ نے بستر سے ٹانگیں نیچے اتارتے ہوئے کہا تھا۔اس کے لہجے میں بے حد اجنبیت تھی۔یہ اجنبیت بھی نیند کی طرح انکی چبھتی ہوئی گہری رشتہ دار تھی۔بہت سال ہو چکے تھے وہ اس اجنبیت کو جانتے تھے اور اس کے عادی تھے۔ان کی اہلیہ تہجد پڑھنے کے لئے اٹھی تھی۔وہ باتھ روم کی جانب جا رہی تھی۔وہ تہجد ادا کرتی اور پھر نماز تک مناجات پڑھتی رہتی اور نماز کے بعد اللہ سے رو رو کر اپنے دل کی مراد مانگتی رہتی۔

"کتنی اچھی ہوتی ہیں مائیں۔۔۔رونے کے لئے کواڑ نہیں ڈھونڈتیں۔۔۔بہانے نہیں بناتیں۔۔۔جھوٹ نہیں بولتیں اولاد کو یاد کرتی ہیں اور انہیں رونے کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔۔۔باپ رونے کے لئے کبھی تنہائی ڈھونڈتا ہے اور کبھی تاریکی۔۔۔اور کبھی کبھی یہ دونوں چیزیں مل جائیں تب بھی رویا نہیں جاتا باپ سے۔۔۔ملامت آنکھوں کو تر کردیتی ہے اور ملامت کبھی کبھی آنکھوں کو خشک بھی کردیتی ہے۔۔۔خشک اور ویران۔۔۔اس شخص کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں اور دل ویران۔۔۔

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد سے نور محمد کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔وہ پہلے بھی اپنے اردگرد سے لاپرواہ رہا کرتا تھا لیکن اب اس کی دلچسپی بالکل صفر ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے اردگرد رہنے والے اس کی اس حالت پر خوش اور مطمئن تھے لیکن ایک اور بات تھی جو ماموں کو محسوس ہوئی جس سے ان کے دل میں کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ماموں کو اس کی حرکتیں اضطراری اور عجیب محسوس ہو رہی تھیں۔انہیں لگ رہا تھا وہ اپنے حواس کھو رہا ہے۔اس امر پر مہر تب لگی جب ماموں نے ایک روز اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھا۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو نور؟" انہوں نے پوچھا تھا۔وہ دونوں دوکان میں بیٹھے تھے۔یہ پیک آورز نہیں تھے اس لئے انہوں نے آرام دہ نشست اپنا رکھی تھی۔ماموں نے ایک دوبار نور محمد کو بولتے سنا تھا۔وہ سمجھے وہ ان سے مخاطب ہے لیکن جب وہ اس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتے تھے تو وہ ان سے بات کرنے کی بجائے کچھ اول فول بکنے لگتا جس کی انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"خضر الٰہی سے باتیں کر رہا ہوں ماموں" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"کس سے۔۔۔کون۔۔کون ہے خضر الٰہی؟" وہ چونکے تھے۔

"یہ میرے دوست ہیں ماموں۔۔۔خضر الٰہی یہ ماموں ہیں۔۔میری امی کے بھائی" وہ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس کے سامنے ہی کوئی بیٹھا ہو۔ماموں کو اس سے خوف آیا۔

"کیا بک رہے ہو نور محمد۔۔ہوش میں آؤ۔۔یہاں کوئی نہیں ہے" انہوں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر کہا تھا۔

"ماموں۔۔میں اب آپ لوگوں کو تو کچھ نہیں کہہ رہا۔۔۔آپ مجھے مت ٹوکیں۔۔۔یہی تو ایک دوست ہیں میرے۔۔۔" وہ تندہی سے اچک کر بولا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی ضد منوانے کے لئے بڑوں سے لاڈ کر رہا ہو۔اس نے اتنا کہہ کر ماموں کی جانب پیٹھ کرلی تھی اور پھر سر ہلا کر آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ماموں کو احساس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ پھر کوئی ذہنی مسئلہ بن رہا ہے۔وہ جب سے ان کے پاس آیا تھا اس کی یہ حالت انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔وہ خوفزدہ ہو گئے تھے لیکن کچھ دیر بعد جب گاہک وغیرہ آنے لگے تو نور محمد کا رویہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ماموں پرسکون ہو گئے تھے۔کچھ دن بعد انہوں نے اسے پھر اسی حالت میں دیکھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتے وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اس نے دوکان کی بالکل ایک سمت میں کچھ بچھانا شروع کردیا تھا۔وہ ایک جائے نماز تھی۔

"کیا کر رہے ہو نور محمد؟" انہوں نے اپنے لہجے کو ذرا نرم رکھا تھا۔
"نماز قائم کرنے لگا ہوں ماموں" وہ بے حد پرسکون لہجے میں بولا تھا۔ ماموں نے حیرانی سے گھڑی کی جانب دیکھا۔
"کون سی نماز... یہ کسی نماز کے اوقات نہیں ہیں نور" انہیں نجانے کیوں اس پر ترس سا آیا۔
میں فجر کی نماز قائم کرونگا ماموں" اس نے جواب دیا تھا اور نیت باندھ لی۔ اگلے چند منٹوں میں ماموں نے اسے بہت خشوع وخضوع سے نماز ادا کرتے دیکھا۔ اس دن کے بعد سے یہی ہونے لگا۔ ماموں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ نور محمد کی ذہنی حالت پھر خراب ہو رہی ہے۔ وہ ہر دو گھنٹے بعد جب گاہک موجود نہیں ہوتے تھے وہ جائے نماز بچھالیتا اور نماز ادا کرنے لگتا۔ ماموں کے پوچھنے پر وہ ہمیشہ یہی کہتا۔
"میں فجر کی نماز قائم کرونگا ماموں" اس کے علاوہ وہ اکثر گود میں پاس پڑی ہوئی کوئی بھی چیز اٹھا کر رکھ لیتا اور کہنے لگتا کہ وہ قرآن پاک پڑھ رہا ہے۔ وہ چونکہ کسی کے لئے مشکل پیدا نہیں کر رہا تھا اور اپنی ڈیوٹی بھی ذمہ داری سے ادا کر رہا تھا اس لئے ماموں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوکل ہیلتھ سینٹر میں رجسٹرڈ تو تھا لیکن کس کے پاس اتنا وقت تھا کہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتا پھر سائکالوجسٹ کی اپائنمنٹ لیتا اور اس کو لے کر جاتا۔ اسی حالت میں اس نے کچھ مہینے گزار لئے پھر ایک حادثہ پیش آ گیا۔



ماموں اس دن دوکان سے ہمیشہ کی طرح جلدی نکل گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اکا دکا ہی گاہک آجاتے تھے اس لئے یہ وقت پرسکون ہوتا تھا۔ نور محمد نے نماز ادا کرنے کے لئے جائے نماز بچھائی اور نیت باندھ ہی رہا تھا کہ دو علاقائی نوعمر لڑکے دوکان میں داخل ہوئے۔
انہوں نے نور محمد کو کچھ پی کیپس دکھانے کے لئے کہا تھا۔ نور محمد نے ان سے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا تاکہ وہ نماز ادا کر لے لیکن وہ جذباتی قسم کے سولہ سولہ سال کے لڑکے تھے۔ انہوں نے نور محمد کو نماز ادا کرنے سے روک دیا تھا۔ اسی بات پر بحث چھڑ گئی۔ نور محمد انکی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ ماموں جب دوکان میں داخل ہوئے تو وہ لڑکے چلا چلا کر نور محمد کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ایسا اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ علاقائی بچے انہیں اسی طرح ستایا کرتے تھے۔ ماموں نے اپنی دوکان میں کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ مل کر سعودیہ سے حجاب اور اسکارف وغیرہ منگوائے تھے تب سے ماموں کی دوکان پر ایسے واقعات زیادہ ہو گئے تھے لیکن یہ روٹین کی بات تھی۔ تارکین وطن اس چیز کے عادی تھے بالخصوص مسلمان زیادہ تنقید کا نشانہ بن جایا کرتے تھے لیکن یہ تو ہوتا ہی رہتا تھا اس لئے ماموں نے دوکان میں داخل ہوتے ہی نور محمد کو ٹوکا تھا اور اسے ان دونوں لڑکوں کی مطلوبہ چیز دکھانے کے لئے کہا تھا۔ نور محمد ناک چڑھاتے ہوئے اٹھا تھا اور اس کے اٹھتے ہی ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے اپنا ٹراؤزر اتارا تھا اور اس جگہ کو گیلا کر دیا تھا۔ دوسرا لڑکا قہقہے لگا کر ہنسنے لگا تھا۔ ماموں کو بھی غصہ آیا تھا لیکن نور محمد نے ایک لمحہ جائے نماز کی جانب دیکھا تھا پھر اس کے پورے بدن میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر اس لڑکے کو گردن سے پکڑا تھا اور نیچے گرا دیا تھا۔
"کمینہ... گندا... حرامی" وہ گالیاں بک رہا تھا اور اس نے اس لڑکے کو تھپڑ بھی دے مارا تھا۔ ماموں پلک جھپکتے آگے بڑھے تھے اور انہوں نے نور محمد کو پکڑ لیا تھا لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ نور محمد کے اندر نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ قابو ہی نہیں آ رہا تھا۔ شور کی آواز سن کر ملحقہ دوکان کا مالک اور ملازم بھی بھاگے آئے تھے۔ انہوں نے مل کر بمشکل نور محمد کو قابو کیا تھا۔ وہ لڑکے بکتے جھکتے واپس چلے گئے تھے۔ ماموں نے شکر ادا کیا تھا

ورنہ اگر پولیس آجاتی تو ان لڑکوں کو کوئی کچھ نہ کہتا لیکن وہ مصیبت میں پھنس جاتے۔

"رانا بھائی۔۔۔چھوکرا کوئی بڑی مصیبت نہ کردے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔اس کا علاج بھی کرواؤ اور اس کو سمجھاؤ بھی کہ یہاں رہنا ہے تو اپنی ضد کو مار کر رہنا ہوگا۔۔۔یہ روزمرہ کی باتیں ہیں۔۔۔ان پہ جذباتی ہونا ٹھیک نہیں" ساتھ والی دوکان کے ملازم نے کہا تھا۔اس پاس کی چند دوکانوں والے جو ایشز تھے وہ نور محمد کی حالت سے واقف تھے ماموں خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔وہ نام نہاد ہی سہی لیکن ان کا داماد تھا اور ماموں اس کو واپس نہیں بھجوا سکتے تھے لیکن اس کو اپنے پاس رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں رہا تھا۔پولیس کو یا کسی فلاح و بہبود والی آرگنائزیشن کو خبر ہو جاتی تو ان کے لئے بہت پریشانی بن سکتی تھی۔اسی دوران ان کو کسی نے ایک نفسیاتی روحانی کلینک کا پتا بتایا تھا جہاں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور تنہائی کے ستائے لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ماموں کے لئے صرف یہی بات قابل ذکر تھی سو وہ نور محمد کو وہاں لے آئے تھے۔ماموں نے اسے وہاں چھوڑ دیا تھا۔وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑوانا چاہتے تھے۔انکا خیال تھا کہ جب نور محمد کی حالت تھوڑی سنبھلے گی تو اسے پاکستان واپس بھیج دیں گے لیکن جب وہ دو مہینے بعد اس کی خیریت دریافت کرنے وہاں گئے تھے تو ان کو بتایا گیا تھا۔

"نور محمد یہاں سے لوٹن جا چکا ہے" ماموں پہلے کچھ دن پریشان رہے پھر انہوں نے اس مصیبت سے جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کیا تھا اور دوبارہ کبھی اس کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نور محمد کسی شخص کا نام نہیں ہے۔۔۔یہ ایک فینامینن ہے۔ایک سوچ ہے ایک عمل ہے۔یہ ثابت کرتا ہے کہ مسلمان اتنی پستی میں گر چکے ہیں کہ انہیں اپنی نسلوں کی بھی پرواہ نہیں رہی۔یہ اپنی اولادوں کو تو بارود کی طرح پروان چڑھاتے ہی رہے ہیں تاکہ وقت پڑنے پر انہیں ہمارے سروں پر ہماری اولادوں کے سروں پر پھوڑ سکیں لیکن اب انہوں نے اپنا پینترا بدل کر ہمارے نوجوان نابالغ بچوں کو ٹریپ کرنا شروع کر دیا ہے"

یہ سٹر نیرن تھے۔ان کے پورے گروپ میں وہ سب سے زیادہ سخت مزاج واقع ہوئے تھے لیکن ان کی سوچ میں وہ فکر مندی جھلکتی تھی جو انہیں آنے والی نسلوں کے مستقبل کے حوالے سے تھی۔یہ فکر صرف ان کے لہجے میں ہی محسوس نہیں ہوئی تھی مجھے۔۔۔

"آپ مزید وضاحت کریں گے۔۔۔میں سمجھا نہیں آپکی بات؟" میں نے اپنی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ پر رکھی۔یو پی ایل (یونائیٹڈ پیپل آف لوٹن) کا گروپ ہمیشہ ہی چونکا دینے والے انکشافات لے کر میرے پاس آتا تھا۔میں اپنے نئے ناول پر ان کے موقف کے مطابق کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔میں ذہنی طور پر اس پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور میرا ارادہ اس پہ مزید کام کرنے کا نہیں تھا لیکن ایک عجیب بات تھی مجھے اس ناول کے متعلق جب بھی مواد ملتا تھا اس میں مجھے پہلے سے زیادہ دلچسپی محسوس ہونے لگتی تھی۔میرے ارادے متزلزل ہونے لگتے تھے۔کوئی طاقت تھی جو مجھے کھینچتی تھی۔

"نور محمد لوٹن کی جامعہ مسجد کا موذن ہے۔آپ کو پتا ہی ہوگا اذان کسے کہتے ہیں۔مسلمان اپنی عبادت گاہ میں پانچ مرتبہ اکٹھے ہوتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہیں بیٹھ کر دنیا کی مہذب قوموں کے خلاف دہشت گردی کی منصوبہ بندیاں کرتے ہیں۔یہ اسے عبادت قرار دیتے ہیں اور صلاۃ (صلوٰۃ۔نماز) کہتے ہیں۔اس صلاۃ کو شروع کرنے سے پہلے یہ سب لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لئے با آواز بلند اذان پڑھتے ہیں تاکہ ارد گرد موجود

لوگ وہاں جمع ہو جائیں۔"

وہ بتا رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ میں اگرچہ اذان اور نماز کی اصلاح سے واقف تھا لیکن میں نے انہیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

"یہ شخص نور محمد دن میں پانچ مرتبہ اذان دینے کی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے لیکن یہ اس کا پارٹ ٹائم کام ہے۔ چھوٹے سے قد کا مُڑا تُڑا اور ڈرا سہما بیوقوف سا نور محمد دراصل ایک جہادی تنظیم سے وابستہ ہے۔ یہ شخص جادوگر ہے۔ ظاہری شخصیت دیکھو تو معصوم سا انسان لگتا ہے جیسے بولنا بھی نہیں آتا ہو گا لیکن نا جانے کیا عمل کرتا ہے کہ لوگ اس کے مطیع بن جاتے ہیں۔ یہ شخص آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتا لیکن بچوں کو ورغلا کر انہیں جہادی بنا دیتا ہے۔ یہ نو عمر ذہنوں کے ساتھ نفسیاتی گیم کھیلتا ہے۔ انہیں ماں باپ سے مذہب سے انسانیت سے متنفر کر کے اپنی جانب راغب کر لیتا ہے اور بس ہمارے پلے پلائے بچے ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتے ہیں اور پھر وہ وہی کرتے ہیں جو یہ جادوگر ان سے کروانا چاہتے ہیں۔ آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے سن کر کہ افغانستان میں بھی برطانوی شہریت رکھنے والے طالبان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وہاں نیٹو فورسز کے خلاف لڑنے والوں میں کئی برطانوی نوعمر لڑکے گرفتار بھی ہوئے ہیں اور مارے بھی گئے ہیں۔ اس نور محمد کا پولیس ریکارڈ بھی ہے۔ اس بات کے بھی ثبوت ہیں کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ مذہبی تعلیم دینے کی ڈیوٹی پر مامور ہے۔ المیہ یہ ہے کہ نور محمد واحد انسان نہیں ہے اس علاقے میں جو یہ سب کر رہا ہے۔ لاتعداد لوگ ہیں جو المہاجرون کے لئے کام کر رہے ہیں اور یہ تنظیم یہاں سے جہادی تیار کر کے پورے انگلینڈ میں بھیجتی ہے۔ ان کا ریکٹ بہت طاقتور ہو چکا ہے۔ نور محمد اور جامعہ مسجد کے کچھ اور لوگ مل کر سب سے پہلے نوعمر لڑکوں کی برین واشنگ کرتے ہیں۔ انہیں روحانی تعلیم کے نام پر اپنے مذہب کا سارا تعصب ساری نفرت پڑھاتے ہیں پھر جو ان کی باتوں میں پوری طرح آ جاتا ہے اسے یہ باقاعدہ عسکری تربیت کے لئے افغانستان بھجواتے ہیں اور پھر یہ پوری دنیا میں خودکش بمبار بن کر دہشت گرد بن کر پھیل جاتے ہیں، یہ ہے وہ اسلامائزیشن جس کے مضمرات کا ہم ایک عرصے سے رونا رو رہے تھے اور رو رہے ہیں" مسٹر ڈیرن نے مجھے تفصیل سے بتایا تھا میری آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔

"یہ تو عجیب بات بتا رہے ہیں آپ۔۔۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ ایسے کیسے یہ سب برداشت کر رہے ہیں" میں ان کے سامنے اپنی حیرانی کا اظہار کئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"ہم ہر سطح پر آواز اٹھا رہے ہیں۔۔۔ جہاں جہاں ممکن ہے ہم نے اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ اہلِ نظر اہلِ ظرف کسی کو نہیں چھوڑا ہم نے۔۔۔ اسی لئے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ اسے التجا سمجھیے یا درخواست لیکن ہم آپ سے پر زور اصرار کرتے ہیں کہ آپ مہربانی فرما کر اس ناول پر کام شروع کریں۔ آپکی آواز ایوانوں تک سنی جاتی ہے۔ آپ کے پڑھنے والوں میں ہر عمر ہر طبقے کا انسان شامل ہے۔ ہم پوری معاونت کریں گے، ہر طرح آپ کی رہنمائی کریں گے۔" وہ دگیر لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"آپ نور محمد سے میری ملاقات کروا سکتے ہیں۔۔۔ میں ایک بار اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں" میں نے کہا تھا۔

"وہ لوٹن میں رہتا ہے۔۔۔" مسٹر ڈیرن بولے تھے میں نے سر ہلا دیا۔

فیصلہ ہو چکا تھا۔



"ڈاکٹر زارا آر یو کے؟" سلیمہ نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ زارا نے اسکی جانب دیکھا۔ وہ اتنی غائب دماغی کی کیفیت میں تھی کہ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے پھر اس نے بستر پر دراز مریضہ کی جانب دیکھا تھا۔ وہ عام سے قد وقامت کی خاتون تھی اور تکلیف کے باوجود بہت برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ لیبر روم میں ایسی عورتیں ڈاکٹرز کے لئے زیادہ مشکل پیدا نہیں کرتیں۔ زارا نے اسکی جانب دیکھا پھر پیشہ ورانہ انداز میں سلیمہ کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اس سے اسکی خیریت دریافت کرنے لگی تھی۔ اس نے اس کا جواب نہیں سنا تھا۔ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سسٹر سلیمہ نے اس سے کیا سوال کیا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف شہروز کا سفاک اور سپاٹ لہجہ گونج رہا تھا۔

"تم کام کرو زارا اور فرصت ملے تو سوچنا کہ جن سے محبت کی جاتی ہے جب وہ ہرٹ کرتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟" کتنا سرد لہجہ تھا شہروز کا۔ اس نے کبھی اس سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی بات کا کتنا بڑا بتنگڑ بنا لیا تھا۔ زارا کا دل جیسے دکھ کے بوجھ سے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"ڈاکٹر۔۔۔" سلیمہ نے پھر اسے مخاطب کیا۔ وہ چونک کر اسکا چہرہ دیکھنے لگی پھر اپنی کیفیت پر قابو پا کر پوچھنے لگی۔

"پہلا بے بی ہے؟" اس نے مریضہ کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"تیسرا ہے۔۔۔ پہلے دو بیٹیاں ہیں۔۔۔" سلیمہ نے اسے بتایا تھا پھر بستر پر لیٹی خاتون کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"انشاء اللہ اس بار بیٹا ہوگا" سلیمہ کی بات پر وہ مسکرائی تھی۔ تکلیف کے باوجود مسکراہٹ نے اس عورت کے چہرے کو بے حد انوکھے رنگ بخشے تھے۔ زارا کو اس کے چہرے کی یہ مسکراہٹ بڑی بھلی لگی۔ ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خیال ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جو اسے الوہی خوشی بخشنے کا باعث بنتا ہے۔ زارا جانتی تھی اس کے لئے یہ خیال کونسا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جو خیال خوشی دیتا ہے وہی بعض اوقات بے حد دکھ کی وجہ بھی بن جاتا ہے۔

"آپ پر سکون ہو جائیں۔۔ انشاء اللہ اس بار اللہ آپکے دل کی مراد ضرور پوری کرے گا" زارا نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔ یہ ایک عمومی پیشہ ورانہ رویہ تھا لیکن اس عورت نے گہری اطمینان بھری سانس بھری۔

"ڈاکٹر آپ کو کیا لگتا ہے۔۔۔ مجھے اس بار بیٹا مل جائیگا" وہ بہت پر امید لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ زارا کو ایسی مریضائیں ہر دوسرے روز ملتی تھیں جو اولادِ نرینہ کی آس میں ڈاکٹرز کے منہ سے نکلے لفظوں کو ہی "خوش خبری" سمجھ لیتی تھیں۔ زارا نے اس کے سوال پر اس کا چہرہ دیکھا۔

"انشاء اللہ۔۔ اچھی امید رکھیں" وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔۔۔

"ہاں مجھے پوری امید ہے اللہ کی ذات سے۔۔۔ میری بیٹیاں بہت خوش ہیں۔۔ میں انہیں بتا کر آئی ہوں کہ ان کے لئے منا سا بھائی لینے جا رہی ہوں" وہ عورت کافی باتونی لگ رہی تھی۔ زارا سر ہلاتے ہوئے اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ اس عورت کی سن لی گئی تھی۔ اللہ پاک نے اسے بیٹے سے ہی نوازا تھا۔

سلیمہ خوشی خوشی بچے کو لیبر سے باہر لے گئی تھی۔ اولادِ نرینہ نرسنگ اسٹاف کے لئے بھی بڑی خوشخبری ثابت ہوتی تھی۔ بیٹا پیدا کرنیوالی ماں کے خاندان والے فراخ دلی اور سخاوت کا اچھا مظاہرہ کرتے ہوئے نرسنگ اسٹاف کو مٹھائی کے نام پر دل کھول کر رقمیں دیتے تھے۔ یہ ان سب کے لئے زائد آمدنی کا ذریعہ تھا سو خوش ہونا ان کا حق بنتا تھا۔ وہ عورت تکلیف سے نڈھال ہونے کے باوجود اطمینان سے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ زارا نے

اپنا کام نبٹا کر دستانے اتار کر ڈسٹ بن میں پھینکے تھے۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔ تھینک یو سو مچ" وہ کہہ رہی تھی۔

زارا نے اس کی جانب دیکھا پھر سپاٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ فقط سر ہلایا تھا اور اس کی فائل پر سائن کر دیئے تھے۔ اسے گھر جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر زارا آپکو آواز آ رہی ہے۔۔ آپ سن سکتی ہیں" سرجن ندا کی آواز میں کرختگی اتنی تھی کہ زارا کی دھڑکن تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وارڈ سے بھی رونے کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ جیسے جیسے آواز آتی تھی زارا کا دل ڈوبتا جاتا تھا۔ اس نے جانے کتنی مرتبہ دل ہی دل میں ممی کے جلد پہنچ جانے کی دعا کی تھی۔

"آپکی لاپروائی اور غیر ذمہ داری سے مجھے یہی امید تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نا ایک دن آپ یہ گل ضرور کھلائیں گی۔ آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ماں باپ کے بل بوتے پر میڈیسن پڑھ تو لیتے ہیں مگر کبھی علاج نہیں کر پاتے" انکا انداز پہلے کی نسبت مزید جارحانہ ہو گیا تھا۔ انکی گفتگو میں طنزیہ انداز تو ہمیشہ موجود ہی رہتا تھا لیکن آج تو وہ جیسے بھتے سے اکھڑی جا رہی تھیں۔ زارا انہی کے کیبن میں بیٹھی تھی۔ اسکی کچھ کولیگز بھی وہیں موجود تھیں۔ ہاسپٹل کا گیٹ بند کروا دیا گیا تھا لیکن پھر بھی سب کے چہرے پر پریشانی تھی۔ زارا کی تو جیسے کسی نے جان ہی نکال دی تھی۔ اسکا دل لرز رہا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ اس طرح کا بھی کوئی واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ایک عام سا کیس تھا کوئی پریشانی کی بات بھی نہیں تھی۔ زچہ کی میڈیکل ہسٹری بھی ٹھیک تھی۔ زارا نے اپنے ہاتھوں سے بے بی سلیمہ کے حوالے کر کے مریضہ کی فائل پر دستخط کیئے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ دوسرے کیس کی جانب متوجہ ہوئی تھی لیکن کچھ دیر بعد ہی اس مریضہ کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے سانس لینے میں رکاوٹ ہو رہی تھی پھر اس کے جسم نے جھٹکے کھانے شروع کر دیے۔۔۔ وہ ایک ایک فٹ اوپر اچھل رہی تھی اس کے چہرے پر اتنی تکلیف کے آثار تھے کہ جتنے ڈیلیوری کے دوران بھی نظر نہیں آئے تھے۔ زارا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس نے فوراً سرجن ندا کو کال کیا تھا لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مریضہ خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ بیس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور سب ختم ہو گیا تھا۔ اس کے خاندان والے ابھی اس خبر پر مسرور تھے کہ زچہ و بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ ان کو اس خبر کے متعلق پتا لگتے ہی ہاسپٹل میں کہرام مچ گیا تھا۔ وہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سارے وارڈ میں عجیب ہلچل سی مچ گئی تھی۔ مریضہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھی اور اس کی فائل پر یہ بات زارا سرخ پین سے لکھنا بھول گئی تھی۔ مسز سلیمہ نے اس سے پوچھ کر ایک انجیکشن "میتھر جن" اس کو دیا تھا۔ یہ ایک عام سا انجیکشن ہے اور عموماً ہر مریضہ کو ڈیلیوری کے بعد دیا جاتا ہے لیکن جس مریضہ کا بلڈ پریشر ہائی ہو اسے یہ انجیکشن نا دینا تجویز کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مریضہ کی فائل پر سرخ روشنائی سے اسکی نشاندہی بھی کرتے ہیں زارا یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہ مریضہ ہائپر ٹینسو ہے۔ اس نے فائل میں ہسٹری خود دیکھنے کی بجائے سلیمہ سے چیدہ چیدہ باتیں پوچھ لی تھیں اور سلیمہ بھی بتانا بھول گئی تھی۔ میتھر جن کا ری ایکشن ہوا تھا اور وہ مریضہ چند لمحوں میں وفات پا گئی تھی۔ سرجن ندا نے احتیاطاً گائنی ڈیپارٹمنٹ کے گیٹ لاک کروا دیئے تھے۔ میڈیا والوں کو بھی خبر ہو گئی تھی اور آن ڈیوٹی ڈاکٹرز اب سرجن ندا کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ہر شخص افسردہ اور پریشان تھا۔ اس عورت کے گھر والے تو ابھی افسردگی سے ہی نہیں نکلے تھے کہ مزید کچھ

سوچتے لیکن سرجن ندا زارا کو معاف نہیں کرنے والی تھیں اس کا اندازہ وہاں موجود سب ڈاکٹرز کو تھا۔ یہ واقعی بے حد افسوسناک تھا لیکن یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ ایسے کیسز رپورٹ ہوتے ہی رہتے تھے لیکن سرجن ندا صورتحال کو مزید ہوا دے رہی تھیں ان کی اور زارا کی ذاتی مخاصمت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ باآواز بلند مسلسل کچھ نا کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔

"آپ وہاں بیٹھی بن کباب کھائیں، فون پر گپیں ماریں، اپنی زلفیں سہلائیں۔۔۔ آپ کو کیا کوئی غریب مرے یا جئے" سرجن ندا کی نظریں جیسے آگ اگل رہی تھیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا میم۔۔۔ میں تو بس میں تو۔۔۔" وہ منمنائی۔

"آپ نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ آریو شیور آپ نے کچھ نہیں کیا۔۔ مجھ سمیت کئی لوگوں نے آپ کو نرسنگ اسٹیشن پر بیٹھے فون پر باتیں لگاتے دیکھا ہے۔ یہاں موجود کتنے لوگ جانتے ہیں کہ مریضہ تکلیف سے تڑپ رہی تھی اور آپ وہاں بیٹھی فون کان سے لگائے سینڈوچ کے مزے لے رہی تھیں۔۔ اتنی سی اخلاقیات پڑھی ہے آپ نے۔۔۔ اتنے سالوں میں بس یہی سیکھ سکیں آپ کہ مریض مصیبت میں ہو تو فون سننے سے اسے آرام آجاتا ہے۔ آپ جیسے غیر ذمہ دار لوگ اس مقدس پروفیشن کے قابل ہی نہیں ہیں میں اسی لئے آپ جیسے لوگوں کے میڈیسن پڑھنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اب آپ بتائیں مجھے کہ اس غریب کے گھر والوں کو کیا جواب دوں۔۔۔ کیا کہوں کہ جسے جان بچانے کا ہنر سکھایا گیا تھا اس نے ہی جان لے لی" ان کی آواز میں شعلوں کی لپک تھی۔ زارا بس رو رہی تھی۔ یہ رونے والی ہی بات تھی۔ مریضہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کو جب اس کے بچے کی شکل دیکھائی گئی تو کیسے کھل سی گئی تھی۔ زارا نے سسکی بھری۔

اسی اثناء میں دروازہ کھلا تھا۔ زارا کے والدین اندر داخل ہوئے تھے۔

"ممی۔۔" زارا تڑپ کر اٹھی تھی۔

"کیا ہوا ہے سرجن۔۔ مجھے تفصیل سے بتائیے" یہ اس کے والد ڈاکٹر تنویر کی آواز تھی۔ سرجن ندا اس کے پاپا کا لحاظ کرتی تھیں کیونکہ وہ کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ ممی نے اسے اپنی بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے ہلس گرانٹ کا نام سنا ہے؟" رضوان اکرم نے کیب کے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ شہروز نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا وہ انہیں ائرپورٹ ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔ اس کے پاس فراغت تھی سو وہ بھی ہوٹل کی کیب میں ان کے ساتھ ہی آگیا تھا۔ اس بات کی پیشکش بھی اسے رضوان اکرم نے ہی کی تھی۔

"یہ ایک مشہور انگلش ناولسٹ ہے۔ اس نے بڑے اچھے اچھے ناولز لکھے ہیں۔ ہیرلڈ ٹربیون (مشہور اخبار) کا دبئی کا کارسپانڈنٹ میرا دوست ہے۔ اس کی نیوز ایجنسی ہے۔ میں جب بھی دبئی آتا ہوں۔ وہ مجھے بہت اچھی اچھی مہنگی نادر کتابیں تحفے میں دیتا ہے۔ میں نے اس بار تمہارے لئے بھی کچھ کتابیں لی ہیں۔۔۔ مجھے امید ہے یہ تمہیں پسند آئیں گی" وہ سگریٹ کے کش لگاتے اسے تفصیل سے بتا رہے تھے۔ شہروز نے تشکر آمیز

مسکراہٹ کو اپنی ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتے محسوس کیا۔

"نوازش، یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے۔۔۔ہماری جاب کا یہ ایکسٹرا فائدہ ہے کہ اب کتابوں پہ روپے خرچ نہیں کرنے پڑتے"

"اس شخص نے اپنا پہلا ناول لکھ کر ہی ہلچل مچادی تھی لیکن اسکی شہرت کی اصل وجہ اس کا دوسرا ناول ہے۔یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے جوانی میں پروسٹیٹ کینسر ہو گیا تھا۔وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بھاگ کر برازیل چلا گیا تھا اور وہاں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔اس کی گرل فرینڈ اس کی موت کے بعد ایک کمپین چلاتی ہے۔جس میں یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ مارفین کو برطانیہ میں لیگل کر دیا جائے کیونکہ یہ ایسی ڈرگ ہے۔جو دوسرے کسی بھی دوسری دوا کی نسبت زیادہ تیزی سے اور زیادہ دیر کے لئے آرام دلاتی ہے۔اس کے مضر اثرات بھی زیادہ ہیں۔اس لڑکی کی کمپین کے بعد اس کا مطالبہ سنا جانے لگتا ہے اور لوگ اس کے بارے میں بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ناول کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر اس ناول کی اشاعت کے بعد برطانیہ میں مارفین کو لیگل کر دیا گیا" وہ اسکا چہرہ دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ناول کی کہانی اچھی تھی لیکن شہروز کو ناول پڑھنے سے بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔وہ سوالیہ انداز میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"میں چاہتا ہوں تم بلس گرانٹ کے سب ناول پڑھو اور پھر لندن آ کر اس شخص کا انٹرویو کرو۔"

"میں۔۔۔؟" اس نے سوال کیا تھا۔دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ابھی تو دبئی کا چارم ہی ختم نہیں ہوا تھا اور وہ اسے لندن کا کہہ رہے تھے۔وہ اس سے پہلے لندن نہیں گیا تھا لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات بھی نہیں۔وہ چاہتا تو جا سکتا تھا لیکن اس قسم کے وزٹ کے جو مزے تھے یہ صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔اس سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔اسی دوران اس کے سیل فون کی بیپ بجی تھی۔اس نے عجلت میں فون جیب سے نکالا تھا اور اس کی بیپس آف کر دی تھیں۔وہ اس لمحے کوئی دوسری بات نہیں سننا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کوڈ ورڈ آف سول آئزیشن۔۔۔بہت زبردست کتاب ہے" اس نے کتاب کھولی ہی تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔فلائٹ بے حد پرسکون تھی۔چند لمحے پہلے انہیں کافی پیش کی گئی تھی۔شہروز نے رضوان صاحب کی دی گئی کتابوں میں سے ایک پہلے سے ہی منتخب کر کے رکھی ہوئی تھی۔5 گھنٹے کی فلائٹ کتاب کی معیت میں آسانی گزر سکتی تھی اس نے اس نے پرسکون ہوتے ہی وہ کتاب نکال لی تھی جسے اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے سراہا تھا۔شہروز نے اس کی جانب دیکھا پھر مسکرایا۔وہ جہاز میں سوار ہوتے ہی اس شخص سے مرعوب ہو گیا تھا۔وہ پچاس کے پیٹے میں ایک بہت ہی بارعب اور انوکھی سی آن بان والا شخص تھا اور شہروز سے آگے آگے ہی ٹنل میں چلتا ہوا جہاز میں داخل ہوا تھا پھر جب وہ اپنی نشست تک پہنچا تو اتفاق سے وہی شخص ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھا۔اس کے برانڈڈ لباس سے مہنگے تیز پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔شہروز کا اندازہ تھا کہ وہ سعودی یا اماراتی ہے۔

"مجھے امید ہے کہ میں اس کو پڑھ کر مایوس نہیں ہوں گا" شہروز نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بھی یہی امید کرتا ہوں" اس نے کہا پھر تھوڑا سا رخ اس کی جانب موڑ کر بولا۔

"میں عوف ہوں۔۔۔عوف بن سلمان۔۔۔آئی ایم فرام سعودی عرب" شہروز نے مزید مرعوب ہو کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما تھا۔

"میں شہروز ہوں۔۔۔میں پاکستانی ہوں" وہ اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔۔۔پاکستانیوں کی ایک بات مجھے بہت پسند ہے دراصل یہ بات مجھے حیران کرتی ہے" وہ سراہنے والے انداز میں بولے تھے۔شہروز مسکرایا۔

"اس بات پر تو میں بے حد مشکور ہوں کہ آپ کو ہم پسند ہیں۔۔۔لیکن حیران کس بات پر ہوتے ہیں آپ؟" شہروز پوچھ رہا تھا۔عوف بن سلمان نامی وہ شخص عام عربوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بات نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کا لہجہ بہت شستہ تھا۔

"آپ لوگ ایک ملٹی میڈیا قوم ہیں۔۔۔یہ میری ذاتی ٹرم ہے جو میں ان لوگوں کو دیتا ہوں جو ہمہ جہت خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ پاکستانی واقعی انتہائی ذہین انتہائی ہنر مند قوم ہیں اور اس بات کا اندازہ مجھے اس امر سے ہوا آپ لوگوں کی قومی زبان اردو ہے جبکہ گھروں میں آپ لوگ اپنی مادری زبانیں بولتے ہیں،آپ لوگ تعلیم انگلش زبان میں حاصل کرتے ہیں اور اس کے باوجود دنیا میں سب سے زیادہ مستند حافظ قرآن مبلغ اور مفتی پاکستانی ہیں۔ہزاروں پاکستانی ہر سال سعودی عرب آتے ہیں اور قرآن اور حدیث کے علم کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور فاتح ٹھہرتے ہیں۔میں حیران ہوتا ہوں کہ آپ لوگ یہ کیسے کرتے ہیں چار چار زبانوں پر ایسی دسترس عام بات نہیں ہوتی۔۔۔میں بہت متاثر ہوتا ہوں۔۔۔ماشاءاللہ پاکستانی قدرتی طور ذہین و فطین لوگوں کی سرزمین ہے۔" وہ سراہ رہا تھا۔شہروز کو بہت انوکھی سی خوشی ہوئی ساری گفتگو میں پہلی بار اسے اپنا انرجی لیول بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔

"بہت شکریہ اتنے کھلے دل سے تعریف کرنے کا۔۔۔کیا کرتے ہیں آپ۔۔۔پاکستان کس مقصد سے تشریف لے جا رہے ہیں" وہ پوچھ رہا تھا۔

"میں بہت سے کام کرتا ہوں۔لیکن بنیادی طور پر میں ایک فوٹو گرافر ہوں میں کیمرے کی آنکھ سے دنیا کا وہ چہرہ سامنے لاتا ہوں جو دنیا نے خود بھی نہیں دیکھا ہوتا۔مجھے اس میں مزا آتا ہے۔۔۔مجھے دنیا کو تسخیر کرنے کا گھومنے پھرنے کا جنون ہے۔۔۔میں لوگوں کو پڑھنے کا شوقین ہوں۔ میری تصویریں مختلف بین الاقوامی اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔میری ڈاکومینٹریز بھی مختلف چینلز پر چلتی رہتی ہیں۔۔میں شارٹ فلمز بھی بناتا ہوں" اس شخص کے انداز میں ذرا بھی غرور اور تعصب نہیں تھا بلکہ وہ اپنی ظاہری شخصیت کے برعکس بہت سادہ انداز گفتگو کا حامل انسان تھا۔

"میں گزشتہ تین سالوں میں پانچویں مرتبہ پاکستان جا رہا ہوں اور میں صرف آپ لوگوں کی ذہانت سے متاثر نہیں ہوں۔۔۔میں اور بھی بہت سی خصوصیات دیکھتا ہوں آپ لوگوں میں۔۔۔اتنے خوش مزاج ،ایثار پسند لوگ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔آپ لوگ قدرتی طور پر ملنسار اور فطرتاً مہربان قوم ہیں۔میں اپنی ڈاکومینٹریز کے سلسلے میں دور دراز کے گاؤں تک کا سفر کرتا ہوں۔عام لوگوں سے میل ملاقات رہتی ہے۔قومیت اور نسل پرستی سے ہٹ کر میں بھانت بھانت کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔پاکستان میں سادہ اور غریب لوگوں کے دل اتنے بڑے اور مہربان دیکھے ہیں میں نے کہ حیران ہوتا ہوں۔میں نے دیکھا ہے لوگ خود روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور ہم جیسے مہمانوں کے لئے خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔میری خاطر سخت سردی میں بھی لوگوں نے باہر کھلے آسمان تلے راتیں گزاری ہیں اور مجھے اپنے گرم بستر دیے ہیں ایسا ظرف ایسا حوصلہ دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں دیکھا میں نے۔۔" وہ بہت کھلے دل سے تعریف کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔شہروز کا حال اس ماں جیسا تھا جو اپنی اولاد کی خامیوں اور غلطیوں

سے بخوبی واقف ہوتی ہے لیکن کسی دوسرے سے اولاد کی تعریف سن کر پھولے نہیں سماتی۔

"کس کس علاقے میں گھومے ہیں آپ؟" اس نے سوال کیا تھا۔

"میں بڑے شہروں یعنی کراچی لاہور اسلام آباد وغیرہ سے زیادہ وزیرستان سوات آتا جاتا رہا ہوں۔ان شہروں کے ساتھ جتنے چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں سب جگہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔یہاں کے باسیوں سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ان کے مسائل سننے میں ان کی ثقافت کو جانچنے پرکھنے کا موقع ملا ہے۔آپ اس قدر حیران نا ہوں میں نے بتایا نا میں ڈاکومینٹریز بناتا ہوں تو میں مسلمانوں اور ان کی موجودہ حالت پر ایک ڈاکومینٹری بنا رہا ہوں جس میں میں یہ ثابت کروں گا کہ ہم دہشت گرد نہیں ہیں بلکہ ہم دنیا کی سب امن پسند قوموں سے زیادہ امن پسند ہیں اور چند گروپوں کے غلط فیصلے یا غلط حرکت کسی قوم پر دہشت گرد کا لیبل لگانے کے لئے کافی نہیں ہوتے۔میں اسی پر کام کر رہا ہوں آج کل۔۔۔میں اسلام کا صحیح اور مثبت چہرہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں" عوف بن سلمان نے اپنے ماتھے کو پہلی انگلی سے ذرا سا کھجاتے ہوئے بتایا تھا۔

"یہ تو بہت اچھا کام کر رہے ہیں آپ۔۔۔آپ مجھے مزید تفصیل بتا سکیں تو میں اپنے چینل پر آپ کو مدعو کروں گا۔۔۔ایک پورا پروگرام کریں گے آپ پر" اس نے پر جوش انداز میں کہا تھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔مجھے تو خود ایسے ذہین پڑھے لکھے قابل والنٹیئرز چاہئیں جو میرے ساتھ کام کر سکیں۔۔۔میری معاونت کر سکیں جو اس نیک کام میں میری مدد کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں" عوف بن سلمان نے کہا تھا۔وہ دونوں ایسے بات کر رہے تھے جیسے جہاز میں نہیں گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوں۔جہاز کی لائٹس ابھی آف نہیں کی گئی تھیں۔فضائی میزبانوں کی چہل پہل سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھانا پیش کیا جانے والا ہے۔

"آپ فکر مت کریں سر۔۔۔سب سے پہلے تو میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔مجھے آپ کے ساتھ کام کر کے بہت خوشی ہوگی" اس نے جھٹ پٹ فیصلہ کر لیا تھا۔

"اتنی جلدی مت کریں۔۔۔آپ سوچ لیں۔۔۔یہ بہت مشکل کام ہے۔۔۔مشکل اور صبر آزما۔۔۔آپ سوچ لیں پھر مجھے بتا دیجئے گا۔میں آپکو اصول وضوابط سے متعلق ایک تفصیلی ای میل بھیج دونگا پھر باقاعدہ آپ کو ہائر کروں گا اور بہت اچھی رقم معاوضہ کے طور پر ادا کروں گا۔کسی کی محنت کا معاوضہ میں کبھی نہیں رکھتا۔۔۔میں اسے حق تلفی نہیں گناہ سمجھتا ہوں" عوف بن سلمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔شہروز مصلحتاً چپ رہا لیکن وہ اس نیک کام کو کرنے کے لئے مکمل طور پر رضامند تھا۔

☆ ☆ ☆

"عوف بن سلمان" اس نے گوگل کرنے کے لئے اپنا لیپ ٹاپ گود میں رکھا تھا۔یہ اسی روز رات کی بات تھی۔عوف بن سلمان نے اسے باقاعدہ ای میل کے ذریعے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن اسے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرے گا کیونکہ ان کی جاب کی پہلی شرط تھی کہ معلومات صیغہ راز رکھی جائیں گی۔دہشت گردی کا موضوع ہی اپنے ساتھ رہنے والوں کو اپنا دشمن بنانے کے لئے کافی تھا سو

اسے جو قواعد و ضوابط کی لسٹ فراہم کی گئی تھی اس میں سے ایک شق یہ بھی تھی کہ وہ ان کے گروپ کو باقاعدہ جوائن کرنے کے بعد ان کے مفادات کی خاطر ان سے یا ان کے موضوع سے متعلق خبریں اجازت کے بغیر بریک نہیں کرے گا اور یہ اس لئے کیا گیا تھا تاکہ کاپی رائٹ ایکٹ کی بھی خلاف ورزی نا ہو۔ شہروز کو اس شق پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بین الاقوامی گروپ کے ساتھ کام کرنے کے لئے مکمل طور تیار تھا اسے لگن تھی وہ مشہور ہونا چاہتا تھا اور اس سے اچھا موقع اسے کہاں مل سکتا تھا کہ وہ اپنے ملک سے نکل کر دوسرے لوگوں کے ساتھ کام کرتا۔ گوگل پر اسے عوف بن سلمان کے متعلق کچھ خاص معلومات نہیں ملی تھیں۔ زیادہ تر وہی باتیں تھیں جو اسے اس شخص نے اپنے منہ سے بتادی تھیں۔ اس نے اپنے کریڈٹ پر جو باتیں بتائیں تھیں وہ اتنی خاص نہیں تھیں لیکن گوگل سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ ایک کامیاب فوٹو گرافر تھا۔ اس نے بہت سی شارٹ فلمز بھی بنائیں تھیں۔ اسے کئی غیر ملکی ایوارڈز بھی ملے تھے۔ شہروز یہ سب دیکھ کر ہی خوش ہو گیا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک زبردست موقع تھا وہ بے حد خوش تھا وہ کامیابی کی نئی منزلیں طے کر رہا تھا۔ زندگی اس کے لئے خوش قسمتی کے نئے دروازے کھول رہی تھی۔ ان دروازوں کی دوسری جانب اسے روشنی نظر آرہی تھی لیکن وہ آگ جو اس روشنی کو پیدا کرنے کے لئے لگائی جارہی تھی وہ اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ کامیابی آنکھیں چندھیا دیتی ہے اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے آگ نظر نہیں آیا کرتی یا پھر آسانی سے نظر نہیں آیا کرتی۔



"یہ ہماری زندگیوں کا ناسور بن گیا تھا عمر۔۔۔ جس طرح لوگ اپنی بیماریوں کو چھپا کر رکھتے ہیں اس طرح ہم نے اپنے بھائی کے وجود کو حتیٰ کے اس کے احساس کو بھی چھپا کر رکھنا شروع کردیا۔ ہم ایک دوسرے سے بھی اس کے متعلق بات نہیں کرتے تھے۔" امائمہ نے اسے سب بتا دینے کے بعد کہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھلکتی جاتی تھیں اور وہ ان کو صاف کرنے کے ساتھ ساتھ سب باتیں بتاتی چلی جاتی تھی۔ عمر نے درمیان میں اسے ٹوکا نہیں تھا لیکن اس کی یہ بات سن لینے کے بعد وہ چپ نہیں رہا تھا۔

"تم سب لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی کی۔۔۔ کیوں چھپا کر رکھا اس کو لوگوں سے۔۔۔ وہ تمہارے ماں باپ کی اولاد تھا۔ کوئی گناہ نہیں تھا ۔۔۔ کوئی خفیہ راز نہیں تھا۔۔۔ ایک جیتا جاگتا مکمل پورا انسان۔۔۔ قیمتی انسان امائمہ۔۔۔ تمہارے امی ابو کو تمہارے ماموں سے بات کرنی چاہیئے تھی" اسے امائمہ کی باتیں کسی مووی کی کہانی کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس نے اسے کہا نہیں تھا لیکن اگر وہ پہلے سے واقف نا ہوتا کہ امائمہ کا کوئی بھائی بھی ہے تو وہ اسکی یہ سب باتیں سن لینے کے بعد اسے من گھڑت قرار دے دیتا۔

"ماموں نے ہمیں اس کے بارے میں جو بھی باتیں بتائیں۔۔۔ وہ بہت افسوسناک تھیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے اسکی اور گڑیا کی باقاعدہ شادی کی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ نور محمد کا وزہ ایکسپائر ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی بیٹی سے اسکی پیپر میرج کی تھی تاکہ اس کے کاغذات بننے میں کوئی رکاوٹ نا ہو۔ ہم ان کی باتوں پر بھروسہ کرنے کے لئے مجبور تھے عمر۔۔۔ وہ بات ہی ایسے کرتے تھے۔۔۔ انہوں نے کہا کہ نور محمد گڑیا کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہے اور وہ اسے روک نہیں سکتے کیونکہ اس کی بات سے انکار کرو تو وہ جذباتی ہو جاتا ہے اور اسکی ذہنی حالت ایسی نہیں کہ اسے جذباتی طور پر کوئی دھچکا دیا جائے۔ وہ ہمیشہ اس کے بارے میں اتنی محبت سے بات کرتے کہ امی ان کے احسان تلے دب

جاتیں۔۔۔پھر انہوں نے بتایا کہ اس کی ایک بیٹی ہو گئی ہے اور وہ بہت خوش ہے، مطمئن ہے۔امی اس کی جانب سے پر سکون ہو گئی تھیں۔یہ سال دو ہزار کی بات تھی۔اسی سال میری ممانی کی ایک نزدیکی رشتہ دار پاکستان آئیں۔ایک شادی کے موقع پر امی کی ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بہت سی ایسی باتیں بتائیں جن سے ہمیں حقیقت کو سمجھنے کا موقع ملا اور یہ احساس ہوا کہ وہاں نور محمد کسی مشکل میں ہے۔جب امی نے ماموں سے اس بارے میں بات کی تو وہ ناراض ہو گئے اس دن کے بعد سے انہوں نے نور محمد کی شکایات کرنی شروع کر دیں کہ وہ کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔کوئی جاب نہیں کرتا۔ماموں اسے گھر بٹھا کر کھلانے پر مجبور ہیں۔پھر انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ گویا کو ٹارچر کرتا ہے۔وہ انکی بات نہیں مانتا۔اپنی ادویات وقت پر نہیں لیتا۔وہ ذہنی طور پر پھر بیمار ہو رہا ہے۔انہوں نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ ہمیں ان کی بات ماننی ہی پڑتی تھی۔ان کے شکوے سن سن کر امی نے انہیں کہنا شروع کر دیا کہ وہ اسے واپس بھیج دیں لیکن اسے واپس بھیجنے کی بجائے ماموں آج کل پر بات ٹالنے لگے اور پھر ایک دن انہوں نے بتایا کہ وہ ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے اور لوٹن میں رہ رہا ہے۔انہوں نے ہم سے تعلقات مکمل منقطع کر دیے" امائمہ چپ ہوئی تھی لیکن اس کے حلق سے سانس سسکیوں کی طرح نکلتی تھی۔

"وہ دن گیا آج کا دن عمر ہمیں کچھ خبر نہیں۔۔۔کوئی اطلاع نہیں۔ابو نے چاہتے ہوئے بھی کبھی اس معاملے میں کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی جبکہ میری ماں اس دن سے کونوں پر بیٹھتی ہے وہ اکیلی عورت کیا کرتیں۔اس دن کے بعد سے ہمارے گھر میں کبھی کوئی سکون سے نہیں رہا۔میری امی کی زندگی ایبنارمل ہو کر رہ گئی۔ان کی ساری امیدیں مجھ سے وابستہ ہیں۔میں بس اپنی امی کو ان کے دل کا سکون لوٹانے کے لئے یہاں وہاں خوار ہو رہی ہوں۔۔میں کچھ غلط نہیں کر رہی عمر۔۔۔تم کچھ اور مت سوچو۔۔۔صرف ایک بہن اور ایک ماں کی تکلیف کا احساس کرو۔۔۔" امائمہ نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

"میں کچھ غلط نہیں سوچ رہا امائمہ۔۔۔میں کنفیوژ ہو گیا تھا اور وہ اس لئے کہ تم نے مجھے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔تم مجھ سے شیئر تو کرتی" عمر نے اس کے سر کو سہلایا تھا۔

"میں ڈر گئی تھی عمر کہ تم ناراض ہو جاؤ گے۔۔۔میں تمہیں کبھی ناراض نہیں کرنا چاہتی عمر" وہ روتے ہوئے بولی تھی لیکن اس کے اندر سکون اتر آیا تھا۔یہ احساس ہی بہت طاقتور تھا کہ عمر اس کے ساتھ ہے اس سے خفا نہیں ہے۔

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا امائمہ۔۔۔تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا یار اور ایسی بات پر تو ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس میں تم بالکل حق بجانب ہو۔۔۔" وہ مسلسل اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا پھر اس نے اسکا چہرہ اوپر کیا تھا۔

"امی لیکن اب پلیز تم لوٹن مت جانا۔۔۔اکیلے تو بالکل نہیں۔۔۔لوٹن جائے بغیر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا وہاں جانا خطرناک ہے۔۔۔یہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔۔۔فیس بک کا زمانہ ہے۔۔۔فکر مت کرو۔۔۔آؤ پہلے کھانا کھا لیں پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کیا کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے اسے تسلی دی تھی اور ساتھ ہی کچھ سوچتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔ مجھے اس بار بیٹا مل جائے گا؟" اس کے کانوں میں کسی کی دھیمی سی پر سکون آواز زوردار چھناکے کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ وہ بہت مشکل سے بستر پر سونے کے لئے آئی تھی کہ پھر اس عورت کی آواز نے اسے بے سکون کر دیا تھا۔ اس واقعے کو آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس عورت کی تدفین ہو چکی تھی۔ اس کے شوہر نے اللہ کی رضا قرار دے کر اس واقعے کو زیادہ ہوا نہیں دی تھی۔ میڈیا تک بھی خبر پہنچنے سے پہلے دبادی گئی تھی۔ زارا کے پاپا نے رقم تو خرچ کر لی تھی اور معاملہ دبا دیا تھا لیکن زارا کے لئے ابھی تک گزشتہ آٹھ دن اس کی زندگی کے بھیانک ترین لمحات تھے۔ وہ ایک بہت بڑے جذباتی نفسیاتی دھچکے کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اس واقعے کے اثرات سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔ ایسے واقعات اس نے رونما ہوتے دیکھے تھے، سنے تھے۔ بے شمار عورتیں ڈیلیوری کے دوران لقمہ اجل کا شکار ہوتی تھیں۔ وہ اور اس کے کولیگز اس پر چند لمحے بات کرتے تھے، افسوس کا اظہار کرتے تھے اور پھر اپنی راہ ہو لیتے تھے۔ یہ ان کی روزمرہ زندگی کا لائحہ عمل تھا۔ جہاں انہیں زندگی کو خوش آمدید کہنا ہوتا تھا وہاں وہ موت کو بھی خوش آمدید کہنے پر مجبور تھے۔ یہی قسمت تھی جو اپنے داؤ اپنی مرضی سے چلتی ہے۔ جو اپنے پتے اپنے وقت پر پھینکتی ہے۔ یہی انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور وارڈز میں دیکھا تھا اور اپنے ہاتھوں سے برتا تھا۔

"یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اس عورت کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ اس کا اتنا ہی وقت تھا۔ تم اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ تم مسیحا ہو۔۔۔ مسیحا کا کام مسیحائی ہوتا ہے۔ وہ کوئی عامل بابا نہیں ہوتا کہ کوئی تعویذ دے کر کوئی عمل بتا کر قسمت کو پچھاڑنے کے طریقے بتا سکے" ممی نے گھر پہنچ کر اس کو پر سکون ہونے کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ زارا کا دل جانتا تھا اگر وہ لاپروائی نا کرتی تو شاید ایسا نا ہوتا۔ اسے یقین تھا قسمت عمل سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ احساس کہ اس کی غلطی نے ایک عورت کی جان لے لی ہے اسے بے چین کرتی رہتی تھی۔ وہ نیند کی گولی کھا کر بھی سونے کی کوشش کرتی تھی لیکن پر سکون نیند اسے آکر نہیں دیتی تھی۔ شہروز واپس آ گیا تھا لیکن وہ کراچی میں تھا اور لاہور آنے کے لئے چھٹیوں کا منتظر تھا۔ وہ زارا کو کال کرتا رہتا تھا اور ان کے درمیان گزشتہ بار کی طرح بات نہیں ہوئی تھی بلکہ شہروز کا مزاج بے حد اچھا ہوتا تھا وہ اس کے لئے دبئی سے کچھ تحائف بھی لایا تھا جو اس نے اسے کوریئر کر دیے تھے۔ وہ اس سے بہت محبت سے بات کرتا تھا۔ وہ شہروز جو اس کے چہرے کی مسکراہٹ کی وجہ تھا، وہ اور اس کا رویہ بھی زارا کی مسکراہٹ واپس نہیں لا پایا تھا۔ زارا گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی جاب پر جا رہی تھی تا ہی اپنی ممی کے پرائیویٹ ہاسپٹل میں روٹین کے مطابق ڈیوٹی دے رہی تھی۔ ممی کے اصرار کے باوجود وہ جا رہی تھی نا جانا چاہتی تھی۔ اس نے وارڈ میں اس عورت کی بچیوں کو دیکھا تھا۔ ان کے معصوم چہرے اور ان پر پھیلا انتظار، اس عورت کی مسکراہٹ جو بیٹے کی پہلی جھلک دیکھ کر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی، زارا کو کچھ نہیں بھولتا تھا۔ وہ کمرے سے ہی باہر نکلتی تھی تو گھر سے باہر جانا تو بہت دور کی بات تھی۔ چند دن میں اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ دبلی پتلی تو پہلے ہی تھی۔ ایک ہفتے میں اب بالکل ہی سوکھی چمرخ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو کس نے بتایا یہ سب۔۔۔" زارا نے اپنے سامنے بیٹھے ٹیپو سے تیسری مرتبہ پوچھا تھا۔ وہ اس کے گھر اچانک ہی چلا آیا تھا۔

"اب یہ کوئی اتنی بھی حیران کن بات نہیں ہے کہ تم سوال پر سوال کرتی چلی جاؤ۔۔۔ میں بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہی رہتا ہوں۔۔۔ مریخ سے تو نہیں آیا" اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تھی۔

"یہ تو نہیں کہہ رہی میں لیکن مجھے حیرانی ہے کہ آپ کے کتنے جاسوس یہاں وہاں بکھرے ہیں اور پھر میرے گھر کا ایڈریس کس سے لیا" زارا نے اتنے دنوں میں اتنے لفظوں پر مشتمل یہ پہلا جملہ بولا تھا۔ اس کا دل پھر اچاٹ ہونے لگا تھا حالانکہ ٹیپو کو دیکھ کر وہ خوش ہوئی تھی لیکن اس کو سارا واقعہ من وعن پتا تھا تو اس بات کا مطلب تھا کہ "بات" ہاسپٹل کی دیواروں سے باہر نکل چکی تھی۔

"ایڈریس حاصل کرنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔۔۔ یہ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ میں نے گوگل کر لیا تھا کہ لاہور کا وہ کون سا گھر ہے اور کہاں واقع ہے جہاں ہر وقت بنا بادل بارش ہوتی رہتی ہے۔۔۔ ایک لمحے میں ڈاکٹر زارا تنویر کے گھر کی لوکیشن پتا چل گئی" وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ زارا جھینپ سی گئی۔ اس کا اشارہ اس کے رونے کی طرف تھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔۔۔ مذاق مت بنائیں میرا" وہ برا منائے بغیر بولی تھی۔ وہ کبھی کبھی اسے بالکل عمر لگنے لگتا تھا۔ وہ اسے عمر کی طرح ہی چڑایا کرتا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ ٹیپو کی باتیں اسے کم بری لگتی تھیں۔

"بخدا یہ گستاخی میں نے نہیں کی۔۔۔ یہ گوگل کی حرکت ہے لیکن میں حیران ہو گیا ہوں ٹیکنالوجی کی پھرتیوں پر۔۔۔ گوگل کو بھی تمہاری عادتوں کی خبر ہے۔ ایک بات میں ضرور کہنا چاہوں گا۔ گوگل زیادہ بھروسے والی چیز نہیں ہے۔ یہ گھر گھر پھرنے والی پھاپھے کٹنی ہے۔ یہ نا ہو "راز" کی بات سب کو پتا چل جائے اس لئے بہتر ہے کہ اپنی بن بادل برسات والی اس عادت کو بدل لو" وہ سابقہ انداز میں اسے نصیحت کر رہا تھا۔ اس کا انداز نشست بتاتا تھا کہ اسے بہت فرصت ہے۔ زارا نے اس کا حلیہ بغور دیکھا۔ روٹین کی نسبت رف سا انداز نہیں تھا بلکہ نک سک سے تیار تھا اچھی طرح سے آئرن کی گئی شرٹ کے ساتھ پینٹ پہنے، ٹائی لگائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے آج تو وہ کسی کارپوریٹ کلچر کی صحیح عکاسی کرتا نمائندہ لگ رہا تھا۔ زارا نے اس کی بے تکی بات کو آرام سے ہضم کر لیا تھا۔ اسے اب اس کی عادت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اسے اتنے دن کی بے کل طبیعت سے جان چھڑانے کے لئے ایسے ہی کسی شناسا کی ضرورت تھی۔

"آج اگر اتفاق سے اچھے کپڑے پہن لئے ہیں آپ نے تو باتیں بھی اچھی کر لیں" زارا نے اس کے انداز میں اسے جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

"ڈاکٹر اگر میری تعریف ہی کرنی ہے تو صاف صاف کر دو نا۔ گھما پھرا کر تو شریکے بات کرتے ہیں۔۔۔ میں اچھا لگ رہا ہوں نا" وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ سروسز ہاسپٹل میں اس کا بہت آنا جانا تھا۔ اسے سوشل ورک کا خبط تھا۔ وہ مریضوں کو لے کر مختلف سرکاری ہاسپٹلز میں جاتا رہتا تھا۔ اسے کچھ ضروری سرکاری کام بھی تھے سو حلیہ اس لئے بھی مناسب تھا۔ وہ سب نبٹا کر سروسز چکر لگا تو زارا سے ملاقات کا سوچ کر گائنی ڈیپارٹمنٹ چلا گیا۔ زارا اسے سیمپل میں آئی ہوئی ادویات میں سے کچھ نا کچھ دیتی رہتی تھی۔۔۔ وہیں سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ ہفتے سے ڈیوٹی پر نہیں آ رہی اور پھر سارا قصہ جاننا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زارا جس قسم کی لڑکی ہے وہ جذباتی طور پر مشکل میں ہو گی۔ وہ اسی لئے اس سے ملنے آ گیا تھا لیکن وہ اس سے کچھ پوچھے بنا عادت کے مطابق اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا تاکہ اس کا جی بہلا سکے اور زارا کو اس کی یہی عادت پسند تھی۔ وہ کریدتا نہیں تھا کھوجتا نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے کچھ ایسا ہنر دیا تھا کہ لوگ اس کے سامنے اپنا دل ہلکا کرنے میں سکون محسوس کرتے تھے۔ زارا نے گاؤں کے لوگوں کو اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی باتیں شیئر کرتے دیکھا تھا۔

"اب پڑھ لو چپ کا وظیفہ۔۔۔میری باری آئے تو صم بکم بن جایا کرو۔۔۔شہروز صاحب کی بات ہوتی تو ابھی ہمیں پورا اخبار سننے کو مل جاتا"

وہ اسے چڑا رہا تھا۔زارا کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول رہا ہے اور اسے اچھا لگا وہ جانتی تھی وہ اسے بہلا رہا ہے۔گفتگو کو جان بوجھ کر شہروز کی جانب موڑ رہا ہے تا کہ وہ خوش ہو سکے اور وہ خوش ہوئی۔اس کے ارد گرد رہنے والوں میں کوئی اتنا ہمدرد تھا کہ اپنے فائدے نقصان کو سوچے بغیر اس کے ساتھ بیٹھ کر وقت ضائع کرنے میں عار نہیں سمجھتا تھا۔

"میں نے تو کسی کی تعریف نہیں کی" وہ مسکرائی تھی۔

"کرنا بھی مت۔۔۔میں جانتا ہوں۔۔۔ڈاکٹرز کی حس جمال قدرتی طور پر کم ہوتی ہے۔۔۔انہیں اچھی چیزیں قریب سے بھی نظر نہیں آتیں" وہ مذاق اڑا رہا تھا۔زارا نے اب کی بار مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ آپ بہت زیادہ بولتے ہیں۔۔۔کسی چینل وغیرہ پر خبریں پڑھنے کی جاب کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔پیسے بھی ملیں گے شہرت بھی۔" وہ مشورہ دے رہی تھی۔ٹیپو نے قہقہہ لگایا۔

"غرض کیا ہے۔۔۔کسی کی بات چلے میں تمہاری بات کروں۔۔۔لے آئی ہو نا پھر بہانے سے "ان" کا ذکر" ۔وہ "ان" پر زور دے کر بولا تھا

"کن کا ذکر۔۔۔میں نے تو شہروز کا نام بھی نہیں لیا"

"ہاں تو میں نے بھی کب شہروز کا نام لیا ہے۔۔۔میں تو شعر سنانے کی کوشش کر رہا تھا" وہ اطمینان سے بولا تھا پھر سامنے کی جانب دیکھ کر بولا۔

"تم لوگوں کے یہاں چائے پانی پوچھنے کا رواج نہیں ہے۔۔۔مہمانوں کو ہوا کھلا کر ٹرخا دیتے ہو"

"میں وہی دیکھ رہی تھی کہ کوئی ملازم نظر آئے تو چائے کا کہہ سکوں۔۔۔آپ بیٹھیں میں کہہ کر آتی ہوں" وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"غضب خدا کا۔۔۔ڈاکٹر تم چائے بھی نہیں بنا سکتی۔۔۔اتنی پھوہڑ لڑکی۔۔۔میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی ہوگی" وہ پھر چڑا رہا تھا۔

"چائے تو بنا لیتی ہوں میں۔۔۔اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔۔۔میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ پھر آپ کو اکیلے بیٹھنا پڑے گا" وہ خجل سی ہوئی

"میں بھی کچن میں ہی آجاتا ہوں نا۔۔۔کباب سموسے فروٹ چاٹ سینڈوچ۔۔۔اب تم اتنا کچھ بناؤ گی تو وقت لگے گا۔۔۔میں اکیلا تو واقعی نہیں بیٹھا رہ سکتا" وہ بھی اٹھا تھا۔زارا نے ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔

"اتنا کچھ کہاں بنانا آتا ہے مجھے۔۔۔بسکٹ منگوا لوں گی۔۔۔فریزر میں دیکھتی ہوں کباب ہوئے تو وہ فرائی کر لوں گی" وہ کچن کی جانب بڑھی تھی۔

"ارے واہ یعنی کباب فرائی کر لیتی ہو۔۔۔ماشاءاللہ کتنی سگھڑ ہو۔۔۔شہروز کی اماں تو خوش قسمت عورت ہیں بھائی۔۔۔کہاں ملے گی ایسی نادرو کمیاب بہو" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا اس کے ساتھ ہی کچن کی جانب چلا آیا تھا۔

"شہروز کی اماں کا تو پتا نہیں مگر میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں۔۔۔بڑی مامی اتنی سگھڑ عورت ہیں کہ ہمارے پورے خاندان میں ان جیسا کوئی نہیں ہوگا۔ہماری فیملی میں کوئی بڑے پیمانے کی دعوت ہو تو ہمارا خانساماں میری ممی کی بجائے ان سے پوچھ کر مینیو تیار کرتا ہے۔ان کے ہاتھ کی بریانی کھانے کے لئے ہم سب ہر وقت تیار رہتے ہیں اور بڑی عید پر باربی کیو کا سارا اہتمام وہ خود کرتی ہیں۔میں تو ان کے جیسا آملیٹ نہیں بنا

سکتی" وہ ساس پین چولہے پر رکھتے ہوئے اس کو بتا رہی تھی۔ ٹیپو نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ کہیں سے کوئی پروفیشنل عورت نہیں لگتی تھی اپنی ساس کو سراہتے ہوئے ان کے سگھڑاپے کی تعریف کرتے ہوئے وہ بالکل عام سی لڑکی لگتی تھی جو اس حسرت میں مبتلا تھی کہ وہ بھی ویسی ہو سکتی۔ ساس پین کو چولہے پر رکھ کر اس نے چائے کی پتی ڈالی تھی پھر وہیں شیلف پر پڑا فون اٹھایا تھا۔ ٹیپو نے اسے چند لمحوں میں پزا کا آرڈر کرتے سنا تھا۔

"بہت نکمی ہو ڈاکٹر تم۔۔۔ پزا آرڈر کروا دیا۔۔۔ یہ نہیں کیا کہ بیسن گھول کر پکوڑے بنا لو۔۔۔ گھر آئے مہمان کو باہر کی چیزیں کھلانا ہمارے گاؤں میں سخت برا سمجھا جاتا ہے۔" وہ جتا رہا تھا۔ زارا نے چولہے کی لو آہستہ کی۔ پزا آنے میں پندرہ منٹ لگ جانے تھے۔ اس نے کیبنٹ کھول کر بسکٹ نمکو وغیرہ نکالے تھے پھر اس کی جانب مڑی۔

"مجھے کہاں آتی ہیں ایسی چیزیں بنانا۔۔۔ میں نے بتایا تو ہے آپ کو کہ میں کوکنگ نہیں کر سکتی"

"اتنی سگھڑ ساس کے ساتھ کیسے رہو گی پھر۔۔۔ روز جھگڑے ہوا کریں گے" اس نے نمکو والی پلیٹ میں سے بھنی مونگ پھلی چن کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ آج کی ملاقات کا کوئی ایجنڈا نہیں تھا۔ وہ دو سہیلیوں کی طرح بے تکی باتیں کر رہے تھے۔

"جھگڑے تو نہیں ہوا کریں گے کیونکہ ممانی بہت اچھی ہیں اور وہ جانتی ہیں کہ میں کیا کام کر سکتی ہوں کیا نہیں۔۔۔ اور پھر میں کوکنگ سیکھ بھی گئی تب بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ہر چیز میں ہر کام میں بہت پرفیکٹ ہیں۔ ہمارے گھر کی طرح ان کا گھر ملازمین کے کندھوں پر نہیں چلتا۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ اتوار بازار سے سبزی لاتی ہیں ہفتے بھر کی۔۔۔ مٹر چھیل کر دانے نکال کر رکھیں گی۔۔۔ کریلے بھنڈی فرائی کر کے گوشت کے پیکٹ بنا کر اتنے سلیقے سے رکھتی ہیں۔ آپ نے سنا ہے کبھی کہ کسی نے لہسن ادرک چھیل کر محفوظ کیا ہو۔۔۔ ممانی یہ بھی کرتی ہیں" وہ اپنی لے میں بول رہی تھی۔ ٹیپو کو احساس ہوا کہ وہ گھریلو ٹائپ سرگرمیوں کو پسند کرتی تھی۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر چمکی۔ یہ سب باتیں ان کے گھروں میں عام تھیں جنہیں وہ اتنے فخر سے سراہ رہی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے میں ممانی جیسی ہوتی۔۔۔ اپنے گھر کا ہر کام اچھے طریقے سے کرنے والی۔۔۔ نوکروں پر بھروسہ نہ کرنے والی۔۔۔ مجھے ایسی عورتیں اچھی لگتی ہیں"

یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔۔۔ سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔ وہ گھر کو مرد کی نسبت زیادہ اچھے طریقے سے مینج کرتی ہیں" ٹیپو متاثر نہیں ہوا تھا۔ وہ مونگ پھلیاں چن چن کر منہ میں رکھ رہا تھا۔

"نہیں، سب عورتیں ایسی نہیں ہوتیں۔۔۔ میری ممی نے آج تک میرے ہوش میں کھانا نہیں بنایا اور نہ کبھی مجھے بنانے دیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے بھی کوکنگ آتی ہو۔ ممی نے کبھی کرنے ہی نہیں دیا یہ سب۔۔۔ ان کو پسند ہی نہیں یہ سب" وہ پھر وہی زارا بن گئی تھی جس کی محرومیاں اس کے چہرے سے ہر وقت ٹپکتی تھیں۔

"کم آن ڈاکٹر۔۔۔ تم وہ کام کیوں نہیں کرتی جو تمہارا دل چاہتا ہے کرنے کو۔۔۔ جب فراغت ہوتی ہو تو کیا کرو کوکنگ۔۔۔ اس میں کیا رکاوٹ ہے" وہ حیران ہوا تھا۔

"ممی کو پسند نہیں ہے۔۔" وہ اتنا ہی بولی تھی کہ ٹیپو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"انہیں ناپسند بھی نہیں ہوگا۔۔وہ تمہیں صرف اسلئے روکتی ہوں گی وہ تمہاری ماں ہیں۔۔۔انہیں تمہاری فکر ہوتی ہوگی کہ تم تھک جاؤ گی" وہ سمجھا رہا تھا۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن ممی سمجھتی ہیں یہ سب گھر بیٹھنے والی عام بی اے ایم اے پاس لڑکیوں کے کام ہیں۔۔میڈیکل پریکٹشنر کا کام کھانا بنانا نہیں ہوتا اس لئے انہوں نے شروع سے مجھے کوکنگ کے معاملے میں ڈی گریڈ کیا ہے۔" وہ ڈور بیل بج جانے کی وجہ سے چپ ہوئی تھی۔اس نے شیلف پر پڑے ایک باکس میں سے پیسے نکالے تھے پھر پزا لے کر اندر آنے والے اپنے گیٹ کیپر کو پیسے دے دیے تھے اور پزا اسے تھما دیا تھا۔

"میں تمہاری ممی کی فلاسفی سے بصد احترام اتفاق نہیں کرتا۔میرا خیال ہے کہ کھانا پکانا ہر لڑکی کو آنا چاہیے اور میں تمہیں ایسی ممی خواتین سے ملوا سکتا ہوں جو ہر فن مولا ہیں۔جاب بھی کرتی ہیں اور گھر بھی سنبھالتی ہیں لیکن ابھی چپ کر جاؤ۔۔۔پزا کھا لینے دو۔۔۔بھوک بھی لگی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے پیسے ضائع ہوں" وہ مزید بے تکلفی سے بولا تھا۔

زارا نے کچن میں چائے نکالی تھی اور وہ ایک بار پھر باہر سٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ٹیپو نے نا صرف خود رغبت سے کھایا تھا بلکہ باتیں کر کر کے اسے بھی کھلا دیا۔جب پزا ختم ہو گیا چائے کے کپ خالی ہو گئے تو اس نے پوچھا تھا۔

"ڈیوٹی پر کیوں نہیں جا رہی ہو تم۔۔۔؟" پھر اسکا جواب سنے بغیر بولا۔

"کتنا حرج ہو رہا ہے تمہاری وجہ سے۔۔۔ایک تو اس ملک میں پہلے ہی ڈاکٹرز کم ہیں اور جو چار چھ ہیں وہ بھی تمہاری طرح چار پائیاں توڑتے رہتے ہیں۔۔۔بس کرو بی بی۔۔۔اس ملک کی بیچاری عوام پر رحم کرو اور کل سے ڈیوٹی پر جانا شروع کرو۔۔۔چھٹیاں کرنے کا اتنا شوق ہے تو اپنے پرائیویٹ ہاسپٹل سے کرنا،میں نہیں روکوں گا" وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور ٹشو پیپر کیس سے ٹشو نکالتے ہوئے جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

"آزمائشوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔۔۔اللہ سے ڈرتے ہیں کہ وہ آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔۔۔اور جب آزمائش آ جائے تو حوصلے کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔۔۔غلطی تسلیم کرنے والا انسان اللہ کی نظر میں بہت بڑا ہو جاتا ہے اللہ کو ایسے لوگ پسند ہیں جو اپنی غلطی سے سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت رکھتے ہوں۔۔۔شاباش کل سے چلی جانا۔۔۔سرکاری ہاسپٹلز میں واقعی ڈاکٹرز کم ہیں اور یہ بات تم مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہو۔۔۔" اس نے اپنی بات مکمل کی تھی اور باہر نکل گیا تھا۔زارا وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔اس نے گہری سانس بھری تھی۔ٹیپو نے غلط نہیں کہا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتی۔اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ لوگوں کی چبھتی نظروں کا سامنا کر سکتی۔وہ وہیں کاؤچ پر لیٹ گئی تھی۔

اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔



(تنزیلہ ریاض کا یہ خوبصورت ناول "عہدِ الست" ابھی جاری ہے،بقیہ واقعات اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

"عوف بن سلمان" شہروز نے گوگل کرنے کے لئے لیپ ٹاپ پر ٹائپ کیا تھا اور پھر اپنے سامنے پڑے کاغذات کو سامنے کیا تھا۔ اسے دو دن پہلے ایک تفصیلی لیٹر اور ای میل مل گئی تھی۔ عوف بن سلمان ابھی کراچی میں ہی تھے اور واپس جانے سے پہلے انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی اور ایک تحریری اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوایا تھا۔ اس کو نا صرف ایک بہت اچھے معاوضے کی پیشکش کی گئی تھی بلکہ دوسرے بھی بہت سے فائدے تھے۔ میڈیکل انشورنس کے علاوہ بچے ہونے کی صورت میں ان کی تعلیم کے اخراجات اس کی آفر لیٹر کا حصہ تھے۔ اسے عوف بن سلمان کی این جی او کی طرف سے ملٹی پل ویزہ آفر کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سعودی عرب کے علاوہ گلف کی باقی ریاستوں میں آزادانہ آجا سکتا تھا۔ سال میں دو بونس کے ساتھ، دو فیملی ٹرپ جس میں وہ اپنی فیملی کے کسی بھی چار افراد کو لے جا سکتا تھا جس کا پورا معاوضہ کمپنی کے ذمہ ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ دنیا بھر میں کسی بھی دوسرے ملک میں جانے کے لئے اپنی کمپنی سے ٹی اے ڈی اے طلب کرنے کا مجاز تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہ کام پارٹ ٹائم جاب تھا یعنی وہ اپنے چینل کا ملازم رہتے ہوئے عوف بن سلمان کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ شہروز کی آنکھیں یہ سب شقیں پڑھتے ہوئے حیرت سے پھٹتی جاتی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جب تنخواہ روپے سے ریالوں کا سفر کرتی ہے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں لیکن اتنے سارے دوسرے حیران کن فرنج بینیفٹس اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے آفر کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس کے لئے ان سب چیزوں سے بھی زیادہ پرکشش چیز وہ سیکھنے کا جذبہ اور شہرت کا نشہ تھا جسے سوچ کر اسے جوائن کرنے سے پہلے ہی مزا آنے لگا تھا۔ وہ دل و جان سے عوف بن سلمان کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی تھا۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ اگر تمام شرائط کے ساتھ متفق ہے تو اسے اپنے شناختی کارڈ کے ساتھ ایک راضی نامہ تیار کروا کر باقاعدہ سعودی کمپنی کے نام بھجوانا تھا تا کہ باقی تمام مراحل طے کئے جا سکتے۔ اس کے سامنے اس کانٹریکٹ کی کاپی موجود تھی جو اسے بھجوائی گئی تھی۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ جاب اسے اتنا منظم طریقے سے آفر کی جائیگی کہ اتنی تحقیق کی ضرورت پڑے گی۔ عوف بن سلمان ابھی پاکستان میں تھے اور ان سے فون پر بات نہیں ہو پائی تھی لیکن انہوں نے ای میل کے ذریعے اسے باقاعدہ میٹنگ کے لئے بلوایا تھا۔ اسی لئے شہروز لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا تا کہ ان کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کر سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جب وہ اپنے بھائیوں اور اپنے ڈیڈی سے اس چیز کا تذکرہ کرے تو وہ عوف بن سلمان کے ویئر اباؤٹس کے متعلق سوال کر کے کسی وہم کا شکار ہوں۔

وہ عوف بن سلمان کے متعلق انٹرنیٹ سے مواد جمع کر رہا تھا اور وہاں جو بھی مل سکتا تھا اس سے شہروز کو یہی اندازہ ہو سکا کہ وہ سعودی عرب کے کامیاب اور مشہور کاروباری شخص تھے۔ ان کے لاتعداد کاروباری مراسم تھے۔ وہ شاہی خاندان کے ذاتی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی اپنی آئل ریفائنریز تھیں۔ وہ اوپیک میں سعودی عرب کی جانب سے نمائندگی بھی کرتے تھے اور بیس کے قریب چھوٹی بڑی سعودی کمپنیوں کے سی ای او اور چیئرمین کے طور پر کام کر رہے تھے لیکن اس سب سے بڑھ کر وہ شوقیہ فوٹو گرافر تھے اور وہ نیشنل جیو گرافک عربیہ کے ساتھ منسلک تھے۔ انہوں نے گزشتہ کچھ سالوں میں بہت اچھی ڈاکیومینٹریز بنائی تھیں جو ایوارڈ یافتہ تھیں۔ ان کے کامیابیوں کی تفصیل بھی نیٹ پر موجود تھی۔ شہروز نے کچھ ڈاکیومینٹریز کے لنک بھی اکٹھے کئے تھے تا کہ فراغت میں ان کے کام اور اس کی نوعیت کا جائزہ لے سکے۔ یہ سب چیزیں سرچ کرتے ہوئے ایک

عجب سا جوش اسکے پورے وجود پر چھایا رہا تھا۔وہ کامیاب تھا اور مزید کامیاب ہونے جا رہا تھا۔وہ خوش قسمت تھا اور مزید خوش قسمتی اس کی منتظر تھی۔اس نے اینکر کے طور پر ایک چینل میں شمولیت اختیار کی تھی۔اس نے نیوز کاسٹر کے طور پر کام کیا تھا۔وہ مانیٹرنگ افسر بھی رہا تھا۔اس نے ایک بڑے نامی گرامی سیاسی پروگرام میں ایک نامی گرامی اینکر پرسن کی معاونت کی تھی۔وہ کچھ عرصہ میں اپنا ایک الگ پروگرام ہوسٹ کرنے والا تھا۔۔۔اور اب بیٹھے بٹھائے اسے ایک بین الاقوامی ادارے کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔اس نے تہیہ کر لیا تھا۔اسے تمام قانونی کاروائی پوری کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں ویک اینڈ پر لاہور آؤں گا" شہروز نے زارا کو بتایا تھا۔وہ بہت فرصت سے آج اسے فون کرنے بیٹھا تھا۔اس لئے سب ضروری کام نپٹا کر فراغت سے وائبر پر بات کر رہا تھا۔اس کو کال کرنے سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی تھی اور اب اس سے بات کر رہا تھا۔بہت دن کے بعد اس کا دل چاہا تھا کہ وہ امی سے اور زارا سے بات کرے۔اس نے عوف بن سلمان کے پراجیکٹ سے متعلقہ تمام کاغذات تیار کروا لئے تھے لیکن ابھی اس نے انہیں واپس نہیں بھجوایا تھا۔کاغذات بھجوا دینے کے بعد اسکی عوف بن سلمان کے ساتھ ایک باقاعدہ میٹنگ طے ہوئی تھی۔"اچھی بات ہے۔۔۔رُکو گے؟" زارا نے عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

"تم روکو گی تو رُک جاؤں گا" اس نے خاص الخاص انداز میں کہا تھا۔وہ بہت مطمئن تھا اور دل چاہتا تھا سب اس کی خوشی میں خوش ہوں۔زارا کا انداز بجھا بجھا سا تھا جو اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں تم اپنی جاب کی طرف دھیان دو۔۔۔یہ تمہارے لئے بہت ضروری ہے" زارا کی آواز میں ابھی بھی کوئی گرمجوشی نہیں جھلکی تھی۔

"طنز کر رہی ہو نا۔۔۔؟" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زارا نے بات کاٹ دی۔

"مشرق سے جو رنگ سنہری لگتا ہے وہی رنگ مغرب میں سرمئی نظر آتا ہے شہروز۔۔۔یہ حقیقت ہے لوگ اسے گرامر کی غلطی سمجھ لیتے ہیں۔میں نے صرف حقیقت بیان کی ہے تم غلط مت سمجھو"

میری غیر موجودگی تمہیں کیا کیا سکھا رہی ہے زارا۔۔۔مجھے حیرت ہوں یہ دنیا کیا سے کیا ہو رہی ہے۔۔۔لوگ جدائی میں عاشق بن جاتے ہیں تم عالم بن رہی ہو۔۔۔عالم بھی وہ کہ جس کی بات پہلی بار میں سمجھ ہی نہیں آتی" وہ خوشگوار سے انداز میں بولا تھا۔زارا کی دھیمی سی ہنسی سنائی دی۔

"تم سب لوگ بھی تو یہی چاہتے تھے نا کہ زارا عقل کی چار باتیں سیکھ لے۔۔۔لو دیکھ لیں زارا نے عقل کی چار باتیں۔۔۔اب مزید کیا حکم ہے بادشاہ سلامت" وہ ساری گفتگو میں پہلی بار خوش مزاجی سے بولی تھی۔

"بادشاہ سلامت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں کنیز کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ویک اینڈ پر اچھا سا تیار ہو کر ہر فکر سے ہر غم سے آزاد ہو کر ہمارے محل میں تشریف لائے اور دوپہر کا طعام ہمارے ساتھ تناول فرمائے" وہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔زارا پھر ہنسی۔

"بادشاہ سلامت کنیز کی اردو ذرا کمزور ہے۔۔۔آسان زبان میں حکم دیا جائے" شہروز کو اچھا لگا کہ وہ اب پرسکون ہو کر بات کر رہی تھی۔

"بادشاہ سلامت آپ کو حکم نہیں "حکم کا اکا" دیں گے۔۔۔اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آپ کو اس بات کی بھی سمجھ نہیں آئی ہوگی"

"اس میں کنیز کی کیا خطا ہے بادشاہ سلامت۔۔۔آپ کو کنیز کی کم فہمی کا بخوبی علم ہے۔آپ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکم دیجئے" شہروز نے پہلے قہقہہ لگایا پھر اس نے اپنی پشت پر پڑا سرہانہ اٹھا کر دائیں جانب رکھ کر اس پر کہنی ٹکالی تھی۔وہ اب پیٹ کے بل لیٹ گیا تھا۔

"حکم نہیں درخواست ہے ملکہ عالیہ کہ ویک اینڈ پر ہمارے گھر تشریف لائیے گا"

"کیوں بھئی۔۔کس خوشی میں دعوت دی جا رہی ہے" وہ طمانیت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"آنکھیں تھک گئی ہیں۔۔ان کو آرام کی ضرورت ہے۔۔۔یہ سکون چاہتی ہیں۔۔۔یہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں زارا۔" اس نے اتنا کہا پھر لمحہ بھر کا توقف کر کے لہجے کی ٹون یکسر تبدیل کرتے ہوئے بولا۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔میں یہ سب نہیں کہنے والا تم سے۔۔۔"

"اونہہ۔۔" زارا نے اس کی بات کاٹ کر مصنوعی ناراضی سے ہنکارا بھرا پھر ناک چڑھا کر بولی۔

"مجھ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔۔کام کی بات کرو۔۔کس خوشی میں لنچ کی دعوت دے رہے ہو؟"

"دو مہینے بعد گھر آؤں گا۔۔۔دل چاہتا ہے وہ چہرہ سب سے پہلے نظر آئے جو دل کو بے حد مرغوب ہے۔۔۔اب بولو کوئی اعتراض" وہ کہہ رہا تھا۔

"اعتراض تو نہیں ہے لیکن سوچ رہی ہوں کہ کوئی اچھی بات ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔۔۔جو تم مجھے بتا نہیں رہے۔۔۔کالی کالی دال کی خوشبو آ رہی ہے" وہ عام سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"زارا میں بہت خوش ہوں۔۔مجھے ایک انٹرنیشنل ادارے کی جانب سے بہت اچھی آفر آئی ہے۔۔۔حیران کن آفر زارا۔۔۔میں وہ سب کچھ حاصل کرنے والا ہوں جس کا میں خواہشمند رہا ہوں۔میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے سارے خواب سارے عزائم اتنی جلدی پورے ہونے لگیں گے۔میری محنت رنگ لا رہی ہے۔میں منزل کی جانب جا نہیں رہا ہوں،پرواز کر رہا ہوں۔ہر قدم مجھے میری منزل کی جانب دھکیل رہا ہے۔۔۔ثابت ہوا زارا اللہ پاک محنت کو ضائع نہیں ہونے دیتے" اس کی خوشی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔زارا کی آواز لمحہ بھر کے لئے سنائی ہی نہیں دی۔

"کیا ہوا خاموش کیوں ہو گئی ہو" وہ پوچھ رہا تھا

"میں تمہاری خوشی میں بہت خوش ہوں شہروز۔۔۔" اس نے لمحہ بھر کا توقف کر کے اتنا کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ایسے خوش ہوتے ہیں کیا۔۔خوش ہو تو مجھے محسوس ہونا چاہیئے یار۔۔۔کیا میں تم لوگوں کو جانتا نہیں ہوں۔۔۔ممی نے بھی میری بات سن کر اسی طرح اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے۔۔۔بجھی ہوئی خوشی۔۔۔مجھے بیوقوف سمجھتے ہو آپ لوگ" شہروز برہم نہیں ہوا تھا لیکن اسے اچھا بھی نہیں لگا تھا۔

"شہروز تم اپنی منزل کی جانب جا رہے ہو۔۔تم آگے بڑھ رہے ہو۔۔۔بہت آگے۔۔۔ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔۔۔ہمیں پیچھے مت چھوڑو شہروز" وہ یقیناً روہانسی ہوئی تھی۔شہروز کو مزید برا لگا۔

"تم لوگ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہو۔۔۔تم لوگوں کو لگتا ہے کہ شہرت مجھے نگل جائیگی۔۔۔کیا میں اتنا کم ظرف ہوں کہ اپنے پیاروں کو بھول جاؤں گا" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے شہروز۔۔۔مجھے خود نہیں پتا کہ میں اتنی بے سکون کیوں ہوں۔۔۔کوشش کے باوجود دل مطمئن نہیں ہوتا۔۔۔شاید میں تمہیں بہت مس کرتی ہوں"

"وہ تو میں بھی تمہیں کرتا ہوں زارا۔۔۔تم سب لوگوں کو کرتا ہوں" وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلا رہا تھا۔اسے شرمندگی تھی کہ وہ زارا کی جذباتی کیفیت جانتے ہوئے بھی اسے زیادہ فون نہیں کر پاتا تھا۔

"تم ناراض مت ہو شہروز۔۔میں تمہیں اپنے دل کا حال بتا رہی ہوں۔۔۔میں بعض اوقات بہت ڈر جاتی ہوں مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔۔لیکن شہروز میں کم عقل نہیں ہوں۔۔۔سچی۔۔۔لیکن میں کیا کروں۔۔۔محبت کے فارمولے میں عقل صفر کا کام کرتی ہے۔۔۔یعنی کوئی کام نہیں کرتی۔۔۔اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔۔۔یہ ناکارہ ہو جاتی ہے۔۔۔میں بالکل ناکارہ ہو چکی ہوں۔مجھ سے کوئی کام نہیں ٹھیک ہوتا۔میری وجہ سے ایک عورت کی جان چلی گئی شہروز۔۔۔میں اتنے دن سے ہاسپٹل نہیں جا سکی۔۔۔میرا دل بھی نہیں چاہتا جانے کو اب۔۔۔مجھے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔۔۔میں نے سوچا ہے میں یہ سب چھوڑ دوں گی" اس کے لہجے میں اتنی بیچارگی تھی کہ شہروز چپ کا چپ رہ گیا۔وہ ذہنی طور بہت تھکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔شہروز کو اپنے رویے پر افسوس ہوا۔وہ اسے بہت چاہتی تھی یہ بات اس نے کبھی چھپائی نہیں تھی اور یہ شہروز کی زندگی کا سب سے طاقتور احساس بھی تھا لیکن وہ اتنی بے یقین رہتی تھی تو شہروز کو برا لگتا تھا۔گزشتہ کچھ مہینوں میں ان کے درمیان نا چاہتے ہوئے بھی کچھ فاصلے پیدا ہوئے تھے لیکن شہروز خود کو قصوروار سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"زارا پلیز اس فیز سے نکلنے کی کوشش کرو۔۔۔بہادری سے اپنی غلطی تسلیم کرو اور دوبارہ سے ڈیوٹی پہ جانا شروع کرو۔۔۔" شہروز نے اتنا ہی کہا تھا کہ زارا نے اسکی بات کاٹ دی۔

"جاب کی بات مت کرو۔۔۔اسے چھوڑو۔۔۔میری کیا غلطی ہے۔۔۔میں تو محبت کے ہاتھوں خوار ہو رہی ہوں" وہ بے حد اکتا کر بولی تھی۔شہروز کو بہت برا لگا۔

"تم اس بات کے لئے بھی مجھے ذمہ دار سمجھتی ہو زارا۔۔۔کم آن یار اب اتنی زیادتی بھی مت کرو یہ میری وجہ سے نہیں ہوا اس کی وجہ تمہاری اپنی غیر ذمہ داری ہے۔۔تم اپنی لاابالی فطرت کو بدلو۔ایک ڈاکٹر کے لئے غیر ذمہ داری اچھی چیز نہیں ہوتی۔۔۔پھپھو نے تم میں ذمہ داری پیدا ہی نہیں ہونے دی۔اس میں بھی میرا قصور ہے کیا۔۔۔عجیب بات کرتی ہو تم۔۔۔اب کیا سولہ سال کی چھوٹی سی لڑکی ہو تم کہ یہ باتیں بھی ارد گرد کے لوگ سمجھائیں گے۔۔۔اب بڑی ہو جاؤ پلیز۔۔۔تم امائمہ کی جانب دیکھو۔۔۔وہ بھی تو اپنے پیرنٹس کی اکلوتی بیٹی ہے لیکن کتنی ذمہ داری ہے اس کی طبیعت میں۔۔۔عمر جیسے بندے کو بدل کر رکھ دیا ہے اس نے۔۔۔" وہ بہت برداشت کرتے ہوئے اسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم امائمہ کے ساتھ میرا کمپیریزن مت کرو عمر۔۔۔اس کو میرے جیسے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔۔۔" زارا نے چڑ کر اتنا ہی کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اب تم اپنے عظیم الشان مسائل کا رونا رونے لگ جانا۔۔۔تم نے بلاوجہ کے مسئلے پال رکھے ہیں۔۔۔تمہارے بال اچھے نہیں ہیں۔۔۔

تمہیں بھوک نہیں لگتی۔۔۔تم کمزور ہوگئی ہو۔۔۔تمہاری سینئرز تم سے خار کھاتی ہیں۔۔۔بڑی ہو جاؤ زارا خدارا بڑی ہو جاؤ۔۔۔دنیا بہت آگے نکل چکی ہے"
شہروز اسے چڑا ہی رہا تھا لیکن زارا کو بے حد برا لگا۔شہروز کو اسکا اندازہ تب ہوا جب اسے دوسری جانب سے کافی دیر تک کوئی جواب سننے کو نہیں ملا تھا۔
زارا نے کال کاٹ دی تھی۔شہروز نے چڑ کر فون بستر پر دور پھینک دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اپنا آفر لیٹر پسند آیا ہے" عوف بن سلمان نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔وہ پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ملاقات کے وقت سے پانچ منٹ پہلے پہنچنے والا شہروز انہیں ڈائننگ ہال میں بیٹھا دیکھ کر شرمندہ ہو گیا تھا لیکن ان کا رویہ بہت اچھا تھا جس سے اس کی شرمندگی زائل ہو گئی تھی۔وہ اتنا کامیاب اور امیر ترین بزنس مین شخص تھا لیکن اتنا ہی عاجز اور ملنسار بھی۔
"میں چند باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔۔۔مجھے امید ہے آپ انہیں ملحوظ خاطر رکھیں گے۔۔۔اگر آپ میرے ساتھ کام کرنے کے لئے رضامند ہیں تو میں مزید کچھ چیزیں ابتداء میں ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔رازداری ہماری پہلی شرط ہے۔ہم بہت حساس موضوعات پر کام کرتے ہیں اور جب تک ہمارا کام مکمل نا ہو جائے ہم اسکے متعلق کسی سے بات کرنا سخت ناپسند کرتے ہیں آپ ایک مشہور چینل کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔۔۔آپ کو کاپی رائٹس کے بارے میں بتانا یا آپ کے سامنے اس فیلڈ میں ہونے والی دھاندلیوں کا ذکر کرنا محض وقت کا ضیاع ہوگا۔ہم بہت منظم طریقے سے کام کرتے ہوں اور بہت سے دوسرے براڈ کاسٹنگ آرگنائزیشنز کے ساتھ رابطہ بھی ہیں لیکن ہم اپنے پراجیکٹس کے بارے میں کبھی کسی سے بات نہیں کرتے۔میرے ساتھ میرے ان پراجیکٹس پر مختلف ایتھنکس کے لوگ کام کرتے ہیں لیکن رازداری کا خیال رکھنا ہم سب پر لازم ہے۔میں اس کی خلاف ورزی ذاتی طور پر بھی پسند نہیں کرتا اور یہ ہمارے کام کی ضرورت بھی ہے۔میرے ساتھ کام کرنے والا ہر شخص اس بات کا پابند ہے اور میرے ساتھ کام کرنے والے بہت سے لوگ مختلف آرگنائزیشن سے مختلف براڈ کارپوریشن سے تعلق رکھتے ہیں یعنی صرف آپ ہی نہیں ہیں، بہت سے لوگ ہیں جو چیلنجز قبول کرتے ہیں اور ہر نئی چیز سیکھنا چاہتے ہیں۔جن کی زندگی کا ہر لمحہ انسانیت کی خدمت ہے۔ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔رازداری رکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارا کام جدت پسند ہوتا ہے ہمارا اپنا ایک طریقہ ہے۔میں اسے پیش کرنے سے پہلے کسی قسم کی پروجیکشن پسند نہیں کرتا۔مجھے یہ پسند نہیں ہے۔آپ یوں سمجھ لیجئے مجھے اس میں مزا نہیں آتا۔۔۔" انہوں نے اپنے دونوں بازو میز کی چکنی سطح پر رکھے تھے۔شہروز اس دوسری ملاقات میں ان سے پہلے سے بھی زیادہ مرعوب ہوا تھا۔وہ لگ بھگ پچاس سے زیادہ کے لگتے تھے لیکن ان کی پشت بالکل سیدھی تھی۔ان کا انداز نشست بھی ایسا تھا کہ مجال ہے ذرا بھی خم آیا ہو۔براؤن ڈبھورے رنگ کے سوٹ میں خوشبوئیں اڑاتا وجود، سلیقے سے جمے بال اور چہرے پر ہلکی داڑھی سب جیسے سلیقے اور شائستگی کی اپنی مثال تھے۔شہروز کو بہت سے سیاستدانوں سے کاروباری افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا لیکن ایسا مرعوب وہ کسی سے نہیں ہوا تھا۔عوف بن سلمان مردانہ وجاہت اور شائستگی کی اعلیٰ مثال تھے۔
"میں بھی شور مچانے سے زیادہ اپنا کام کرنے پر یقین رکھتا ہوں سر۔۔۔یہ میری نوکری سے زیادہ میری طبیعت کا معاملہ ہے۔میں اپنا کام ہمیشہ سے اپنے بھروسے پر مکمل کرنے کا عادی رہا ہوں یعنی میں ایسے پراجیکٹس کرتا ہی نہیں ہوں جس میں بہت زیادہ لوگ شامل ہوں۔۔ایسی

صورتحال میں راز داری کی شرط اہم نہیں رہ جاتی" شہروز نے اپنی دلی کیفیت چھپا کر اعتماد سے کہا تھا۔اس میں ایک خوبی تھی وہ اپنی عزت نفس کو ہمیشہ اہمیت دیتا تھا۔یہ اسکی ٹریننگ کا حصہ تھا۔عوف بن سلمان نے سر ہلایا جیسے سراہ رہے ہوں۔

"شباب (نوجوان کو مخاطب کرنے کا مخصوص انداز) میں ایک چیز کا قائل ہوں۔۔۔نئے تعلقات بناتے ہوئے حقیقت اور وضاحت مکمل کر بتانی چاہیئے۔۔۔اس سے ناکامی کا رسک کم ہو جاتا ہے" وہ مزید کہہ رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں آپ ایک اچھے صحافی ہیں اور آپ میں نئی چیزیں سیکھنے کا آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔۔میں پہلی نظر میں آپ کی شخصیت میں چھپے اسپارک کو پہچان گیا۔شہروز کا خون سیروں بڑھ گیا تھا۔اسے پوچھنا چاہیئے تھا کہ وہ اس کے بارے میں ایک فلائٹ میں اتنا کچھ کیسے جان گئے تھے لیکن تعریف کے نشے نے اسکی حیات کو جیسے لپیٹ لپاٹ کر ایک سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔اس نے خود ہی فرض کر لیا تھا وہ اتنا قابل ہے کہ ایک نجی چینل پر کام کرنے سے مشہور و معروف ہو چکا ہے اور دنیا بھر کے لوگ اسے جانتے ہیں اور یہ شاندار نوکری اسے اسکی اسی قابلیت کی وجہ سے آفر کی گئی ہے۔

"میں ایک صحافی ہوں سر۔۔۔مجھ سے زیادہ سچائی کی اہمیت کون جان سکتا ہے" اس نے ابھی بھی اسی انداز میں بات کی تھی۔

"اچھی بات ہے۔۔میرے دل کو اچھی چیزیں بھاتی ہیں۔۔میرا اصول ہے کہ آنکھیں ناک کان منہ بے شک بند رکھیں لیکن اپنے دل کو قفل مت لگائیں۔دل انسان کے جسم کا قطب نما ہوتا ہے۔۔۔یہ منزل کی جانب جانے والے راستے کی نشاندہی کرتا ہے۔۔اس لئے اس کی رہنمائی کو ہمیشہ ترجیح دیں۔۔آپ اگر میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ یہاں بھول بھلیاں بہت ہیں۔۔ہر قدم آپ کو چوکنا ہو کر اٹھانا پڑے گا۔۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔شہروز کو دل ہی دل میں ان کی اس بے وجہ کی سنسنی پھیلاتے انداز سے الجھن ہوئی۔وہ وضاحت طلب انداز میں انکا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کو جس پراجیکٹ کی آفر کی گئی ہے اس کا بنیادی موضوع دہشت گردی ہے۔۔۔آج کی دنیا کا سلگتا ترین موضوع ہے دہشت گردی۔۔۔مذہب اسلام کے ماتھے پر اس سے بڑا کلنک آج تک نہیں لگا ہو گا۔۔آپ اس کلنک کو مٹانے نکلیں گے تو آپ جہاد کے راستے پر ہونگے۔۔۔یہ راستہ آسان نہیں ہے۔دنیا بھر میں مسلمانوں کو جس طرح ان چیزوں میں ملوث کیا جا رہا ہے اور اسکی کیا وجوہات ہیں کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کو ہر سچائی کا سامنا کرنا پڑے گا چاہے وہ آپ کو پسند آئے یا نہیں۔میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرا حالیہ پراجیکٹ دنیا کے سامنے اسلام کا مثبت چہرہ پیش کرنے کے متعلق ہے۔۔۔میں اس کام کو جہاد سمجھ کر کر رہا ہوں۔۔۔میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی ابہام کا شکار ہوں۔۔۔آپ کو ذہنی آمادگی کے ساتھ یہ جانتے ہوئے اپنا کانٹریکٹ سائن کرنا چاہیئے کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے۔آپ کو بہت سی رکاوٹوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔۔۔آپ کو بہت سے مقام پر اپنے ہی لوگ غلط سرگرمیوں میں ملوث ملیں گے جنہیں آپ کو بے نقاب کرنا پڑے گا۔میں پھر کہوں گا آپ کو ایسی ہر چیز ذہن میں رکھ کر اس جاب کو قبول کرنا پڑے گا۔۔۔آپ کو یہ سب منظور ہے تو بسم اللہ۔۔۔ورنہ واپسی کے دروازے ابھی کھلے ہیں" انہوں نے لفظ "ابھی" پر زور دیتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔وہ گفتگو کے دوران اس کا بغور جائزہ لیتے رہے تھے۔شہروز نے سر ہلایا۔یہ ساری باتیں اس کے لئے اتنی نئی بھی نہیں تھیں۔راز داری تو اس

نے ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھی تھی اور اچھے برے کا فرق بھی وہ اب جان چکا تھا۔۔۔ اتنے پینٹرز کی دوڑ میں اپنے کام کو منفرد اور مختلف رکھنے کے لئے یہ سارے حربے سب ہی آزماتے تھے سو اس میں نیا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ کسی پراجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لئے اتنی محنت تو کرنی پڑتی ہے۔

"میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جس سے مجھے کچھ سیکھنے کو ملے۔۔۔ مجھے روپے پیسے کی حاجت نہیں ہے لیکن مجھے اپنا تجربہ بڑھانا ہے، اپنا علم بڑھانا ہے۔ یہی میرا شوق ہے، یہی میرا جنون ہے۔۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایک مشکل پراجیکٹ کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔ آپ کے انداز سے لگ رہا ہے کہ یہ بہت زبردست پراجیکٹ ہوگا۔ میں اس کے لئے آپ سے زیادہ پرجوش اور پرامید ہوں" وہ میز پر پڑے گلدان میں موجود پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا عزم اس کے چہرے سے چھلکتا تھا، اس کی استقامت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ یہ تھیں وہ خصوصیات جو عوف بن سلمان جیسے جوہری نے بھانپ لی تھیں۔ یہ ہی تھے وہ جذبے جو انہوں نے دنیا دنیا گھوم کر سمیٹے تھے اور ایسے ہی تھے وہ لوگ جو ان کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے راضی نامے پر دستخط کئے تھے اور پھر کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ شہروز نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"میں اس عزت افزائی پر مشکور ہوں سر اور پوری توانائی آپ کے اس پراجیکٹ کو دینے کی کوشش کروں گا" اس نے کہا تھا اور پھر دستخط کر دیے تھے۔



"کیا کر رہی ہو؟" زارا راکنگ چیئر پر بیٹھی بلاوجہ ادھر ادھر جھول رہی تھی۔ جب عقب سے ممی کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا پھر کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ کم ہی اس طرح اس کے کمرے میں آتی تھیں۔ انہوں نے ملگجے سے کپڑے پہن رکھے تھے اور ان کے شولڈر کٹ بال بکھرے بکھرے سے تھے۔ اس نے شاید تین بعد ممی کو دیکھا تھا تین دن پہلے بھی وہ کچھ سست سی تھیں جب زارا نے انہیں رات کے کھانے پر دیکھا تھا۔ وہ ان سے کترانے لگی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ اس کا ممی سے سامنا کم سے کم ہو۔ وہ ابھی تک ہاسپٹل نہیں جا رہی تھی۔ ممی کی تاکید کے باوجود اس نے ایک دن بھی اپنی ڈیوٹی نہیں دی تھی۔ ایک مہینہ ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک روٹین کے مطابق ہاسپٹل جانا شروع نہیں ہوئی تھی۔ اب احساس جرم سے زیادہ اس کی ازلی کاہلی اس کی بڑی وجہ تھی۔ اس کی طبیعت کسی چیز کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔۔ شہروز نے اسے بتایا تھا وہ لندن جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ لاہور آیا تھا تو ایک ہفتہ رکا تھا۔ زارا ایک بار ممی کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی اور زندگی میں پہلی بار اسے شہروز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بہت بدلتا جا رہا تھا اور اس بات کا شکوہ سب کو تھا جبکہ وہ اسے سب کا وہم اور اپنی مصروفیت قرار دیتا رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ سب سے لاپرواہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے کسی کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی کامیابیوں کا ذکر کرتا رہتا تھا اور وہ اس معاملے میں کسی قدر مغرور ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائیوں اور اپنے ڈیڈی کے سامنے بھی اپنا موقف اس طرح بیان کرنے لگا تھا جیسے صحافی ہونے کے بعد صرف وہی واحد شخص ہے جو حق اور سچ بیان کر سکتا ہے۔ وہ لندن جا رہا تھا اس لئے امامہ اور عمر وغیرہ کے لئے شاپنگ کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ زارا نے انکار کر دیا تھا۔ زارا کو اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اپنی محنت اور زارا کی ناکامیوں کو اسکی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی قرار دیتا تھا۔ شہروز کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ شہرت کا نشہ اس کے منہ کو لگ چکا تھا اور شہرت انسان کو زندہ کھا جاتی ہے۔ زارا کی کمزور شخصیت کو اس کے رویے سے مزید دکھ ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا

تھا کہ وہ صرف اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی اور اپنی ممی کو بھی نظر انداز کرنے لگی تھی۔اس لئے انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر اس نے مثبت رسپانس نہیں دیا تھا۔اسے اندازہ تھا کہ وہ اس سے پوچھیں گی کہ وہ کب سے ڈیوٹی پر جا رہی ہے۔ان کے درمیان اس موضوع پر ابھی تک بات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ممی کی آنکھوں میں چھپے سوال کو پڑھ سکتی تھی۔

"میں بس یونہی بیٹھی تھی" اس نے سادہ سے انداز میں جواب دیا پھر ان کو وارڈ روب کی جانب جاتا دیکھ کر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ممی تھکی تھکی سی ہیں۔وہ صبح جب ہاسپٹل کے لئے نکل رہی تھیں تب بھی زارا نے انہیں بالکنی سے جاتے دیکھا تھا اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ بیمار ہیں۔

"کپڑے دیکھنے کے لئے نہیں ہوتے پہننے کے لئے ہوتے ہیں" انہوں نے اس کے ہینگ کئے ہوئے لباسوں کو دیکھ کر بات برائے بات کی تھی۔وہ ہمہ وقت اس کے ملگجے اور شکنوں والے کپڑوں میں ملبوس ہونے کی وجہ سے اسے ٹوک رہی تھیں۔زارا بھی بے وجہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا چہرہ دیکھنے لگی کہ وہ مدعا بیان کریں۔وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ممی کے استفسار پر کہہ دے گی کہ آنے والے ویک اینڈ کے بعد سے ڈیوٹی پر جانا شروع کر دے گی اور جب جانے کا دن آئے گا تو دل چاہے گا تو چلی جائیگی ورنہ پھر کوئی بہانہ بنا لے گی۔اسی لئے وہ ممی کی باتوں کے جواب دینے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی۔دوسری جانب اس کی ممی کی صرف اس کے کپڑوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"تمہارے پاس گرمیوں کے سب کپڑے پرانے ہیں نا۔تم نے اس بار کوئی ایک بھی چیز نہیں خریدی۔۔اتنے اچھے کلرز آئیں ہیں برے پر۔۔بھابھی بتا رہی تھیں بہروز کے کسی دوست کی بہن نے صدر میں بوتیک بنائی ہے۔۔بہت اچھے ڈریسز ہیں اور قیمتیں بھی مناسب۔۔کسی دن چلو میرے ساتھ۔۔تمہیں شوز اور بیگ بھی لے کر دوں۔۔۔یہی ایک براؤن بیگ لئے پھرتی ہو۔۔۔بہت پرانا ہو گیا ہے۔تمہارا دل نہیں کرتا اپنے لئے شاپنگ کرنے کو۔کپڑے بنانے کو۔۔لڑکیوں کو تو اتنا شوق ہوتا ہے خریداری کا" انہوں نے وارڈ روب کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا پھر اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے الماری بند کی تھی اور اس کے بستر پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ فرصت سے اس کے پاس بیٹھنے کے لئے آئی ہیں زارا نے اپنی اکتاہٹ چھپا کر حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔اس کی یادداشت میں کوئی ایسا لمحہ نہیں تھا جب ممی نے اس سے ایسے کوئی بات کی ہو۔یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لئے کچھ خریدتی یا لاتی نہیں تھیں۔وہ اپنی مرضی سے ہر سیزن میں اس کے لئے اپنی مرضی سے کپڑے جوتے خرید لایا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ اس کے بچپن سے ہی چل رہا تھا۔عمر کی شادی وہ پہلا موقع تھا جب زارا نے اپنے لئے کوئی ڈریس خود جا کر خریدا تھا اور تب بھی وہ اپنی ممانی یعنی شہروز کی امی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔

"آپ لے آنا میرے لئے۔۔مجھے کہاں سنس ہے ایسی چیزوں کی۔۔۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔یہ حقیقت تھی کہ اس کا دل اور دماغ ایسی چیزوں میں نہیں لگتا تھا اب۔۔۔

"زارا۔۔۔یہاں آؤ میرے پاس" انہوں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا وہ اٹھ کر انہی کے پاس آ رہی تھی لیکن ان کا اس طرح کہنا اسے بہت عجیب لگا۔وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس آ گئی تھی۔

"کتنی کمزور ہو گئی ہو۔۔رنگ بھی کیسا زرد ہو گیا ہے۔۔کیوں اپنا خیال نہیں رکھتی تم" وہ اتنے محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں کہ زارا کو ان کا لہجہ نا صرف حیران کن بلکہ انوکھا بھی لگ رہا تھا۔

"بھول جاؤ سب باتوں کو۔۔سب لوگوں کو۔۔۔اپنے بارے میں سوچو۔۔۔خوش رہا کرو" وہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منت بھرے انداز میں بولی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو ممی۔۔۔میں خوش ہوں۔۔۔مجھے کیا ہوا ہے" وہ سابقہ انداز میں بولی۔ان ماں بیٹی کے درمیان ایسے محبت بھرے لمحے آئے ہی نہیں تھے بھی سو اس کا حیران ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ ایک پریکٹیکل عورت کے روپ میں مصروف زندگی گزارتے دیکھا تھا۔یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے لاپرواہ تھیں یا اس کو نظر انداز کرتی آئی تھیں۔یہ ان کی فطرت تھی جو روبوٹک تھی۔ان کے پاس جذبے تھے لیکن وہ ان کے اظہار کے معاملے میں کنجوس تھیں اور یہ بات زارا سمجھتی تھی لیکن اسے بھی عام اولاد کی طرح ماں کی اس فطرت سے چڑ تھی۔ اب جب وہ اس کے سامنے بیٹھی عام ماؤں کی طرح اس کے لئے فکر مند ہو رہی تھیں تو بھی زارا کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"میں کیا جانتی نہیں ہوں کہ تم کتنی خوش ہو۔۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر یکدم اسے گلے سے لگا لیا تھا۔زارا ایک لمحے کے لئے تو سن ہی ہو گئی۔اسے نہیں یاد تھا کہ اس کی ماں نے آخری دفعہ اسے کبھی گلے لگایا تھا۔وہ چند ثانیے کے لئے ان کے لمس کو محسوس کرتی رہی پھر اس نے خود کو ان کی بانہوں میں چھوڑ دیا تھا۔کتنا سکون تھا ماں کی آغوش میں اور اسے یہ آغوش اپنے ہوش وحواس میں اس انداز میں پہلی بار میسر ہوئی تھی۔اس نے اپنے بالوں میں نمی کو محسوس کیا۔ممی رو رہی تھیں اسکی آنکھیں بھی تر ہونے لگیں لیکن کتنے مزے کے تھے یہ آنسو جو سکون عطا کر رہے تھے اور کوئی ان کو پونچھنے والا نہیں تھا اور ان دونوں کو خواہش بھی نہیں تھی کہ کوئی ان آنسوؤں کو پونچھتا۔

"آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔۔کیا ہوا ہے۔۔آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔آپ مت پریشان ہوں ممی۔۔میں بالکل ٹھیک ہوں ۔۔میں پیر سے ڈیوٹی پر چلی جاؤں گی" اس نے ان کو تسلی دی تھی۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی زارا۔۔مجھے پہلے ہی ایسے لگتا ہے کہ میں نے تم پر اپنے فیصلے مسلط کر کے تمہیں مفلوج کر دیا ہوا ہے۔تمہیں اپنے اشاروں پر چلا چلا کر تمہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ تم اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی جوڑا ہی خرید سکو۔لیکن زارا میری نیت پر شک مت کرنا میرے بچے۔۔۔میں تمہاری ماں ہوں اور مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں چاہ سکتا۔میں نے تمہیں اپنے پروں میں چھپا چھپا کر تمہاری پرورش کی تا کہ تمہیں کوئی تکلیف نا ہو کوئی گزند نا پہنچے۔۔تم سے پہلے میرے تین بچے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اللہ کے پاس واپس چلے گئے۔۔۔تمہیں بہت منتوں مرادوں کے بعد پایا تھا۔۔تم بہت قیمتی ہو میرے لئے اسی لئے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہا کہ کوئی میری اتنی قیمتی بیٹی کو نقصان نا پہنچا دے۔۔۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بول رہی تھیں۔زارا کو عجیب سی شرمندگی ہوئی۔وہ اسے صفائی کیوں دے رہی تھیں۔۔اسے اس ساری صورتحال میں کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا تھا۔

"میں جانتی ہوں ممی۔۔آپ ایسے بات مت کریں" وہ منہ انکی جانب کئے بنا کہہ رہی تھی۔زارا کچھ خوفزدہ ہوئی تھی۔ممی کیا سوچ رہی تھیں۔

ان کے دل کو یکدم کیا اندیشات لاحق ہو گئے تھے۔ کیا ان کی ماموں یا شہروز سے کوئی بات ہوئی تھی۔ کیا پھر وہ اس کی شادی کے مسئلے کے لئے پریشان تھیں۔

"مجھے بات کرنے دو زارا۔۔۔ میں اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔۔ میں آج کل بہت دکھی ہو گئی ہوں۔۔ زندگی موت کا بھروسہ کیا ہے ۔۔ آج ہوں کل نہیں رہوں گی۔۔۔ میرے بعد کون تمہیں سنبھالے گا زارا۔۔ کاش تمہارا کوئی بھائی ہوتا یا بہن ہی ہوتی۔ کوئی تو ہوتا۔۔ ماں باپ کے بعد بہن بھائی ہی ہوتے ہیں جو سہارا دیتے ہیں۔۔۔ باقی سب تو بیکار کے دل بہلاوے ہیں۔۔ کوئی رشتہ دار دوست احباب یا کزن۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔۔ سب کو اپنے مقصد اپنے عزائم عزیز ہوتے ہیں۔۔۔ سب کے لئے اپنی ذات پہلے ہوتی ہے۔۔ باقی اس کے بعد آتے ہیں۔۔۔ یہی دنیا ہے" ان کے لہجے میں اب کی بار عجب سی اکتاہٹ تھی۔ زارا دل میں چور سی ہو گئی۔

"آپ کی شہروز سے بات ہوئی ہے کیا۔۔۔؟" اس نے انکی جانب دیکھے بنا سوال کیا تھا۔ وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکی تھی۔

"شہروز کی بات مت کرو۔۔۔ مجھے اس کے متعلق بات نہیں کرنی۔۔۔ مجھے آج کسی غیر متعلقہ شخص کے بارے میں بات نہیں کرنی۔۔۔ ہم آج اپنی باتیں کریں۔۔ وہ باتیں جو ہم نے آج تک نہیں کی ہیں۔ تمہاری اور میری باتیں۔۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں زارا میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔ بہت زیادہ محبت۔۔۔ تم کبھی یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی تھی" وہ بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ زارا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی گفتگو بے ربط تھی۔

"ممی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔ میں جانتی ہوں۔۔ محبت کوئی ماپنے کی چیز تھوڑی ہوتی ہے کہ زیادہ یا کم کا فیصلہ کیا جائے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔۔ پلیز ایسی باتیں مت کریں۔۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"ہاں کوئی اور بات کرتے ہیں۔۔۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔۔۔ کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔۔ کسی مال میں چلتے ہیں۔۔ ہم بھی تو دیکھیں زارا کہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں کتنی بڑی ہوتی ہیں" وہ کہہ رہی تھیں۔ زارا نے ان کے چہرے پر پھیلی بے چینی کو دیکھا تھا۔ ایسا پھیکا چہرہ ہو رہا تھا کہ شاید ہی پہلے کبھی ہوا ہو۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔۔ آئیں میں آپکا بلڈ پریشر چیک کروں پہلے۔ کیا ہو گیا ہے۔۔ کیا ہو رہا ہے آپ کو مجھے بتائیں" اس نے بستر سے پاؤں نیچے اتارے تھے اور ان کا ہاتھ تھاما تھا۔

"ٹھیک ہوں میں۔۔ بس۔۔ یونہی۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔" انہوں نے بے ربط سے انداز میں کہا پھر وہ اسی کے بیڈ پر لیٹ گئی تھیں۔ زارا پھٹی پھٹی آنکھوں سے جیسے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی لیکن ابھی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

"ممی۔۔ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیا ہوا ہے" وہ چلائی تھی۔ ممی نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا خود کو سنبھالا تھا اور اس کو دیکھ کر مسکرائی تھیں اور آنکھیں موند لی تھیں۔

"ممی ی ی۔۔" زارا ان پر جھپٹی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے انکی نبض جانچی۔ سینے پر ہاتھ رکھا پھر وہ فون کی جانب لپکی تھی۔ یہ ایمرجنسی کیس تھا۔ ایمبولینس کی فوری ضرورت تھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

ماؤں کی ضرورت زندگی میں کبھی ختم نہیں ہوتی۔۔۔ان کی محبت آکسیجن کی طرح ہوتی ہے جس کی ضرورت آخری سانس تک رہتی ہے اور جب یہ نہیں رہتیں تو ان کی ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

زارا نے یہ بات اپنی ممی کے جانے کے بعد سیکھی تھی۔وہ بہت مضبوط عورت تھیں، اتنی مضبوط کہ انہوں نے اپنے اردگرد رہنے والوں کو بھی اپنی ذات میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ ممی کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔وہ اس کی پریشانیوں میں پریشان نہیں ہوتیں۔وہ جب اتنی بے سکون رہتی ہے تو ماں ہونے کے ناطے وہ ہمیشہ پرسکون رہتی ہیں۔وہ پریقین تھی کہ ممی اس سے محبت ہی نہیں کرتیں۔وہ اس سے لاپرواہ رہتی تھیں تو اس نے بھی ان سے لاپرواہ رہنا شروع کر دیا۔وہ اپنے اپنے دائروں میں اپنی اپنی زندگیاں جینے لگے تھے۔انہوں نے کبھی ان دائروں کی خلاف ورزی کر کے ایک دوسرے کے ساتھ وہ مضبوط بانڈ بنانے کی کوشش ہی ترک کر دی تھی جو تعلقات میں بے حد ضروری ہوتی ہے۔اس کے باوجود ممی کے انتقال نے اسے باور کروایا تھا کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی تھی۔

"کیا کوئی ایسے بھی چلا جاتا ہے چھوڑ کر" اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ابتداء میں سب لوگ آس پاس تھے۔ماموں احسان بھی لندن سے آ گئے تھے۔تسلی دلاسہ دینے کے لئے رونے کے لئے کوئی نا کوئی کندھا میسر رہا لیکن پھر کچھ دن بعد ہی سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہونے لگے۔شہروز بھی چند دن میں تین مہینوں کے لئے لندن جانے والا تھا۔اس کی واپسی پر بالآخر یہ طے پا گیا تھا کہ ان دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔زارا سب کے چہرے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی۔اس نے ممی کی زندگی میں ہمیشہ ان کی مداخلت کو ناپسند کیا تھا اور اب انکی وفات کے بعد وہ سارا دن یہ سوچتی رہتی تھی کہ اب کیا کرے گی۔کیسے زندہ رہے گی۔اسے ان کے بغیر ایک قدم اٹھانے کی بھی عادت نہیں رہی تھی لیکن ان کی وفات سے اس نے یہ ضرور سیکھ لیا تھا کہ بعض اوقات بڑے بڑے حادثے زندگی میں انسان کو کمزور کرنے کی بجائے بہادر بنا دیتے ہیں۔اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے زندگی میں جو کرنا تھا عقلمندی سے بہادری سے کرنا تھا۔اس کی غلطیوں پر پردے ڈالنے والی ماں اب نہیں رہی تھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

"میں تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔۔۔دس منٹ میں اگر تم باہر نہیں آئیں تو نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی" یہ دس دن بعد کی بات تھی۔وہ ماسی سے گھر صاف کروا رہی تھی جب فون کی بیپ بجی تھی۔دوسری جانب ٹیپو تھا۔زارا کو اس شخص کا انداز اب ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ممی کی تدفین والے روز بھی وہ کچھ دیر کے لئے آیا تھا لیکن زارا سے بات نہیں ہو پائی تھی۔

"فرض کیجئے میں نہیں آتی۔۔زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے آپ" اس نے بات کرنے کے ساتھ ساتھ ماسی کو اشارے سے میز کے نیچے سے کچرا نکالنے کے لئے کہا تھا۔کافی دن سے صفائی ستھرائی ٹھیک سے نا ہونے کے باعث کافی کچرا جمع تھا۔

"بحث کرنے کا وقت تو ہے میرے پاس مگر آج ہمت نہیں ہے۔تھکا ہوا ہوں۔۔۔اسلئے مہربانی فرما کر دس منٹ میں تشریف لے آئیے" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔

"کہاں جانا ہے" زارا نے منٹوں میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اس کے ساتھ جانا ہے۔

"سوال مت پوچھو۔ تشریف لاؤ۔۔۔ سوال پوچھ پوچھ کر تم ذہین نہیں ہو جاؤ گی" وہ چڑ کر بولا تھا۔ زارا نے فون بند کیا تھا پھر ماسی کو ضروری ہدایات دے کر فریش ہونے میں اس نے واقعی دس منٹ ہی لگائے تھے۔ گیٹ کیپر کو گیٹ کھولنے کا کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور ابھی پوری طرح باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ وہ سامنے سرخ آلٹو میں بیٹھا نظر آگیا تھا۔ وہ اشارے کر رہا تھا کہ اپنی گاڑی اندر کر لو۔ زارا نے کچھ دیر سوچا تھا پھر وہ گاڑی سے نکل آئی تھی۔ گیٹ کیپر کو چابی تھما کر وہ اسکی آلٹو میں آ بیٹھی تھی۔

"اب تو بتا دیں کہاں جانا ہے" اس نے بیٹھتے ہی سوال کیا تھا۔ ٹیپو نے گاڑی ریورس کی تھی۔

"میرے گھر۔۔۔ اپنی امی سے ملواؤں گا" وہ مسکرا رہا تھا۔ زارا نے سر ہلایا۔ اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ رائیونڈ گئی ہا رگئی تھی لیکن کبھی ٹیپو کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ زارا جانتی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی امی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی امی کی باتیں بتاتا رہتا تھا۔ اس کی امی کی اور اس کی بہت نوک جھونک ہوتی تھی۔ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا اور ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ وہ چالیس منٹ میں رائیونڈ پہنچ گئے تھے۔ ٹیپو نے اپنے گھر کے باہر ہی گاڑی روکی تھی۔ وہ بڑے سے گیٹ والا عام طرز کا گھر تھا جس کے باہر پیپل کے گھنے درخت تھے جبکہ بیرونی دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی بوگن ویلیا تھی۔ سخت گرمیوں کے دن تھے لیکن وہاں اتنا سبزہ تھا کہ طبیعت تر و تازہ ہو گئی تھی۔

تم اندر چلی جاؤ۔۔۔ میں ایک ضروری کام نپٹا کر آتا ہوں" اس نے زارا کے اترتے ہی کہا تھا اور خود آگے بڑھ گیا تھا۔ زارا ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ بنا تعارف اندر کیسے جا سکتی تھی پھر اس کا خیال تھا کہ اس کی امی گاؤں کی سادہ ان پڑھ عورت ہوں گی۔ وہ ان کو کیا بتاتی کہ وہ کون ہے۔۔۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھی کہ اندر جائے یا نا جائے جب گیٹ خود بخود کھل گیا تھا۔

"آؤ۔۔ اندر آ جاؤ۔۔ کب سے کھڑی ہو یہاں۔۔" ایک خاتون نے ذرا سا باہر نکل کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ زارا چپ چاپ اندر داخل ہو گئی تھی۔

وہ گھر باہر سے جتنا سبز تھا اندر سے اس سے زیادہ ہرا بھرا تھا۔ سرخ اینٹوں کے فرش سے سجا بڑا سا صحن جس کے ساتھ ساتھ کیاریاں تھیں۔ مختلف پودے پھول اور پھولوں کی خوشبو نے ایک ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ گاؤں کے گھروں کا ایسا تصور تو کبھی نہیں کیا تھا اس نے۔ ٹیپو کی امی نے برآمدے کی جانب اس کی رہنمائی کی تھی۔ برآمدہ بھی اے سی نا ہونے کے باوجود ٹھنڈا تھا۔ ایک جانب دیوان پڑا تھا جبکہ اس کے سامنے سفید آئرن راڈ کی کرسیاں تھیں جن کی دونوں سائیڈ پہ تپائیاں تھیں۔ دیواروں پہ بھی ایسی آرائشی چیزیں تھیں جن کو دیکھ زارا کا وہ تصور ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جو اس نے گاؤں کے گھروں کے متعلق ذہن میں بٹھا رکھا تھا۔

"یہاں تخت پہ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تھک گئی ہو گی" ٹیپو کی امی نے پنکھا آن کیا تھا پھر اسے کرسی پہ بیٹھتا دیکھ کر بولی تھیں۔ زارا نے ان کی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔ وہ گھر کا جائزہ لینے کے بعد اب ان کی جانب دیکھ رہی تھی اور ان کو دیکھ کر بھی اسے حیرانی ہی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں ٹیپو کی امی جو حلیہ تھا وہ ابھی انڈین فلموں کے تناظر میں سوچا تھا اس نے۔۔۔ ایک فربہی مائل عورت جو کھلے کھلے پائنچوں والی شلوار پہنے سر پہ چادر کی بکل مارے۔ بالوں میں ڈھیروں تیل ڈالے آنکھوں کو سرمے کی دھار سے سجائے دودھ دہی کی خوشبو سے مہکتا وجود لئے نظر آئیں گی۔۔ وہ ٹیپو کی امی

تھیں۔۔ یہ کیسے ممکن تھا وہ زارا کو حیران نا کرتیں۔ وہ لباس تو عام سا ہی پہنے ہوئے تھیں لیکن اس پر کوئی شکن نہیں تھی۔ انہوں نے مانگ نکال کر چٹیا بنا رکھی تھی۔ صاف ستھرے ہاتھ پاؤں والی وہ خاتون پہلی نظر میں ہی پڑھی لکھی لگتی تھیں۔ وہ اسکی ممی جیسی ماڈرن خاتون تو نہیں تھیں لیکن شہروں میں رہنے والی عام خواتین جیسی خاتون تھیں۔

"تم آمنہ ہو؟" انہوں نے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں زارا ہوں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے۔۔ معاف کرنا۔۔ میں نہیں جانتی تھی۔۔ دراصل میرے بیٹے کو ایسے ادھورے کام کرنے میں مزا آتا ہے۔ مجھے صرف یہ پتا تھا کہ مہمان آرہے ہیں۔ یہ نہیں پتا تھا کہ کون آرہا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا شاید تم آمنہ ہو" وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

نہیں میں زارا ہوں۔۔۔ آمنہ کون ہے؟" اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا تھا۔ اس نے ٹیپو کے منہ سے کبھی آمنہ کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ٹیپو کی امی نے اسکی جانب دیکھا پھر جیسے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولیں۔

"زارا۔۔" انہوں نے دوہرایا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ نام سن رکھا ہے یا نہیں۔۔۔ زارا خاموش رہی تھی۔

"تمہاری والدہ کا انتقال ہوا ہے نا۔۔ ہاں یاد آگیا۔۔ ذکر کیا تھا ٹیپو نے۔۔ بس بیٹا تمہارا نقصان تو بہت ہوا۔۔ ماں کا چلے جانا بڑا المیہ ہے۔ لیکن رب کی جو مرضی۔۔ اللہ تمہیں صبر و استقامت دے۔۔ ہمت دے۔ آمین" وہ کہہ رہی تھیں۔ زارا ابھی بھی خاموشی سے بیٹھی رہی۔۔ ایسی باتوں کے جواب خاموشی ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ بھی چند لمحے کے لئے خاموش رہی تھیں۔

"زارا میں ابھی اسکول سے آئی ہوں۔ کھانا بھی نہیں کھایا ہوا میں نے۔۔ تمہیں بھی بھوک لگی ہوگی۔۔۔ ایسا کرو تم میرے ساتھ کچن میں ہی آجاؤ۔"

وہ بڑی پھرتیلی سی عورت لگ رہی تھیں۔ زارا کو بھی یہی بہتر لگا۔ وہ ان کو اٹھتا دیکھ کر ان کے ساتھ کچن میں آگئی تھی۔ کچن بھی اچھا اور کافی وسیع تھا۔ ایک دیوار کی جانب شیلف اور کیبنٹس تھے باقی سارا کچن خالی تھا۔ انہوں نے ایک کیبن کھول کر اس میں سے فولڈنگ کرسی اور چھوٹی سی میز نکالی تھی پھر کھول کر اس کے لئے رکھ دی تھی۔

"میں آٹا گوندھ چکی ہوں۔۔۔ مولیاں کرش کرلی ہوئی ہیں۔۔ تم مولی کا پراٹھا کھالوگی نا۔۔" وہ پوچھ رہی تھیں۔ زارا اس ساری گفتگو میں پہلی بار مسکرائی تھی۔ ان کا انداز بہت دوستانہ سا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل بھی فارمل برتاؤ نہیں برت رہی تھیں جو اسے اچھا لگ رہا تھا۔

"جی ہاں۔۔ کھالوں گی" اس نے بھی فارمل ہو کر "نہیں اٹس اوکے۔۔ آپ رہنے دیں" کی گردان کر کے ان کے خلوص کی ناقدری نہیں کی تھی۔ انہوں نے چولہا جلایا پھر اس پر توا رکھ کر اس کی جانب دیکھے بنا بولیں۔

"تم ذرا فریج سے چٹنی نکالو اور وہاں پانی کی بوتل بھی ہوگی" زارا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"وہاں شیلف پر اچار بھی رکھا ہے" انہوں نے دوسرا حکم دیا تھا۔ زارا اچار کا جار بھی اٹھا لائی تھی۔ انہوں نے تب تک پیڑا اٹھا بیل لیا تھا۔ چند

لمحوں بعد سنہرا سنہرا گرم پراٹھا اسکے سامنے موجود تھا۔۔انہوں نے اپنے اور اس کے لئے پراٹھے بنائے اور موڑھا لے کر اس کے ساتھ ہی آبیٹھیں۔ انہیں پندرہ منٹ ہی لگے تھے یہ سارا کام نپٹانے میں جبکہ ذرا سی بھی بے ترتیبی نہیں پھیلی تھی۔ پراٹھے بھی ذائقہ دار اور خستہ تھے۔

"اب بتاؤ زارا کیا کرتی ہو تم۔۔۔ پڑھ رہی ہو؟" انہوں نے کھانے کے دوران ہی پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ڈاکٹر ہوں" اس کا جواب مختصر تھا۔اس سے پہلے کہ وہ دوسرا سوال پوچھتیں زارا نے پوچھا تھا۔

"آپ ٹیچر ہیں؟"

"جب ٹیپو جیسی نالائق اولاد ہو تو ماں کو ٹیچر بننا ہی پڑتا ہے۔۔" وہ اچار کی گٹھلی کو منہ میں رکھ کر چوستے ہوئے بول رہی تھیں۔

"آپ نے ذکر کیا تھا ناکہ آپ اسکول سے آئی ہیں تو اس لئے میں نے سمجھا کہ آپ ٹیچر ہیں۔" زارا نے وضاحت دی تھی۔

"میں نے اپنا ایک اسکول بنا رکھا ہے۔۔سلائی اسکول۔۔وہاں پر ہفتے میں پانچ دن غریب کام کاج کرنے والے بچوں کے لئے بنیادی ابتدائی تعلیم کا اہتمام بھی کرتی ہوں۔۔۔ٹیچر بھی سمجھ لو، پرنسپل بھی سمجھ لو۔۔مالی بھی سمجھ لو چوکیدار بھی سمجھ لو۔۔سب کام میں خود کرتی ہوں۔دراصل میں نے مریدکے میں بطور ہائی اسکول ٹیچر جاب کی ہے۔۔ریٹائرمینٹ کے بعد وقت گزاری کے لئے اچھا مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔۔فراغت راس نہیں آتی ہم جیسے لوگوں کو۔۔۔اب صبح اسکول چلی جاتی ہوں۔۔شام کو بچیاں گھر پر بھی ٹیوشن پڑھنے آجاتی ہیں۔۔۔"

"اور رات کو امی خود پڑھتی ہیں۔۔۔وہ چیزیں جو امی کو امی کی سہیلیاں اور اردگرد کے لوگ میرے بارے میں آکر پڑھاتے ہیں۔۔۔بہت پڑھنے لکھنے والی خاتون ہیں میری امی" یہ ٹیپو نے کہا تھا۔زارا نے مڑ کر دیکھا۔وہ کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔اس سے پہلے کہ امی کوئی جواب دیتیں وہ اس سے پوچھنے لگا تھا۔

"امی کی باتوں کا برا نا منانا۔۔۔یہ بہت بورنگ خاتون ہیں۔۔" اس سے پہلے کہ آنٹی کوئی جواب دیتیں وہ کھٹ سے باہر چلا گیا تھا۔زارا ہنسنے لگی تھی جبکہ وہ ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں بیٹھی لقمہ بناتی رہیں۔

"ٹیوشن میں کیا مضامین پڑھاتی ہیں آپ؟" زارا کو ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

"سب کچھ۔تمام مضامین جو ابتدائی کلاسز میں ضروری ہوتے ہیں۔۔انگلش، میتھس، اردو۔۔۔زیادہ تر لڑکیاں انگلش سے خار کھاتی ہیں اور انگلش میں مدد چاہتی ہیں۔اسکول میں بھی اسی طرح کا حساب ہے۔۔۔دراصل یہ عام طرز کا اسکول نہیں ہے۔۔ہم کوئی ہارڈ اینڈ فاسٹ رولز پر نہیں چلتے۔۔۔ہمارے پاس بہت غریب طبقے کے بچے ہیں جو ایک نوٹ بک بھی افورڈ نہیں کر سکتے۔۔یہ عام کچرا چننے والے، ہوٹلوں میں کام کرنے والے اور دوکانوں پر جھاڑو پونچھا کرنے والے بچے ہیں جو ہمارے پاس آتے ہیں۔ہم انہیں اس قابل کرتے ہیں کہ یہ علم کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔۔۔اور اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ انہیں اپنی عزت نفس کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی روزی روٹی کیسے کمانی ہے۔۔۔میں تعلیم کے ساتھ ہنر سیکھنے کو برا نہیں سمجھتی۔اسی لئے۔۔۔میں انہیں کام کرنے سے منع نہیں کرتی" وہ تحمل بھرے انداز میں سمجھا رہی تھیں۔

"امی آپ بہت باتیں کرتی ہیں۔۔اب اٹھ جائیں اور میرے لئے کڑ کڑ کرتا خستہ سا پراٹھا بنا کر لائیں" ٹیپو ایک بار پھر آدھمکا تھا اور اس نے

ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔زارا نے دیکھا انہوں نے ابھی بھی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی تھیں۔ٹیپو ان کی جگہ پر آبیٹھا تھا۔اس کا کھانا ابھی بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

"آپ نے ڈاکٹر صاحبہ کو بیٹھک میں اے سی چلا کر بٹھانا تھا نا۔۔یہاں بٹھا دیا تا کہ اے سی نا چلانا پڑے اور آپ کا خرچا بچ جائے۔۔بہت بری بات ہے امی۔۔مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔۔اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔۔" وہ مسلسل بول رہا تھا جبکہ دوسری جانب بالکل خاموشی تھی۔

"اے خوبصورت خاتون۔۔کوئی جواب نہیں دینا چاہتیں تو ایک محبت کی نظر ہی ڈال لیں۔۔۔کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا۔۔" وہ ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا تھا۔زارا کو لگا انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی ہے۔وہ زارا کو اشاروں میں بتا رہا تھا کہ امی ناراض ہیں۔

"حسن والوں سے اللہ بچائے۔۔ماہ جمالوں سے اللہ بچائے" ٹیپو ان کی بے اعتنائی دیکھ کر گانا گانے لگا تھا۔انہوں نے میز پر اس کی پلیٹ رکھی تھی اور توے سے پراٹھا چمٹے کی مدد سے اٹھا کر ڈائریکٹ اس کی پلیٹ میں رکھ دیا تھا پھر ٹیپو کے سر پر چپت لگائی تھی۔

"کھانا کھاؤ۔۔۔گانا بعد میں بھی گایا جا سکتا ہے"

"آپ نے کھانا کھا لیا۔۔آئیں میرے حصے کے رزق کی برکت بڑھائیں" اس نے ان کو دعوت دی تھی۔زارا نے دیکھا آنٹی چائے کا پانی چولہے پر رکھ رہی تھیں۔ٹیپو نے گرم پراٹھے کا ایک لقمہ بنایا تھا پھر اسے چٹنی میں ڈبو کر اپنی امی کے پاس چلا گیا تھا اور وہ لقمہ ان کے منہ کی جانب بڑھایا تھا۔زارا کو بہت اچھا لگا۔محبت کے یہ پرخلوص مظاہرے اس کی زندگی میں کم کم ہی آئے تھے۔

"ڈرامے بازیاں بہت آتی ہیں میرے لعل کو" آنٹی مسکرائی تھیں۔

"میری تعریفیں چھوڑیں۔۔۔اور یہ بتائیں کہ ڈاکٹر صاحبہ کی آؤ بھگت اچھے طریقے سے کی ہے نا آپ نے۔۔۔شہر والوں کو پتا چلنا چاہیئے کہ پنڈ والے کتنے مہمان نواز ہوتے ہیں" وہ اب رغبت سے کھانا کھانے لگا تھا۔

"تمہارے کام اتنی عجلت والے ہوتے ہیں کہ سب بھول جاتا ہے۔تم مجھے پہلے سے بتاتے تو میں کچھ اچھا بنا لیتی۔۔" آنٹی شرمندہ ہوئی تھیں۔

"کھانا اچھا نہیں تھا کیا۔۔۔آئی ایم سوری ڈاکٹر۔۔امی کو اچھا کھانا نہیں بنانا آتا۔۔انکے ہاتھ میں ذائقہ ذرا کم ہے" ٹیپو اپنی امی کو چڑا رہا تھا۔

"بکو مت۔۔میرے کہنے کا مطلب تھا کہ کوئی اچھی ڈش بنا لیتی۔۔۔بتاؤ مولی کے پراٹھے پر ٹرخا دیا بیچاری کو۔۔۔اور اس سے بھی بری بات یہ ہوئی کہ میں سمجھی یہ آمنہ ہے" وہ ساس پین میں دودھ ڈال رہی تھیں۔زارا کو لگا آمنہ کے ذکر پر ٹیپو کچھ چپ سا ہوا ہے۔

"آپ نے بتا دیا کہ آمنہ کون ہے" وہ گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔زارا کو محسوس ہوا اس کے تاثرات مصنوعی ہیں۔

"ارے مجھے بھی کہاں پتا ہے کہ آمنہ کون ہے۔۔زارا تمہیں پتا ہے کہ آمنہ کون ہے؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔زارا نے نفی میں سر ہلایا جبکہ ٹیپو اپنی امی کو چپ رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔زارا سوالیہ انداز میں آنٹی کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"امی اب کیا ساری باتیں باہر والوں کو بتا دیں گی۔۔۔راز کی باتیں چھپا کر رکھنے کی ہوتی ہیں" وہ ہنس بھی رہا تھا اور انہیں روک بھی رہا تھا۔زارا کو بہت حیرانی ہوئی۔وہ اس شخص سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

"چپ کرو۔۔جو گھر کے اندا آجاتا ہے۔۔وہ باہر والا نہیں ہوتا۔زارا میں تمہیں بتاتی ہوں سارا معاملہ کیا ہے۔۔۔دراصل میں جب بھی اس سے شادی کا ذکر کرتی ہوں تو یہ کہتا ہے۔۔آمنہ سے کروں گا۔۔آمنہ سے کروں گا اور جب میں کہتی ہوں مجھے آمنہ سے ملواؤ تو یہ بہانے بنانے لگتا ہے اور کہتا ہے آمنہ مان جائیگی تو ملواؤں گا۔وہ جب کہے گی تب اس کے گھر لے جاؤں گا۔۔۔آمنہ راضی ہوتی ہے نا یہ مجھے اس سے ملواتا ہے۔۔اسی لئے تمہیں دیکھ کر میں سمجھی شاید تم آمنہ ہو۔۔لیکن اب مجھے لگ رہا ہے یہ جھوٹ بولتا ہے مجھ سے۔۔آمنہ کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔یہ مجھے ٹالنے کے لئے کسی فرضی لڑکی کا ذکر کرتا رہتا ہے" وہ کافی چڑ کر بول رہی تھیں۔زارا نے سوالیہ انداز میں ٹپو کا چہرہ دیکھا۔آنٹی کپوں میں چائے انڈیلنے لگی تھیں۔

"کون ہے آمنہ؟" زارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔اسے خوشی اس بات کی تھی کہ ٹپو کی زندگی کا ایک ذاتی معاملہ اسے پتا چل رہا تھا۔

"اب مگروں پے جاؤ (پیچھے پڑ جاؤ)۔۔ایک پراٹھا تم کھا نہیں سکتی۔۔میرا دماغ پورا کھا جاتی ہو" وہ اس کے نامکمل پراٹھے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔زارا کا پیٹ بھر چکا تھا لیکن پراٹھا ابھی بھی تھوڑا سا باقی تھا۔

"بتائیں نا کون ہے آمنہ۔۔" زارا نے اس کی بات کو دھیان سے سنا ہی نہیں تھا۔

"امی کس کو میرے پیچھے لگا دیا۔۔اس کو نا بتایا تو اس نے رونے لگ جانا ہے" وہ اٹھ کر سنک پر ہاتھ دھونے لگا تھا پھر شیلف پر پڑے چائے کے کپ اٹھا کر دوبارہ اپنی جگہ پر آبیٹھا۔آنٹی سنک میں پڑے برتن دھونے لگی تھیں۔

"آمنہ ایک اچھی لڑکی ہے۔۔تمہارے جیسی۔۔۔اور کیا بتاؤں" اس کا چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"کیا کرتی ہے؟" زارا کو بڑا خوشگوار سا تجسس ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں کرتی۔۔میری طرح بونگیاں مارتی ہے اور بھیڑ بکریاں چراتی ہے" وہ مسکرا رہا تھا۔

"تم کس کی باتوں میں آگئی ہو زارا۔۔یہ جھوٹ بول رہا ہے۔۔مجھے یقین ہے آمنہ کوئی ہے ہی نہیں۔۔یہ سب بہانے ہیں اس کے" آنٹی نے اپنا چائے کا کپ اٹھایا تھا اور اسے اشارہ کیا تھا کہ اپنا کپ لے کر دوسرے کمرے میں آجائے۔ٹپو کچھ نہیں بولا تھا۔زارا سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ سچ بول رہا ہے یا اس کی امی۔۔۔آنٹی چونکہ باہر بلا رہی تھیں اس لئے وہ مزید کچھ کہے بنا اپنا کپ اٹھا کر ان کے پیچھے چل دی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ ساری زمین میری ہے۔۔۔" آنٹی رافعہ نے اپنے سامنے پھیلے تاحد نگاہ لہلہاتے کھیتوں کی جانب اشارہ کر کے اسے بتایا تھا۔

"یہ ساری۔۔۔؟" زارا حیران ہوئی۔اس کے خاندان میں دور دور تک کوئی گاؤں سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔اس نے صرف سن رکھا تھا کہ لوگوں کی ذاتی زرعی زمینیں بھی ہوتی ہیں اور آج وہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہی تھی۔ٹپو کھانا کھانے کے بعد چونکہ کہیں باہر نکل گیا تھا اب زارا اس کی منتظر تھی کہ وہ واپس آئے تو اسے واپس چھوڑ کر آئے۔شام ڈھل رہی تھی۔سورج کی تھکی تھکی کرنیں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اگلی منزل کی تیاری کر رہی تھیں اور جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی تھی وہاں تک صرف سبزہ ہی نظر آرہا تھا۔آنٹی اسے گھر سے باہر اپنا اسکول دکھانے لے جا رہی تھیں۔گھر کے پچھلی جانب سے گزرتے ہوئے انہوں نے اسے سرسری سے انداز میں بتایا تھا کہ یہ ساری زرعی زمین ان کی ہیں۔زارا نے سن رکھا تھا کہ یہ بہت فخر کا حوالہ ہوتا ہے لیکن آنٹی رافعہ نے قطعاً کسی فخر کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔آنٹی رافعہ سے مل کر اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔ان کی اپروچ بہت مثبت تھی حالانکہ انہوں نے بتایا

کہ وہ صرف تیس سال کی تھیں جب بیوہ ہوگئیں۔اس کے باوجود زارا نے ساری دوپہر ان کے منہ سے مختلف باتیں سنی تھیں لیکن ایک بھی دفعہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کی زندگی میں کبھی کوئی مشکل بھی آئی تھی۔وہ اپنی ذات کے متعلق بات ہی کم کرتی تھیں۔ان کی ساری گفتگو اپنے اسکول اپنے طلباء کے گرد گھومتی رہی اور زارا حیران تھی کہ وہ اس کام کا کریڈٹ بھی نہیں لیتی تھیں۔ابھی بھی ان کا انداز دیکھ کر زارا بہت متاثر ہوئی۔

"آپ بہت اچھی ہیں آنٹی۔۔۔آنٹی عاجزی میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی تھی" وہ یکدم چلتے چلتے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔آنٹی اس کے اس فعل سے حیران ہوئیں پھر انہوں نے سر ہلایا۔

"یہ کوئی خوبی نہیں ہے۔۔یہ میری خود غرضی ہے۔۔عاجزی انسان کی شخصیت کا سنگھار ہے۔۔اس کو اپنانے سے انسان خوبصورت لگنے لگتا ہے اور خوبصورت لگنے کا مجھے بڑا شوق ہے۔۔کیا کروں عورت ہوں نا" وہ اپنے بیٹے کی ہی ماں تھیں۔۔وہ دونوں دانائی کا مزاحیہ ورژن تھے۔زارا ان سے متاثر ہوئی جا رہی تھی۔

"آنٹی مجھے بھی خوبصورت ہونا ہے۔۔ایسا سنگھار کرنا مجھے بھی سکھا دیں" وہ انہی کے انداز میں بولی تھیں۔آنٹی نے اس کی جانب دیکھا۔

"تم تو پہلے ہی اتنی خوبصورت ہو۔۔۔اور مزید خوبصورت ہونے کے لئے اللہ نے مواقع بھی بے شمار دیئے ہیں۔۔۔تم مسیحا ہو۔۔۔مسیحائی کے ساتھ عاجزی تو گولڈ کو مہو ہے بھئی" وہ اتنی سی دیر میں زارا سے کافی بے تکلف ہو گئی تھیں۔وہ دونوں ایک گھر کے پاس رک گئی تھیں۔آنٹی نے ہاتھ میں پکڑی چابی سے دروازے پر لگا تالا کھول کر پورا دروازہ وا کر دیا تھا۔

"آنٹی میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔میں بھی ایسا کچھ کرنا چاہتی ہوں کہ آپ جیسی ہو جاؤں۔۔اچھی ہو جاؤں۔۔اپنی ممی کے لئے صدقہ جاریہ بن سکوں" وہ منت بھرے انداز میں بولی تھی۔آنٹی نے ایک جانب لگے سوئچ بورڈ کا بٹن دبا کر لائٹ آن کی تھی۔

"کیا تم اچھی نہیں ہو۔۔" وہ نجانے پوچھ رہی تھیں یا بتا رہی تھیں۔

"آنٹی اچھی ہوتی تو بے سکون کیوں ہوتی۔۔۔میرے دل کو چین نہیں آتا۔۔میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔۔۔میرے اردگرد والوں کے لئے میں ایک بیکار چیز کے سوا کچھ نہیں ہوں" وہ مغموم لہجے میں بولی تھی۔آنٹی رافعہ نے ناپسندیدگی سے اس کی جانب دیکھا۔

"زارا تم بھی بہت اچھی ہو۔۔فضول باتیں مت کرو۔۔۔مجھے تمہاری باتیں سن کر اندازہ ہوا ہے کہ تمہیں فراغت کی بیماری ہے جس کی بناء پر تم صرف اپنے آپ کے گرد چکر لگاتی رہتی ہو۔۔اپنی ذات کے جنگل سے باہر نکل کر دیکھو۔باہر آؤ اس خود ترسی سے۔۔۔مجھے زندگی میں صرف خود ترسی سے نفرت ہے۔۔یہ انسان کی ساری طاقت ساری توانائی کھا جاتی ہے۔۔بتاؤ سکون کیسے ملے گا۔ارے لڑکی ذاتی سکون تلاش نہیں کرنا پڑتا۔۔وہ اللہ نے انسان کے اندر کہیں چھپا کر رکھا ہوتا ہے۔تمہارا سکون تمہاری اپنی ذات میں کہیں مقید ہے۔۔تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم دوسروں کا سکون تلاش کرنے میں ان کی مدد کرو۔اپنے اردگرد بکھرے لوگوں کو دیکھو۔۔۔ان کے مسائل کو سنو۔۔ان کے دکھوں کو محسوس کرو۔۔۔۔اپنے بارے میں کم دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچو۔۔اپنی توانائیوں کو مثبت انداز میں استعمال کرو" انہوں نے ڈپٹ کر کہا تھا پھر ایک دم سے اسکی جانب مڑیں۔

"تم میں بہت انرجی ہے۔۔۔تم اس کو سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی ہو۔۔۔اب یہ چھلکنے لگی ہے۔۔۔یہ جو تمہارا ڈپریشن ہے نا یہ اسی بناء پر ہے کہ ہم میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ انرجی ضائع ہو رہی ہے۔۔۔انسان کی انرجی ضائع ہوگی تو اس کا دل تو دکھے گا نا۔۔۔کب تک

دیکھے گا۔۔جاگ جاؤ۔۔کوئی اور تھوڑی آئیگا تمہاری مدد کرنے کو۔۔تمہیں خود ہی ہمت کرنی ہوگی" وہ نصیحت بھی کتنے اچھے انداز میں کرتی تھیں۔

"فرض کرو زارا اگر چڑیا کو راستہ دکھانے کے لئے جگنو نہیں ملتا تو کیا وہ گم ہو جاتی۔۔۔رستہ تلاش نا کر پاتی؟" انہوں نے ایک عجیب سا سوال کیا تھا۔

"نہیں۔۔۔وہ بھی گم نا ہوتی۔۔۔اس کو چند لمحوں بعد خود بخود تاریکی میں نظر آنے لگتا۔۔۔اس کی حیات تاریکی کو شکست دینے کے قابل ہو جاتیں۔۔راستہ خود بخود نظر آجاتا۔۔۔یہی قانونِ قدرت ہے۔۔جگنو کا انتظار مت کرو بچے۔۔جگنو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوا کرتے" وہ بے حد سنجیدہ مگر محبت بھرے انداز میں سمجھا رہی تھیں۔۔زارا چپ چاپ ان کے پیچھے چلتے ہوئے ان کی جانب دیکھنے لگی۔

"جگنو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتے۔۔۔میں اگر آپ سے نا ملی ہوتی تو ایسے ہی سوچتی۔۔۔" وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بھی سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے" زارا نے واپسی پر ٹیپو سے کہا تھا۔رات اتری نہیں تھی مگر اترنے والی تھی۔موسم گرم تھا مگر شام کی اپنی نرم و نازک مسحور کر دینے والی ادائیں تھیں۔ہوا بہت تیز نہیں چل رہی تھی لیکن جو بھی جھونکا آتا تھا مایوس نہیں کرتا تھا۔زارا کھڑکی کے شیشے سے بھی باہر دیکھ رہی تھی اور ونڈ اسکرین سے بھی سامنے نظر ڈالتی جاتی تھی۔اس کو آج پھر ایک نئی امید کے انجیکشن لگے تھے۔وہ مطمئن تھی۔اس نے عزم مصمم کر لیا تھا اور اس پر قائم بھی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔۔۔میں رات کو شکرانے کے نوافل ضرور ادا کروں گا۔تم بھی کر لینا" ٹیپو کا انداز ہمیشہ کی طرح چڑا دینے والا تھا۔

"آپ میرے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ دیں گے۔۔۔میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانا چاہتی ہوں۔۔۔اپنے علاقے میں کوئی چھوٹا اچھا گھر ڈھونڈ دیں گے نا آپ۔۔۔لیب اور فارمیسی بھی وہیں بناؤں گی" وہ اس سے درخواست کر رہی تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ یہ آئیڈیا فیزیبل ہے۔۔۔کلینک بنانا بے شک دنوں کا کام ہے لیکن اسے چلانا سالوں کا کام ہوتا ہے۔۔آپ تو سال چھ مہینے میں رخصت ہو جائیں گی شہروز میاں کے سنگ۔۔۔اس کے بعد میں یا میری امی اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سنبھال سکیں گے میڈم" وہ اب کی بار سنجیدہ تھا۔

"آپ ہمیشہ نصیحتوں کی دوکان نا کھول کر بیٹھے رہا کریں۔۔۔بوریت ہونے لگتی ہے۔۔کوئی اچھی بات کریں۔۔آپ کی گاڑی میں کوئی ببل گم وغیرہ یا چپس کا پیکٹ نہیں ہوتا۔۔شہروز تو ہمیشہ چاکلیٹ رکھتا ہے"

زارا سنجیدہ نہیں تھی۔اس نے پسنجر سیٹ والا چیمبر کھولتے ہوئے غیر سنجیدہ انداز میں کہا تھا۔

"میں آئندہ دھیان رکھوں گا جی۔۔کون سی چاکلیٹ پسند ہے محترمہ کو" وہ شاید ابھی کچھ اور بھی کہتا لیکن چیمبر کے کھلتے ہی کچھ کاغذات اس کی گود میں آگرے تھے۔

"عہدِ الست" زارا نے نمایاں کر کے لکھا یہ لفظ پڑھا تھا۔ٹیپو نے اس کی جانب دیکھا،وہ اسے ہی سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے نور محمد سے ملنا ہے" میں نے سوالیہ انداز میں اپنی جانب دیکھتے اس شخص کو جواب دیا تھا۔
یہ لوٹن کی جامعہ مسجد تھی جہاں آنے سے پہلے میں نے بہت سوچا تھا اور ہر بار میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ مجھے اس شخص سے ملنا ہی تھا۔ یہ 2006 کے ابتدائی مہینوں کی بات تھی۔
بہار کے خوشنما رنگ ہر جانب بکھرے تھے۔ لندن شہر بہار کو بہت محبت سے منانے کا عادی رہا ہے اور لندنر ہونے کی وجہ سے میں نے ہمیشہ بہار کا استقبال خوشدلی سے کیا تھا لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے میں نے ہر چیز سے کنارا کرلیا ہوا تھا۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے یو پی ایل کی بتائی ہوئی تمام تر تفصیل کی روشنی میں کام کر رہا تھا۔ میں نے میں اپنا آخری ناول لکھنا چاہتا تھا اور یہی ناول دراصل میرا پہلا ناول بھی تھا۔
میں نے لوٹن میں ایک گھر لیا تھا اور اپنی تمام ضروری اشیاء وہاں منتقل کرلی تھیں۔ جامعہ مسجد میں باقاعدہ داخل ہونے سے بھی پہلے میں کئی روز تک باہر جائزہ لیتا رہا تھا۔ میرے دل میں کشمکش جاری تھی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے اس مسجد کے اندر جانا ہی تھا۔
"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ" اس شخص نے مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اس سوال کی توقع تھی اور میں اس کا جواب تیار کر کے لایا تھا لیکن مجھے جواب دینے میں وقت لگ رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی گہری سانس بھری۔ یہ عام عبادت گاہوں جیسی عبادت گاہ تھی۔ میں نے زندگی میں پہلے بھی چند ایک مساجد دیکھ رکھی تھیں۔ یہاں کا انٹیریر بھی انہی مساجد جیسا سادہ تھا لیکن لوٹن کی مسجد میں مجھے بے سکونی کا جو احساس ہو رہا تھا وہ پہلے کہیں اور نہیں ہوا تھا حالانکہ عیا کے ساتھ میں نے بہت سے ٹیمپلز دیکھے تھے۔ ہم نے اسپین اور سری لنکا میں بھی مسلمانوں کی مساجد اور بدھسٹ کی پرانی عبادت گاہیں دیکھی تھیں۔ ہمیں وہاں جا کر اچھا لگتا تھا لیکن آج جو بے چینی دل کو لاحق تھی وہ ایک نیا تجربہ تھا۔
"کیا کام ہے آپ کو نور محمد سے؟" اس شخص نے مجھے مسلسل خاموش پا کر دوسرا سوال کیا تھا۔ میں نے غائب دماغی سے اسکی جانب دیکھا۔ میں جو سوچ کر آیا تھا مجھے وہی کرنا تھا۔ میرے تذبذب کا میرے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اپنے فیصلے پر قائم تھا لیکن میرا دل بے چین تھا اور اس کی وجہ مجھے سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں یہاں آنے سے پہلے سارا ہوم ورک کر کے مسجد میں آیا تھا جو مسلمانوں کی عبادت گاہ تھی۔۔۔ دہشت گردوں کی آماجگاہ۔۔ یہاں دنیا کو برباد کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔۔ دنیا جن بھوتوں سے زیادہ ان سے خوف کھاتی تھی۔ کیا میں نے یہاں آکر کوئی غلطی تو نہیں کرلی تھی۔ میری حقیقت جان کر یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن میں پھر بھی یہاں موجود تھا۔
"یہ مسجد ہے۔۔ اللہ کا گھر۔۔ اللہ سبحان تعالیٰ!۔ آپ (اللہ) سے میری کوئی پہچان نہیں ہے۔ میں آپ کو نہیں جانتا لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو آپ کو نہیں جانتے کیا آپ بھی ان کو نہیں جانتے" میں نے دل میں پھر دہرایا تھا۔ یہ بات میں ایک عرصے سے خود کو باور کروا رہا تھا۔ میں اس بات کا منکر نہیں تھا کہ دنیا کو چلانے والی ایک عظیم مقدس طاقت ہے۔ میں قدرت کا معترف تھا۔ میں اس کے کسی اصول سے انحراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی مذہب کے خلاف شرانگیزی پھیلانے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن کسی مذہب کے نام پر دنیا میں دہشت پھیلانے کا حق بھی کسی کو نہیں تھا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں اس غلاظت کو بے نقاب کرسکوں جو دنیا کو کسی مذہب کے نام پر دہشت اور خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ میں نے ایک اور گہری سانس بھری۔

"میں تو مسلم ہوں" میں نے کہہ دیا تھا۔ یہ ایک بہت اونچی چوٹی سے گہری کھائی میں چھلانگ لگانے کے مترادف تھا اور میں نے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس شخص کے چہرے پر مروت والی مسکراہٹ محبت والی مسکراہٹ میں بدلی۔

"ماشاءاللہ۔۔۔۔ بہت مبارک ہو آپ کو"

"میرا نام احمد معروف ہے۔۔ میں اسلام کے بارے میں کتابوں میں پڑھ چکا ہوں لیکن میں اب باقاعدہ دین کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسی سلسلے میں نور محمد صاحب سے ملاقات کا خواہشمند ہوں" میں نے وہ کہہ دیا جو میں نے کہنا تھا۔ وہ شخص بے تحاشا خوش ہوا تھا۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں لیکن میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ نور محمد کی بجائے استقلال بیگ سے ملئے۔ وہ زیادہ قابل اور عالم ہیں۔ ان کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے لیکن وہ انگلش پر عبور رکھتے ہیں۔ وہ نور محمد کی نسبت آپ کی زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔ میرے سامنے بیٹھے شخص نے مخلص انداز میں کہا تھا

"نہیں۔۔۔" میں نے قطعیت سے انکار کیا پھر ان کے چہرے پر پھیلا تحیر دیکھ کر میں نے مزید کہا تھا۔

"مجھے نور محمد سے ہی ملنا ہے۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بہت خوش الحان ہیں۔۔ وہ بہت اچھا قرآن پڑھتے ہیں۔۔ میں نے انکی تعریف سن رکھی ہے" میں نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا کہ کہیں وہ شخص مجھے نور محمد کے علاوہ کسی اور کے پاس نا بھیج دے۔ اس شخص نے سر ہلایا۔

"میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔۔۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ نور محمد زیادہ ملنسار انسان نہیں ہے۔ وہ ہر شخص سے ملنا پسند نہیں کرتا"

"آپ مجھے ایک بار ملوا دیجئے۔۔ میں ان سے خود بات کرلوں گا۔۔ میں ان کو رضامند کرلوں گا" میں نے منت کی تھی۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔۔۔ ابھی وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ اگلی نماز کے لئے آئیں گے تو میں بات کر کے دیکھوں گا" انہوں نے مجھے کہا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔



اور یہ 2006 کی ہی بات تھی جب مجھے نور محمد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس کو دیکھ کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سلگتے عزائم پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے رک کر دیکھنے دوسری نظر ڈالنے یا مخاطب کرنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی۔ انسان سینما میں بیٹھ کر پاپ کارن بیچنے والے کو اس سے زیادہ غور سے دیکھ لیتا ہے اور میرے معزز دوست اسے جادوگر کہہ رہے تھے۔ پہلی بار وہ مجھے ڈھیلی سی جینز اپنے وجود سے ذرا بڑا اپل اوور پہنے مسجد میں گھومتا نظر آیا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ وہ خوش الحان تھا۔ وہ اذان کے نام پر جو کلمات ادا کرتا تھا وہ مسحور کن لگتے تھے۔ میں نے اسے قرآن۔ پاک پڑھتے بھی سنا اور مجھے اس کی آواز کے علاوہ اس کی شخصیت میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں لگا تھا۔ میں چاہ کر بھی اس میں وہ سب تلاش کرتا رہا جس کا مسٹر ٹیرن تذکرہ کرتے رہے تھے۔ دہشت گرد کو دہشت کی علامت ہونا چاہیئے لیکن وہ شخص بہت معصوم اور بیچارہ سا لگتا تھا کیا وہ بہت بڑا اداکار تھا۔ میں اس کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچتا رہتا کیونکہ اس نے مجھ سے ملنے سے ابتدا میں ہی انکار کر دیا تھا۔ نظیر اختر

جن سے پہلے دن میری بات ہوئی تھی انہوں نے مجھے محبت سے سمجھایا تھا کہ میں کسی کے رویے سے دل برداشتہ نا ہوں اور وہ نور محمد کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ میں مسلسل مسجد جاتا رہا اور اسکی حرکات و سکنات پر غور کرتا رہا۔ میں نے مسجد کے بے حد قریب گھر لیا تھا اور اپنی بہت سی کتابیں اور اپنے پراجیکٹ سے متعلقہ تمام مواد وہاں منتقل کر لیا تھا۔ انہوں نے اس کو نجانے کیسے سمجھایا میں نہیں جانتا لیکن کچھ دن بعد میں اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے۔۔۔ میں آپ کو نہیں جانتا" ۔اس نے نیچی نگاہوں اور ہکلاتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

یہ تھا وہ پہلا جملہ جو اس شخص نے مجھ سے کہا تھا اور میں اسکا انداز دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ وہ آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کی آواز حلق سے رک رک کر نکلتی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں کو سیکنڈ کی سوئی کے حساب سے چٹخاتا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج ایسی تھی کہ اس پر ترس آتا تھا۔ وہ کس چیز سے خوفزدہ تھا۔ وہ دہشت گرد تھا۔ وہ دہشت گرد تھا۔ جو باقی دنیا کے لئے دہشت کی علامت تھا وہ خود مجھ سے دہشت زدہ تھا۔ میں ایک دہشت گرد کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ کیسے کوئی عام واقعہ ہو سکتا ہے لیکن میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے گھٹنوں میں منہ دے کر زور زور سے چیخیں ماروں۔

"کیا دہشت گرد ایسے ہوتے ہیں؟" میرے ذہن میں ایک ہی سوال کی گردش تھی۔ وہ مجھ سے لگ بھگ بیس سال چھوٹا تو ہوگا۔ وہ ایک ڈرا ہوا جھجکا ہوا انسان تھا جو بات کرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ انتہائی کم گو تھا۔ اپنی مرضی سے بات کرنا پسند کرتا تھا اور وقفہ دے دے کر جملہ مکمل کرتا تھا۔ وہ ایک جملہ بولتا تھا اور پھر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بات کو سمجھنے کے لئے لگ بھگ دس منٹ درکار ہوتے تھے۔ یہ تھی میری نور محمد سے پہلی ملاقات جس نے مجھے انتہائی مایوس کیا تھا۔ اس کے باوجود کوئی تحریک تھی جو مجھے کہتی تھی کہ جو کام کرنے آئے ہو اسے نامکمل مت چھوڑنا ورنہ خود نامکمل رہ جاؤ گے۔

"مجھے کسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے" اسے ٹس سے مس نا ہوتا دیکھ کر میں نے آخری حربہ آزمایا تھا۔ خضر الٰہی کس کا نام تھا میں نہیں جانتا تھا لیکن مسٹر ٹیرن کے منہ سے میں نے سنا تھا کہ نور محمد کو الوشن ہوتے تھے اور وہ کہا کرتا تھا کہ اس کا ایک دوست ہے جس کا نام خضر الٰہی ہے۔ میں نے اسی لئے خضر الٰہی کا ذکر کرنے کا سوچا تھا۔

"خضر الٰہی نے" نور محمد کے چہرے پر جیسے بجلیاں چمکنے لگی تھیں۔ وہ حیران ہوا تھا۔

نور محمد نے یہ نام سن کر میری مدد کرنے کی حامی بھر لی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ نام استعمال کر کے اسے رضامند کر لوں گا۔

☆ ☆ ☆

"کیا دین میں نماز اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہے؟" یہ تھا وہ پہلا سوال جو میں نے ایک دن نور محمد سے پوچھا تھا۔ وہ میری بات سن کر میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ایک دم سے اپنا موقف بیان نہیں کر پاتا تھا اور اس کی وجہ اس کی لاعلمی نہیں بلکہ اس کی شخصیت میں اعتماد کا فقدان تھا۔ نور محمد کی قربت حاصل کرنے کے لئے میں نے اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ ابتداء میں جتنا خشک اور تنگ مزاج لگتا تھا وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ بے تکلف ہونے لگا۔ اس کے پاس علم تو تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا اور اس کو فقہ پر بھی عبور تھا۔ وہ احادیث وسنت کے متعلق بھی مکمل آگاہی رکھتا تھا۔ ایک بات میں نے ابتداء میں ہی تسلیم کر لی تھی کہ وہ بے حد ذہین آدمی تھا۔ اس کے اندر نئی چیزوں کو سیکھنے کی صلاحیت تو تھی لیکن نئی

چیزوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یہ میری اب تک اس کے بارے میں ایک رائے تھی جو بدلنے جا رہی تھی۔

"میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ قرآن میں تو زندگی گزارنے کے سنہرے اصول ہیں رہنمائی ہے۔۔۔ اس کو پڑھنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ۔۔۔ نماز کا اس قدر حکم کیوں ہے۔۔۔" میں نے اس کے تاثرات دیکھ کر فوراً وضاحت کی تھی۔

میرے سوال پر وہ چند لمحے میرا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے جو جواب دیا اس نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے۔۔۔

"میں اگر یہ کہوں کہ نماز ہم اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے پڑھتے ہیں تو آپ کی تشفی نہیں ہوگی۔۔۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوتے رہیں گے۔۔ میں بھی پہلے حیران ہوتا تھا کہ نماز کی پابندی کا اتنا حکم کیوں ہے۔۔ یہ کیوں چند حالتوں کو چھوڑ کر کسی حالت میں معاف نہیں ہے اور ہمارے نماز پڑھنے سے ایسا کونسا جادوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کریم نے نماز کو اس قدر ضروری کیوں قرار دیا ہے۔۔۔ جب میں نے جانچنا شروع کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نماز کی پابندی روح کو طاقت فراہم کرنے کا عمل ہے ہمارے جسم کی طرح ہماری روح کا بھی ایک مدافعتی نظام ہے۔ نماز اس مدافعتی نظام کو فعال اور متحرک رکھتی ہے۔ میں اب آپ کو اس کا میکنزم سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔ دراصل انسان کا ضمیر اس روحانی مدافعتی نظام کا الارم ہے۔ نماز اس الارم کو کمزور نہیں ہونے دیتی اس کو ختم نہیں دیتی۔۔۔ یعنی نماز ہمارے اس الارم کو مکمل چارج کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس طرح جسمانی مدافعتی نظام کی حفاظت نہ کی جائے تو جراثیم حملہ کر دیتے ہیں انسان بیمار ہو جاتا ہے۔۔۔ اسی طرح روحانی مدافعتی نظام سے لاپرواہی برتنے پر روح کو بھی کیڑا لگ سکتا ہے اس کیڑے کا نام شیطان ہے۔۔۔ شیطان کی طاقت کے متعلق کبھی کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔ وہ ہمہ وقت ایسے جرثومے یا برائی انسان کی جانب پھینکتا رہتا ہے جو اسے روحانی طور پر بیمار اور لاچار کر سکتے ہیں۔ ہم ہمہ وقت ان جرثوموں کی زد پر ہوتے ہیں اور ہر برائی سے بچ کر اور ہر نیک عمل کر کے ہم اپنے اس نظام کو مضبوط رکھ سکتے ہیں۔۔ نماز کو ترک کرنے سے یا پابندی نہ کرنے سے ضمیر ان جرثوموں کا شکار سب سے پہلے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ضمیر کمزور ہو جاتا ہے اور اسکی مزاحمت کی طاقت کم ہونے لگتی ہے۔ وہ آپ کو برائی کے متعلق وارن کرنے کی اپنی قدرت صلاحیت کھونے لگتا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ برائی وہ ہے جو انسان کے دل میں کھٹکا پیدا کرے اور یہ کھٹکا دراصل ضمیر پیدا کرتا ہے روح مضبوط ہوگی تو اس کا الارم ٹھیک کام کرے گا ورنہ اچھائی اور برائی میں تخصیص کرنے کی قدرتی صلاحیت جو اللہ نے اسے پیدائشی طور پر عطا کی ہوتی ہے وہ دھیرے دھیرے کم اور پھر ختم ہونے لگتی ہے۔ اچھائی اور برائی کا فرق مٹنے لگتا ہے۔ انسان کفر کے رستے کی جانب مائل ہو سکتا ہے۔ اس لئے روح کو ابلیسی جرثوموں یا برائی سے بچنے کے لئے انتہائی طاقتور ملٹی وٹامن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اسکے مدافعتی نظام کو مضبوط رکھ سکیں۔"

نور محمد کی یہ ایک حیرت انگیز وضاحت تھی جس نے مجھے یہ باور کروایا کہ وہ ذہانت میں بے مثال ہے۔

"اللہ نے یہ ملٹی وٹامن ہمارے لئے پہلے سے تجویز کر کے رکھا ہے۔۔۔ پانچ گولی دن میں پانچ مرتبہ پانی کے ساتھ۔۔۔ پابندی کے ساتھ ۔۔۔ تاکہ یہ سارا میکنزم متحرک رہے۔۔ نماز کی پابندی روح کو کمزور نہیں ہونے دیتی۔۔ اس کے امیون سسٹم کو طاقت فراہم کرتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ مکمل نیت اور خود سپردگی سے نماز ادا کی جائے۔ ظاہر ہے جتنا اچھا ملٹی وٹامن ہوگا اتنا اچھا امیون سسٹم ہوگا۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے بھی صرف اپنی انگلیاں ہی چٹخا رہا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

یہ تھا وہ نور محمد جو خود دہشت گرد تھا اور جس نے مجھے دہشت گردی کے اس دائرے میں داخل ہو کر بالا آخر اس کو سمجھنے میں مدد دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہم مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ نور محمد نے مجھے اپنے بارے میں سب بتانا شروع کر دیا۔ وہ بہت تلخ ماضی کو بوجھ اٹھائے پھرتا تھا میرے رویے سے متاثر ہو کر اس نے میرے ساتھ وہ بوجھ بانٹنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بھی چند ایک باتوں کے علاوہ سب سچ بتا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

2007 کی ابتداء میں نور محمد میرے ساتھ میرے گھر میں منتقل ہو گیا۔ میں زندگی میں اتنا پرسکون پہلے کبھی نہیں ہوا تھا جتنا ان دنوں تھا۔ زندگی میں بالا آخر سب کچھ ٹھیک ہونے والا تھا۔ میں ہر روز لکھنے کا شغل جاری رکھتا اور دل کو بہلاتا رہتا کہ میں یہ سب صرف اپنی ذات کے لئے نہیں کر رہا۔ مجھے پہلی بار انسانیت کے لئے کچھ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان دنوں دو عجیب باتیں ہوئیں۔

مسٹر میرن نے خودکشی کر لی۔ وہ یو پی ایل کے اس گروپ کے ایسی موت مرنے والے آخری ممبر تھے جو مجھ سے اس ناول پر کام کروانے کے لئے آتے رہے تھے۔ پہلے تین لوگ ایک کار ایکسیڈینٹ میں مر گئے تھے۔ مسٹر میرن نے خودکشی کر لی اور مسٹر ولسن کو کینسر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کو امید تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے کیونکہ ان کا کینسر ابتدائی اسٹیج پر تھا لیکن جانے کیسے وہ کیموتھراپی کے سائیڈ افیکٹس برداشت نہیں کر پائے تھے۔ ان سب لوگوں کی ایسی اندوہناک اموات نے مجھے اس ناول پر مسلسل کام کرنے کے لئے مزید متحرک کیا یو پی ایل ان دنوں کافی غیر فعال ہو گئی تھی۔ اس کے ممبرز کی تعداد کم ہونے لگی تھی لیکن مجھے اب کسی کی معاونت کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ میں اب کسی چیز سے خائف نہیں تھا کوئی چیز مجھے میرے عزم سے یا ارادے سے متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری عجیب بات کا نام سلمان حیدر تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں پاکستان جانا چاہتا ہوں" نور محمد نے کہا تھا۔ ہم چہل قدمی کی غرض سے ہر روز باہر نکلتے تھے۔ اس روز بھی ہم سٹی سینٹر تک کا چکر لگا کر واپس آ رہے تھے جب نور محمد نے کہا۔

"میں انہیں کچھ پوسٹ کارڈز پوسٹ کر دوں۔۔۔ انہیں اچھا لگے گا۔۔۔ اتنے سال ہو گئے میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔۔۔ میرے پاس ایڈریس لکھا ہوا ہے" وہ پوسٹ آفس کی جانب جاتے ہوئے خود ہی باتیں کر رہا تھا۔ میں اس کی خوشی میں خوش تھا۔ پوسٹ آفس میں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔ وہ کاؤنٹر پر موجود خاتون سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

وہ اس ادھیڑ عمر خاتون کی تعریف میں کچھ کہہ رہا تھا جبکہ وہ ہنسنے میں مصروف تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ شخص پیچھے ہٹ گیا تھا نور محمد پوسٹ کارڈز دیکھنے لگا جبکہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ شخص ہماری جانب دیکھنے میں مگن تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت بہت نامناسب لگی۔ نور محمد کو کارڈز پسند نہیں آ رہے تھے اس لئے ہم کچھ بھی پوسٹ کئے بناء باہر آ گئے۔ چند لمحوں بعد میں نے اس شخص کو اپنے عقب میں آتے دیکھا۔ وہ بھوری رنگت کا دبلا پتلا ایشین تھا۔ وہ نور محمد کی جانب متوجہ تھا۔

"معاف کیجئے گا۔۔۔میں۔۔۔میں آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔مجھے یاد نہیں آرہا" وہ نور محمد کو گہری نگاہوں سے تکنے میں مگن کہہ رہا تھا۔ میں نے نور محمد کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ جیسے وہ اس شخص کو پہچان چکا ہے۔

"تم سلمان حیدر ہو نا" نور محمد نے کہا تھا۔ اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نور محمد ہوں" نور محمد نے کہا تھا۔ وہ شخص پہلے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اسے یاد آ گیا تھا

"ہاں۔۔۔نور محمد۔۔۔پروفیسر آفاق کے بیٹے۔۔۔ہے نا۔۔۔؟" وہ ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میں ایک صحافی ہوں۔۔۔میں ابزیرو انگلش کے لئے کام کرتا ہوں۔۔۔یہاں آج کل ایک شارٹ کورس کے لئے آیا ہوا ہوں۔" سلاد کے باؤل کو اپنے سامنے کرتے ہوئے وہ اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ سادہ سے انداز میں بات کرتا تھا اسکی ظاہری شخصیت میں کوئی ایسا اسپارک نہیں تھا لیکن اس کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ عام نوجوانوں جیسا ایک جوان آدمی تھا۔ یہ میری اس کے بارے میں پہلی رائے تھی۔ وہ نور محمد کی دعوت پر ہمارے گھر آ گیا تھا۔ مجھے نور محمد کے رویے نے خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا۔ وہ اس شخص سے مل کر بے پناہ خوش تھا۔ یہ بات مجھے سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے اور ایک اسکول میں پڑھتے رہے تھے۔ نور محمد نے اس کے لئے بہت شوق سے ایک پر اہتمام کھانا تیار کیا تھا جسے کھانے کے لئے ہم اب میز پر موجود تھے۔

"تمہارے بارے میں ہمیشہ میں یہی سوچتا تھا کہ تم بہت کامیاب انسان بنو گے" نور محمد نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے اتنا سوچتے تھے تم میرے بارے میں۔۔۔اتنا تو میری امی بھی نہیں سوچتیں میرے بارے میں۔۔۔" وہ کانٹے سے آئس برگ کے سبز پتے ٹونگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔۔۔

"میں تمہارے جانے کے بعد بھی تمہیں یاد کیا کرتا تھا۔" نور محمد بولا تھا۔ اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ بس اپنے دوست کو دیکھنے میں مگن تھا۔

"تمہیں باؤلنگ کرنی آئی کہ نہیں آئی۔۔۔ابھی بھی بال کو ہیئر برش کی طرح پکڑتے ہو کیا" وہ شاید اسے چڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں نے دوبارہ کبھی کرکٹ نہیں کھیلی۔۔۔دوبارہ بال کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کبھی" نور محمد نے اپنے مخصوص سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ وہ سلمان حیدر سے جتنی باتیں کر رہا تھا اتنی باتیں میں نے اسے کسی سے کرتے نہیں سنا تھا۔

"تم اس معاملے میں بہت نکمے تھے۔۔۔تمہیں کرکٹ پر ایک اچھے سبق کی ضرورت تھی" سلمان نے باؤل سے پاستا اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے کہا تھا۔ نور محمد کے چہرے کی سادہ سی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"سبق تو مل گیا تھا۔۔۔اچھا۔۔۔مزید کی حاجت ہی نہیں رہی تھی" سلمان نے یکدم اپنی پلیٹ سے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ ہم تینوں یکدم چپ ہو گئے تھے۔ سلمان حیدر کا مجھے نہیں پتا لیکن میں اس بات سے آگاہ تھا کہ نور محمد کی پٹائی کرکٹ کھیلنے پر بھی ہوا کرتی تھی۔

" میں تم سے بہت جھگڑا کیا کرتا تھا نا۔۔۔ میں بچپن میں زیادہ سمجھدار نہیں ہوا کرتا تھا۔۔۔ لیکن اب میں ویسا نہیں رہا۔۔۔ میں اب تمہیں کرکٹ کھیلنا سکھا سکتا ہوں۔۔۔ شرط وہی ہے۔۔۔ بیٹ تمہیں خود لانا ہوگا" سلمان نے فورک میں پاستا پھنساتے ہوئے بے تکلف انداز میں کہا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی وہ اچھا ہنس مکھ انسان تھا۔

" میں بھی اب ویسا نہیں رہا۔۔۔" نور محمد نے اتنا ہی کہا تھا۔ میں نے چکن فلے والی ٹرے سلمان حیدر کی جانب بڑھائی۔ اس نے ایک فلے اٹھا لیا تھا۔ نور محمد خاموشی سے کافی بنانے کے لئے اٹھ گیا تھا۔

" آپ کا نیا ناول کب آ رہا ہے مارکیٹ میں" اس کے جانے کے بعد سلمان حیدر نے یکدم پوچھا تھا۔ میں چونک کر اسکا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے آدھی عمر کا تھا لیکن اس لمحہ وہ مجھے اپنے آپ سے زیادہ چالاک محسوس ہوا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا تو اس نے ظاہر کیوں نہیں کیا تھا اور اگر نہیں پہچانتا تھا تو اسے میرے نئے ناول کی سن گن کس سے ملی تھی۔ میں تو عوامی طور پر اعلان کر چکا تھا کہ میں لکھنا چھوڑ چکا ہوں اور میرے حالیہ پراجیکٹ کا میرے چند قریبی لوگوں کے علاوہ صرف یو پی ایل کی منتظمین کو پتا تھا۔

" کیا نام ہے اس ناول کا" وہ ابھی بھی فورک اور پاستا میں مگن لگتا تھا لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ وہ پیٹ میں داڑھی لے کر پھرنے والا انسان ہے۔

" عہد الست" میری زبان سے پھسلا تھا۔

" عہد الست۔۔۔" اس نے دوہرایا پھر میری جانب جھکا تھا۔

" کیا ہے اس کتاب میں۔۔۔؟" وہ میرے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے الجھن ہوئی۔

" آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے سنجیدگی سے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ میں اس سے عمر میں دوگنا تھا۔ اسے مجھ سے اس انداز میں سوال کرنے کا حق نہیں تھا۔

" میں صحافی ہوں سر۔ سوال پوچھتا ہوں تو رزق آتا ہے۔۔۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ معذرت خواہ ہوں اگر آپکو برا لگا تو" وہ دوبارہ پلیٹ کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس لمحے نجانے کیسے میرے دل نے اشارہ دیا کہ مجھے ایک رازدان کی ضرورت ہے۔ وہ شخص بیوقوف نہیں لگتا تھا۔ وہ وقت پڑنے پر میری مدد کر سکتا تھا۔ مجھے کسی کی مدد تو چاہیئے تھی۔

" عہد الست میری اور نور محمد کی کہانی ہے۔۔۔" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ اسکی مسکراہٹ مجھے اس کے سوال سے بھی زیادہ بری لگی۔

" آپ یوں کہیئے نا یہ حق اور باطل کی کہانی ہے۔۔۔" وہ پھر مسکرایا تھا۔ میں نے تلخی بھرے انداز میں اپنا فورک پلیٹ میں رکھ دیا۔

" ایسا نہیں ہے۔۔۔ میں سوالوں سے چڑ کر آپ کی بات مان نہیں سکتا۔ میں باطل نہیں ہوں۔" میں اب کی بار بہت تحمل سے بولا تھا۔

" میں نے کب کہا آپ باطل ہیں۔۔۔ میں نور محمد کو باطل سمجھ رہا ہوں" وہ چڑانے میں ماہر تھا۔

" وہ بھی باطل نہیں ہے" میں حیران سا ہوا تھا۔

" سر کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ مانتے ہیں وہ ایک جہادی تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔۔۔ وہ " المہاجرون" کے لئے کام کر رہا ہے" وہ دھیمی سی

آواز میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ یہ کوئی اور ہی معمہ تھا جو مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کون تھا۔ وہ کس کے لئے کام کر رہا تھا۔ کیا وہ واقعی اس کا دوست ہے یا اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔

"میں نور محمد کو آپ سے بہتر جانتا ہوں" میں نے کہا تھا۔

"کیسے۔۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس بھری۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ اس روز کی بات تھی جب میں بلیک برن گیا تھا۔ بیا کی خودکشی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ بلیک برن کے یوگا سینٹر میں ایک لیکچر ہو رہا تھا جو سکون کی تلاش کے موضوع پر تھا لیکن جس نے مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں ہال سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا پھر میں وہیں باہر بیٹھ گیا تھا۔ میں لیکچر ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے ان سکالر سے دوبارہ ملنا تھا۔ مجھے ان سے کچھ سوالوں کے جوابات پوچھنے تھے۔۔۔

"کیا مذہب ہر مسئلہ حل کر دیتا ہے۔ میں اگر یہ مان لوں کہ ہر بچہ دنیا میں آنے سے قبل خدا سے ایک عہد کر کے آتا ہے تو کیا میں پرسکون ہو جاؤں گا۔ کیا رب کو رب مان لینے سے انسان کو سکون مل جاتا ہے؟"

جب ہال میں سے سب اٹھ کر چل دیئے تو میں نے سوال کیا تھا۔ ہال میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میرا اشارہ اس قرآن کی آیت کی طرف تھا جو اس لیکچر کی ابتداء میں تلاوت کی گئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہم مسلمانوں کا تو یہی عقیدہ ہے" انہوں نے سر ہلایا تھا۔ ان کے جواب نے مجھے مایوس کیا تھا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عہد الست کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب پیدائشی مسلمان ہیں؟ میں اپنی ناگواری چھپا نہیں پایا تھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ آپ اپنا لہجہ درست کر لیجئے۔ مسلمان ہونا کوئی گالی نہیں ہے۔" انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ میں شرمندہ ہوا۔ میرا لہجہ واقعی کچھ غیر مناسب ہو گیا تھا۔ میں حاجت مند تھا اور حاجت مند کو سر جھکا کر بات کرنی چاہیئے۔

"میں گالی نہیں دے رہا لیکن میں مذہب کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برا مت مانیئے گا لیکن میں کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ میں سکون کی تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے صدیوں پرانی باتیں نہیں سننی۔ یہ میرے لئے اینٹی بائیوٹک کی طرح ہیں جو ایک مدت کے استعمال کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ یہ سیشن سکون کے موضوع پر تھا جو مجھے نہیں ملا۔ آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ انسان کو سکون کے لئے ایک کندھا چاہیئے ہوتا ہے ایک آغوش جس میں منہ چھپا کر وہ اپنا سارا غم بھول سکے اور جسے وہ محسوس کر سکے۔" میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ انہوں نے سر ہلایا۔

"اچھا۔۔۔ میں مذہب کی بات نہیں کرونگا۔۔۔ میں سائنس کی بات کرتا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ انسان کے خلیوں میں کلیے چھپے ہوتے ہیں۔ ایک خلیہ ہے اسکی ایک حفاظتی پرت ہوتی ہے۔ اسکا ایک مرکز ہوتا ہے۔ مرکزے میں جینز ہوتی ہیں سائنس بتاتی ہے کہ جینز میں بہت ہی باریک چھوٹے حجم کے کروموسومز ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد چھیالیس ہوتی ہے اور یہ تیئس جوڑوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ یہ اس قدر مختصر حجم کے ہوتے ہیں کہ خوردبین سے بھی صرف اس وقت دیکھے جا سکتے ہیں جب خلیہ تقسیم کے عمل سے گزرتا ہے۔۔ ان کی تعداد بہت اہمیت رکھتی ہے۔ سائنس مانتی ہے کہ

ایک زیادہ ہو گیا یا ایک کم ہو گیا۔۔۔ سمجھیں سارا تناسب بگڑ گیا۔ ایک ہندسہ اوپر نیچے ہوا نہیں اور انسان نارمل نہیں رہتا، ایب نارمل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس مانتی ہے کہ جینز میں پائے جانے والے کروموسوم نامی ان اسٹرکچرز کی تعداد انسان کو نارمل رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اب میں آپ کو اپنی ایک تحقیق کے متعلق بتاتا ہوں۔ آپ بے شک اسے مفروضہ سمجھ لیجئے۔ عہد الست کا ذکر قرآن کریم کے پارہ نمبر 9، سورۃ نمبر 7 (الاعراف) اور آیت نمبر 172 میں ہے۔ عہد الست سے متعلقہ تمام حرفوں کا عربی حروفِ تہجی میں جو مقام ہے، آئیں اسے شمار کرتے ہیں۔ یہ حرف "ع" پھر "ہ، د، ا، ل، س، ت" پر مشتمل ہیں "ع" کا مقام 18 ہے پھر "ہ" کا نمبر 27 بنتا ہے اسی طرح "د" "8" "ا" "1" "ل" "23" "س" "12" اور آخری حرف "ت" کا نمبر 3 بنتا ہے۔ آپ ان تمام 3، 12، 23، 1، 8، 27، 18 کو جمع کر لیجئے۔ یہ بانوے 92 بنتے ہیں۔ وہ بہت اطمینان سے اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے جبکہ میں ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"انسان کے چھیالیس کروموسومز ایک صورت میں بانوے ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور وہ صورت تب ہوتی ہے جب انسان اس دنیا میں آنے کے لئے اپنی ماں کے وجود میں مقید ہوتا ہے۔ حاملہ ماں کے کروموسومز چھیالیس اور اس کے وجود میں پلنے والے بچے کے کروموسومز بھی چھیالیس۔۔۔ یہ مل کر بانوے بن گئے یعنی عہد الست کے کل حروف۔۔۔ ماں بچہ پیدا کر کے پھر واپس چھیالیس ہو جاتی ہے۔ بچہ اپنے چھیالیس کروموسومز لے کر ماں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس طرح عہد الست میں بندھا ایک اور وجود دنیا میں آجاتا ہے اور عہد الست کیا ہے یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ ان کی مسکراہٹ پُراسرار ہو گئی تھی۔

"کروموسومز بھی محسوس تو نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ خوردبین سے بھی چند حالتوں کے سوا نظر نہیں آتے لیکن یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی حالت ان کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ کم یا زیادہ ہو جائیں تو انسان کی دماغی حالت ایب نارمل ہو سکتی ہے جو بے سکونی پیدا کرتی ہے۔ سکون دراصل دماغ ہی کا معاملہ ہے۔ کیا یہ بات مانتے ہیں آپ۔۔۔ اب تو میں نے سائنس کی رو سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مان لیجئے کہ اگر چھیالیس نمبرز انسان کو نارمل رکھنے کے لئے ضروری ہیں تو بانوے نمبر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔۔۔ آپ حقیقت کو ساری زندگی نا مانیں مگر آپ کے خلیے مانتے ہیں اور مانتے رہیں گے" ان کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

"یہ ساری باتیں جو میں نے آپ سے کہی ہیں نا۔۔۔ میری نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔۔۔ آپ کیا سمجھتے ہیں خدا کو اپنا وجود منوانے کے لئے ہندسوں کی ضرورت ہے۔۔۔ وہ سائنس کا محتاج ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ اللہ جس دل میں بسنا چاہتا ہے وہ خود وہاں بس جاتا ہے۔ آپ اس حقیقت کو مان لیجئے اور۔۔۔ یہ مان گئے ہیں تو یہ بھی مان لیجئے کہ ربوبیت کا اقرار انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا کیونکہ انسان کی فطرت میں سربسجودگی ہے۔ سجدہ صرف ربوبیت کو جچتا ہے اور اور ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت ہے۔ انسان دینِ حق پر پیدا کیا گیا ہے، یہی عہد الست ہے۔ یہی سکون ہے۔ اس سے منکر ہو جانا ہی دراصل دنیا کی بے سکونی کی بنیادی وجہ ہے۔ آپ چھیالیس کی اہمیت کو مانیں اور بانوے کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں تو آپ ایب نارمل ہونے لگتے ہیں یعنی بے سکون ہونے لگتے ہیں۔ دنیا اسے ڈپریشن بھی کہتی ہے۔۔۔ یہ بھی مانتی ہے کہ ڈپریشن بہت بڑھ گیا ہے اور رب کو رب بھی نہیں ماننا چاہتا۔۔۔" وہ پھر رکے تھے اور گہری سانس بھر کر اپنی ٹانگوں کا زاویہ درست کیا تھا۔ وہ اپنے گھٹنوں کو سہلا رہے تھے۔

"یہی وجہ ہے کہ میں عہد الست کو یعنی ربوبیت کے اقرار کو انسان کے سکون کی بڑی وجہ قرار دیتا ہوں۔ اللہ اس دنیا میں سونے جیسے لوگ بھیجتا ہے اور وہ توقع کرتا ہے کہ ہم سونے جیسے ہو کر ہی اس تک واپس پہنچیں۔ آئیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کو مٹی اور پانی سے بنایا اور پھر اس میں ہوا یعنی روح داخل کر دی۔ یہ تین عناصر ہیں۔ آگ یعنی چوتھا عنصر اللہ نے اسے نہیں دیا یا شاید ہر ایک کو نہیں دیا۔ یہ عنصر ہمیں اپنے اندر خود پیدا کرنا پڑتا ہے۔ لوہا اگر واقعی لوہے کو کاٹتا ہے تو شیطان کی آگ کو کاٹنے کے لئے انسان کو آگ چاہیئے جو اسے خود پیدا کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو نیک عمل کرنا پڑتا ہے اور ہر نیک عمل چاہے وہ کچھ بھی ہو اگر وہ کل انسانیت کے لئے عمل خیر ہے تو وہ سنہری روشنی جیسی آگ پیدا کرتا ہے۔ جسے نور کہتے ہیں۔ جس کی سنہری روشنی آگ کی روشنی سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتی ہے یہی سنہری روشنی ڈھیرے ڈھیرے سرمئی سرد مایوسی کی برف کو جلا سکتی ہے۔ یہ نسخہ آزما کر دیکھئے میری تشخیص ہے کہ آپ کے اندر آگ کم ہو چکی ہے جو آپکے وجود کو ڈھیرے ڈھیرے سرد مایوسی کے حوالے کرتی جا رہی ہے۔۔ اپنے اندر آگ پیدا کیجیے۔ ہر وہ عمل جو انسانیت کو بگاڑنے کے لئے کر بیٹھے ہیں تو اس سے منکر ہو کر توبہ کیجیے اور عمل خیر کا آغاز کر دیجیے۔" انہوں نے گفتگو ختم کر دی تھی۔ میرا پورا وجود پسینے میں نہا چکا تھا۔

"عمل خیر کیا ہے۔۔۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جو عمل میں کر رہا ہوں وہ انسانیت کو سنوار رہا ہے؟" میری آواز میں سرسراہٹ تھی۔ میرے وجود پر کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے اب کی بار میری آنکھوں میں دیکھا۔

"ہر وہ عمل جو آپ اپنی ذات سے ہٹ کر کسی دوسرے انسان کی بھلائی کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں وہی عمل خیر ہے۔۔۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دینے سے لے کر کسی سے میٹھی بات کر لینے تک ہر عمل، عمل خیر ہے اور اس میں خیر ہی خیر ہے۔۔۔ اسی لئے اخلاق اور اخلاص کی بے حد اہمیت ہے۔۔ ان سے پوری انسانیت فیض یاب ہو سکتی ہے۔ یاد رکھیں عمل خیر چونکہ ختم نہیں ہوتا۔۔ زندہ رہتا ہے اس لئے اس سے حاصل ہونے والی انرجی مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔۔۔ یہ بعد از مرگ بھی انسان کے لئے کہیں تاریکی میں راہ دکھانے والا جگنو بن کر ساتھ رہتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کا اجر ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔۔۔ اللہ آپ کے اس لقمے کا اجر بھی ضائع نہیں ہونے دے گا جو آپ نے مخلص ہو کر کسی بھوکے کو کھلا دیا ہو گا۔ ہر وہ لفظ جو کسی کھوٹ کے بغیر کسی سے محبت بھرے انداز میں کہا گیا یا ہر وہ دعا جو کسی کی بھلائی کے لئے نیک نیتی سے کی گئی۔۔۔ عمل خیر ہے۔" وہ ابھی بھی مسکرا رہے تھے۔ میں پہلے بھی زمین پر ہی بیٹھا تھا اب تو مجھے لگا جیسے میں زمین پر جھکتا چلا جا رہا ہوں۔

وہ میرے قریب آ گئے تھے پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔۔۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا آپ اسلام قبول کر لیں۔۔۔ مسلمان ہو جائیں۔۔۔ آپ صرف حق کو کھوجیں۔۔۔ سچ کو تسلیم کر لیں۔۔۔ اللہ خود آپ کو ہمت عطا کرے گا۔۔۔ وہ جس کو سنہرا کرنا چاہتا ہے۔۔۔ خود کر دیتا ہے۔۔۔ یہ جو بچہ ابھی میرے ساتھ تھا۔۔۔ اسے دیکھا آپ نے۔۔۔ اس کا نام نور محمد ہے۔۔۔ ایسا انمول انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔۔۔ جب میرے پاس آیا تو تقریباً مکمل پاگل ہو چکا تھا۔ اس کا ڈوپامائن لیول بڑھا ہوا تھا، یہ شیزوفرینی کی اسٹیج اے پر تھا۔ آج ماشاءاللہ تمام نمازیوں کی پانچ وقت امامت بھی کرواتا ہے اور اذان بھی دیتا ہے۔۔۔ دنیا اسے بے شک بد بخت کہے لیکن میں جانتا ہوں وہ اللہ کا بہت پیارا بندہ ہے۔۔۔ اللہ اسے عزیز رکھتے ہیں تو اسے اتنی بڑی ذمہ داری عطا کی ہے۔۔۔ میں نے کہا نا وہ جسے سنہرا کرنا چاہتا ہے۔ خود کر دیتا ہے۔۔۔" وہ کہہ رہے تھے۔

میں اس روز گھر واپس آیا تو میں وہ نہیں تھا جو وہاں گیا تھا۔ اس رات میں نے چند خوفناک حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔ میں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ میں نے جب سے یہ ناول لکھنا شروع کیا تھا میری زندگی میں ہر چیز بے ترتیب ہو گئی تھی۔ میں ایک کے بعد ایک حادثے کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بچہ اپنی بیوی اور اپنا ہنر سب کھو دیا تھا اور تب بھی میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ میں جو لکھ رہا تھا۔ میں اتنا ڈپریسڈ رہا تھا کہ خودکشی کرنے کی نوبت آگئی تھی اور اسکی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ناول میں اسلام اور اس کے ماننے والوں کے خلاف شرانگیز مواد جمع کر رہا تھا۔ میں نے جب جب بھی اس ناول کا کوئی نیا چیپٹر لکھا تھا۔ مجھے کوئی نیا غم ملا تھا اور تب بھی میں لاعلم کیوں رہا تھا کہ میں شر جمع کر کے اس میں سے خیر کیسے پاسکتا تھا۔ اس رات میں نے وہ سب جواب تک لکھ رکھا تھا سب کا سب نذرِ آتش کر دیا تھا اور تہیہ کیا تھا کہ اب جو لکھوں گا سچ لکھوں گا۔۔۔ تب میں نے ایک نیا ناول شروع کیا تھا۔۔۔ میں نے عہدِ الست لکھنا شروع کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ فیس بک پیج بنایا ہے میں نے" عمر نے اپنا لیپ ٹاپ امائمہ کے سامنے کیا تھا۔ وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جبکہ امائمہ چت لیٹی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ پریگنینٹ تھی اور اس فیز کے سائیڈ ایفیکٹس نے اسکا برا حال کیا ہوا تھا۔ وہ سارا دن تھکی رہتی تھی یا ابکائیاں کرتی رہتی تھی۔ اس کی توجہ نا چاہتے ہوئے بھی آجکل کسی چیز پر نہیں رہی تھی۔ وہ نقاہت بھی محسوس کرتی رہتی تھی سو اس کے بھائی کی تلاش کرنے کا کام اب عمر کے سر آگیا تھا۔ عمر کی یہ بات اسے پسند بھی بہت تھی۔ وہ جب کسی کام کو کرنے کی ٹھان لیتا تھا تو پھر پوری توانائی سے اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں اب تک لوٹن کا چکر تو لگایا ہی تھا لیکن انٹرنیٹ سے بھی اس نے نا صرف لوٹن بلکہ بلیک برن کی بھی تمام مساجد کی معلومات اکٹھی کی تھیں۔ اس نے وہاں کے کانٹیکٹ نمبرز بھی تلاش کئے تھے۔ بلیک برن وہ جگہ تھی جہاں نور محمد روچڈیل سے آیا تھا جب اسکی ذہنی حالت بے حد مخدوش تھی۔ اس نے کچھ لوگوں کو فون بھی کئے تھے لیکن تا حال کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے نیٹ پر زیادہ منظم معلومات نہیں دی گئی تھیں۔ لوٹن کی جامعہ مسجد کا نمبر اسے وہاں مل نہیں سکا تھا۔ اس لئے وہ ایک بار وہاں گیا بھی تھا لیکن تب نماز کے اوقات نہیں تھے سوائے کوئی مل نہیں سکا تھا۔ مسجد کے باہر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ ہر روز وہاں نہیں جاسکتا تھا۔ جاب کی ذمہ داریاں بھی تھیں اور وہ علاقہ بھی اسکی گڈ بک میں نہیں تھا۔ اس لئے وہ انٹرنیٹ پر جو ہوسکتا تھا وہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نور محمد اور نور آفاق اور نور بن آفاق کے نام سے فیس بک پر سرچ کرنا شروع کیا تھا۔ اس نام کے لاتعداد آئی ڈیز فیس بک پر موجود تھے سو ایسے تلاش کرنا نا ممکن تھا۔ اس لئے اس نے ایک فیس بک پیج بنایا تھا جس میں نور محمد کے متعلق تمام تر معلومات جواب تک اسے دستیاب تھیں اس نے لکھ ڈالی تھیں۔ اس نے لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اگر کوئی اس کے متعلق جانتا ہے تو آگے آ کر معاونت کرے۔ کل ویک اینڈ تھا سو اسے فراغت تھی۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اس میں آنٹی اور انکل کی تصاویر بھی اپ لوڈ کر دوں۔۔۔ کیا پتا نور محمد نے کسی اور نام سے آئی ڈی بنائی رکھی ہو۔۔۔ اس کی نظر سے گزرے تو اسے اچھا لگے۔۔۔ آنٹی انکل کی تصاویر سے جذباتی طور پر بھی ہٹ کیا جاسکے گا" وہ امائمہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسکی نگاہیں لیپ ٹاپ کی سکرین پر تو تھیں لیکن توجہ ابھی بھی وہاں نہیں تھی۔

"تم آنٹی کو بولو کہ وہ ہمیں کچھ پرانی تصویریں بھجوا دیں۔۔۔ نور محمد کے بچپن کی مل جائیں تو کیا کہنے۔" امائمہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ عمر نے بغور اسے دیکھا۔

"کیسا محسوس کر رہی ہو۔۔طبیعت ٹھیک ہے۔۔تمہارے لئے جوس لاؤں" وہ یکدم اس کی جانب جھکا تھا۔امائمہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"نہیں۔۔میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔

"اپنا خیال رکھا کرو نا یار۔۔یاد نہیں ممی کیا کہہ رہی تھیں کہ بھوک نا بھی لگے یا دل نا بھی چاہے تو کچھ نا کچھ کھاتے رہنا چاہیئے۔۔۔ پہلے ہی اتنی کمزور ہو گئی ہو" وہ اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔

"دل تو چاہتا ہے۔۔بھوک بھی لگ رہی ہے۔۔مگر پھر ڈر لگتا ہے۔۔کچھ بھی کھالوں ہضم نہیں ہوتا۔۔الٹی آجاتی ہے" وہ لاچاری بھرے لہجے میں بولی تھی۔اس نے لیپ ٹاپ بھی سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

"میں اسٹرابیریز لایا تھا۔۔بہت فریش ہیں۔۔ٹھنڈی ہونے کے لئے رکھی تھی۔۔میں لے کر آتا ہوں۔۔تم نمک ڈال کر کھاؤ۔۔اس سے الٹی نہیں آئیگی" وہ محبت سے اسکی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔امائمہ مسکرائی۔

"ایسی باتیں کون سکھاتا ہے تمہیں عمر۔۔ایسی باتیں تو مجھے بھی یاد نہیں رہتیں"

"بدتمیز۔۔مذاق اڑا رہی ہو مجازی خدا کا۔۔ٹھہرو میں پہلے کچن سے اسٹرابیریز لے آؤں پھر پوچھتا ہوں تمہیں" وہ خجل سا ہو کر اٹھا تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا۔چند لمحوں بعد امائمہ نے اسے اسٹرابیری والی باسکٹ اٹھائے واپس آتے دیکھا۔وہ اس کے پاس بیٹھ گیا تھا پھر ایک اسٹرابیری اس کی جانب بڑھا کر بولا۔

"ممی تمہیں جو باتیں بھی بتاتی رہتی ہیں۔۔میں بس انہی کو ذہن میں رکھتا ہوں۔۔میں تمہارا خیال رکھنا چاہتا ہوں۔۔۔تمہاری امی تو ہیں نہیں یہاں پر۔۔اب مجھے ہی خیال رکھنا پڑے گا نا۔" اس نے ایک اسٹرابیری اپنے منہ میں بھی رکھی تھی۔

"تھینک یو عمر۔۔تم بہت اچھے ہو۔۔جب تمہارا پروپوزل آیا تھا تو امی سب سے زیادہ خوش تھیں اور انہوں نے مجھے کہا تھا کہ امائمہ تم میرے اس فیصلے پر ایک دن فخر کروگی" اس نے اسٹرابیری کا ایک بائٹ لیا تھا۔

"اچھا تو اب تم اس فیصلے پر فخر کرنے لگی ہو۔۔۔اشاروں اشاروں میں تعریف کر رہی ہو میری" وہ مسکرایا تھا۔

"اشاروں میں ہی کیوں۔۔۔میں کھل کر تمہاری تعریف کرتی ہوں۔۔تم بہت اچھے ہو عمر۔۔۔میرے لئے کتنا کچھ کرتے ہو۔۔میرے بھائی کو ڈھونڈ رہے ہو۔۔اتنی محنت کر رہے ہو۔۔کون کرتا ہے کسی کے لئے اتنا کچھ" امائمہ کے دل میں جو بھی تھا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"کسی کے لئے۔۔۔؟" عمر نے اسے گھورا تھا

"تم اب میری فیملی کا حصہ ہو۔۔ان فیکٹ تم میری فیملی ہو۔۔میرا سب کچھ ہو تم۔۔۔تمہارے لئے نہیں کروں گا تو کس کے لئے کروں گا۔۔ مجھے اب آنٹی (امائمہ کی امی) کے لئے زیادہ فکر ہوتی ہے۔۔ابھی میں نے بے بی کا پیار محسوس نہیں کیا۔۔ابھی ہم ابتدائی مرحلے میں ہیں لیکن میں ابھی

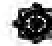
سے محسوس کرسکتا ہوں امامہ کہ اولاد کا دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔۔آپ اپنے بچے کو کھو کر جیسے اپنا سارا حوصلہ ساری ہمت کھو دیتے ہیں۔۔کھو جانے والے کا دکھ مرنے والے کے دکھ سے بہت زیادہ مہلک ہوتا ہے۔۔۔آنٹی بہت مشکل میں ہیں۔۔۔آئی وش میں ان کے لئے کچھ کرسکوں۔۔میں واقعی چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اللہ کریم آنٹی سے ان کے بیٹے کو ملوا دے" وہ اسے بتا رہا تھا۔امامہ کو بے حد حوصلہ ہوا۔یہ عورت کے لئے بہت طاقتور احساس ہوتا ہے کہ آپ کا شریک حیات آپ کے ماں باپ یا بہن بھائی کو اتنی ہی اہمیت دے جتنا کہ وہ اپنے ماں باپ یا بہن بھائی کو دیتا ہے۔

"تم کافی کچھ تو کر رہے ہو۔۔۔میں تو اس بات کے لئے بھی بہت شکر گزار ہوں عمر" اس نے تشکر آمیز انداز میں کہا تھا۔

"اچھا اب باتیں بند کرو اور اس اسٹرابیری کو ختم کرو۔۔۔میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں نے یہ پیچ تو بنا لیا ہے لیکن میں سوچ رہا تھا کہ شہروز آجائے تو اس سے بات کروں گا پہلے۔۔۔اس کے بعد آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔۔۔وہ جرنلسٹ ہے اس کی اپروچ ہم دونوں سے زیادہ ہے۔۔ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے گا۔۔۔آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا زیادہ اچھا رہے گا۔۔۔کیا خیال ہے"

"کب آ رہا ہے شہروز۔۔۔انکل (عمر کے والد) کی تو دس تاریخ کی فلائٹ ہے۔ان کے ساتھ ہی آ رہا ہے یا بعد میں آئیگا؟" امامہ نے ہاتھ میں پکڑا اسٹرابیری کا آدھا حصہ منہ میں رکھ لیا تھا۔

"ابو کی ڈائریکٹ فلائٹ ہے۔۔وہ جمعہ کی صبح پہنچ جائیں گے۔۔۔شہروز بیس تاریخ تک آئیگا۔۔" عمر نے بتایا تھا۔



"یہ کلر کیسا ہے؟" اس نے شرٹ اپنے ساتھ لگا کر امائمہ سے پوچھا تھا۔۔۔وہ دونوں سیلفرج (سپر مارکیٹ) کے گارمنٹس سیکشن میں کھڑے تھے۔عمر امائمہ کو بنا کسی غرض کے یہاں لایا تھا۔وہ آجکل گھر سے باہر کم ہی جاتی تھی۔عمر کو اپنے بھائی کے متعلق بتا کر وہ بہت ریلیکس محسوس کرتی تھی۔اسے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا اور عمر اس کے بھائی کی کوئی نا کوئی خیر خبر ضرور لے آئے گا۔عمر اس کو تازہ ہوا کھلانے کے لئے لایا تھا۔۔۔سیلفرج ان کے گھر کے نزدیک تھی۔ممی بھی ان کے ساتھ تھیں لیکن وہ گروسری کے سیکشن میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ان کا ارادہ باقاعدہ شاپنگ کا نہیں تھا۔وہ بلا ضرورت اور حاجت مختلف سیکشنز میں پھر رہے تھے۔

"مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔۔۔آلو بینگن لگ رہا ہے بالکل" اس نے ناک چڑھا کر ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔وہ شرٹ آف وائٹ اور پرپل رنگ کی تھی۔عمر نے اسکو گھور کر دیکھا پھر وہ شرٹ دوبارہ اس کی جگہ پہ ہینگ کر دی۔

"اچھا یہ کیسی ہے؟" اس نے دوسری شرٹ اٹھا کر اپنے ساتھ لگائی جو آف وائٹ اور پنک رنگ کی تھی۔

"اونہہ۔۔۔کیا ہو گیا ہے تمہاری چوائس کو۔۔۔بہت بری ہے" وہ پھر ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"اتنا بری بھی نہیں ہے ویسے۔۔۔جتنی بری شکل تم نے بنائی ہے" عمر نے اس کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"یا خدا اب یہی سننا باقی تھا۔۔۔یعنی لوگ اب ہمیں شکل کا طعنہ بھی دیا کریں گے" وہ ڈسپلے ہوئی شرٹس کو آگے پیچھے کرتے ہوئے سرسری انداز بولی تھی۔

"لوگ کچھ دے رہے ہوں تو شکر ادا کر کے لے لینا چاہیئے۔۔۔آج کل کے زمانے میں دیتا کون ہے بھئی" وہ اب لیڈیز شرٹس والے سیکشن کی جانب بڑھ گیا تھا۔امائمہ مسکراتے ہوئے وہیں کھڑی شرٹس کو الٹ پلٹ کرتی رہی تھی۔اس دوران ایک لڑکا سامنے سے آ کر اسی اسٹینڈ کو ہلانے لگا تھا جہاں امائمہ کھڑی تھی۔امائمہ نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔وہ اٹھارہ انیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔اس نے لمبے لمبے بال بڑھا رکھے تھے۔نیلی آنکھیں سفاک سی تھیں۔عام طور سے ایسا ہوتا نہیں تھا۔امائمہ کو اس سے پہلے کبھی کسی جگہ پر ایسا برا تجربہ نہیں ہوا تھا۔وہ یہ سوچ کر پیچھے ہٹ گئی تھی کہ شاید اس لڑکے نے ڈرگز وغیرہ لی ہوئی ہیں کیونکہ وہ آپے میں نہیں لگ رہا تھا۔امائمہ اس کے قریب سے نکل کر آگے ہونے لگی تھی کیونکہ وہ شرٹس دیکھنے کے بہانے اسٹینڈ کو بار بار ہلاتا جا رہا تھا۔امائمہ نکلنے لگی تو اسٹینڈ اس کے اوپر گرتے گرتے بچا تھا۔

"واٹ نان سینس۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ لڑکا اس کے منہ کے قریب آ کر زور سے چیخا تھا اور پھر مسلسل چلانے لگا تھا۔وہ کچھ کہہ نہیں رہا تھا یا شاید امائمہ ہی اس کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن وہ بے تحاشا ڈر گئی تھی۔اس لڑکے کا شور سن کر عمر اور کچھ مزید لوگ بھی متوجہ ہوئے تھے۔عمر فوراً اس کے قریب آیا اور قریب آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا۔۔۔" اس نے امائمہ سے پوچھا تھا لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔وہ لڑکا اب کچھ بولنے لگا تھا لیکن چونکہ وہ بہت تیزی سے بات کر رہا تھا اس لئے امائمہ قطعاً سمجھ نہیں پا رہی تھی وہ اس کے اشارے دیکھ رہی تھی جو اس کے سر کی جانب تھا۔وہ خوفزدہ کھڑی تھی۔

تم کو کیا اعتراض ہے۔۔۔ یہ اس کا حق ہے وہ جو چاہے جیسے چاہے پہنے" عمر اس لڑکے کے انداز پر انتہائی برامان کر بولا تھا۔اس لڑکے نے بات سمجھنے کی بجائے مزید گالیاں دینی شروع کر دی تھیں۔اس کے اور عمر کے درمیان بحث شروع ہو گئی تھی۔وہ مسلمانوں کے خلاف مسلسل ہذیان بک رہا تھا۔امائمہ کو خدشہ ہونے لگا تھا کہ ان کے درمیان کہیں ہاتھا پائی نا شروع ہو جائے۔اسی دوران دو سیکورٹی والے بھی آ گئے تھے۔عمر نے امائمہ کو گاڑی کی چابی تھما کر اسے وہاں سے جانے اور گاڑی میں اس کا انتظار کرنے کے لئے کہا تھا لیکن کاپس نے اسے وہیں کھڑے رہنے کے لئے کہا۔انہوں نے ان دونوں کی گفتگو کو سنا تھا پھر عمر کو تحمل کا مشورہ دے کر اس لڑکے کو پکڑا تھا اور باہر کی جانب لے گئے تھے۔امائمہ کو سیکورٹی والوں کی بات سے سمجھ میں آیا تھا کہ وہ لڑکا اس کے اسکارف کی بناء پر اسے" ریڈیکل مسلم" کہہ کر گالی دینے کی کوشش کر رہا تھا اور مطالبہ کر رہا تھا کہ یا تو اسے مارکیٹ سے باہر نکالا جائے یا پھر اس کا اسکارف اتروایا جائے۔امائمہ تو ڈر گئی تھی لیکن عمر کا موڈ بہت آف ہو گیا تھا۔اس نے مزید کچھ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات امائمہ کو بتا رہے تھے کہ وہ بہت غصے میں ہے۔وہ ایلی ویٹر سے نیچے اتر آئے تھے۔امائمہ نے پہلے کچھ چاکلیٹس خریدی تھیں لیکن عمر کا رویہ دیکھ کر اس نے انہیں بھی ایک سائیڈ پر رکھ دیا تھا اور ممی کو لے کر کیش کاؤنٹر پر رکے بغیر باہر کی سمت آ گئے تھے۔اس نے کبھی عمر کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔وہ اس سے چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔اس کے ذہن میں لاتعداد سوچیں تھیں پھر جیسے وہ ایک نتیجے پر پہنچی تھی جبکہ ممی اشاروں اشاروں میں امائمہ سے پوچھ رہی تھیں کہ اچانک کیا ہو گیا۔

"میں آئندہ پبلک پلیس پر اسکارف نہیں پہنوں گی" اس نے انہیں ساری بات بتا کر عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ ایک بہتر فیصلہ ہے امائمہ۔۔۔ برا مت ماننا بیٹا لیکن جس ملک میں رہو، وہاں کے طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں" ممی نے اس کا ساتھ دیا۔

"او ہو ممی۔۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ اگر کسی کو اس ملک میں کپڑے اتارنے کی آزادی ہے تو پہننے کی بھی ہے۔ایک شخص کی بدتمیزی سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ کوئی آپ کی شخصی آزادی میں جس طرح چاہے مداخلت کر سکتا ہے یہ امائمہ کا حق ہے وہ اگر اسے پہننا چاہتی ہے تو کوئی اسے نا پہننے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا" وہ سپاٹ انداز میں بولا تھا۔اس سے پہلے کہ امائمہ کچھ بولتی آنٹی نے عمر کو ٹوک دیا تھا۔

"عمر تم اس معاملے میں مت بولو۔۔۔ تم عقل سے زیادہ جذبات کے سہارے چلتے ہو۔۔۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معاملے میں اوریجنل ہو کر سوچا جائے ایسے کام سنورتے نہیں ہیں بگڑتے ہی ہیں۔یہ برمنگھم یا مانچسٹر نہیں ہے۔۔۔ یہ لندن ہے۔۔۔ یہاں آج کل ہیڈ اسکارف پہننے والوں کو ریڈیکل کہہ کر ہر روز تذلیل کی جا رہی ہے۔۔۔ ایسی صورتحال میں یہی بہتر ہے کہ احتیاط برتی جائے" امائمہ نے ساس کی بات سنتے ہوئے عمر کے چہرے کو بھی فوکس کر رکھا تھا جہاں تاثرات ہر جملے کے ساتھ مزید بگڑ رہے تھے۔آنٹی اپنے بیگ سے پانی کی بوتل تلاش کرنے لگی تھیں۔

"آنٹی میں آئندہ پبلک پلیس پر ہیڈ اسکارف نہیں پہنوں گی۔۔۔ آپ پریشان نا ہوں" امائمہ نے انہیں تسلی دینی چاہی تھی۔اس وقت اس کے حواس بالکل کام نہیں کر رہے تھے۔

"میں تمہیں اس قدر بزدل نہیں سمجھتا تھا امائمہ" عمر نے اس کی جانب دیکھا تھا پھر وہ بے انتہا چڑ کر بولا تھا۔امائمہ نے ایک اور نظر اس پر ڈالی۔اس کا دل چاہا وہ اسے کہے کہ ابھی خاموش رہو ہم یہ بات اپنے گھر جا کر زیرِ بحث لا سکتے ہیں۔اپنی ممی کے سامنے چپ رہو لیکن وہ یہ بات بھی

کہہ نہیں سکتی تھی۔وہ عمر کو خفگی بھرے انداز میں پارکنگ سے گاڑی باہر نکالتے ہوئے دیکھتی رہی۔وہ دل ہی دل میں کافی گھبرا گئی تھی اور ممی بھی کافی الجھے ہوئے انداز میں پیسنجر سیٹ پر بیٹھی ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔وہ ساری خوشی زائل ہو گئی تھی جس کے زیرِ اثر وہ گھر سے نکلے تھے۔

"تم مجھ سے حجاب کے معاملے میں بحث کر سکتی ہو، جھگڑ سکتی ہو۔۔۔دلیلیں دے کر میرا منہ بند کروا سکتی ہو لیکن ایک ڈرنک شخص تمہیں اتنا خوفزدہ کر دیتا ہے اسکی فضول باتیں تمہیں اتنا مجبور کر دیتی ہیں کہ تم اپنی منشاء و مرضی کے خلاف کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتی ہو یعنی تمہارے لئے اس نیم پاگل شخص کی باتیں اہم ہیں میری نہیں۔۔۔" اسکی آنکھوں سے بھی غصہ جھلک رہا تھا۔امائمہ نے اسے ایسے انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔اسے کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ بولے تو کیا بولے۔

"عمر تم خاموش نہیں رہ سکتے۔۔۔مجھے امائمہ کا نہیں پتا لیکن میں واقعی بہت خوفزدہ ہو گئی ہوں۔۔۔امائمہ کا فیصلہ ٹھیک ہے۔۔۔اب مزید بحث مت کرو۔" ممی نے اکتا کر ایک بار پھر مداخلت کی تھی۔

"بحث۔۔۔؟ ممی میں پولیس کمپلینٹ کرنے والا ہوں۔۔۔یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ہمیں ہراساں کیا گیا ہے۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا تھا لیکن ممی نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔

"شٹ اپ مائی ڈئیر سن۔۔۔میں تمہیں ایسی کسی حماقت کی اجازت نہیں دے سکتی۔۔۔بھول جاؤ جو بھی ہوا اور براہ مہربانی اپنے ابو کے آنے پر ان کے سامنے یہ ذکر بھی مت کرنا۔۔۔وہ خوامخواہ اپ سیٹ ہوں گے" وہ دو دن بعد واپس آ رہے تھے۔

"ممی پلیز۔۔۔آپ چپ رہیں۔۔۔آپ دونوں چپ ہی رہیں تو اچھا ہے۔۔۔جنگل کا قانون ہے کیا کہ چپ چاپ بیٹھا رہوں۔۔۔میں آپ دونوں کو گھر ڈراپ کر کے اس معاملے کی رپورٹ کروں گا۔۔۔چپ رہنے کا مطلب ہے ایسے لوگوں کو شہہ دینا۔۔۔میں ایسا کروں گا تو یہ حماقت ہو گی" وہ اب کوئی لائحہ عمل طے کر چکا تھا اس لئے کسی حد تک پرسکون لگ رہا تھا۔امائمہ نے تھوک نگل کر اس کی جانب دیکھا۔اسے اپنی ساس سے بھی بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔اس سارے معاملے کی قصوروار وہ ہی تھی۔

"عمر مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم سے سختی سے بات کروں۔۔۔تم ہمیشہ چھوٹے بچے مت بنے رہا کرو۔۔۔جذباتی اور ضدی۔۔۔" ممی نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"ممی۔۔۔میں جب بھی سچ بولتا ہوں۔۔۔میں جذباتی اور ضدی ہو جاتا ہوں۔۔۔آپ لوگوں نے خود ہی فرض کر لیا ہوا ہے کہ میں جذباتی ہوں۔۔۔تو ٹھیک ہے۔۔۔میں جذباتی ہوں۔۔۔اپنے حق پر ڈٹے رہنا اگر جذباتیت ہے تو ٹھیک ہے۔میں جذباتی ہوں" عمر نے سخت لہجہ نہیں اپنایا تھا لیکن اس کے لہجے میں جو ہٹ دھرمی تھی وہ صاف نظر آ رہی تھی۔

عمر یہ جذباتیت ہی اپنانی ہے تو ایک بات یاد رکھو۔۔۔یہ 2012 ہے۔۔۔حالات ہم جیسوں کے لئے بہت برے ہو چکے ہیں۔۔۔ایک ہم مسلمان دوسرا ہم پاکستانی اسٹنگ۔۔۔ایک چھوٹی سی غلطی بھی بھاری پڑ سکتی ہے۔۔۔ایک لمحہ لگے گا ان کو تمہیں اپنے ملک سے نکالنے میں۔۔۔" ممی اب سفاکانہ انداز میں اس کو حقیقت سے روشناس کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔امائمہ کی نظریں عمر کے چہرے پر تھیں جس کا رنگ خطرناک حد تک

سرخ تھا۔ وہ بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"ان کا ملک ... کن کا ملک ممی ...؟ یہ میرا بھی ملک ہے" وہ چیخنے والے انداز میں بولا تھا۔

"عمر یہ تمہارا ملک نہیں ہے ... تم اگر ان کے اصولوں سے بغاوت کر کے یہاں رہنا چاہتے ہو تو یہ واقعی تمہارا ملک نہیں ہے۔ یہ ہمارا ملک نہیں ہے اور یہ بات تم جتنی جلدی اپنے ذہن میں بٹھا لو اتنا ہی تمہارے اور ہم سب کے لئے اچھا ہوگا۔" ممی کا انداز اس سے زیادہ برا تھا۔

"ممی اگر زندگی کے تیس سال اس جگہ گزار کر بھی آپ نے یہی کہنا تھا تو پھر معاف کیجئے گا کہ آپ نے یہاں آ کر سخت غلطی کی ... آپ کو پاکستان سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ نے ہمیں اگر یہی سبق دینا تھا تو بہتر ہوتا آپ ہمیں وہیں پلنے بڑھنے دیتیں ..." وہ چڑ چڑ کر بول رہا تھا۔ امامہ نے اسے ہمیشہ ہی اپنے موقف کی حمایت میں ایسے ہی بحث کرتے دیکھا تھا لیکن آج سے پہلے وہ کبھی اتنی دل برداشتہ نہیں ہوئی تھی۔ اسے ماں بیٹے کے درمیان یہ بحث دکھ دے رہی تھی اور شرمندگی الگ ہو رہی تھی۔

یہی سننے کے لئے تو پاکستان سے یہاں لائے تھے تمہیں ... یہی صلہ پانے کے لئے تو قربانیاں دی تھیں کہ ایک دن اولاد بڑی ہو جائے اور طعنے دے سکے۔ ماں باپ کے فیصلوں کو غلط قرار دے سکے۔" ممی کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ امامہ نے عمر کو اشارہ کیا تھا کہ وہ چپ رہے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ممی ... آپ بات کو غلط سمت میں لے جا رہی ہیں" وہ بھی ماں کے تاثرات دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ وہ ہائپر ٹینشن تھیں اور ان کو گہری سانسیں بھرتے دیکھ کر امامہ اور عمر دونوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔

"تم یہی کہنا چاہ رہے تھے عمر ... تم یہی جتانا چاہ رہے تھے کہ تمہارے ماں باپ نے تمہیں پاکستان کی بجائے یہاں ایک اچھے ماحول میں پال پوس کر بڑا کر کے غلطی کی اور واقعی ہم نے غلطی کی جو تم لوگوں کے اچھے مستقبل کی خاطر یہاں آ گئے ... اچھا تھا ہم وہیں رہتے۔ تم وہاں کے ماحول میں پلتے بڑھتے، وہاں کے مسائل کو سہتے، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے ترستے تو تمہیں احساس ہوتا کہ تمہارے ماں باپ نے تمہیں لا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔" وہ گہرے سانس بھرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔ عمر کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ممی کی طبیعت بگڑنے کا خدشہ تھا سو بہتر تھا کہ اس بحث کو طول نہ دیا جاتا۔ وہ تینوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں ممی سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی" امامہ نے اس کے سامنے کافی کا مگ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ممی کو ڈراپ کر کے فوراً اپنے گھر آ گئے تھے حالانکہ انہوں نے کہا بھی تھا کہ کھانا کھا کر جاؤ اور گھر سے نکلنے سے پہلے ان کا پلان بھی یہی تھا کہ کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے لیکن درمیان میں اس سکھ شخص والا مسئلہ ہو گیا۔ عمر آجکل اپنے ابو کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کی گاڑی استعمال کر رہا تھا اس نے اپنے مزاج کی برہمی کو ظاہر کرنے کے لئے گاڑی بھی ان ہی کے گھر چھوڑ دی تھی اور امامہ کے ساتھ اپنے گھر تک منٹ کی واک کر کے واپس آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے اطمینان سے کھانا کھایا تھا اور امامہ کو کافی بنانے کا کہہ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ امامہ جانتی تھی وہ بات نہیں کرنا چاہتا سو یہ ظاہر کرنے کو اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہے، وہ روٹین کی سرگرمیوں میں بلاوجہ کی دلچسپی لینے لگتا تھا لیکن امامہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے بات کرے اور یہ پولیس

کمپلینٹ کا خیال دل سے نکال دے۔ اس کے ساتھ یہ واقعہ پہلی دفعہ ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ بھی ہوئی تھی لیکن ممی کا موقف بھی غلط نہیں تھا۔ اخبارات میں کہیں نا کہیں ایسے واقعات پڑھنے کو مل ہی رہے تھے۔ "بین دا برقع" نامی ایک کمپین بھی کسی تنظیم کی طرف سے چلائی جا رہی تھی۔ اخبارات اور ٹی وی پر بھی اس کمپین کو کوریج دی گئی تھی۔۔ ایسی صورتحال میں ایسی کمپلین بے فائدہ ثابت ہوتی۔

"کم آن امامہ۔۔۔ اب ختم کرو اس بات کو۔۔۔ میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا" وہ ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر بولا تھا۔ امامہ نے اپنا کپ ہاتھ میں پکڑ کر اس کے قریب ہی کاؤچ پر نشست سنبھال لی تھی۔

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے" وہ برا منائے بغیر بولی تھی۔ عمر نے ابھی بھی اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس سے خفا نہیں تھا لیکن وہ بے چین تھا اور امامہ جانتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں بہت الجھا ہوا ہے۔

"اس کا مطلب تم واقعی مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے" اسے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولی تھی۔ وہ پھر بھی خاموش رہا۔ امامہ دل برداشتہ ہو کر اٹھنے لگی تھی تب ہی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ سے بٹھا دیا۔

"بیٹھی رہو یار۔۔۔ دل بہت بوجھل ہے۔۔۔ تم اٹھ کر چلی دیں تو مزید بے چین ہو جاؤں گا" اس نے منہ کا زاویہ تبدیل کیے بنا کہا تھا۔ امامہ کو دل ہی دل میں بہت سکون ملا۔ وہ جتنا بھی الجھا ہوا تھا لیکن اس سے غافل نہیں تھا۔ یہ بات بہت حوصلہ افزا تھی۔

"دل کو بوجھل کر دینے والی باتیں دل میں جمع مت رکھو نا۔۔۔ کہہ ڈالو سب کچھ" وہ کاؤچ پر دونوں ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ یہ اس کا ٹی وی دیکھنے اور عمر سے باتیں کرنے کا مخصوص انداز تھا۔

"دل میں کچھ جمع نہیں ہے یار۔۔۔ بس ایویں میں کبھی کبھی الجھ جاتا ہوں۔۔۔ زندگی کے تیس سال اس ملک میں گزارے ہیں۔۔۔ اس دوران کبھی ایک بھی مرتبہ کوئی بھی ال لیگل کام نہیں کیا۔ کسی کو مارنا دھاڑنا تو دور کی بات کسی پر کبھی سخت نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ کبھی کیو نہیں توڑی، کوئی رول نہیں توڑا۔ کبھی سڑک پر تھوک نہیں پھینکا، کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔ ہمیشہ انرجی بلز وقت پر جمع کروائے، ٹیکس بھی ادا کیے۔۔۔ اس سے زیادہ اور کیا کرے کوئی کسی خطے کے لئے۔۔۔ یہ سب کر کے بھی اگر یہ ملک میرا نہیں ہے تو پھر میرا ملک کون سا ہے۔۔۔ کیا میرا حق نہیں ہے کہ مجھے شکایت ہے تو سٹیٹ کا قانون مجھے میرا حق دلوائے" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ امامہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ واقعی کافی ہرٹ لگ رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ممی کی اسی بات سے میں بہت ہرٹ ہوتا ہوں۔۔۔ انہوں نے اتنا وقت یہاں گزار کر بھی جب اپنی اولاد کو یہی سکھانا تھا تو کیا بہتر نا ہوتا کہ ہمیں پاکستان میں ہی رکھتے۔۔۔ ہمیں یہ احساس نا ہوتا کہ ہم آدھے تیتر آدھے بٹیر ہیں۔۔۔ یہ بڑی تکلیف دہ کیفیت ہے۔۔۔ بالخصوص لندن میں رہنا مشکل تھا امامہ۔۔۔ ہم اتنا مکلی بہت کمزور تھے۔۔۔ اور لندن کمزور لوگوں کا شہر نہیں ہے۔۔۔ ایک مہنگے ترین شہر میں سستا ترین لائف اسٹائل بھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔۔۔ ہم نے ایک کمرے کے گھر کا جتنا کرایہ بھرا ہے نا بائیس سال۔۔۔ اتنے میں پاکستان میں پانچ پانچ کمروں کے پانچ گھر بنا سکتے تھے ہم۔۔۔ لیکن ہم یہاں رہے۔۔۔ لندن میں۔۔۔ تمہیں بتاؤں ہم کیسے رہے۔۔۔" وہ رخ مکمل اس کی جانب موڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"ہمارے آس پاس کے گھروں میں غیر مسلم رہتے تھے۔۔سائپرس سے۔آسٹریا سے، گریس سے۔۔سری لنکا سے۔انڈیا سے۔۔وہ سب بھی اچھے ہی لوگ تھے لیکن ان کی اپنی مخصوص ویلیوز تھیں جو مادر پدر آزاد تھیں اور ہماری مذہبی اقدار سے متصادم تھیں۔ہمیں بہت احتیاط سے رہنا پڑتا تھا۔۔ہم نے بچپن قید میں گزارا ہے۔۔۔ہمارے گھر سے نکلنے پر پابندی ہوتی تھی، ہم ارد گرد والے بچوں کے ساتھ کھیل نہیں سکتے تھے۔ممی کو ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ ہم کسی کے ساتھ ساتھ کھیل میں ان کے گھر کا کھانا نا کھالیں جو حرام ہو، ہم بے دھیانی میں الکحل نا پی لیں۔ممی ہمیشہ ہر نئے دوست کے متعلق اتنی محتاط رہتی تھیں، اتنے سوالات کرتی تھیں کہ دوست بنانے سے دل ہی متنفر ہو جاتا تھا۔بڑی گھٹن تھی امائمہ۔تم نہیں سمجھ سکتی وہ اذیت" وہ چڑ کر بولا تھا۔امائمہ نے گردن ہلائی۔اس کے پاس زیادہ الفاظ نہیں تھے کہ وہ اس کی تشفی کر پاتی۔وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ عمر دل برداشتہ ہو رہا ہے اور کوئی ایسا جملہ بھی منہ سے نہیں نکالنا چاہتی تھی جو عمر کو اس کی ممی سے مزید متنفر کرے

"ان کی نیت پر تو شک مت کرو۔۔۔والدین تو اولاد کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔۔۔وہ تم لوگوں کے اچھے بچپن اچھے مستقبل کے لئے ہی تمہیں یہاں لائے تھے۔" وہ یہی کہہ سکی۔

"نیت پر شک نہیں کر رہا۔۔۔اپنے ماں باپ سے بہت محبت ہے مجھے۔۔۔اور محبت سے زیادہ ان کا احترام کرتا ہوں۔۔۔بہت جتنوں سے پالا ہے انہوں نے ہمیں۔۔۔تمہیں بتاؤں میرے ابو نے پاکستان کیوں چھوڑا تھا۔۔؟" وہ پہلی بار اپنے والدین کے متعلق ایسی باتیں کر رہا تھا۔وہ امائمہ سے ان کے متعلق باتیں تو پہلے بھی کرتا تھا لیکن یہ شاید پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اپنی محرومیوں کا ذکر کر رہا تھا۔

"ابو نے جی سی سے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تھا ڈسٹنکشن کے ساتھ۔۔۔وہ گولڈ میڈلسٹ تھے۔۔۔ان کی فیملی میں سب گریجویٹ تھے اور ابو کے گولڈ میڈل اور ماسٹرز کی ڈگری نے ابو کو مغرور کر دیا تھا۔انہیں اپنی پسند کی جاب ملتی نہیں تھی اور دادا کا بزنس وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔۔ابو کو چوچی سویٹر جرسیاں (ہوزری کا بزنس) بیچنے سے۔۔۔دادا کا اچھا خاصا بزنس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تایا ابو (شہروز کے ڈیڈی) کی طرح میرے ابو بھی ان کا ہاتھ بٹائیں لیکن وہ دادا سے لڑ کر ضد کر کے لندن آئے تھے کہ یہاں ان کے علم کی ان کی ڈگری کی خوب قدر ہوگی۔۔۔ایسا کب ہوتا ہے یار۔۔۔رزق تو خدا نے دینا ہوتا ہے۔۔اور خدا شناختی کارڈ دیکھ کر رزق نہیں بانٹتا۔ابو کو یہاں آکر بھی کوئی ہائی فائی جاب نہیں ملی تھی لیکن واپس جاتے تو سبکی ہوتی سو دس سال تک میرے ابو نے ایک سٹور پر سٹور کیپنگ کی۔اوور ٹائم کئے۔پارٹ ٹائم جاب کی۔۔۔بہت مشقت تھی جو ہم سب نے مل کر جھیلی۔۔۔یہ جو سٹیبلٹی تم اب دیکھ رہی ہو نا۔۔۔یہ پہلے دن سے نہیں تھی۔۔۔۔میرے ماں باپ نے واقعی خون پسینہ ایک کیا تو ہم یہاں تک آئے ہیں۔۔۔یہ سب کہنے سننے میں جتنا آسان لگ رہا ہے نا اتنا تھا نہیں۔۔ممی کو کبھی چھٹی نہیں ملتی تھی وہ چھوٹے سے عمیر اور صبا کو میرے حوالے کر کے دروازہ باہر سے لاک کر کے جاب پر جاتی تھیں۔۔عمیر کو میں نے اپنی گودوں میں اٹھا اٹھا کر پالا ہے۔۔۔ہمارے پاس کوئی نانی دادی خالہ یا پھپھو نہیں تھیں جو ہمیں امی کی غیر موجودگی میں سنبھال لیتے۔۔ہمیں کھانا پکا کر دیتی۔۔۔میں نے چھوٹی سی عمر میں کھانا پکانا سیکھ لیا تھا تاکہ ممی کو کوئی آسانی ہو سکے۔۔۔میں لانڈری بھی کرتا تھا۔بہن بھائیوں کو بھی سنبھالتا تھا۔" وہ بوجھل سے لہجے میں سب بتا رہا تھا۔امائمہ نے اسے ٹوکا تھا نا تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔وہ چاہتی تھی وہ اپنے دل کی بھڑاس پوری طرح نکال لے۔

"میں کیسے کہہ دوں کہ میرا بچپن اچھا گزرا امامہ۔۔۔میں نہیں کہہ سکتا۔۔۔مجھ سے کہیں زیادہ اچھا بچپن شہروز اور اس کے بھائیوں کا تھا۔۔زارا کا تھا۔۔میرے دوسرے کزنز کا تھا۔۔ہم جب پاکستان جاتے تھے تو لگتا تھا جیسے جنت میں آ گئے ہوں۔۔ہم پانچ افراد نے زندگی کے بائیس سال ایک کمرے کے گھر میں گزارے ہیں۔۔جبکہ پاکستان میں ہمارے گھر کے پورشن کا کچن لندن والے گھر کے جتنا تھا۔۔۔پاکستان ہمارے لئے جنت تھی امامہ۔۔۔سارا دن کھیلنا کودنا۔کھانا پینا۔کسی پابندی کے بغیر۔۔۔پیرنٹس مکمل طور پر ہمیں ملتے تھے۔۔۔ہمارا خیال رکھ سکتے تھے۔وہ وہاں ہمیں نا تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے نا اکتائے ہوئے۔۔۔وہ ہمیں تفریح کروانے باہر لے جا سکتے تھے کھانا کھلا سکتے تھے۔۔وہاں کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تھا کہ جو ہمیں کھانے کے لئے دیا جا رہا ہے۔۔وہ حلال تو ہے نا۔۔۔ہمارے لئے پاکستان میں گزارے گئے دو مہینے جو ہر تین سال بعد ہمیں ملتے تھے باقی چھتیس مہینوں سے کہیں زیادہ قیمتی خوبصورت اور یادگار ہوتے تھے۔۔۔میں کیسے کہہ دوں کہ ہمارا بچپن اچھا تھا امامہ۔۔۔آج سے بیس بائیس پہلے کا لندن ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے یا شاید ہمارے حالات ہی ایسے نہیں تھے کہ ہم لندن پر حق جتا سکتے۔۔۔ہم نے اس ڈر سے کبھی کھانا باہر نہیں کھایا تھا کہ کہیں ہم کوئی نان حلال فوڈ نا کھالیں۔۔ہم نے یہاں کبھی کوئی عید ایسے نہیں منائی جیسے ہمارے کزنز پاکستان میں مناتے تھے۔میں نے اپنی زندگی میں صرف وہی نماز عید اہتمام سے پڑھی جو پاکستان میں کبھی پڑھ لی۔۔۔آسانی کہاں تھی امامہ۔۔۔بچپن تو بہت مشکل تھا۔۔۔ہم انگلش بچوں کے ساتھ پبلک اسکولز میں پڑھتے تھے۔۔ہم پر راشسٹ کومنٹس ہوتے تھے۔۔۔ہم برداشت کرتے تھے۔۔می سختی سے سمجھا کر بھیجتی تھیں کہ لنچ اسکول کا نہیں کرنا کیونکہ ہمارے سکول میں حلال حرام کا خیال نہیں رکھتے تھے۔۔بچے بڑے ہو جانے پر میری ممی کو صرف ایک خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں میں کسی گوری کے ساتھ ڈیٹ پر نا چلا جاؤں۔۔صبا پر سب سے زیادہ سختی ہوتی تھی۔میری اتنی لائق فائق بہن ہائی اسکول کے بعد مزید پڑھ نہیں سکی صرف اسلئے کہ میرے پیرنٹس کو خدشہ رہتا تھا کہ وہ لڑکی ذات کسی غیر مسلم کے ساتھ افیئر نا چلالے۔۔اور یہ صرف میرے پیرنٹس کا خدشہ نہیں تھا۔۔۔یہ یہاں رہنے والے سارے ماں باپ کا نائٹ مئیر ہے۔۔۔"وہ چپ ہو گیا تھا۔امامہ نے دیکھا اس کی آنکھیں نم تھی۔اس زاویے سے تو اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔

"ہر جگہ کی کچھ کلچرل ویلیوز ہوتی ہیں عمر۔۔ان کا دھیان تو رکھنا پڑتا ہے نا" امامہ نے اپنی جانب سے تسلی دینا چاہی تھی۔وہ لفظوں کی کمی کا شکار تھی۔

"میں نے کون سی ویلیوز کا خیال نہیں رکھا یار۔۔۔انہی ویلیوز کی وجہ سے ہی تو پولیس کمپلینٹ کے لئے ضد کر رہا ہوں۔۔۔میں نے گوروں سے ہی سیکھا ہے کہ اپنے حق کے لئے آواز ضرور بلند کرنی چاہیے۔اور ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ گوروں کی کلچرل ویلیوز بہت اسٹرونگ ہوتی ہیں۔۔۔ہم سمجھتے ہیں کہ کلچر صرف لباس تک محدود ہے لیکن یہ تصور غلط ہے۔۔۔کلچرل ویلیوز کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس معاملے میں گورے ہم سے آگے ہیں جو ہماری مذہبی ویلیوز ہیں وہ ان کی کلچرل ویلیوز ہیں۔۔۔میں نے یہاں رہ کر سیکھا کہ جھوٹ نہیں بولنا۔۔کیونکہ گورا جھوٹ نہیں بولتا۔۔۔میں نے یہ بھی سیکھا کہ انڈر دا ٹیبل منی یعنی رشوت کا مطلب میری یا کسی دوسرے کی حق تلفی ہے۔۔۔سو میں نے یہ بھی کبھی نہیں کیا۔۔۔میں عورت کے پیچھے آوازیں نہیں کستا کسی کے معاملات میں ٹو نہیں لیتا۔میں سڑک پر گاڑی لے کر جاؤں تو کبھی ہارن نہیں بجاتا کہ کسی کو گراں گزرے گا۔۔میں نے راشسٹ کامنٹ سہے ہیں سو میں کبھی کسی کو رنگ نسل زبان کی بنیاد پر حقیر نہیں جانتا۔۔میں برابری کے ہر قانون کو تسلیم کرتا ہوں سو میں سب انسانوں کو ایسے ہی ٹریٹ کرتا ہوں جیسے میں خود کو ٹریٹ کیا جانا پسند کرتا ہوں۔۔۔یہ ہیں وہ ویلیوز جن کو میں فالو کرتا آیا ہوں اور اس کے باوجود مجھے بتایا جاتا

ہے کہ میں یہاں کے رہنے والے لوگوں سے کمتر ہوں۔ان کے برابر نہیں ہوں۔تم خود بتاؤ کیا یہ میرا حق نہیں ہے کہ ہر اصول، ہر قانون پہ عمل پیرا ہونے کے بعد مجھے اس ملک کا آزاد خودمختار شہری سمجھا جائے۔کیا مجھے یہ خدشہ تا عمر رہے گا کہ مجھے یہاں سے نکال دیا جائے گا کیونکہ یہ میرا ملک نہیں ہے۔۔۔مجھے جب یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ میرا ملک نہیں ہے۔۔تو میں دکھی ہو جاتا ہوں، ڈپریسڈ ہو جاتا ہوں۔۔اسے آسانی کہتی ہیں تم؟ یہ ہے اچھا مستقبل؟۔۔۔اتنا ہی اچھا مستقبل ہے تو خدشہ کا ہے کا۔۔۔اونہہ۔۔آسانی۔۔۔اس نے لمبی گہرا ہنکارا بھرا تھا۔امائمہ بوجھل دل کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

نہیں امائمہ۔۔یہ آسانی نہیں ہے۔۔ایسی زندگی آسان نہیں ہوتی۔۔اور اگر یہ آسان زندگی ہے تو ہم اس سے کہیں زیادہ اچھی آسان اور خوبصورت زندگی پاکستان میں گزار سکتے تھے۔ہم تو دوہری زندگیاں جیتے ہیں۔پاکستان جاتے ہیں تو وہ ہمیں اپنا حصہ نہیں مانتے اور یہاں آتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں ڈس اون کر دیا جاتا ہے۔" وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تم عجیب انسان ہو عمر۔۔یہاں کا اور پاکستان کا کیا مقابلہ۔۔لوگ یہاں رہنے کے خواب دیکھتے ہیں۔۔۔اپنے باپ دادا کی جائیدادیں بیچ دیتے ہیں، اپنی زندگی بھر کی جمع پونجیاں لٹا دیتے ہیں اس ملک کی امیگریشن حاصل کرنے کے لئے۔۔" وہ جانے کیا کہنے والی تھی لیکن عمر نے اسے موقع نہیں دیا۔

"ہاں۔۔لوگ ایسا کرتے ہیں اور میں شرطیہ کہتا ہوں کہ ایسے لوگوں میں سے نوے فیصد پچھتاتے ہیں اور پھر ساری زندگیاں یہ سوچتے ہوئے گزار دیتے ہیں کہ وہ بہتر ہیں یا بیٹر۔۔۔انسان اپنی تقدیر اور اپنے اسٹھنک سے پیچھا کبھی نہیں چھڑا سکتا امائمہ۔۔وہ چاہے تب بھی نہیں۔"

"تم آج کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہو" وہ مسکرائی تھی۔۔۔ایسی باتیں وہ روٹین میں نہیں کرتا تھا۔۔امائمہ نے اسے لندن کی تعریفوں میں قلابے ملاتے دیکھا تھا۔اس نے سر جھٹکا۔

"میں کچھ معاملات میں تو واقعی جذباتی ہوں۔۔میں پاکستان جاؤں تو لندن کی باتیں کرتا رہتا ہوں اور یہاں آؤں تو مجھے وقفے وقفے سے پاکستان یاد آتا رہتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔اس کا مزاج اب کچھ بہتر ہو رہا تھا۔

"پاکستان کیوں یاد آتا ہے؟" وہ اٹھلا کر پوچھ رہی تھی۔عمر نے اس کے انداز پہ ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ کو گرمجوشی سے دبایا تھا۔

"آف کورس۔۔۔پاکستان میں شہروز ہے۔۔زارا ہے۔۔میری تائی امی ہیں جو ورلڈ بیسٹ بریانی بناتی ہیں۔۔میرے تایا ابو جو شلوار قمیض پہن کر گولف کھیلنے جاتے ہیں۔۔پاکستان میں انور رٹول ملتا ہے۔۔۔سوہن حلوہ۔۔۔چلغوزے۔۔پچھورے۔۔۔نان چنے میرا فیورٹ ناشتہ۔۔اور پاکستان میں دھوپ سینکنے کے لئے بیچ پر نہیں جانا پڑتا۔۔وہاں بڑے بڑے گھر ہوتے ہیں۔۔بڑے بڑے ٹیرس ہوتے ہیں۔۔۔اور۔۔۔اور" اس نے سوچتے ہوئے امائمہ کی جانب دیکھا۔اس نے مصنوعی ناراضی کا مظاہرہ کر کے ہاتھ چھڑانا چاہا تھا۔

"ہاں ہاں بھئی۔۔تم بھی تو پاکستان کی سوغات ہو۔۔میری ونڈرفل لائف پارٹنر" امائمہ نے سکون کا سانس لیا تھا کہ مد شکر وہ ہنس رہا تھا۔



"میں تمہاری باتیں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ ذرا نرم لہجے میں بولی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔اسی لئے تو میں الجھا ہوا ہوں۔۔۔" وہ دونوں بازو سر کے پیچھے رکھ کر ٹانگوں کو پھیلا کر بولا تھا جیسے تھکے ہوئے جسم کو آرام دے رہا ہو۔

اسی دوران فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے امائمہ کو فون نا اٹھانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تھا تو عموماً کال نہیں لیتا تھا۔ تین رنگز کے بعد ریکارڈنگ مشین پر پیغام ریکارڈ کروایا جانے لگا تھا۔

عمر اتم نے جس شخص کا کہا تھا۔ میں نے اس کا پتا کروالیا ہے۔۔نورمحمد نام کا کوئی شخص یہاں لوٹن میں نہیں ہے" امائمہ کی جان نکل گئی تھی۔ ایک یہی تو آخری اطلاع تھی جو اس کے بھائی کے متعلق تھی اور اب کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہے۔

"یہ نہیں ہوسکتا۔" اس نے عمر کی جانب دیکھا، وہ اس کو اپنے بازو کے حلقے میں لے کر باقی کی بات سننے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نورمحمد سے یہاں ہی ملے۔۔۔لوٹن میں؟" میرا سارا قصہ سن لینے کے بعد سلمان حیدر نے مجھ سے یہ پہلا سوال پوچھا تھا۔ نورمحمد سونے کے لئے چلا گیا تھا۔ وہ قصوں کہانیوں سے، لفظوں آوازوں سے، دوست احباب سے متاثر ہو کر اپنا وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ میرے فلیٹ میں ابھی ہم دونوں ہی رہائش پذیر تھے۔۔۔مجھے سلمان حیدر سے بات کرنے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ وہاں بے یقینی کے گھنے بادل چھائے تھے۔ مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ ایک صحافی تھا اور میں ایک ناولسٹ۔۔۔وہ سچ میں جھوٹ ملا کر زیبائش داستان کا عادی تھا جبکہ میں جھوٹ میں سچ ملا ملا کر یہی کام ایک عرصے سے کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا اسے آسانی سے میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ مجھے اس کا انداز برا بھی نہیں لگا تھا جب تک کہ اس نے دوسرا سوال نہیں کیا تھا۔

"آپ اس شخص سے یہاں ہی پہلی بار ملے۔۔۔آپ نے اسے پہلی بار یہیں کہیں دیکھا۔۔اور آپ اس سے بے تحاشا متاثر ہو گئے۔۔۔اتنے کہ آپ نے کنورٹ ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔۔۔آپ کو نہیں لگتا کہ آپ ایسی کہانیاں لکھ کر دولت تو کما سکتے ہیں لیکن نیکیاں نہیں۔۔۔میں متاثر نہیں ہوا" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ مجھے وہ شخص زہر لگا۔ مجھے ہمیشہ وہ لوگ برے لگتے تھے جو میرے انداز میں بات کر کے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔

"میں آپ کی بے یقینی کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں؟" میں نے بے تاثر لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ ابھی تک نورمحمد کا دوست ہونے کی وجہ سے میرے لئے اہم رہا تھا لیکن اب یہ اہمیت ختم ہونے لگی تھی۔ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ "المہاجرون" کے لئے کام کر رہا ہے۔۔وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے، اپنی شخصیت کو چھپا رہا ہے۔۔۔وہ جھوٹا ہے" اس نے کہا تھا۔

"آپ نورمحمد کو جھوٹا کیسے کہہ سکتے ہیں" میں نے تڑپ کر پوچھا تھا۔

"وہی نہیں آپ بھی جھوٹے ہیں۔۔۔آپ احمد معروف نہیں ہیں۔۔۔آپ کنورٹ نہیں ہوئے ہیں۔آپ کا نام بل گرانٹ ہے۔۔۔ آپ اپنے ناول کے لئے مواد حاصل کرنے کے لئے اس شخص کو استعمال کر رہے ہیں۔آپ نور محمد کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ورنہ ایک شخص جس کی زبان سے آپ واقف نہیں ہیں، جو اپنی بات آپکو سمجھانے کے لئے چار دفعہ جھٹکا کھاتا ہے اور بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔جس کا نام نسب آپ جانتے نہیں، جس کا رنگ بھورا ہے اور شاید یہ وہ پہلا بھورا شخص ہوگا جس کے ساتھ بیٹھ کر آپ ایک ہی برتن میں کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔۔۔ آپ کے لئے اتنا اہم کیسے۔۔۔کیوں۔۔۔؟" وہ بات ادھوری چھوڑ کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں حقارت تھی۔مجھے انتہائی برا لگا لیکن میں نے بہت تحمل کا مظاہرہ کیا۔وہ مجھے راشسٹ سمجھ رہا تھا۔۔۔میں پھر بھی صبر کر رہا تھا۔۔۔میں اگر یہ نا کرتا تو مجھے حیرت ہوتی۔۔۔میں نے اتنے مہینوں میں برداشت کرنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا تھا۔

"آپ کے اسی سوال کا جواب تو عہد الست ہے" میں نے کہا تھا۔اس کے چہرے پر تحقیر وتضحیک بڑھی تھی۔اب کی بار میں نے پرواہ نہیں کی تھی۔میں اگر ایک شخص کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا تو میں آئندہ دنیا کو کیسے مطمئن کرنے والا تھا۔

"میں احمد معروف نہیں ہوں۔۔۔میں بل گرانٹ ہوں۔۔۔یہ بات غلط نہیں ہے لیکن یہ بات غلط ہے کہ میں نور محمد کو استعمال کر رہا ہوں۔ میں نے عہد الست میں اپنی ہی کہانی لکھی ہے اور میرے دل میں دین اسلام کی بہت عزت ہے۔میں نے اپنی زندگی میں جو پہلا اہم نکتہ سیکھا تھا وہ یہ تھا کہ قدرت نے انسان کو "بشر" بنایا ہے۔وہ فطرتاً نیکی سے تسکین اور بدی سے ترغیب لیتا ہے یعنی وہ ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نیکی سے خوش ہوتا ہے اور بدی اس کو اپنی جانب راغب کر لیتی ہے۔۔۔یہی فطری کشمکش دنیا میں اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔زندگی اسی کشمکش کے توازن کا نام ہے۔۔۔ یہ توازن آپ کو سکھاتا کون ہے۔۔۔بے شک مذہب ہی آپ کو یہ توازن سکھا سکتے ہیں۔۔۔اس لئے ایک بات سمجھ لیجئے کہ مذہب دنیا کے لئے بے حد ضروری ہیں" میں نے اپنا پہلا ترپ کا پتا پھینکا تھا۔اس کی آنکھوں کی چبھتی ہوئی روشنی نا قابل برداشت ہوئی تھی۔

"آپ مسلمان ہیں یا نہیں؟" اس نے پوچھا تھا۔مجھے اس کے لہجے کی تلخی پر غصہ آیا۔

میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے میرا موقف واضح کرنے دیں۔میں مذہب کے متعلق وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔مذہب یا مذاہب غلط ہوتے ہیں نا جھوٹے ہوتے ہیں۔یہ انسان کی آسانی کے لئے ہی وجود میں آئے ہیں۔یہ دنیا کے میکنیزم کو سمجھانے اور چلانے کی مینوئل بک ہیں۔یہ دنیا کا منشور ہیں اور یہ بات دنیا ہر سو سال بعد بھول جاتی ہے۔اگلے سو سال بعد وہ اس بحث میں گزار دیتی ہے کہ مذاہب کو کسطرح دنیا کا سب سے بڑا ناسور قرار دیا جائے۔سائنس کو سوشل سائنسز کو ٹیکنالوجی کو مذہب کے مقابلے میں دس میں سے دس نمبر دے کر دنیا پر رائج کر دیا جائے لیکن وہ اس میں ناکام رہتا ہے اس لئے بعد کے آنیوالے سو سال وہ ایک بار پھر مذاہب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔وہ ورغلایا جا سکتا ہے۔وہ ورغلائے جانے کے بعد پچھتا بھی سکتا ہے۔۔۔یہی انسانی چلن ہے۔وہ جنت سے اپنی اسی فطرت کی وجہ سے بے دخل کیا گیا اور وہ جنت کے حصول کے لئے بھی اسی فطرت کی وجہ سے سرگرداں رہتا ہے آپ اسے بدل نہیں سکتے۔۔۔انسانوں کے درمیان سب سے مشترک چیز یہی فطرت ہے۔اور دنیا لاتعداد انسانوں کی رہائش گاہ ہے کیونکہ انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔۔۔یہ بات حتمی ہے۔وہ دنیا میں اکیلا

آتا ہے لیکن دنیا میں اکیلا رہتا نہیں ہے۔۔۔ ہر علم، ہر مذہب اور سائنس متفق ہے کہ انسان یا دوسرے جاندار بھی یکتائی نہیں جھیل سکتے۔ یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ انسان کو انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان ملتے ہیں تو خاندان بنتے ہیں، خاندان مل کر معاشرہ بناتا ہے ہیں اور معاشرے سے ریاست بنتی ہے اور ریاستیں مل کر دنیا بناتی ہیں۔۔۔ یعنی انسان اس پوری دنیا کی بنیادی اکائی ہے لیکن اکائیاں مل کر ہی ایک پورا نظام بناتی ہیں۔ ان اکائیوں کو جوڑنے اور متحد رکھنے کے لئے انسانیت کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔ بھانت بھانت کے انسان، کالے انسان، بھورے انسان، سفید انسان، سمندر کے اس طرف کے انسان، سمندر کے اُس طرف کے انسان۔ محبت کی میٹھی بولی بولنے والے انسان، کڑوے سچ کے تلخ لہجے والے انسان۔۔۔ اس دنیا میں اسی انسانیت کی وجہ سے متحد رہ سکتے ہیں۔ انسانیت کو اگر دنیا سے عنقا کر دیا جائے تو پھر یہ دنیا ہی جہنم ہے جبکہ انسان اس دنیا میں جنت پانے کیلئے آیا ہے اس دنیا کو جہنم بنانے کے لئے نہیں۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ انسان رنگ نسل زبان سے ماورا ہو کر اس دنیا میں رہے۔ وہ اگر اس امتیاز سے نکلیں گے تو ہی چین وسکون سے رہ پائیں گے یہی انسانیت کا پہلا درس ہے، پہلا اصول ہے جبکہ دین اسلام اس درس پر مکمل ہوتا ہے۔ انسانیت جس مقام سے پہلا قدم اٹھاتی ہے، دین اسلام اس قدم پر اپنا سفر ختم کرتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع میں واضح طور پر انہوں نے فرمایا کہ" اے ایمان والو آج تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا گیا۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں"۔۔ یعنی رنگ نسل اور زبان کی ہر برتری کو رد کر دیا گیا، رنگ نسل اور زبان کی بنیاد پر کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں اور انسان کو جج کرنے کا صرف ایک معیار ہے اور وہ معیار "تقویٰ" ہے۔ آپ یا میں کون ہوتے ہیں نور محمد کو یا کسی بھی اور ایکس وائی زیڈ کو ایسی باتوں کی بنیاد پر جج کرنے والے۔۔۔ یہ کام تو اللہ بھی نہیں کرے گا تو کیا ہم اللہ سے بڑے ہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ اب چپ تھا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔

" میں نے اس مذہب کو پڑھ کر اور پرکھ کر یہی سیکھا ہے کہ۔۔۔ یہاں سب برابر ہیں اور انسانوں میں امتیاز کرنے والی واحد چیز "تقویٰ" ہے۔ تقویٰ وہ لٹمس پیپر ہے جس کی بنیاد پر انسان کو جانچا جاسکے گا کہ آیا وہ "مومن" ہے یا نہیں۔۔۔ یہ اللہ سبحان تعالیٰ کے بنائے ہوئے معیار ہیں۔۔۔ وہ اسی لٹمس پیپر (تقویٰ) کے ذریعے جانچیں گے کہ ہم میں سے مومن کون ہے۔ ہمیں انسانوں کو جانچنے کا، جج کرنے کا اول تو اختیار ہی نہیں ہے اور اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں انہیں جج کرنا ہی ہے تو کم از کم معیار تو کوئی ڈھنگ کا ہو۔ انسان اگر مومن ہے تو وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ وہ غدار نہیں ہوسکتا۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ آپ میرے یا میرے مذہب کے متعلق سوال مت کیجئے۔۔۔ میں غدار نہیں ہوسکتا اور نور محمد جھوٹا نہیں ہے۔ میں نے اتنے عرصے اس شخص کے ساتھ رہ کر یہی دیکھا ہے کہ یہ ایک متقی انسان ہے۔ اب آپکی باری ہے۔ آپ خود یہ لٹمس پیپر استعمال کر کے جانچ لیجئے کہ نور محمد کتنے جھوٹے اور کتنے سچے ہیں۔"

" اس لٹمس پیپر (تقویٰ) کو حاصل کیسے کرنا ہے۔ استعمال کیسے کرنا ہے یہ بھی آپ ہی بتا دیجئے "سلمان حیدر میری ساری بات سننے کے بعد بولا تھا اور اب کی بار میں مسکرایا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔

"تقویٰ اُسے حاصل ہوتا ہے جسے اکملیت حاصل ہوتی ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"اکملیت۔۔۔؟" اس نے استفہامیہ انداز میں دوہرایا۔ اب کی بار میں مسکرایا تھا۔

"یہی تو وہ ترپ کا پتا ہے جو مجھے نور محمد کے ساتھ رہنے سے ملا۔۔۔ اور یہی تو وہ ترپ کا پتا ہے جو میں اپنے ناول میں استعمال کرنے والا

ہوں۔" میں نے طمانیت والی گہری سانس بھری تھی۔ میں زندگی میں پہلی بار ایسا سرخرو ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے فلاح اور کامیابی میں فرق سمجھ میں آیا تھا۔

"میرے ساتھ آئیے" میں نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے اسے اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے میری حیات مجھے کچھ اشارہ کر رہی ہوں۔ میں اپنی الماری کی طرف بڑھا تھا۔ الماری کا پٹ کھولتے ہی مجھے جھٹکا لگا تھا۔ میرا چرمی بیگ جس میں "عہدِ الست" کا مکمل مسودہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ اسی دوران ایک زوردار آواز سنائی دی تھی جیسے کچھ گرا ہو۔ میں پیچھے مڑا تھا۔ سلمان حیدر عقب میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا یا سمجھنے کی کوشش کرتا۔ میرے سر کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ میرے سر پر کسی چیز سے وار کیا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے تاریکی چھانے لگی تھی۔ میں نے بیڈ کے کراؤن کا سہارا لینا چاہا لیکن میں خود کو سنبھال نہیں پایا تھا اور فرش پر گر گیا تھا۔

ہوش و حواس کے غائب ہونے سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ فرش پر کوئی اور بھی گرا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ نور محمد کی کہانی ہے" مس صفیہ مشہود نے اپنے پین کو دونوں ہاتھوں میں گھماتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

"نور محمد؟" شہروز نے سر ہلاتے ہوئے دہرایا تھا۔ یہ مس مشہود کے ساتھ اس کی پہلی اور آخری میٹنگ بھی تھی۔ اس کے بعد اسے لندن فلائی کر جانا تھا۔ اسے تمام تر مواد ای میلز کے ذریعے ڈیلیور کر دیا گیا تھا۔ اس نے سرسری جائزہ لیا تھا۔

"یہ شخص ایک دہشت گرد ہے اور اسلامی جہادی تنظیم "المہاجرون" کے لئے کام کرتا ہے۔ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے ایک برطانوی ناولسٹ بل گرانٹ جو اپنے کسی ناول کے لئے ریسرچ کرتے ہوئے اس تنظیم تک پہنچا تھا اور اس کا مقصد ان کے متعلق معلومات اکٹھی کرنا تھا کو نور محمد نے اغوا کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے بل گرانٹ کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ایک مفروضہ ہے کہ وہ المہاجرون کے پاس زندہ موجود ہے اور اب انہی کے لئے کام کرتا ہے۔ جب کہ اس بات کے بھی امکان ہیں کہ شاید اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ ڈاکیومینٹری اسی موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ یہ حقیقی کہانی ہے لیکن اسے علامتی کہانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں چند پاکستانی بھی ان لوگوں کے ساتھ ان کی معاونت کر رہے ہیں۔ آپ اگر سب کچھ دیکھ لیتے تو شاید اندازہ ہو جاتا کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایجنسیز بھی کوئی رول پلے کر رہی ہیں۔" اس کا دورانیہ نوے منٹ ہے اور اس پر کافی کام پہلے ہی مکمل ہو چکا ہے۔" مس صفیہ اسے اپنی طرف سے بہت اچھے طریقے سے بات سمجھا رہی تھیں لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"افغانی ہے یہ شخص؟" شہروز نے سر ہلاتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اسے چند دن پہلے تمام تر چیزیں ای میل کے ذریعے بھجوا دی گئی تھیں لیکن وہ اپنی دوسری مصروفیات میں بھول گیا تھا۔ اگلے ہفتے اس کی فلائٹ تھی اور وہ لندن جانے کے لئے کافی پرجوش تھا۔ اس مصروفیت میں باقی ہر کام اس نے پس پشت ڈالا ہوا تھا۔

"پاکستانی ہے۔ تیس پینتیس سال عمر ہے۔ کیا میں آپ کو اس کے بارے میں مزید تفصیل بتاؤں؟" وہ اس کے چہرے پر تجسس دیکھ کر

سوال کرنے لگیں۔شہروز نے سر ہلایا۔

"یہ شخص یہیں لاہور کا رہنے والا تھا۔یہاں کے ہی اسکول کالج وغیرہ میں پڑھا تھا لیکن ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ان کے والد یہاں کسی کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔وہ بنیاد پرست مسلمان ہیں۔انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت بہت گھٹے ہوئے انداز میں کی تھی۔وہ افغانستان میں طالبان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ان کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان کا بیٹا بچپن سے ہی مار دھاڑ والے رجحانات رکھتا تھا۔کالج میں کلاس فیلوز کے ساتھ اور گھر میں ماں باپ کے ساتھ بھی اس کے فسادات کا ذکر کیا گیا ہے اس میں۔۔۔"

"یہ کس علاقے کا رہنے والا ہے۔۔۔والد کے وزٹ ابا ؤنٹس کا ذکر ہے اس میں۔۔۔آپ مجھے انکے والد کا یا کالج وغیرہ کا نام بتا سکتی ہیں؟" شہروز نے یہ ظاہر کرنے کو کہ وہ مس مشہود کی بات کو بہت انہماک سے سن رہا ہے ایک سوال برائے سوال کیا تھا۔

"ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اس فائل میں موجود ہے جو میں نے آپکو ای میل کر دی ہوئی ہے۔ذیلی لنک بھی دیے ہوئے ہیں۔چھوٹے چھوٹے وڈیوز بھی ہیں۔سوال جواب کے سیشن بھی ہیں۔المہاجرون کا کردار، ای ڈی ایل کا کردار۔۔۔سب کچھ ڈسکس کیا گیا ہے۔آپ ایک دفعہ گو تھرو ہو جائیں گے تو ہر سوال کا تسلی بخش جواب آپکو مل جائیگا۔اس کے علاوہ آپ جب وہاں پہنچیں گے تو باقی جو تفصیلات درکار ہونگی وہ بھی فراہم کی جائیں گی۔ہمارا ایک نمائندہ وہاں آپکو گائیڈ کرنے کے لئے موجود ہوگا۔۔۔وہ آپ کی ہر معاملے میں معاونت کرے گا۔آپ کو اس کے ساتھ مل کر المہاجرون کے چند لوگوں کے ساتھ ملاقات کر کے ان کی رائے لینی ہے اور پھر آپکو فائنل رپورٹ سرعوف بن سلمان کو کرنی ہے۔آپ کا کام زیادہ نہیں ہے۔۔۔آپ کو ٹور انجوائے کرنے کا بہت وقت ملے گا۔وہ اسے تسلی دیتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔شہروز نے عادتاً سر ہلایا تھا۔اس نے ابھی تک وہ کیس اسٹڈی ہی نہیں کیا تھا جس کی بات مس مشہود کر رہی تھیں۔اس لئے وہ زیادہ سوالات سے احتراز برت رہا تھا۔

"اس ڈاکیومینٹری کا نام نہیں پوچھا آپ نے؟" مس مشہود نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"میں پوچھنے والا تھا" وہ یہی کہہ سکا۔

"عہد الست" شہروز نے یہ لفظ پہلے نہیں سنا تھا

☆ ☆ ☆

"میں تمہارے لئے کیا لے کر آؤں" شہروز نے پاؤں کی مدد سے جھولے کی رفتار کو تیز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔وہ اور زارا آنٹی جھولے پر بیٹھے تھے۔اس کی صبح چار بجے کی لاہور سے فلائٹ تھی۔۔پہلے احسان ماموں الگ فلائٹ سے واپس جانے والے تھے لیکن سب لوگوں کے اصرار پر وہ مزید کچھ دن کے لئے رک گئے تھے اس لئے اب شہروز اور چاچو احسان ایک ہی فلائٹ سے جا رہے تھے۔اس لئے شہروز دو دن پہلے ہی کراچی سے آ گیا تھا تاکہ سب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل سکے اس مقصد کے لئے رات کے کھانے پر زارا اور اس کے پاپا بھی مدعو تھے۔اس قسم کی دعوتیں ان کے خاندان میں بہت پرلطف ہوا کرتی تھیں۔بہروز بھائی مہروز بھائی ڈیڈی اور احسان چاچو سب ہی چٹکلے سنانے اور گپ شپ لگانے میں ماہر تھے لیکن زارا کی ممی کے انتقال کے بعد چونکہ وہ سب ایک ساتھ پہلی بار اکٹھے ہوئے تھے اسلئے ماحول ابتداء

میں افسردہ ہی رہا تھا۔ان ہی کا تذکرہ ہوتا پا کر زارا کا دل بھی بوجھل ہو گیا تھا اسی لئے وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ یہ گھر شہروز لوگوں کا آبائی گھر تھا۔وقت کے ساتھ اس کی جدید طرز پر تزئین و آرائش ہوتی رہی تھی۔ چیزیں آتی رہی تھیں، چیزیں جاتی رہی تھیں لیکن یہ آبنوسی جھولا ویں کا ویں رہا تھا جو شہروز کے دادا نے گھر کے عقبی برآمدے میں بہروز کی پیدائش پر نصب کروایا تھا۔ یہ گھر کے سب بچوں کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔اب بھی بہروز بھائی کی بیٹی عبیرہ اس پر بیٹھ کر گھر گھر کھیلتی رہتی تھی۔

"بولو نا۔۔" اس کو خاموش پا کر شہروز نے اس کے کندھے کو ٹہوکا دیا تھا۔

"سوچ رہی ہوں کہ کیا منگواؤں۔۔۔۔اب تو سب کچھ یہاں بھی مل جاتا ہے۔۔۔سوئس چاکلیٹس لے آنا" وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔شہروز نے اس کی جانب دیکھا۔وہ بظاہر اداس تو نہیں لگ رہی تھی۔

"صرف چاکلیٹس ۔۔۔اتنی دور سے تمہارے لئے صرف چاکلیٹس لاؤں گا تو ناک نہیں کٹ جائیگی میری۔۔ بلا تکلف فرمائش کرو یار۔۔۔ اب تو میں کافی اچھی اماؤنٹ کما رہا ہوں" وہ اس کے مزاج کو شگفتہ کرنے کی خاطر بولا تھا۔

"اچھا تو پھر بریسلٹ لے آنا۔۔۔پلاٹینم کی۔۔۔جس میں تقریباً سو دو سو ڈائمنڈز جڑے ہوں" وہ بھی شرارتی انداز میں بولی تھی۔

"او تیری خیر۔۔۔سو دو سو ڈائمنڈز۔۔۔۔کچھ زیادہ نہیں ہو جائیں گے" وہ ہنسا تھا۔

"صحافی اور سیاستدان کیلئے کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔۔۔ان کا تو یہ حال ہے کہ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں" وہ ابھی بھی اسے چڑا رہی تھی۔ شہروز نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جی نہیں۔۔صحافی کو اس کی محنت کے پیسے ملتے ہیں جبکہ سیاستدان ڈاکٹرز کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔دوسروں کی محنت کے پیسوں سے جیبیں اور گھر بھرتے ہیں۔۔۔تمہیں ایسے کہنا چاہیئے تھا کہ ڈاکٹرز اور سیاستدان کا یہ حال ہے کہ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں" وہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔

"تم ڈاکٹرز سے جلتے ہو اور کوئی بات نہیں ورنہ تم بہتر جانتے ہو کہ مسیحائی کس قدر مقدس پیشہ ہے" وہ جھولے کو پاؤں پر زور دیتے ہوئے جھلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔شہروز نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔جھولا ہلنے لگا تھا۔

"اسی لئے تم نے ایک عرصے سے ہاسپٹل کی شکل نہیں دیکھی نا۔۔" شہروز نے کہہ تو دیا لیکن پھر یکدم ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہیں کہنا چاہیئے تھا۔

"میں نے ریزائن کر دیا شہروز۔۔" وہ برا منائے بغیر سکون سے بولی تھی۔شہروز نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے اس سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔یہ وہی زارا تھی جو ایک نیل کٹر بھی اس سے پوچھے بغیر نہیں خریدتی تھی۔

"زارا۔تم نے مجھے بتایا بھی نہیں اور اتنا بڑا فیصلہ بھی کر لیا۔۔" وہ واقعی حیران تھا۔

"تم خود ہی تو کہتے رہتے ہو کہ اپنے فیصلے خود کرنا سیکھو۔۔۔اپنی عقل استعمال کرو" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"اس فیصلے میں عقل استعمال کی ہے تم نے۔۔۔؟" وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں" وہ اس ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔شہروز کو اسکا لاپرواہ انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ایک بار پوچھ لیتی۔۔۔مجھ سے مشورہ کر لیتی" وہ سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔زارا نے اس کی جانب دیکھا اور پھر چند لمحے دیکھتی رہی۔

"یہی بہتر ہے میرے لئے۔۔۔میں فیصلہ کر چکی ہوں اب میں صرف وہی کروں گی جو میں ٹھیک سے کر پاؤں گی" اس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا

"اچھا تو پھر یہ بھی بتا دو کہ تم ٹھیک سے کیا کر سکتی ہو؟" وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔زارا کو اس کا طنز اچھا نہیں لگا۔

"میں وہ سب کچھ ٹھیک کر سکتی ہوں جو اب تک خراب کرتی آئی ہوں۔۔۔میں بری ڈاکٹر نہیں ہوں شہروز۔۔۔براوہ سیٹ اپ تھا جو مجھے کھل کر اپنی توانائی استعمال نہیں کرنے دے رہا تھا۔۔میں ہاسپٹل کی ٹانگ کھینچنے والی سیاست کا شکار ہو کر بھول ہی گئی تھی کہ میں بھی ایک اچھی ڈاکٹر ہو سکتی ہوں۔میں اپنے ذاتی مسائل میں گم ہو کر بھول گئی تھی کہ زندگی میں کچھ کارآمد بھی کر سکتی ہوں میں۔۔۔میں نے مریضوں سے،ضرورت مندوں سے زیادہ اپنے اردگرد رہنے والوں کی دلجوئی میں اپنی طاقت صرف کی۔میں نے ہمیشہ زندگی میں خوش ہونے والی چیزوں پر شکر گزار ہونے کی بجائے ناخوش ہونے والی چیزوں کا ماتم کیا ہے۔۔۔اب میں یہ سب مزید نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اسے اپنے پلان بتا رہی تھی۔

"یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کرنا کیا چاہ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں اپنا ایک کلینک بنوا رہی ہوں۔۔رائے ونڈ میں۔۔۔میٹرنٹی ہاسپٹل کی طرز پر۔۔۔ابھی چھوٹے پیمانے پر شروع کروں گی پھر دیکھوں گی آہستہ آہستہ دائرہ کار بڑھاتی جاؤں گی۔" اس نے مختصراً بتایا تھا۔

"لاہور والے ہاسپٹل کا کیا کرو گی" یہ بھی ایک اہم سوال تھا۔

"میں صرف فیصل ٹاؤن والا ہاسپٹل دیکھوں گی۔۔وہاں آنٹی تحریم ہیں۔۔۔بہت اچھی سرجن ہیں۔۔۔دو ڈاکٹرز نئے ہائر کئے ہیں۔۔۔میں بھی ہفتے میں تین دن فیصل ٹاؤن ہوا کروں گی اور تین دن رائے ونڈ۔۔۔فیصل ٹاؤن کا اسٹاف اچھا ہے۔پاپا بھی دھیان رکھیں گے۔۔۔وہ سب مجھ سے کہیں زیادہ اچھے طریقے سے سنبھال سکتے ہیں ہاسپٹل۔۔اس کے علاوہ تو باقی سب میں پہلے ہی چھوڑ چکی ہوں" زارا نے پھر جھولا جھلایا تھا اس بار شہروز نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

"سوچ لو زارا۔۔یہ ایک احمقانہ فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔گورنمنٹ جاب کی تو خیر تھی۔۔۔لیکن لاہور میں تمہارے ہاسپٹل کا ایک نام ہے۔۔اچھی ساکھ ہے،شہرت ہے۔۔۔۔چلا چلایا سیٹ اپ ہے۔۔۔آمدنی کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔۔۔یہ سب کسی اور کے حوالے کر کے تم خود ایک دور دراز علاقے میں سروس فراہم کرنے چلی جاؤ گی۔۔۔۔تمہیں کیا ملے گا۔۔۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"سکون۔۔۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"سکون سے پیٹ نہیں بھرتا زارا۔۔۔یہ بات بھی ذہن میں رکھنا۔۔۔۔یہ اکیسویں صدی ہے۔۔۔جذباتی ہو کر فیصلے کرنے والوں کی کامیابی کے چانسز صفر نا بھی ہوں تو صفر کے قریب ترین ضرور ہوتے ہیں۔۔۔زندگی کوئی فلم نہیں ہوتی یہ حقیقت ہے اور اسے کھلی آنکھوں سے ہوشمندی سے جینا ہی کامیابی ہے۔۔۔"

"مجھے فلاح چاہیئے شہروز اور فلاح کا مفہوم کچھ بھی ہو۔۔۔اس کا مقصد کامیابی ہی ہے۔سکون ہی ہے۔۔۔انسان کو جس کام میں سکون ملے وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔میں فیصلہ کر چکی ہوں اور میں بہت پر جوش ہوں شہروز۔۔۔پلیز تم میرا ساتھ دو۔یہ میری زندگی کا وہ واحد فیصلہ ہے جو میں نے اپنی مرضی سے کسی کے دباؤ میں آئے بغیر کیا ہے۔" زارا اس کی بات کاٹ کر اسے اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہروز نے گہری سانس بھری۔وہ بلاشبہ اس کے فیصلے سے ناخوش تھا۔

"اس مقصد کے لئے شہر سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔تم یہیں اپنے ہاسپٹل میں یہ سب فلاحی کام کر سکتی تھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔زارا نے جانچنے کی کوشش کی کہ آیا وہ ابھی طنز کر رہا ہے یا اس کا موقف جاننا چاہتا ہے۔

"ہاسپٹل میں آنٹی تحریم کے بھی شیئرز ہیں۔۔ باقی بہت لمبا چوڑا اسٹاف ہے۔۔سب کی تنخواہیں دینی ہوتی ہیں۔۔لیب بھی ہے۔۔وہاں یہ آئیڈیا فیزیبل نا ہوتا۔راؤنڈ میں میرے کچھ اچھے دوست ہیں جو میری معاونت کریں گے اس لئے میں نے وہ علاقہ چنا ہے۔۔شہر سے دور ہے وہاں ایک اچھے میٹرنٹی ہاسپٹل کی ضرورت بھی ہے۔تم پریشان مت ہو۔تم جب لندن سے واپس آؤ گے تو میں سب سیٹ کر چکی ہوں گی اور اتنے اچھے طریقے سے اپنا پراجیکٹ چلا رہی ہوں گی کہ تم شاباش دیئے بنا نا رہ سکو گے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"رائیونڈ میں تمہارے کون سے دوست ہیں۔۔میں تو نہیں جانتا کسی کو" شہروز حیران ہوا۔

"تم نہیں جانتے۔۔تم ابھی لندن جاؤ اپنا ٹرپ انجوائے کرو جب واپس آؤ گے تو میں تمہیں ملواؤں گی" زارا نے گرمجوشی سے کہا تھا۔

"نہیں۔۔" وہ قطعیت بھرے لہجے میں بولا۔

"میں مزید حماقت افورڈ نہیں کر سکتا۔تم ابھی مجھے بتاؤ کہ کن کے ساتھ کام کر رہی ہو تم تا کہ میں پتا کرواؤں کہ کیسے لوگ ہیں۔۔۔ایک تو تم مجھے فلائٹ سے پہلے بتا رہی ہو اب میں کچھ کر بھی نہیں سکتا لیکن میں بہروز بھائی سے کہتا ہوں وہ اپنے آفس میں سے کسی کی ڈیوٹی لگائیں اور پتا کریں کون لوگ ہیں جن کے ساتھ مل کر آنسہ زارا خدمتِ خلق کرنے جا رہی ہیں۔۔تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ دنیا کیسے کیسے گھاگ لوگوں سے بھری ہے۔۔تم نے بہت غلط کیا۔۔تمہیں یہ سب کرنے سے پہلے مجھے بتانا تو چاہیئے تھا۔" وہ واقعی کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔زارا کو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اس کی اتنی پرواہ کر رہا ہے۔

"تم پریشان مت ہو۔۔اتنی بھی بیوقوف نہیں ہوں۔۔اچھے برے کی تمیز آگئی ہے مجھے۔۔۔مجھے چھوٹی بچی سمجھنا چھوڑ دو۔۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرارت بکھری تھی۔

"اچھا تو کیا کروں۔۔تمہاری پرواہ کرنا چھوڑ دوں۔۔۔یہ میں نہیں کر سکتا اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو" وہ تنک کر بولا تھا۔ایسی تنک مزاجی جس میں محبت کے سب رنگ تھے۔

" زارا نے جھولے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تم بس ناراض مت ہو۔۔تم صرف مجھے گڈ لک وش کرو۔۔میرا حوصلہ بڑھاؤ۔۔۔ایسا تاثر مت دو کہ میں کچھ غلط کرنے جا رہی ہوں۔اور

فرض کرو اگر خدانخواستہ کچھ غلط ہو بھی گیا تو میری آخری غلطی سمجھ کر درگزر کر دینا" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر بولی تھی جہاں واضح طور پر ناپسندیدگی تھی۔شہروز بھی اس کی جانب دیکھتا رہا تھا پھر اس نے گہری سانس بھری۔وہ اتنی مطمئن لگ رہی تھی۔پھوپھو کے انتقال کے بعد اب مصروف رہنے کے لئے زارا کچھ بھی کرتی اس کے لئے اچھا ہی تھا۔وہ کم از کم اس ڈپریسڈ فیز سے باہر آ رہی تھی۔یہ بات قابل اطمینان تھی۔

"گڈ لک۔۔خدا نا کرے کہ تمہارے ساتھ کبھی کچھ بھی غلط ہو۔۔ورنہ میرا کیا ہوگا۔۔اتنی بیوقوف لڑکی دوبارہ ڈھونڈنا آسان نہیں ہوگا میرے لئے۔۔۔اچھی بات یہ ہے کہ تم اپنے فیصلے کرنے اور ان پر قائم رہنے جتنی خود مختار ہو گئی ہو۔۔میں خوش ہوں تمہارے لئے" وہ چڑا بھی رہا تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔

"تو پھر تم میرے لئے ڈائمنڈ بریسلٹ لے آؤ گے نا" وہ بھی مسکرائی تھی۔

"تم اگر تھوڑی سی بھی خوبصورت ہوتی تو شاید لے ہی آتا۔۔۔اب تو سوچنا پڑے گا" وہ پھر سابقہ پرانی ٹون اپنا کر بولا تھا۔

"مجھے خوبصورت ہونے کا ہنر بھی آ گیا ہے۔۔۔عاجزی شخصیت کا نکھار ہے اور نکھار انسان کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔۔۔تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔۔۔میں عاجزی اپنا لوں گی تو بہت خوبصورت ہو جاؤں گی تم بریسلٹ لے آنا" اس کے لفظوں پر کسی اور کے لفظوں کا سایہ تھا۔شہروز اسکی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اب تو خرچہ کرنا ہی پڑے گا لیکن خدارا ضرورت سے زیادہ یہ والا نکھار نا کر لینا۔۔۔بات کہیں سو دو سو ڈائمنڈز کے بریسلٹ سے چار سو ڈائمنڈز والے نیکلس تک نا پہنچ جائے۔" وہ ہنستے ہوئے اسے چڑا رہا تھا۔زارا نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عہد الست ہر انسان کی زندگی کا خلاصہ ہے" نور محمد نے سمجھایا نہیں تھا یہ امر دل سے تسلیم بھی کر لیا تھا۔یہ اس دن کی بات تھی جب نور محمد رات بھر سو نہیں پایا تھا۔اس نے اپنے پاس موجود تمام تر مواد متعلقہ شخص کو بھیج دیا تھا۔اصولاً اس کے دل کا بوجھ ختم ہو جانا چاہیئے تھا،اسے پرسکون ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا ہوا نہیں تھا۔۔۔ایسا کیوں نہیں ہوا تھا۔

اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا،کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے اور اس کی ہمت بھی۔۔۔جب سے زین العابدین نے اسے بتایا تھا کہ کوئی پاکستانی اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے لوٹن تک آ پہنچے ہیں۔۔۔اس کے حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔۔ہر چیز پہلے دن کی طرح یاد آنے لگی تھی۔ہر وہ چیز جو اس نے بھولنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔سونے پر سہاگہ وہ خواب تھا جو اسے نا صرف نیند سے جگا دیتا تھا بلکہ حد سے زیادہ مضطرب بھی کر دیتا تھا۔اس کا دل بہت بے چین تھا۔نا چاہتے ہوئے بھی ایک آنسو اس کی پلکوں سے گال پر اتر آیا تھا۔ایک اکیلا تنہا آنسو۔۔۔جب انسان تنہائی نہیں سہہ سکتا تو آنسو کی کیا اوقات۔۔۔تنہائی یہ جتا دیتی ہے کہ یکتائی سکھ نہیں ہے۔۔۔یہ صرف رب سہہ سکتا تھا۔

سو ایک کے بعد ایک تم موتی گالوں کو تر کرنے لگا۔یہ شاید اس کی زندگی میں بہت سالوں بعد ہوا تھا کہ وہ ایسے رویا تھا۔اس کا لیپ ٹاپ میز پر پڑا تھا۔اس کا کام باقی تھا،جو صلہ ختم ہو چکا تھا۔

دو ہزار چھ سے دو ہزار بارہ۔۔۔وقت اس کے لئے کچھوے کی رفتار سے چلتا رہا تھا۔اس نے ایک نقاب پہن رکھا تھا اور وہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو اسے جانتے تھے۔۔جو یہاں اسے واقعی جانتے تھے وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اسے جانتے ہیں۔یہ ان لوگوں کی غلطی نہیں تھی کہ وہ اسے پہچانتے نہیں تھے۔۔۔یہ اس کی اپنی مہارت تھی کہ اس نے خود کو ان میں اتنا رچا بسا لیا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان میں سے ہے۔وہ بہت بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔اس نے اپنا ضروری سامان رات ہی ایک بیگ میں منتقل کر لیا تھا،ضروری کاغذات بھی رکھ لیے تھے۔اس نے کمرے کی لائٹ آن کر دی تھی۔وہ انتظار کر رہا تھا کہ اس کے روم میٹس چلے جائیں تو وہ بھی گھر سے نکلے۔باتھ روم وغیرہ سے فراغت کے بعد وہ اپنے لئے کافی بنا کر واپس کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ زین العابدین آ گیا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" زین العابدین نے جانے کس چیز کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ شاید وہ کہیں جا رہا ہے۔نور محمد چونک کر اسکا چہرہ دیکھنے لگا جیسے اسکی بات سمجھ نہ سکا ہو۔

"آپ کا بیگ پڑا تھا نا۔۔۔میں سمجھا شاید کہیں جا رہے ہیں" وہ اطمینان سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔نور محمد نے ناپسندیدگی سے اس کے انداز کو دیکھا۔اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اسکی بات کا جواب دیے بغیر اپنی الماری میں منہ گھسا کر کچھ دوسری ضروری چیزیں ایک چھوٹے بیگ میں منتقل کرنے لگا تھا۔اس نے زین العابدین کی جانب پشت کر لی تھی۔اسکی الماری کا ایک پٹ پورا کھلا تھا اس نے اسے بھی بند کر دیا تھا۔وہ اس کے سامنے اپنی چیزیں بھی سمیٹنا نہیں چاہتا تھا۔زین العابدین کو وہ کافی پسند کرتا تھا۔وہ اچھا انسان تھا لیکن اسکا یہ مطلب نہیں تھا کہ نور محمد اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتا۔وہ اپنے بارے میں کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔

"تم اب جاؤ یہاں سے۔۔۔میں کچھ مصروف ہوں" اس نے رکھائی سے کہا تھا۔زین العابدین کو اس کے انداز سے حیرانی نہیں ہوئی۔وہ سب اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ تھے اور اس کے عادی ہو چکے تھے۔

"مجھے دراصل کچھ رقم چاہیے تھی۔۔۔آپ جانتے ہیں میری ایک شفٹ ختم ہو گئی ہے۔۔مجھے گھر پیسے بھجوانے ہیں۔۔۔میں آپکو اگلے مہینے لوٹا دونگا"۔

وہ سادہ سے انداز میں مدعا بیان کر رہا تھا،وہ پہلے بھی نور محمد سے پیسے لیتا رہتا تھا۔

"وہ وہاں میز پر والٹ رکھا ہے۔۔۔لے لو" نور محمد نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔وہ چاہتا تھا وہ وہاں سے جلد از جلد چلا جائے۔زین العابدین اسکی اسٹڈی ٹیبل کی جانب بڑھا تھا۔وہ والٹ اٹھانا چاہتا تھا لیکن لیپ ٹاپ کھلا دیکھ کر اس نے اسے بلاوجہ بند کرنا چاہا۔وہ لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن تھا لیکن اس کی لڈ بند نہیں تھی۔زین العابدین اکثر اس روم کی صفائی ستھرائی کر دیا کرتا تھا۔نور محمد اسے لیپ ٹاپ کے اوپر گرد پڑ جانے کے خدشے کی وجہ سے اکثر کہہ دیا کرتا تھا کہ اسے کھلا دیکھو تو بند کر دیا کرو۔اسی لئے اس نے اسے بند کرنا چاہا تھا تب ہی نور محمد پلٹا تھا اس نے زین العابدین کی جانب خفگی بھری نظر ڈالی۔اس نے گڑبڑا کر فوراً لیپ ٹاپ سے ہاتھ اٹھا لئے تھے۔" آپ چلے کیوں نہیں جاتے یہاں سے" وہ غرایا تھا۔زین العابدین

حیران رہ گیا۔اس نے پہلے کبھی اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔وہ شرمندہ ہوتے ہوئے پیسے لئے بنا کمرے سے نکل گیا تھا۔نور محمد مردم بیزار تھا لیکن بدتمیز نہیں تھا۔نور محمد کو بھی کچھ دیر بعد اپنے رویے کا احساس ہو گیا تھا۔اس نے والٹ سے کچھ رقم نکالی تھی اور اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر ہال میں آ گیا تھا۔زین العابدین صوفے پر بیٹھ کر موزے پہن رہا تھا۔نور محمد نے اس کے قریب بیٹھ کر پانچ سو پاؤنڈز اس کی گود میں رکھ دیے تھے۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔سر میں درد ہو رہا ہے۔۔۔اس لئے۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا۔زین العابدین مافی الضمیر خود ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنے رویے کی تلافی کر رہا ہے۔

"آپ کیوں پریشان ہیں" اس نے رقم اٹھائے بنا سوال کیا تھا۔نور محمد نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا۔

"نہیں۔۔ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔میں پریشان نہیں ہوں۔۔۔"

"برادر۔۔۔میں بہت دیر سے آپ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔۔۔میں جانتا ہوں آپ کتنے اچھے انسان ہیں۔لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔۔میں نے جب سے آپ کو ان پاکستانیوں کے بارے میں بتایا ہے جو آپ کے متعلق پوچھتے ہوئے آئے تھے آپ تب سے پریشان ہیں۔۔" وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔نور محمد پہلے سے زیادہ حیران ہوا لیکن وہ اب پہلے کی طرح فوراً تردید نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ پاکستانیوں کو پسند نہیں کرتے نا۔" وہ سوال کر رہا تھا۔نور محمد منہ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔وہ اب کچھ نہیں بول پا رہا تھا۔

"آپ نہیں ملنا چاہتے ان سے تو مت ملیے۔۔۔میں بھی پاکستانیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔۔اس میں اتنا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے" وہ اپنے انداز میں تسلی دے رہا تھا۔نور محمد کو یکدم ایک خیال آیا۔

"آپ ایک کام کرو گے میرا زین العابدین۔۔۔" اس نے زین العابدین کی جانب رخ موڑا۔

"مر کر بھی کروں گا برادر۔۔آپ کی عزت ہی نہیں کرتا۔۔آپ سے محبت بھی کرتا ہوں" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔

"مجھے پتا ہے جو لوگ کل میرے بارے میں پوچھنے آئے تھے وہ دوبارہ بھی آئیں گے۔۔آپ ان سے مل کر انہیں اتنا بتا دیں کہ نور محمد مر چکا ہے" وہ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔زین العابدین کو جھٹکا لگا تھا۔وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جھوٹ نور محمد بھی نہیں بولتا۔۔۔پانچ سو پاؤنڈز اس کی گود میں پڑے تھے۔



"میں تمہارے لئے بہت خوش ہوں" آنٹی رافعہ نے مسکراتے ہوئے اسے کہا تھا۔اس نے ناسمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھا نجانے وہ کس معاملے کی بات کر رہی تھیں۔پھپھو نے کلینک کے لئے جگہ دیکھ لی تھی اور اسے معاملات طے کرنے کے لئے بلایا تھا۔وہ بھی دیکھنے کے لئے آئی تھی۔یہ تین کمروں والا ایک گھر تھا جس کی صفائی ستھرائی اور کچھ ضروری مرمتیں وغیرہ بھی شروع کروا دی گئی تھیں۔زارا کو جگہ پسند آئی تھی۔وہ کچھ فرنیچر جو اس کے لاہور والے ہاسپٹل میں بیکار پڑا تھا وہ بھی لے آئی تھی۔اس کے علاوہ دوائیاں تھیں۔پین کلرز تھے ملٹی وٹامنز۔آئرن کی ٹیبلٹس اور سیرپ سرنجیں،دستانے وغیرہ تھے جو اس کے پاس اسٹاک میں موجود تھے۔یہ سب چیزیں اس نے آنٹی رافعہ کے اسکول کے ایک کمرے میں ہی رکھوا دی

تھیں۔سب کام اس کے حساب سے اتنے اچھے طریقے سے ہونے لگے تھے کہ وہ ایک نیا جوش اور ولولہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔وہ بہت مطمئن انداز میں ان درودیوار کو دیکھ کر سراہ رہی تھی۔آنٹی رافعہ اس کے چہرے پر خوشی کی رمق دیکھ کر خود بھی مسکرا رہی تھیں۔

"میں بھی بہت خوش ہوں آنٹی۔۔۔خوش اور مطمئن" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"یا اللہ۔۔بے شک آپ بے حد کریم ہیں۔۔میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں میرے کان یہ جملہ بھی سنیں گے" یہ پپو کی آواز تھی۔زارا کو اب اس کی باتیں بالکل بری نہیں لگتی تھیں۔وہ ہنسی تھی۔وہ ایک سیڑھی اٹھا کر اندر لاتے ہوئے اسے چڑا رہا تھا جو اس نے دیوار کے سہارے کھڑی کر دی تھی۔

"دھئیے۔۔اگر خوش ہے تو اس سے بڑی بات کوئی نہیں ہو سکتی۔۔ہم سب خوش ہیں۔۔تو نے جو کام شروع کیا ہے نا، یہ بڑا ای چنگا ہے۔بڑی نیکی کا کام ہے۔۔انسانیت واسطے کی جانے والی ہر نیکی کا ثواب روزِ قیامت پوری بھر بھر کے سوہنے رب نے دینا ہے" پپو کے پیچھے ہی ایک ضعیف خاتون اندر داخل ہوئی تھیں اور آتے ہی اس کا ماتھا چوم کر اسے گلے لگاتے ہوئے بولی تھیں۔یہ ایسی گرمجوشی کا مظاہرہ تھا جو زارا نے اپنے ماحول میں دیکھا ہی نہیں تھا۔وہ اتنی محبت پا کر جھینپ سی گئی تھی۔ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا اور چرچے پھیلنے لگے تھے۔

"یہ اماں صغریٰ ہیں۔۔۔یہ حقیقی معنوں میں وہ خاتون ہیں جو ذہانت و فطانت میں بالکل آپ کے جوڑ کی ہیں زارا بی بی!" پپو پھر اندر آ گیا تھا۔اس کے ہاتھ میں بلب لائٹس اور دوسری متعلقہ چیزیں تھیں جو وہ شاید وہاں فکس کرنے کی نیت سے لایا تھا۔زارا نے مشکور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔وہ دونوں ماں بیٹا ہر کام میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔زارا دل ہی دل میں ان کی بے حد شکر گزار تھی

"دھئیے۔۔اس منڈے دیاں گلاں میری سمجھوں باہر نیں۔۔۔میں تے بس اتنا جانتی ہوں کہ انسانیت واسطے رب جس کے دل میں چاہے خب ڈال دے۔۔یہ اوپر والے کے کام ہیں۔۔حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے کھوہ (کنویں) میں ڈال دیا تھا۔۔وہاں کوئی نہیں تھا ان کی آہ سننے والا تو رب نے ہد ہد کے دل میں احساس جگایا۔۔وہ نمانا پرندہ سب دیکھ رہا تھا۔۔کوئی مدد تو نہیں کر سکتا تھا سو وہ دن گیا اور آج ایک دن یہ پرندہ "یوسف کھوہ۔۔یوسف کھوہ" کی آوازیں نکالتا رہتا ہے۔۔" وہ زارا کا ہاتھ تھامے اسے کچھ بتا رہی تھیں۔زارا کو آدھی باتیں سمجھ میں آئیں اور آدھی کو سمجھنے کے لئے وہ آنٹی رافعہ کی شکل دیکھنے لگیں۔انہوں نے اماں صغریٰ کے آگے ایک کرسی رکھی اور بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس کی جانب مڑ کر بولیں۔

"یہ تمہیں سراہ رہی ہیں کہ تم ایک اچھا کام کر رہی ہو اور اللہ نے تمہارے دل میں انسانیت کا درد جگایا ہے۔وہ تمہیں سمجھا رہی ہیں کہ اللہ نے حضرت یوسف کی مدد کے لئے ہدہد جیسے پرندے کو چنا تھا۔اس نے ان کے بھائیوں کو انہیں کنویں میں پھینکتے دیکھا تھا اور تب سے وہ "یوسف کھوہ۔۔یوسف کھوہ" کی آوازیں نکالتا ہے وہ تمہارا موازنہ کرنا چاہ رہی ہیں اس پرندے کے ساتھ۔۔۔" انہوں نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

"سبحان اللہ۔۔۔اس سارے واقعے سے زارا بی بی ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابی آنٹی پرانی زبان ہے مصر کے وہ بازار جہاں صرف عبرانی بولی اور سمجھی جاتی تھی وہاں پر پرندوں کو پنجابی پر پورا عبور حاصل تھا۔۔ماشاءاللہ ماشاءاللہ" پپو ایک بار پھر کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔اس نے ہاتھ میں پیچ کس اور پلاس وغیرہ پکڑے ہوئے تھے۔

"ٹیپو کسی کو تو بخش دیا کرو" آنٹی رافعہ نے ہنستے ہوئے ٹوکا تھا۔

"توبہ توبہ امی۔۔۔بخشش عطا کرنا صرف اللہ رب العزت کی صفت ہے۔۔آپ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ کیا میں نے غلط کہا تھا کہ اماں صغریٰ اور ڈاکٹر صاحبہ ذہانت میں ایک دوسرے کے جوڑ کی ہیں۔۔۔" وہ اوزار میز پر رکھ کر سیڑھی پر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

"کی کہہ ریا اے منڈا (کیا کہہ رہا ہے یہ لڑکا)" اماں نے آنٹی رافعہ کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ انہیں ہنستے ہوئے وضاحت دینے لگیں۔

"ڈاکٹر صاحبہ آپ ذرا یہاں تشریف لائیں اور میری معاونت کریں۔۔۔" وہ اپنی جیب سے موبائل اور والٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھا تھا زارا سیڑھی کے قریب آگئی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی پٹی فٹنگ تبدیل کرنی تھی۔ اسے وقتاً فوقتاً اوزاروں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ زارا اسے مہارت سے کام کرتا دیکھنے لگی۔ وہ پیچ کس سے پرانی والی پٹی کے پیچ کھول رہا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بیپ بجی تھی جو وہ میز پہ رکھا تھا۔ بیپ بجنے پر زارا نے غور کیا تھا۔ اس کے پاس جدید طرز کا اسمارٹ فون تھا۔

"اوہو۔۔۔لوگ نیکی کا کام بھی اطمینان سے نہیں کرنے دیتے۔۔۔ذرا دیکھیں تو کون ٹیپو صاحب کو فون کر رہا ہے" اس نے زارا سے فون اٹھانے کے لئے کہا تھا۔ زارا نے جھجکتے ہوئے فون اٹھا کر اسے تھمانا چاہا۔

"کال ریسیو کر کے اسپیکر آن کر دو" اس نے وہیں اوپر سے حکم جاری کیا تھا۔ زارا نے ایسا ہی کیا تھا اور فون دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔کیا میں سلمان حیدر سے بات کر سکتا ہوں" کسی نے انگلش میں پوچھا تھا۔

"جی۔۔کیا میں جان سکتا ہوں۔۔۔آپ کون ہیں" ٹیپو نے کچھ حیرانی سے اپنا منہ نیچے کی جانب کر کے سوال کیا تھا۔ وہ بھی روانی سے پوچھ رہا تھا۔ زارا کو بڑا شدید جھٹکا لگا۔۔۔اس کی وجہ ٹیپو نہیں تھا بلکہ دوسری جانب سے آنے والی آواز تھی۔

"میں نور محمد ہوں" دوسری جانب سے کہا گیا تھا۔



میں تمہیں کب سے فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔کیا تم فارغ ہو۔۔۔اطمینان سے میری بات سن سکتے ہو؟" دوسری جانب سے پوچھا جا رہا تھا۔ مجھو اضطراب کے عالم میں نیچے اترا تھا۔اس نے فون اٹھا کر عجلت بھرے انداز میں اسپیکر آف کیا اور فون کان سے لگا لیا تھا۔

ہاں نورمحمد۔۔۔تم کہاں تھے۔۔۔میں بہت دن سے منتظر تھا۔۔۔تم ٹھیک ہو نا۔۔۔سب کچھ کیسا چل رہا ہے؟" وہ رواں انگلش میں پوچھ رہا تھا پھر اس نے زارا کو اشارہ کیا تھا کہ وہ ابھی آتا ہے۔چند لمحوں بعد زارا نے اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔وہ حیرانی سے آنٹی رافعہ کی جانب مڑی تھی لیکن وہ اماں صغریٰ سے بات کرنے میں مصروف تھیں۔ان کے لئے یہ عام سی بات تھی جبکہ زارا حق دق رہ گئی تھی۔اس نے مجھو کو کبھی اتنے شستہ مہذب انداز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔وہ بہت روانی سے انگلش میں بات کر رہا تھا۔وہ شخص جو اس کے لئے ایک عام سا ایف پاس انسان تھا۔جس کے صحیح نام سے بھی اسے آگاہی نہیں تھی۔۔۔وہ یقیناً اتنا عام سا نہیں تھا۔شہروز نے ٹھیک کہا تھا۔اسے انسانوں کی پرکھ نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"نورمحمد کا عہدِ الست اور عہدِ الست کا نورمحمد" سلمان حیدر نے ان باکس میں اس سبجیکٹ کا نام دیکھ کر نہایت پرجوش انداز میں ای میل کھولی تھی۔یہ آخری باب تھا جس پر کام کرنا باقی رہ گیا تھا۔لیپ ٹاپ کی نیلگوں روشنی میں وہ سب واضح ہونے لگا تھا جو اب تک چھپا ہوا رہ گیا تھا۔وہ کب سے منتظر تھا کہ اسے کب اشارہ کیا جائے اور کب وہ اس کو مکمل کر کے سرخرو ہو سکے۔نورمحمد نے اسے چھ سال کے بعد بالآخر اجازت دے دی تھی کہ وہ مل گراف کے آخری "ناول" کو پبلک کرنے کی تیاری کرے جو اب تک نہیں ہو سکا تھا اور اس کی تاخیر کی وجہ سے صرف سلمان حیدر واقف تھا یا نورمحمد۔۔۔

"نورمحمد سلمان حیدر کا کلاس فیلو تھا۔۔۔اس سے اس کی دوستی گریڈ 7 میں ہوئی تھی۔اس کے ابو چونکہ آرمی میں تھے اس لئے کسی بھی جگہ ان کا قیام چند مہینوں سے زیادہ نہیں ہوتا تھا اس لئے سکول میں بھی ایڈمیشن کا دورانیہ عموماً بہت طویل نہیں ہوتا تھا۔یہ تب کی بات تھی جب اس کے ابو کا لاہور ٹرانسفر ہوا۔ہر چیز وقت پر اور ٹھیک ٹھاک ہو گئی لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر تب اس کا ایڈمیشن آرمی پبلک میں نہیں ہو سکا تھا سو اس کے ابو نے اس کا ایڈمیشن گورنمنٹ اسلامیہ سکول میں کروا دیا۔نورمحمد کو پہلی مرتبہ اس نے گورنمنٹ اسلامیہ اسکول میں دیکھا تھا۔وہ بہت عام سا سادہ سا چپ چپ رہنے والا بچہ تھا۔سلمان حیدر کے اندر پیدائشی ایک موروثی جرثومہ تھا اسے انسانوں کی پرکھ تھی۔۔۔وہ جو گلے سے جھٹک کر دور جا رہے ہوتے تھے۔۔۔وہ اسے فوراً نظر آجاتے ہیں۔۔۔اس کی چرواہا فطرت برداشت نہیں کرتی تھی کہ کوئی گلے کو چھوڑ کر جائے۔۔۔اس نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔۔۔ہیرے کی قدر اگر جوہری کو ہوتی ہے نا تو بھیڑوں میں سنہری بھیڑ بھی صرف چرواہا ہی پہچان سکتا ہے۔۔۔اسے اس چھپے ہوئے دبے ہوئے نورمحمد میں وہ ہیرا نظر آنے لگا جو نیچے بہت نیچے دبا ہوا ہوتا ہے لیکن جس کی ٹھنڈی چمک آنکھوں کو طراوت بخشتی ہے۔اصل ہیرا کبھی آنکھوں کو چکا چوند نہیں کرتا بلکہ وہ دیکھنے والوں کے لئے راحت ہوتا ہے۔۔۔ایسا ہی بچہ تھا نورمحمد۔۔۔انتہائی ذہین۔۔۔اور صرف ذہین۔۔۔وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔۔۔صرف کتابیں اس کی دنیا تھیں۔۔۔

سلمان حیدر نے اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ دونوں دوست بن گئے۔ نور محمد ایک ایسی کتاب کی طرح تھا جسے جلدی جلدی نہیں پڑھا جاتا بلکہ رات کو بستر پر لیٹ کر سکون سے تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھنے میں مزا آتا ہے سو نور محمد سلمان حیدر کے لئے ایک ایسی ہی کتاب کی مانند تھا۔ وہ دونوں اکٹھے کھیلتے تھے، پڑھتے تھے، ہوم ورک کرتے تھے، بچوں کے میگزینز پڑھتے تھے۔ وہ اسے کرکٹ کھیلنا سکھانے لگا اور اس سے ڈاکٹر امز بنانا سیکھنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ ان کے ٹیچرز بھی اس کی طبیعت میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹ کر رہے تھے اور خوش تھے۔ سلمان حیدر کو کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ اسے تکلیف دے رہا ہے یا اسکے لئے پریشانی کا باعث بن رہا ہے لیکن ایک دن اس کے ابو اسکول میں شکایت لے کر آگئے۔ انہوں نے اسکول کے ایڈمن سے سلمان حیدر کی شکایتوں میں بہت کچھ کہا۔ انہوں نے بالخصوص اس بات کا تذکرہ کیا کہ سلمان ان کے بیٹے کو کھیل کود میں لگائے رکھتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر سے کرکٹ بیٹ لائے تاکہ وہ اسکول میں کھیل سکیں۔ سلمان حیدر کے لئے یہ بہت تکلیف دہ باتیں تھیں۔ وہ تیرہ سال کا ایک بچہ ہی تو تھا۔ نور محمد کے ابو نے یہاں تک کہا کہ سلمان حیدر کی وجہ سے ان کے بیٹے کے رزلٹ خراب ہو رہے ہیں اور وہ اسے نا صرف اسکول میں پڑھنے سے روکتا ہے بلکہ گھر جا کر بھی کھیلنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ سر شعیب نے اسے بلا کر سب کچھ بتایا اور صرف اتنا کہا کہ انہیں اس سے شکایت نہیں ہے لیکن بہتر ہے کہ نور محمد سے دور رہے۔ اسے بے پناہ دکھ ہوا۔ اس دن کے بعد سے وہ نور محمد سے دور رہنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اور کبھی دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ابو کا ٹرانسفر سہالہ ہو گیا۔ وہ سہالہ چلے گئے اور سلمان حیدر سب بھول بھال گیا۔ ابھی دنوں اس کے ابو کا انتقال ہو گیا۔ زندگی میں ترجیحات بدل گئیں۔ وہ اپنی زندگی میں گم ہو گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ نور محمد سے پھر کبھی سامنا بھی ہو گا۔ جب میٹرک کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو نور محمد کی ایک چھوٹی سی تصویر اخبار میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے بورڈ میں فرسٹ پوزیشن لی تھی لیکن تب بھی وہ چونکا نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے ایک بھولی بسری یاد کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ سن دو ہزار دو کی بات تھی۔ وہ ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ ابو کے انتقال کے بعد وہ چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جابز کرتا رہتا تھا۔ ان دنوں ڈیپارٹمنٹ کے ایک پروفیسر نے اسے ایک این جی او کے بارے میں بتایا جو فریش انٹرنیز ہائر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان طالبعلموں کو رجسٹر کر رہے تھے جو مستقبل میں برطانیہ یا یورپ میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کافی اچھا معاوضہ دے رہے تھے اور کام بھی زیادہ نہیں تھا۔ ڈیٹا انٹری کا کام تھا۔ وہ آرام سے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں رات کے وقت یہ کام کر سکتا تھا سو اس نے بھی رجسٹریشن کروا لی۔ یہ اتفاق کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اس این جی او کے لئے ڈیٹا اینٹر کرتے ہوئے اسے نور محمد کے کوائف دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اسے شاید نا پہچان پاتا لیکن اس کے بارے میں ہر چھوٹی چھوٹی تفصیل دی ہوئی تھی۔ اس کے ویزا اپلائیڈ، اس کے رزلٹس، اس کی وہ تصویر جو میٹرک کے رزلٹ پر اخبار میں چھپی تھی۔ وہ چونکا تب جب اس نے اسکا پولیس ریکارڈ دیکھا۔ بھائی پھیرو کے کسی پولیس اسٹیشن میں اس کی تفصیلات موجود تھیں جسکا کافی تفصیل سے ذکر تھا۔ یہ اتنے سالوں بعد پہلی دفعہ تھا کہ سلمان کو دوبارہ اپنے اسے بھولے بسرے کلاس میٹ میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ لاہور میں ہاسٹل میں رہ رہا تھا۔ ماس کمیونی کیشن پڑھ رہا تھا، اخبار والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کے بیٹے کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا اسکے لئے حلوے جیسا کام ثابت ہوا۔ اسے پتا چلا کہ نور محمد دو سال پہلے یو کے گیا تھا۔ سلمان نے وہ سب پتا لگایا جو یو کے جانے سے پہلے نور محمد پر بیتا تھا۔ اس رپورٹ میں بھی یہی لکھا تھا کہ اس کے

والد کی سختی جو انہوں نے اپنے بیٹے پر اس کا کسی لڑکی کے ساتھ انگیج ہونے پر روا رکھی تھی کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ رہتا تھا۔اس کے متعلق سب جان کر جہاں وہ دکھی ہوا وہاں حیرانی بھی ہوئی۔ایک این جی او ان سب معلومات کو کیوں اکٹھا کر رہی تھی۔یہ وہ پہلا سوال تھا جو اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔یہ ایک برٹش این جی او تھی اور اسے بتایا گیا کہ نائن الیون والے واقعے کے بعد یا اس سے کچھ عرصہ پہلے یو کے جانے والے ان تمام لوگوں کا ڈیٹا اکٹھا کیا جا رہا تھا جو برطانیہ کسی بھی مقصد کے لئے جا رہے تھے اور ان کا چھوٹا موٹا کوئی بھی پولیس ریکارڈ رہا تھا۔اسے یقین دلایا گیا کہ یہ روٹین کی سرگرمی ہے۔دہشت گردی کے بڑھتے واقعات کے باعث آجکل ایسا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔اس نے کام مکمل کر کے دے دیا تھا لیکن بنا کسی وجہ کے نور محمد کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ماسٹرز کے بعد اس نے کچھ عرصہ ایک مشہور اخبار میں ملازمت کر لی لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔وہ ہاتھ باندھ کر جی جناب حاضر جناب کہنے والی مشین نہیں تھا۔اسی لئے وہ بگی بندھی جاب سے کتراتا بہت تھا۔

"میں بھیڑ نہیں ہوں۔۔۔چرواہا ہوں۔۔۔میں گلے کا وہ حصہ ہوں جو گلے کے باہر رہ کر اپنا فرض ادا کرتا ہے" یہ اسکا پسندیدہ ڈائیلاگ تھا جو وہ ان لوگوں سے کہتا تھا جو اس سے نوکری چھوڑنے کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔وہ فری لانسنگ کرنے لگا اور ساتھ ہی مزید پڑھائی شروع کر دی۔اسے اس میں مزا آتا تھا۔وہ پابندیاں قبول کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا وہ صرف پالیسیز پر معترض رہتا تھا جو اسے ہمیشہ ہی ملک و قوم کے مفاد میں نظر نہیں آتی تھیں۔وہ ایسا ہی تھا۔۔۔محب وطن، پر جوش مگر لاپرواہ اور چھپا رستم۔۔۔اسے اپنے کام سے دوسروں کو چونکانے کی عادت تھی۔۔۔وہ انوکھے موضوعات پر رپورٹس تیار کرتا تھا جن کے ہر شعبے میں اسکی محنت صاف نظر آتی تھی۔

اسی لئے اسے فری لانسر صحافی کے طور پر شہرت ملنے لگی تھی۔اسکا نام پہچان بنانے لگا تھا۔یہ انہی دنوں کا قصہ تھا۔۔۔سال 2006 شروع ہوا تھا۔اس نے ایم فل کو بھی ادھورا چھوڑ دیا ہوا تھا۔جب اسے اسی این جی او سے کال موصول ہوئی جس کے ساتھ وہ بہت پہلے ڈیٹا اینٹری کی پارٹ ٹائم جاب کر چکا تھا۔انہوں نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دی۔اس این جی او کا اوریجن برطانیہ کا تھا اور انکا بنیادی مقصد بھی پاکستانی نژاد برطانوی مسلمانوں کے حقوق کے لئے کام کرنا تھا۔وہ ایک اچھی پیشکش تھی جس میں مالی منفعت بھی تھی اور نئی راہیں تسخیر کرنے کا انوکھا موقع بھی۔۔۔اس این جی او کے ساتھ کام کر کے ہی اسے ان کے پراجیکٹ کی صحیح سمجھ آئی تھی۔وہ ان لوگوں کی ذہنی و جسمانی بحالی کے لئے کام کرتے تھے جو مسلمان تھے اور برطانیہ یا یورپ کے اور چھوٹے بڑے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مختلف مسائل کا شکار تھے۔ایسے لوگوں کی ایک لمبی لسٹ تھی جنہیں احمقانہ بنیادوں پر استحصال کا سامنا تھا۔ان میں زیادہ تر لوگ اٹھارہ سے چوبیس سال کی عمر کے تھے جو پاکستانی ماں باپ کے ساتھ رہ رہے تھے لیکن برطانیہ میں پیدا ہوئے تھے اور وہاں کی معاشرت کو ذہنی طور پر قبول کر چکے ہوئے تھے۔سلمان حیدر جلد ہی اس این جی او سے بھی اکتا گیا تھا۔۔۔اور تب ایک بار پھر نور محمد اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔اس تنظیم کے پاس لاتعداد پاکستانیوں کا ریکارڈ تھا جو وہاں ملازمت اور تعلیم کے سلسلے میں گزشتہ پانچ، چھ سالوں سے مقیم تھے۔نور محمد کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا لیکن اب اس کے متعلق جو کچھ پتا چلا وہ کافی دردناک اور تشویشناک تھا۔وہ ذہنی طور پر بیمار رہتا تھا اور ایک دہشت گرد تنظیم المہاجرون میں شامل ہو چکا ہوا تھا۔وہ اس گروپ کا آلہ کار تھا جو اپنے قول و فعل کے ذریعے اپنے اردگرد اشتعال پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔اس کے علاوہ بھی کچھ تفصیلات تھیں جو اس کی مجرمانہ ذہنیت کو ظاہر کرتی تھیں۔سلمان حیدر اس جاب سے بھی جلدی اکتا

گیا تھا کیونکہ وہ این جی او صرف ان مسائل کے تدارک کے لئے کام کر رہی تھی جو برطانوی معاشرے کے لئے قابل قبول تھیں جبکہ اسلامی اقدار سے متصادم تھیں۔ ہم جنس پرستی، اٹھارہ سال کے بعد نوجوان نسل کی آزادانہ روش، مسلمان لڑکیوں کی عیسائیوں سے انٹر میرج۔۔۔اس نے آٹھ مہینے بعد ہی استعفیٰ دے دیا تھا اور اس بار اس نے دانستہ طور پر نور محمد سے متعلق سارا ڈیٹا اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ اس وقت تک اس کا حلقہ احباب بھی کافی بڑھ چکا ہوا تھا۔ صحافیوں، سیاست دانوں، وکیلوں اور اداکاراؤں میں بھی وہ ایک سچا صحافی ہونے کی وجہ سے اچھا مقام حاصل کر چکا تھا۔ نور محمد کے متعلق ملنے والی نئی معلومات نے اس کی صحافیانہ فطرت کو اکسایا تھا کہ وہ اس سارے قصے کی تہہ تک پہنچے سو وہ ایک دن پروفیسر آفاق علی سے ملنے ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی ایک بیٹی اور اہلیہ کے ساتھ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ دیکھتے ہیں اصل معاملہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

"نور محمد کی ناکامی فرد واحد کی ناکامی نہیں تھی۔۔۔ یہ میری ناکامی تھی۔۔۔ یہ اس نظام کی ناکامی تھی جس کا میں حصہ تھا۔ یہ اس کوشش کی اس امید کی ناکامی تھی جو میں نور محمد کے سراپے میں دیکھتا تھا، ڈھونڈتا تھا، تلاش کرتا تھا"

جھریوں بھرا چہرہ جس پر سفید داڑھی تھی اور حوادث زمانہ کے رنگ تجربہ بن کر بکھرے تھے لیکن ان کی آنکھیں تھیں جو نم نا ہونے کے باوجود گیلی محسوس ہوتی تھیں۔ سلمان حیدر کو ان پر بے پناہ ترس آیا۔ وہ انہیں ایک سخت گیر شخص کے طور پر جانتا تھا جو ایک کرکٹ بیٹ کی خاطر اپنی اولاد کو روئی کی طرح دھنک سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں ان کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ اس نے انہیں شاید ہی کبھی ایک آدھ بار اسکول میں دیکھا تھا لیکن یہ اتنی پرانی بات تھی کہ اس کے ذہن سے ایسا ہر خاکہ مٹ چکا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے یہ بہتر سمجھا کہ پرانا کوئی حوالہ دیئے بغیر ان سے ملا جائے سو اس نے اپنے ایک اور پروفیسر صاحب کے ذریعے اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا اور چونکہ وہ انہی کے حوالے سے ملا تھا اس لئے سر آفاق بہت اچھے طریقے سے ملے تھے۔ انہیں اپنے مضمون پر نا صرف بھرپور عبور تھا بلکہ وہ ادب اور سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ملکی و غیر ملکی حالات حاضرہ پر بھی اچھی گہری نظر تھی۔ انہیں بھی سلمان حیدر سے مل کر کافی خوشی ہوئی۔

"کتنے مہنگے ہوتے ہیں بیٹے۔۔۔ کتنی قیمتی ہوتی ہے اولاد" پروفیسر آفاق علی نے ایک جملے میں اسے سراہ کر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اندر سے اس پہاڑ کی طرح نہیں ہیں جو جھرنا بن کر پھوٹ جاتا ہے بلکہ وہ اس میدان کی طرح ہیں جہاں سے پانی تب ہی ابلتا ہے جب اس پر ایڑیاں رگڑی جاتی ہیں۔ وہ اتنے سپاٹ چہرے لے کر دنیا کے سامنے آتے تھے کہ کوئی ان کے اندر جھانکنے کی جرأت بھی نہیں کرتا تھا۔ تب سلمان حیدر نے فیصلہ کیا کہ وہ انہیں اعتماد میں لے گا۔ وہ انہیں بتائے گا کہ نور محمد سے قطع تعلقی انہیں اس مرحلے پر بھاری پڑ سکتی ہے۔۔۔ ایک بین الاقوامی این جی او کے ریکارڈ میں اس کے متعلق جو معلومات تھیں وہ کسی اچھی خبر کی طرف اشارہ نہیں کر رہی تھیں۔ سلمان حیدر کو ان کو ٹٹولنے میں مشکل ہوئی لیکن وہ جب اپنی بات بتانے پر آئے تو پھر بتاتے چلے گئے۔

"میں خود چاہتے ہوئے بھی میڈیسن نہیں پڑھ سکا تھا لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ہزاروں لاکھوں بچے میرٹ پر نا آنے کی وجہ سے ہر سال میڈیکل میں ایڈمیشن نا ملنے کے باعث اپنے ماں باپ کے خواب پورے نہیں کر پاتے لیکن میرٹ پر پورا اترنے کے باوجود میڈیکل کالج

میں سیٹ نا ملنے کا دکھ میرے لئے بہت بڑا تھا۔ میں بہت غریب خاندان سے آیا تھا۔ میرے ماں باپ پیسہ پیسہ جوڑ کر مجھے تعلیم دلوا رہے تھے۔ میں ڈاکٹر تو نا بن سکا لیکن بی ایس سی اور پھر ایم ایس سی کر کے میں ایک اسکول میں پڑھانے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایم بی بی ایس نہیں کیا تو کیا ہوا ایم ایس سی کی ہے۔۔۔ لیکچرر شپ ضرور مل جائے گی لیکن یہ بھی میرے جیسے عام آدمی کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا میرے پاس سفارش کروانے کے لئے کوئی بڑا رشتہ دار تھا نا رشوت دینے کے لئے بھاری رقم۔۔۔ میں نے لیکچرر شپ حاصل کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلے۔ رشوت اور سفارش کے بغیر میں نے جن دقتوں سے لیکچرر کی جاب حاصل کی یہ میرا دل ہی جانتا تھا لیکن تدریس کے شعبے نے مجھے سکھایا کہ دراصل ہمارا نظام تعلیم بے حد تعفن زدہ ہے۔ اساتذہ چھوٹے چھوٹے تحائف کے بدلے نالائق طالب علموں کو زائد نمبرز دلواتے تھے۔ رشوت لے کر کمرہ امتحان میں نقلیں کروائی جاتی تھیں اور عملی امتحانوں کے دوران معاونت فراہم کی جاتی تھی۔ پریکٹیکلز کروائے جاتے تھے۔ انٹرویو میں مدد کی جاتی تھی۔ اپنے پسندیدہ چہیتے طالب علموں کو کامیاب کروانے کے لئے ناجائز کوششیں کی جاتی تھیں۔ میں نے خود اپنے بہت سے انتہائی ذہین اور قابل طالب علموں کو اس چکر میں ناکام ہوتے اور رشوت کی بناء پر بہت سے نالائق طلباء کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ مجھے اس نظام سے نفرت تھی جو اخلاقیات کا درس دیتا تھا جو بچوں کو سچائی اور ایمانداری کے سبق سکھاتا تھا لیکن خود ایسی کالی بھیڑوں کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا تھا۔ میں اپنے دوستوں اور کولیگز میں برملا اس نفرت کا اظہار کرتا تھا اور وہ مجھ پر ہنسا کرتے تھے کہ یہ حربے ہیں ہتھکنڈے ہیں اور ان کے بغیر کامیابی کا ملنا آسان نہیں ہے۔ اگر تمہیں اس نظام سے نفرت ہے یا اس کے خلاف ہو تو اپنی اولاد کو اس کے بغیر کامیاب ہو کر دکھا دینا ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ انہی دنوں میری شادی ہوئی تھی۔ میں اللہ سے بس یہی دعا کیا کرتا تھا کہ مجھے اولاد نرینہ دے۔۔۔ میں بیٹا چاہتا تھا اور بیٹا بھی وہ جو نہایت ذہین و فطین ہو۔" وہ چپ ہو گئے تھے۔ ساتویں بار ایڑی کی رگڑ نے اندر کہیں دور تک ہلچل مچا دی تھی۔ سلمان نے ان کی آنکھ سے آنسو ٹپکتے دیکھا۔

"تم نے ایسی ماؤں کے بارے میں سنا ہو گا جو اولاد نرینہ کے لئے وظیفے کرتی ہیں۔ دعائیں کرتی ہیں۔ اللہ کے حضور گڑگڑاتی ہیں۔ لیکن میں وہ باپ تھا جو اولاد نرینہ کے لئے رات رات بھر جاگ کر دعائیں کیا کرتا تھا۔ میں نا صرف بیٹا چاہتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ انتہائی ذہین بھی ہو۔" وہ پھر لمحہ بھر کے لئے رکے تھے۔ ان کی آواز کی ٹون بدل رہی تھی۔ جذبات کا غلبہ ان کی آواز کو کپکپانے لگا تھا۔

نور محمد بہت ذہین بچہ تھا۔ پہلا لفظ سات مہینے کی عمر میں بولنا سیکھا۔ دو سال کو ہوا تو سارے حروفِ تہجی کی پہچان کرنا سیکھ چکا تھا۔ ہم سڑک پر بھی جاتے تو بورڈز پر لکھے لفظ پہچان لیتا۔ اولاد بہت بڑا فخر کا حوالہ ہوتی ہے۔ میرے لئے بھی میری اولاد میرا فخر تھی لیکن میں نے اولاد کے سامنے کبھی اس فخر کو ظاہر نہیں کیا۔ لیکن یہ میری غلطی تھی۔ میرا گناہ نہیں تھا۔ میں اپنے جذبات کو چھپا کر رکھتا تھا۔ میری طبیعت ہی اس قسم کی تھی۔۔۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے نور محمد سے محبت نہیں تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی باپ کو بیٹے سے محبت نا ہو۔ محبت تو تھی لیکن میں نے اپنی اولاد کو نظام کے خلاف لڑنے کے لئے اپنا ہتھیار سمجھ لیا تھا۔ میں اس کے ذریعے اس نظام تعلیم کو شکست دینا چاہتا تھا جو بے ایمانی اور رشوت کی بناء پر قابل بچوں کا حق مار رہا تھا۔ میں نے اس پر بہت محنت کی۔ بے حد، بے حساب محنت کی۔ میں اسے کہیں کمزور پڑتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا لوگ سمجھتے تھے مجھے اپنی اولاد کی کامیابی سے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟" انہوں نے بات ادھوری چھوڑی پھر وہ بدقت اٹھ کر ایک چیسٹ دراز کی طرف چلے آئے۔ وہ ہاتھ میں کچھ لے کر واپس آئے تھے۔

"یہ دیکھو میرے پاس اسکی ایک ایک کامیابی کا ریکارڈ ہے۔" انہوں نے سلمان کے آگے ایک ڈائری رکھی تھی۔۔۔اس پر کافی چیزیں درج تھیں۔۔۔وہ صفحات پلٹنے لگے۔

"یہ دیکھو اسکا پہلا ٹیسٹ بارہ مارچ انیس سو چوراسی کو ہوا تھا۔۔۔یہ دوسرا ٹیسٹ جو اس کے کچھ دن بعد ہوا۔۔۔یہ دیکھو یہ ٹیسٹ۔۔۔یہ دیکھو وہ ٹیسٹ۔۔۔" وہ اپنی لے میں بول رہے تھے۔انہیں شاید بہت عرصے بعد اپنے بیٹے کے بارے میں باتیں کرنے کے لئے کوئی ملا تھا۔سلمان کو بے پناہ دکھ ہوا۔وہ ایک باپ کی ذات کے بکھیے ادھیڑنے نہیں آیا تھا جبکہ وہ اپنے حال سے بے خبر بول رہے تھے۔

"یہ دیکھو ایک ایک چیز کو میں سنبھال کر رکھتا تھا۔لوگ جانے کیوں سمجھتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ایسا ممکن ہے بھلا۔۔۔مجھ سے بس یہ غلطی ہوئی کہ مجھے ظاہر نہیں کرنا آیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔" وہ اب چپ ہوئے تھے۔سلمان نے انہیں سکتے ہوئے سنا۔اس کی اپنی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔یہ کوئی قابل دید منظر نہیں تھا۔اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔

"میں سمجھ سکتا ہوں سر۔۔۔میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کو تکلیف دینے کا باعث بن رہا ہوں لیکن یہ سب جاننا بہت ضروری ہے۔۔۔بہت سی باتیں ہیں جو میں جاننا چاہتا ہوں۔۔۔میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر نور محمد کے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ اس کی دماغی حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے پڑھائی چھوڑنا پڑی۔۔۔اس کا پولیس ریکارڈ کیسے بنا۔۔۔اس نے ایسی کون سی غلطی کی تھی آخر اور پھر وہ لندن کیسے گیا۔۔۔کس کے ذریعہ گیا۔۔۔اور آخری سوال کہ اب وہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔انہوں نے حیرانی سے اس کے سوالات کو سنا پھر سختی سے تردید کی۔

"نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔۔۔وہ ایک بار پولیس کی گرفت میں آیا ضرور تھا لیکن وہ بھی میری غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔میں نے زندگی کے ہر معاملے میں اس پر بے جا سختی کی۔میں سوچتا رہا کہ اگر جنگ جیتنی ہو تو ٹریننگ سخت کرنی چاہیئے۔میں سمجھتا رہا کہ میں نرم پڑوں گا یا نرمی برتوں گا تو میرا بیٹا ناکام ہو جائے گا۔میں کیسے ثابت کر پاؤں گا کہ کسی رشوت معاونت کے بغیر بھی بچے پوزیشن لے سکتے ہیں۔مجھ سے غلطیاں ہوئیں لیکن نور محمد کے ذہن پر میرے رویے کا اتنا برا اثر پڑ رہا ہے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔وہ سولہ سال کا بھی نہیں تھا جب کالج میں آ گیا تھا۔لیکن وہ اپنی عمر کے باقی بچوں کی نسبت بہت معصوم تھا۔اکیڈمی میں لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔حالانکہ وہ اس لڑکی کو نوٹس وغیرہ دیا کرتا تھا لیکن چند شرپسند طبیعت کے حامل لڑکوں نے اسے اس بات کے لئے تنگ کرنا شروع کر دیا۔اسی بات کی وجہ سے اکیڈمی میں اس کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوا اور وہ میری زندگی کی سب سے بڑی خطا تھی کہ میں نے اسے ایک ناکردہ گناہ کی سخت سزا دی۔مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔مجھے اپنی تربیت پر بھروسہ ہونا چاہیئے تھا۔۔۔مجھے اپنے بیٹے پر یقین کرنا چاہیئے تھا لیکن میں نے اسے جھٹلا دیا اور تب ہی یہ چیز اس کے اعصاب کے لئے بہت بھاری ثابت ہوئی۔انہوں نے اسے وہ تمام تفصیلات بتانی شروع کیں۔۔۔اس کا گھر سے چلے جانا پھر ایک دور افتادہ پولیس اسٹیشن سے بازیاب ہونا۔اس کی ذہنی حالت بگڑنے کا قصہ پھر اینٹری ٹیسٹ میں ناکام ہو جانے کا دکھ۔

"میں نے اس پر پڑھائی کا اتنا بوجھ ڈالے رکھا کہ اس کے اعصاب کمزور سے کمزور ہوتے چلے گئے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسکی اس حالت نے میرے اعصاب پر کیا اثر ڈالا۔میں ایک سڑا ہوا درخت ہوں۔جسے کیڑا لگ چکا ہے۔اولاد کے دکھ کھوکھلا کر دیتے ہیں اور کھوکھلے وجود لے

کر اس دنیا کا سامنا نہیں کیا جاتا۔میں دنیا کے سامنے اس کے وجود سے منکر ہونے لگا۔اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔میری خاموشی کو میرے اپنے گھر والے بھی میری سنگدلی سمجھتے ہیں لیکن میں پھر بھی اپنے بیٹے کے بارے میں زبان نہیں کھولتا۔جس دن زبان کھولوں گا،ڈھے کر گر جاؤں گا۔اتنا کھوکھلا ہو چکا ہوں۔اتنا حوصلہ نہیں ہے میرا کہ دنیا کے سامنے اعتراف کرسکوں کہ اللہ نے مجھے جو ہیرا دیا تھا وہ خاک بنا دیا میں نے۔"سلمان نے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔درختوں سے جھڑتے پتے بھلے اچھے لگتے ہوں۔۔بوڑھے باپ جوان اولادوں کے دکھ روتے کبھی اچھے نہیں لگتے۔۔اس کا دل بہت بوجھل ہو چکا تھا۔

"میں آپ کے دکھ کو محسوس کرسکتا ہوں سر۔میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو پرانی باتیں یاد دلا کر آپ کے دکھ میں اضافے کا باعث بن رہا ہوں لیکن معافی چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے۔میں سب جاننا چاہتا ہوں۔۔۔نور محمد یو کے کیوں گیا۔اسے کون لے گیا۔۔۔وہ وہاں کیا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ کس علاقے میں رہ رہا ہے۔۔۔یہ سب باتیں انتہائی ضروری ہیں۔"اس نے ایک بار پھر درخواست دہرائی تھی۔سر آفاق علی نے آنکھیں صاف کیں۔

"وہ سن دو ہزار کے بالکل آخر میں یو کے گیا تھا اور اس کے ماموں اسے لے گئے تھے۔"وہ بتا رہے تھے پھر انہوں نے مزید تفصیلات بھی بتائی تھیں۔یہ بہت حیران کن باتیں تھیں یو کے جانے کے بعد نور محمد پر جو بیتی وہ مزید تکلیف دہ تھی۔انہی کی زبانی سلمان کو پتا چلا کہ نور محمد کے ماموں جو اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے،نے اپنی بیٹی کی شادی نور محمد سے کروادی تھی لیکن یہ شادی زیادہ نہیں چلی تھی کیونکہ اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔یہاں سے اس کے ماموں نے اسے بلیک برن بھجوادیا جہاں سے وہ آخری اطلاع کے مطابق لوٹن چلا گیا تھا۔سلمان کو اس مقام پر اس کہانی میں ابہام محسوس ہوا۔وہ سر آفاق کو مزید کریدنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس طرح وہ مشکوک بھی ہو سکتے تھے۔

آفاق صاحب سے ملنے کے بعد اس کو نور محمد کے بارے میں مزید تفصیلات تو پتا چلیں لیکن یہ ابھی بھی واضح نہیں تھا کہ نور محمد کے متعلق ایک این جی او اتنی حساس نوعیت کی معلومات کا ریکارڈ کیوں رکھ رہی ہے اور اب نور محمد کہاں تھا؟یہ سوال سب سے زیادہ حیران کن تھا۔اس کا جواب کھوجنے کے لئے سلمان حیدر نے مزید محنت کا ارادہ کیا۔سر آفاق علی سے ملنے اور ان کی حالت دیکھ کر اس نے انگلینڈ جانے کا پلان بنایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں انگلینڈ جانا چاہتا ہوں۔"اس نے رضوان اکرم صاحب سے کہا تھا جن کے ساتھ ان کے چینل پر وہ پہلے ایک مرتبہ کام کر چکا تھا۔وہ اسے کافی سراہتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔وہ اتنا بااختیار بھی نہیں تھا کہ کسی اور ملک میں جانے کا سوچتا اور سب وسائل اس کی دہلیز پر آموجود ہوتے۔اس کے لئے اسے کسی ایسے شخص یا پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جو اسے وسائل اور اختیار دلوا سکتا۔اس لئے وہ ان کے پاس آیا تھا۔

"اجازت ہے۔"انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے جنگامی بنیادوں پر ویزہ دلوا دیجیے۔"اس نے فوراً فرمائش داغی۔

"اپلائی کردو۔۔نکل آئے گا ویزہ۔"انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

"سادہ ویزہ نہیں چاہیئے۔ اختیارات بھی چاہئیں۔ ورنہ عمارتیں دیکھنے اتنی دور جانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے مجھے آپ کی ضرورت ہے۔" اس نے مدعا بیان کیا تھا۔

"میں جان سکتا ہوں کہ جناب کرنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ بھی ایک زیرک انسان تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سلمان کے عزائم کچھ اور ہیں۔

"کچھ خاص نہیں۔ سیر سپاٹا کروں گا۔ پاکستانی کمیونٹی سے ملوں گا۔ ان کے مسائل پر باتیں کروں گا۔ رپورٹس تیار کروں گا لیکن اس کے لئے مجھے اختیارات چاہئیں۔ آپ کی معاونت چاہیئے ورنہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے مجھے پکڑ کر لے جائیں گے کہ تم کس خوشی میں معلومات اکٹھی کرتے پھر رہے ہو۔"

"میں سی ای او کا برادر نسبتی نہیں ہوں۔۔۔ (اس زمانے میں ملک میں جنرل مشرف کی حکومت تھی) میری مہر سے جی میں مال و اسباب سے لدی کشتیاں بھی نہیں چلتیں۔۔۔ میں بالی ووڈ کی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر فلمیں بھی شوٹ نہیں کرواتا۔۔۔ یعنی نا کسی سیاست دان کا رشتے دار ہوں نا مالدار ارب پتی شیخ ہوں نا ہی بالی ووڈ کی چمکیلی چمکتی بھٹکتی ہیروئن ہوں۔۔۔۔ میں تو بہت عام سا انسان ہوں۔۔ میری اتنی پہنچ کہاں کہ کسی کو ویزہ مع اختیارات دلوا سکوں" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

"آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا سر۔۔۔ آپ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے" اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا

"تم نے میری خاطر آج تک کیا کیا ہے برخوردار۔۔۔ میرے چینل کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمارے اخبار میں بھی ملازمت کو الوداع کہہ دیا۔ کبھی میل ملاقات کے لئے بھی نہیں آئے۔ ایک فون کال کے روادار نہیں اور اب کہہ رہے ہو کہ تمہاری خاطر میں ویزہ ارینج کروں" وہ سابقہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

"سر اتنی بے مروتی کی توقع آپ سے نہیں تھی۔ میں نے گزشتہ بقر عید پر آپ کو کال کی تھی" وہ مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔

"وہ ایک پانچ منٹ والی سادہ فون کال۔۔۔" انہوں نے طنز آمیز نگاہیں اس پر مرکوز کی تھیں۔

"تو آپ کو کیا ساتھ بکرے کا گوشت بھی چاہیئے تھا؟" اس کا وہی انداز تھا۔

"سلمان یہ باتیں کسی اور کو سنانا۔ میرا وقت ضائع نہیں کرو۔۔۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں" انہوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور تب سلمان نے ان کو مختصراً چیدہ چیدہ باتیں بتا دی تھیں۔

"ہم۔۔۔" انہوں نے ہنکارا بھرا

"کام تو ہو جائیگا۔۔۔ دیٹس ناٹ اے بگ ڈیل۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ اسٹوری اگر جاندار نکلی تو پھر میرے پروگرام سے بریک ہوگی۔" انہوں نے یقین دہانی چاہی تھی۔ سلمان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس طرح ضروری کاروائیوں سے گزرنے کے بعد اسے ویزہ مل گیا تھا۔ اس نے سر آفاق سے وہ تمام ایڈریس لے لئے تھے جو انکے پاس موجود تھے۔ یو کے پہنچ کر وہ سب سے پہلے روچڈیل گیا تھا جہاں نور محمد کے ماموں کی رہائش تھی۔ وہ وہاں سے جا چکے تھے لیکن ان کا چھوٹا بیٹا ابھی بھی روچڈیل میں ہی رہتا تھا اور اپنے باپ کی دکان کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ اس سے تو زیادہ معلومات نہیں ملی تھیں لیکن اسی دکان کے ساتھ والی دکان پر موجود ایک پاکستانی کاریگر نے سلمان کو وہ سب کہانیاں بتائیں جو پاکستان میں نور محمد کے گھر والوں کو بھی

تفصیل سے نہیں پتا تھیں۔ ماموں کی زیادتیاں، ان کی بیٹی کا چال چلن، بیٹوں کی آوارگیاں اور نور محمد کی سادگی۔۔۔ وہیں سے سلمان کو مزید تفصیلات پتا چلیں کہ نور محمد شیزوفرینک ہو گیا تھا۔ اس کو اوڈ تو ہوتے تھے اور وہ ارد گرد والے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتا تھا۔ اس ریہیبی لیٹیشن سنٹر کا پتا بھی اسی کاریگر نے سلمان کو دوڑ دھوپ کر کے پتا کر کے دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نور محمد" وہ باریش داڑھی والے شخص کے سامنے بیٹھا اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ان کا نام سیف اللہ نیازی تھا اور وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بہت چاک و چوبند قسم کے انسان تھے۔ انہیں فوراً یاد آ گیا تھا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔

"جی ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں نور محمد کو" انہوں نے سلمان کے سوال کا اثباتی جواب دیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ آپ مجھے اس کا کچھ اتا پتا دے سکتے ہیں" وہ مودب انداز میں پوچھنے لگا

"جی نہیں۔۔۔ میں ایسے کسی کے متعلق آپ کو نہیں بتا سکتا جب تک کہ مجھے یہ نا پتا لگ جائے آپ کون ہیں اور نور محمد کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہیں۔۔۔" ان کا موقف دو ٹوک تھا۔

"میں اس کا کزن ہوں اور پاکستان سے اس سے ملنے کیلئے آیا ہوں" سلمان نے مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت جلدی نیند سے جاگے آپ۔۔۔ اتنے مہینے وہ یہاں اکیلا رہا۔۔۔ اپنے آپ سے بے خبر۔ تن تنہا۔۔۔ تب تو آپکو اس کی یاد نہیں آئی۔۔۔ اب جبکہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے۔۔۔ ایک نارمل زندگی گزارنے لگا ہے تو آپ اسے ڈھونڈتے ہوئے آ گئے ہیں"

"ہم سب اس کی حالت سے باخبر نہیں تھے۔۔۔ وہ یہاں اپنے ماموں کے ہمراہ رہ رہا تھا۔۔۔ انہوں نے ہمیں ہمیشہ لاعلم رکھا اور نور محمد کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں گھڑ کے بتاتے رہے۔۔۔ اس کے والدین بہت پریشان ہیں سر۔۔۔ وہ اپنے بیٹے سے ملنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں صرف اتنا پتا ہے کہ وہ چند سال پہلے یہاں تھا۔۔۔ اس کے بعد وہ یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔۔۔ اس کے بعد سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔۔۔ ایک بار اسکے متعلق کوئی مثبت رپورٹ مل جاتی تو میں اس کے والد محترم کو بتا کر سرخرو ہو سکوں گا۔۔۔ آپ کو اگر اسکی اطلاع ہے تو پلیز مجھے بتائیے۔ اس کی ماں کے بے چین دل کو قرار آ جائے گا سر" اس نے ان بزرگ کو جذباتی انداز میں ٹریپ کرنا چاہا تھا۔ اس مقام پر اس کو دل میں یقین تھا کہ نور محمد کسی نا کسی غلط سرگرمی میں ملوث ضرور ہو گا اور اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ یہ بزرگ بھی اس کے معاون ہو سکتے ہیں۔

"اس کے والد اب تک کہاں تھے جنہیں میرے جیسا بچہ پہلے یاد ہی نہیں آیا" وہ کافی رعب اور دبدبے والے انسان تھے۔ سلمان کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی کہ وہ کوئی وضاحت دے پاتا۔

"لوٹن میں رہتا ہے آجکل۔۔۔ موذن بھی ہے اور امامت بھی کرواتا ہے ماشاءاللہ۔۔۔" وہ پرجلال انداز میں بولے تھے۔ سلمان نے سر ہلایا پھر شکل پر مصنوعی رقت طاری کر کے بولا۔

"آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔ وہ یہاں سے لوٹن کیوں اور کیسے چلا گیا اور پھر اس نے اپنے ماموں کے پاس واپس جانا کیوں مناسب نہیں سمجھا۔۔۔ اس کے والد تو وہاں پاکستان میں یہی جانتے ہیں کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر لوٹن گیا تھا"

"سب بیکار کی باتیں ہیں، جھوٹ کا پلندہ ہیں۔۔۔ وہ جب یہاں آیا تو ذہنی حالت ایسی تھی کہ ہر دوسرے روز دورہ پڑنے لگتا تھا۔۔ ڈوپامائن لیول بڑھ گیا ہوا تھا۔۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ کسی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اتنی خراب حالت میں بھی اس کے ماموں کو بھی توفیق نا ہوئی کہ آ کر اسکی خیر خبر لیتے۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس پر کوئی رقم نہیں خرچنا چاہتے تھے۔۔۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اگر آ کر پوچھیں گے تو اس کے اخراجات کے لئے رقم کا مطالبہ کیا جائے گا سو انہوں نے اس سے لاتعلقی اختیار کر لی۔۔۔ جبکہ ہم نے اسے اپنے خرچے پر دوائیں استعمال کروائیں۔۔۔ اس کی کاؤنسلنگ کی۔ وہ بہت جلدی صحت یاب ہو گیا تھا۔ اس کو دورے پڑنا بھی بند ہو گئے تھے اور پھر میں نے اسے قرآن پڑھانا شروع کیا۔۔۔ آپ یقین نہیں کرو گے برخوردار۔۔۔ وہ اتنا ذہین بچہ تھا کہ ایسی دماغی حالت کے باوجود اس نے نو مہینے میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔۔۔ اسے اللہ سبحان تعالیٰ نے ایک حیرت انگیز دماغ دیا تھا۔ دو سال لگاتار یہاں ہماری مسجد میں نماز تراویح کی امامت کرواتا رہا۔۔ پھر اسی لئے میں نے اسے لوٹن بھجوا دیا۔۔ وہاں جامعہ مسجد کا ملازم ہے۔۔۔ ہفتہ وار تنخواہ کماتا ہے۔۔۔ اچھی بھلی زندگی گزار رہا ہے۔۔ اور وہ بھاگ کر کہیں نہیں گیا تھا، میں نے خود اسے وہاں بھرتی کروایا تھا۔۔۔ جب تندرست ہو چکا تھا تو کیوں مفت کی روٹیاں تڑواتے اس سے۔۔ اپنی کماتا ہے، کھاتا ہے ماشاء اللہ" وہ جنک کر بولے تھے۔

"آپ مجھے اس کا کوئی اتا پتا دے دیں۔۔۔ میں اس سے ایک دفعہ ملنا چاہتا ہوں" اس نے کہا تھا

"دے دوں گا۔۔۔ اگر تم یہ بتا دو کہ تم کون ہو؟" انہوں نے اسکی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ سلمان گڑبڑا سا گیا۔ وہ صحافی تھا، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا رہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا وہ سب کو آرام سے چکما دے سکتا ہے لیکن سامنے بیٹھے بزرگوار نے چند منٹ میں اس کے اس غرور کا کیا کچا کر ڈالا تھا۔

"میں۔۔۔؟ اس کا کزن ہوں۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا" وہ بات بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو۔۔۔ یہ جو کزن، رشتہ دار۔۔۔ دوست احباب ہوتے ہیں نا ان کی آنکھوں میں ایسی کھوج نہیں ہوتی جیسی تمہاری آنکھوں میں ہے۔۔۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ سلمان نے ایک لمحہ ہی سوچا تھا پھر کسی انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے خدا کو یاد کرتے ہوئے انہیں کچھ نا کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔ اس نے انہیں مختصراً بتایا تھا کہ نور محمد کا تعلق کس طرح ایک جہادی تنظیم سے جوڑا جا رہا ہے۔ وہ چونکہ سادہ لوح انسان ہے اور ٹریپ کیا جا سکتا ہے تو اس سے ملنا ضروری ہے۔" سیف اللہ نیازی نے اس کی باتوں کو غور سے سنتے رہے تھے۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔ میں نور محمد کو دوست کی حیثیت سے تلاش نہیں کر رہا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔۔۔ میں اس کا خیر خواہ ہوں۔۔۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں نور محمد کو اس کے والدین سے ملوا سکوں۔۔۔ میرا مقصد صرف اتنا ہی ہے" اس نے انہیں یقین دلایا تھا۔

"تم ایڈریس لے لو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو اس سے ایسی کوئی بات مت کرنا جس سے اسے کوئی تکلیف ہو۔ وہ دماغی طور پر تندرست ہے لیکن ابھی بھی اس کے اعصاب بہت مضبوط نہیں ہے۔ اس کی ذہنی رو بھٹک بھی سکتی ہے سو الزام تراشی سے پرہیز کرنا۔ اور اس کے ماں باپ سے ملوا تو

ایک بات میری طرف سے ضرور کہنا کہ انہوں نے چاہے اسے دنیا میں چھوڑ دیا ہو لیکن وہ اتنے کرموں والا بچہ ہے کہ جنت میں بھی انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔۔۔ساتھ لے کر جائیگا۔۔۔" انہوں نے جتا کر کہا تھا۔سلمان چپ چپ کا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے بعد وہ لوٹن پہنچا تھا لیکن یہاں پہنچنے سے پہلے اس نے لوٹن کے متعلق کافی معلومات اکٹھی کی تھیں۔انٹرنیٹ پر بھی اور اخبارات کے ذریعے بھی اور وہاں مقیم مسلم آبادی سے بھی ملاقاتیں کر کے اس نے کافی مواد اکٹھا کیا تھا۔لوٹن کے بارے میں اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مسلم کمیونٹی زیادہ تھی۔۔۔یہاں کافی جگہوں پر مسلم روایات کی پاسداری بھی کی جاتی تھی جس کی بناء پر مقامی آبادی ناخوش رہتی تھی اور مسائل بھی لاتعداد تھے۔جھڑپیں اور فسادات بھی ہوتے رہتے تھے۔مقامی سفید فام اکثریت نے ایک تنظیم یو پی ایل بنا رکھی تھی جو بظاہر خیر فعال نظر آتی تھی لیکن پھر بھی سفید فام آبادی کی جانب سے بھوری رنگت کے حامل بالعموم دیسی اور بالخصوص ریڈیکلز کہلائے جانے والے لوگ عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت المہاجرون تھی جس کے متعلق سوالات اٹھتے رہتے تھے اور زیادہ تر مسلمان آبادی بھی اس تنظیم سے ناخوش تھی۔یہ لوگ شریعت کے نفاذ کی بات کرتے تھے جبکہ یو پی ایل کے نمائندگان شریعت کے خلاف زہر اگلتے تھے اور مسلمانوں اور ان کی روایات کا کھلے عام مذاق اڑاتے تھے۔قرآن کے اوراق کی بے حرمتی،مسجد میں آنیوالے نمازیوں پر آوازیں کسنے کے واقعات اور خنزیر کا گوشت یا کچرا مسجد کے احاطے میں پھینکنے کی باتیں بھی سننے میں آتی تھیں۔سلمان نے ایک دن جامعہ مسجد میں ایک وقت کی نماز بھی ادا کی۔اس نے وہاں نور محمد کو بھی دیکھا۔اسے پہچاننے میں اسے زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی کیونکہ سر آفاق نے اسے اسکی ایک دو تصویریں دکھائی تھیں۔سلمان کو اس سے زیادہ حیرانی اس کے ساتھ موجود سفید فام کو دیکھ کر ہوئی۔وہ دونوں زیادہ تر وقت ایک ساتھ ہی نظر آتے تھے جبکہ ان کی عمروں میں تقریباً دگنا فرق تھا۔نور محمد تیس بتیس سال کا تھا جب کہ وہ سفید فام پچاس پچپن کے پیٹے میں لگتا تھا۔سلمان کو بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک نو مسلم ہیں اور ان کا نام احمد معروف ہے۔اس نے احمد معروف کے متعلق پوچھ گچھ کی تو اس شخص کی شناخت "بل گرانٹ" کے نام سے ہوئی جو ناول نگار بھی تھے۔

بل گرانٹ کے متعلق اس نے سب سے پہلے انٹرنیٹ پر ریسرچ کی تھی۔جہاں مع ان کی تصویر کے ان کے متعلق کافی معلومات مل گئی تھیں۔دوسری اہم بات جو ان کے متعلق اسے پتا چلی وہ ان کی شہرت تھی،وہ کوئی عام ناول نگار نہیں تھے بلکہ کافی مشہور لکھنے والے ادیب تھے۔سلمان نے یہاں بھی رضوان اکرم سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔اس نے انہیں کال کیا تھا اور اس شخص کے متعلق کچھ معلومات فراہم کرنے کے لئے کہا تھا۔اس کے ناولز اور ان کی تھیمز کے بارے میں اسے رضوان اکرم سے پتا چلا تھا اور یہ بات بھی انہوں نے ہی بتائی تھی کہ وہ اپنی ہندو بیوی کی خودکشی کے بعد سے گمنامی کی زندگی گزار رہا ہے اور اس کا آخری ناول جس پر وہ کام کر رہا تھا ابھی مکمل نا ہو سکا تھا۔احمد معروف عرف بل گرانٹ کے متعلق مزید معلومات اسے سیف اللہ نیازی سے بھی ملی تھیں۔سیف اللہ نیازی دراصل وہی شخص تھے جنہوں نے بل گرانٹ کو نور محمد کے متعلق بتایا تھا۔وہ بل گرانٹ کے متعلق بھی کافی باتیں جانتے تھے جو انہیں خود بل گرانٹ نے بتائی تھیں۔سلمان نے دوبارہ جا کر ان سے ملاقات کی تھی کیونکہ جامعہ مسجد سے اسے پتا چلا تھا کہ بل گرانٹ نے بلیک برن کی جامعہ مسجد کے امام سیف اللہ خان نیازی کے سامنے اسلام قبول کیا تھا جبکہ وہ اس بات کی شہادت سے

انکاری ہو گئے تھے کہ بل گرانٹ نے ان کے سامنے کلمہ پڑھا تھا لیکن انہوں نے بل گرانٹ کی تعریف کی تھی اور اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ انہوں نے بل گرانٹ سے کہا تھا کہ وہ کسی "مومن" بندے سے ملنا چاہتا ہے تو ایک بار "نورمحمد" سے ضرور ملے۔ اب کی بار سلمان نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا کہ کیسے وہ نور محمد کے بارے میں جاننے کے لئے یہاں آیا ہے اور کس طرح پاکستان میں کام کرتی ایک این جی او کے پاس اس کا ریکارڈ ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ دہشت گرد تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ سیف اللہ خان نیازی نے ہی سلمان کو بتایا تھا کہ بل گرانٹ اچھا انسان ہے لیکن وہ اس بات کی سوفیصد گواہی نہیں دے سکتے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے یا نہیں۔ اس طرح سلمان نے خاطر خواہ ہوم ورک کر کے ایک دن ان دونوں کو پوسٹ آفس میں جالیا تھا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ اتفاقیہ نور محمد سے آملا ہے۔ یہاں تک سب ویسا ہی ہوا تھا جیسا اس نے سوچا تھا لیکن وہ وہاں چونک گیا تھا جب اس نے بل گرانٹ عرف احمد معروف سے ساری باتیں مکمل کر کرنی شروع کی تھیں۔ نور محمد اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا تھا۔ سلمان کو ان دونوں کی نیت پر جو شک تھا وہ کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ دونوں ہی جھوٹ نہیں بول رہے لیکن وہ لہجے کو نرم رکھ کر معاملہ نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس نے احمد معروف سے اپنے مخصوص انداز میں ہی بات کی تھی جو وہ صحافی بن جانے کے بعد اپنایا کرتا تھا لیکن اس مقام پر سارا معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ وہ احمد معروف کی گفتگو سے متاثر ہوا تھا جب ہی انہوں نے اسے اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا تھا۔ وہ ان کے ہمراہ دوسرے کمرے تک گیا تھا لیکن تب ہی کسی نے عقب سے اس کے سر پر کسی وزنی چیز سے وار کیا تھا۔ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر نیچے گر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کا نام سلمان حیدر ہے" وہ پوچھ رہی تھی۔ گاڑی راولپنڈی سے لاہور کی جانب گامزن تھی۔ وہ زارا کو لینے بھی خود آیا تھا اور اب ڈراپ بھی خود کرنے جا رہا تھا۔ زارا کو پہلی بار اس سے عجیب سا خوف لاحق ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کر پائی تھی۔ وہ فون کال کے آجانے کے بعد سب کام ادھورا چھوڑ کر جانے کہاں چلا گیا تھا اور دو اڑھائی گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچوں کا جال بنا تھا اور اپنے مخصوص باتونی انداز میں باتیں کرنے کی بجائے کافی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"ہاں۔ کیوں اچھا نام نہیں ہے کیا" وہ اسی انداز میں پوچھ رہا تھا جو اس کا خاصہ تھا۔ زارا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں" وہ ابھی بھی مناسب الفاظ جمع نہیں کر پائی تھی۔

"کیا۔۔۔؟" اس نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کو اپنا صحیح نام مجھے بتانا چاہیے تھا" وہ لہجے میں زور دے کر بولی تھی۔ اس کی خفگی بھی اب لہجے سے عیاں ہونے لگی تھی۔

"ٹیپو بھی غلط نام نہیں ہے۔۔۔" اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا تھا پھر موڑ کاٹتے ہوئے مزید بولا۔

"یہ نام میرے ابو نے رکھا تھا اور مجھے یہ نام بہت عزیز ہے اور یہ نام صرف ان لوگوں کو بتاتا ہوں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔۔۔ کوئی اعتراض؟" وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔ زارا چند لمحے سوچتی رہی کہ مزید کیا پوچھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں تمہیں عام سا کم پڑھا لکھا انسان سمجھتی تھی جو کہیں ڈسپنسر یا کم پاؤنڈری جاب کرتا تھا۔ یہ کہنا بہت بڑی بد اخلاقی ہوتا۔

"اب مراقبے میں کیوں چلی گئی ہو۔۔۔اس میں اتنا برا منانے والی کیا بات ہے کہ اگر پھپھو کا نام سلمان حیدر ہے تو۔۔۔لوگ مالٹے کو بھی تو کینو کہتے ہی ہیں۔۔۔اور شلجم کو گونگلو بھی۔۔۔اس پر تو کبھی کسی نے ایسے منہ نہیں بگاڑا ہوگا جیسے تم نے بگاڑ لیا ہے" وہ اتنے عام سے انداز میں مثالیں دے رہا تھا کہ نا چاہتے ہوئے بھی زارا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ نے کبھی اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔۔۔میں آپ کے گھر جاتی ہوں۔۔۔آپ کی امی کو آنٹی کہتی ہوں۔۔۔آپ لوگوں کے گھر کھانے کھاتی ہوں۔۔۔آپ سے اپنے مسئلے ڈسکس کرتی ہوں۔۔۔اسکے باوجود میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی" اس نے گود میں رکھے ہاتھوں کو بلاوجہ مسلا تھا۔

"اسکی وجہ بھی میں ہوں کیا؟" وہ پوچھ رہا تھا پھر اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

"تمہیں اپنے اور اپنے شہروز صاحب کے بارے میں بات کرنے سے فرصت ملے تو کبھی کسی اور کے متعلق بات ہو نا۔۔۔اچھا اب خفا مت ہو۔۔۔پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو۔۔۔اب خدارا میری امی کی طرح یہ مت پوچھنا کہ آمنہ کون ہے"

"آمنہ کے بارے میں بات کیوں نہیں کرنا چاہتے آپ؟" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"ارے میں نے کب کہا کہ مجھے آمنہ کے بارے میں بات نہیں کرنی۔۔۔تم تو بلاوجہ خفا ہو رہی ہو۔۔۔کہیں بھوک تو نہیں لگی۔۔۔آج میں چاکلیٹ لایا ہوں تمہارے لئے۔۔۔یہ چیمبر کھول کر نکال لو" وہ مسکرا رہا تھا۔ زارا نے چیمبر کھولنے کے لئے ہاتھ آگے نہیں کیا تھا۔

"مجھے چاکلیٹ لینی ہے نا چیمبر کھولنا ہے۔۔۔پھر آپ کے کوئی ضروری کاغذات میرے ہاتھ لگ جائیں گے اور آپ غصہ کریں گے" وہ گزشتہ بار کا واقعہ یاد کرتے ہوئے بولی تھی جب پھپھو نے اپنے کچھ کاغذات اس کے ہاتھ لگنے پر چھیننے کے انداز میں لے لئے تھے۔

"زارا! تمہیں تو معصوم انسانوں سے بدگمان ہونے کا موقع ملنا چاہیئے۔۔۔غصہ نہیں کیا تھا میں نے۔۔۔اتنا ہی کہا تھا کہ یہ کاغذات واپس رکھ دو۔۔۔بہت اہم ہیں" پھپھو ہنستے ہوئے بولا تھا۔

واپس رکھنے کے لئے نہیں کہا تھا بلکہ میرے ہاتھ سے لے کر رکھ دیئے تھے جیسے میں آپ کے وہ دس روپے کے پیپرز کھا جاؤں گی" زارا نے ناک چڑھائی تھی۔

"خدا کو مانو لڑکی۔۔۔تمہیں کیا پتا کہ وہ کتنے قیمتی ہیں میرے لئے۔۔۔میں انکے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہوں۔۔۔" زارا نے اسکی بات کاٹی۔

"یہی تو پتا کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ کیا کرتے ہیں۔۔۔کون ہیں۔۔۔کہاں کام کرتے ہیں" یہ تھیں وہ باتیں جو زارا واقعی اب جاننا چاہتی تھی۔ایک فون کال نے اس کے دل میں وہ خدشات جگا دیے تھے جن کا اظہار شہروز نے اس سے کیا تھا۔

"گڈ مارننگ ڈاکٹر زارا۔۔۔آپ کو لمبی نیند سے بیدار ہونے پر میں "صبح الخیر" کہتا ہوں" وہ اسے چڑا رہا تھا۔وہ جانے کیا کھاتا تھا اسے باتیں ٹالنے کا ہنر آتا تھا۔

"آپ جب اس طرح میری باتوں کو بچگانہ سمجھتے ہوئے مجھے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں نا تو مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے" اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں شہروز کے علاوہ آج تک کوئی اچھا لگا بھی ہے؟" وہ ترت بولا تھا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی پھر وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی تھی۔
"نہیں۔۔۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی تھی۔ مجو نے قہقہہ لگایا تھا۔
"مجھے ایک گانا یاد آ گیا ہے۔۔۔ عرض کیا ہے۔۔۔ منڈا شہر لاہور دا۔ میرے دل تے تیر چلاوے" اس نے گانے کو پڑھنے کے انداز میں گاتے ہوئے آنکھیں بھی مٹکائیں تھیں۔ زارا نے قہقہہ لگایا۔
"واہ واہ۔۔۔ مکرر مکرر" وہ بولی تھی۔ اسے اب یاد رہا تھا تو شہروز باقی سب جیسے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ مجو واقعی باتیں ٹالنے میں ماہر تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ لندن میں اس کی پہلی صبح تھی۔
وہ آیا تو دس دن پہلے تھا لیکن جس روز آیا اسی شام کو برمنگھم چلا گیا تھا۔ رضوان اکرم لندن میں تھے اور وہ مزید چند صحافیوں کے ساتھ برمنگھم جا رہے تھے۔ وہاں سے ان لوگوں نے تفریحی ٹور کے لئے اسکاٹ لینڈ جانا تھا۔ شہروز کا یہ شیڈول طے شدہ تھا سو وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا گیا تھا اسے مزا بھی آیا تھا لیکن لندن میں اپنے چاچو کے گھر کا سکون اسے زیادہ پسند آ رہا تھا۔
آنکھ کھلی تو روشنی کمرے کی واحد کھڑکی سے چھن چھن کر اندر بستر تک آ رہی تھی۔ اس کو پہلی ہی صبح بہت بھلی لگی۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ پاکستان میں موسم ابھی بھی گرم تھا لیکن یہاں اسے موسم خوشگوار لگ رہا تھا۔ کمرے میں پنکھا تو تھا ہی نہیں لیکن اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کروٹ بدل کر کچھ دیر ایسے ہی لیٹا رہا۔ ابھی مزید سونے کی طلب تھی لیکن آنکھ کھل چکی تھی سو دوبارہ نیند آنا مشکل بات تھی۔
اس کی توقع کے برعکس نیند اچھی آگئی تھی۔ اسے کمرہ بھی بہت پرسکون دیا گیا تھا جو چھوٹا لیکن بے حد پرسکون تھا۔ آرام دہ بیڈ کے علاوہ لکھنے پڑھنے کے لئے میز جس پر ڈیسک ٹاپ بھی تھا اور کرسی بھی تھی۔ ایک طرف ٹی وی تھا۔ جس کے سامنے دو موڑھوں کی طرح کے فلور کشن تھے۔ کمرے میں ہلکے ہرے رنگ کا پینٹ تھا جبکہ بیڈ کور اور کمرے کی واحد کھڑکی پر جھولتا پردہ سفید اور ہرے پھولوں والا تھا۔ رنگوں کا بڑا مناسب سا امتزاج تھا۔ اسے سب کچھ بڑا بھلا لگا تھا۔
اس نے بستر سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ باتھ روم سے فراغت کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا تھا اور باہر دیکھنے لگا تھا۔ اس پاس شاید کوئی اسکول تھا کیونکہ یونیفارم میں ملبوس مختلف عمروں کے بچے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑا بلاوجہ باہر دیکھتا رہا۔ اسے سگریٹ پینے کی طلب ہو رہی تھی اور وہ یہاں سگریٹ پینا نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ وہ لاہور اپنے گھر میں بھی کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن کراچی اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا اس لئے صبح بیدار ہونے کے بعد سگریٹ پینے کی لت سی لگتی جا رہی تھی۔ اپنی طلب سے لڑتے ہوئے وہ صرف وقت گزاری کے لئے باہر دیکھنے لگا تھا۔
بیرونی بڑی سڑک پر ایک بزرگ سفید فام ہاتھ میں ایک بورڈ لئے کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تین بچوں کا گروپ جیسے ہی سڑک پار کرنے کے لئے اس سمت آئے۔ ان بزرگ شخص نے اپنا بورڈ والا ہاتھ ہوا میں بلند کر دیا تھا جس پر اتنی دور سے لکھا ہوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن شہروز

نے دیکھا دو گاڑیوں نے جو تیزی سے آرہی تھیں اس بورڈ کو دیکھ کر رفتار آہستہ کر لی تھی۔ اس بوڑھے شخص نے اس کے بعد بچوں کو اشارہ کیا تھا۔ وہ تینوں بچے اطمینان سے بزرگ کی طرف مسکراہٹ اچھالتے ہوئے سڑک پار کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ شہروز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے یہ سب اچھا لگا۔ لندن کا پہلا تاثر ہی بہت گہرا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ سامنے عمر کھڑا تھا۔ نہایا دھویا تر و تازہ نکھرا نکھرا۔۔۔

"اسلام وعلیکم۔۔گڈ مارننگ۔۔۔میرے ابو کے گھر میں پہلی صبح مبارک ہو" وہ اندر داخل ہوتا ہوا بشاشت سے لیکن عجلت بھرے انداز میں بولا تھا۔

"میں آفس کے لئے نکل رہا تھا۔ سوچا تم سے مل کر جاؤں پھر واپسی پر تو میں لیٹ ہو جاتا ہوں آج کل۔ ذرا یہاں آؤ کچھ چیزیں سمجھانی ہیں "وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ کھول رہا تھا۔

"امائمہ بھی آئی ہے؟" شہروز نے بیڈ کی سمت آتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔وہ شام کو آئیگی۔۔۔میں تو تمہیں کچھ چیزیں دینے آیا تھا۔۔۔یہ ووڈا فون کی انٹرنیشنل سم ہے۔ اسے اپنے فون میں انسرٹ کرلو۔۔۔تمہیں ہم سے رابطہ کرنے میں آسانی رہیگی۔۔۔یہ جو بیک اسٹریٹ ہے نا۔۔اس کے دائیں طرف پوسٹ آفس ہے۔ وہاں سے تم ڈے کارڈ لے لینا لیکن دس بجے کے بعد جانا۔۔۔پہلے جاؤ گے تو کارڈ مہنگا ہوگا۔۔۔دس بجے کے بعد رش کم ہو جاتا ہے تو ریٹ کم ہو جاتا ہے۔ لندن دیکھنا ہے تو گھوم پھر کر ہی دیکھنا پڑے گا اس لئے ضروری ہے کہ تم یہاں کا روٹ سسٹم سمجھ لو۔ یہ میپ ہے۔ اس کے مطابق چلو گے تو آسانی سے سب سمجھ آجائیگا۔ میرا مشورہ ہے پہلے دن تم سنٹرل لائن سے جوبلی لائن تک کا کارڈ لینا اس میں چار اسٹیشن آجائیں گے۔ میں ابو اور عمیر تینوں شام کو ہی آئیں گے۔۔تم اکیلے ہو گے سارا دن لیکن ایسے گھر بیٹھے رہے تو بہت جلد اکتا جاؤ گے اس لئے بہتر ہے ذرا باہر چلے جانا۔۔۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"بہت خوب۔۔تم پاکستان آتے ہو تو ہم تمہیں اکیلے گلیاں گھمانے بھیجتے ہیں کیا؟۔۔۔میرے ساتھ چلنا۔۔میں اکیلا کہیں نہیں گھوم سکتا "شہروز مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔

"میں ویک اینڈ پر جوائن کروں گا تمہیں۔۔۔اس سے پہلے بہتر ہے تم خود بھی کہیں نکلو ورنہ تم پورا لندن نہیں دیکھ پاؤ گے۔۔گھر میں صرف ممی ہوں گی۔ لنچ کے بعد امائمہ بھی آجائیگی لیکن یہ دونوں خواتین تمہیں بور کر دیں گی اس لئے بہتر ہے دو تین گھنٹے ذرا باہر نکل جانا۔" وہ وضاحت دے رہا تھا۔ شہروز کچھ نہیں بولا۔

"یہ کچھ کیش ہے۔۔۔پچاس پاؤنڈز ہیں اور یہ میرا اے ٹی ایم ہے۔۔۔اس کا پن کوڈ میرا ڈیٹ آف برتھ ہے۔۔مجھے پتا ہے تمہارے پاس پیسے ہیں لیکن وہ روپے ہوں گے۔۔۔پاؤنڈز نہیں۔۔۔اس لئے جب تک تم روپوں کو پاؤنڈز میں کنورٹ نہیں کروا لیتے۔۔۔صرف تب تک تم میرا اے ٹی ایم استعمال کر سکتے ہو" عمر نے والٹ کھول کر اس میں سے رقم اور اپنا کارڈ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ شہروز کو حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ عمر اس کو کیش اور اپنا کارڈ تک دے ڈالے گا۔۔۔اسے اس کے خلوص پر بہت پیار آیا۔

"ارے نہیں نہیں۔۔۔مجھے ضرورت نہیں ہے۔۔میرے پاس یوروز ہیں۔۔۔یہ مت کرو تم" وہ اسکا کارڈ اٹھا کر اسے واپس تھمانے لگا۔

"اوہو۔۔۔اپنے یوروز بھی سنبھال کر رکھو۔۔۔یہ پاؤنڈز ہیں۔۔۔چپ چاپ رکھ لو اب والٹ میں اور اتنے بھی شو مت بنو۔۔۔میں جانتا ہوں تم بہت امیر ہو گئے ہو لیکن ہمیں بھی اپنا فرض ادا کرنے دو" وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی زپ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔اب کی بار شہروز کچھ نہیں بولا تھا حالانکہ وہ پاکستان سے ہی کچھ روپے یورو میں کنورٹ کروا کر لایا تھا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا تا کہ عمر کو دکھا سکے کہ اس کے پاس پیسے ہیں "اب کدھر جا رہے ہو؟" عمر نے اسے اٹھتا دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"ابھی تو صرف واری صدقے جا رہا ہوں تمہارے انداز پر۔۔۔ماشاءاللہ بڑے ذمہ دار ہو گئے ہو" شہروز نے چڑایا پھر وہ اپنا والٹ کھولنے لگا تھا۔۔۔عمر نے ناپسندیدگی سے اسکو دیکھا پھر والٹ پکڑ کر اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"چل پھر لائے لگتا ہوں۔۔۔شام کو ملاقات ہوگی پھر بات کریں گے ذمہ داریوں کی۔۔۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔شہروز نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نور محمد؟" شہروز نے ناسمجھی کے عالم میں عمر کا چہرہ دیکھا تھا۔اسے ایک دم یاد نہیں آیا تھا کہ عمر کس کا ذکر کر رہا ہے۔لندن آمد کے بعد یہ پہلا ویک اینڈ تھا اور عمر اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے کافی پر جوش تھا۔وہ آفس کے بعد روز ہی ممی کے گھر آجاتے تھے۔آج بھی وہ آفس سے نہیں آیا تھا اور اب وہ دونوں کافی کے مگ لے کر عمیر کے کمرے میں آبیٹھے تھے۔ایک دور کے رشتہ دار کی فیملی ڈنر کے لئے آرہی تھی اس لئے امائمہ بھی ممی کی معاونت کے خیال سے ان کے گھر پہ تھی۔عمر نے یہ موقع مناسب سمجھتے ہوئے شہروز کو ساتھ لیا تھا اور اوپر آ گئے تھے۔عمر تفصیل سے اس سے نور محمد کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں نور محمد۔۔۔تمہیں یاد ہے نا۔۔۔بہروز بھائی نے ہمیں ایک بار بتایا تھا کہ امائمہ کا بھائی ان کا کلاس فیلو تھا۔وہ جو بعد میں کسی نفسیاتی بیماری کے چکر میں مینٹل ہاسپٹل میں داخل تھا۔۔۔" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اوہو۔تمہیں یاد کیوں نہیں آرہا" عمر نے اکتا کر پوچھا تھا۔شہروز نے سر ہلایا۔اس کی توجہ خشک میوہ جات کی پلیٹ میں زیادہ تھی جو عمر کافی کے ساتھ اٹھا لایا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔یاد تو آگیا ہے لیکن مسئلہ کیا ہے۔۔۔اتنی رازداری سے بات کیوں کر رہے ہو" اس نے کھٹے میٹھے روسٹڈ کاجو کے دانے مٹھی میں بھرے تھے۔

"وہ یہاں ہے۔۔یو کے میں۔۔۔کسی اسائلم میں نہیں ہے" عمر نے اپنی تئیں کوئی راز آشکار کیا تھا اس پر۔

"اچھا۔۔۔یہاں ہے؟ امائمہ ملتی ہے اس سے۔۔ملنا بھی چاہیے۔۔بھائی ہے اس کا۔" وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔عمر نے اسکے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"بھائی مانا تو بہت ہینڈسم ہو گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ عقل کو استعمال ہی نہیں کرنا۔۔اس کو پیکنگ میں رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے کیا

؟" وہ مصنوعی انداز میں چونک کر اس کے سر پہ انگلی سے دستک دیتے ہوئے بولا تھا۔شہروز ہنسا۔

"بک بک نہیں کر۔۔تعریف کرنی ہے تو کھل کر کر" اس نے کاجو کا ایک دانہ اس کی جانب اچھالا تھا۔

"تمہیں بھی لڑکیوں کی طرح تعریفیں سننے کا زیادہ ہی شوق ہو گیا ہے۔۔لیکن فی الحال ذرا اپنی ذات سے باہر نکلو اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔۔۔یہ بہت اہم معاملہ ہے۔۔۔مجھے یہ بتاؤ کہ امائمہ کا ایک بھائی ہے نور محمد۔۔۔یہ بات تمہیں پتا ہے یا نہیں؟" عمر کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو محسوس کر کے شہروز بھی سنجیدہ ہوا تھا۔

"ہاں یہ بات تو پتا ہے مجھے۔۔۔اور یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ وہ یہاں ہے۔۔۔آگے چلو" وہ بتا بھی رہا تھا اور پوچھ بھی رہا تھا۔

"نہیں یہاں لندن میں نہیں ہے۔۔لوٹن میں ہے۔۔" عمر نے اپنے گھٹنے کے نیچے رکھا کشن نکال کر اپنے انداز نشست کو مزید آرام دہ بنایا تھا۔

"میں تمہیں مختصر الفاظ میں ساری بات بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔امائمہ کا ایک بھائی تھا نور محمد۔۔۔جس کے بارے میں ہمیں بہروز بھائی نے بتایا تھا کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھا اور بعد میں کسی لڑکی کے ساتھ افیئر کی بناء پر انکل آفاق نے اسے کافی مار پیٹ کی تھی اور وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔۔یہ ہیں وہ باتیں جو ہمیں بہروز بھائی سے پتا چلی تھیں لیکن اب امائمہ نے مجھے اس بارے میں کافی تفصیل سے بتایا ہے۔۔۔اصل قصہ یہ نہیں ہے" عمر نے رک کر اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی کہ آیا اسے ابھی بھی اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی ہے یا نہیں۔اسے یہ احساس بھی تھا کہ شاید شہروز اس مسئلے میں زیادہ دلچسپی نہ لے لیکن چونکہ وہ امائمہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ اس کے بھائی کی تلاش میں اس کی مدد کرے گا تو یہ اس کے لئے اب کسی مہم سے کم نہیں تھا۔اس کی دلی خواہش تھی کہ شہروز اس سلسلے میں ذاتی دلچسپی لے۔

"اصل قصہ کیا ہے پھر؟" شہروز نے پوچھا تھا۔

"امائمہ کا بھائی کسی لو ٹینک اسائلم میں نہیں تھا بلکہ 2000 میں یو کے آگیا تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھا اس کا علاج بھی ہوتا رہا تھا لیکن اسکی وجہ کوئی لڑکی نہیں تھی یا کوئی افیئر وغیرہ کا معاملہ نہیں تھا جیسا کہ ہمیں بہروز بھائی نے بتایا تھا۔۔دراصل انکل آفاق ابتدا سے ہی اپنے بیٹے کے لئے بہت سخت گیر باپ تھے اور بڑھائی کو لے کر مار پیٹ کرتے رہتے تھے حالانکہ بقول امائمہ کے اسکا بھائی ایک بہت ہی آؤٹ سٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھا لیکن انکل کے سخت تشدد اور ابنارمل رویے نے اسے مکمل طور پر پھلنے پھولنے ہی نہیں دیا۔ایک بار اس کا اپنے اکیڈمی فیلوز کے ساتھ جھگڑا ہو گیا جسے بلاوجہ یہ رنگ دیا گیا کہ اس کا شاید کسی لڑکی سے افیئر تھا۔۔۔باپ کی حیثیت سے جب انکل آفاق کو اس جھگڑے اور اس جھگڑے کے محرک کا پتا چلا تو انہوں نے عادت کے مطابق اس پر کافی تشدد کیا۔پہلا پینک اٹیک اس کو تب ہی ہوا تھا۔آسان اور مختصر لفظوں میں بیان کروں تو انکل آفاق کا رویہ بیٹے کے ساتھ نہایت نامناسب تھا اور اس کی ذہنی تشویش حالت کی وجہ بھی یہی رویہ تھا اس واقعہ کے بعد سے حالات مزید بگڑ گئے شاید اس کو پینک اٹیکس بھی ہوتے تھے اور وہ انگزائیٹی کا مریض بھی تھا۔اس کا علاج چلتا ہی رہتا تھا۔اسی وجہ سے آنٹی روبینہ نے اپنے بھائی کے کہنے پر اسے ان کے ساتھ یو کے بھجوا دیا تھا۔وہ روچڈیل میں رہتے تھے اور انہیں بھی اپنی آزاد اور روشن والی بیٹی کے لئے ایک کھونٹا چاہیے تھا۔اسی لئے انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی لیکن یہ شادی زیادہ دیر نہیں چلی تھی۔اس لڑکی کا کسی سعید نام عیسائی کے ساتھ افیئر تھا جو اسے

چھوڑ کر چلا گیا تھا اور تب وہ پریگنینٹ تھی۔ وہ لڑکی نور محمد کے ساتھ شادی پر خوش نہیں تھی اور صرف زمانے کو دکھانے کے لئے اس نے یہ سرسری سا رشتہ قائم کیا تھا لیکن مطلب نکلنے کے کچھ عرصہ بعد نور محمد ماموں ممانی کو کھٹکنے لگا تھا۔ وہ چاہتے تھے نور محمد واپس چلا جائے سو انہوں نے حالات کو اس کے لئے اس نہج پر موڑنا شروع کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کر نور محمد کی ذہنی حالت مزید بگڑ گئی۔ وہ لیول اے شیزوفرینک ہو گیا تھا۔ اس لئے امائمہ کے ماموں نے اسے بلیک برن کسی بحالی سینٹر بھجوا دیا" عمر نے چیدہ چیدہ سب ہی بتا دیا تھا۔

"یہ تو بہت عجیب باتیں بتا رہے ہو تم۔۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی فلم کی کہانی سنا رہے ہو" شہروز کو اس مرحلے پر واقعی کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ عمر نے اپنے کافی کے مگ پر بنے جھاگ کو دیکھا پھر اسے ہٹانے کے لئے پھونک ماری تھی۔

"فلمی کہانی ابھی کہاں۔۔۔ اصل فلمی کہانی تو ابھی باقی ہے۔۔۔" کافی کا سپ بھرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"امائمہ کا بھائی بلیک برن سے کہیں غائب ہو گیا تھا۔۔۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ وہیں کہیں ہے لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوٹن چلا گیا تھا۔۔۔ تم نے شاید کبھی لوٹن کے بارے میں سنا ہو۔۔۔ لوٹن ایسے علاقے کے طور پر شہرت رکھتا ہے جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے لیکن یہاں مسائل بھی زیادہ ہیں۔۔۔ یہاں غیر قانونی طور مقیم بیگرز زیادہ ہیں۔ یہاں کے بارے میں اکثر خبریں آتی رہتی ہیں جو زیادہ حوصلہ افزا اور مثبت نہیں ہوتیں۔۔۔ اس کے علاوہ اس کے متعلق مزید کوئی خیر خبر نہیں ہے۔۔۔ امائمہ کے ماموں تو اس کے متعلق بات نہیں کرتے۔۔۔ ان لوگوں کے ٹرمز بھی آپس میں نا ہونے کے برابر ہیں۔۔۔ یہ سب باتیں بھی کسی تیسرے رشتہ دار کے ذریعے امائمہ لوگوں کو پتا چلی تھیں۔ انکل آفاق ویسے ہی اس معاملے میں دلچسپی نہیں لیتے۔۔۔ وہ گویا بیٹے سے دستبردار ہو چکے ہیں لیکن آنٹی اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہیں اور ظاہر ہے امائمہ کے دل میں بھی بھائی سے ملنے کی خواہش ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں مزید کچھ پتا نہیں ہے۔ امائمہ کے پاس صرف ایک فون نمبر تھا جو اس شخص کا تھا جو اس کے بھائی کو روچڈیل سے بلیک برن لایا تھا لیکن وہ نمبر بھی ریسپانڈ نہیں کر رہا اب"

"عمر کیا پتا۔۔۔ وہ زندہ نا ہو۔۔۔ میرا مطلب اتنے سالوں سے غائب ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے" شہروز نے کندھے اچکا کر خدشہ ظاہر کیا تھا۔

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تو تھی لیکن میں اس نہج پر سوچنا نہیں چاہتا۔۔۔ ایسے سوچنے کا مطلب ہوگا شکست تسلیم کر لینا جو کہ میں نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ میں پورے انرجی کے ساتھ یہ سوچ کر اسے تلاش کر رہا ہوں کہ وہ زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ اور یہ بات تم امائمہ کے سامنے بھول کر بھی مت کہنا۔۔۔ وہ اپنے بھائی کو ملنے کے لئے بے تاب ہے" عمر نے کہا تھا

"یہ تو فطری سی بات ہے۔۔۔ خونی رشتے مقناطیس کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔ ان کے حصار سے نکلنا آسان تھوڑی ہوتا ہے" شہروز نے بھی اپنا مگ سنبھالا تھا۔

"یہی تو بات ہے۔۔۔ آنٹی کے بارے میں سوچتا ہوں تو دل بہت دکھتا ہے۔۔۔ سوچ یار ہم کہیں ادھر ادھر ہوں تو ہماری مائیں کیسے بے چین ہو جاتی ہیں۔۔۔ میں اب ممی سے الگ رہتا ہوں لیکن روز یہاں آتا ہوں۔ ایک دن نا آؤں نا تو ممی بے چین ہو کر فون کرتی ہیں کہ کہیں میری طبیعت تو خراب نہیں ہے یا کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔۔۔" عمر کے لہجے میں تاسف تھا۔ شہروز نے سر ہلایا۔۔۔ اس کی ممی بھی اس کے کراچی جانے کے بعد سے

اسی طرح بے چین رہنے لگی تھیں لیکن وہ ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ ممی آپ تو جذباتی ہی ہو جاتی ہیں۔ عمر کے لہجے میں اپنی ممی اور پھر اپنی ساس کے لئے اس قدر محبت اور پریشانی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔ وہ جس دن سے آیا تھا، عمر کے رویے میں اسے عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پہلے جیسا غیر ذمہ دار اور لاپرواہ نہیں رہا تھا بلکہ کافی سمجھدار لگنے لگا تھا۔ شادی اس کی شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی لائی تھی جو واضح محسوس ہوتی تھی۔

"میری دلی خواہش ہے کہ نور محمد کا جلد از جلد کچھ پتا چل جائے تاکہ آنٹی روبینہ کا انتظار ختم ہو۔۔۔ ان کے بارے میں سوچ کر میرے دل کو کچھ ہوتا ہے شہروز۔۔۔ اولاد کے دکھ پیراسائٹ ہوتے ہیں۔۔۔ یہ والدین کو اندر ہی اندر ختم کر دیتے ہیں۔۔۔ مجھے جس دن سے یہ ساری تفصیل پتا چلی ہے نا آنٹی روبینہ کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔۔۔ ان کو دیکھ کر پہلا خیال یہی آتا تھا میرے ذہن میں کہ یہ میری ممی کی طرح مطمئن اور پرسکون کیوں نہیں لگتیں۔ ان کے پورے وجود سے بے چینی سی کیوں جھلکتی نظر آتی ہے۔۔۔ ایک ہی ان کی بیٹی ہے۔۔۔ مالی مسئلہ بھی نہیں ہے۔۔۔ تو پھر ایسا کیا ہے جو ان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔۔۔ اب جا کر اس راز سے پردہ اٹھا ہے۔۔۔ تو یقین کرو ان پر ترس آتا ہے۔۔۔ اللہ کسی ماں کو ایسی مشکل میں نا ڈالے۔" وہ کافی ختم کر چکا تھا۔ شہروز کی کافی ابھی بھی مگ میں موجود تھی۔ وہ عمر کا چہرہ تکنے میں مگن تھا۔ عمر کی آنکھوں کے گوشے نم لگتے تھے۔ شہروز اس عمر سے تو واقف ہی نہیں تھا جس کا دل اتنا حساس تھا کہ کسی اور کے دکھ اس کی آنکھوں کو نم کر دیتے تھے۔ وہ کسی تیسرے انسان کے لئے پریشان ہو سکتا تھا۔ شہروز اس کے رویے پر حیران ہو گیا تھا

"تم مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہو۔۔۔ کیا پہلے کوئی خوبرو آدمی نہیں دیکھا۔۔۔ اور اب دیکھ ہی لیا ہے تو کیا دیکھتے ہی چلے جاؤ گے" وہ اس کی نظروں سے خائف ہو کر نیم مزاحیہ انداز میں بولا تھا تاکہ اپنی کیفیت پر قابو پا سکے۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم پہلے والے عمر نہیں رہے؟" شہروز نے ٹھنڈی کافی کا پہلا سپ بھرا تھا۔ ٹھنڈی ہو جانے کے باعث وہ اسے بہت بدمزا لگی۔

"کیا بہت برا لگ رہا ہوں؟" عمر نے نیم سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" شہروز نے اتنا کہہ کر ایک اور سپ بھرا پھر لہجے میں قطعیت بھر کر بولا۔

"بہت ذمہ دار لگ رہے ہو۔۔۔ اچھے بیٹے۔۔۔ اچھے شوہر۔۔۔ اچھے بھائی"

"میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔۔۔ اچھا بھائی، اچھا بیٹا۔۔۔ اچھا شوہر۔۔۔ یعنی ایک ٹکٹ میں تین تین مزے۔ فل پیکج"

وہ ابھی سنجیدہ نہیں تھا۔

"نہیں پہلے تمہاری طبیعت میں بچپنا تھا جو اب یکدم غائب ہو گیا ہے" شہروز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

"طبیعت میں بچپنا نہیں تھا۔۔۔ میں خود بچپن میں تھا۔۔۔ چھوٹا تھا۔ ضد اور جذباتیت تھی مزاج میں۔۔۔ اب خیر سے خود باپ بننے والا ہوں تو ذمہ داری تو آنی تھی نا" اس نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا پھر شہروز کو خوش دیکھ کر بولا

"یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔۔۔ انسانی فطرت ہے۔۔۔ اس میں ٹھہراؤ وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔۔۔" اس نے سرسری سے انداز میں کہا

جیسے وہ اپنی بدلتی ہوئی طبیعت سے خود بھی واقف تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔۔۔ انسان وقت کے ساتھ سمجھدار ہوتے ہیں۔۔ لیکن کچھ انسان پیدائی سمجھدار ہوتے ہیں جیسے کہ "میں"۔۔۔ شہروز منور" وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں جیسے کہ تم۔۔ سمجھدار۔۔ خوش فہم۔۔ خود پسند۔۔۔ اور۔۔۔" عمر کا انداز بھی اس جیسا ہی تھا۔ شہروز نے اس کی بات کاٹی۔

"اور۔۔ خوش لباس۔۔ خوش ذوق۔۔ خوددار۔۔۔ اور۔۔" اب کی بار عمر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"اور خود بخود بھی۔۔۔ آٹو میٹک۔۔۔ یعنی کسی کے پوچھنے کہنے سے پہلے ہی اپنی تعریف میں مسلسل بجنے والا باجا۔۔ جھنجھورا۔۔"" عمر اسے چڑا رہا تھا شہروز نے شرارتی انداز میں اسے گھورا تھا پھر بولا۔

خود بخود نہیں۔۔ اسے کہتے ہیں خود شناس۔۔۔ خود آگاہ۔۔۔ دور اندیش۔۔۔ کوتاہ بین"

کیا۔۔ کھوتا بین۔۔۔؟ صحیح کہا بالکل کھوتا بین" عمر کو آخری لفظ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شہروز نے اس کی تشریح پر پاس پڑا کشن اسے کھینچ کر مارا تھا۔ وہ گفتگو جو انتہائی سنجیدگی سے شروع ہوئی تھی بالآخر کسی منطقی لائحہ عمل کو طے کیے بنا ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم نے آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" آنٹی رافعہ نے اس کے آگے چائے کا کپ رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس کا کلینک باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ ہر کام اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے اور بہترین طریقے سے انجام پایا تھا۔ وہ ہفتے میں دو دن جمعہ ہفتہ کے لئے دس بجے سے چھ بجے تک کلینک پر رہی تھی۔ اتوار کو فی الحال چھٹی ہی طے کی گئی تھی۔ اس نے ایک نرس بھی اپنے پرانے اسٹاف میں سے یہاں کے لئے مزید تنخواہ دے کر رکھ لی تھی اور ایک مددگار اسسٹنٹ آنٹی رافعہ نے اپنے سلائی والے اسکول کی لڑکیوں میں سے چن کر منتخب کی تھی۔ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا ابھی تک جو دو دن گزرے تھے وہ تو بے حد مصروفیت والے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت ہی پسماندہ علاقہ ہے تو یہاں کی عورتیں سادہ، کم پڑھی لکھی اور دیہاتی ہوں گی لیکن ایسا نہیں تھا وہ اتنا پسماندہ علاقہ بھی نہیں تھا جیسا زارا نے سوچ رکھا تھا۔ یہاں کی زیادہ تر عورتیں پڑھی لکھی اور کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آنٹی رافعہ نے پبلسٹی کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا اور ابتداء میں کنسلٹیشن فیس بہت ہی کم رکھی گئی تھی تو عورتوں کی جانب سے رسپانس اچھا حاصل کیا تھا اور زارا کو یہ مصروفیت اچھی لگ رہی تھی۔ جمعہ کی وجہ سے آنٹی رافعہ کا اپنا اسکول جلدی بند تھا۔ وہ گھر پر ہی تھیں اس لئے انہوں نے زارا کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے بلایا تھا لیکن پلوشہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ آجکل کافی مصروف رہنے لگا تھا۔ کھانا کھا کر وہ چائے پینے بیٹھی تھیں۔

"شادی کب کرو گی" وہ اسے خاموش پا کر مزید پوچھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی لیکن فوراً سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب کیا دے۔ گزشتہ ایک سال وہ شادی کے متعلق بہت سنجیدگی سے سوچتی رہی تھی۔ اس مسئلے کے لئے پریشان رہی تھی لیکن اب اس نے اس مسئلے پر سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ واقعی اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

"خدارا اب یہ گھسا پٹا جملہ مت بولنا کہ شادی ایک جوا ہے۔ شادی جوا نہیں ہوتی۔ جوا ہوتی تو سنت نا ہوتی۔ اس لئے سنجیدگی سے جواب دو کہ شادی کے متعلق کیا سوچا ہے" انہوں نے اپنا کپ تھاما تھا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

"ابھی نہیں۔۔۔ چند سال بعد سوچوں گی۔۔۔" اس نے سپ بھرا تھا۔

"ویسے تو یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے زارا لیکن میں چونکہ زندگی بھر استاد رہی ہوں اس لئے اچھی بات بتانے سے رہ نہیں سکتی۔۔ شادی مناسب وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ تم خود ایک ڈاکٹر ہو۔ تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ بیس سے پچیس سال کی عمر بچے پیدا کرنے کے لئے مناسب ترین عمر ہوتی ہے۔۔ میرا ذاتی خیال ہے اس عمر میں شادی ہو جانی چاہیئے"

"اس عمر میں کون کرتا ہے آجکل شادی۔۔ یہ عمر تو ابھی کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے" اس نے ان کی بات کے وزن کو کم کرنے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"آنٹی نے اس کی جانب آنکھ ترچھی کر کے دیکھا۔

"ارے بی بی آجکل بچوں کو کھیلنے کودنے بھی کون دیتا ہے۔۔۔ پانچ سال کی عمر سے جو موٹی موٹی کتابیں دے کر بٹھاتے ہیں تو تیس تیس سال تک بس سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دھکے ہی کھاتی رہتی ہیں۔ کمپیوٹرز میں سر کھپا رہی ہیں، موٹی موٹی اسائنمنٹ میں صحت خراب کر رہی ہیں، بسوں رکشوں میں خرچ ہوئی جا رہی ہیں۔ ایم اے۔۔ ایم ایس۔۔ ایم فل۔۔ پی ایچ ڈی۔۔ ہمیں تو نام لینے میں ہی تھکن ہو جاتی ہے۔۔ یہ آجکل کی بچیاں ان ڈگریوں کے ہاتھوں ضائع ہو رہی ہیں۔۔۔ اور کہو کہ شادی کر لو تو کہیں گی۔۔ ہائے نہیں، بہت بڑی ذمہ داری ہے۔۔ ابھی تو ہمارے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔۔۔ خون چوسنے والی اس پڑھائی سے زیادہ بڑی ذمہ داری ہے کوئی آج کل" انہوں نے اس انداز میں منہ بنا کر کہا کہ زارا کو ہنسی آگئی۔

"آپ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف ہیں کیا؟" اس نے وہی سوال پوچھا جو سب سے پہلے ذہن میں آیا تھا

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔ میں تعلیم کے خلاف نہیں ہوں۔۔ کوئی بھی تعلیم کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے" انہوں نے قطعیت سے کہا تھا پھر مزید اضافہ کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"میں تعلیم کی اس بے مقصدیت کے خلاف ہوں جو آجکل رائج ہوتی جا رہی ہے۔ تعلیم آجکل ڈگریوں کے پلندے کا نام بن کر رہ گئی ہے۔۔ علم محدود ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ بچے بچیاں علم نہیں حاصل کر رہے بلکہ جیسے کسی دوڑ میں گھوڑے بنے دوڑے چلے جا رہے ہیں اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آ رہا۔ ہم نے اتنا بے ذائقہ علم پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔

میں تمہیں اپنی مثال دیتی ہوں۔ جب میں نے بی اے کیا نا تو میرا اشمار انتہائی پڑھی لکھی لڑکی کے طور پر ہونے لگا تھا۔ یہ 75ء کی بات ہے۔ جب بی اے کیا تو میں اپنے سارے آس پاس کے گھروں اور رشتے داروں کی منظور نظر ہو گئی تھی۔ کسی کو خط لکھنا ہوتا تھا، کوئی فارم بھرنا ہوتا تھا یا کوئی درخواست لکھی ہوتی تھی تو سب میرے پاس آتے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ رافعہ بی بی بہت سیانی لڑکی ہے جو شہر سے پڑھ کر آئی ہے، تم یقین نہیں کرو گی لیکن اس وقت میں اپنی فیملی کی اس علاقے کی پہلی لڑکی تھی جو ہاسٹل میں رہ کر کالج تک پڑھ کر آئی تھی۔ میں نے اتنی اتنی درخواستیں اور خط

لکھیں ہیں کہ گنتے بیٹھو تو ہزاروں نا سہی سینکڑوں تو ضرور ہو جائیں گے اور اب اکیسویں صدی میں یہ حال ہے کہ میرے آس پاس کے ہر گھر میں تین تین چار چار افراد ہیں جو گریجویٹ ہیں۔ میرے پاس ایک وقت میں چودہ لڑکیاں پڑھنے آتی ہیں جو بی اے کر رہی ہیں۔۔۔ان میں سے کسی ایک کو بھی کالج میں درخواست لکھنے کے لئے کہہ دو نا تو تیرہ لڑکیاں پرنسپل کے اسپیلنگ ہی نہیں لکھ پائیں گی اور وہ جو ایک لکھ کے لائے گی وہ بھی پرنسپل کے اسپیلنگ میں "اے" کی بجائے "ای" لکھ دے گی" انہوں نے تلخی بھرے لہجے میں کہا تھا پھر گفتگو میں اسکا انہماک محسوس کر کے بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

"یہ ابھی اسی سال کی بات ہے مجھے اپنی پنشن کے سلسلے میں کچھ کام تھے تو لاہور جانا پڑا۔ واپسی میں کچھ بچیوں نے کتابیں منگوائی تھیں وہ خریدنے کے لئے لبرٹی چلی گئی۔ بک اسٹور پر ایک لڑکی کتابیں خرید رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں "شہاب نامہ" پکڑا ہوا تھا۔ میں بہت خوش ہوئی۔ میری بہت پسندیدہ کتاب ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے یہ کتاب ہی کیوں خریدی۔ میرے ذہن میں تھا وہ تعریف کرے گی کتاب کی اور لکھنے والے کی۔ میں بھی چار جملے بول کر خوش ہوں لوں گی۔ کتابیں پڑھنے والوں کو ایک بیماری ہوتی ہے۔ اپنی پسندیدہ کتاب کے بارے میں اپنی من چاہی اولاد کی طرح ہر وقت بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے میں اس لڑکی کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر مچل ہی گئی تھی۔ وہ محترمہ بولیں" میں دراصل سی ایس ایس کی تیاری کر رہی ہوں تو موٹی موٹی مشہور کتابیں خرید رہی ہوں۔ ان میں سے بھی کچھ یاد کر لوں گی کیا پتا پیپرز یا انٹرویو میں ان میں سے بھی کچھ آجائے۔۔۔اف مت پوچھو۔۔۔ مجھے کتنا غصہ آیا۔۔۔ یہ ہے آجکل تعلیم کا معیار لیکن یہ تعلیم نہیں ہے۔۔۔ یہ تعلیم کی ناقدری ہے۔۔۔ایسی تعلیم کی میں حامی نہیں ہوں" ان کے چہرے سے ناپسندیدگی جھلکنے لگی۔

"تم میری بات سے اتفاق کرو یا نا کرو لیکن آجکل تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور لگن اتنی نہیں ہے جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ تعلیم کا لگن اور شوق بہت کم لوگوں کو ہے۔ آجکل یہ شعور حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔ میں ایسی تعلیم کے حق میں نہیں ہو جو صرف ڈگریوں کا انبار جمع کرنے کی خاطر، ملازمت میں پروموشن یا تنخواہ میں انکریمنٹ کی خاطر یا پھر اچھے رشتے کے لالچ میں کی جائے۔ مجھے تھکا دینے والی چیزوں سے شروع سے الجھن رہی ہے۔ ایسی بے مقصد تعلیم جس میں شوق یا لگن کا کوئی عنصر شامل نہیں تھکن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ عورتوں کو کمزور کر رہی ہے اور اس کا فائدہ صرف فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو ہو رہا ہے۔ ایک ایک بچہ پیدا ہوتے ہی آجکل کی بچیوں کے گھٹنے جواب دے جاتے ہیں۔۔ کمر کا درد ہر تیسری لڑکی کا مسئلہ ہے۔ طاقت کی دوائیاں کھا کھا کر لڑکیوں کے بدن اور فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے بینک اکاؤنٹس پھولتے جا رہے ہیں۔

ہم نے ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم نے اپنی بچیوں کو سکھا دیا ہے کہ تم ڈگریوں کے ڈھیر نہیں لاؤ گی تو تمہیں اچھا رشتہ نہیں ملے گا، اچھی جاب نہیں ملے گی، اچھا رتبہ نہیں ملے گا۔" اچھی عورت" کی ایسی ایسی نایاب تعریفیں رائج کر دی گئی ہیں کہ اب لڑکی بیچاری کو اچھا بننے کے لئے بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔۔۔ پہلے اچھا طالبعلم بننے کے لئے جی جان سے محنت کرتی ہے پھر اچھی بیٹی، بیوی بہو بننے کے لئے اپنا آپ خرچتی ہے کیونکہ وہ پڑھ لکھ جائے تب بھی گھر اور گھر کی ذمہ داریاں اسے ہی اٹھانی ہوتی ہیں۔ اور وہ اس فکر میں گھلنے لگتی ہے کہ ہر کام میں سلیقہ اور جدت لا سکے ورنہ فوراً طعنہ دے دیا جاتا ہے کہ ایسی تعلیم کا فائدہ جب سیب کی ٹوکری اور گاجر کے پھول سلاد میں رکھنے کے لئے نا بنانے آسکے۔ اس معاشرے کو عورت کی لاتعداد

ورائٹی چاہیے۔اچھی بیٹی، اچھی طالب علم، اچھی ڈاکٹر، اچھی انجینئر، اچھی باورچن، اچھی دھوبن۔وہ بھی کولہو کے بیل کی طرح سب کرتی جاتی ہے اور جب اچھی ماں بننے کی باری آتی ہے تو وہ اتنا تھک چکی ہوتی ہے کہ دن انگلیوں پر گنتی ہے کہ بچہ تین سال کو ہو تو اسے کنڈر گارٹن میں ڈال کر پھر سے اچھی عورت ہونے کا ثبوت دے سکے لیکن سچ پوچھو تو تب اسے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جن کے لئے اسے اچھا، بہت اچھا ہونا چاہیے تھا وہ ان کے لئے ویسی اچھی نہیں ہو پا رہی۔میں جانتی ہوں تم اور بہت سی بچیاں میری بات سے متفق نہیں ہوں گی لیکن میں پھر بھی کہتی رہوں گی کہ اس ملک کا المیہ ہے کہ یہاں کی عورت تو طاقتور ہو گئی ہے لیکن وہ ایک کمزور ماں بن چکی ہے۔ماں کو کمزور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ماں کسی بھی ریاست کا انرجائزر ہوتی ہے۔یہ طاقت ہوتی ہے۔یہی سب سے بڑی ذمہ داری بھی ہے۔میں اسی لئے لڑکیوں کی مناسب وقت پر شادی کی حامی ہوں۔انہوں نے اولاد پیدا ہی نہیں کرنی ہوتی۔اسے پالنا بھی ہوتا ہے۔اس کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے بچے۔ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ بچہ پیدا کر لیا، تکلیف سہہ لی تو جنت مل جائیگی۔بچہ تو ہر مادہ پیدا کر لیتی ہے۔تکلیف تو بندریا، گھوڑی یا بھینس کو بھی ہوتی ہو گی۔ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب جو مجھے سمجھ میں آیا ہے نا وہ یہ ہے کہ بچہ ماں کی گود سے اتر کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھتا ہے۔یہ ماں کے قدم ہیں۔اسکی پیروی ہے اسکی نقش قدمی ہے جو بچے کو جنت کا راستہ دکھا سکتی ہے جو صرف درد و زہ سہہ کر نہیں حاصل ہونے والی۔اصل مشقت تو اس تربیت کی ہے جو ماں کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے" انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اس لئے تو ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔اس سے بہت احسن کام لینے ہوتے ہیں اللہ کی ذات نے۔بہرحال میں تمہیں نصیحتیں کر کر کے بیزار نہیں کرنا چاہتی۔میں تو صرف ایک مشورہ دے رہی تھی۔تم خود ایک ڈاکٹر ہو۔ہر اچھی بری چیز بہتر سمجھتی ہو۔اس لئے اب پڑھ لکھ چکی ہو۔جو کرنا تھا کر رہی ہو۔اللہ تمہیں اس میں کامیابی دے لیکن آئندہ کے متعلق بھی سوچو" وہ اس کے ہاتھ سے خالی کپ پکڑتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔

"آنٹی آپ بہت ذہین ہیں۔۔آپ کی باتیں سن کر مجھے ہمیشہ بہت موٹی ویشن ملتی ہے۔۔میں بہت متاثر ہوتی ہوں۔۔اللہ نے آپکو بہت فہم و فراست دی ہے" اس نے انہیں دل سے سراہا تھا۔وہ ایک دم ہنس دیں۔

"ذہین نہیں ہوں، نقل چور ہوں۔۔۔ادھر ادھر سے کتابیں پڑھ کر لوگوں کے سامنے خود کو عقل مند ثابت کرنے کے لئے لیکچر دیتی رہتی ہوں۔۔۔" وہ مسکرائی تھیں

"یہی بات جب میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ نقل چور ہیں تو آپ برا مناجاتی ہیں" یہ بچو کی آواز تھی جو صحن سے آئی تھی۔وہ صحن میں لگے واش بیسن کے پاس کھڑا تھا۔آواز سے ابھی بھی نیند کے اثرات جھلک رہے تھے۔

"اٹھ گئے تم" آنٹی رافعہ نے اس کو محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیسی ہیں آپ ڈاکٹر زارا۔۔۔سب کام ٹھیک چل رہا ہے نا" وہ وہیں کھڑا ہوا پوچھ رہا تھا۔زارا کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے منہ دھونا شروع کر دیا تھا۔زارا نے بھی اپنی چیزیں سمیٹیں۔وہ نہیں جانتی تھی کہ بچو گھر موجود ہے۔وہ نظر نہیں آیا تھا سو اس نے یہی سوچا تھا کہ باہر ہو گا۔

"میں زارا سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا شادی کا کب تک ارادہ ہے۔۔۔یہ بھدری۔۔۔" وہ جانے کیا کہنے والی تھیں۔بچو نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ناشتہ بنائیں امی۔۔۔ابھی کوئی نصیحت سننے کا موڈ نہیں ہو رہا۔۔۔میرے دماغ کے سب سگنلز بھوک کی وجہ سے کام نہیں کر رہے۔۔۔" وہ پانی کے چھینٹے مار رہا تھا منہ پر۔۔۔

"تم نیٹ ورک تبدیل کرلو برخوردار۔۔تمہارے سگنلز کام کی باتوں پر ہمیشہ ہی ایسا بھونڈا ریسپانس کرتے ہیں" زارا نے کچن کی جانب جاتی ہوئی آتی رافعہ کی چڑی ہوئی آواز سنی تھی۔وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ماں بیٹے کے درمیان سینڈوچ بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا،وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا" بل گرانٹ نے اسکی پیشانی پر ایک اور بینڈ ایج لگائی تھی۔سلمان نے بدقت اپنے درد پر قابو پایا۔نور محمد نے وار اس پر عقب سے کیا تھا لیکن وہ فرش پر اس رخ سے گرا تھا کہ اسکا چہرہ اور پیشانی فرش سے ٹکرائی تھی۔اس کمزور نظر آنے والے نور محمد میں جانے اتنی طاقت کیسے آگئی تھی کہ اسکی لگائی گئی ایک ضرب نے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے چڑیاں سب اڑا دئیے تھے۔وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا اور یہی حال بل گرانٹ عرف احمد معروف کا ہوا تھا لیکن وہ ہوش میں پہلے آئے تھے اور اب سلمان کی مرہم پٹی بھی وہی کر رہے تھے۔اضطراب بے چینی ان کے ہر عمل سے مترشح تھی۔

"سب کچھ ہی اگر ٹھیک ہونے لگے تو زندگی جامد ہو کر رہ جائے۔۔۔اس لئے کبھی کبھی کچھ ٹھیک نا ہونا ہی ٹھیک ہوتا ہے" سلمان نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔اسے بولنے میں تکلیف کا سامنا تھا جو اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ بل گرانٹ نے آخری بینڈ ایج لگا کر فرسٹ ایڈ باکس بند کر دیا تھا۔

"میں تمہارے لئے کافی لے کر آتا ہوں" وہ کوئی بھی جواب دئیے بنا باہر نکل گئے تھے۔سلمان وہیں بیٹھنے کی بجائے ان کے ہمراہ ہی آگیا تھا۔نور محمد کے گھر سے اس طرح چلے جانے کے عمل نے اسے بھی حیران کیا تھا۔وہ بل گرانٹ کی الماری سے ان کا بیگ ہمراہ لے گیا تھا اور اس نے ان کے لئے الماری پر ایک اسٹیکر نوٹ بھی چپکا گیا تھا جس پر صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

"آپ اچھے انسان نہیں ہیں احمد معروف" اس نوٹ کو دیکھ کر وہ مزید بے چین ہو گئے تھے۔

"آپ کیوں پریشان ہیں؟" سلمان نے کچن شیلف کے سامنے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"آپ پریشان کیوں نہیں ہیں؟" وہ اکتائے ہوئے انداز میں اس سے پوچھنے لگے۔

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں وہ بہت اچھا اور نیک انسان ہے تو پھر اس کے اس طرح چلے جانے پر پریشان ہونے کا کوئی جواز تو نہیں بنتا۔۔۔وہ کچھ دیر میں واپس آجائیگا" سلمان نے انہیں تسلی دینی چاہی۔

"پریشان ہونے کا جواز تو ہے۔۔۔آپ کچھ ہی نہیں رہے۔۔۔وہ میرا بیگ بھی ہمراہ لے گیا ہے۔۔جانے کیا سوچ کر لے گیا ہے۔۔۔اور پھر اس طرح تشدد کرنے کی وجہ۔۔۔میرا ذہن کچھ نہیں پا رہا کچھ بھی۔۔۔اور آپ کا اس کے ساتھ جو تعلق تھا وہ میری نسبت زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے۔۔۔وہ آپ کا کلاس میٹ تھا۔۔۔آپ کا ہم وطن ہم زبان ہم مذہب تھا۔۔۔رات کے اس پہر وہ گھر سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔۔۔پریشانی تو جائز ہے جبکہ

آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی باتوں سے خائف ہو گیا ہے" انہوں نے جتا کر کہا تھا۔

"وہ میری باتوں سے نہیں آپ کی باتوں سے خائف ہو گیا ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔۔۔ اسے آپ کے متعلق سب کچھ پتا چل گیا ہے۔۔ اس کے لئے یہی دیکھنا ناقابل برداشت ثابت ہوا ہو گا کہ آپ مسلمان نہیں ہیں۔۔۔ اسی لئے وہ جو بیگ لے گیا ہے اس میں یقیناً آپ کے ناول کا مسودہ ہو گا۔۔ یعنی اگر کوئی شخص اس ساری صورت حال کا ذمہ دار ہے تو وہ آپ ہیں" سلمان نے بھی اسی انداز میں جتا کر کہا تھا۔ بل گرانٹ کچھ نہیں بولا۔۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اس کے چہرے سے پتا لگانا مشکل تھا۔ سلمان چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

"میں اعتراف کر لیتا ہوں کہ آپ نے سر توڑ محنت کر کے میرے بارے میں جو بھی معلومات اکٹھی کی ہیں۔۔ وہ سو فیصد غلط نہیں ہیں لیکن آپ نے نور محمد کو پہچاننے میں سخت غلطی کی ہے۔۔ وہ ایسا انسان نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں" بل گرانٹ نے دھیمے سے لہجے میں کہا تھا۔

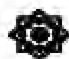
"آپ نور محمد کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں اور آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جو آپ جانتے ہیں وہی سچ ہے۔۔ میرے پاس بھی جو معلومات ہیں وہ انتہائی مستند ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ میں نے بذات خود جس شخص سے بھی نور محمد کے متعلق پوچھا ہے اس کے منہ سے ایک بھی برا لفظ سننے کو نہیں ملا۔ میرے سب ہی ذاتی ذرائع بھی ان معلومات سے مماثل نہیں ہیں لیکن بہرحال ایک برطانوی این جی او کے پاس اگر کسی کے متعلق کوئی مواد ہے تو وہ ایک دم سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

سلمان کے لئے یہ سوال واقعی بہت اہم تھا۔ وہ ہر حال میں اس سوال کا جواب چاہتا تھا۔ اس نے تمام تر باتیں جو اس کے پاس ریکارڈ کی صورت موجود تھیں۔ وہ باتیں جو اس نے ایک بوڑھے پروفیسر آفاق علی کے منہ سے سنی تھیں۔۔ وہ باتیں جو روپڑ مل میں رہنے والے ایک کاریگر نے بتائی تھیں اور وہ باتیں جو وہ خود اس کے متعلق جانتا تھا ایک ایک کر کے ان سے کہہ ڈالی تھیں۔۔ وہ خاموشی سے اس کے چپ ہو جانے کا انتظار کرتے رہے۔

"سلمان حیدر آپ ابھی اس سمندر میں ایک چھوٹی مچھلی کی طرح ہیں۔ مچھلی بھی وہ جو گہرے پانی میں رہ نہیں سکتی۔ میں نے اس سمندر میں زندگی گزاری ہے۔ میں کنارے پر کھڑے ہو کر بھی گہرائی ماپنے جتنا قابل ہو چکا ہوں۔ میں آپ کو یہ سارا نیٹ ورک کھول کر بتا سکتا ہوں، سمجھا سکتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود ایسے کام کرتا رہا ہوں۔ جھوٹ میں سچ کیسے ملایا جاتا ہے اور سچ کو کیسے جھوٹ ثابت کرتے ہیں یہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میرا نام بل گرانٹ ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے پہلے چار بیسٹ سیلرز ایسے لکھے ہیں جیسے بچہ کلاس روم میں املا لکھتا ہے۔" وہ ایسے بات کر رہے تھے جیسے خود کلامی کر رہے ہوں۔

"میں آج آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں فنڈز کے نام پر ایک خطیر رقم لے کر ناول لکھتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے قلم کا غلط استعمال کیا ہے۔ میں نے اپنے زیادہ تر ناولز ایسے موضوعات پر لکھے جو کچھ مخصوص لوگوں یا قوموں کے فائدے کے لئے تھے۔ میں نے کبھی انسانیت کے متعلق نہیں سوچا۔ میں شہرت کے نشے میں اس قدر گم رہا کہ مجھے کبھی یہ سوچنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ میں کوئی غلط کام کر رہا ہوں حالانکہ مجھے زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ملتے رہے جو مجھے سمجھاتے رہے کہ غلط اور صحیح میں فرق کر کے زندگی گزارنا ہی اصل زندگی ہے" وہ خاموش ہوئے تھے۔ پشیمانی ان کے ہر انداز سے جھلکنے لگی تھی۔ سلمان حیدر کو اپنی ہر چوٹ کا درد ان کی آنکھوں میں چھپے کرب کے آگے ہیچ محسوس ہوا۔

"بہر حال یہ میری زندگی کے متعلق بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو اس گورکھ دھندے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جس کا شکار نور محمد ہوا ہے۔ اسے استعمال کیا گیا ہے۔ آپ کو میری باتیں عجیب نہیں لگنی چاہئیں۔ آپ ایک صحافی ہیں۔ آپ اس بات کو سب سے بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی من پسند خبریں لگوانے کے لئے یا رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے سیاسی قوتیں یا دوسرے عناصر پانی کی طرح پیسہ بہاتے ہیں۔ دنیا بھر میں کسی ایک متنازعہ موضوع پر اتفاقِ رائے پیدا کرنے کی خاطر یہ انجانی قوتیں ہمیشہ متحرک رہتی ہیں۔ نور محمد انہی قوتوں کا شکار ہوا ہے۔ نور محمد کے متعلق مجھے سب سے پہلے صوفی سیف اللہ نے بتایا تھا۔ وہ نور محمد کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ بات بھی انہوں نے مجھے کہی تھی کہ یہ بچہ یعنی نور محمد دین میں اس قدر گم ہے کہ اسکو احساس ہی نہیں ہوتا کہ دنیا بھی کوئی چیز ہے۔۔۔ اس کے متعلق ہر بات مجھے ان سے پتا چلی تھی۔ وہ اسے کافی اچھے طریقے سے جانتے تھے۔ وہی چاہتے تھے کہ میں نور محمد کو سکھاؤں کہ دنیا سے لاتعلقی ممکن نہیں ہے۔ وہ ہی چاہتے تھے کہ نور محمد ایک بار اپنی ماں سے ضرور ملے۔ وہ کہتے تھے کہ مائیں بلکتی ہیں تو اللہ ناراض ہوتا ہے۔ انہی کے کہنے پر میں نور محمد سے ملنے یہاں آیا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مسٹر ٹیرن سے بھی مجھے نور محمد کے متعلق کافی باتیں پتا چلی تھیں۔ انہوں نے نور محمد کو "دہشت گرد" قرار دے دیا تھا اور وہ مجھ سے "دہشت گردی کے موضوع پر ہی ناول لکھوانا چاہ رہے تھے۔ اس ناول میں مجھے ایسا مواد دیا جا رہا تھا جس میں اسلامی روایات کی تذلیل کے علاوہ مقدس شخصیات کے متعلق تضحیک آمیز چیزیں بھی شامل تھی۔ میں وضاحت کرتا چلوں کہ اس سب کے پیچھے انہی قوتوں کا ہاتھ ہے جو "اسلاموفوبیا" کو مغرب کا سب سے بڑا ناسور قرار دیتے ہیں۔ اس میں حکومتی اہلکار بھی شامل ہیں۔ سوشل ایکٹیوسٹ بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ لوگ بھی انہی کے حامی ہیں جو ہری پنتھی راشسٹ ہیں اور برطانوی امیگریشن پالیسی کے خلاف ہیں جو نہیں چاہتے کہ برطانوی امیگریشن بھورے لوگوں کو دی جائے۔ یہ لوگ "اسلاموفوبیا" کو بہت ہوا دیتے ہیں اور شریعت کو اپنے حقوق کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ وہ دینِ اسلام کو پسماندہ خیال کرتے ہیں اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ مسٹر ٹیرن انہی کے نمائندہ تھے۔ ان کی زبانی مجھے نور محمد کے متعلق بھی پتا چلا تھا۔ ان ہی کی باتوں نے بھی مجھے متجسس کر دیا تھا کہ میں دیکھوں تو سہی یہ شخص آخر کون ہے۔ مسٹر ٹیرن کہتے تھے نور محمد ایک جادوگر ہے۔ جو اس سے ملتا ہے۔ اس کا ہو جاتا ہے۔ جب میں پہلی بار اس سے ملا تو حیران رہ گیا۔ جادوگر ایسے ہوتے ہیں کیا۔ میں نے سوچا تھا۔ میں بہت مایوس ہوا تھا سلمان حیدر اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن میرا یقین کیجئے یہ شخص ایک ہیرا ہے جو تراشا نہیں گیا اور یہ بات مجھے اس کے ساتھ رہنے سے سمجھ میں آئی۔۔۔ یہ واقعی جادوگر ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بات کا اسے خود بھی نہیں پتا۔ اس لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ نور محمد استعمال کیا جا رہا ہے" وہ چپ ہوئے تھے۔ سلمان نے اپنے سامنے بیٹھے اس پچاس پچپن برس کے سفید فام کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں جھوٹ کہتی نہیں لگتی تھیں۔



(تنزیلہ ریاض کا یہ خوبصورت ناول "عہدِ الست" ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

"نور محمد استعمال کیا جا رہا ہے" بل گرانٹ نے اس کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے دوبارہ پرعزم لہجے میں دوہرایا تھا۔ دو ہزار سات کی اس رات کو بالآخر کئی مہینوں کی محنت کے بعد وہ لوٹن کے ایک چھوٹے سے گھر میں اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نور محمد واقعی کسی شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔۔۔ کیا، کیوں، کیسے اور کس لئے جیسے کتنے ہی سوالات ابھی بھی سلمان کے ذہن میں گونج رہے تھے جن کے جوابات اور ان سازش کی بقیہ تمام تر تفصیلات اس بوڑھے سفید فام کے پاس تھیں جو خود ایک پہیلی بن کر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ جس کا خیر خواہ بن کر آیا تھا وہ منظر سے غائب ہو گیا تھا جبکہ اچھی بات یہ تھی کہ بل گرانٹ جو خود کو نور محمد کے خیر خواہ ثابت کرنے کے لئے ہر حد سے گزرنے کو تیار تھے اسے اپنی دلی رضامندی سے سب کچھ بتانے جا رہے تھے۔ اس کی دلچسپی مزید بڑھ رہی تھی۔ اب کی بار وہ متذبذب نہیں تھا اس نے مزید اداکاری کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بل گرانٹ کی صداقت کے بارے میں پریقین نہیں تھا۔ وہ ان کی باتوں پر سو فیصد یقین کرے یا نا کرے یہ وہ سوال تھا جو اسے بے چین تو کر رہا تھا لیکن بے چینی پر قابو پا کر ہی دریا کے پار اترا جاتا ہے یہ سبق اسے اچھی طرح سے سکھایا گیا تھا سو اس نے ان پر اعتبار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

میں آپ کی بات مان لوں تو بھی بے شمار الجھنیں ہیں جو دماغ کو پریشان کر رہی ہیں۔۔۔ یہ سارا معاملہ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے میں ہی بے حد محنت درکار ہے۔۔۔ میں کسی سے یہ کہہ کر بات ختم نہیں کر سکتا کہ "نور محمد معصوم ہے اور نور محمد کو استعمال کیا جا رہا ہے۔۔۔" ایسا کہنے سے مزید بحث شروع ہو جائے گی اور میں بحث سے کتراتا نہیں ہوں لیکن جب میں خود ہی اس معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ پایا تو کسی کو کیسے سمجھاؤں گا۔ آپ کو مجھے وہ سب بتانا پڑے گا جو آپ جانتے ہیں" اس نے بل گرانٹ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ اس بات کا اظہار بھی تھا کہ وہ ان کی باقی ماندہ باتیں سننے کے لئے حوصلہ رکھتا ہے۔

"آپ اگر اس سارے نظام کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو تحمل کے ساتھ میری ہر بات سننی پڑے گی۔ میں آپ کو ہر تفصیل بتاؤں گا لیکن آپ کو یہ بات بھی سمجھنی پڑے گی کہ یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔ راتوں رات کچھ نہیں ہونے والا۔ جن لوگوں نے نور محمد کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لئے اتنے سال محنت کی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے آپ کو دنیا کے سامنے حقیقت فاش نہیں کرنے دیں گے۔ آپ کو صابر اور بے خوف ہونا پڑے گا۔"

بل گرانٹ کی یہ بات سلمان کو پسند آئی۔ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ سلمان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس مقام پر وہ مشکلات سے گھبرا کر مر سکتا تھا لیکن پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس نے پوری دلجمعی سے اپنی سماعتیں بل گرانٹ کے بیان کی جانب مبذول کر لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اب تک جاگ رہے ہو" یہ امی کی آواز تھی۔ وہ بہت انہماک سے اپنا کام کر رہا تھا جب امی کی آواز نے سکوت کا تسلسل توڑ ڈالا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً تہجد ادا کرنے کے لئے اٹھی تھیں اور باتھ روم کے ساتھ ہی چونکہ اس کا کمرہ تھا سو وہ وضو کرنے کے بعد اسے دیکھنے آ گئی تھیں۔ وہ آجکل رات کو بہت دیر تک جاگتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ہر پراجیکٹ کے لئے سخت محنت کرنے کا عادی تھا لیکن اس بار ایک جنون تھا جو اس پر

حاوی تھا۔ ان نے وہ تمام حقائق و شواہد، مستند گوشوارے اور وہ ہر مصدقہ ریکارڈ جو نور محمد کی بے گناہی اور معصومیت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری تھا کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اسے فائل کی شکل دینی شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ 2007 سے لے کر تا حال تک کے واقعات اس نے خود کمپوز اور کمپائل کرنے تھے۔ نور محمد نے اسے یہی ذمہ داری سونپی تھی اور وہ جی جان سے یہ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی اس آخری ناول کو پبلک کرنا چاہیں گے وہ ان کی تمام تر ممکنہ مدد کرے گا۔ اسی لئے نور محمد کی کال نے اسے بہت متحرک کر دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا جوائنٹ وینچر تھا اور یہ کوئی رپورٹ نہیں تھی جو وہ ایک فائل میں بند کر کے دے دیتا کہ اسے نشر کر دیا جائے یا اس پر بحث کر کے اس کی افادیت دنیا کے سامنے ظاہر کی جائے بلکہ یہ ایک ناول تھا جس کا آخری حصہ اسکی معاونت سے لکھا جانا تھا۔ یہ ایک ثبوت تھا ان پردوں کا جو جان بوجھ کر حقائق پر ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ ایک فرض تھا جو اسے اپنے ملک کی خاطر ادا کرنا ہی کرنا تھا سو وہ اسے دنیا کے سامنے لانے سے پہلے ہر طرح سے جانچنا چاہتا تھا کہ غلطی کا امکان کم سے کم رہ جائے۔۔ اس لئے یہ کام نہ صرف اہم بلکہ دلچسپ اور بہت انوکھا بھی تھا۔ اس کے لئے دن رات کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

"نہیں سویا ہوا ہوں" امی کے سوال پر وہ انہی کے انداز میں بولا تھا۔ اس کی آنکھیں مسلسل ڈیسک ٹاپ پر کام کرنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں لیکن ابھی بھی اس کا اٹھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر سے خود کو اس بوجھ کے تلے دبا محسوس کرتا تھا جو کچھ سال پہلے بل گرانٹ کے سامنے بیٹھ کر ان کی باتیں سنتے ہوئے اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہوتا تھا۔ امی کی مداخلت اسے فی الحال ذرا نہیں بھائی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا ارتکاز ٹوٹ گیا تھا بلکہ اس کے دل کا بوجھل پن اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ کام کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ لیکن اتنے سالوں بعد بھی حالات کا جوں کا توں ہونا مایوس کن تھا سو ایک مایوسی تو تھی جو دل کے کسی کونے سے کبھی کبھی دستک دے کر اسے کمزور کرنے کی کوشش کرتی تھی اور وہ جانتا تھا اس کی امی کو دنیا میں کسی سے نفرت نہیں تھی سوائے "مایوسی" کے۔۔۔ وہ مایوسی کو کوئی کیفیت نہیں بلکہ جرم سمجھتی تھیں۔ سلمان نہیں چاہتا تھا کہ فی الوقت وہ ان کا سامنا کرے۔

"ساری قوم ہی سوری ہے بچے" اب کی بار آواز زیادہ قریب سے آئی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑے رہنے کے لئے اس کے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔ سلمان نے مڑ کر دیکھے بنا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کے بستر پر بیٹھ گئی تھیں۔

"سو یار ہنے دیں امی۔۔۔ تہجد فرض نہیں ہے۔۔۔ اذان ہونے دیں، نماز کے لئے اٹھ جائیں گے سب" یہ ایک ذومعنی بات تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی امی اس بات کا جواب نہ دیتیں۔

"امتحان شروع ہے بیٹا اور امتحان آزمائش ہوتا ہے۔۔۔ آزمائش کے دنوں میں وہ چیزیں جو فرض نہیں ہوتیں انہیں بھی فرض سمجھ کر ادا کرنا پڑتا ہے۔۔۔ یہی دوراندیشی ہے، کامیابی کی کنجی بھی اور زندگی گزارنے کی درست حکمت عملی بھی۔۔۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھیں۔

"امی آپ بھول جاتی ہیں کہ آپ کو ریٹائر ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔۔۔ آپ نے اپنی گریجویٹی بھی ساری خرچ کر دی ہوئی ہے۔ امتحان، آزمائش۔۔ کمرہ جماعت۔ گوشوارے۔۔ حاضری سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے اس لئے آپ بھی لیکچر دینے بند کر دیں" وہ چڑ کر بولا تھا۔ امی اس کے عقب میں بیٹھ گئی تھیں اور ڈیسک ٹاپ پر نور محمد کی تصویر والی فائل کھلی تھی۔ وہ اسے ہٹانے کیلئے ماؤس پر کلک کر رہا تھا لیکن اسکرین جامد ہو گئی تھی۔ امی سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا اس نے، لیکن کام مکمل ہونے سے پہلے کبھی بتایا بھی نہیں تھا۔ ایک منٹ لگا تھا مانیٹر کی اسکرین سے فائل منی مائز

ہو گئی تھی۔ وہ ریوالونگ چیئر کو گھما کر ان کی جانب مڑ گیا تھا۔ اس کی پشت نے مانیٹر کا احاطہ کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں لیکچر دینا بند کر دیتی ہوں اور تم دھوکہ دینا بند کر دو" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ چہرے پر خفگی بھی نمایاں تھی۔ سلمان کو ان کے انداز سے ہلکا سا جھٹکا لگا اور مسکراہٹ بھی ہونٹوں کے کنارے سے پھسل کر باہر نکلنے لگی جسے اس نے سرعت سے قابو کیا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" یہ اس کا پسندیدہ سوال تھا۔ اپنی امی کے سامنے بچپن سے ہر جھڑکی، ہر نصیحت اور ہر جواب طلبی پر وہ بھیگی بلی بن کر جب یہ پوچھتا تھا کہ "میں نے کیا کیا ہے؟" تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس نے واقعی کچھ ایسا کیا ہے جو امی کی پکڑ میں آ چکا ہے۔

"کیا کرتے پھر رہے ہو آج کل تم" ان کا لہجہ ہی نہیں اب کی بار انداز بھی برہم تھا۔ سلمان کو سنجیدہ ہونا پڑا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا تھا پھر جیسے اس نے ہار مان لی۔

"امی میں نے پہلے بھی کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ مجھے ضمیر کی ملامت سہنی پڑے۔۔۔ کچھ غلط کر رہا ہوتا تو آپ سے پہلے ہی مجھے جھڑکیاں دے دے کر میرا جینا دوبھر کر دیتا۔۔۔ اس لئے بے فکر رہیں آپ کا بیٹا اچھے برے کا فرق سمجھتا ہے"

"الحمدوللہ بولو۔۔۔ اور پھر میرا شکریہ ادا کرو۔۔۔ یہ میرے لیکچرز کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔۔۔ میں نے ہی سکھایا ہے یہ سب تمہیں" وہ متاثر ہوئے بنا بولی تھیں۔

"چلو۔۔۔ اب وضو کر کے بھی جھوٹ بولیں گے لوگ۔۔۔ یہی سننا باقی رہ گیا تھا۔۔۔ آپ نے تو کبھی کلمہ پڑھنا بھی نہیں سکھایا تھا۔۔۔ یہ تو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میری دادی ماں کو جنہوں نے میری تربیت کی۔۔۔ مجھے پروان چڑھایا" اس نے بازو پھیلا کر انگڑائی لی تھی۔ چائے کی طلب ہونے لگی تھی

"میرے بیٹے ہو۔۔۔ لفظوں سے کھیلنا جانتے ہو۔۔۔ یہ مجھے پتا ہے۔ یہ ہنر مجھ پر مت آزماؤ۔۔۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ساری ساری رات جاگ کر کیا کر رہے ہو آج کل۔۔۔ پہلے بھی کام تو مشکوک ہی تھے تمہارے لیکن اب تو انداز ہی جدا ہے۔۔۔ سارا دن سوئے رہتے ہو اور رات بھر جاگتے رہتے ہو۔ اور دن کے وقت کمرہ کیوں لاکڈ رکھتے ہو" وہ ابھی بھی اسی انداز سے پوچھ رہی تھیں۔

"توبہ ہے امی۔ آپ کی جاسوسی سے۔۔۔ کمرہ اس لئے لاکڈ کرتا ہوں کہ آپ کمپیوٹر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔۔۔ میرا لیپ ٹاپ تو کھول نہیں سکتیں آپ لیکن ڈیسک ٹاپ کی شامت لے آتی ہیں۔۔۔ کمپیوٹر چلانا آتا نہیں ہے آپ کو۔۔۔ میری ساری محنت کا بیڑا غرق کر دیتی ہیں۔۔۔" وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو آرام دینے کی خاطر انہیں ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخاتے ہوئے بولا تھا۔

"بکو مت۔۔۔ یہ بتاؤ تم آج کل "عہد الست" پر کام کر رہے ہو نا؟" ان کے ایک سوال میں ہی ساری کہانی چھپی تھی۔ سلمان اب ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

"دھت تیرے کی۔۔۔ اس گھر میں آپ سے کچھ نہیں چھپایا جا سکتا۔ آپ دیسی ساخت کی زیرو زیرو سیون ہیں" اس نے مبہم جملے میں بالآخر اعتراف کر لیا تھا۔

"جب یہ بات جانتے ہو تو پھر چھپاتے کیوں ہو اور مختصر بات کرو۔۔۔ تہجد کا وقت ختم ہونے سے پہلے بات ختم کرو" انہیں اب ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

"بات ختم ہو گئی ہے امی۔۔۔ آپ کو پتا چل تو گیا ہے کہ عہد الست پر کام کر رہا ہوں"

"پتا تو مجھے اسی روز چل گیا تھا جس روز نور محمد کی کال آئی تھی لیکن میں نے تم سے پوچھا نہیں۔۔۔ یہ سوچ کر کہ تم خود ہی مجھے بتاؤ گے لیکن تم تو ایسے کمرہ نشین ہو گئے ہو جیسے کیڑے سردیوں میں ہائبرنیٹ ہوتے ہیں" یہ تھا وہ اصل مدعا جس کے باعث امی تہجد کی ادائیگی میں بھی تاخیر برداشت کرنے کو تیار تھیں۔

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا امی کہ میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا۔۔۔ دراصل ابھی گتھیاں سلجھی ہی نہیں۔۔۔ میں خود ہر بات سے مکمل طور پر آگاہی حاصل کیے بغیر کیسے آپ کو کچھ بتا دوں۔۔۔ وقت آنے دیں۔۔۔ سب بتاؤں گا آپ کو" اس نے ہتھیار پھینکنے والے انداز میں کہا تھا۔ امی نے سر ہلایا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھیں اور یہی ان ماں بیٹے کا طریقہ کار تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ وقت آنے پر بتائے گا تو اس کی امی کو بھی یقین تھا کہ وہ اپنی بات کا بھرم رکھے گا۔ یہ ان کی تربیت تھی جو انہیں بحکم اللہ مایوس نہیں کرتی تھی۔

"میں تہجد ادا کر لوں۔۔۔ تم میرا بہت وقت ضائع کرواتے ہو" وہ مزید ایک بھی لفظ کہے بنا اٹھی تھیں پھر اسے جھکے ہوئے انداز پر نظر ڈالی۔

"میں دیگچی آنچ پر چاہے چولہے پر رکھ دیتی ہوں۔۔۔ دس منٹ بعد مگ میں ڈال لانا۔۔۔" وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھنے سے پہلے بولی تھیں۔ سلمان نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا ہونٹوں پر رکھ کر چوما تھا اور پھر اپنی امی کی طرف پھونک ماردی تھی۔ وہ مسکراہٹ چھپا کر باہر کی سمت چل دیں۔ ان کے یہاں محبت اور لاڈ بھی عام روایتی طریقوں سے ذرا ہٹ کر رائج تھے۔ ان کے کمرے سے جاتے ہی سلمان مانیٹر کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اسے بہت کام کرنا تھا۔ بہت سی پرانی یادیں ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ہاں بھئی۔ کیا پلان کیا ہے کل کا؟" ابو (احسان صاحب) نے صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے ان سب کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ شہروز کی وجہ سے عمر اور امائمہ بھی یہیں رکنے والے تھے۔ میرا اپنے کمرے کی بجائے ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا تھا۔ آنٹی (عمر کی ممی) بھی ابو کے ساتھ ہی بیٹھی سب کے خوش باش چہرے دیکھ کر مطمئن سے انداز میں اون سلائیں سے کچھ بننے میں مصروف تھیں۔ ماحول بہت پر جوش سا لگنے لگا تھا۔ گھر میں رونق لگ گئی تھی۔ امائمہ کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے کافی کے مگ والی ٹرے پہلے سامنے مرکزی میز پر رکھی تھی پھر باری باری سب کے مگ ان کے ہاتھوں میں تھما کر خود سنگل صوفہ پر نشست سنبھالی تھی۔ اس سارے ماحول میں صرف وہی تھی جو مرجھائی ہوئی سی لگتی تھی حالانکہ وہ بات بات پر مسکرا رہی تھی لیکن پھر بھی اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ عمر نے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں مگ نہیں تھا۔ عمر نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے اس سے اشارے سے پوچھا تھا کہ اس کا مگ کہاں ہے۔ اس نے پھر بلاوجہ مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی کہ اسے خواہش نہیں ہے۔ عمر پوچھنا چاہتا تھا کہ کیوں لیکن وہ ابو کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ شہروز کی وجہ سے سب کل کے لئے بہت پر جوش انداز میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ پکنک وغیرہ کا ارادہ تھا۔

"شہروز کو ٹریفالگر اسکوائر دکھایا؟" آنٹی نے پوچھا تھا۔

"ممی۔ وہاں ہے کیا دیکھنے والا۔ لارڈ ایڈ مرل نیلسن کا مجسمہ اس کے ارد گرد چار شیروں کے مجسمے۔۔۔ اور اس کے ارد گرد کبوتر ہی کبوتر" عمیر نے سب سے پہلے اعتراض کیا تھا۔

"کبوتروں کی وجہ ہی سے تو وہ جگہ اچھی لگتی ہے مجھے۔ اتنے مہذب اور تمیز دار کبوتر ہیں۔۔۔ پرسکون انداز میں انسانوں سے لاپرواہ ہو کر اپنا دانہ دنکا چنتے رہتے ہیں" انہوں نے ناک کی نوک پر آجانے والے چشمے کو سلائی کی مدد سے اوپر کرتے ہوئے جواب دیا تھا

"مہذب اور تمیز دار نہیں ہیں۔۔۔ بھوکے ہیں اور لالچی بھی۔۔۔ جب تک دانہ ہاتھ پر رہتا ہے تب تک انسان کی قدر کرتے ہیں ورنہ پھر سے اڑ جاتے ہیں" عمیر چڑ کر بولا تھا۔

"ٹاور آف لندن چلتے ہیں" ابو نے کافی کا سپ بھرتے ہوئے اپنی پسندیدہ جگہ کا نام لیا تھا جس پر عمر کو اعتراض تھا

"وہاں پر بھی کچھ نہیں ہے دیکھنے والا۔۔۔ اندر داخل ہوتے ہی لندن کے شاہی قلعے کا وارڈر (گارڈ) آجائیگا۔ پہلے اپنی تعریفیں کرے گا پھر اپنے بادشاہوں کی کرے گا اور پھر کرتا ہی چلا جائیگا۔ وہی قید خانے، وہی ظلم و بربریت کی داستانیں، وہی دنیا بھر سے چرا کر اور ہتھیا کر لائے ہوئے نوادرات اور جواہرات۔۔۔ مجھے نہیں جانا وہاں۔۔۔ میں سخت بور ہو جاتا ہوں اُدھر" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"اتنی اچھی جگہ ہے۔۔۔ پارک کا مزا بھی اور میوزیم کا مزا بھی۔۔۔ دیکھنے کو بھی بہت کچھ اور سیکھنے کو بھی" ابو اپنے انداز میں وضاحت کر رہے تھے۔ عمیر نے نفی میں انگلی ہلائی۔

"نہیں ابو۔۔ اس سے بہتر ہے ریجنٹ پارک چلے چلتے ہیں۔۔ وہاں مزا آئیگا" وہ انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امائمہ نے دیکھا۔ سب کتنے خوش اور مطمئن تھے۔ آنٹی کی توجہ کا مرکز بظاہر ان کی اون سلائیاں تھیں لیکن وہ اپنے بیٹوں کی باتیں سن رہی تھیں، مسکرا رہی تھیں۔ طمانیت ان کے ہر عضو سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اون کا گولہ پھسل کر زیادہ تھمل گیا تھا۔ ابو اسے پکڑ کر اس کے گرد ادھ کھلی اون باندھنے لگ گئے تھے۔ اس کے ساس سسر کی ایک عجیب سی کیمسٹری تھی۔ وہ ایک دوسرے کی بات بن کہے سمجھ جاتے تھے۔ آنٹی ابو کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ ابو ان کے ہاتھ کا کھانا ہی کھانا پسند کرتے تھے آنٹی کو ایک چھینک آجاتی تھی تو ابو اپنے ہاتھوں سے قہوہ بنا کر لاتے تھے۔ بار بار پیشانی چھو کر دیکھتے کہیں بخار تو نہیں ہو گیا۔ ابو کو ذیابیطس تھی لیکن میٹھا کھانے کے شوقین تھے تو آنٹی انٹرنیٹ سے ان کے لئے شوگر فری ڈیزرٹ بنانے کی ترکیبیں ڈھونڈتی رہتی تھیں یا پھر ٹی وی پر ذیابیطس کے لئے کوئی ٹوٹکہ یا گھریلو نسخہ دیکھنے کو ملتا تو بہت اہتمام سے اسے اپنی ڈائری میں تحریر کرتی تھیں اور ابو کو وہ سب بنا کر بھی دیتی تھیں۔ رات کو دونوں اہتمام سے گرم دودھ میں شہد ملا کر پینے کے عادی تھے اور اس وقت دودھ گرم کرنے کی ذمہ داری ابو نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ پاکستانی چینل پر لگنے والے سیریل بھی وہ لوگ ضرور دیکھتے تھے پھر اس پر سیر حاصل بحث بھی کرتے تھے۔ ان کی امائمہ کے لئے یہ سب چھوٹے چھوٹے محبت کے اظہار بہت انوکھے تھے۔ عمر بھی اس کے حق میں بہت اچھا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا۔ اسے وہ عزت دیتا تھا جس کی وہ حقدار تھی لیکن آنٹی اور ابو کے درمیان کی کیمسٹری اسے نجانے کیوں عجیب سے احساس میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس کے امی ابو کے درمیان بھی

کچھ نارمل نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بنا ضرورت مخاطب بھی نہیں کرتے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ابو اکثر اپنے کاموں کے لئے اسے یا پھر ملازم کو ہی مخاطب کرنے کے عادی تھے۔ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تو اس نے انہیں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی نادیدہ چپقلش ہمیشہ ان کے رشتوں میں محسوس ہوتی تھی۔ دوسرے عمر رسیدہ شادی شدہ جوڑوں کی باہمی ہم آہنگی اسی لئے اسے چونکاتی ضرور تھی۔ امی تو ان کے گھر کی ملکہ تھیں۔ ابو ان کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔ عمر عمیر بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ خود بھی بیٹوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ عمر ایک روز ملنے نہیں جاتا تھا تو بے چین ہو کر کال کرتی تھیں کہ وہ خیریت سے تو ہے۔ امائمہ یہ سب دیکھتی تھی محسوس کرتی تھی اور سوچتی تھی۔

"کیسا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں بیٹے۔۔۔ ماں کا مان، ان کی آنکھوں کی روشنی، ان کے دل کا سکون" اس نے گہری سانس بھری۔ آنکھیں نم سی ہونے لگی تھیں۔ وہ بلاوجہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس سے مسکرایا نہیں گیا تھا۔ اس نے دوبارہ سے اپنی گفتگو میں دلچسپی لینی چاہی۔

"ابو۔۔۔ پہلے ٹاور آف لندن چلتے ہیں پھر ریجنٹ پارک چلے جائیں گے۔۔۔ شہروز بھائی کے لئے تو ہر جگہ نئی ہوگی تو ان کو تو اچھا ہی لگے گا" عمیر کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ شاید کچھ فائنل کر چکے تھے۔ امائمہ کو ایک دم سے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ آجکل اس کی طبیعت بھی مزید خراب رہنے لگی تھی۔ صبح سے شام تک بھوک لگنے کے باوجود کچھ کھایا نہیں جاتا تھا۔ کھالیتی تھی تو متلی کی کیفیت ہونے لگتی تھی۔ یہ تو خیر روٹین کی باتیں تھیں۔ اس حالت میں سب کے ساتھ ایسا ہوتا تھا۔ امی اس کو سمجھاتی رہتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتی تھیں۔ امائمہ کے لئے اصل پریشان کن چیز موڈ سوئنگز تھے۔ اسے بلاوجہ غصہ آنے لگتا تھا۔ بیزاری سے جتنا کتراتی تھی اتنا ہی بیزار رہتی تھی۔ عمر سے بلاوجہ جھگڑنے کا دل کرتا رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے معاملے میں لاپرواہی برت رہا ہے۔ وعدہ کرنے کے باوجود اسے تلاش کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہا۔ اسے شہروز کے ساتھ سیر و تفریح کی باتیں کرتا دیکھ کر وہ اکتاہٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ اسی لئے خاموشی سے سب کے درمیان سے اٹھ کر کچن کے چھوٹے سے دروازے سے باہر آکر باغیچے کی جانب اترنے والی سیڑھی نما چبوترے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے عقب میں دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کے اندر سے آنے والی آوازیں اس کے اندر اٹھنے والی آوازوں کو دبا کر خاموش کروا دیں۔ اندر کی نسبت باہر بالکل سناٹا تھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دبا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی حتیٰ کہ اپنی امی کو بھی نہیں۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ اس حالت میں اسے اپنی امی کا دکھ پہلے سے کہیں زیادہ دکھی رکھتا تھا۔ وہ اپنی حالت دیکھتی تھی تو سوچتی تھی کہ امی بھی اسی حالت سے گزری ہوں گی۔ انہوں نے جب اولاد کی خوشی دیکھی ہوگی تو وہ بھی انہی مراحل سے نبرد آزما رہی ہوں گی اور پھر جب یہ سوچتی تھی کہ ان سب حالات کو سہنے کے باوجود ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ بیٹا کھو گیا تھا اور بیٹی بیاہ دی تھی۔ وہ ابھی بھی اتنی ہی تنہا تھیں جتنا کہ ایک بے اولاد ماں ہوتی ہے تو دل بے حد بوجھل ہو جاتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا بس امی کہیں سے اڑ کر آجائیں اور وہ ان کو گلے سے لگا لے، کسی چھوٹے بچے کی طرح ان کو تسلی دے۔ انہیں یقین دلائے کہ امی اللہ آپکی گود کا سکھ آپ کو ضرور لوٹائے گا۔ آپ پریشان نا ہوں امی۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ امی کی یاد ہر وقت اسے گھیرے رکھتی تھی۔ ایسی صورتحال میں دوسرے لوگوں کا ہنسنا بولنا بھی چبھتا تھا۔ ساس سسر کی ایک دوسرے کے ساتھ لگاوٹ بھی زخموں پر چھڑکے جانے والا نمک محسوس ہوتی تھی۔ تنہائی میسر آتے ہی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اولاد کے دکھ ماں باپ کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ماں باپ کے دکھ اولاد کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ اسے بیٹھے چند

منٹ ہی گزرے تھے جب عقب سے چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کچن کا جالی والا دروازہ کھلا تھا۔اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا تھا۔اس کے اندازے کے عین مطابق عمر ہاتھ میں مگ تھامے اس کے قریب سیڑھی پر آ بیٹھا تھا۔

"تم باہر کیوں آ گئے؟" امائمہ نے اب کی بار اس کی جانب دیکھے بنا سوال کیا تھا۔

"یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں تم سے کہ تم باہر کیوں آ گئی؟" وہ اس کے سوال کو ٹال کر بولا تھا

"مجھے گھٹن سی ہو رہی تھی" اس نے کہا تھا۔

"مجھے بھی" عمر نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔امائمہ کچھ نہیں بولی۔

"کیا بات ہے۔۔۔کیا ہوا ہے؟" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پوچھ رہا تھا۔امائمہ پہلے ہی بوجھل دل لئے بیٹھی تھی۔اسے مزید رلانے کا وہ سارا سامان اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔آواز میں فکرمندی،انداز میں اپنائیت اور آنکھوں میں محبت،ستم در ستم یہ کہ اس کے کندھے پر بازو بھی رکھ دیا۔عورت کی ساری رمزیں عجیب ہیں۔مرد رونے کی وجہ نا پوچھے تب بھی روتی ہیں اور اگر پوچھ لے تو بھی روتی ہیں۔امائمہ کی آنکھیں پہلے سے زیادہ تیزی سے بھیگی تھیں۔وہ سر جھکا کر اپنے پاؤں کی جانب دیکھنے لگی۔آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔عمر نے اس کے گرد بازو مزید سختی سے رکھا تھا اور اسے اپنے قریب کیا تھا۔

"کیا ہوا ہے یار۔۔۔اچھا نہیں جائیں گے ہم ٹاور آف لندن۔۔۔جہاں تم کہو گی وہاں چلے جائیں گے۔۔۔لیکن تم رونا تو بند کرو" وہ شرارتی انداز میں اسے چڑا رہا تھا۔امائمہ نے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔عمر کی بات سن کر ہنسی تو نہیں آئی تھی لیکن رونے کی وجہ بھی تو کوئی نہیں تھی سو آنسو روک لینا ہی ٹھیک تھا۔

"عمر! میرا بھائی مل جائے گا؟" وہ اپنے ہی ہاتھ کی پشت پر چمکنے والی آنسوؤں کی نم کو دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی اور عمر اب جا کر سمجھا تھا کہ وہ رو کیوں رہی ہے۔اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا تھا

"میرا دل کہتا ہے کہ ضرور مل جائیگا" وہ قطعیت بھرے لہجے میں بولا تھا۔امائمہ نے اس کی جانب دیکھا پھر اپنی جھنجلاہٹ چھپائے بغیر بولی

"اللہ کا نظام تمہارے دل کے مطابق نہیں چلتا۔۔۔" اس کے دل میں خفگی اس بات کی تھی کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھا ہے۔وہ چاہتی تھی کہ اب جب کہ شہروز بھی آ چکا ہے تو وہ دونوں مل کر کوئی عملی قدم بھی اٹھائیں۔

"تو پھر تم مجھ سے مت پوچھو امائمہ۔۔۔اللہ پر بھروسہ رکھو۔۔۔اللہ چاہے گا تو ہر مشکل آسان ہو جائیگی" وہ ابھی بھی اس کی خفگی سمجھے بنا تسلی دے رہا تھا۔

"عمر۔۔۔اللہ پر بھروسہ ہے مگر توکل کا حکم بھی اونٹ باندھنے کے بعد کا ہے۔۔۔تم کوئی پریکٹیکل ایفرٹ بھی تو کرو۔۔۔تم ایک بار تو لوٹ جاؤ۔"

وہ التجا بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔عمر نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے انداز کو دیکھا پھر یکا یک جیسے اس کے الجھے اور اکتائے ہوئے رویے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم لوگوں نے کوئی پروگرام فائنل کرلیا ہے کیا" عمر نے اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ عمر امامہ اٹھ کر گئے تو چچی اور چاچو ابھی سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میر بھی اپنے کمرے میں آ گیا تھا اور شہروز کا بھی لیپ ٹاپ پر کچھ چیزیں گوگل کرنے کا ارادہ تھا سو وہ بھی اٹھ گیا تھا لیکن عمر پھر اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"تم لوگ مجھے نہیں گھر۔۔۔ میں تو سمجھا تھا تم چلے گئے ہو" شہروز نے سرہانہ کمر کے پیچھے اڑستے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس نے ابھی لیپ ٹاپ گود میں رکھا ہی تھا۔ عمر اور امامہ اس کی وجہ سے روز رات کا کھانا ادھر آ کر کھاتے تھے اور پھر لیٹ نائٹ تک یہیں رہتے تھے۔

"نکلنے لگے تھے بس۔۔۔ ممی امامہ کو کوئی نصیحتیں کرنے لگ گئیں تو میں تمہارے پاس آ گیا۔۔۔ میں نے پوچھا تھا کل کا کیا پروگرام فائنل کیا ہے؟"

"مجھے کیا پتا۔ تم لوگ جانو۔۔۔ میں تو مہمان ہوں۔۔۔ جہاں لے جاؤ گے۔ چلا جاؤں گا" وہ تساہل سے پاؤں پھیلاتے ہوئے بولا تھا۔

"میری بات غور سے سنو۔۔۔ امامہ بہت پریشان ہے یار۔۔۔ اس لئے کل لوٹن چلتے ہیں۔۔۔ صبح صبح نکلیں گے۔۔۔ سنڈے کی وجہ سے ابو دیر سے اٹھیں گے تو ان کی گاڑی پر جائیں گے اور امامہ کے بھائی کا پتا کر کے ان کے اٹھنے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔" وہ اپنی پلاننگ بتا رہا تھا۔ شہروز نے کندھے اچکائے۔ اسے پروگرام کچھ زیادہ بھایا نہیں تھا۔

"ہم وہاں جا کر کہیں گے کیا۔۔۔ کیا پتا کریں گے۔۔۔ میرا مطلب ہے ہم کیا کہیں گے ان سے" اس نے بات مکمل کیے بنا چھوڑ دی تھی اس کے چہرے پر تذبذب تھا جسے عمر نے بھانپ لیا تھا۔

"کیا ہوا تم نہیں جانا چاہتے میرے ساتھ؟" عمر نے سوال کیا تھا۔ شہروز نے برا سا منہ بنایا۔

"صحافی میں ہوں۔۔۔ کہانیاں تم بناتے رہتے ہو۔۔۔ میں نے کب کہا کہ میں نہیں جانا چاہتا تمہارے ساتھ"۔

"جذباتی کیوں ہو رہے ہو۔۔۔ تمہارے چہرے پر نام ہی سوا نو والا ہو گیا تھا تو میں نے سوچا۔۔۔ شاید" اس نے بھی بات ادھوری چھوڑ دی اور اسی کے بستر پر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

"یہ سوا نو والا کونسا نام ہوتا ہے؟" شہروز نے سوال کیا تھا۔ عمر ہنسا۔ وہ اپنے دوستوں میں اکثر یہی ذاتی اختراع والی اصلاح استعمال کرتے تھے جس کا مطلب کسی دوسرے کی کنفیوژن، خفگی یا عدم دلچسپی کو ظاہر کرنا ہوتا تھا۔

"سوا نو۔۔۔ یعنی بلینک۔۔۔ سیدھے سپاٹ۔۔۔ بنا کسی دلچسپی کے۔۔۔ الجھے الجھے تاثرات۔۔۔ جیسے میری بات سن کر تمہارے چہرے پر آ گئے تھے" اس نے وضاحت کی۔

"دلچسپی تو ہے مجھے لیکن الجھا ہوا بھی ہوں کیونکہ کچھ معمہ سا ہے یہ ساری کہانی۔۔۔ برا مت ماننا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس قصے میں کچھ جھول ہے۔۔۔ میں اسے جھوٹ نہیں کہہ رہا لیکن میری عقل نہیں مانتی۔۔۔ عجیب الجھن سی ہے۔۔۔ اور پھر لوٹن جا کر بھی ہم کہیں گے کیا۔ ہمیں ایک شخص کے متعلق پوچھنا ہے جس کے بارے میں ہم بھی سالوں سے کچھ نہیں جانتے۔۔۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم اور امامہ وہاں جا چکے ہو۔۔۔ اس کے متعلق پہلے بھی وہاں جا کر سن گن لینے کی کوشش کرتے رہے ہو۔۔۔ کسی نے پہلے بھی کچھ نہیں بتایا۔۔۔ ذرا سوچو وہ شخص نور محمد اگر وہاں ہوتا تو وہ ایک بار تو خود بھی

اپنی بہن سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔۔وہ اگر وہاں ہے تو کسی سے اسے بھی تو سن گن ملی ہوگی ان کہ اس کی بہن اسے تلاش کر رہی ہے" شہروز نے اپنے دل کی ساری بات بتادی تھی۔

"سچ تو یہ ہے شہروز کہ تم غلط نہیں کہہ رہے۔۔میرے پاس بھی کوئی زیادہ حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ہے۔۔کوئی مستند معلومات بھی نہیں ہیں۔۔امائمہ کے پاس جو فون نمبر تھا وہ اسی بحالی سینٹر کا ہے جہاں بقول امائمہ کے اس کا بھائی بھی مقیم رہا تھا۔ہم نے وہاں فون کیا اور ایک بار وہاں گئے بھی تھے۔۔وہ کسی پاکستانی شخص کا سینٹر ہے۔ابھی سے امائمہ کی دو تین بار فون پر بات ہوئی تھی۔یہ تصدیق تو انہوں نے کی ہے کہ نور محمد نام کا ایک موذن وہاں ہے لیکن یہ بات بھی انہوں نے ہی کی تھی کہ نور محمد کے متعلق لوٹن جا کر پتا کریں۔۔وہ کوئی حتمی بات بھی نہیں بتاتے۔۔وہ وہاں کی جامعہ مسجد میں موذن رہا ہے۔۔امائمہ دو ایک بار وہاں گئی ہے اور ایک بار میں بھی گیا تھا لیکن کبھی کسی سے کچھ ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا۔۔ایک بار تو مسجد کو ہی تالا لگا ہوا تھا۔۔ایک دو بار جو لوگ ملے ہیں۔۔وہ خود کنفیوژڈ لگتے ہیں۔۔کوئی بھی حتمی بات نہیں بتاتا۔۔میں تو وہاں اپنا کانٹیکٹ نمبر بھی چھوڑ کر آیا تھا کہ کسی کو پتا ہو تو ہمیں کال کر کے بتائے لیکن ابھی تک کوئی خیر خبر یا کوئی اطلاع نہیں مل سکی" شہروز نے ساری بات سن کر سر ہلا دیا۔اسے حقیقتاً اس کہانی میں ابھی تک کوئی جان نہیں محسوس ہوئی تھی۔

"تم کچھ بھی کہو عمر۔۔کنفیوژن تو ہے اس ساری کہانی میں۔۔الجھنیں ہیں کافی۔۔حقیقت کا عنصر ذرا کم ہی لگتا ہے" اس نے پرسوچ انداز عمر کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔اس نے امائمہ سے ابھی تک براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی،کوئی تسلی دی تھی نا کوئی اس دلاسا تھی لیکن اس کے وجود پر چھائی ہوئی بے چینی وہ محسوس کر سکتا تھا۔

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گا۔۔لیکن میں کوشش ترک بھی نہیں کروں گا۔۔میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری دلی خواہش ہے کہ میں اس شخص کے متعلق کوئی بھی اطلاع کوئی خیر خبر پتا کر سکوں۔۔میں تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ الجھنیں ہیں لیکن میں امائمہ سے بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بھائی کی تلاش میرے لئے معمہ ہے کیونکہ یہ کسی ایکس وائی زیڈ کی بات نہیں ہے۔۔اس کے سگے اکلوتے بھائی کی بات ہے" عمر کا لہجہ پر عزم تھا۔شہروز نے اسے دیکھا پھر گہری سانس بھرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے

"چل یار ٹھیک ہے۔۔چلے چلتے ہیں۔۔کچھ نا کچھ تو پتا چل ہی جائیگا نا" اس نے حامی بھری تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اگلے دن صبح ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔عمر کے انکار اور اصرار کے باوجود امائمہ ان کے ہمراہ آ گئی تھی۔عمر نے ممی سے رات ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شہروز کے ساتھ بوٹ سیل (پرانی اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے لگائی جانیوالی منڈی) جانے کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے ابو سے گاڑی لینا بھی دشوار ثابت نہیں ہوا تھا اور ان کی جانب سے مزید کوئی سوال جواب بھی نہیں ہوئے تھے کیونکہ بوٹ سیل اتوار بازار کی طرح پہلے آیئے پہلے پایئے کے اصولوں پر چلتی تھی سو جلدی نکلنا ہی مناسب تھا۔وہ وہاں پہنچے تو مسجد کو پھر تالا ہی لگا ہوا ملا تھا لیکن پھر ملحقہ گلی کے کونے پر موجود پوسٹ آفس میں پوچھنے پر وہاں کام کرنے والے ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ان کا نام استقلال بیگ تھا اور تعلق بنگلہ دیش سے تھا۔انہوں نے بتایا کہ وہ اسی مسجد میں پارٹ

قائم رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دیتے ہیں اور ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

"نور محمد اس وقت اپنے گھر پر ہوں گے۔ آپ کچھ دیر انتظار کر لیں تو نماز ظہر کے وقت ان سے ملاقات ممکن ہو سکے گی" انہوں نے مشفق لہجے میں کہا تھا۔ ان کی بات سن کر امائمہ کے چہرے پر اضطراب اور مسکراہٹ ایک ساتھ چمکی تھی۔

"یہاں پر نور محمد نام کے شخص ہی موذن ہیں نا۔۔۔ وہ جو بلیک برن سے آئے تھے" اس نے تصدیق کرنی چاہی تھی کیونکہ ابھی تک پوچھ گچھ کرنے پر شکوک شبہات سے بھری آراء ہی ملی تھیں۔ استقلال بیگ کے انداز میں استقامت تھی۔ امائمہ کو کافی حوصلہ ہوا تھا ان کی بات سن کر کہ آج تو کوئی اچھی خبر ضرور مل جائیگی۔

"یہ معمہ تو کوئی بھی حل نہیں کر پایا کہ کہاں سے آئے تھے پر ان کا نام نور محمد ہی ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ امائمہ نے چونکہ اردو میں بات کی تھی اس لئے وہ بھی بنگالی اور اردو کا ملا جلا جملہ بولے تھے۔ امائمہ کو ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا لیکن عمر ضرور سمجھ گیا تھا۔

"ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ وہ نور محمد ہیں۔۔۔ ہم ان سے ملنے کے لئے بہت بے چین اور پر امید ہیں۔۔۔ یہ ان کی بہن ہیں اور بہت عرصے سے ان سے نہیں ملی ہیں" اس نے ان کو بتایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر استقلال بیگ نور محمد کو ذاتی طور پر جانتے ہیں تو اس کی بہن کا حوالہ مزید کارآمد رہے گا اور یہی ہوا تھا۔ انہوں نے حیرانی سے ان سب کے چہروں کو باری باری دیکھا۔

"ان کی کوئی بہن نہیں ہے" وہ اپنے تاثرات بنا چھپائے ہوئے بولے تھے۔

"میں ان کی بہن ہوں۔۔۔ میرا یقین کیجئے" امائمہ تڑپ کر بولی۔

"آپ ان کی بہن نہیں ہو سکتیں" وہ استہزائیہ انداز میں بولے تھے۔ ان کا انداز عجیب لگا تھا ان تینوں کو۔۔۔ امائمہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شہروز نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تا کہ اسے خاموش رہنے کا سگنل دے سکے۔

"جی آپ درست کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں" وہ بولا تھا

"آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کریں میں ان کو فون کرتا ہوں" انہوں نے اپنا سیل فون جیب سے نکالا تھا۔ وہ تینوں واپس گاڑی میں آبیٹھے تھے۔ امائمہ تو عورت ذات تھی اور پھر اس کے گمشدہ بھائی کے متعلق پہلی بار کوئی مصدقہ اطلاع ملی تھی اس کا جوش اور خوشی تو سمجھ میں آتی تھی مگر فطری طور پر شہروز اور عمر بھی کافی ولولہ سا محسوس کرنے لگے تھے لیکن اعصاب میں تناؤ سا بھی تھا۔ جیسے کسی ان دیکھے تحفے کی پیکنگ کھولنے سے پہلے والی کیفیت ہوتی ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان پر چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد استقلال بیگ نے انہیں مسجد کا دروازہ کھول کر ہال سے ملحقہ ایک حجرے میں بٹھا دیا تھا تا کہ وہ وہاں بیٹھ کر انتظار کر سکیں۔ آدھا گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑا تھا اور پھر ایک شخص اندر آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سپید تھا، چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی قدر بے رونق لگتی تھیں۔ ان میں بھی سوال چھپے تھے۔ شہروز نے حیرانی سے عمر کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا اور عمر امائمہ کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی مایوس نظر آتی تھی۔ عمر کے تنے ہوئے اعصاب میں مزید جھنجھناہٹ سی ہوئی۔ ہال کول میں جانے سے پہلے ہوا میں معلق محسوس ہوتا تھا۔ ان تینوں کے چہرے پر سوالیہ نشان چمکنے لگا تھا۔

"آپ نور محمد ہیں؟" شہروز نے سب سے پہلے خاموشی کو توڑا تھا

"نہیں" اس شخص نے سر ہلاتے ہوئے نفی میں جواب دیا تھا۔ ان تینوں کے اعصاب ایک دم ڈھیلے ہو گئے تھے۔ امائمہ نے تھوک نگل کر حلق کو تر کیا۔ اس کی حالت سب سے بری ہو رہی تھی۔ ہیجان اور تناؤ اس کی طبیعت کے پیش نظر ویسے بھی اچھا نہیں تھا۔

"ہمیں نور محمد سے ملنا تھا" یہ بھی شہروز نے ہی کہا تھا۔ امائمہ اور عمر تو خاموش ہی ہو گئے تھے۔ اس شخص نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ ان سے زیادہ تناؤ کا شکار نظر آتا تھا اس کی آنکھیں بھی بجھا بجھا۔ ابھی کہانیاں سناتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ تینوں اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"میرا نام زین العابدین ہے۔ میرے پاس آپ کے لئے اچھی خبر نہیں ہے" اس نے کہا تھا۔ اس کی آواز میں بھی وہی اضطراب تھا جو اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ امائمہ نے عمر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ایسی صورتحال کا سامنا تو بھی اسے تب بھی نہیں کرنا پڑا تھا جب اس کے رزلٹس اناؤنس ہوتے تھے۔

"نور محمد کا انتقال ہو چکا ہے" اس شخص نے ان میں سے کسی کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔

"یا اللہ۔۔۔" اب کی بار امائمہ نے تڑپ کر عمر کی جانب دیکھا جبکہ شہروز اور عمر بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میرا بھائی زندہ ہے عمر۔۔۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں" امائمہ نے ٹھوس لہجے میں اس سے کہا تھا۔ وہ گھر آچکے تھے اور ان دونوں کو امائمہ کو سنبھالنے کے لئے کوئی خاص جتن نہیں کرنے پڑے تھے۔ توقع کے برعکس امائمہ بہت کمپوز ڈ رہی تھی۔ وہ سارا راستہ روئی تھی نا ہی اس نے مزید کوئی سوال کیا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گھری محسوس ہوتی تھی۔ دل تو ان دونوں کے بھی بوجھل تھے اور دل میں سوالات اور خدشات بھی تھے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ گھر میں تو عمر نے ابھی تک یہ ذکر بھی کسی سے نہیں کیا تھا کہ امائمہ اپنے بھائی کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ وہ امائمہ کے لئے بھی افسردہ تو تھا لیکن ذہن میں یہ کشمکش بھی تھی کہ ممی کو جا کر بتانا چاہیے تاکہ فوتگی کے بعد والی دعائے مغفرت وغیرہ کروائی جا سکے اور پھر پاکستان میں امائمہ کے والدین کو کس طرح یہ بری خبر دینی تھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ امائمہ کو اکلوتی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اس موقع پر ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ انہیں سنبھالنے کے لئے کسی قریبی عزیز کا وہاں ہونا بہت ضروری تھا۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران بھی امائمہ کو تسلی یا دلاسہ نہیں دے پایا تھا کیونکہ وہ پیچھے سیٹ پر بیٹھی تھی اور گھر واپس آکر عمر کے کسی بھی دلاسے کو اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے اس خیال کو ہی رد کر دیا تھا کہ اس کا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

"تم خود سوچو ایک شخص کہتا ہے نور محمد ہی یہاں کا موذن ہے۔۔۔ ایک کہہ دیتا ہے۔۔۔ نہیں وہ نہیں ہے۔۔۔ پھر ایک تیسرا آدمی آتا ہے اور وہ کہہ دیتا ہے کہ نور محمد کا انتقال ہو چکا ہے۔۔۔ میرا دماغ تو ماؤف ہوا جا رہا ہے" وہ چڑ کر بولی۔

"امائمہ! میرا خیال ہے وہ لوگ جھوٹ نہیں بول رہے۔۔۔ انہیں کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی" عمر نے اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے تحمل بھرے لہجے میں کہا تھا۔ امائمہ کے بھڑکنے کا خطرہ تھا اور ہوا بھی یہی۔۔۔ اس نے مزید چڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"عمر پلیز۔۔۔تم اب میرا دماغ مت کھاؤ،، میں پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں۔۔۔میں نہیں مان سکتی کہ میرا بھائی۔۔۔۔" وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی پھر اس نے چھوٹی تپائی پر پڑا اپنا بیگ اٹھا کر اس میں سے اپنا موبائل نکالا تھا۔وہ کسی کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔شہروز فلور کشن پر بیٹھا ان دونوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔اس کو تو اس سارے واقعے پر صرف کہانی کا گمان ہو رہا تھا لیکن چونکہ وہ یہ بات برملا کہہ نہیں سکتا تھا اس لئے خاموشی سے ان کو دیکھنے اور سوچنے میں مگن تھا

"نور محمد کا اصل قصہ کیا ہے؟"

☆ ☆ ☆

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ نور محمد استعمال کیا جا رہا ہے۔اس کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نور محمد ہی کیوں۔۔۔؟

اس عام سے شخص میں کیا بات ہے۔۔۔؟؟؟اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف نور محمد ہی نہیں ہے۔بدقسمتی سے یہ سازش اتنی سادہ نہیں ہے۔ایسے لاتعداد لوگ ہو سکتے ہیں اور ہوں گے بھی جن کے متعلق آپ کو آنے والے سالوں میں پتا چلتا رہے گا کہ وہ کیسے اس سازشی دائرے میں خود بخود پھنستے چلے گئے۔تیسری دنیا کے غریب اور بالخصوص اسلامی ممالک سے لاتعداد لوگ ہر سال یورپ، کینیڈا امریکہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ان کے متعلق ہر ملک ایک ٹھوس جامع پالیسی رکھتا ہے۔اس ملک کے شہریوں کو اس پالیسی پر کتنے ہی اعتراضات کیوں نا ہوں یہ ہیومن ٹریفکنگ کا سلسلہ رکتا نہیں ہے اور رک سکتا بھی نہیں ہے کیونکہ یہ مین پاور ہے۔اس کی بھی معاشی نظام میں ایک اہمیت ہے۔یہ کسی بھی ملک کی معیشت کے دھارے کو رواں دواں رکھتے ہیں۔نور محمد اسی نظام کا حصہ بن کر اپنے ماموں کے ساتھ سن 2000 میں انگلینڈ آیا تھا۔اس وقت بھی لوگوں کے بارے میں ایمبیسی میں معلومات رکھی جاتی تھیں،ریکارڈ موجود ہوتے تھے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔یہ ایک طرح کی سیکورٹی ہے،اس پر کسی کو مشکوک نہیں ہونا چاہیے لیکن جب یہ معلومات لیک آؤٹ ہو جائیں اور انہیں کہانی گھڑ کر بڑھا چڑھا کر بیان کیا جانے لگے تو یہ بات کسی ایسے عنصر کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے کہ جس کے مقاصد غیر قانونی اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔افسوس صد افسوس کہ مسلمانوں کے متعلق ایسے عناصر کافی سرگرم ہیں۔میری معلومات کے مطابق نور محمد کو ایک این جی او نے اسپانسر کیا تھا لیکن یہ بات صرف نور محمد کے ماموں جانتے تھے۔یہ آپ کو سننے میں بے شک اچھی نا لگے لیکن یہ کوئی حیران کن یا انوکھی بات نہیں ہے۔بہت سی این جی اوز تعلیم کے نام پر اسکالرشپس، گرانٹس اور لونز ضرورتمند طلباء کو فراہم کرتی ہیں۔ان کا دائرہ کار سن 2000 میں بھی وسیع تھا اور اب تو وسیع ترین ہو چکا ہے۔آپ کے ملک میں دھڑا دھڑ وظائف تقسیم کئے جا رہے ہیں۔لوگ ہاتھوں ہاتھ سود پر قرضے لے کر اپنی اولاد یں یورپ میں علم حاصل کرنے کے لئے بھیج رہے ہیں۔غریب ضرورتمند طلباء کو امداد دی جا رہی ہے۔میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ غلط ہے۔۔۔یہ سوچنا آپ لوگوں کا کام ہے۔میں کوئی مفتی نہیں ہوں کہ فتوی جاری کروں۔میں آپ کو صرف اس نظام کو سمجھنے کے لئے یہ ساری باتیں بتا رہا ہوں کہ اصل میں نور محمد کے ماموں نے اس کے والدین کے علم میں لائے بغیر ایسی ہی این جی کو نور محمد کو اسپانسر کرنے کے لئے درخواست دی تھی۔اس کا تعلیمی ریکارڈ تو اچھا تھا،وہ پوزیشن ہولڈر رہا تھا۔وہ اسکالرشپ کا مستحق تھا لیکن اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ آسانی سے گرانٹ نہیں مل سکتی تھی اس لئے انہوں نے یہ کہانی بڑھا چڑھا کر خود بیان کی تھی کہ نور محمد کو اس کے والد کسی لڑکی کے ساتھ افیئر کی بناء پر ذہنی و جسمانی ٹارچر کرتے رہے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا

ہے۔اسے ماحول بدلنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ وہ اپنی توانائی کو مثبت طریقے سے استعمال کر سکے۔ یہ کہانی بہت دلچسپ تھی۔اس میں ہمدردیاں سمیٹنے، مسلمان والدین کی تربیت کی خامیاں گنوانے اور کسی اسلامی معاشرے کی گھٹن کو ظاہر کرنے کے بہت زیادہ امکانات تھے۔اس این جی او کو یہ کہانی اور نور محمد کافی پسند آئے۔ایک بات تو یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ایسی این جی اوز نا تو صرف آپ کے ملک میں ایکٹو ہیں اور نا ہی یہ اب ایکٹو ہوئی ہیں۔ایک عرصے سے یہ سلسلہ جاری ہے۔وہ کام جو پہلے عیسائی مشنری کیا کرتے تھے وہی کام یہ این جی اوز زیادہ موثر اور بہتر طریقے سے سرانجام دے رہی ہیں۔ان کا بنیادی مشن گراس روٹ لیول تک رائے عامہ کو اپنے مفاد اور حق میں نرم کرنا ہوتا ہے۔ یہ والی این جی او جس نے آپ کو مشکوک کیا ہے اس کی ابتدا افغانستان سے ہوئی تھی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس خطے یعنی پاکستان افغانستان میں متحرک ہونے سے بھی پہلے یہ اور ان جیسے بہت سارے عناصر لاطینی امیریکہ کے ممالک یعنی وینزویلا پانامہ کو لیبیا۔۔۔جنوبی ایشیاء کے ممالک یعنی انڈونیشیاء ملائیشیا، خلیجی ریاستیں یعنی سعودی عریبیہ، متحدہ عرب امارات اور افریقہ کے بہت سارے غریب ممالک یعنی یوگنڈا گھنی سوڈان الجزائر، صومالیہ میں متحرک رہے ہیں۔اب یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان این جی اوز یا رفاہی اداروں کا مقصد کیا ہوتا ہے۔۔۔کیا واقعی یہ کسی ملک کی عوام کی محبت میں وہاں آ کر اپنے نیٹ ورک مضبوط کرتے ہیں۔۔۔اگر کوئی ہوش مند انسان ایسا سوچتا ہے تو اس سے بڑا بیوقوف روئے زمین پر کوئی نہیں ہوگا۔۔۔" انہوں نے توقف کیا تھا۔

سلمان نے منہ کھولا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تا کہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ ہوش مند ہے بیوقوف نہیں ہے۔اسے اس نام نہاد جدید رفاہ عامہ کے سارے نیٹ ورک کی خبر ہے اور وہ تو پہلے ہی جانتا تھا کہ بیرانِ ملک سے آئی امداد کبھی عوامی مفاد کے لئے نہیں ہو سکتی لیکن اس کا منہ کھلا ہی رہا۔۔ سچائی یہی تھی کہ وہ اتنا بھی باخبر نہیں تھا۔وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ بل گرانٹ جو کچھ اسے بتا رہے ہیں وہ بہت چونکا دینے والی خوفناک حقیقت تھی۔

"یہ ادارے نئے زمانے کی ایسٹ انڈیا کمپنیاں ہیں اور یہ دنیا کو دہشت گردی، اسلامو فوبیا یا ریڈیکل اسلام جیسی اصطلاحات سے جتنا بھی خوفزدہ کریں یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ان کو چلانے والی قوتیں وہی ہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں برطانیہ امریکہ جرمنی اٹلی فرانس۔۔۔ممالک وہی پرانے ہیں اور ان کی ڈوریں ابھی بھی انہی امیر ترین کھربوں اربوں کمانے والے خاندانوں کے ہاتھوں میں ہیں جو اس دنیا کے اثاثوں اور وسائل کو اپنے آباء کی میراث سمجھتے ہیں۔۔۔اور ایک بات۔۔۔آپ اس غلط فہمی سے نکل آئیں کہ یہ خاندان صرف یہودی ہیں، نہیں۔۔۔اس حمام میں سب عریاں ہیں۔۔۔اس میں عیسائی، ہندو، بدھسٹ اور مسلمان سب شامل ہیں۔۔۔یہ سب وہی لوگ ہیں جو دنیا کے وسائل پر اپنا حق سمجھتے ہوئے آکٹوپس کی طرح "انسان" کو جکڑے رکھنا چاہتے ہیں۔یہ وہی ہیں جو کبھی ون ورلڈ آرڈر تخلیق کر کے دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنانے کی بات کرتے ہیں کبھی گلوبلائزیشن کے نام پر دنیا کی آنکھوں میں مٹی جھونکتے ہیں اور کبھی کارپوریٹ کلچر جیسے دل لبھانے والے الفاظ استعمال کر کے انسانوں کی منڈی میں راج کرتے ہیں آئل ریفائنریز، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی فیلڈ۔۔ صنعتی زون۔۔۔بڑے بڑے شاپنگ مالز۔۔۔فوڈ چینز۔۔۔سب کے سب ان کے پھیلائے ہوئے جال ہیں۔۔۔ان کے مالکان کا بنیادی مقصد بھی ایک ہے۔۔۔حکمرانی۔۔۔ان کی جنگ بظاہر انسان سے ہے بھی نہیں۔۔۔وہ اللہ کے ساتھ دو بدو مقابلوں میں مصروف ہیں۔۔۔دراصل انسان "واحد" کا تصور کبھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا۔وہ عہد الست کو سمجھ ہی نہیں پایا۔۔اللہ ایک ہے، تھا اور رہے گا۔۔۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی اقتدار اعلیٰ ہے۔۔اس نے جو چیز اپنے "اختیار" میں کر لی۔۔۔آپ کا "اختیار" نہیں کہ آپ اس پر کسی قسم کا "اختیار" جتا

سکیں۔۔۔یہ دنیا، اس کے وسائل اور ان وسائل پر پلنے والا "حضرت انسان" یہ اللہ کی چیزیں ہیں۔۔۔ہم سب اللہ کی چیزیں ہیں۔۔"اُسے" صرف "اُسے" حق ہے کہ وہ جب چاہے جسے چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔۔۔کسی امیر خاندان، کسی رفاہی ادارے یا کسی طاقتور ملک کو یہ حق دیا ہی نہیں گیا کہ وہ انسان کو "چیز" کی طرح استعمال کر سکے۔آپ اب ذرا رب کائنات کی عطا پر غور کریں کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کو یہ حق دیتا ہے تو وہ خود "انسان" ہے جسے وہ خود مختار پیدا کرتا ہے اور اسے اس کے ہر عمل کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے اور صرف ایک "عہد" کرتا ہے۔۔۔وہ پوچھتا ہے۔۔۔بتاؤ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔انسان اقرار کرتا ہے اور پھر وہ جب دنیا کے چہرے پر نمودار ہوتا ہے تو سب بھول جاتا ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے تھے۔

اس ساری طویل گفتگو میں پہلی بار سلمان کو کمی کا احساس ہوا۔وہ اس شخص کو کس بنیاد پر "مسلمان" سمجھنے سے انکاری تھا۔وہ اس سے بہتر اللہ کے "حق" کو سمجھتا تھا۔وہ خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا لیکن اس سفید فام نے اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"دنیا بہت خوبصورت ہے لیکن یہ کسوٹی بھی ہے۔۔جب ایک سبق پڑھایا جاتا ہے تو دہرانا بھی جاتا ہے۔۔اس کی آزمائش بھی لی جاتی ہے تاکہ آپ کو جانچا جا سکے۔آپ کو امتیازی نمبروں سے کامیاب ٹھہرایا جا سکے۔اللہ نے آپکو ایک ہی سبق خود پڑھایا ہے اور وہ "عہد الست" ہے۔آپ کو امتیازی حیثیت چاہیے۔آپ کو کامیابی چاہیے تو آپ کو ان فتنوں سے ان آزمائشوں سے بچ کر گزرنا ہے، دامن بچا کر چلنا ہے۔۔۔یہ پل صراط سے پہلے والا پل صراط ہے۔۔۔جو یہاں سے سر جھکا کر احتیاط سے ہر باطل قوت کو شکست دے کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گزر گیا۔وہ انشاءاللہ روز آخرت بے خطر سر اٹھا کر "پل صراط سے گزر جائے گا۔اس لئے ان باطل قوتوں کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔المیہ یہ ہے کہ یہ پہلے سے کہیں زیادہ متحرک اور سرگرم ہو چکے ہیں" انہوں نے ہاتھ آپس میں رگڑ کر انہیں اپنی داڑھی پر پھیرا تھا۔وہ ایک بار پھر مذہب سے ریاست پر آگئے تھے۔

"ان باطل قوتوں کا ایک ہی طریقہ کار ہے۔۔یہ این جی اوز اور دوسرے رفاہی اداروں کی شکل میں ٹڈی دل کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ان کے دو بنیادی ہتھیار ہیں یہ لوگ پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں، وسائل کا کھل کر استعمال کرتے ہیں اور ان کا اخلاق دل موہ لینے والا ہوتا ہے۔یہ کسی بھی ریاست میں اپنی میٹھی زبان سے اپنی محبت سے وہاں بسنے والے لوگوں کا دل جیتتے ہیں اور پھر انہیں اپنی جانب راغب کر لیتے ہیں۔یہ لوگوں کے مسائل سنتے ہیں ان کا تدارک کرتے ہیں یا پھر تدارک کرنے کی یقین دہانی کرواتے ہیں۔عام انسان کے مسائل صحت تعلیم خوراک امن اماں تک محدود ہوتے ہیں اور یہ ادارے جب انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معاشروں میں خود بخود ان کی خاص جگہ بنتی جاتی ہے۔وہ کام جو لاکھوں ہتھیار نہیں کر پاتے وہ ان کا اخلاق کر دیتا ہے۔یہ یوتھ کو یعنی سولہ سے بائیس سال کی عمر کے لوگوں کو ٹارگٹ کرتے ہیں، ان کی برین واشنگ کرتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ یہ اس طرح سے جڑوں میں پھیل جاتے ہیں کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی اور ان کے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔عوام میں جب ان کی ایک اچھی خاصی کنٹرول بن جاتی ہے تو پھر یہ اپنے پریشر گروپس بنا لیتے ہیں۔یہ اتنے طاقتور ہو جاتے ہیں کہ کسی بھی ریاست کے مقتدر اعلیٰ نا ہوتے بھی نا صرف عوام بلکہ حکومتوں پر بھی حکومت کرنے لگتے ہیں۔یہ اپنے مفاد کی خاطر ریاستوں کے وسائل کا اندھا دھند استعمال کرتے ہیں۔حکمرانوں سے اپنی مرضی کے کام کرواتے ہیں، اپنی مرضی کے قوانین بنواتے ہیں۔بڑے بڑے اداروں میں اپنی مرضی کی بھرتیاں کرواتے ہیں

۔۔جہاں رقم خرچ کر کے بات بنتی ہے وہاں رقم خرچ کرتے ہیں، جہاں رقم نہیں خرچ کر سکتے وہاں بلیک میل کر کے کام نکلواتے ہیں اور جب یہ دونوں حربے کام نہیں کرتے تو پھر حکومتوں کی بے دخلی، قتل و غارت ۔امن و امان کے مسائل پیدا کیے جاتے ہیں" ان کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں لیکن سلمان کا حوصلہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ بہت خوفناک حقائق تھے جو کسی بھی عقل و شعور رکھنے والے انسان کو دہلا کر رکھ سکتے تھے۔

"مسٹر سلمان حیدر اب ان سب حقائق کے تناظر میں اپنے ملک کی صورتحال کو جانچ لیجیے۔۔۔آپ کو مجھ سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔۔آپ کھلی آنکھوں کے ساتھ اکیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لے لیجیے ہر چیز آپ کو خود بخود سمجھ میں آنے لگے گی اور پھر آپ کو حیرانی نہیں ہوگی کہ نور محمد کو کیوں کس لئے اور کس طرح سے ٹریپ کیا گیا ہے۔میں نے آپ سے کہا نا کہ پاکستان کا اصل سرمایہ یہاں کی یوتھ ہے جو ہر سال مشروم کی طرح پھل پھول رہی ہے۔نئی نسل جو واقعی کسی ملک کی تقدیر کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے اسے یہ باطل قوتیں اپنے جال میں جکڑ کر برباد کر رہی ہیں۔این جی اوز نے یہاں بھی سولہ سے پچیس سال کی عمروں کے لوگوں کو ٹارگٹ کیا ہے کیونکہ ان کے ذہنوں کو بدلنا آسان ہوتا ہے ۔نوجوان نسل جذباتی ہوتی ہے، نڈر ہوتی ہے۔اور تجربات کرنے یا مہموں میں حصہ لینے سے گھبراتی نہیں ہے۔ان کو ان کی اساس سے ہٹانے کے لئے بہت سے ذرائع ڈھونڈے گئے۔۔۔وہ ہر وسیلہ جو ذہنوں کو بدل کر رکھ دے۔۔این جی اوز، میڈیا۔ٹیکنالوجی۔۔سوشل ایکٹیوسٹ۔۔ادیب شاعر ۔۔اساتذہ۔۔ہر وہ ادارہ جو نسلوں کو بنانے میں معاون ہو سکتا ہے اسے اندر سے کھوکھلا کر کے اپنی معاونت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔یہ این جی اوز اور رفاہی ادارے لوگوں کے دماغوں کو برین واش کر رہے ہیں، انہیں سکھا رہے ہیں کہ ان کا عقیدہ ابتداء سے ہی غلط تھا۔یہ انہیں (یوتھ کو) دو قومی نظریے کو بے بنیاد کہنے کا درس دیتے ہیں، یہ بتاتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں۔۔۔یہ زندگی بھوک جنس نیند اور موت کے علاوہ کسی دوسری چیز کو انسان کی بنیادی ضرورت نہیں سمجھتے۔یہ میڈیا کے ذریعے ناچ گانے، رومانوی داستانیں اور آدھے ادھورے کپڑوں میں ملبوس اداکار دکھا دکھا کر یوتھ کو کلچر لیس کر رہے ہیں۔۔جو ثقافت کے نام پر عورتوں کو گھر سے اور پھر کپڑوں سے باہر آنے کو حقوقِ نسواں قرار دیتے ہیں۔۔یہ انہیں (یوتھ کو) سکھا رہے ہیں کہ مذاہب ذاتی معاملہ ہوتے ہیں، اور ذاتی معاملے دلوں یا گھروں تک محدود ہوتے ہیں، انہیں گھروں باہر لانے یا پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لئے اگر آپ اسلام کے ماننے والے ہیں تو اسلام کو گھر میں ہی رکھیں۔۔۔معاشرے میں نکل کر اسلام کی بات کرنا کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کی توہین ہے اس لئے مذہب پر بات کرنا بد اخلاقی ہے۔۔یہ اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ کتابوں میں الف اللہ اور بے بسم اللہ پڑھانا شدت پسندی کو ہوا دینے کے مترادف ہے، جو انہیں سمجھاتی ہے کہ اللہ کو بھگوان کہو یا یزدان۔۔اس سے مراد "اللہ" ہی ہوتی ہے۔۔داڑھی پردہ کا درس دینے والا ریڈیکل ہے اور ریڈیکل کا مر جانا ہی بہتر ہے۔۔۔آپ کی نئی نسل ان باطل قوتوں کے ہاتھوں پروان چڑھ رہی ہے اور یہ سب اپنا نصف سے زیادہ کام کر چکے ہیں۔2000 سے 2005 تک یہاں سیکولر سوچ تیزی سے پروان چڑھنا شروع ہوئی۔تین سال بعد 2010 میں یہاں کی پچیس فیصد آبادی کھلے عام سیکولر ہو چکی ہوگی اور 2015 میں پچاس فیصد لوگ سیکولرازم کو ہی اصل "اسلام" اور ترقی یافتہ معاشرے کی ضرورت قرار دینے لگیں گے۔۔۔یہ کسی بھی ریاست کے خلاف کی جانے والی بدترین سازش ہے کہ اس کی نئی نسل کو اس کے عقائد سے ہٹا کر اس میں اپنی من پسند سوچ انجیکٹ کر دی جائے۔۔۔سیکولر سوچ اس مٹی کو راس نہیں آسکتی۔۔یہ اس کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔آنکھیں کھولیں۔آپ ایک زرخیز ترین ملک

سے تعلق رکھتے ہیں۔وقت کی ضرورت کو سمجھیں،اپنے دشمنوں کو پہچانیں اور کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں ورنہ۔۔۔وہ خاموش ہو گئے تھے جبکہ سلمان گنگ رہ گیا تھا۔اس کے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ایک محب وطن انسان کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔

"میں نے جتنا ریسرچ کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس ملک میں صورتحال اتنی خراب نہیں ہے۔اس ملک میں ترقی کرنے کے بہت سے گن ہیں۔۔یہ قطعاً غریب ملک نہیں ہے۔۔۔یہاں کا کپڑا اور ہوزری بھی ممالک کو ایکسپورٹ کیا جاتا ہے اور یہاں کے آم مالٹے اور چاول کے لئے لوگ دن گن گن کر انتظار کرتے ہوں۔یہاں تیل گیس اور سونے جیسے خزینے مٹی کے سینے میں دبے ہیں۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا مالا مال ملک ترقی کیوں نہیں کرتا اور پھر میں اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ یہاں جتنی مایوسی ظاہر کی جاتی ہے وہ سب مصنوعی ہے۔۔میرے جیسے لوگوں سے نور محمد جیسے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں لکھوانے کی وجہ بھی دراصل مایوسی پھیلانا ہی ہے۔

نور محمد کی کہانی اس ڈونر این جی او کے لئے بے پناہ کشش کا باعث تھی جو ان کے ماموں نے سنائی تھی۔گزشتہ کچھ سالوں سے ہر وہ قصہ جو اس معاشرے کی گھٹن ظاہر کر کے یہاں کی یوتھ کو مایوسی سے ہمکنار کر دے کو ہوا دی بھی اور دی جا رہی ہے۔اسی لئے خوشی خوشی نور محمد کو اپنا نسر کیا گیا اور اس کے متعلق جو بھی معلومات تھیں وہ گھڑی نہیں گئیں صرف تلاش کی گئیں کیونکہ ان کے ماموں نے خود سب بتایا تھا۔اس کا ریکارڈ بھی رکھا گیا۔مجھے لگتا ہے یہ کہانی تب ہی تخلیق کر لی گئی تھی جب نور محمد کو گرانٹ دی گئی لیکن میں اس بارے میں سو فیصد پر یقین نہیں ہوں۔۔بہر حال نور محمد روپڑ بل آ گئے۔یہاں پر آ کر کہانی میں ایک اور ٹوئسٹ آ گیا۔نور محمد روپڑ بل آ کر یکدم مذہب کی جانب راغب ہونے لگا۔اس کی ذہنی حالت کچھ عرصہ ٹھیک رہی لیکن اسے الوژنز ہونے لگے۔اس مرحلے پر وہ این جی او جس کے پاس آپ نے ریکارڈ دیکھا نے اس ساری کہانی کے کاپی رائٹس اس اشاعتی ادارے کو فروخت کر دیئے جن کے لئے میں بھی کام کرتا ہوں۔میں پہلی مرتبہ اپنے ناول کے سلسلے میں ہی نور محمد سے متعارف ہوا تھا۔یہ ناول اب نوے فیصد مکمل ہو چکا ہے۔۔میں دس فیصد پر کام کر رہا ہوں۔۔۔میں اس ناول کو کسی قیمت پر ادھورا نہیں چھوڑوں گا کیونکہ اس ناول نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔۔میں اس کا کریڈٹ اسی لئے نور محمد کو دیتا ہوں۔۔میں نے جب اس ناول کی کہانی ترتیب دینی شروع کی تو میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا تھا لیکن اب میں یہ بات حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نور محمد کو سب سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتا ہوں۔یہ بخور (خوشبو۔عرب کلچر میں اگربتی کی طرح جلا کر خوشبو پیدا کرنے والی جڑی بوٹی کی بہت اہمیت ہے۔اسے بخور کہتے ہیں) جیسا آدمی کسی کی مستقل دعاؤں کے حصار میں ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا پسندیدہ بندہ بھی ہے۔آپ خود بتائیں کتنے لوگ ہوتے ہیں جن سے ہم ہر روز ملتے ہیں،کیا ہمیں ہر انسان سے محبت اور انسیت ہو جاتی ہے۔کیا ہم ہر شخص کی مدد کرنے کے لئے اپنا وقت اور پیسہ خرچ کر کے غیر ممالک کا سفر کرتے ہیں۔۔آپ میں اور صوفی سیف اللہ کیوں نور محمد کے لئے اس قدر پریشان ہوتے ہیں۔۔۔قسمت والے ماں باپ کی اولاد ہوتے ہیں نور محمد جیسے بیٹے۔۔اور قسمت ہی ہے جو ہیروں کو مٹی کے مول بکواتی ہے۔۔۔میں جب نور محمد سے ملا تو وہ دنیا کو منکر ہو چکا تھا۔میرا ماننا ہے کہ اللہ کو دنیا کا انکار پسند نہیں ہے ورنہ کوئی ایک نبی تو دنیا سے منکر ہوتا۔دنیا کا منکر،منکر انسان ہونے لگتا ہے اور یہ بات قدرت پسند نہیں کرتی۔انسان جب انسان سے اکتا جاتا ہے تو دو باتیں ہوتی ہیں یا تو وہ خود اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہے یا خود اپنے آپ سے گم ہو جاتا ہے۔یہ مایوسی ہے اور مایوسی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ایسی صورتحال میں قدرت اپنا ایک خود کار بحالی نظام متحرک کرتی ہے۔میرا

مانتا ہے کہ انسان جب بھی کہیں بھٹکنے لگتا ہے یا مایوس ہونے لگتا ہے تو قدرت ایک خودکار نظام کے تحت حتی الامکان کوشش کرتی ہے کہ اسے بھٹکنے سے بچایا جا سکے۔۔قدرت کے ذرائع کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔شمال سے آتی گرم موسم کی شدت کو کم کرتی ٹھنڈی ہوا، تاریکی کو چیر کر دنیا کا چہرہ روشن کرنے والی سورج کی پہلی کرن، اپنی خوراک کو ذخیرہ کرنے کے مقصد سے اونچی دیواروں پر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چیونٹی یا پھر ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھل جانے والا انسانی وجود۔۔۔کہنے کو یہ بہت چھوٹی چیزیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ سب آپ کو عہد الست کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ آپ کو احساس دلاتے ہیں کہ ایک اللہ ہے جو ذرے سے لے کر کائنات تک کے سارے نظام کو آپ سے پوچھے اور آپ کو بتائے بنا متحرک رکھتا ہے۔آپ مایوس کس سے ہیں۔۔اس اللہ سے۔۔۔جو کیڑے کو زمین سے، جانوروں کو فضا سے اور مچھلی کو نمی سے زندہ رہنے کا عنصر عطا فرماتا ہے" وہ بولتے بولتے خاموش ہوئے تھے۔سلمان کو پہلی مرتبہ ایک عجیب سا احساس ہوا۔اس کا دل ایک انوکھی سی کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔وہ یہاں کسی مذہبی موضوع پر دیا جانے والا درس سننے تو نہیں آیا تھا۔وہ تو خالصتاً ایک سیاسی سازشی ماحول کی خوشبو سونگھتا اس شخص کے سامنے آ بیٹھا تھا جبکہ وہ کتنے اچھے طریقے سے اسے مایوسی سے نکلنے کے طریقے سکھا رہا تھا۔وہ شخص جو ابھی باقاعدہ مسلمان نہیں تھا لیکن اس کے پاس ہنر تھا وہ کسی بھی شخص کے سامنے اللہ کی وحدانیت بیان کرنے کی انوکھی صلاحیت سے مالا مال ہو چکا تھا۔اسے اس پر رشک آیا۔

"معافی چاہتا ہوں لیکن میرا مقصد آپ کو کوئی روحانی کہانی سنا کر بور کرنا نہیں تھا۔۔میں صرف ان سازشی عناصر سے مکمل طور پر پردہ اٹھا کر آپ کے سامنے ساری حقیقت واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔میں آپ کو بتانا چاہ رہا تھا کہ نور محمد وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ کر یہاں تک آئے ہیں۔۔نور محمد وہ ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔۔۔یہ شخص آپ کے لئے بہت خوش بختی کی علامت ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے آپ بہت سے سازشی عناصر وقت سے پہلے بے نقاب کر سکتے ہیں جو آنے والے سالوں میں "پاکستان" کے لئے مزید نقصان کا باعث ہوں گے۔آپ ہمت کریں، میرا ساتھ دیں تو نقصان سے بچا جا سکتا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔۔۔پاکستان وہ واحد ملک ہے جو دنیا سے اللہ کے نام پر لیا گیا تھا۔اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ اللہ کے نام پر دی گئی تو چھوٹی اٹھنی نہیں ضائع ہوتی تو کوئی ملک کیسے ہو گا۔۔"سلمان کی آنکھیں بھیگنے والی تھیں۔اس نے خود کو سنبھالا۔اب کی بار اسے اپنے آپ پر رشک آیا۔اللہ نے اسے کسی اچھے کام کے لئے چن لیا تھا۔

"ہمیں نور محمد کو تلاش کرنا چاہیے۔۔کافی رات ہو چکی ہے" اس نے عجلت کہا کیونکہ وہ اگر کچھ نا بولتا تو آنسو ٹپکنے کا خدشہ تھا۔بل گرانٹ کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔۔

"مجھے لگتا ہے صبح ہونے والی ہے" وہ بولے تھے، سلمان نے سر ہلایا اور ہلاتا چلا گیا لیکن وہ مسکرا نہیں سکا تھا۔نمی کہیں ابھی بھی آنکھوں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی

"نور محمد کہاں چلا گیا۔۔؟" اس نے سوال کیا تھا

☆ ☆ ☆

"میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ "المہاجرون" کے لئے کام کر رہا ہے۔۔وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے، اپنی شخصیت کو چھپا رہا ہے۔۔۔وہ

جھوٹا ہے" یہ سلمان حیدر تھا۔ نور محمد نے حیرانی سے اس جملے کو ہضم کیا تھا۔ وہ سونے کی غرض سے کمرے میں چلا گیا تھا لیکن نا جانے کیوں نیند نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ سے ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے اپنے کمرے سے نکل کر آیا تھا لیکن وہاں جو گفتگو ہو رہی تھی اس نے اسے باہر ہی رک جانے کے لئے مجبور کیا تھا۔ اسے جلد ہی سمجھ میں آگیا تھا کہ گفتگو کا مرکز وہ ہی ہے۔

"وہ میرے بارے میں اس طرح بات کیوں کر رہا ہے" اس نے سوچا تھا۔ اسے پہلے حیرانی اور پھر دلی دکھ ہوا کہ اس کا دوست اس کے بارے میں ایسی باتیں کر رہا ہے لیکن اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ لوٹن میں رہتے ہوئے ایک پریکٹیکل مسلم ہونے کا مطلب ہی "ریڈیکل مسلم" تھا اور ریڈیکل مسلم کو سب ہی جہادی سمجھتے تھے۔ یہ وہ اصطلاح تھی جو انگریز ان نمازیوں کے لئے استعمال ہو رہی تھی جو باقاعدگی سے مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لئے آتے تھے۔ سفید فام نوعمر لڑکے نمازیوں کو چڑانے کے لئے یہ لفظ کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ برداشت کرنے کے باوجود نور محمد کے پورے جسم میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

"آپ احمد معروف نہیں ہیں۔۔۔ آپ کنورٹ نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کا نام بل گرانٹ ہے۔" یہ سلمان حیدر کی آواز تھی۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"آپ اپنے ناول کے لئے مواد حاصل کرنے کے لئے اس شخص کو استعمال کر رہے ہیں۔۔۔ آپ نور محمد کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں"

نور محمد کے تلووں میں یکدم جلن شروع ہوئی تھی۔ اس نے اپنی گردن کو گھما کر اپنی بے چینی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دوخیر خواہ نظر آنے والے دوست اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ اس کے لئے اندر کمرے سے سنائی دینے والا ہر جملہ صرف جملہ نہیں تھا بلکہ انکشاف تھا اس کی طبیعت کا طیش بڑھنے لگا۔ اسے خفا ہونے کا پورا حق تھا اس کے وجود پر حیرت، پریشانی، خفگی اور بے دلی ایک ساتھ نازل ہوئی۔

"میں احمد معروف نہیں ہوں۔۔۔ میں بل گرانٹ ہوں۔۔۔" یہ احمد معروف کی آواز تھی نور محمد دروازے سے مزید دور ہوا۔ اس کا منہ جیسے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ احمد معروف کی اس بات نے اس کا سارا حوصلہ اور ہمت سلب کر لی تھی۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنے کمرے میں واپس آگیا تھا۔ یہ کمرہ احمد معروف اور وہ دونوں مل کر شیئر کرتے تھے۔ وہ کچھ دیر بستر کے سامنے ادھر ادھر ٹہل کر اپنی انگلیاں چٹخاتا رہا پھر اس نے بنا سوچے سمجھے احمد معروف کی الماری کھول کر وہ بیگ دیکھا تھا جسے احمد معروف اپنی جان سے عزیز رکھتے تھے۔ نور محمد کو یقین تھا کہ اسی بیگ میں اس ناول کا مسودہ ہے جس کا عنوان "عہد الست" ہے۔ یہی ناول فی الحال اسے فساد کی جڑ لگ رہا تھا۔ اسی ناول کی وجہ سے احمد معروف اسے دھوکہ دے رہے تھے۔ اس نے وہ بیگ باہر نکال لیا تھا۔ سلمان حیدر کی باتیں سن کر اسے دکھ ہوا تھا لیکن احمد معروف کے اس اعتراف نے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا ہے اسے غصہ دلا دیا تھا۔ اس کا ہر عمل اضطراری تھا جسے سوچے سمجھے بنا وہ کرتا جا رہا تھا۔

"آپ مسلمان نہیں ہیں احمد معروف۔۔۔ آپ اتنا بڑا دھوکہ کسی کو کیسے دے سکتے ہیں۔۔۔ آپ کسی کے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتے ہیں" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آپ صرف شہرت حاصل کرنے کے لئے اپنے ناول کی خاطر مواد جمع کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے آپ میرے ساتھ گھل مل کر رہ رہے تھے۔ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ آپ پہلے دن سے مجھے استعمال کر رہے ہیں۔ آپ میرے ساتھ مخلص نہیں تھے۔ میں نے آپ کو بھی پہچاننے میں غلطی کر دی۔۔۔ آپ کو میری ذات سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔۔۔ کبھی نہیں تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ آپ کو الزام کیا دینا۔۔۔ اس دنیا نے صدا میرے ساتھ یہی کیا

ہے۔اس دنیا میں مجھے ہمیشہ سب ہی لوگ خود غرض ملے ہیں۔سب مجھے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے آئے ہیں۔اسی لئے میں اس دنیا سے منہ موڑنا چاہتا تھا کیونکہ یہاں سب جھوٹا پیار اور اخلاص جتا کر دھوکہ دیتے ہیں۔۔اس دنیا میں سب میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتے ہیں۔۔میں تو کسی کا برا نہیں چاہتا پھر احمد معروف آپ نے بھی میرے ساتھ دھوکہ کیوں کیا۔۔میں تو تو دنیا سے کنارہ کر کے خوش تھا۔میں تو کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔میں تو بس آخرت کے لئے عبادتیں کر کر کے جنت اکٹھی کر رہا تھا اور دنیا میں رہنے والوں کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔میں نے آخر ایسا کیا کر دیا ہے کہ یہ دنیا میری سادگی کا مذاق اڑا کر مجھے "صفر" ثابت کرنے پر تلی ہے۔یہ سب لوگ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے" وہ غصے سے ابل رہا تھا۔اس کے منہ سے الفاظ بھی ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔دماغ کی تاریں تن گئی تھیں۔خون میں جیسے آگ سی لگی تھی۔ایک دفعہ پھر نا چاہتے ہوئے بھی اس کو اس کیفیت کا سامنا تھا جسے دنیا" پینک اٹیک یا دورہ" کہتی تھی۔وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بنا ہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔موسم خوشگوار تھا۔ہوا میں نرمی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جیسے خون ابل رہا تھا۔یہ احمد معروف کا بیگ نہیں تھا جو اس کی بغل میں دبا تھا۔۔۔یہ وہی نوٹس تھے جو اس نے ایک دفعہ اپنے ابو کے منہ پر دے مارے تھے۔یہ وہ کتابیں تھیں جو بڑھائی کا مشورہ دیتے پر وہ اپنی امی کی گود میں اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتا تھا۔یہ اس کے رزلٹ کارڈز تھے جو اس کے ابو کے لئے ہمیشہ اسے ڈانٹنے کا جواز بنتے آئے تھے۔یہ بیگ دراصل اس کا ماضی تھا جو اسے احساس دلاتا تھا کہ وہ بھی کسی کا دل جیتنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔لوگ اسے اپنی خوشی کے لئے اپنی ذہنی آسودگی کے لئے ہمیشہ استعمال کریں گے۔۔۔یہ اس کی نا آسودہ خواہشیں تھیں، یہ اس کے خواب تھے، عزائم تھے۔یہ اس کی توقعات تھیں جو اس نے اپنے ارد گرد رہنے والوں کے ساتھ وابستہ کی تھیں اور جن کی بناء پر اسے ہمیشہ دکھ ملے تھے۔اس نے مزید مضبوطی سے اس بیگ کو بغل میں دبایا۔یہ اسے اس سینڈ بیگ کی طرح لگ رہا تھا جس پر کھلاڑی مکے مار مار کر کثرت کرتے ہیں اور اپنے ہیجان کو بڑھاتے ہیں۔

"میں ہی کیوں۔۔۔میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔کیا اتنا گیا گزرا ہوں میں۔۔کیا میں پاؤں میں پہنے جانے والی چپل ہوں۔۔۔کیا میں کچرا جمع کرنے والا کچرا دان ہوں" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"ہے۔۔۔کدھر جا رہے ہو۔۔۔" اسے کسی نے عقب سے تالی دے کر پکارا تھا۔اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا کہ وہ کسی کی طرف دیکھے اور دیکھے بنا بھی وہ جانتا تھا یہ سفید فام نوعمر اوباش لڑکے تھے جو اس علاقے میں آنے جانے والوں پر آوازیں کسنے کے عادی تھے۔وہ بیئر کے ٹن لے کر ایسے ہی بیٹھے رہتے تھے۔وہ ان کی جانب توجہ کئے بنا آگے بڑھنے لگا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔دو منٹ بات تو سن لو رک کر" اسے پھر پکارا گیا۔اب کی بار کسی نے خالی بیئر کا ٹن کھینچ کر مارا تھا اور چار پانچ لڑکے اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"اسے مت روکو۔۔یہ اللہ سے ملنے کے لئے جا رہا ہے" ایک لڑکے نے مضحکہ آمیز انداز میں کہا تھا۔وہ نمازیوں کو چڑانے کے لئے مسلمانوں کے بارے میں اسی حقارت بھرے انداز میں بات کیا کرتے تھے۔نو محمد نے کھا جانے والی نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

"تمہیں اللہ سے ملنے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔۔پہلے ہم سے تو مل لو۔۔۔اللہ سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔۔آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔تمہیں

جنت دکھاتے ہیں" وہ اس کے گرد دائرہ تنگ کر رہے تھے۔ایک لڑکے نے بیئر کے گھونٹ منہ میں بھر کر اسکی جانب اچھالے تھے۔نور محمد کی ذہنی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی۔اس کا ارادہ ان اوباش لڑکوں سے جھگڑنے کا قطعاً نہیں تھا۔یہاں ایسے بہت سے غیر مسلم لڑکے تھے جو نشے میں دھت آنے جانے والے مسلمانوں کا اسی طرح مذاق اڑاتے تھے۔نور محمد کو بھی ایسے اوباش لڑکوں کو درگزر کرنے کی عادت تھی لیکن فی الوقت وہ کسی کو بھی معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔اس نے ہاتھ میں پکڑا بیگ ایک لڑکے کے سر پہ مارا تھا تا کہ اسے ہٹا کر گزرنے کے لئے راستہ بنا سکے۔اس لڑکے نے ایک طرف جھک کر اپنے آپ کو بچایا اور بیگ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔دوسرے لڑکے نے عقب سے اس کے سر پہ تھپڑ مارا تھا۔

"تم کتیا کی اولاد۔۔۔تمہاری اتنی ہمت۔۔۔" اسے ایک اور مکا رسید کیا گیا۔وہ تھکی سے وجود کا مالک تھا۔اس سے اتنی ضرب بھی برداشت نہیں ہوئی تھی۔وہ نیچے گر گیا۔

"میرا بیگ واپس کرو۔۔خبردار میرے بیگ کو نقصان پہنچایا تو" وہ چلایا تھا۔

"اس بیگ میں کیا خاص بات ہے۔۔کہیں اس میں تمہارا برقع تو نہیں ہے۔۔لیکن وہ تو تمہاری عورتیں پہنتی ہیں۔۔تو پھر اس بیگ میں تمہارے لئے کیا ہے" جس لڑکے نے اس سے بیگ چھینا تھا وہ پھبتی کسنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔اپنی بات مکمل کر کے اس نے وہ بیگ کھولنا شروع کر دیا تھا۔نور محمد کا خیال تھا وہ بیگ مقفل ہوگا یا اس کا کوئی سیکورٹی کوڈ ہوگا اور وہ لڑکا اسے نہیں کھول پائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔وہ بیگ بہت آسانی سے کھل گیا تھا۔نور محمد کے اعصاب ابھی بھی قابو میں نہیں تھے لیکن اسے یہ احساس ضرور تھا کہ یہ بیگ احمد معروف کا تھا اور وہ اس بیگ کو غصے میں اس کی اجازت کے بغیر لے تو آیا تھا لیکن اب اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اوہو ہو۔۔اس میں تو کوران (قران) ہے۔۔۔" اسی لڑکے نے سنہری سبزی مائل جلد والی ایک کتاب باہر نکال لی تھی اور وہ بہت بے دردی سے اس کتاب کے اوراق پلٹ رہا تھا۔نور محمد نے بھی اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔وہ واقعی قرانِ کریم تھا۔نور محمد کو بڑا زور کا جھٹکا لگا۔اسے یقین تھا احمد معروف جس بیگ کو اتنا سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے وہ اس کی اپنی کوئی ذاتی چیز ہوگی۔وہ اس کا "عہد الست" ہوگا لیکن وہ قران پاک تھا۔نور محمد بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ان لڑکوں کا کوئی بھروسہ تھا۔وہ غیر مسلم تھے۔وہ نشے میں تھے اور وہ مسلمانوں کی ایذا رسانی کا کوئی موقع چھوڑتے نہیں تھے۔وہ قران پاک کی حرمت سے واقف نہیں تھے اور وہ جانے اس مقدس کتاب کے ساتھ کیا کرتے۔اس نے اس لڑکے کے ہاتھ سے قران پاک چھین لیا تھا۔وہ سب اس کے انداز پہ قہقہے لگانے لگے تھے۔

"تم تو بہت طاقتور ہو۔کیا کھاتے ہو۔۔پورک تو کھاتے نہیں ہو۔۔۔اچھا اچھا۔۔حلال چکن کھاتے ہو نا۔۔یہ طاقت تو حلال چکن سے ہی آ سکتی تھی۔۔" ایک اور لڑکا بولا تھا۔

"دیکھو میری تمہاری کوئی لڑائی نہیں ہے۔۔تم لوگوں نے مجھے مارا ہے لیکن میں کسی کو شکایت نہیں کروں گا۔۔کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔۔۔مجھے جانے دو" وہ ان سب کی طرف باری باری دیکھ کر بولا تھا۔اس کے بدن سے اب پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

"تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو لیکن اس قران کو وہاں پھینک دو" ان میں سے ایک نے فٹ پاتھ پہ پڑے ڈسٹ بن کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا تھا۔نور محمد نے کھا جانے والی نظروں سے اسکی جانب دیکھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔۔۔یہ ہماری مقدس کتاب ہے۔۔۔یہ قرآن پاک ہے۔۔۔لیکن اگر یہ بائبل بھی ہوتی تب بھی میں اسے نہیں پھینکتا۔۔۔میں مسلمان ہوں اور مقدس کتابوں کی حرمت کیا ہوتی ہے یہ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں" اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا اور ان کے درمیان سے جگہ بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کی تھی۔وہ مزید قریب قریب ہو گئے تھے کہ اس کو بھاگنے کے لئے جگہ نا مل سکے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔ہمیں بھی سکھاؤ ذرا کہ کیا حرمت ہوتی ہے مقدس کتابوں کی" وہ مزید ڈھیٹ ہو رہے تھے۔ایک لڑکے نے پھر اس کے ہاتھ سے قرآن پاک چھیننا چاہا تھا۔نور محمد نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے مزید سینے کے ساتھ لگا لیا تھا۔جس لڑکے کا ہاتھ اس نے جھٹکا تھا اس نے اسے ایک مکا رسید کیا تھا۔

"بہت اچھی باتیں کرتے ہو تم۔۔۔ہم بہت متاثر ہو گئے۔۔۔ہم بھی اس کتاب کو پڑھنا چاہتے ہیں۔۔۔اب یہ ہمیں دے دو" ایک لڑکا جو ان کا لیڈر لگتا تھا بالکل سامنے آ کر بولا تھا۔اس کے چہرے کے تاثرات بے حد مضحکہ خیز تھے۔نور محمد کچھ نہیں بولا تھا لیکن اس نے بازوؤں میں دبا قرآن پاک سینے میں مزید بھینچ لیا تھا۔

"یہ چھپکلی ایسے نہیں مانے گی" وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔وہ سب ہنستے ہوئے اس کے گرد دائرے میں چلنے لگے تھے۔ایک لڑکا نور محمد کے اوپر بیئر انڈیلنے لگا تھا۔اسے بے پناہ کراہیت محسوس ہوئی۔وہ تو کبھی راستے میں آ جانے والے بیئر کے خالی ٹن کو پاؤں سے ٹھوکر بھی نہیں مارتا تھا کہ اس کے پاؤں ناپاک نا ہو جائیں۔

"مجھے جانے دو" اس نے ایک دفعہ پھر درخواست کی تھی۔وہ سب ہنسنے لگے۔ان میں سے دو نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ان کے لئے یہ تفریح تھی،مذاق تھا،لطف لینے کا ذریعہ تھا۔

"پہلے یہ کتاب دے دو۔۔۔دوسری بات اس کے بعد کریں گے" وہ یک زبان ہو کر بولے تھے۔

"ہم ہاریں گے نہیں،،ہماری رگوں میں جیتنے والی قوموں کا خون ہے۔۔۔ہم قدرت کی طرف سے فاتح ٹھہرائے گئے ہیں۔۔۔ہم جھکنا نہیں جانتے،،،دشمن ہمارے قدم چومنے کی تیاری کر لے۔۔۔ہم فاتح ہیں اور ہم فاتح ہی رہیں گے" وہ کسی پرانے جنگی اطالوی نغمے کو گانے لگے تھے۔ان میں سے ہر ایک بیئر کا گھونٹ بھرتا تھا اور پھر اسے نور محمد کی طرف کلی کرنے والے انداز میں اچھال دیتا تھا۔کچھ دیر یہی سلسلہ چلتا رہا۔نور محمد ان کے حلقے میں قرآن کریم کو سینے سے لگائے ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔اس کام سے تنگ آ کر ان لڑکوں نے اس کو مارنا شروع کر دیا تھا۔یہ ایک عجیب سا کھیل تھا۔وہ نا جانے کیا کرنا چاہ رہے تھے۔وہی جنگی نغمہ پڑھتے پڑھتے ان سب نے مل کر نور محمد کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا کوئی ناک کے نیچے مارتا تھا تو کوئی کان کھینچنے لگتا تھا۔

"مجھے جانے دو" نور محمد چلایا تھا۔انہوں نے اسے دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر گرا دیا تھا اور اسے لاتیں مکے گھونسے مارنے لگے تھے۔اس سارے تشدد کے باوجود نور محمد نے قرآن کریم نہیں چھوڑا تھا بلکہ اسے مزید سختی سے دبوچ لیا تھا۔اس کے بدن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور خون بہنے لگا تھا۔

"تم یہ قران (قرآن) ہمیں دے دو تو ہم تمہیں جانے دے سکتے ہیں۔" ایک لڑکا باقی سب لڑکوں کو روک کر اس سے مخاطب تھا۔ نور محمد کی ساری ہمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

"تم قرآن پاک کا کرو گے کیا۔ تم اسے پڑھنا نہیں جانتے۔ تمہیں اس کا کچھ نہیں پتا۔ مجھے جانے دو" وہ بلبلایا تھا۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون ابل ابل کر اس کی قمیض کو تر کر رہا تھا۔

"ہمیں اسے پڑھنا بھی نہیں ہے۔ ہم تو اس کے پنے جلا جلا کر سگریٹ پئیں گے۔ اس کے جہاز بنا کر ہوا میں اڑائیں گے۔ اس کی کشتیاں بنا کر سوئمنگ پول میں چلائیں گے" وہی لڑکا جو ان کا لیڈر لگتا تھا کہہ رہا تھا۔ نور محمد نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا

"یہ گناہ ہے۔ تم کیوں جہنم کمانا چاہتے ہو۔ ایسے مت کرو" وہ ہونٹوں سے رستا خون صاف کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بات پر ان کے لیڈر کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

"تم اپنی جنت کی فکر کرو۔ تم بے عقل قوم کے بے عقل انسان تمہیں کیا خبر کہ جنت اور جہنم ہوتی کیا ہے۔ تم جو ایک تنگ نظر قوم ہو۔ تم جو دہشت گرد ہو۔ تم جاؤ گے اپنے ریڈیکل نظریات کے ساتھ جہنم میں اور تمہاری یہ کتاب بھی اور تمہارے نبی بھی۔ تم لوگ ہو جو انسانیت کے ماتھے کا گہرا بد نما زخم ہو" وہ چلا کر بولا تھا۔ اس نے مزید کچھ توہین آمیز جملے اسلام اور نبی آخر الزماںؐ سے متعلق مزید کہے۔ نور محمد سے صبر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس لڑکے کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ ایک لمحے میں وہ سب اس پر پل پڑے تھے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ٹھڈے مار رہے تھے اور اس کے سینے سے لگا قرآن کریم چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ نور محمد گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گیا تھا اور اس کی گود میں قرآن دبا ہوا تھا۔ اس کی پشت لہولہان ہو چلی تھی لیکن پھر بھی اس نے قرآن پاک کو زمین سے لگنے نہیں دیا تھا۔ اسی دوران پولیس موبائل کا سائرن سنائی دینے لگا تھا۔ ان لڑکوں نے رک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی شاید کسی راہ گیر نے کاپس کو کال کر دی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ نور محمد کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ اس نے دیکھا وہ لڑکے جیبوں سے کچھ نکال رہے تھے۔ انہوں نے اس پر ایک محلول انڈیلنا شروع کیا تھا۔ وہ جانے مزید اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ وہ شاید پیٹرول اس پر انڈیل کر اسے آگ لگا دینا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان اوباش لڑکوں نے ایک نمازی کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا تب مسلمانوں کی طرف سے کافی ہنگامہ کیا گیا تھا۔ پولیس موبائل کا ہارن اب قریب سے سنائی دینے لگا تھا۔ نور محمد نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔ مدد قریب ہی تھی۔

اس نے قرآن کریم کو مزید ہمت مجتمع کر کے اپنے ساتھ چپکایا تھا اور ایسا کرنے سے اس کی پشت میں جیسے انگارے جلنے بجھنے لگے تھے۔ تیز آگ کے جیسی چیرتی ہوئی جلن اس کے وجود میں اٹھی تھی۔ یہ وہ تکلیف نہیں تھی جو ان لڑکوں کے تشدد کی وجہ سے وہ محسوس کر رہا تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔ اس نے گہری گہری سانسیں بھریں۔ اسے توانائی کی ضرورت تھی۔ پشت پر لگنے والی آگ دل تک پہنچ رہی تھی۔ اسے اب جا کر سمجھ میں آئی تھی کہ اس پر فائر کیا گیا تھا۔ اس کی سانس یہ سوچ کر ہی رکنے لگی تھی۔ وہ قرآن کو سینے سے لگائے لگائے سڑک پر لڑھک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ اس کی سماعت متاثر ہونے لگی۔ چیخ و پکار تو سنائی دے رہی تھی لیکن کوئی مفہوم واضح نہیں ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی

ہے بھی یا نہیں۔۔ تکلیف اتنی بڑھی تھی کہ اس کے منہ سے ایک زوردار ڈکراتی ہوئی کراہ نکلی تھی۔۔ دنیا گول تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے گول گول ہی گھوم رہی تھی۔ وہ بے پناہ درد محسوس کر رہا تھا۔

"امی۔۔۔" اس نے پکارا تھا۔ اسے اپنی آواز ہی اجنبی لگی۔ اس نے۔ بہت عرصہ بعد اپنی ماں کو اتنی شدت سے پکارا تھا۔ ماں نام تھا ایک حوصلے کا، ایک ہمت کا۔۔ اسے دونوں چیزیں درکار تھیں۔ اس نے مزید طاقت کے ساتھ سانس اندر کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور پھر سانس بھی۔۔۔ سانس کھینچنے کی اگلی کوشش میں اس کے حلق سے خوفناک سرسراتی ہوئی آوازیں نکلیں۔ اس کے اعصاب و حواس سب ڈھیر سے رخصت ہونے لگے۔۔۔ ایک قرآن تھا جو سینے پر دھرا رہ گیا تھا۔

"وقت ختم ہوا تھا یا شاید وقت شروع ہی اب ہوا تھا"۔

☆ ☆ ☆

"یہ سب کیوں کر رہے ہیں آپ" صوفی صاحب نے خفگی بھرے لہجے میں نور محمد سے کہا تھا، وہ سر جھکائے اپنی انگلیوں کو دیکھ رہا تھا صوفی صاحب۔ بہت عرصہ بعد اس طرح خود اس سے ملنے آئے تھے۔ نور محمد ان کو دیکھ کر مزید بے چین ہو گیا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ بات ان تک پہنچ جائے گی

"آپ سچائی کو تسلیم کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں۔۔ آپ کوئی گنہگار نہیں ہیں۔۔ آپ بزدل نہیں ہیں۔ آپ تو محسن ہیں۔۔ پھر کیوں اتنا کتراتے ہیں دنیا سے" وہ اب ڈپٹ کر بولے تھے۔

"وہ بھی بہت دور سے آئی ہے۔۔۔ اس کے دل کی حالت کا سوچتا ہوں تو دل دکھتا ہے اور آپ سوچیں کہ اس کی ماں کی کیا حالت ہو گی جو صبح شام "نور محمد" کی تسبیح پڑھتی رہتی ہے۔۔۔ ماؤں کو اتنا نہیں تڑپاتے۔۔۔ آپ کیوں یہ گناہ اپنے سر لیتے ہیں۔۔ کیوں اللہ کی ناراضی مول لیتے ہیں" صوفی صاحب التجائیہ انداز میں بولے تھے۔ وہ کافی خفا لگتے تھے۔ ان کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ وہ بیمار بھی رہنے لگے تھے اور اگر اب وہ خود چل کر نور محمد کو نصیحت کرنے آئے تھے تو یہ اس بات کا مظہر تھا کہ وہ کافی ناخوش ہیں اس سے

"میں اللہ کی ناراضی سے ہی تو ڈرتا ہوں صوفی صاحب۔۔۔ میرے اندر ہمت نہیں ہے۔۔ میں کسی کو کیا جواب دوں۔۔۔ میں نہیں کر سکتا کسی کا سامنا۔۔۔ آپ انہیں خود ہی سب بتا دیں" وہ اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے بولا تھا

"نور محمد 2012 ختم ہونے والا ہے۔۔۔ پانچ سال گزر چکے ہیں اس بات کو۔۔ آپ کے اندر ابھی تک ہمت کیوں نہیں پیدا ہو سکی۔۔۔ آپ کوئی سولہ سال کے بچے ہیں کہ حقائق آپ کو ڈراتے ہیں۔۔ یہ کیسا ایمان ہوا نور محمد کہ آپ سچ کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں، خوفزدہ ہیں" وہ پھر ڈپٹ رہے تھے۔

"خوفزدہ کب ہوں۔۔۔ اور سولہ سال کا بھی کب ہوں۔۔ سولہ سال کا ہوتا تو جذباتی ہو کر سب کہہ دیتا۔۔ اب تو سوچتا ہوں۔۔ ایک ماں میرا گریبان پکڑ کر سوال کرے گی تو کس منہ سے جواب دوں گا" اس کی آواز پر ندامت کا غلبہ تھا۔

"آپ یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے ہیں اور تب ہی آپ کو ایسے خواب نظر آتے ہیں کہ ایک ماں آپ سے اپنی اولاد کے متعلق جواب طلبی کرتی رہتی ہے۔۔۔ ایک بار سامنے آ جائیں۔۔۔ حقائق کو مزید مت چھپائیں۔۔ آپ کو بہت سکون ملے گا" وہ زچ ہو کر بولے تھے۔ نور محمد ان سے اکثر

تذکرہ کرتا تھا کہ اسے ایک ہی خواب مسلسل آتا ہے اور صوفی صاحب پڑھنے کے لئے اسے وظائف بتاتے رہتے تھے۔

"میں سلمان حیدر سے بات کر چکا ہوں۔۔۔وہ سارے حقائق دنیا کو بتانے کی تیاری کر رہے ہیں اس نے روٹھے ہو کر کہا تھا

"وہ سلمان حیدر ہیں۔۔آپ نور محمد ہیں" وہ دونوں ناموں پر زور دے کر بولے۔

"میں نور محمد نہیں ہوں" اس نے جیسے ہتھیار ڈالے تھے۔صوفی صاحب نے گہری سانس بھری۔

"بس بات ایک بار اس بچی کے سامنے آ کر کہہ دیجئے۔۔۔وہ بہت پریشان ہے۔۔۔اسا حق ہے کہ ہم جو بھی جانتے ہیں اسے اس بارے میں بتایا جائے۔۔میں نہیں جانتا تھا کہ آپ نے اپنے روم میٹ کے ذریعے اسے کیا کہلوایا ہے لیکن اس نے کل مجھے دوسری بار فون کیا تھا وہ سمجھتی ہے کہ اس کا بھائی اس سے ملنا نہیں چاہتا۔۔۔رو رہی تھی کہ میں نور محمد کی منت کروں کہ ایک بار اپنی ماں سے مل لے۔۔۔میں چپ کا چپ رہ گیا۔۔کیا جواب دیتا اسے۔۔۔ماں بہنیں روتی ہوئی اچھی لگتی ہیں کیا" انہوں نے کہا پھر آواز کو مزید نرم کر کے بولے۔

"مل لیجئے اس سے ایک بار۔۔ماں بہنیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔۔۔انہیں راضی کرنے سے رب راضی ہوتا ہے نور محمد۔۔۔اور رب راضی ہو تو بندہ راضی ہو جاتا ہے۔۔۔پانچ سالوں سے آپ کو بے سکون دیکھ رہا ہوں۔۔۔آپ کو بھی سکون کی ضرورت ہے۔۔۔نکال دیجئے اپنے من کا غبار۔۔۔دنیا کا سامنا کر لیجئے"

نور محمد نے اپنی نیلی آنکھوں اور عمر رسیدہ سفید چہرے کے ساتھ ان کی جانب دیکھا تھا

"دنیا" وہ بڑبڑایا تھا

☆ ☆ ☆

"میں نور محمد ہوں" اس شخص نے دوہرایا تھا۔شہروز نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں سکوڑ کر عمر کی جانب دیکھا تھا اور عمر اسی انداز میں امائمہ کی جانب دیکھ رہا تھا ان دونوں نے تو نور محمد کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ایک آدھ تصویر جو امائمہ کے پاس اپنے بھائی کی شناخت کے لئے موجود تھی وہ بھی اس قدر پرانی تھی کہ اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو پہچاننا آسان نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ تینوں کسی تصدیق کے بغیر یہ کہہ سکتے تھے کہ ان کے سامنے بیٹھا شخص نور محمد تو ہو سکتا تھا لیکن یہ وہ نور محمد نہیں تھا جو امائمہ کا بھائی تھا اور جس کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے۔

"آپ نور محمد نہیں ہیں" امائمہ کے حلق سے آواز بہت وقت کے بعد نکلی تھی۔وہ اس شخص کو دیکھ کر سب سے زیادہ مایوس ہوئی تھی۔۔۔پچاس پچپن کے لگ بھگ گلابی رنگت والا وہ ادھیڑ عمر والا شخص جس کے چہرے پر ہلکے بھورے تل تھے اور سرمئی اور سنہری کھچڑی داڑھی نے آدھے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔اس کی آنکھیں نیلی تھیں جن میں گہرے راز چھپے محسوس ہوتے تھے۔وہ اس کا بھائی نہیں تھا۔اس نے اپنے بھائی کو بہت سالوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے سامنے بیٹھا شخص بھی اس کا بھائی نہیں تھا۔وہ تو ایک سفید فام تھا۔

"آپ میرے بھائی نہیں ہیں" وہ بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پا کر بولی تھی۔وہ سارا جوش وہ خوشی زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی جس کے زیر اثر وہ ایک بار پھر ایئرفیلڈ سے لوٹن تک آئی تھی۔اس نے عمر کو بھی ضد کر کے یہاں آنے کے لئے تیار کیا تھا اس نے کتنی منتیں کی تھیں صوفی صاحب کی کہ وہ نور

محمد سے اسے ملوا دیں۔اس شخص نے جھکی ہوئی نگاہیں ذرا کی ذرا اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔۔میں آپ کا بھائی نہیں ہوں" اس کی آواز میں بھی تھکن چھپائے نہیں چھپتی تھی۔امائمہ نے الجھ کر عمر کی جانب دیکھا۔وہ خود ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے میں مگن تھا۔

"دیکھیں،،شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔۔ہمیں نور محمد صاحب سے ملنا ہے۔۔وہ پاکستانی ہیں اور یہاں موذن ہیں۔۔صوفی صاحب نے ہمیں ان سے ملنے کے لئے بھیجا ہے" عمر نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔صورتحال بڑی عجیب سی ہو گئی تھی۔وہ ایک ایسے شخص سے ملنے آئے تھے جوان کا رشتہ دار تھا لیکن جو شخص ان سے ملنے کے لئے آیا تھا وہ کوئی اور ہی تھا۔

"میں ہی نور محمد ہوں۔۔۔اور میں ہی یہاں موذن کے فرائض سرانجام دیتا ہوں۔۔میں ہی ہوں جو امامت بھی کرواتا ہوں اور میں ہی ہوں جس سے صوفی صاحب نے آپ لوگوں کو ملنے کے لئے بھیجا ہے" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔وہ نور محمد میرا بھائی تھا۔۔وہ سفید فام نہیں تھا۔۔وہ بھورا دیسی شخص تھا۔۔۔آپ اگر مذاق کر رہے ہیں تو یہ بہت ہی تکلیف دہ مذاق ہے۔۔۔آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی امید لے کر یہاں آئی ہوں۔۔مجھے اپنے بھائی سے ملنا ہے۔۔۔وہ اگر نہیں بھی ملنا چاہتا تو آپ ایک بار میری اس سے فون پر بات کروا دیں۔۔۔میں اسے رضامند کروں گی کہ وہ ایک بار مجھ سے مل لے۔۔۔وہاں پاکستان میں میری ماں اس کے انتظار میں مر جائیگی" امائمہ نے بہت ضبط سے جملہ مکمل کیا تھا لیکن پھر بھی آنکھ سے آنسو کسی آوارہ گرد کی طرح ٹہلتے ہوئے گالوں پر پھسلنے لگے تھے۔

"میں یہ نہیں کر سکتا۔۔۔میں کیا کوئی بھی اب آپ کو اس سے نہیں ملوا سکتا۔۔۔وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا" اس شخص نے امائمہ کی جانب دیکھنے سے احتراز برتتے ہوئے کہا تھا۔امائمہ کے حلق سے سسکی نکلی۔

"آپ لوگ بار بار کیوں جھوٹ بولتے ہیں ہمارے ساتھ۔۔۔میں نے خود انٹرنیٹ پر چیک کیا ہے کہ لندن کی جامعہ مسجد کے انتظامیہ میں نور محمد نامی ایک شخص موجود ہے" وہ زچ ہو کر بولی تھی۔کمرے کے درمیان میں بیٹھا وہ سفید فام شخص اس سے زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔یہ سب جو بھی ہو رہا تھا اسے سمجھ پانا اتنا آسان نہیں تھا۔

"ہم معافی چاہتے ہیں۔۔لیکن شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔۔۔ہم نور محمد سے ملنے آئے تھے۔۔۔جو۔۔" شہروز نے سنبھل کر اتنا ہی کہا تھا پھر اس نے اپنے ساتھ آئے دونوں افراد کے چہرے دیکھے۔۔مناسب لفظ مل ہی نہیں رہے تھے۔

"آپ کون ہیں" اس نے یکدم اس سے پوچھ لیا تھا شاید کچھ ایسے کہہ سکتی تھی۔اس شخص نے ایک ٹھنڈی گہری سانس بھری پھر امائمہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔اس کی آنکھوں میں بے چینی بڑھ گئی تھی ایسے جیسے بچہ کسی مشکل سبق سے بچنے کے لئے ڈرتے ڈرتے استاد کا چہرہ دیکھتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ استاد اس سے وہ سبق کبھی نا سنے

"میں بل گرانٹ ہوں۔۔۔۔میں نے پانچ سال پہلے جب اسلام قبول کیا تھا تو نور محمد کی عقیدت میں یہ نام اپنایا تھا۔۔جب وہ شہید ہوئے تھے"

اس نے بالآخر اعتراف کرلیا تھا۔ وہ امائمہ کو پانچ سال پہلے اس کے بھائی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی تفصیلات بتانے کے لئے ہمت مجتمع کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

"نور محمد صوفی صاحب کے ساتھ نہیں ہے۔۔۔ وہ روچڈیل بھی نہیں گیا" بل گرانٹ نے ٹیلی فون ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے اسے پریشان کن لہجے میں بتایا تھا۔ وہ رات بھری اس کا انتظار کرنے کے بعد اب تمام لوگوں کو فون کر چکے تھے جن کے ساتھ نور محمد کے ہونے کا امکان تھا مگر اس کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ پریشانی والی بات یہ تھی کہ اردگرد کے علاقوں سے بھی اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ وہ مسجد میں اذان واقامت کے لئے بھی نہیں آیا تھا حالانکہ اس کا ریکارڈ تھا کہ اس نے کبھی مسجد سے رخصت نہیں لی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے رہے تھے لیکن جس طرح سے اسے تلاش کیا جانا چاہیئے تھا ویسے کر بھی نہیں پا رہے تھے۔ نور محمد کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا جسے کوئی ٹافی یا لالی پاپ کا لالچ دے کر ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اپنے ہوش وحواس میں اپنی پوری رضامندی کے ساتھ گیا تھا اور پھر وہ ان سے خفا ہو کر گیا تھا اس لئے بھی اس کے بارے میں کسی سے سوال جواب کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ بل گرانٹ کو سب سے بڑا اندیشہ یہ ستا رہا تھا کہ وہی طاقتیں جو پہلے دن سے اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں اسے حراست میں نا لے لیں یا وہ اپنے آپ کو کوئی نقصان نا پہنچا لے۔

تین دن وہ ایسے ہی اندھیرے میں تیر چلاتے رہے۔۔۔ ادھر اُدھر بار بار فون کرتے رہے اور نور محمد کی غیر حاضری کے متعلق استفسار پر لوگوں کو جھوٹے سچے بہانے بنا کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے۔۔۔ پھر بالآخر صوفی صاحب کے کہنے پر انہوں نے پولیس کمپلینٹ کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ پانچویں دن کی بات تھی۔ وہ گھر سے پولیس اسٹیشن کے لئے نکلنے والے تھے جب نذیر صاحب نے انہیں فون کر کے مسجد آنے کے لئے کہا تھا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ انہیں پتا چلا تھا وہ ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔

"پولیس کو ایک پرانی سنسان گھر کے گیراج سے مسخ شدہ لاش ملی تھی جس کی فورینزک رپورٹ اور جامہ تلاشی سے پتا چلا تھا کہ وہ مسلمان تھا۔ اسی لئے دو پولیس اہلکار لندن کی جامعہ مسجد میں پوچھ گچھ کے لئے آئے تھے۔ ان کے پاس ایک قرآن پاک بھی تھا جس پر خون کے دھبے تھے۔ یہ قرآن پاک مسجد کی پراپرٹی نہیں تھا سو کوئی بھی اسے فوراً شناخت نا کرسکا تھا۔ یہ صرف بل گرانٹ جانتے تھے کہ یہ قرآن پاک ان کا تھا اور نور محمد کے پاس تھا۔ نور محمد چونکہ بل گرانٹ عرف احمد معروف کا روم میٹ تھا سو انہیں پولیس نے اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا تھا۔ پولیس اسٹیشن جا کر انہیں ایک جوڑا سلیپرز اور وہ لباس دیکھنے کا موقع ملا تھا جو پولیس کو ملنے والی لاش کے بدن پر تھا۔ ان کے بدترین اندازوں کی تصدیق ہوئی تھی۔ وہ سب چیزیں نور محمد کی ہی تھیں۔ ان کے لاکھ چاہنے کے باوجود، ہر ممکنہ کوشش کے باوجود اور ہر مناجات کے باوجود نور محمد ایک بدترین انجام سے دوچار ہو چکا تھا۔ پولیس نے لاش کو سرد خانے سے ہی دفنا دیا تھا۔ بل گرانٹ کے لئے نور محمد کی موت کا دکھ ان کی اہلیہ کے دکھ سے بھی زیادہ بڑا اور مہلک ثابت ہوا تھا۔ وہ بالکل گم صم ہو گئے تھے۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا" انہوں نے خشک آنکھوں سے نور محمد کی چیزیں دیکھتے ہوئے نجانے کتنی بار یہ جملہ بولا تھا۔ پولیس معاملے کی

تفتیش کر رہی تھی لیکن تا حال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ نور محمد کے انتقال سے دو لوگوں پر دو مختلف اثر ہوئے۔ سلمان کو اس حادثے نے مزید پر جوش کر دیا۔ اسے نور محمد سے ہمدردی تو تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ ہمدردی اسے سر آفاق سے تھی اور پھر جو نقشہ بل گرانٹ نے کھینچا تھا اور جو سازش انہوں نے بے نقاب کی تھی اس کے سد باب کے لئے وہ اپنے اندر نیا جوش محسوس کرتا تھا جبکہ احمد معروف کے حوصلے بالکل سلب ہو گئے تھے۔ وہ نور محمد کی موت کا ذمہ دار خود کو سمجھتے تھے اور انہیں اس قدر گہرا صدمہ ہوا تھا کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ اللہ نے ان کی معافی کو قبول نہیں کیا تب ہی ان کی نور محمد کے لئے کی جانے والی ہر پُر خلوص کوشش ناکام ٹھہری تھی۔ وہ اسے دنیا کی طرف راغب تو کر پائے لیکن اسے اپنی ماں سے نہیں ملوا پائے تھے جبکہ آخری ایام میں وہ اپنی ماں سے ملنے کے لئے بہت پر جوش تھا اور یہ بات بل گرانٹ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کا صدمہ اور نقصان بہت بڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ واحد ہے" انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں وہی جملہ دہرایا تھا جو صوفی صاحب نے ان سے دہرانے کے لئے کہا تھا۔ وہ کلمہ شہادت پڑھ رہے تھے۔ وہ گواہی دے رہے تھے۔ وہ باقاعدہ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے تھے۔ ان کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک کر گود میں دھرے ہاتھوں کو گیلا کرنے لگے۔ یہ لمحہ جاوداں تھا۔ یہ لمحہ ضوفشاں تھا۔ وہ امتی ہونے جا رہے تھے۔ وہ قیمتی ہونے جا رہے تھے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو دنیا میں آتے ہی امتی ہوتے ہیں اور بیش قیمت ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ "دنیا" میں آنے کے بعد امتی ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے۔ بل گرانٹ بیش قیمت ہونے جا رہے تھے۔ ان کا درجہ بڑھ گیا تھا تو آنسوؤں نا آنکھوں کا گیلا کرتے۔ اللہ نے انہیں پرکھ کر اپنے لئے الگ کر لیا تھا۔ انہیں امتی نا ہوتے ہوئے بالا آخر امتی بنا لیا گیا تھا

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ واحد ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے اور محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں" انہوں نے دوبارہ سے گلوگیر لہجے میں پڑھنا شروع کیا تھا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک عجیب سا رونا تھا جو خود بخود بہہ رہا تھا۔ غموں کے بادل نہیں تھے مگر برسات ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھے انہیں چن لیا گیا تھا۔ صوفی صاحب نے بھیگی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا تھا

مبروک برادر مبروک۔۔۔ خوش آمدید"

سلمان حیدر ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ اس کا دل بھی لرز رہا تھا۔ اللہ نے اسے کسی کی "الوہی محبت" کا اقرار سننے کا موقع دیا تھا۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا۔ اس نے بھی انہیں گلے سے لگا کر مبارک دی

"آپ کا نام آج سے نور محمد ہے۔۔ میری دعا ہے کہ آپ کی خوش بختی کا نیا سفر ہم سب کے لئے خوش بختی کا امین ہو۔۔۔ آمین ثم آمین"

"میرا نام آج سے نور محمد ہے" انہوں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹوں کو پھیلاتے ہوئے سر جھکا کر تصدیق کی تھی

☆ ☆ ☆

"میں ابھی "عہد الست" کی اشاعت کے لئے وقت اور حالات کو مناسب نہیں سمجھتا۔۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں اسے نامکمل چھوڑ دوں گا لیکن میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں کہ مجھ جیسے گنہگار کو اپنی زندگی کے یہ حصے پبلک کے سامنے لانے بھی چاہئیں یا نہیں۔۔۔ میری زندگی میں ایسا کچھ نہیں

ہے جو میں کسی کو بتا سکوں۔۔نور محمد دنیا سے اس طرح نا جاتے تو میں خوشی خوشی سب کچھ دنیا کے سامنے لاتا۔۔مجھے اپنے اس واحد کام پر فخر ہوتا۔۔لیکن اب میں کچھ دیر انتظار کرنا چاہتا ہوں۔۔میں اپنے آپ کو وقت دینا چاہتا ہوں۔۔لیکن۔۔۔۔“

انہوں نے جس روز اسلام قبول اسی روز شام کو اس سے معذرت کی تھی۔سلمان خاموشی سے ان کو بات مکمل کرنے دینا چاہتا تھا۔اس نے پہلے ان کی بات کو جذباتیت میں اہمیت نا دے کر کوئی نفع حاصل نہیں کیا تھا سو وہ چاہتا تھا کہ وہ انہیں بات مکمل کرنے کا موقع دے۔

”میں آپ کے ساتھ معاونت کے لئے تیار ہوں،آپ جو بھی چاہیں وہ مواد میں آپ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔۔ہر وہ ثبوت،ریکارڈ یا کوئی اور مستند معلومات آپ کو چاہیئں ہوں گی۔وہ میں دوں گا۔میں آپ کی مدد کرنے کا پابند ہوں لیکن میں اپنے ناول کو ابھی کچھ عرصہ روک کر رکھوں گا۔۔یہ میرا حق ہے۔۔لیکن آپ سچ کا ساتھ دینے کے لئے،اپنے ملک و قوم کے مفاد کے لئے ہر معاملے میں آزاد ہیں۔۔آپ کو بھی پورا حق ہے کہ وہ باتیں جو میں نے آپ سے شیئر کی ہیں۔۔۔وہ من وعن یا جس طرح آپ چاہیں،جہاں چاہیں شائع کروا کر یا نشر کر کے منظر عام پر لا سکتے ہیں لیکن میں آپ سے ایک فیور چاہوں گا کہ آپ میرا یا مرحوم نور محمد کا نام کسی کے سامنے نہیں لائیں گے۔۔کم از کم تب تک جب تک میں آپ سے خود نا کہہ دوں“ وہ با اختیار تھے لیکن عاجزی سے التجاء کر رہے تھے۔سلمان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”سر نور محمد! میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔۔۔میں اپنے آپکو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ سے اتنا کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو جب بھی اپنے ناول کے سلسلے میں میری ضرورت پڑے گی۔۔میں آپ کو اپنی سو فیصد توانائی دوں گا۔۔میں ہر طرح سے آپ کی مدد کروں گا۔۔آپ نے مجھے جو بھی حقائق مجھے بتائے ہیں،میں انہیں ضرور دنیا کے سامنے لاؤں گا اور میں اس بات کا مجاز ہوں کہ میں جب تک آپ نہیں چاہیں گے آپ کا نام کسی کو نہیں بتاؤں گا“ اس نے عہد کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”کیا کمال کی کہانی لکھ کر لائے ہو۔۔۔خوب میں کسی بزرگ نے تو آ کر نہیں سنائی تھی“ رضوان اکرم نے ساری بات سن کر استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔سلمان کے دل میں انکی بہت عزت تھی لیکن اس لمحے ان کا تضحیک آمیز انداز اسے برا لگا۔وہ چھ مہینے سے اس رپورٹ کو تیار کر رہا تھا۔اس نے اپنی نیندیں قربان کر کر کے سارے حقائق ایک جگہ جمع کئے تھے۔اس کے بس میں جو کچھ تھا اس نے سب کر ڈالا اور یہاں اسکے محترم استاد اور گرو اسے کا مذاق اڑا رہے تھے۔

سراپا آنکھیں کھول دینے والی حقیقتیں ہیں۔۔میں سن کر دنگ رہ گیا ہوں۔۔کیا کیا نہیں ہو رہا ہماری آنکھوں کے نیچے۔۔ہماری نسلیں تباہ کرنے کی ایسی جامع منصوبہ بندی کی جا رہی ہے کہ ہم نے اگر ابھی کچھ نہیں کیا تو آنے والے سالوں میں کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ نہیں رہے گا ہمارے پاس۔۔میں سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔۔اور آپ میری بات کو سنجیدہ ہی نہیں لے رہے“ وہ اپنی جھلاہٹ چھپا کر بولا تھا۔اس کی خفگی فطری بات تھی۔وہ سمجھتا تھا اسے سراہا جائیگا اسکی تعریف کی جائیگی اور اس کا ساتھ دیا جائیگا لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔رضوان اکرم نا صرف پھبتیاں کس رہے تھے بلکہ اس کی رپورٹ کی سچائی پر بھی مشکوک تھے جبکہ اس کے پاس ایک ایک ثبوت پوری محنت اور دیانتداری کے ساتھ موجود تھا۔وہ چاہتا تھا کہ اس کی یہ رپورٹ رضوان اکرم صاحب اپنے چینل پر بریک کریں اور چونکہ وہ انہی کی مدد سے لندن گیا تھا اس لئے ان کا حق پہلا تھا۔

"کم آن سلمان! جاگو اور کسی ہوش مند انسان کی طرح پیش آؤ۔۔۔اس ملک میں عوام کی فلاح کے لئے اربوں کی گرانٹ آرہی ہے۔۔ ملٹی نیشنل کمپنیز دل کھول کر اس ملک میں انویسٹ کر رہی ہیں۔۔۔لوگ سیاحت کی خاطر یورپ امریکہ سے آرہے ہیں۔۔۔ہمارے لوگوں کی بہبود کے لئے ادارے بن رہے ہیں۔۔۔میڈیا ترقی کر رہا ہے۔۔ کتنے ہی چینلز بن رہے ہیں۔۔۔نئے اسکول کھل رہے ہیں، رفاہی اداروں کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ روزگار کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔۔۔انٹرنیشنل برانڈز کا جم غفیر لگ گیا ہے اس ملک میں۔۔۔اور تم اس رپورٹ کا سیاپا ڈال دو۔۔۔اوہ میرے بھائی کوئی عقل کے ناخن لے۔۔۔عوام سکھ کا سانس لے رہی ہے تو تمہاری جان کیوں جل رہی ہے" وہ بھنائے تھے۔

"سر یہ سب آنکھ کا دھوکہ ہے۔۔۔رات کے آخری پہر کا میٹھا خواب جو نماز کے لئے جاگنے نہیں دیتا۔۔۔یہ ہوا سے بھرا ہوا غبارہ ہے جو پھٹے گا تو بہت زوردار آواز کے ساتھ پھٹے گا۔۔۔میں یہ سب بلا جواز نہیں کہہ رہا۔۔۔میرے پاس ثبوت موجود ہیں۔۔۔ریکارڈ ہے لیکن آپ سننا نہیں چاہتے تو اور بات ہے" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"ثبوت۔۔۔؟ اچھا بتاؤ کون سا پروفیسر ہے وہ جس کا بیٹا ایسا ہیرو بن گیا۔۔۔کہ ایک بوڑھا ادیب اسے اپنے ناول میں "ہیرا" قرار دے رہا ہے۔۔۔کون ہے یہ نور محمد" ان کے سوال نے نہیں انداز نے سلمان کو چونکایا تھا۔۔۔وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں سن رہے تھے۔۔۔وہ متذبذب ہوگیا تھا۔۔۔وہ نور محمد کے متعلق کیا بتاتا کہ جسے وہ ہیرا کہہ رہا تھا وہ ذرہ بن کر ہوا میں خوشبو بکھیر کر تحلیل ہوگیا تھا۔۔۔خوشبو کا کوئی وجود ہوتا تو وہ مٹھی میں بند کر کے رضوان اکرم کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ اس پر یقین کرنے کو تیار تھے نا مدد کرنے کو۔۔۔ان کے سامنے کسی کا نام لینا بھی رسک سے کم نہیں تھا۔

"آپ پھبتیاں کس رہے ہیں سر۔۔۔یہ آپ کی عادت نہیں تھی" اب کی بار اس نے بھی سنجیدہ دو ٹوک انداز اپنایا۔

"ابتداء کس نے کی تھی۔۔۔تم نے میرے بھائی۔۔۔کوئی عقل والی بات کرو۔۔۔تم نے لندن جانے سے پہلے مجھے جو کہانی سنائی تھی اب اس کے بالکل ہی ایک مختلف چیز بنا کر لے آئے ہو۔۔۔اس پر یہ بھی چاہتے ہو کہ میں منہ اور آنکھیں پھاڑ کر اس کہانی کو سنوں۔۔۔میرے بچے یہ اکسویں صدی ہے۔۔۔یہ جو کہانی تم سنا رہے ہو نا۔۔۔الف لیلوی داستان۔۔۔ایک ہیرا تھا جو کسی جن کی قید میں تھا۔۔۔اسے طاغوتی قوتوں نے اپنے کالے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔۔۔مجھے اس پر یقین نہیں تو باقی کروڑوں کی عوام کو کیسے یقین دلاؤں گا" یہ ان کا حتمی انکار تھا۔

"سر! اسی لئے تو آپ کو یقین نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ بے حد حیران کن ہے۔۔۔یہ کمرے میں بیٹھ کر لکھی گئی کہانی ہے نا میز پر بیٹھ کر گھڑی گئی خبر۔۔۔یہ ایک واقعہ ہے سر۔۔۔اور واقعات ہی حیران کن ہوا کرتے ہیں"

"یہ کہانی ہی ہے جو تم خود تخلیق کر کے لے آئے ہو۔۔۔میں اس کو اپنے چینل سے بریک نہیں کروں گا اور تمہیں بھی کہوں گا کہ اس کو اپنے تک محدود رکھو۔۔۔اس ملک کو مزید کہانیوں کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔یہ ملک ترقی کر رہا ہے اسے کرنے دو"

"سر کوئی بڑا نقصان نا ہو جائے" وہ تھک کر بولا۔

"اچھا۔۔۔؟ کیا ہوگا۔۔۔پاکستان تباہ ہو جائے گا۔۔۔ختم ہو جائے گا؟" تحقیر ابھی بھی انداز میں تھی۔۔۔سلمان کو اپنا خون ابلتا ہوا محسوس ہوا۔۔۔پاکستان اس کی دکھتی رگ تھی اور رگ بھی وہ جسے شاہ رگ کہتے ہیں۔۔۔شاہ رگ۔۔۔جہاں اللہ بھی بے حد قریب محسوس ہوتا ہے

"یہ تو کبھی مر کر بھی نہیں ہوگا۔۔ساری دنیا مل کر بھی آجائے تو وہ ہیرے جو اس مٹی میں موجود ہیں۔۔ایسا ہونے نہیں دیں گے۔۔۔۔ہم جیسے پاکستانی رہیں نا رہیں سر۔۔پاکستان رہتی دنیا تک رہے گا۔۔انشاء اللہ۔۔۔اللہ کے نام پر جو بنی دی ہوئی ضائع نہیں ہوتی۔۔ملک کیا ضائع ہوں گے سر۔۔یہ ملک دنیا سے ہم نے اللہ کے نام پر لیا ہے۔۔۔آپ اور میں یہ بات بھول بھی جائیں سے تو اللہ کبھی نہیں بھولے گا" اس نے بل گرانٹ کے الفاظ کو دہرایا تھا۔اس کا عزم مصمم تھا اور ارادے نیک۔۔وہ اس دن کے بعد سے رضوان اکرم سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔اسے پہلے یہ شخص ایک اچھے صحافی کے طور پر کافی پسند تھا لیکن اس رپورٹ جسے اس نے بھی "عہد الست" کا نام دیا تھا کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے سامنے بے نقاب ہوئے،اسے اس رپورٹ کی اشاعت اور براڈ کاسٹنگ کی اجازت کسی نے بھی نہیں دی تھی۔وہ تب بھی مایوس نہیں تھا۔اسے اپنے کام پر اتنا بھروسہ تھا وہ جانتا تھا وہ کامیاب ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔



یہ 2007 کا زمانہ تھا اور تب بھی ایک معروف نجی نیوز چینل فیلڈ میں سکہ جما چکے تھے مگر وہ نیٹ ورک جسے سلمان حیدر منظر عام پر لانا چاہتا تھا وہ بھی کافی مضبوطی سے اپنا شکنجہ کسنے میں مگن تھا۔ اسے جہاں جہاں سے مثبت جواب کی توقع تھی وہاں اسے ٹالا جانے لگا اور ایک دو جگہوں سے مثبت جواب ملا بھی تو ان کی شرائط جو اس رپورٹ کی بلاوجہ ایڈیٹنگ سے متعلق تھیں اسے قبول نہیں تھیں۔ ان دنوں فنڈز اور انویسٹمنٹ کے نام پر ڈالرز اور یوروز کی بارش نے ہر نظام کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ معیشت کو ٹیکے لگا کر پھولا ہوا دکھانے کی کوشش میں اتنی محنت صرف کی جا رہی تھی کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ملک و قوم کا درد تھا وہ جذباتیت کا مارا ہوا قرار دیا جانے لگا اور سلمان تو واقعی پاکستان کے لئے بہت جذباتی تھا۔ اس کے ارد گرد رہنے والے لوگوں کے غیر سنجیدہ رویے اسے بہت تکلیف دینے لگے تھے مگر وہ ڈٹا رہا لیکن اس کے باوجود اس کی کوششیں رنگ لانے میں ناکام رہی تھیں۔

آنے والا ہر دن اس کے لئے ناکامی کا ایک نیا دروا کرتا چلا گیا تھا۔ 2007 کے آخر تک ملکی حالات میں بھی اتار چڑھاؤ آئے۔ ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ہو گیا۔ ڈکٹیٹر شپ نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دئے پھر ایک بڑی لیڈر کا سیاسی قتل ہر خبر پر حاوی ہو گیا۔ خواص اپنی الجھنوں اور عیاشیوں میں گم ہو گئے اور عوام کو اپنی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔ پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے عناصر اتنے سرگرم بھی نہیں تھے جتنے ان ایام میں ہو گئے۔ بل گرانٹ عرف نور محمد کے کہنے کے عین مطابق رفاہی اداروں نے امداد کے نام پر جو چھوٹے چھوٹے بم قوم کے سر پر چھوڑے تھے وہ پھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ ملک میں دھڑا دھڑ غیر ملکی امداد آنے لگی اور پھر جانے بھی لگی۔۔۔ کیا آ رہا تھا، کہاں سے آ رہا تھا۔ اس بارے میں کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ کہاں جا رہا تھا، کون لے جا رہا تھا۔ اس بارے میں کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ملک و سلامتی کا ضامن ہر ادارہ کچھوے کی طرح گردن دبائے، ریت میں دبکا بیٹھا تھا کیونکہ امداد کے نام پر فنڈز آ رہے تھے۔ بدن بھر رہے تھے۔۔۔ روحیں مر رہی تھیں۔ ملک تاریکیوں کے اور قوم ٹیکنالوجی کے نام پر جہت کے گہرے دلدل میں غوطے لگانے لگی۔۔۔ غربت اپنے پنجے تیزی سے گاڑنے لگی۔ امارت ملک کے ایک کونے میں پر پھیلا کر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک امیر شخص کے بیٹے کا سیل فون ایک غریب کے بچے کے پیٹ سے زیادہ بھرا رہنے لگا۔۔۔ لوڈشیڈنگ کا بحران۔۔۔ وکلا تحریک اور سیاسی کشمکش۔۔۔ افراطِ زر۔۔۔ زرعی اجناس کی مصنوعی قلت۔۔۔ جس کا دل جو چاہنے لگا جیسے چاہنے لگا۔۔۔ وہ اپنی من مانی کرنے لگا۔۔۔ جن کے دلوں میں ملک کا درد تھا وہ دعاؤں میں مصروف ہو گئے اور معجزوں کا انتظار کرنے لگے۔۔۔ ان ہی دنوں اس واقعہ سے متعلق دو اہم باتیں ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

"مجھ بدبخت کے لئے کوئی اچھی خبر ہے آپ کے پاس۔۔" سر آفاق نے ملتجی متلاشی متفکر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور اسے لگا کہ بس اب وہ بول نہیں پائے گا۔ وہ اسی لئے دوبارہ ان سے ملنے کے لئے نہیں آیا تھا لیکن وہ جو کچھ رہے تھے اس کا اظہار انہوں نے اپنی آنکھوں میں دھیرے دھیرے چھلکتی بے چینی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بھی کر دیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کراچی رہنے کے بعد ایک بار پھر لاہور آ گیا ہوا تھا اور اب اس کا ارادہ دوبارہ جلدی کراچی جانے کا نہیں تھا کیونکہ ملکی حالات نے ایسی کروٹ بدلی تھی کہ اب رکاوٹیں مزید بڑھ گئی تھیں۔ اس کا خیال تھا

کہ وہ انہیں سب کچھ بتادے گا لیکن اب ان کے لہجے کی آس وناس والی کیفیت اور ان کی آنکھوں سے چھلکتی مدہم سی امید نے ہی اسے ڈگمگا کر رکھ دیا تھا۔ وہ انہیں کیا بتائے گا۔ وہ اس رپورٹ کو تو تیار کرتا رہا تھا۔ اس کے دل میں ملک کے لئے تو درد اختیار رہا تھا۔ حالات اسے بے چین و مضطرب بھی کرتے رہے تھے لیکن نور محمد کی موت کو اس نے عام سا واقعہ سمجھ کر اہمیت دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ یہ اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کے وسیع تر مفاد میں وہ جی جان سے جتا رہا تھا اور اتنے مسائل میں الجھا رہا تھا کہ اس کے دل میں نور محمد کا خیال آیا ہی نہیں تھا اور اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ بھی تھے جو انتظار میں ہیں اور جانے کب سے انتظار میں ہیں۔ سر آفاق نے اسے خود فون کر کے گھر بلوایا تھا۔ وہ خود کافی حیران تھا کہ انہوں نے اسے اتنے مہینوں بعد کیوں بلوایا ہے۔ اس نے سر آفاق کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کے دیکھنے پر مسکرائے اور بولے

"میں جانتا ہوں آپ لندن میرے بیٹے کو تلاش کرنے ہی نہیں گئے تھے۔۔ آپ کی اپنی مصروفیات بھی ہوں گی۔ لیکن دراصل میں نے ایک امید سی باندھ لی تھی کہ شاید۔۔۔ کوئی خیر خبر، کوئی اطلاع۔۔۔ میں اور میری اہلیہ لندن سے عجیب سی انسیت رکھتے ہیں۔۔۔ کوئی شناسا وہاں سے آتے یا جائے ہم خود ہی امید باندھ لیتے ہیں کہ شاید کچھ اچھی خبر سننے کو مل جائے" ؟ وہ رُک رُک کر بات مکمل کر رہے تھے اور سلمان لفظوں کے معاملے میں مزید تنگ پڑنے لگا۔ انہیں کیا بتائے، کیسے بتائے۔۔۔

"میں آپ کے آنے سے پہلے اپنے ملازم کو با آواز بلند کہہ آیا ہوں کہ چائے تیار کر لے۔۔ لندن سے مہمان آرہے ہیں۔۔ اب میری اہلیہ چائے لے کر خود آجائیں گی اور جب تک آپ موجود رہیں گے، وہ یہاں بیٹھی رہیں گی۔۔ چہرے پر سوال ہوں گے اور آنکھوں میں امید و ناامیدی کا عکس۔۔ لیکن بولیں گی کچھ نہیں۔ کہیں گی کچھ نہیں بلکہ پوری سماعتیں آپ کی جانب مبذول کئے اس ایش ٹرے کی طرف دیکھتی رہیں گی۔۔۔ جس میں کوئی سگریٹ بے نارا کھ۔۔ بس امید یں ہیں آس ہے۔۔۔ مجھے ان کی اس خاموش تفتیش سے خوف محسوس ہوتا ہے" وہ کافی الجھے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ سلمان نے محسوس کیا تھا کہ نور محمد کے تفصیلی تذکرے کے بعد سے ان دونوں کے درمیان جھجک کا ان دیکھا پردہ خود بخود ہٹ گیا تھا۔ آفاق صاحب پہلے کی نسبت زیادہ کھل کر اپنے بیٹے کے متعلق بات کرنے کے لئے رضامند نظر آتے تھے۔ اس کی وجہ بھی سلمان نے خود ہی فرض کر لی تھی۔ وہ یقیناً سلمان کے منہ سے کوئی امید افزا خبر سننے کی توقع کر رہے تھے کیونکہ انہیں پہلے سلمان نے اس قدر پر امید نہیں دیکھا تھا۔ سلمان کا دل مزید بوجھل ہوا۔ اس کے پاس انہیں بتانے کے لئے کوئی بات نہیں رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں وہ شاید ہم سے ملنے کا خواہشمند نہیں ہے ورنہ اتنے عرصے میں کبھی ایک بار تو پلٹ کر دیکھتا۔۔۔ لیکن آپ اسے میرا ایک پیغام دے دیجئے کہ بھلے سے مجھ سے نا ملے۔۔ لیکن اپنی ماں سے ایک بار ضرور مل لے۔۔۔ وہ بہت اذیت میں ہے۔۔ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔۔ میں اسے تڑپتا دیکھتا ہوں تو اپنا سر پھوڑ لینے کو دل چاہتا ہے۔۔ اس کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہی تو ہوں۔ میں نے ایک ماں کے صبر کو آزمایا ہے۔۔ مجھ سے اللہ کبھی خوش نہیں ہوگا۔" وہ جیسے بے خودی کے عالم میں اپنے کسی بہت قریبی شناسا شخص سے باتیں کر رہے تھے اور یہ بھروسہ سلمان کو مزید خائف کر رہا تھا۔ اس کے پاس انہیں دینے کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔

"میرا تجزیہ ہے۔۔اولاد کے دکھ ماں کو انسان نہیں رہنے دیتے۔۔کچھ اور بنا دیتے ہیں۔۔دراصل کوئی بھی درد انسان سے بڑا نہیں ہوتا۔۔۔درد کتنا بھی بڑا کیوں نا ہو۔۔انسان جس وقت اسے برداشت کرنے کا حوصلہ کرتا ہے وہ درد خود بخود چھوٹا ہو جاتا ہے اور ماں تو بہت ہمت والی مخلوق بنائی ہے اللہ نے۔۔۔وہ باپ کی نسبت بہت ہمت سے درد برداشت کرتی ہے لیکن اولاد کا بچھڑ جانا درد نہیں دیتا،،،یہ تو نرا کرب ہے۔۔کیونکہ جب ہم درد کو برداشت کرنے کی صفت کھو دیتے ہیں تو وہ کرب بن جاتا ہے اور کرب انسان کے اندر اوندھے منہ جا کر لیٹ جاتا ہے پھر وہ آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔کرب زدہ ماں پھر دعاؤں میں بھی یا اللہ نہیں کہتی بلکہ یا اولاد یا اولاد پکارتی رہتی ہے۔۔میں نے نور محمد کی ماں کو ماں نہیں رہنے دیا" کرب زدہ" کر دیا ہے۔۔" وہ بات کرتے ہوئے رو نہیں رہے تھے۔۔کاش وہ رو لیتے۔سلمان نے سوچا تھا۔اسے کسی بہانے کی تلاش تھی۔وہ اپنی آنکھیں پونچھنا چاہتا تھا۔وہ انہیں نہیں خود کو دلاسہ دینا چاہتا تھا۔

"وہ جہاں ہے ٹھیک ہے۔۔آپ پریشان مت ہوں۔۔اللہ نے اس کے لئے ایک بہتر جگہ کا انتخاب کیا ہے۔۔" اس نے دل ہی دل میں ہمت جمع کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ اس انکشاف کو کیا جا سکے جو اس کے سامنے بیٹھے شخص کے اعصاب پر بہت بھاری پڑ سکتا تھا۔

"مجھے اللہ پر ہی تو بھروسہ ہے۔۔۔ورنہ میں نے تو زندگی میں غلطیوں کے سوا کیا ہی کچھ نہیں۔۔مجھے امید ہے۔۔میرا بیٹا جہاں ہوگا،،بہت حفاظت سے خوش باش اور مطمئن ہوگا۔۔لیکن اچھا ہوتا وہ ایک بار اپنی ماں بہن سے مل لیتا۔۔آپ اسے درخواست کریں کہ ایک بار مل لے۔۔۔وہ اگر چاہے تو اسکی والدہ اور بہن وہاں جا کر بھی اس سے ملاقات کر سکتی ہیں۔۔۔وہ ایک بار حامی تو بھرے" ان کا لہجہ اس قدر گلوگیر تھا کہ سلمان کو اپنی آنکھیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔اس نے اپنے باپ کو بہت چھوٹی عمر میں کھو دیا تھا۔اس نے باپ کی محبت کو ان کی بے چینی کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔اسے نہیں پتا تھا کہ جب باپ کو جوان اولاد کا غم توڑتا ہے تو کیا ہوتا ہے لیکن سر آفاق کے انداز،ان کے الفاظ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔اس کے اندر وہ ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں کیا بتاتا اور کیسے بتاتا۔

"آپ فکر نا کریں۔۔میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔۔آپ پلیز سنبھالیں خود کو۔۔تسلی رکھیں" اس کے منہ سے الفاظ بھی بمشکل ادا ہو پا رہے تھے۔

"میں ناامید نہیں ہوں۔۔۔بخدا نہیں ہوں" سر آفاق اس کے لہجے کے بوجھل پن سے بھی کچھ اخذ نہیں کر پائے تھے۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایک بار اپنی ماں سے مل لے۔۔۔اس کے دل میں بے شک میرے لئے گنجائش نا ہو لیکن اپنی ماں سے اسے بہت لگاؤ ہے ورنہ وہ اتنے سالوں بعد وہ اپنی ماں کو پوسٹ کارڈز نا بھیجتا" وہ مزید پرجوش ہوئے تھے۔سلمان نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"پوسٹ کارڈز۔۔۔کس نے بھیجے۔۔کب۔۔؟" وہ کبھی اتنا پرتجسس نہیں ہوتا تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو ظاہر نہیں کرتا تھا۔سر آفاق نے اس کے سوال پر سامنے پڑی میز پر اخبارات ہٹا کر ایک فولڈر نکالا تھا پھر اس میں سے چند پوسٹ کارڈز برآمد کئے۔سلمان نے ان کے ہاتھ سے وہ وہ کارڈز جھپٹنے تھے۔وہ عام سے پوسٹ کارڈز تھے جو سووینیر شاپس پر عام ملتے ہیں۔وہ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور پھر اس کی حیرت کی انتہا نا رہی

"یہ۔۔یہ تو ایک ہفتہ پہلے ہی موصول ہوئے ہیں" وہ ہکا بکا تھا۔

"جی۔۔۔اسی لئے تو میں نے آپ کو بلوایا ہے۔۔۔ان کارڈز کو دیکھ کر اس کی ماں مزید بے چین ہو گئی ہے۔۔۔مجھ سے اس کی حالت مزید نہیں دیکھی جاتی۔۔۔آپ سے التجاء ہے میری کہ ہمیں اس کے ویئر اباؤٹس کا کچھ تو بتائیں۔۔۔میرے خاندان کو اس جلتے توے سے اٹھانے میں کچھ تو مدد کریں۔۔" وہ رو دھلکے سے ہو رہے تھے۔سلمان تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ان کارڈز پر لوٹن یو کے کی اسٹیمپ تھی۔ان پر واضح انداز نور محمد کا نام لکھا تھا۔سلمان سے اپنی حیرانی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔سر آفاق تو لاعلم تھے لیکن وہ تو جانتا تھا کہ نور محمد یہ کارڈز نہیں بھیج سکتا تھا۔یہ کارڈز کس نے بھیجے تھے۔۔؟

وہ خاموش کا خاموش رہ گیا تھا اور پھر اس نے خاموش ہی رہنے کا تہیہ کیا تھا۔ان کارڈز کو دیکھنے کے بعد وہ ایک دم سے سر آفاق سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کا بیٹا مر چکا ہے سو فی الوقت اس کا چپ رہنا مناسب تھا۔یہ پہلی اہم بات تھی

☆ ☆ ☆

"فورتھ جنریشن وار فیر ملٹری ڈاکٹرائن" اس کے سامنے بیٹھے شخص نے ایک ہی لفظ میں گویا اس کی بولتی بند کر دی تھی۔وہ ریٹائرڈ میجر اظہر رشید تھے اور انہوں نے بجانے کس طرح اس کا فون نمبر حاصل کر کے اسے ملنے کے لئے بلوایا تھا

"بنیادی طور پر یہ وہ محاذ ہوتا ہے جو کسی بھی ملک کی فوج یا سیکیورٹی ایجنسیز کو اپنے ہی ملک کے اندر کھولنا پڑتا ہے۔۔دوسرے لفظوں میں ایسے محاذ میں ملکی سلامتی کے ادارے اپنے ہی لوگوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔۔بظاہر یہ محاذ کس قدر سہل اور غیر اہم لگتا ہو لیکن قوموں کی زندگی میں اس کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔۔کیونکہ یہ محاذ سرحد کے پار نہیں بلکہ سرحدوں کے اندر ہی کھولا جاتا ہے۔۔اس محاذ میں جنگ لڑنے والے بھی اپنے ہوتے ہیں اور جن سے جنگ لڑی جاتی ہے وہ بھی اپنے ہی ہوتے ہیں۔۔۔لیکن کوئی بھی فوج اس محاذ پر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو پاتی کیونکہ اپنے علاقے میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف لڑنا آسان نہیں ہوتا۔اس میں کامیابی کا مارجن بہت ہی کم ہوتا ہے۔۔مجھے افسوس کے ساتھ یہ بات تسلیم کرنی پڑ رہی ہے کہ پاکستان میں بھی یہ فورتھ جنریشن وار فیر ملٹری ڈاکٹرائن اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جسے آپ نے دانستہ یا نادانستہ اپنی اس رپورٹ میں استعمال کر لیا ہے جو ہر طرف سے ریجیکشن سہہ سہہ کر اب ایک فائل میں بند پڑی ہے۔۔میں صحیح کہہ رہا ہوں نا" انہوں نے تمہید باندھنے کے بعد مدعے کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔

سلمان کو ان کے منہ سے یہ سن کر زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایکس آرمی مین اس کی رپورٹ کے متعلق اتنی اچھی طرح سے جانتا تھا۔اسے اتنے مہینے خوار ہونے کے بعد یہ اندازہ تو ہو ہی چلا تھا کہ یہ کوئی ایسا گورکھ دھندا نہیں تھا اور جن باتوں کو وہ ڈھکی چھپی سمجھتا آیا تھا وہ اب اتنی ڈھکی چھپی نہیں تھیں

"میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں آپ اس رپورٹ پر کام ضرور کریں مگر تصویر کے دونوں رخ دکھائیں۔۔۔بیرونی عناصر کے ساتھ ساتھ اندرونی عناصر کا پردہ بھی فاش ہونا چاہیئے جو پاکستان کی جڑیں کاٹنے میں پیش پیش ہیں۔۔ورنہ وہ مقاصد حاصل نہیں ہو پائیں گے جو آپ کرنا چاہتے ہیں" سلمان فقط سر ہلا سکا۔میجر اظہر رشید نے اس کے سامنے ایک فائل رکھی تھی۔

"میں چاہتا ہوں۔۔آپ یہ فائل دیکھ لیں پھر تسلی سے فیصلہ کریں" سلمان نے ایک نظر ان کے چہرے کی طرف اور دوسری نظر اس فائل پر ڈالی تھی۔اس نے فائل اٹھا کر سرسری سے انداز میں اس فائل کو کھولا تھا اور پھر وہ ٹھٹھک کر میجر اطہر کا چہرہ دیکھنے لگا۔انہوں نے کندھے اچکائے جیسے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے ہوں۔

"یہ۔۔۔یہ کیا ہے۔۔؟" وہ ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتا ہوا ہکا بکا ان کا چہرہ بھی دیکھتا جا رہا تھا۔

"آپ کے سامنے ہے جو بھی ہے۔۔۔" ان کا انداز سابقہ تھا۔وہ یقیناً اپنے سینے میں بہت سے راز چھپائے ہوئے تھے۔سلمان ساکت و جامد رہ گیا تھا۔یہ دوسری اہم بات تھی جس نے اسے آنے والے بہت سے سالوں تک ساکت و جامد ہی رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا واقعی آپ جو کہہ رہے ہیں یہی سچ ہے؟" امائمہ نے بوجھل دل مگر چمکتی آنکھوں کے ساتھ سب کچھ سن لینے کے بعد ان سے سوال کیا تھا۔وہ کس قدر لاچار نظر آتی تھی۔نور محمد نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا۔یہ ایک عرصہ بعد ہوا تھا کہ انہوں نے کسی عورت کی جانب آنکھیں اٹھا کر دیکھنے کی چاہ کی تھی اور پھر بے بسی کے عالم میں دوبارہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگے تھے۔ان کے دل میں کوئی گندگی نہیں تھی بس اتنا تھا کہ انہیں اس کے چہرے میں اپنے محسن کا چہرہ دکھتا تھا جبکہ وہ جانتے تھے یہ چہرہ محتسب کا تھا۔وہ آنکھیں مجسم سوال بنی ان کو دیکھ رہی تھیں۔وہاں بے چینی تھی اور بے یقینی بھی۔۔۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔اب وہ مزید کچھ چھپانا نہیں چاہتے تھے۔پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی تھی۔یہ کوئی گیم شو نہیں تھا کہ آدھا آج کھیل لیا جاتا اور باقی آدھا کل کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔انہیں بالآخر یہ امر تسلیم کرنا ہی پڑا تھا کہ نور محمد کے خاندان کا حق تھا کہ انہیں ہر بات ہر حقیقت ہر نقطہ بتایا جاتا۔۔

"یہ آپ کے ایمان کی کمزوری ہے نور محمد جو آپ کو سچ اگلنے نہیں دے رہی۔۔اس سے فرار اختیار مت کریں۔۔اس سے مقابلہ کریں اور بہادری سے حالات کا سامنا کریں۔۔آپ حقیقت جانتے ہیں تو پھر چپ کیوں ہیں۔۔آپ کو چاہیے اب "عہد الست" کو منظر عام پر لے آئیں۔۔۔مزید تاخیر مزید نقصان کا باعث ہوگی۔۔یاد رکھئے مزید خاموشی غلطی نہیں گناہ ہوگی۔۔۔۔میں تو خود کو بھی اس معاملے میں قصوروار سمجھتا ہوں کہ میں کچھ نہیں کر پایا۔اللہ کی ناراضی کا احساس بہت خوفزدہ رکھتا ہے۔۔آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں ماں کو اولاد کے لئے تڑپانا اللہ کے غضب کو آواز دینا ہے۔۔۔جب مٹی تڑپتی ہے تو زلزلے آجایا کرتے ہیں۔۔۔مٹی سے بنی ماں تڑپتی ہے تو جانے اللہ کس سزا کا حقدار ٹھہرائے گا ہمیں۔۔۔ہمت پکڑیں اور دنیا کا سامنا کریں۔۔آپ کی نیت نیک ہے تو اللہ آپ کی مدد ضرور کرے گا" یہ صوفی صاحب کے الفاظ تھے جو انہوں نے گزشتہ ملاقات میں کہے تھے اور وہ جب بھی ملتے تھے یہ احساس ضرور دلاتے تھے کہ عہد الست مکمل کرو یہ نور محمد کی بازیابی کے لئے ضروری ہے۔یہ بات انہیں سلمان حیدر نے بھی سمجھانی چاہی تھی اور صوفی صاحب بھی یہی چاہتے تھے لیکن یہ ایک "بہن" تھی جس کے آنسوؤں نے انہیں احساس دلایا تھا کہ اب انہیں خاموشی کا روزہ توڑ دینا چاہیئے۔سچ تو یہ ہے وہ خود بھی جیسے اب تھک گئے تھے۔دل پر بوجھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ دل چاہتا تھا وہ سب دنیا کے سامنے لے آئیں جو کب سے ان کے اور ان سے وابستہ چند لوگوں کے درمیان ایک "گناہ" کی طرح چھپا چھپا کر رکھا گیا تھا اور یہی وہ بوجھ تھا جو انہیں سکون سے رہنے نہیں دیتا تھا جو انہیں

رات کو سونے نہیں دیتا تھا اور جو خواب میں آ آ کر انہیں ڈرا دیتا تھا۔۔انہیں امائمہ سے مل کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ واقعی بہت بڑی زیادتی کے مرتکب ہو رہے تھے۔انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ دنیا کو ایک معصوم شخص کے متعلق اندھیرے میں رکھتے۔یہ اس شخص کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی تھی۔یہ اس کی بہن کی آہوں اور ماں کے نوحوں کا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔۔وہ اسی لئے امائمہ سے ملنے کے لئے رضامند ہوئے تھے اور اسے ہر وہ بات بتادی تھی جو انہیں سو فیصد معلوم تھی جس کے بارے میں وہ گواہی دے سکتے تھے۔

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ میرا بھائی زندہ ہے؟" امائمہ نے ایک بار پھر سابقہ بے یقین لہجے میں سوال کیا تھا۔ان کی ساری باتیں سن لینے کے بعد یہ تیسری مرتبہ تھا کہ اس نے یہ سوال دوہرایا تھا

"آپ اسے میری خواہش یا امید بھی سمجھ سکتی ہیں۔۔آپ کی طرح میرا بھی دل کہتا ہے کہ نور محمد حیات ہیں لیکن وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں اس متعلق مجھے سو فیصد معلومات نہیں ہیں" وہ بتاتے ہوئے بے حد نادم نظر آئے۔شہروز نے الجھ کر عمر اور امائمہ کا چہرہ دیکھا تھا۔وہ مزید خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔اس کا ذہن ویسے ہی بہت الجھ گیا تھا

"سر! معذرت خواہ ہوں لیکن یہ ایک شخص کی زندگی کا معاملہ ہے۔۔ایک ایسا شخص جسے دنیا "دہشت گرد" سمجھتی ہے۔۔آپ اسے سوڈوکو (گیم) کی طرح نہیں کھیل سکتے کہ کسی لاجک کے بغیر۔۔ایک سے نو تک کے ہندسے گن گن کر خانے پر کرتے جائیں۔۔یہاں تین لکھ دیں،وہاں آٹھ لکھ دیں۔عمودی لائن میں آٹھ لکھا ہوا ہے تو پھر چھ لکھنا بہتر رہے گا۔۔۔۔پہلے آپ نے کہا نور محمد حیات نہیں ہیں،پھر کہا شہید ہو چکے ہیں اور اب کہہ رہے ہیں کہ حیات ہیں لیکن آپ کو یہ نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔۔کس کے ساتھ ہیں۔۔کم آن۔۔بس کیجئے۔۔آپ بہت بہترین ادیب ہیں۔۔لہٰذا آپ کے اشاروں پر ناچتے ہیں لیکن اب ہمیں کسی دلیل کے ساتھ اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کریں"

"مجھے احساس ہے۔۔میری باتوں پر ایک دم یقین کرنا مشکل ہے لیکن میں واقعی نور محمد کے وئیر اباؤٹس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔اور میری تذبذب بھری اس طویل خاموشی کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے" انہوں نے اسی نادم انداز میں بات شروع کی تھی

"دراصل دو ہزار سات میں جب پولیس نے ان کی میت ہمارے حوالے کی تو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ نور محمد کی میت نہیں ہے۔۔ہم نے اس کے فیونرل میں یہی سمجھ کر حصہ لیا تھا کہ یہ نور محمد کا فیونرل ہے۔۔مجھے وہ شخص بے حد پیارا تھا اسی لئے ان کا اس طرح دنیا سے جانا میرے لئے بہت بڑے ذہنی صدمے کا باعث بنا رہا کیونکہ مجھے اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ قصور اپنا دکھائی دیتا تھا۔لیکن میرے وہ عزیز جو نور محمد سے حقیقی ہمدردی رکھتے تھے نے کچھ مہینوں تک جی جان سے کوشش کی تھی۔۔اس وقت تک ہم سب کو یقین تھا کہ نور محمد کو واقعی شہید کر دیا گیا ہے" وہ لمحہ بھر کے لئے رکے

"اکیسویں صدی میں اگر انسان حالات و واقعات کو صرف تقدیر کے ہیر پھیر کا نام دے تو دنیا اسے احمق کہتی ہے لیکن میرا یقین ہے کہ سو فیصد محنت کے بعد بھی اگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو یہ کہیں نا کہیں مقدر ہی کا کھیل ہوتا ہے۔۔۔چاہنے کے باوجود بھی ہماری کسی کوشش کو کامیابی نہیں ملی۔پاکستان کے حالات کا تو آپ لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس ساری مدت میں کس قدر دگرگوں رہے پھر لندن 7/7 دھماکوں کے بعد لوٹن

کے حالات کافی خراب ہو گئے لیکن نور محمد کے متعلق خاموش رہنے کی وجہ صرف یہ حالات نہیں تھے۔" وہ ایک بار پھر چپ ہوئے اور سامنے پڑی تپائی پر پڑا ایک بڑا لفافہ اٹھایا تھا۔ امائمہ سمیت عمر اور شہروز بھی ان کے ہاتھوں کی ایک ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ نا جانے لفافے میں سے کیا نکلنے والا تھا۔ نور محمد نے اس میں سے چند کارڈز نکالے تھے۔ یہ عام سے پوسٹ کارڈز تھے۔ امائمہ نے چونک کر وہ کارڈز ان کے ہاتھ سے لئے پھر کچھ دیر ان کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد مایوسی سے بولی۔

"ایسے کارڈز تو ایک بار میری والدہ کے نام بھی موصول ہوئے تھے۔۔۔ ان میں خاص بات کیا ہے؟"۔ امائمہ اپنے بھائی کے لئے لفظ "دہشت گرد" سن کر کافی دل برداشتہ ہو رہی تھی۔

"بظاہر کوئی خاص بات نہیں ہے۔۔ لیکن یہ کارڈز مجھے تب موصول ہوئے تھے جب نور محمد کی میت کو دفنائے تقریباً چھ مہینے گزر چکے تھے۔۔۔ یہ کارڈز مجھے پاکستان سے بھیجے گئے تھے اور نور محمد کی جانب سے بھیجے گئے تھے۔۔۔ ان کارڈز نے ہم پر یہ انکشاف کیا کہ نور محمد کہیں موجود ہیں اور ہم سے رابطہ کرنے کے باوجود ہم سے ملنا نہیں چاہتے۔۔۔ تب میرے وہ عزیز جو اس معاملے میں میرے ساتھ تھے کو یقین ہو چلا تھا کہ نور محمد کہیں روپوش ہیں اور شاید واقعی "المہاجرون" کے لئے کام کر رہے ہیں۔۔۔ میں نے اتنے سالوں میں نور محمد کو اس "دہشت گرد" کے ٹائٹل سے چھٹکارا دلوانے کے لئے جتنی محنت کی ہے اتنی شاید ہی کسی اور مقصد کے لئے کی ہو۔۔۔ ان چند سالوں میں سب سے زیادہ دکھ مجھے اسی بات نے پہنچایا ہے کہ دنیا کے سامنے مسلمان کو مسلمان ثابت کرنا آسان نہیں ہے لیکن مسلمان کو "دہشت گرد" ثابت کرنا بے حد آسان ہے۔ اس کی صرف داڑھی اور باجماعت پانچ نمازیں دنیا کو اس کی شناخت کے حوالے سے مشکوک کر دیتی ہیں۔۔۔ یہ ایک المیہ لیکن حقیقت ہے کہ فی زمانہ مسلمان ہی مسلمان کو "کافر" قرار دینے میں پیش پیش ہے اور میری خاموشی کی دوسری وجہ بھی یہی ہے۔" وہ اب روانی سے بات کر رہے تھے۔ فکر ان کے چہرے پر کسی موسم کی طرح بکھری تھی۔ ایک ایسے مسلمان کی طرح جسے مسلم امہ کے حالات دکھ دیتے ہیں۔ پریشان کرتے ہیں وہ بھی پریشان نظر آئے۔

"دو ہزار کے آخر میں الجزیرہ انگلش سے ایک ڈاکیومینٹری پیش کی گئی۔۔ جس میں گوانتاناموبے کے اندرونی حالات اور وہاں موجود کچھ مسلمانوں کے حالات کو ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔۔۔ اور انہیں دہشت گرد دکھا کر دنیا کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہاں مسلمان دہشت گرد ہیں۔۔۔ اس ڈاکیومینٹری میں نور محمد کا ذکر نہیں تھا لیکن ایک قطار میں کھڑے کچھ لوگوں کی ایک جھلک دکھائی گئی۔۔ ان میں نور محمد موجود تھے" انہوں نے بالآخر بتا ہی دیا تھا کہ نور محمد "کہاں" تھا۔ شہروز نے "الجزیرہ انگلش" کے لفظ پر ایسے پہلو بدلا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ امائمہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں جبکہ یہ پہلو عمر کے لئے بھی کافی حیران کن تھا۔

"گوانتاناموبے۔۔۔۔ واقعی۔۔۔؟" امائمہ کی آواز کسی سرسراہٹ سے مشابہ تھی۔ یہ کسی تاش کے پتوں کے محل کے بار بار گر جانے کے مترادف تھا۔ اس کا خاندان کس قدر بد قسمت تھا۔ ایک کے بعد ایک امید افزاء بات پتا چلتی بھی تھی تو وہ بھی آخر میں ناامیدی کے دسترخوان پر بیٹھ کر روزہ افطار کرتی نظر آتی تھی۔ دہشت گرد۔۔۔ گوانتاناموبے۔۔۔ یہ تو الفاظ ہی خوفزدہ کرنے کو کافی تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے عمر۔۔۔ ہمارے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے۔۔۔؟" وہ روہنکی ہو کر اپنے شریک حیات کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"آپ اس بارے میں اتنے پر یقین کیسے ہیں۔۔۔کیا پتا وہ کوئی اور ہو۔۔آپ خود ہی کہہ رہے کہ ڈاکیومینٹری میں نور محمد کی ایک جھلک ہی دکھائی گئی۔۔سننے میں بھی عجیب سا لگتا ہے۔۔۔جیسے کوئی کہانی ہو۔۔۔نہیں؟" یہ شہروز تھا جس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"نور محمد کے معاملے میں ہر بات عجیب ہی رہی ہے اب تک۔۔۔کیا یہ عجیب نہیں لگتا سننے میں کہ ایک بیٹا ماں باپ کی وجہ سے دربدر ہو کر رہ گیا۔۔۔دنیا اور زندگی انہی عجیب وغریب واقعات کا مجموعہ ہے جناب۔۔۔انسان ازل سے خود بیتی کو واقعہ اور جگ بیتی کو کہانی سمجھتا آیا ہے۔۔۔" نور محمد کا لہجہ طنز سے پاک لیکن دوٹوک تھا۔شہروز کے لہجے کا طنز انہیں برا لگنے لگا تھا۔

"میں تو کنفیوژ ہو گئی ہوں۔۔۔ایک سرا ہاتھ آتا ہے تو دوسرا الجھ جاتا ہے۔۔۔اب میں اپنے ماں باپ کو کونسی امید کی ڈور تھماؤں گی؟" امائمہ بالکل ڈھ جانے والے انداز میں بولی تھی۔اس کے اعصاب بالکل جواب دے رہے تھے۔

"میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔۔۔میرے پاس میرا اثاثہ صرف میرے لفظ ہیں اور وہ میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔۔۔میں "عہدِ الست" کو بہت جلد پبلک کرنے والا ہوں۔۔اس کی اشاعت کے بعد مجھے امید ہے کہ کوئی مثبت پیش رفت ضرور ہو گی کیونکہ اس میں ہر وہ پہلو زیرِ بحث آیا ہے جو نور محمد کی زندگی کا احاطہ کرے گا اور انہیں معصوم ثابت کرے گا اور۔۔۔آپ لوگوں کے آنے سے مجھے حوصلہ ملا ہے کہ اب ہم نور محمد کو ڈھونڈ لیں گے۔۔۔۔آپ کا ان سے خون کا رشتہ ہے۔۔آپ ہماری مدد کریں۔۔ہمارے ساتھ تعاون کریں۔۔نور محمد کو دہشت گرد مت سمجھیں۔۔میرے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔۔۔ہر وہ پہلو جو آپ کے لئے الجھن کا باعث بنے گا میں اس پر بات کرنے کو تیار ہوں۔" وہ امائمہ سے براہ راست مخاطب تھے۔

"میں نا امیدی کو گناہ سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ نا امید مت ہوں۔۔۔اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے ایک چیز یہ سیکھی ہے کہ مایوسی چھوت کی بیماری ہے۔۔۔یہ ایک دوسرے کو دیکھنے سے بھی لگ جایا کرتی ہے۔۔۔آپ مل جل کر میرا ساتھ دیں۔۔انشاءاللہ کوئی نا کوئی اچھی خبر مل جائیگی" وہ اسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔امائمہ نے گہری سانس بھری۔

"میں کیسے اپنی امی کو بتاؤں گی کہ ان کا لختِ جگر ایک ایسی جگہ ہے جہاں کا نام لیتے بھی انسان کئی بار سوچتا ہے اور ابو تو پہلے ہی ہمیشہ نیوٹرل رہے ہیں۔۔انہیں تو بیٹے سے محبت ہی نہیں تھی کبھی۔۔وہ تو اب بالکل ہی مخالفت پر اتر آئیں گے۔" ایک سوچ آ رہی تھی ایک جا رہی تھی۔اسکا جسم جیسے اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔اس نے مزید کچھ گہری سانسیں بھریں۔۔اس کا بی پی شوٹ کر رہا تھا۔عمر نے اس کے چہرے کے تکلیف دہ تاثرات کو لمحہ بھر میں نوٹس کیا تھا۔

"امائمہ۔۔تم ٹھیک ہو نا۔۔کیا ہو رہا ہے۔۔۔ادھر دیکھو۔۔میری طرف" امائمہ کی سماعتوں نے اتنا ہی سنا تھا اور پھر وہ جیسے کہیں ہوا میں معلق ہونے لگی تھی۔



"بل گرانٹ یا نور محمد" شہروز نے الجھے ہوئے انداز میں سوچا تھا اور ساتھ ہی لیپ ٹاپ آن کر کے لئے پاور بٹن دبایا تھا۔وہ جب سے لوٹن سے واپس آیا تھا اس کے دل میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔بل گرانٹ بمقابلہ نور محمد اور پھر نور محمد بمقابلہ نور محمد۔۔۔ایک معمہ،ایک پہیلی یا پھر ایک انکشاف

...آج کا دن اس کے لئے بہت سنسنی خیز دن تھا۔ امائمہ کے بھائی کے مسئلے میں الجھتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے سامنے ایک نئی داستان شروع ہو جائیگی۔

لوٹن میں بل گرانٹ عرف نور محمد کے انکشافات نے ان تینوں کو چونکا یا تھا۔ امائمہ کا بی پی اچانک شوٹ کر گیا تو اسے لوٹن میں ہی ایمرجنسی میں لے جانا پڑا جہاں وہ تین گھنٹے آبزرویشن میں رہی تھی کیونکہ وہ حاملہ تھی اس لئے اس کا تفصیلی معائنہ اور تمام لیب ٹیسٹ بھی کئے گئے۔ شہروز اور عمر دونوں ہی اس صورتحال سے گھبرا گئے تھے سو نہ چاہتے ہوئے بھی عمر کو ممی کو فون کر کے بتانا پڑا۔ لنچ کا وقت ہو جانے کے باعث وہ بار بار شہروز کے سیل پہ کال کر رہی تھیں۔ امائمہ کے نمبر پر بھی ان کی کال آئی اور پھر جب عمر کا سیل بھی ان کے نام کے حروفوں چمکا تو بالآخر اسے ان کی کال ریسیو کرنا پڑی اور یہ بھی بتانا پڑا کہ وہ تینوں ایک ساتھ ہیں اور امائمہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ممی کی خفگی پریشانی اور بے چینی عمر کو فون پر ہی محسوس ہو گئی تھی سو وہاں سے واپسی پر ہی وہ تینوں الگ ذہنی خلجان کا شکار رہے تھے۔ امائمہ کو بھائی کے صدمے اور پھر اس پریشانی نے کہ وہ حیات تھا مگر ابھی بھی ان کی رسائی سے دور تھا نے لاچار کر رکھا تھا جبکہ عمر کو اپنے والدین کی جواب طلبی کا ڈر ستا رہا تھا اور شہروز کو جس چیز نے سوچ میں الجھا رکھا تھا وہ ایک الگ ہی نقطہ تھا۔ اس کے سامنے تو انکشافات کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ نور محمد عرف بل گرانٹ نے انہیں اپنے تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی بلکہ ان سے ملتے رہنے کے لئے بھی کہا تھا

ایک ناولسٹ تھا جس کا نام بل گرانٹ تھا جس کے بارے میں رضوان اکرم نے ایک بار کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے تم اس کا انٹرویو لو انہوں نے بھی نور محمد کا ذکر کیا تھا اور پھر عوف بن سلمان کی کریڈو ٹیم تھی جس نے بہت سا مواد فراہم کیا تھا جس میں کسی نور محمد کا ذکر تھا جو لاہور کا رہائشی تھا اس کے والد کا نام بھی آفاق ہی تھا اور کیسی عجیب بات تھی کہ یہاں امائمہ اپنے کسی بھائی کو تلاش کر رہی تھی جس کا نام نور محمد تھا اور وہ ایک ناول نگار کے قبولِ اسلام کا موجب بن گیا تھا اور اس کا نام بھی نور محمد تھا لیکن خود اس کے بارے میں اس کو جو بتایا گیا تھا وہ ایک قصہ تھا جبکہ بل گرانٹ عرف نور محمد جو بتا رہے تھے وہ ایک الگ داستان تھی لیکن یہ سچ تھا کہ شہروز کو فی الحال خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے اس سارے قصے کو سنتے رہنے کے باوجود کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ وہ نور محمد ولد آفاق علی کا نام سننے کے باوجود چونکا کیوں نہیں تھا۔ لیپ ٹاپ کے آن ہوتے ہی خود کو لتاڑتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے پڑے سرہانے کو کراؤن کے ساتھ ٹکایا تھا اور پھر انداز نشست کو مزید آرام دہ بنا کر لیپ ٹاپ گود میں رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹیلی اور دل میں کھد بد مچی تھی۔ یہ ایک بہت ہی حیران کن بلکہ پریشان کن انکشاف تھا کہ وہ ایک ایسی ڈاکیومینٹری پر کام کر رہا تھا جس کا موضوع "دہشت گردی" تھا۔ اس میں ایک ایسے دہشت گرد کا ذکر تھا جس کے ساتھ اس کی رشتہ داری نکل آئی تھی۔

اب تک اس نے ڈاکیومینٹری پر کام شروع ہی نہیں کیا تھا تو اتنے دن سے سب چیزیں کہیں لاشعور میں دبی بیٹھی تھیں۔ وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹے نکتے سے باخبر ہونا بہت ضروری تھا۔ یہ اب صرف اس کی جاب۔ اس کے جنون یا شہرت کا معاملہ نہیں رہا تھا۔ یہ اس کے خاندان کا ذاتی معاملہ بن چکا تھا اور حیرت والی بات یہ تھی کہ یہ سب معلومات بہت مبہم اور منتشر سی تھیں۔ ایک ہی شخص کے متعلق دو تین طرح کی آراء تھیں اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی تین طرح کے ہی تھے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ نور محمد

دہشت گرد تنظیم کا رکن تھا۔ کچھ کہہ رہے تھے یہ صرف ایک سازش ہے۔ کچھ لوگ اسے مردہ اور بل گرانٹ کو اس کا قاتل قرار دے رہے تھے جبکہ اس کے پاس جو مواد تھا اس میں یہ واضح لکھا تھا کہ وہ زندہ ہے جبکہ بل گرانٹ خود کو مسلمان ظاہر کر رہا تھا اور اس شخص نے جو انکشافات کئے تھے وہ مزید ہوش اڑا دینے والے تھے۔ اسی لئے شہروز اب اپنے پاس موجود مواد کو بہت اچھے طریقے سے جانچنا پرکھنا چاہتا تھا سو الجھے الجھے انداز میں ایک ایک کر کے تمام چیزیں دیکھنے لگا تھا۔ وہاں کچھ فون نمبرز بھی دیے گئے تھے اور ساتھ میں ان کی تصاویر بھی تھیں۔ یہ ان لوگوں کے تھے جن سے وہ لندن میں رابطہ کر سکتا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے ان نمبرز کو اپنے سیل فون میں محفوظ کرنا شروع کیا تھا۔ ایک نمبر پر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔ یہ دراصل رابطہ نمبر نہیں تھا جس نے اسے چونکایا تھا بلکہ یہ اس شخص کی تصویر تھی جس نے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس کا نام جو لکھا ہوا نظر آ رہا تھا وہ تیمور نصر تھا جبکہ شہروز اسے زین العابدین کے نام کے ساتھ جانتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے بل گرانٹ عرف نور محمد کے روم میٹ اور دوست کے طور پر ان سے پہلی بار ملاقات کر کے نور محمد کی شہادت کے متعلق بتایا تھا۔

"کیا زین العابدین عرف تیمور نصر کوئی انڈر ورلڈ ایجنٹ تھا؟" شہروز کے لئے صورتحال مزید گمبھیر ہونے لگی۔ یہ گورکھ دھندا تھا یا بھول بھلیاں ۔۔ معمہ تھا یا پہیلی ۔۔۔ جو بھی تھا بہت پریشان کن ہو رہا تھا۔



"تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو" ابو کی آواز میں خفگی نہیں تھی۔ وہ سرسری سے انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے ایسے بات کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو۔ انہوں نے عمر اور شہروز دونوں کو جواب طلبی کے لئے سٹنگ ہال میں بلوایا تھا

ہیرو ہو کوئی ۔۔۔ ٹارزن ہو یا سپر مین ۔۔؟" ان کی آواز میں طنز کی آمیزش بڑھی تھی۔ عمر نے سر اٹھا کر ممی کی جانب دیکھا کہ شاید وہاں کوئی نرم تاثر دیکھنے کو ملے۔ وہ ابو کے ساتھ ہی کاؤچ پر براجمان تھیں اور ان کے چہرے پر شدید خفگی تھی۔ وہ ابو کی طرح اپنے تاثرات چھپا کر رکھنے کو ناراضی نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ عام ماؤں کی طرح اولاد کا ہر وہ معاملہ جس میں ڈانٹ ڈپٹ کا اندیشہ ہو شوہر کے سامنے کھول کر بیان نہیں کرتی تھیں لیکن جب پانی سر سے اونچا ہوتا دکھائی دیتا تھا تو پھر وہ اولاد کو کوئی رعایت بھی نہیں دیتی تھیں۔ عمر کو ان کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ابو کو ہر بات بتادی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اسٹول پر شہروز بیٹھا تھا اور وہ سٹنگ ہال میں بیٹھے ان تینوں افراد میں سب سے زیادہ نیوٹرل شخص تھا۔ امائمہ وہاں موجود نہیں تھی اگرچہ وہ اسی گھر میں تھی لیکن عمر نے اسے سونے کے لئے عمیر کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ممی نے بھی اسی بات پر زور دیا تھا کہ امائمہ کی طبیعت کے پیش نظر ساری بات اسکی غیر موجودگی میں ہونی چاہیے۔ ابو کی ساری توجہ سارا ارتکاز عمر پر مرکوز تھا لیکن ان کا انداز سادہ بھی نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ کسی احساس سے عاری لہجہ اس کے لئے شدید ناراضی کا اظہار ہے۔ وہ جب بہت ناراض ہوتے تھے تو بہت لاتعلق ہو جاتے تھے اور اسے اس لاتعلقی سے بڑا خوف آتا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بے حد خفا ہیں۔ ان کے لئے سب سے زیادہ شاکنگ یہی تھا کہ وہ تینوں آخر ان اوقات میں جب عمر کو ڈیوٹی پر شہروز کو اپنے لیپ ٹاپ پر اور امائمہ کو اپنے گھر میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ وہاں لوٹن میں کیا کر رہے تھے۔ انہیں کسی اور معاملے کا علم تو نہیں تھا لیکن وہ لوٹن جانے کے معاملے پر ہی سخت خفا تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان سے باز پرس نا کی جاتی جبکہ لوٹن والا معاملہ پہلے

بھی گھر میں ایک بار زیر بحث آ چکا تھا اور ممی اس کے سامنے اپنی سخت ناپسندیدگی کا نا صرف اظہار کر چکی تھیں بلکہ یہ بھی باور کروا چکی تھیں کہ امائمہ کی یہ روٹین ان کے لئے تشویش کا باعث ہے۔ ممی نے یقیناً عمر کی فون کال کے بعد ابو کے سامنے سب کچھ اگل دیا تھا۔ اسی لئے وہ دونوں ہی اب کافی ناراض لگ رہے تھے۔

"آئی ایم سوری ابو۔۔۔ دراصل۔۔۔ میں آپ کو بتانے والا تھا۔" وہ الفاظ جمع کر کے بولنے کی جستجو میں تھا لیکن امی نے اسے جھڑک کر چپ کروا دیا۔

"کیا بتانے والے تھے۔۔۔ یہی کہ تم لوگ گھومنے پھرنے اتنی دور گئے تھے۔۔ پہلے امائمہ کو روٹ سینس بہتر بنانا تھا۔ اب شہروز کو یہ شوق چرایا ہوگا۔۔۔ تم لوگ اپنے بڑوں کو بیوقوف سمجھتے ہو نا۔۔۔ ایڈونچرز کا شوق پورا کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے" ممی انتہائی خفگی بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

"مجھے بات تو مکمل کرنے دیں۔۔۔ ایڈونچر کی بات نہیں ہے۔۔۔ ہم کسی اور کام سے گئے تھے" عمر ان بیٹوں میں سے تھا جنہیں ماؤں کی ہمیشہ حمایت حاصل ہوتی اور وہ ہمیشہ ماؤں کی گڈ بک میں رہتے ہیں ممی ڈیڈی کے سامنے ہمیشہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ سے بچاتی آئی تھیں۔ اسی لئے ڈیڈی کے سامنے ان کی باز پرس پر دل ہی دل میں چڑنے کے باوجود وہ تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"کام سے جانے کے لئے تمہیں وہی علاقہ ملا ہے۔۔۔ اور ہر روز ایسے کون سے کام پڑنے لگے ہیں تمہیں وہاں۔۔۔ پہلے تو کبھی نہیں گئے تھے تم لوگ" ممی کا انداز اب طنزیہ ہو رہا تھا۔

"اوہو ممی۔۔ ایسا بھی حشر نہیں مچا ہوا وہاں۔۔۔ پرسکون علاقہ ہے۔۔ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔۔ کیا ہو گیا اگر ایک آدھا کریمنل مائینڈڈ شخص وہاں سے گرفتار ہو گیا۔۔۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ آپ پورے لوٹن کو ہی میدان جنگ سمجھ لیں" یہ ون ٹو ون مقابلہ شروع ہو گیا تھا جس کا اختتام ابو کی ایک جھڑک سے ہی ہو سکتا تھا اور یہی ہوا۔

"مجھے بات کرنے دیں" انہوں نے ممی کو کہا تھا۔ وہ عمر کو گھورتے ہوئے کچھ کہنے سے باز آ گئی تھیں۔

"تم بولو۔۔۔" انہوں نے اسی لاتعلق انداز میں اب عمر سے کہا تھا۔

"ابو۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔" اس نے بات شروع کی پھر شہروز کی جانب دیکھا جو ایسے بیٹھا تھا جیسے نیوز چینل پر نیوز دیکھ رہا ہو اور چڑ کر خود ہی جملہ ترتیب دینے لگا تھا۔

"ہم نور محمد کا پتا کرنے گئے تھے" وہ اتنا کہہ کر پھر چپ ہو گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بتائے۔

"اچھا۔۔۔ تو پھر پتا چلا نور محمد کا۔۔؟" ابو کے سوال نے اسے چونکا دیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ کیا وہ پہلے سے کچھ جانتے تھے

"آپ کو پتا ہے نور محمد کا۔۔ آپ جانتے ہیں اس کے بارے میں۔۔؟" اسے سوال پوچھنے کے بعد احساس ہوا کہ اسے نہیں پوچھنا چاہیے تھا

"مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے عمر۔۔۔ اور مجھے کچھ پتا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔۔ تم لوگ اب خود مختار ہو چکے ہو۔۔۔ اپنے معاملات سلجھانے میں ماشاءاللہ کافی ماہر ہو چکے ہو۔۔ والدین کو کچھ بتانے کی پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں تم اگر اپنی ماں کے ٹوکنے کے

باوجود وہاں جاتے رہے ہو تو مسئلہ کچھ بڑا ہی ہوگا۔۔۔ اتنا بڑا کہ تم نے ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔۔۔ لیکن تم جب دس بارہ سال بعد اپنے باپ کو اس قابل سمجھو کہ اسے کوئی اہم بات بتائی یا کوئی مشورہ لینا ہے تو میری قبر پر آ کر بتا دینا۔۔۔ وہی مناسب وقت ہوگا اپنے باپ سے کوئی بات شیئر کرنے کا" یہ ان کا پہلا وار تھا۔ عمر کا سر دوبارہ جھک گیا۔

"ایسی بات نہیں ہے ابو۔۔ ہم بتانے والے تھے۔۔" عمر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ابو نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں۔۔ دس سال بعد بتا ہی دیتے تم۔۔۔ بہت شکریہ۔" یہ وہی مخصوص طنزیہ انداز تھا جس کی عمر کو عادت تھی۔ صورتحال کی سنگینی کے باجود عمر کو ہنسی آئی جسے اس نے ہونٹوں کے کناروں تک آنے سے بھی پہلے روک لیا تھا۔ ایک بڑا مرحلہ ابھی باقی تھا۔

"ابو ناراض مت ہوں پلیز۔۔۔ میں بتا تو رہا ہوں" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ممی کی ناراضی اسے کبھی نہیں ڈراتی تھی لیکن ابو کی ناراضی سے اسے واقعی ڈر لگتا تھا۔

"بہت احسان مند ہوں میں بیٹا جی!" ابو کہنا نہیں بھولے تھے۔

"نور محمد امائمہ کا بھائی ہے چاچو۔۔۔ ہم لوگ ان میں اس سے ملنے گئے تھے" شہروز نے خاموشی کے طویل وقفے کو بالا آخر توڑا تھا

"کس کا بھائی۔۔۔ امائمہ کا۔۔؟" ممی نے چونک کر اسے دیکھا

"جی ممی امائمہ کا۔۔۔" عمر نے جواب دیا تھا۔

نور محمد۔۔۔؟" ابو نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے دوہرایا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ ان کے گھر میں امائمہ اور عمر کے نکاح کے بعد اس کے بھائی کا ذکر ہوا تھا اور وہ بھی اس تناظر میں جو باتیں انہیں اپنے بھائی اور بھتیجوں سے پتا چلی تھیں۔ اپنی بہو کے بھائی کا کسی اسائلم میں ہونا ان کا درد سر نہیں تھا۔

"یہ امائمہ اور اس کے والدین کا ذاتی معاملہ ہے اور ہم میں سے کوئی بھی اس بارے میں بات نہیں کرے گا۔" یہ تاکید انہوں نے بہت پہلے اپنے گھر میں کر دی تھی وہ اگر چہ اپنے گھر میں بھولی بسری کہانیاں سنانا پسند کرتے تھے نا ہی انہیں بھولی بسری کہانیاں سننا پسند تھا لیکن اب معاملہ کچھ اور نظر آتا تھا سو انہیں بیٹے کی بات سننے میں دلچسپی لینی پڑ رہی تھی۔ دوسری جانب عمر نے دل ہی دل میں ہمت مجتمع کی تھی۔ ان کو بتانے کے لئے اس کے پاس کافی لمبا چوڑا قصہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ یہ روز روز لوٹ جانا کوئی اور ہی قصہ ہے۔۔۔ اب پتا چل گیا نا آپ کو کہ میری گٹ فیلنگز کبھی غلط نہیں ہوتیں۔۔۔ ہمارے ہونہار سپوت کسی مہم جوئی میں حصہ لیں اور مجھے خبر نا ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا" یہ ممی کا مخصوص جملہ تھا جو عمر کی ہر نئی مگر اوندھی شرارت پر ممی کہنا نہیں بھولتی تھیں۔ عمر کے خاموش ہوتے ہی وہ ابو کو جتانا نہیں بھولی تھیں۔ یہ معاملہ اگر چہ شرارت سے کچھ آگے کی چیز تھا اور اس میں عمر کا کوئی قصور بھی نہیں تھا لیکن امائمہ کے ناطے اب یہ ان کے گھر کا ہی مسئلہ تھا۔ ابو کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی جبکہ دوسری جانب شہروز ابھی کھویا کھویا سا تھا

۔وہاں موجود تینوں مردوں کو اندازہ تھا کہ یہ کس قدر گھمبیر صورتحال ہو سکتی تھی

"تم۔تمہارا مطلب ہے۔۔امامہ کا بھائی دہشت گرد ہے۔۔۔اور گوانتاناموبے میں ہے؟" ساری بات سن کر انہوں نے تشویش بھرے انداز میں سوال کیا تھا

"جی چاچو۔۔۔وہ شخص تو یہی کہہ رہا ہے" شہروز اب ان کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔آئندہ کا سب لائحہ عمل ان پر منحصر تھا

"دہشت گرد نہیں ہے ابو۔۔۔اس کا امیج ایسا بنادیا گیا ہے کہ جیسے وہ دہشت گرد ہے" عمر نے شہروز کا چہرہ دیکھتے ہوئے تصحیح کی تھی۔شہروز کا رویہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔وہ ہر نقطے میں کوئی نا کوئی اعتراض کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا۔

"ایک ہی بات ہے عمر۔۔۔دہشت گرد ہونا یا دہشت گرد کا امیج ہونا۔۔۔دنیا دونوں چیزوں کو ایک ہی تناظر میں دیکھتی ہے" شہروز نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا

ایک ہی بات کیسے ہوسکتی ہے۔۔۔دنیا کی کوئی طاقت ملزم کو گناہ ثابت ہونے سے پہلے مجرم نہیں کہتی۔۔۔تم تو میرے ساتھ سارا قصہ سن کر آئے ہو۔۔انہوں نے ایک ایک بات تمہیں بتائی ہے پھر بھی تم ایسے کہہ رہے ہو" عمر چڑ کر بولا تھا۔اسے ابو کے سامنے شہروز کی حمایت کی ضرورت تھی جبکہ وہ پارٹی بدل کر ابو کے ساتھ اس کی مخالفت میں پہلی صف میں جا کھڑا ہوا تھا۔

"تم کچھ بھی کہو عمر۔۔مجھے تو یقین نہیں آیا اس ساری بات پر۔۔۔عجیب من گھڑت سی کہانی ہے۔۔۔وہ شخص جھوٹ بھی تو بول رہا ہوسکتا ہے۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہروز نے ان کی بات کاٹ کر انہی کی بات کی تائید کی

"مجھے تو خود یقین نہیں آیا اس شخص کی کسی بات پر۔۔۔عجیب فلمی سی کہانی لگ رہی ہے" وہ ابھی بھی اپنے موقف پر قائم تھا اور اب تو اس کا انداز مزید مدلل ہوگیا تھا کیونکہ اب اس نے وہ ڈاکیومینٹری اور اس سے متعلقہ مواد اچھی طرح جانچ لیا تھا

"ابو! مجھے لگتا ہے وہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔کچھ حقیقت تو ہے سارے معاملے میں" عمر ابھی بھی اپنے موقف پر قائم تھا۔

"یار اسے سمجھاؤ کچھ۔۔۔ایسا ہوتا ہے بھلا کہیں۔۔۔تم لوگ اتنے سالوں سے گمشدہ ایک شخص کو ڈھونڈنے نکلو اور وہ تمہیں نہیں ملے لیکن اس کے ایسے خیر خواہ مل جائیں جو بتائیں کہ وہ حیات نہیں ہے پھر تم منت سماجت کرو تو وہ کہہ دیں کہ ہاں وہ زندہ ہے مگر۔۔وہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔۔۔وہ اسے جانتے تھے مگر اب وہ کہاں ہے اس بارے میں انہیں نہیں پتا۔۔۔اور پھر وہ خدشہ ظاہر کریں کہ وہ ایک بدنام زمانہ جگہ پر ہوسکتا ہے۔۔۔اس بارے میں بھی وہ سو فیصد پر یقین نہیں ہے کہ وہ گوانتاناموبے میں ہے یا نہیں۔۔۔میں تو ساری بات سن کر ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ شخص واقعی اچھا ناولسٹ ہے۔۔۔اسے کہانی لکھنی آتی ہے" ابو نے کہا۔شہروز نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی تھی۔چاچو عمر کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔یہ ایک خوش آئند بات تھی۔عمر نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔

"ابو آپ سمجھ نہیں رہے۔۔وہ بلا جواز یا بنا ثبوت بات نہیں کر رہے۔۔۔وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔۔۔وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ نور محمد یعنی امامہ کا بھائی کہاں موجود ہے اور وہ یہ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ معصوم اور بے گناہ ہے۔ان کے پاس اس ساری سازش

کو جھوٹ کا پلندہ ثابت کرنے کے لئے بہت سی شہادتیں ہیں۔۔۔ابو! اتنی مستند باتیں کوئی خوامخواہ کیوں کرے گا" عمر نے بھی اپنا موقف بیان کرنا ضروری سمجھا تھا۔ابو اب اسکی جانب دیکھ رہے تھے۔

"ٹھوس شواہد موجود ہیں تو اب تک کیوں خاموش تھا وہ۔۔۔اسے کچھ تو کرنا چاہیئے تھا نا۔۔۔وہ اگر واقعی سچا ہے تو پھر چپ کیوں رہا اتنی دیر۔۔۔" ابو نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے ان کی بات کاٹ دی

"ابو وہ کہہ رہے تھے کہ وہ منتظر تھے کہ نور محمد کا کوئی قریبی عزیز ان کا ساتھ دے تو وہ یہ سارا معاملہ پبلک کریں۔۔ورنہ وہ کس بنیاد پر یہ سوال کریں گے۔۔۔ان کا کوئی بلڈ ریلیشن تو نہیں ہے نور محمد کے ساتھ۔۔۔قانونی کاروائی کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کا ساتھ ہونا بہت ضروری ہے جس کا نور محمد کے ساتھ بلڈ ریلیشن ہو۔۔" وہ پر جوش انداز میں بولا تھا۔انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا

"بہر حال جو بھی بات ہو عمر۔۔۔تم اس سارے معاملے سے دو سو قدم دور رہو۔۔۔اللہ امائمہ بیٹی کے والدین کو صبر دے۔۔۔ان کے لئے بیٹے کا زندہ ہونا یا نا ہونا اب ایک ہی بات ہے۔۔۔تم اب دوبارہ لوٹن مت جانا۔۔۔سویڈن میں جو خودکش دھماکہ ہوا ہے نا اس کے بمبار کا تعلق بھی لوٹن سے تھا اور تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔۔اب تو ہر روز وہاں فسادات ہو رہے ہیں گوروں اور بھورے لوگوں کے درمیان۔۔۔یاد رکھنا۔۔یہ میری نصیحت نہیں ہے میری تاکید ہے"۔ان کا لہجہ دو ٹوک تھا۔۔وہ چپ ہوئے تو ممی بھی بول اٹھیں

"عمر بلڈ ریلیشن تمہارا بھی نہیں ہے اور تمہارے ابو کہہ رہے ہیں نا کہ تم اس معاملے سے دور رہو تو بہتر ہے کہ تم دور رہو۔۔۔پہلے ہی مسلمانوں کے لئے بہت مشکلات بڑھ گئی ہیں۔۔تمہارے سامنے ہی ہے سب کچھ۔۔اس دن مارکیٹ میں کیا ہوا تھا۔۔۔ذرا سی بات کے لئے مجمع اکٹھا ہو گیا تھا مسلمانوں بالخصوص پاکستانیوں کے لئے زندگی روز بروز مشکل ہوتی جاری ہے۔۔۔اسکارف سے سر ڈھانپنا ہی مصیبت بنتا جا رہا ہے یہاں۔۔داڑھی والا مسلمان اور ڈھکے سر والی عورت مشکوک سمجھے جاتے ہیں اب۔۔۔اور پھر پاکستانی چھینک بھی مارے تو یہ گورے سوائن فلو پھیلانے کا الزام لگانے لگتے ہیں۔۔۔دہشت گردی کا لفظ بھی منہ سے نکالو گے تو یہ منٹوں میں تمہیں دہشت گرد ثابت کر دیں گے۔۔۔تم لوگوں کو بے شک ڈر نا لگتا ہو لیکن میں اس دن کے بعد سے بہت خوفزدہ ہو گئی ہوں۔۔تم بس اس معاملے میں نہیں پڑو گے" عمر چند لمحے دونوں کی جانب دیکھتا رہا۔

"نور محمد دہشت گرد نہیں تھا ابو۔۔۔جب وہ شخص تھا ہی معصوم تو ہم کیوں خوفزدہ ہیں۔۔کس لئے ساتھ نا دیں اس کا۔۔یہ مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔۔۔مسلم آبادی کو پریشرائز کرنے کی کوشش ہے یہ۔۔۔اور ممی آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ برائی کو پھیلتے دیکھو تو اسے ہر ممکن طریقے سے روکنے کی کوشش کرو۔۔۔میں تو وہی کروں گا جو آپ نے مجھے سکھایا ہے۔۔۔میں اس شخص کا ساتھ ضرور دوں گا" وہ چڑ چکا ہوا تھا لیکن بات تحمل سے ہی کر رہا تھا۔وہ اکیلا ہو گیا تھا۔وہاں کوئی بھی اس کے موقف کی حمایت میں نہیں بول رہا تھا۔ابو نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔وہ چاہتے تھے عمر بھی یہی کہے کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے پھر وہ اسے سو فیصد جھوٹا قرار دے کر اس سارے معاملے سے مکمل طور پر قطع تعلق ہو جائیں۔وہ سب بھول جائیں کہ ان کے کسی دور پار کے رشتے دار کا کسی دہشت گردی نیٹ ورک کے ساتھ نام بھی لیا جا رہا تھا لیکن وہ عمر کو ایک دم یہ سب نہیں کہہ سکتے تھے۔وہ جب چھوٹا تھا تب بھی ایسے معاملات میں تب تک سکون سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک کہ ان سے بحث کر کے انہیں زچ نہیں کر دیتا تھا۔اولاد جوان

ہو جائے تو باپ کو ٹوکنے کے انداز بدلنے پڑتے ہیں اور وہ تو اب شادی شدہ تھا۔ باپ بننے والا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو تمہارے صرف اس طرح کہہ دینے سے سب مسئلے سلجھ جائیں گے۔۔ فرض کرلو یہ سازش بھی ہے تب بھی وہ عناصر جو اس کو گھڑنے میں اتنی محنت اور وقت برباد کر چکے ہیں وہ آرام سے بیٹھے ہوں گے۔۔۔ تم کہو گے کہ نور محمد معصوم ہے اور وہ تمہیں یہ کہنے دیں گے۔۔۔ احمقوں کی جنت سے باہر آؤ برخوردار۔۔۔ یہ لندن ہے اور ہم یہاں موم کی طرح پگھل کر مٹی میں جذب بھی ہو جائیں تب بھی پاکستانی ہی رہیں گے اور پاکستانیوں کے لئے ان کے دل میں جگہ کافی تنگ ہو رہی ہے۔۔۔ یہاں رہتے ہوئے ہم بھی اسٹیبلشمنٹ کی جنگ سے باہر نہیں نکل سکتے۔۔۔ اس لئے بیوقوفی کی باتیں بند کرو۔ تمہاری ذرا سی لاپروائی سے سارا خاندان مشکل میں پڑ جائیگا۔۔۔ یہ کھا جائیں گے ہمیں۔۔۔ ہم سب اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔۔ اتنی زندگی گزار کر یہاں جو ساکھ بنائی ہے منٹوں میں ختم ہو جائیگی۔۔ کاروبار گھر بار سب لمحہ بھر میں خاک میں مل جائیگا" ابو نے سخت الفاظوں کو محبت بھرے لہجے میں سمو کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ عمر چند لمحے ان کی شکل دیکھتا رہا جیسے زچ ہو رہا ہو پھر سرد لہجے میں بولا

"ابو جب ہم اسٹیبلشمنٹ کی جنگ سے نکل نہیں سکتے تو پھر ہم یہاں رہ کیوں رہے ہیں۔۔۔ یہ اچھا اندیشہ پال لیا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔ ہم لندن میں رہ رہے ہیں اس لئے ہم سچ نہیں بولیں گے۔۔ ہم حق کی مخالفت کریں گے اور ہم برائی کو دیکھیں گے اسے دل میں برا جانیں گے اور پھر آنکھیں نیچی کر کے وہاں سے گزر جائیں گے مگر اس کے خلاف بولیں گے کچھ نہیں کیونکہ اسٹیبلشمنٹ بنیادوں پہ ہمارا استحصال ہوگا۔۔۔ برے الفاظ میں اگر کسی جگہ کا ذکر کرنا مقصود ہوگا تو ہم دل کھول کر صرف پاکستان کی بات کریں گے۔۔۔ پاکستان کو برا کہیں گے کہ ہم وہاں محفوظ نہیں ہیں۔۔ وہاں مسالک کی بنیاد پہ استحصال ہے۔۔ وہاں مساوی حقوق نہیں ہیں۔۔۔ یہاں لندن میں ہمارا جان مال محفوظ ہے۔۔ ہمارا ایمان محفوظ ہے۔۔۔ حد ہوگئی ابو۔۔۔ مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب۔۔۔ ایمان کا اس قدر کمزور درجہ مجھے قبول نہیں۔۔۔ میں غلط کو غلط نا کہوں تو مجھے کتنے دن نیند نہیں آتی۔۔۔ میں کیا کروں ۔۔ مجھ سے یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ ایک شخص جو اتفاق سے میرا رشتے دار بھی ہے اور گنہگار بھی نہیں ہے۔۔ اسے اگر میری مدد کی ضرورت ہے تو میں کیوں اس کی مدد نا کروں۔۔ میں تو ضرور کروں گا۔۔ لندن ہو یا لاہور میں حق کو حق ہی کہوں گا۔۔ اللہ کو منہ بھی دکھانا ہے میں نے" شہروز نے بھی اب کی بار اسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔۔ یہ تھا وہ عمر جس کی جذباتیت کے آگے وہ سب خود کو بے بس محسوس کیا کرتے تھے

"اللہ کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو۔۔۔ اللہ نے تو کہا ہے کہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل کرو۔۔ میں تمہیں روک رہی ہوں۔۔ تمہارے ابو تمہیں روک رہے ہیں تو پھر سمجھ کیوں نہیں جاتے تم۔۔۔ اتنے نافرمان کیوں ہو جاتے ہو تم۔۔۔ یہ تو نہیں سکھایا تھا میں نے تمہیں"

ممی اب بے حد برامان چکی تھیں اور ان کا لہجہ سخت ناراضی ظاہر کر رہا تھا۔ عمر نے بے چین ہو کر ان کی طرف دیکھا

"ممی اللہ درمیان سے نکلتا ہی کب ہے۔۔۔ اسی لئے تو میں چاہتا ہوں کہ ہم حق کا ساتھ دیں۔۔۔ ہم سب۔۔ تا کہ اللہ کے سامنے سرخرو ہو سکیں ۔۔۔ آپ ہی نے تو سکھایا تھا کہ حق کا ساتھ ہمیشہ دل کھول کر بے خوف ہو کر دو۔۔۔ یہ سبق پڑھا کر بھی ہمیشہ آپ ہمیں ڈراتی ہی رہی ہیں۔۔۔ یہ غلط ہے ممی۔۔۔ آپ ہی کہتی تھیں نا کہ سکول میں کسی کا کھانا شیئر مت کرنا۔ کہیں کوئی حرام لقمہ نا بدن میں چلا جائے۔۔۔ حرام لقمہ بدن میں جائیگا تو سچ بولنے کی طاقت ختم ہو جائیگی۔۔۔ ساری زندگی حرام کے خوف سے بہت سی حلال چیزیں بھی اتنی احتیاط سے کی ہیں۔۔ صرف اس لئے کہ حق اور باطل کا فرق نا

بھول جائے۔۔۔اس لئے جب کوئی یہ کہتا ہے نا کہ حق کا ساتھ نا دو تو پھر اچھا نہیں لگتا۔۔طبیعت بے چین ہونے لگتی ہے۔۔سانس اکھڑنے لگتی ہے ۔۔۔یہ اگر میری جذباتیت ہے تو آئی ایم سوری ممی یہ مجھے بہت عزیز ہے" وہ چپ ہو گیا تھا اور باقی سب لوگ بھی۔۔۔

" میں مانتا ہوں تم حق کے ساتھ ہو۔۔میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ نور محمد معصوم اور بے گناہ ہے۔۔اس کے باوجود اس بات کو دبا دینا بہتر ہے میرے بچے۔۔۔ہم بہت چھوٹے، بہت ادنیٰ لوگ ہیں اور یہ سازش بہت بڑی معلوم ہو رہی ہے۔۔ہم ان عناصر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔۔ہماری اگلی پچھلی نسلیں مصیبت میں آجائیں گی۔۔۔ہمارا موقف بھی سمجھنے کی کوشش کرو" ابو اس کے انداز سے پسیج کر بولے تھے۔وہ واقعی غلط تو نہیں کہہ رہا تھا بچپن سے اسے ایک ہی بات تو سکھائی تھی انہوں نے کہ حق کتنا بھی خوفناک کیوں نا لگے۔۔وہ حق ہوتا ہے اور حق ہی انسانی فطرت ہے اور حق ہی اللہ کو مرغوب ہے اور بالآخر حق ہی فاتح اعظم ٹھہرتا ہے۔

" عمر! مجھے ہولاؤ مت۔۔۔ختم کرو بس اب۔۔۔تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں اپنی اولاد کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتی۔۔پتا نہیں کس سے مل کر آگئے ہو۔۔کون لوگ ہیں۔۔ہمیں نہیں پڑنا کسی ایسے ویسے مسئلے میں۔۔۔ہم میں سے کوئی تمہیں اس حماقت کی اجازت نہیں دے سکتا۔۔بھول جاؤ نور محمد کو۔۔" ممی نے عاجز ہو کر کہا تھا۔

" میں نہیں بھول سکتا ممی۔۔۔مجھ سے بھولا نہیں جائیگا۔۔" عمر بھی ان لوگوں کے انداز سے خائف ہو رہا تھا

" ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں عمر۔۔۔بھول جاؤ نور محمد کو۔۔" یہ امائمہ کی آواز تھی۔وہ ان لوگوں کی بلند آوازیں سن کر زیادہ دیر کمرے میں لیٹی نہیں رہ سکی تھی۔اس لئے اٹھ کر چلی آئی تھی۔دل تو بوجھل تھا اور فی الوقت کوئی دوسری سوچ بھی ذہن میں نہیں تھی لیکن اس نے ساس سسر کی ساری باتیں سنی تھیں اور کہیں نا کہیں اسے بھی ان باتوں سے اتفاق تھا۔

" امائمہ تم تو ایسے مت کہو" عمر کو اس کی مداخلت ذرا نہیں بھائی

" تم سمجھنے کی کوشش کرو عمر۔۔معاملہ واقعی اتنا الجھا ہوا ہے کہ ہم سب کا اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔۔۔یہ ایک خاندان کا نہیں۔۔نسلوں کا معاملہ ہے۔۔۔ہم کس کس کو سمجھائیں گے کہ نور محمد دہشت گرد نہیں تھا۔۔" وہ ایک ایک قدم اٹھاتی اس کے ساتھ کاؤچ پر آبیٹھی تھی۔عمر نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔ممی اسے فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔انہیں اچھا لگا تھا کہ امائمہ بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی

" چلو۔۔تمہاری کمی رہ گئی تھی۔۔۔یا خدا پہلے تم سب لوگ خود کو تو سمجھا لو کہ وہ دہشت گرد نہیں تھا۔۔۔مجھے تو ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے تم سب لوگ خود کو ہی یقین نہیں دلا پا رہے۔۔" امائمہ کے الفاظ نے اسے مزید تاؤ دلا دیا تھا

" عمر! پلیز ہوش کے ناخن لو۔۔ہر معاملہ جذباتیت سے حل نہیں ہوتا۔۔ایک نور محمد کی خاطر سارے خاندان کو مصیبت میں نہیں ڈالا جا سکتا ۔۔مجھے یقین ہے وہ دہشت گرد نہیں ہے لیکن وہ جس جگہ پر ہے وہاں دہشت گرد ہی رکھے جاتے ہیں۔۔وہ سٹگمیٹائزڈ ہو چکا ہے۔۔اس کے نام کے ساتھ اب یہ لفظ لگ چکا ہے جسے چاہ کر بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔۔نا ہی کبھی مٹایا جا سکے گا۔۔۔میرا خاندان بھی یہ سب نہیں برداشت کر پائے گا۔۔ہماری آنیوالی نسلیں یہ سب سہہ نہیں پائیں گی۔۔۔اس بات کو یہیں دفن کر دو بس۔۔۔میں پاکستان میں یہی کہہ دوں گی کہ بھائی کا کچھ پتا نہیں چلا۔۔میرے

ماں باپ پہلے ہی بہت کچھ سہہ رہے ہیں لیکن مزید یہ سب نہیں سہہ سکتے عمر۔۔۔اولاد کا دکھ انہیں کھا جائے گا" وہ نقاہت کا شکار تھی مگر پھر بھی پوری کوشش کر رہی تھی کہ اپنے شوہر کو وہ بات سمجھا سکے جو اس کے ماں باپ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بہت خوب۔۔۔بہت ہی خوب۔۔۔یہی امید تھی تم سے مجھے۔۔۔اتنے دن سے تم بھائی بھائی کر رہی تھی۔۔اور اب جب کچھ پتا چل گیا ہے تو تمہیں وہی بھائی سنگین ایڈوائزڈ لگنے لگا ہے۔۔۔پہلے بھی تم یہی کہتی آئی ہو کہ میرے ماں باپ بہت لاچار ہیں۔۔اولاد کا دکھ انہیں کھائے جا رہا ہے اور اب جب کہ اسی اولاد کے وزرا اوڈس کا پتا چل گیا ہے تب بھی تم یہی کہہ رہی ہو کہ اولاد کا دکھ تمہارے ماں باپ کو کھا جائے گا۔۔۔مجھے آپ سب لوگوں پر حیرت ہو رہی ہے۔۔۔آپ لوگ تقریر میں اتنی بڑی بڑی کرتے ہو اور اب جب عمل کا وقت آیا ہے تو سب نصیحتیں کرنے لگے ہیں۔۔دراصل یہی ہمارا قومی رویہ ہے۔۔انسان ہوں۔۔رشتے یا آپ کا اپنا ملک۔۔۔اسے صرف تب اون کرنا ہے جب وہ کامیاب ہے۔۔طاقتور ہے۔۔۔مستحکم ہے۔۔۔اگر وہ ناکام کمزور یا غیر مستحکم ہے تو اسے لگ آؤٹ کر دو۔۔ڈس اون کر دو۔۔۔زندگی سے نکال دو۔۔۔اور اسے "ذلت" کی طرح پہلو میں چھپا کر رکھ لو۔۔۔معاف کیجئے گا آپ سب لوگ۔۔۔میں ایسا نہیں ہوں اور میں کبھی ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔۔۔آپ میں سے کوئی بھی نور محمد کا ساتھ نا دے لیکن اب میں اس کا ساتھ ضرور دوں گا۔۔۔یہ اب میرے لئے حق اور باطل کی لڑائی ہے اور میں حق کو پہچانتا ہوں۔۔۔۔یہ بحث و مباحثہ میری طرف سے یہاں ختم ہوتا ہے"

اس نے اتنا کہا تھا پھر ان میں سے کسی کی جانب دیکھے بنا وہاں سے اٹھ کر چل دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کھانا تیار ہے ملکہ عالیہ؟" یہ سوال تھا جو اس نے امی کے عقب میں ان کے کندھے کو انگلی سے بجاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں تمہارا پسندیدہ مٹر پلاؤ اور شامی کباب۔۔" وہ مسکرائی تھیں۔

"کتنی دیر ہے؟" اسے زیادہ ہی بھوک لگ رہی تھی

"پانچ منٹ بس۔۔۔چاول دم دیے ہیں اور کباب تلنے لگی ہوں۔۔تم ذرا زارا کو تو فون کرو۔۔۔اگر فارغ ہو گئی ہے تو ہمارے ساتھ کھانا کھالے۔۔بیچاری چھٹی والے دن بھی یہاں خوار ہوتی رہتی ہے۔۔میں نے ایس ایم ایس کیا تھا پر اس کا جواب نہیں آیا" انہوں نے فرائنگ پین دوسرے چولہے پر رکھتے ہوئے بنا اس کی جانب دیکھے کہا تھا۔اس نے شلف پر پڑی سلاد کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے ان کی جانب ناپسندیدگی سے دیکھا

"آپ اپنے خلوص کا اس قدر بے دریغ استعمال بھی مت کیا کریں کہ لوگ عاجز ہی آ جائیں۔۔۔کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو فون کرنے کی" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا تھا۔وہ آجکل دوپہر کے وقت ہی اٹھتا تھا تو ناشتے کی بجائے کھانا ہی کھا لیتا تھا

"اوہو۔۔ایک تو تم اپنی ماں کی ماں بنے رہا کرو۔۔۔نہیں آتے لوگ عاجز۔۔تم کال تو کرو" وہ چڑ کر بولی تھیں۔ان کے ہاتھ تیزی سے انڈا پھینٹ رہے تھے۔اس عمر میں بھی ان کی پھرتی قابلِ داد تھی

"ہمارا کام تھا ڈاکٹر زارا کی مدد کرنا۔۔وہ ہم کر چکے۔۔اب اس کو خود اپنے مسئلے مسائل حل کرنے دیں۔۔یہ نا ہو کہ وہ آپ کی روز روز کی دعوتوں سے تنگ آ جائے"

"ارے کھانے کا وقت ہے۔۔۔ مہمان کی موجودگی باعث رحمت ہوتی ہے۔۔۔ میں کون سا سر دبوانے کے لئے بلواری ہوں اسے"

"نا کریں امی۔۔ نا کریں۔۔ لوگ آپ کو وہ کہنے لگیں گے" وہ کاجر کتر رہا تھا

"کیا کہنے لگیں گے۔۔؟" انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا تھا پھر چونکہ کباب فرائنگ پین میں ڈال چکی تھیں اس لئے فوراً ہی توجہ اس طرف مبذول کرلی ورنہ اس کے چہرے کی شرارتی مسکراہٹ ضرور دیکھ لیتیں۔

"وہی جو گول گول سا ہوتا ہے۔۔ باہر سے سبز سبز اندر سے سفید سفید۔" وہ مسکراہٹ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔

"کیا بک رہے ہو۔۔ سفید سفید۔ سبز سبز۔۔ پاکستان کا پرچم۔۔؟" انہوں نے شاید جملے کا آخری حصہ ہی سنا تھا۔ سلمان نے قہقہہ لگایا

"نہیں وہ جو چپچپا سا ہوتا ہے۔۔ لیس دار۔۔۔ جس کا اچار ڈالتے ہیں۔" اس نے جملہ مکمل کر کے منہ میں کھیرا رکھ لیا تھا۔ امی کا سارا دھیان کبابوں کو سنہری رنگت میں رنگنے کی جانب مبذول تھا اس لئے ایک ساعت تو وہ واقعی نہیں سمجھی تھیں پھر جب سمجھ گئیں تو بڑا برا سا منہ بنایا

"شرم تو نہیں آتی ماں کو لسوڑا کہتے ہوئے" سلمان نے پھر قہقہہ لگایا

"میں کب لسوڑا کہہ رہا ہوں آپ کو۔۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ اپنا خلوص آنے کے بھاؤ لٹاتی رہیں گی تو لوگ خدانخواستہ۔۔ میرے منہ میں خاک۔۔ آپ کو کہہ سکتے ہیں۔۔ لسوڑا" سارا زور آخری لفظ پر دیتے ہوئے اس نے جملہ مکمل کیا تھا

"برخوردار خلوص کا بھاؤ تو آٹے بھی نہیں ہوتا۔۔ یہ تو ہے ہی لٹانے کی چیز۔۔ جتنا لٹاؤں گی اتنا ہی واپس پاؤں گی۔۔ ہاتھ والا نلکا دیکھا ہے نا۔۔ یہ خلوص بالکل ہاتھ والے نلکے کی طرح ہوتا ہے۔۔ جتنی طاقت سے چلاؤ گے،، اتنا پانی آئے گا" انہوں نے کباب پلیٹ میں منتقل کئے تھے۔

"امی کھانا دیں گی یا لیکچر سے پیٹ بھرنا پڑے گا" وہ مڑ کر بولا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس امی کی بات کا جواب نہیں ہے سو لاجواب ہو کر وہ ہمیشہ یہی انداز اپناتا تھا۔

"کھانا تیار سمجھو۔ تم فون تو کرو" انہوں نے وہی بات دوہرائی جو سلمان سننا نہیں چاہ رہا تھا

"امی میں فون وون نہیں کر رہا۔ اتنی بھوک لگی ہوئی ہے اور آپ کو خلوص کا دورہ پڑ گیا ہے۔۔ آئیں کھانا کھاتے ہیں۔۔ آپ پلیٹ بنا دیں۔۔ میں کھانا کھا کر دے آؤں گا ڈاکٹر صاحبہ کو" وہ مزید چڑ گیا تھا۔ امی نے کباب اور رائتہ میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب ناپسندیدگی سے دیکھا لیکن کہاں کچھ نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ بھوک فی الحال اس کے حواسوں پر سوار ہے۔ تمام لوازمات میز پر سجا کر وہ خود بھی بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے بیٹھتے ہی وہ پلیٹ میں چاول نکالنے لگا۔ امی نے بھی گلاس میں پانی بھرا پھر اس کا رغبت بھرا انداز دیکھ کر شفقت سے مسکرائیں لیکن کہا کچھ نہیں بلکہ خاموشی سے پہلے اس کی پلیٹ میں رائتہ ڈالا پھر کباب بھی رکھ دیا۔ اسے شوق سے کھاتا دیکھ کر مطمئن ہوگئی تھیں اسی لئے اپنے لئے چاول نکالتے ہوئے بھی اسے کسی بات پر مخاطب کیا نا ٹوکا۔ کچھ دیر خاموشی سے دونوں ماں بیٹا کھانے میں مگن رہے پھر جب اس نے پہلا کباب ختم کر کے دوسرا کباب بھی خود اٹھا کر پلیٹ میں رکھ لیا تو امی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر ٹھٹک کر رکیں اور کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے باہر والا گیٹ کسی نے کھولا ہو۔ پڑوس والوں کی بیاہتہ بیٹی آئی ہوئی تھی تو اس کے بچے اکثر کھیلنے کے لئے دوپہر کو آجایا کرتے تھے لیکن جب کھڑکی سے کوئی نظر نہیں آیا تو پھر سر

جھٹک کر اس کی جانب دیکھا

"تم زارا سے کب بات کرو گے؟"

"کون سی بات۔۔؟" اس نے ناسمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے آجکل اپنے پراجیکٹ کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"آمنہ کی بات" امی جتا کر بولیں

"آمنہ کی بات زارا سے کیوں کروں گا امی؟" اسے امی کی باتوں سے زیادہ فی الوقت چاولوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی

"ڈرامے کرنا بند کرو۔۔میں شادی کی بات کر رہی ہوں" امی نے اس کی پلیٹ میں بلا ضرورت مزید چاول نکالے کہیں وہ اٹھ کر چلا نا جائے۔

"میں زارا کی شادی کی بات آمنہ سے کروں۔۔ یا آمنہ کی شادی کی بات زارا سے کروں۔۔کس کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔زارا کی شادی ہو رہی ہے؟۔۔اس نے بتایا آپ کو۔۔؟" وہ آخری بات پر چونکا تھا۔ امی نے اپنے تئیں اس کی چوری پکڑی پھر مسکرائیں

"تم سب کو چھوڑو۔۔صرف اپنی شادی کی بات کرو"

"ماشاء اللہ یعنی اب آپ کی بورنگ باتیں بھی برداشت کرنا پڑیں گی۔۔۔اچھا کھانا کھلانے کی یہی سزا دیتی ہیں آپ ہمیشہ" وہ گہری سانس بھر کر بولا تھا۔

"میں سنجیدہ ہوں" امی نے اسے گھورا تھا

"میں سلمان حیدر ہوں۔۔۔سنجیدہ بیگم آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔۔۔کھانا کھائیے نا" وہ ان کی سنجیدہ بات کو واقعی غیر سنجیدہ انداز میں اڑا رہا تھا۔ امی چند ساعتوں تک تو خاموشی سے اسکی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں پھر سمجھ گئیں تو اس کے کندھے پر چپت رسید کر کے بولیں

"تم مان کیوں نہیں جاتے کہ تم زارا کو پسند کرتے ہو؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔۔۔اچھی لڑکی ہے تب ہی تو ہمارے شناساؤں میں شامل ہے۔۔اچھی ہے تب ہی تو آپ سے ملوایا ہے۔۔اچھی ہے تب ہی تو آپ کو کھانے کے وقت پر یاد آجاتی ہے" وہ مٹر کا ایک ایک دانہ منہ میں رکھتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔ امی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ انہیں ہمیشہ کی طرح ٹال رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔۔میں خود ہی زارا سے بات کروں گی" انہوں نے گویا دھمکی دی تھی

"یہ ہمارے گھر کی ہر بات میں زارا کا ذکر کیوں آجاتا ہے؟" اس نے چمچ پلیٹ میں رکھ دی تھی۔ پلیٹ میں ابھی بھی چاول موجود تھے

"یہ سماجی اصول ہے بیٹا۔۔پہلے لڑکی کا ذکر گھر میں آتا ہے۔۔۔پوری لڑکی اس کے بعد ہی گھر آتی ہے۔" سلمان نے ان کی بات پر اب کی بات بغور ان کی جانب دیکھا پھر کچھ دیر دیکھتا ہی رہا

"امی۔۔۔آپ بہت ذہین وفطین ہیں۔۔۔لیکن رمضان کا چاند رجب میں دیکھنے کی کوشش نا کریں۔۔۔میں آپ کو آخری بار کہہ رہا ہوں

۔۔۔آپ غلط سوچ رہی ہیں" وہ مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا تھا۔اس کا انداز دوٹوک تھا سوامی چند لمحے کے لئے چپ ہی ہو گئیں اور کچھ لمحے تذبذب کے عالم میں اسے سنک کے پاس کھڑا ہاتھ دھوتا دیکھتی رہیں۔وہ جو کہہ رہا تھا انہیں سمجھ میں تو آ گیا تھا لیکن وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں۔بیٹے کی یہ حرکتیں انہیں تاؤ دلاتی تھیں۔وہ کچھ لمحے اس کی پشت کی جانب دیکھتی رہیں پھر کہنے کے لئے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چڑ کر اپنی پلیٹ کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں

"میں اگر غلط سوچ رہی ہوں نا تو تم غلط کر رہے ہو ٹچو۔۔۔ایک ماں کے دل کے ساتھ کھیل رہے ہو۔۔۔اللہ پوچھے گا تمہیں"

"مدعو بالا نا بنیں۔۔۔کھانا کھائیں۔۔۔پھر چائے پلواتا ہوں آپ کو اپنے ہاتھ کی" وہ مسکراتا ہوا اس پین اٹھانے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔اب تم سے اس متعلق کوئی بات نہیں ہو گی۔۔میں خود ہی زارا سے بات کروں گی اور اسے بتا دوں گی کہ وہی" آمنہ" ہے" ان کا انداز دوٹوک تھا۔سلمان کچھ نہیں بولا تھا اور ان دونوں کو پتا نہیں چلا تھا کہ کوئی گیٹ تک آ کر دوبارہ واپس چلا گیا تھا۔



"اتنی بے مروتی بھی اچھی نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحبہ!" سلمان نے دروازے سے اندر آتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایلومینیم فوائل سے ڈھکا ہوا پارسل تھا۔زارا نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔اس کا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔وہ جو باتیں ان دونوں ماں بیٹے کو کرتا سن کر آئی تھی ان سب نے اسے بے حد الجھا دیا تھا۔آنٹی نے اسے انسسٹ کیا تھا کہ وہ کھانا ان کے ساتھ کھائے۔یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔جب سے وہ یہاں آنا شروع ہوئی تھی اتوار کو کھانا ان کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ایک بار وہ اپنے گھر کے خانساماں سے بھی فرائیڈ رائس بنوا کر لے گئی تھی لیکن رافعہ آنٹی نے اس بات کا سخت برا منایا تھا۔اس کے بعد سے وہ کچھ بھی نہیں لے کر گئی تھی۔اس کے لئے آنٹی رافعہ اب ایک سہیلی کی طرح تھیں۔ان کے درمیان کافی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔اسی لئے جب ان کے گھر کا گیٹ کھلا ملا تو اس نے اطلاعی گھنٹی بجانے کا تکلف نہیں کیا تھا بلکہ گیٹ کھول کر اندر چلی گئی تھی اور تب ہی برآمدے میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے ان دونوں کی باتوں آوازوں نے اسے لاشعوری طور پر باہر ہی رک جانے پر مجبور کیا تھا۔وہ اسی کا ذکر کر رہے تھے

"تم زارا سے کب بات کرو گے؟" وہ جانے کس متعلق بات کر رہی تھیں لیکن اس کا ذکر ہو رہا تھا۔وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی اور پھر اسے سمجھنے میں چند لمحے ہی لگے تھے کہ آنٹی رافعہ دراصل اپنے بیٹے سے کیا بات کر رہی تھیں۔وہ ان دونوں ماں بیٹے کی انتہائی ذاتی گفتگو تھی لیکن اس کے لئے یہ دھچکا بہت بڑا تھا کہ آنٹی کو اسے پہلی بار دیکھ کر جو غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ" آمنہ" ہے وہ دراصل غلط فہمی نہیں تھی۔کیا ٹچو اسے ہی" آمنہ" کہتا تھا۔اس سوال نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔وہ اچھا انسان تھا۔وہ دل سے اسکی قدر کرتی تھی۔اسکی عزت کرتی تھی لیکن محبت والا معاملہ دور دور تک نہیں تھا۔اس نے اسے شہروز کے متعلق ایک ایک بات بتا رکھی تھی۔وہ اس کی اور شہروز کی وابستگی اور رشتے سے متعلق مکمل واقفیت رکھتا تھا تو پھر اسے یہ حق نہیں تھا کہ وہ اس کے متعلق اپنی امی کو کسی قسم کی کوئی آس دلاتا یا کسی غلط فہمی کا شکار ہوتا یا پھر اپنے دل میں ایسی کوئی امید پالتا کہ ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی ایسی وابستگی پیدا ہو سکتی ہے۔زارا کو اس ساری صورتحال سے انتہائی الجھن ہونے لگی تھی۔ٹچو کے دل میں اگر اس کے لئے ایسی کوئی

پسندیدگی تھی تو یہ بہت عجیب اور الجھا دینے والی بات تھی اور نجانے یہ پسندیدگی پیدا کب ہوئی تھی۔ وہ تو شہروز کے متعلق ہر بات اتنے کھلے الفاظ میں اسے بتاتی آئی تھی حتیٰ کہ اس نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہے کہ شہروز کو امائمہ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر جیلس بھی ہوتی ہے۔

"میری پیاری امی نے آپ کے لئے کھانا بھیجا ہے۔۔۔اور میری امی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔۔" اس نے پارسل اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا اور تب ہی شاید اس نے زارا کے چہرے کو بغور دیکھا تھا جہاں دنیا بھر کا اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ تین بجے وہ کلینک بند کر دیا کرتے تھے اس لئے اس کے ساتھ آنے والی دونوں نرسز بھی جا چکی تھیں۔

"کیا ہوا۔ تمہارے چہرے پر زوال کا وقت کیوں ٹھہرا ہوا ہے؟" اس نے اپنے مخصوص غیر سنجیدہ انداز میں سوال کیا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ بولے بھی تو کیا۔۔۔وہ واقعی بہت الجھ چکی تھی۔

"زو۔۔۔مجھے اس وقت کو بدلنے کا طریقہ آتا ہے۔۔۔ایک مسکراہٹ ہر مشکل وقت کو ٹال دیتی ہے۔۔ مسکراؤ بی بی زارا!" وہ ایسا ہی تھا ،اسی طرح کی بے سروپا باتیں کرتا تھا لیکن آج سے پہلے اس کی باتیں زارا کو بری نہیں لگی تھیں۔ وہ مسکرانا تو دور کی بات ،اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ سلمان کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا

"تمہاری مسکراہٹ کا پاس ورڈ آتا ہے مجھے۔۔۔زو" اس نے اتنا کہا پھر میز پر پڑے ایک چھوٹے سے سٹینڈ سے چٹ اٹھا کر اس پر لکھنا S.H.A.H.R.O.Z. شروع کیا تھا۔۔۔"

"وہ شہروز کے نام کے اسپیلنگ لکھ رہا تھا۔ اسپیلنگ لکھنے کے بعد اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا تھا پھر با آواز بلند بولا تھا۔۔۔

"اینٹر" زارا نے اسے یہ سب حرف لکھتے اور با آواز بلند پڑھتے دیکھا اور سنا تھا۔ وہ پھر بھی مسکرا نہیں پائی تھی۔

"اوہو۔۔ پاس ورڈ چینج کر لیا گیا۔۔۔اور بتایا بھی نہیں" اس کا ساکت وجامد چہرہ دیکھ کر وہ مزید چڑا رہا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا" وہ یکدم بولی تھی۔ اس کا لہجہ خاصا جارحانہ جبکہ سلمان کا انداز کافی پرخلوص تھا

"اللہ نا کرے کہ کبھی ایسا ہو۔" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔ زارا اس کی جانب مڑی پھر بے ڈھنگے پن سے پوچھنے لگی

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔بے حد" اس نے بھی ترت جواب دیا تھا۔ زارا کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔



زارا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ اس سے کتنی بھی بے تکلف سہی لیکن یہ معاملہ اور نوعیت کا تھا۔ اس میں مذاق کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے اعتراف نے زارا کے وجود کو مزید سرد کر دیا تھا۔ یہ سب جو ہو رہا تھا۔ اس کے اعصاب کے لئے بہت بھاری تھا

"آپ کو نہیں کرنی چاہیئے تھی محبت مجھ سے۔۔۔آپ جانتے تھے میں شہروز سے محبت کرتی ہوں اور میں اسی سے محبت کرتی رہوں گی۔۔۔میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے اور نا کبھی ہوگی۔ میں اگر شہروز کے متعلق آپ سے شکوے شکایات کرتی رہتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن میں میرے متعلق کچھ بھی سوچتے رہیں" ۔ وہ سخت برا مان کر بولی تھی۔ اب کی بار اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ وہ دل ہی دل میں سخت پچھتا رہی تھی کہ وہ اس شخص سے شہروز کی شکائتیں کیوں کرتی رہی تھی۔ اسے نہیں کرنی چاہیئے تھیں جبکہ سلمان اس کے چہرے کے تاثرات کو پرکھتا ہوا سنبھلا تھا اور پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ بات مجھے پتا ہے محترمہ۔۔۔اس انکشاف کی کیا ضرورت پیش آ گئی آپ کو اس وقت" وہ بھی اب سنجیدہ ہو چلا تھا۔ زارا نے اتنا سنجیدہ اسے پہلے کم ہی دیکھا تھا۔

"آپ مجھے پاگل مت بنائیں۔۔۔آپ نے ابھی کہا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔اور ابھی آپ اس بات سے انکار کر رہے ہیں" وہ عادت کے مطابق چڑ کر بولی تھی۔

"انکار۔۔۔؟۔۔۔انکار کس الو کے پٹھے نے کیا ہے۔۔۔میں کہہ رہا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں" وہ اسی کے انداز میں بولا تھا پھر اس کے الجھے ہوئے انداز سے خود بھی الجھتا ہوا بولا ۔

"انسانوں کو پرکھنے میں جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے زارا بی بی۔۔۔۔مرد اگر بے تکلفی سے بات کرتا ہے تو یقین کرو یہ اس کی محبت نہیں ہوتی۔۔۔یہ اس کی عادت بھی ہو سکتی ہے۔۔۔اور میں تو فطرتاً محبت کرنے والا انسان ہوں۔۔۔انسانوں سے محبت میری گھٹی میں ہے۔۔۔محبت میری عادت ہے۔۔۔یقین کرو میں عادتاً محبت کرتا ہوں۔۔۔نہیں جانتا اچھا کیا ہے۔ برا کیا ہے لیکن میرے ماں باپ نے مجھے یہی سب سکھا کر پروان چڑھایا ہے کہ انسان سے محبت کرو۔۔۔بے غرض بے لوث محبت۔۔۔محبت ہماری خاندانی صفت ہے۔۔۔نفع نقصان تو تجارت سے مشروط ہوتا ہے۔۔۔ہمارے لئے محبت اس سے ذرا اوپر کی چیز رہی ہے۔۔۔میرے لئے محبت ایک درویشی سا جذبہ ہے۔۔۔ہم "محبت" کو غلاظت کی عینک لگا کر نہیں دیکھتے" ۔ وہ اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر اپنی طرف سے وضاحت دے رہا تھا۔

"آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فرشتہ ہیں۔۔۔انسانوں سے بے غرض ہو کر محبت کرتے ہیں" وہ شرمندہ تو ہوئی مگر پھر بھی اس کے انداز سے مرعوب ہوئے بغیر بولی تھی۔ اب کی بار سلمان کو سخت برا لگا اور اس کے چہرے سے اس کی خفگی چھلکنے بھی لگی تھی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ کیا فرشتے انسان سے محبت کرتے ہیں۔۔۔کہیں پڑھا ہے تم نے ایسا۔۔۔کسی کتاب میں۔۔۔کسی حکایت میں۔۔۔؟ فرشتے انسان سے محبت نہیں کرتے۔ فرشتے صرف اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ محبت کرتا ہے انسانوں سے۔۔۔اور میں اللہ کی خا

طرح اس کے انسانوں سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ یہ میرے نبیؐ کا طریق تھا اور میں بس اس کو فالو کرتا ہوں۔۔۔ میں نے کہا تھا نا میں چرواہا ہوں ۔۔۔ میں انسانوں کو ایک جگہ گلے میں متحد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔۔ اور یہ کام محبت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں کرسکتا۔ مجھ سے اس طرح بات کر کے مجھے میری نظر میں شرمندہ مت کرو۔۔ میری نیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ مجھے نہیں پتا میرے کس انداز سے تمہیں میری نیت پر ایسا شک ہوا۔۔۔" وہ تنک تنک کر بول رہا تھا۔ زارا پر ٹھنڈے پانی کی بھری ہوئی بالٹی پڑنے والی صورتحال تھی۔ وہ چند لمحے سر جھکائے اپنی انگلیوں کو مروڑتی رہی۔

"میں نے آپ کی اور آنٹی کی سب باتیں سنیں۔۔۔ آمنہ والی۔۔۔ آنٹی مجھے آمنہ سمجھتی ہیں" وہ شرمندہ تھیں مگر اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرنے سے بھی کترا رہی تھی۔

"واہ رے زارا بی بی آپ کی پھرتیاں۔۔ لاحول ولا۔۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔۔ ماں بیٹے کی گفتگو چھپ کر سنی اور پھر بس سوچنے لگیں الٹا سیدھا۔۔ متنفر ہونے سے پہلے تصدیق تو کر لیتا ہے انسان۔۔۔" وہ خفا تھا۔

"آئی ایم سوری لیکن آپ آنٹی کو آمنہ سے ملوا دیں نا۔۔ وہ مجھے آمنہ سمجھتی ہیں۔۔۔" شرمندگی اور خفت اس کے الفاظ پر بھی غالب تھی۔

"امی کی بات مت کرو۔۔۔ یہ بات ان سے چھپی ہوئی ہو سکتی ہے کہ تم انگیجڈ ہو لیکن میں تو جانتا ہوں" وہ جھنجھلایا ہوا بول رہا تھا

"میں نے کبھی کسی سے نہیں چھپایا۔۔ یہ بات تو میں نے آپ کو سب سے پہلے بتائی تھی" زارا نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا۔ سلمان نے اس کی جانب دیکھا پھر ناک چڑھا کر بولا

"ایکسکیوزمی۔۔ آپ کے بتانے سے بھی پہلے یہ بات میں جانتا تھا محترمہ۔۔۔" وہ رکا پھر جتانے والے انداز میں بولا

"میں بہت پہلے سے جانتا تھا کہ تم اور شہروز منور انگیجڈ ہو"

"آپ شہروز کو پہلے سے جانتے تھے۔۔؟ آپ نے مجھے نہیں بتایا۔۔۔ کیسے۔۔۔ کیسے جانتے تھے آپ شہروز کو" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔۔ سلمان کے منہ سے شہروز کا سرنیم سن کر وہ مزید حیران ہوئی تھی۔ اس نے اسکا مکمل نام کبھی نہیں بتایا تھا۔

"ہماری ایک دلچسپی مشترک ہے" سلمان نے اگلا تھا۔ زارا کی گردن پر چہرہ نہیں تھا بلکہ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اُبھر آیا تھا

"معاف کیجئے گا۔۔ وہ آپ نہیں ہیں۔۔ اس لئے کسی خوش فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔۔" اس نے جتا کر کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"عہد الست" سلمان نے سچ اگلنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔ زارا نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا اس نے یہ لفظ ان کاغذات پر لکھا دیکھا تھا جو ایک بار سلمان ہی کی گاڑی میں اسے ملے تھے اور اس نے انہیں اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا☆☆

☆ ☆ ☆

"یہ عہدِ الست کیا ہے؟" یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی۔ لندن کے ایک علاقے ایلفرڈ کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے شہروز نے اپنے سامنے بیٹھے تیمور نصار سے پوچھا تھا۔

"میرے لئے یہ ایک مشہور ادیب کی آٹو بائیوگرافی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔۔۔ یہ ایک مشہور شخص کی زندگی کی کہانی ہے جو اپنے آخری ایام میں کنورٹ ہو گیا ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی طرح کنورٹ ہو جائے۔۔۔ ان کا اسکول آف تھاٹ ہی یہی ہے۔۔۔ ہر شخص کو اس دائرے میں طوعاً کرہاً کھینچ کھانچ کرلے آنا۔۔۔ جسے یہ "اسلام" سمجھتے ہیں۔ اسی دائرے کو یہ دین کہتے ہیں اور اسے ہی یہ "عہدِ الست" کہتے ہیں" اس نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے سینڈوچ کا ایک بڑا سا لقمہ لیا تھا۔ وہ بہت بے ڈھنگے انداز میں کھا رہا تھا۔ بڑے بڑے لقمے اور عجلت بھرا انداز شہروز کو سخت ناگوار گزر رہے تھے۔ شہروز نے عمر سے ہونے والی طویل بحث کے بعد رات کافی تاخیر سے اسے ٹیکسٹ کر کے ملنے کے لئے کہا تھا اور وہ اگلی ہی صبح برنچ کرنے لوٹن سے ایلفرڈ آگیا تھا۔ وہ "زین العابدین" نہیں تھا اسی لئے وہ پہلی ملاقات والے زین العابدین سے بہت مختلف تھا۔ لوٹن میں وہ ایک تھکا ہوا لاچار ضرورت مند آدمی نظر آتا تھا جبکہ اب شہروز کے سامنے وہ کارپوریٹ کلچر کے ایک نمائندے کے روپ میں تھا۔ اس کا تعلق ترکی سے تھا اور وہ چند ایک چھوٹی موٹی جاب کے علاوہ ایک برطانوی شخص کے پاس فارسی مترجم کے طور پر کام کر رہا تھا۔ زبانوں پر اس کا عبور قابلِ رشک تھا۔ وہ ترکی فارسی ہندی اور عربی کے علاوہ فرنچ بھی بول سکتا تھا لیکن اس کی اصل جاب وہی تھی جو شہروز کی تھی۔ وہ مختلف بین الاقوامی چینلز کے علاوہ عوف بن سلمان کے لئے بھی کام کرتا تھا اور فری لانس کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک فوٹوگرافر تھا۔ اور اسی لئے وہ بھی اس ڈاکیومینٹری کا حصہ تھا۔ اس کے ساتھ چند منٹ گزار کر ہی شہروز مایوس ہوا تھا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس شخص کی واحد خصوصیت اس کی مختلف زبانیں بولنے کی صلاحیت ہے ورنہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہ چھوٹا سا کیفے ٹیریا ٹائپ کینٹین تھی جہاں اکا دکا سفید فام ٹین ایجر طالبعلم ہی نظر آ رہے تھے تیمور نے خود ہی اس سے اردو میں بات شروع کی تھی سو وہ بھی اردو میں ہی اس سے بات کرنے لگا تھا۔

"میں نور محمد صاحب کے ساتھ کافی مہینوں سے رہ رہا ہوں۔۔ اچھے انسان ہیں۔۔ اس سے بھی زیادہ اچھے رائٹر ہیں۔۔ قدرت نے انہیں الفاظ پر بے پناہ مہارت عطا کی ہے۔۔ الفاظ کی بنیاد پر ہی دوسروں کی سوچ تک بدل کر رکھ سکتے ہیں۔۔۔ وہ اپنے اسی ہنر کا سہارا لے کر مسلم دنیا میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں۔۔ نئے نئے کنورٹ ہوئے ہیں۔۔۔ اس لئے جوش بھی زیادہ ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ان کی نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔۔ یا وہ کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔۔ نہیں وہ ایسے انسان ہی نہیں ہیں۔۔۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔۔ تو۔ لینے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔۔۔ میں نے ایک بار اپنے متعلق جو کہانی سنا دی کہ میں مجبور غریب انسان ہوں۔۔ جس کے پاس رہائش نہیں ہے۔۔ جس کا تعلق ایک غریب ملک سے ہے،، جس کا خاندان بہت بڑا ہے۔۔۔ اسی پر یقین کر کے بیٹھے ہیں۔۔ کبھی بلاوجہ کے سوالات نہیں کرتے۔۔ کمرے کی یا میری چیزوں کی چیکنگ نہیں کرتے۔۔۔ مالی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔۔ ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھے انسان میں ہونی چاہئیں۔۔ اس لئے میں انہیں دل سے پسند کرتا ہوں۔ میرا ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں ہے" وہ اپنی دھن میں مگن مسلسل بول رہا تھا۔ شہروز کو اسکی وضاحت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

"ہمارے درمیان اختلاف کا بس ایک ہی پہلو ہے۔۔۔وہ ہر شخص کو ریڈیکلائز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کا بس نہیں چلتا کہ سب کی داڑھیاں رکھوا کر سر پر امامے بندھوا دیں اور انہیں جہاد کے لئے بھیج دیں۔۔۔عورتوں کو گھروں کی مخلوق قرار دے کر انہیں محصور کر کے ایسے رکھ دیں جیسے بالٹیاں باتھ روموں میں رکھی جاتی ہیں۔۔۔یعنی اگر ڈرائنگ روم میں یا گھر کے کسی دوسرے حصے میں نظر آئیں تو اوڈ لگیں گی۔۔نامناسب تحقیر آمیز۔۔۔میں اس سوچ سے سخت چڑتا ہوں" وہ مقام جب شہروز اسے بائے کہہ کر اٹھنا چاہتا تھا۔اس نے بالا آخر ایک کام کی بات کہہ ڈالی۔

"ہمم۔۔۔" شہروز نے ہنکارا بھرا۔

"کیا واقعی۔۔ان کی سوچ اس قدر ریڈیکلائزڈ ہے۔۔؟" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔اسے تیمور کی ہر بات سے اتفاق نہیں تھا۔اس کا ذاتی خیال تھا کہ نور محمد کنورٹ ہونے کے باوجود ابھی بھی کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔

"اس سے بھی بڑھ کر۔۔۔لیکن ان کی غلطی نہیں ہے۔۔انہوں نے اسلام کی جو شکل دیکھی ہے وہ ایسی ہی ہے۔۔۔وہ تبلیغیوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔۔۔ایسے لوگ جو اسلام کو پابندیوں کا مذہب سمجھتے ہیں۔۔تنگ نظری ان کی سوچ ہی نہیں خون میں بھی رچی بسی ہوئی ہے۔میوزک الکحل عورت لباس حرام حلال۔۔۔ان کے یہاں ہر معاملہ تنگ نظری کا شکار ہے۔۔۔وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ یہ سب چیزیں کلچرل ویلیوز ہیں۔۔ان کا تعلق مذہب سے بے نا ہو سکتا ہے۔۔۔مذہب اسلام سے تو قطعاً نہیں ہو سکتا۔۔میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔۔میرے ماں باپ مسلمان ہیں۔۔میرا ماننا ہے کہ اسلام جیسا جدید مذہب کوئی نہیں۔۔ یہاں تنگ نظری نہیں ہے۔۔ یہاں ہر معاملے میں لچک ہے۔۔دواؤں میں ایک عنصر کے طور پہ علاج کی غرض سے الکحل استعمال کی جا رہی ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔۔مسلمان مرد اہلِ کتاب غیر اسلامی عورت سے شادی بھی کر سکتا ہے۔۔موسیقی بھی اگر طبیعت میں ہیجان پیدا نہیں کرتی تو اسے سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔۔۔۔عورت اگر سر نہیں ڈھکتی مگر مہذب لباس میں ہے تو پھر اس کو ٹوکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔۔عورت مجسم خوبصورتی ہے اور خوبصورتی کو قید کر کے رکھنا ظلم کے مترادف ہے۔۔وہ اگر بغیر آستینوں کی قمیض پہنتی ہے یا گھٹنوں سے اونچا اسکرٹ پہن لیتی ہے تو یہ اس کی خوبصورتی کو اجاگر کرنے کے لئے ہے۔۔اس میں حرج ہی کیا ہے۔۔وہ مرد کے سکون کے لئے پیدا کی گئی ہے نا کہ پابندیوں میں جکڑ کر گھروں میں محصور رکھنے کے لئے۔۔۔اس کا گھر سے باہر نکل کر مرد کی ذمہ داریاں بانٹنا بھی مرد کے لئے باعث رحمت اور باعث سکون ہی ہے۔۔۔لیکن برادر نور محمد یہ سب نہیں مانتے۔۔۔وہ طالبنائزڈ ہو چکے ہیں اور قصور ان کا بھی نہیں ہے۔۔۔انہیں لوگ ہی ایسے ملے ہیں جن کے عقائد نہایت فنڈامینٹلسٹ ہیں۔۔۔ہر معاملے میں تنگ نظری ان کا وطیرہ بن چکی ہے۔۔آپ مل چکے ہیں ان سے۔۔آپ جانتے ہیں وہ آپ کے جس رشتہ دار سے بے پناہ متاثر ہیں وہ کون ہے۔۔وہ آجکل کہاں ہے۔۔۔وہ سرٹیفائیڈ دہشت گرد ہے؟" شہروز کو لفظ "رشتہ دار" دہشت گرد سے بھی زیادہ برا لگا۔

"کیا واقعی نور محمد "المہاجرون" کے لئے کام کرتا رہا ہے؟" شہروز نے اپنی کیفیت چھپا کر اس کی جانب جھکتے ہوئے راز داری بھرے انداز میں سوال کیا تھا۔اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر استفہامیہ انداز میں بولا۔

"برٹش نور محمد۔۔۔؟" شہروز نے بدقت منہ کا زاویہ برا بنانے سے خود کو روکا۔۔ اسمتھک بنیادوں کو یہاں بھول پانا آسان نہیں تھا
"پاکستانی نور محمد" وہ لفظ پاکستانی پر زور دے کر بولا۔ تیمور نصار نے ناک چڑھائی۔
"پاکستانی کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا میں۔۔۔ان کے بارے میں تو ان کے گھر والے حتمی کچھ نہیں سکتے ۔۔۔معاف کیجئے گا لیکن پاکستانیوں کی سرگرمیاں ایسی ہیں کہ کوئی بھی انہیں شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔۔افغانستان کے بعد یہ دوسری بڑی قوم ہے جو اپنی سوچ میں نہایت ریڈیکل ہے۔۔۔کنزرویٹو ہے۔۔۔آپ کے یہاں ملائیت کا جو نظام رائج ہے وہی اصل تباہی کی جڑ ہے اور یہی نظام اقوامِ عالم کو آپ لوگوں کے متعلق مشکوک کیے ہوئے ہے۔۔۔آپ کے یہاں عبادت گاہوں کو نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔۔مدارس اور مساجد میں اشتعال انگیز تقاریر کر کے دوسری اقوام کے لئے عدم برداشت کا پہلو اجاگر کیا جانا تو بہت عام سی بات ہے۔۔۔پڑھا لکھا طبقہ بھی داڑھی ستر عورت شراب کے متعلق کھل کر بات کرنے کو مذہب کی خلاف ورزی سمجھتا ہے۔۔ستر فیصد پاکستانیوں کی رائے ایک جیسی قدامت پسندانہ سوچ پر مبنی ہے۔۔طالبنائزیشن اور ریڈیکلائزیشن ان کے لئے نیا فینامینن نہیں ہے۔۔سو پاکستانی نور محمد کے بارے میں یہ بات حتمی ہے کہ اس کا کوئی نا کوئی تعلق کسی الٹی سیدھی سرگرمی سے رہا ہوگا۔" وہ شہروز کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں ناپسندیدگی کے تاثرات تھے مگر وہ اس کی بات کو رد بھی نہیں کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا۔
"آپ نے کچھ زیادہ ہی سخت الفاظ استعمال کر لئے۔۔۔یہ سب مغربی پروپیگنڈا ہے۔۔اور کچھ نہیں ورنہ ہم پاکستانی بہت مہذب اور لبرل قوم ہیں" شہروز نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا لیکن اس کی آواز تاثیر سے عاری تھی۔
"نہیں۔۔۔میں معذرت خواہ ہوں کہ میرے الفاظ آپ کو سخت لگے لیکن سچائی کی تلخی ہے۔۔۔یقیناً چبھے گی۔۔آپ لوگ مغربی پروپیگنڈا کے بعد مہذب ہوتے ہیں۔۔اب واقعی صورتحال بہتر ہو رہی ہے۔۔۔ورنہ کتنے ہی واقعات میں آپ کو یہاں بیٹھے بیٹھے انگلیوں پر گنوا سکتا ہوں جب اسلامی جمہوریہ پاکستان میں "اسلام" کے نام پر وہ قتل و غارت ہوا ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔دراصل آپ لوگوں نے خود کو اسلام کا ٹھیکیدار ہی سمجھ لیا ہے۔۔۔رہی سہی کسر اسمتھک پاور نے پوری کر دی۔۔۔گویا قدرت نے گنجے کو ناخن دے ہی ڈالے۔۔۔اب کھجا کھجا کر لہولہان ہی ہوگا نا۔۔" اس نے رک کر ایک بار پھر شہروز کی شکل دیکھی پھر اس کی خفگی محسوس کر کے ہاتھ ہوا میں بلند کر کے بولا۔
"برا مت مانئے برادر۔۔۔میں کسی ملک یا اس کے شہریوں کے خلاف نہیں ہوں۔۔۔بلکہ میں اس سوچ کے خلاف ہوں جو اسلام کے نام پر وہاں پروان چڑھائی جا رہی ہے۔۔میں افغانستان سعودی عرب ایران اور ان جیسے سب ہی ممالک پر تنقید کرتا ہوں۔۔"
"آپ کر سکتے ہیں۔۔۔میں مان لیتا ہوں لیکن اب کام کی بات کریں اور نور محمد کے ناول پر روشنی ڈالیں۔۔۔یہ زیادہ مناسب رہے گا" شہروز نے اس کی باتوں سے اکتا کر ٹوکنا ضروری سمجھا تھا۔ اس نے ناک سکیڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر شہروز کو دیکھا پھر سر ہلایا گویا سمجھ گیا ہو کہ اس کے سامنے بیٹھا شخص برا منا رہا ہے۔
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔جو آپ کو مناسب لگے۔۔لیکن یہ سب بھی ڈسکس کرنا ضروری ہے۔۔میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں

معذرت خواہ ہوں لیکن حقیقت سنیں گے تو برداشت کرنا سیکھیں گے اور برداشت کرنا سیکھیں گے تو اس دنیا میں اپنے مقام کا تعین کر پائیں گے۔۔۔میں آپ کو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نور محمد اور ان کا عہد الست ریڈیکلائزڈ سوچ پر مبنی ایک کاغذات کا پلندہ ہے۔۔میری نظر میں اس لئے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔۔۔آپ بھی اس کی پرواہ نا کریں۔۔۔اور تعصب پسند ہوئے بغیر یکسوئی سے اپنے کام پر دھیان دیں" اب کی بار وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔شہروز کو اس کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگی بلکہ یہ بات اسے سب سے زیادہ بری لگی

"میں اپنے کام پر ہی دھیان دے رہا ہوں لیکن متضاد آراء کو سن کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔۔میں آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔۔ان سے اتفاق کرنا یا نا کرنا میری مرضی پر منحصر ہے مگر میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں تعصب پسند نہیں ہوں اس لئے میں اس بین الاقوامی چینل کے لئے میرٹ پر چنا گیا ہوں۔۔۔میں بھی اس پراجیکٹ کو اپنا سو فیصد دینا چاہتا ہوں۔۔میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا نکتہ جس پر میری اپنی سوچ واضح نا ہو اسے عوام کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی وجہ بنوں" اس نے بہت ہی پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی اور اپنا موقف واضح کر دیا تھا۔اسے اس لمحے ذہنی طاقت کی بہت ضرورت محسوس ہوئی تھی۔وہ اس امر کو ہمیشہ گلوکوز کی طرح استعمال کرتا تھا کہ وہ میرٹ پر چنا گیا ہے۔اس کے لئے خود شناسی خود اعتمادی تھی۔

"ہم سب کی یہی سوچ ہے۔۔یہی مقصد ہے۔۔ہمارا پراجیکٹ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔۔۔پاکستان کے خلاف بھی نہیں ہے۔۔۔میں ترکی میں بھی بسنے والے فنڈامینٹلسٹ پر سخت تنقید کرتا ہوں۔آرٹیکلنگ پر بہت کام کیا ہے میں نے۔۔ہم تو مسلم دنیا کو وہ رخ پیش کرنے والے ہیں جو حقیقی معنی میں بے پناہ خوبصورت ہے۔۔ہمارا کلچر ہماری ویلیوز ہمارے طور طریقے کس قدر جدید ہیں،کس قدر دل موہ لینے والے ہیں۔۔یہ دوسری اقوام کو دکھانے اور باور کروانے کی اشد ضرورت ہے۔۔اس کے لئے ہمیں ان چودہ سو سال پہلے والی دقیانوسی سوچ سے نکلنا ہو گا۔۔یہ وقت کا تقاضا ہے۔ہمیں اپنے وہ اصول جو دوسری اقوام کے لئے نا قابل برداشت ہیں کو بدلنا ہو گا اور ان میں ترمیم کرنی ہو گی۔۔اقوام عالم کے ساتھ تعلقات بنا کر چلنا ہے تو ان کے ساتھ ہم آہنگی کی خاطر ان کی عادات کو اپنانا ہو گا۔۔میں نے اپنے مذہب سے یہی سیکھا ہے کہ جمود معاشروں کو جو ہڑ بنا دیتا ہے۔۔اور یہی میں اپنی آنے والی نئی نسلوں کو سکھاؤں گا۔۔میں اس پراجیکٹ کے ساتھ اسی لئے منسلک ہوں کہ یہ وہ سب کرے گا جو میں بحیثیت مسلمان کرنا چاہتا ہوں۔انشاءاللہ وتعالیٰ۔۔۔ہماری نیت نیک ہے۔۔اور کامیابی ہمیں ضرور ملے گی۔۔۔اس لئے انہیں اپنا کام کرنے دیں اور آپ اپنا کام کریں۔ہمیں اپنی ڈاکیومینٹری ان کے ناول سے پہلے تیار کرنی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنا کام مکمل نیک نیتی سے وقت پر کر لیں گے"

تیمور نسار نے کہا تھا۔شہروز نے سر ہلایا۔اب کی بار اس کے متحکم لہجے نے شہروز کو متاثر کیا تھا۔وہ اس کی اس سوچ کے ساتھ سو فیصد متفق تھا۔

"انشاءاللہ" اس نے بھی کہا تھا



یہ عہد الست کیا ہے؟" اسی روز اور تقریباً اسی وقت جب شہروز ایلفرڈ کے ایک کیفے ٹیریا میں بیٹھا "عہد الست" کے متعلق بات کر رہا تھا۔عمر نے اس سفید فام شخص کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا جس کا نام نور محمد تھا۔اس کے پاس بہت سے سوالات تھے جن کے تسلی بخش جوابات جاننا اس کے لئے بہت ضروری تھا۔اسی لئے وہ لوٹن میں موجود تھا اور اس بار اس نے کسی کو بتانے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔اس نے اپنے باس سے تین گھنٹے کا بریک لیا تھا اور پھر یہاں آ گیا تھا۔اسے کل رات ہونے والی ایک لمبی بحث نے بجھا دیا تھا کہ وہ اگر اس سمندر میں کود ے گا تو اکیلا ہی کودے گا۔کوئی اس کا ساتھ نہیں دے گا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کود کر ہی دم لے گا۔یہ ہی اس کی طبیعت کا وہ رنگ تھا جس کی بناء پر وہ سارے خاندان میں جذباتی مشہور تھا۔وہ عموماً ہر بات پر بھی ضد میں نہیں آ جایا کرتا تھا لیکن جب اسے کسی معاملے میں اپنا آپ حق پر لگتا تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے فیصلوں سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا پاتی تھی۔اس کے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔اس کے ابو نے جب اپنے بھائی کی معاونت سے لندن میں ہوزری کا بزنس شروع کیا اور پاکستان سے ہوزری کا سامان امپورٹ کرنا شروع کیا تو بہروز بھائی کے ایک جاننے والے کسٹم میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ان کی معاونت سے ایکسائز ڈیوٹی پر کافی چھوٹ ملنے لگی تب بھی عمر نے بہت شور ڈالا تھا حالانکہ تب وہ پڑھ رہا تھا لیکن اس نے اپنے ابو اور تایا ابو سے اس بات پر بہت بحث کی تھی کہ وہ ایک ال لیگل کام کر رہے ہیں جو ان کے اپنے ملک کے مفاد میں نہیں ہے اور وہ پاکستان کی خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ سب خرابیاں پاکستانیوں کی خود کی پیداوار ہیں۔تب بھی اسی طرح وہ ایک طرف رہ گیا تھا اور باقی سارا خاندان اسے جذباتی قرار دیتے ہوئے ایک طرف ہو گیا تھا پھر جب اس کی بہن صبا کی شادی ہائی اسکول کے بعد ہی طے کر دی گئی تب بھی اس نے خوب واویلا مچا کر اپنے ابو کی ناراضی مول لی تھی اور اُسے اسی طرح کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس نے انہیں واضح لفظوں میں کہا تھا کہ وہ صبا کی خواہش کے باوجود اسے مزید پڑھنے کی اجازت صرف اس لئے نہیں دے رہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی نا کرلے۔انہیں اللہ سے زیادہ لندن کے آزاد ماحول سے خوف آتا ہے اور اگر انہیں اتنے ہی خدشات ستاتے ہیں تو وہ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔اس طرح کی صورتحال میں اسے ہمیشہ اپنے والدین کے دوغلے پن سے الجھن ہوتی تھی اور وہ واقعی جذباتیت کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔سو اب بھی وہ اکیلا تھا۔تنہا تھا۔لیکن حق پر تھا۔

"عہد الست آپ کے لئے شاید ایک عام سا ناول ہے۔جس میں آپ کے کسی رشتے دار کا ذکر ہے۔کسی دوسرے شخص کے لئے یہ ایک مشہور شخص کی آٹو بائیو گرافی ہو سکتی ہے لیکن میرے لئے یہ ایک عقیدہ ہے۔۔۔ایک سوچ۔زندگی گزارنے کا طریقہ،جسے میں نے ساری زندگی گزار لینے کے بعد سیکھا ہے۔۔اور میں اسی لئے اس پر زور دیتا ہوں اور اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوں" عمر نے دیکھا وہ شخص پہلے سے زیادہ پرعزم دکھائی دیتا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں پہلا اہم سبق یہ سیکھا تھا کہ اپنی فطرت سے غداری نہیں کرنی چاہیئے۔بہت چھوٹی عمر میں میرے گرینڈ پا نے مجھے یہ بات بتا دی تھی کہ فطرت سے بغاوت بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور میری زندگی کا آخری اہم سبق یہ تھا کہ انسان فطرت حنیف پر پیدا کیا

گیا ہے۔۔یعنی دینِ حق کا اقرار اس کی فطرت میں ہے۔انسان اس اقرار سے منہ نہیں موڑ سکتا۔انسان فطرتِ حنیف سے منہ موڑتا ہے تو کل انسانیت کے لئے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔یہی عہد الست ہے اور یہی میری کہانی ہے۔اس کہانی کی بظاہر آپ کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن آپ نور محمد کے رشتہ دار ہیں اور ان کے لئے یہ ناول بہت اہم ہے کیونکہ یہ ان کی بے گناہی کو ثابت کر سکتا ہے۔اسی لئے میری کہانی آپ کے لئے اہم ہو سکتی ہے۔"

"نور محمد سے اتنی محبت کیوں ہے آپ کو۔۔ان سے آپ کی کوئی رشتہ داری تھی نا کوئی گہرے مراسم۔۔وہ آپ سے عمر علم تجربے میں بھی کم تھے آپ کے ان کے تعلقات کی عمر بھی شاید ہی کچھ مہینے رہی ہوگی۔۔اس کے باوجود آپ کے دل میں ان کے لئے اتنی عقیدت سننے میں عجیب سی لگتی ہے۔۔۔ایسی بھی کیا خاص بات ہے ان میں۔۔۔؟" عمر یہ سوال سب سے پہلے پوچھنا چاہتا تھا۔یہ سوال اس کے دل میں بے حد کھلبلی مچا رہا تھا۔فی زمانہ ایک شخص کا دہشت گرد قرار دیا جانا ہی اس سے لاتعلق ہو جانے کے لئے کافی تھا۔وہ امائمہ کا رویہ ہی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اپنے بھائی کے لئے اتنا بے چین رہنے والی امائمہ اب یکدم اس کے وڑ ایاڈز کے تعلق جان کر کیسے نیوٹرل ہو کر ایک طرف بیٹھ بھی گئی تھی تو ایسی کیا الفت تھی اس بوڑھے سفید فام کو اس "نور محمد" سے کہ جو اس کی خاطر ہر قدم اٹھانے کو تیار تھا۔وہ کون سا جذبہ تھا جو اس سارے عمل کے پیچھے کارفرما تھا۔انہوں نے اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔

"یہ سوال پہلے بھی کسی نے پوچھا تھا اور اسی انداز میں پوچھا تھا۔۔آپ لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ نور محمد ہی کیوں اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ۔۔نور محمد کیوں نہیں۔۔؟وہ اگرچہ ایک عام سا انسان ہی ہے۔۔لیکن "خاص" ہونے سے پہلے ہر انسان "عام" ہی ہوا کرتا ہے۔۔۔بظاہر دنیاوی لحاظ سے ان میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔۔آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ آیا وہ پھونک مار کر ٹوپی میں سے خرگوش نکال سکتے تھے یا آبرا کاڈابرا قسم کا کوئی منتر پڑھ کر انسان غائب کر سکتے تھے۔۔۔ایسا کچھ نہیں ہے میرے دوست۔۔۔مجھے اس کا تقویٰ پسند ہے۔۔کیا پیارے نبیؐ کا پڑھایا ہوا آخری سبق یہ نہیں ہے کہ تقویٰ کو ہی فضیلت حاصل ہے۔۔کیا کسی انسان کو جانچنے کا اس سے اچھا کوئی اور پیمانہ ہو سکتا ہے یا ہونا چاہیئے۔۔؟"

وہ اس سے پوچھ رہے تھے اور عمر چپ کا چپ ہی رہا۔اس کے پاس اتنا علم نہیں تھا کہ وہ ایسی باتوں کے جوابات فوراً دے پاتا۔ہر عام مسلمان انسان کی طرح وہ تو خود کو ہی سب سے بڑا متقی سمجھتا تھا۔۔اس کے لئے تو یہی سب سے بڑی خوبی تھی کہ اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کسی کا حق نہیں مارا تھا۔وہ تو اس بات پر بھی اتراتا تھا کہ وہ نماز پڑھ لیتا ہے۔روزے بھی رکھ لیتا ہے۔۔اس کے لئے یہی فخر کم نہیں تھا کہ اس نے آزاد ماحول میں پرورش پانے کے باوجود وہاں کا رتی برابر اثر قبول نہیں کیا تھا۔۔اس سے کوئی پوچھتا تو وہ کہتا کہ ہاں میں ہی بہترین مسلمان ہوں۔۔میرے دم سے آج تک کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔۔میں اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔؟"

"نور محمد ایک متقی انسان ہیں۔۔اللہ کو متقی انسان سے بڑی محبت ہوتی ہے۔۔میرے لئے بھی ان سے محبت کرنے کے لئے یہی خوبی کافی ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوئے تھے۔

"تقویٰ کیا ہے سر!۔۔۔" عمر نے لاچار انداز میں سوال پوچھا تھا۔اس کے سامنے بیٹھا شخص جو پہلی ملاقات میں ایک عام سا سفید فام بوڑھا تھا اب یکدم ایک عالم بن گیا تھا۔اس کے لفظوں میں تاثیر تھی جو دل پر وار کرتی تھی۔عمر خود کو اس کے سحر میں جکڑا محسوس کرتا تھا۔

"تقویٰ وہ سیڑھی ہے جو اکملیت کی طرف لے جاتی ہے۔۔۔مجھے پتا ہے اب آپ پوچھیں گے کہ اکملیت کیا ہے۔۔میں آپ کو اس سوال کا جواب بھی دوں گا۔۔۔میری اہلیہ نے خودکشی کی تھی۔۔میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس کے ساتھ نرمی والا معاملہ روا رکھیں کہ اس کے الجھے ہوئے سوالات نے ہمیشہ مجھے سلجھی ہوئی راہ دکھائی۔۔اس کی اپنی زندگی ایک سوال کے گرد گھومتی رہی۔۔"اکملیت کیا ہے؟" اس نے بہت تھرلنگ زندگی گزاری تھی لیکن اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ اسے تازندگی نا ملی۔۔وہ کہا کرتی تھی وہ لمحہ جب روح اور جسم ایک نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں تو ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔۔اسے اُس سکون کی تلاش تھی وہ سمجھتی تھی کہ یہ سکون اسے تب ملے گا جب وہ "ماں" بن جائیگی۔۔اس نے فرض کرلیا تھا کہ" اولاد کا حصول ہی ماں کے لئے" اکملیت " ہے۔وہ سوچتی تھی کہ اولاد مل جانے سے زندگی مکمل اس کی ہو جائیگی۔اس کی مطیع ہو جائیگی۔۔۔اور اسے اس مقام پر ابدی سکون حاصل ہوگا اور وہ" اکمل" ہو جائیگی۔۔۔اس کے لئے اکملیت کے جانے کیا معنی تھے لیکن مجھے لگتا ہے ہر انسان اسی سوال کے تعاقب میں پورا جیون گزارتا ہے۔نئی سے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔۔اپنے خواہشات کے بے لگام گھوڑے پر بیٹھ کر سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے۔۔آرزو کو جنون پھر لگن اور پھر عشق بنالیتا ہے۔۔۔اور پھر اسی کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔۔درد سے بے چین ہوتا ہے تو مرہم بنالیتا ہے پھر تجسس اور تھرل اور مہم جو فطرت سے بے قابو ہو کر درد میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔۔ہم سب ایسا کرتے ہیں۔۔۔ہماری ابدی خواہش سکون ہے اور ہم اسے جنون میں تلاش کرتے کرتے لقمہ اجل بن جاتے ہیں لیکن سمجھ نہیں پاتے کہ ہم چاہتے کیا تھے۔۔ہمارا آخری سوال خود سے یہی ہوتا ہے کہ کیا ہم" یہی" چاہتے تھے جو ہم کرتے رہے اور پھر ہم سے بہت سے لوگ اس سوال کا جواب نفی میں ہی دیتے ہیں۔یہ انسان کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔۔یہ کل انسانیت کا تجسس ہے کہ آخر اسے چاہیئے کیا۔۔میں نے یہ سیکھا کہ وہ" اکملیت " کا مارا ہوا ہے۔اسے" اکملیت " چاہیئے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔۔کہ" اکملیت کیا ہے؟۔۔۔میں اگر یہ کہوں گا کہ دین کی پیروی ہی اکملیت ہے تو آپ فوراً مجھ پر ہنسیں گے اور مجھے طالبان سمجھنے لگیں گے۔۔۔یہی آجکل کے ماڈرن انسان کا المیہ ہے۔۔آجکل کے سائنٹفک دور کے ہم سب انسانوں کے لئے دین مذہب سب پرانی باتیں ہیں۔ہمیں ان میں دقیانوسیت نظر آتی ہے۔ہمیں وہ جواب چاہیئے جو سائنسی بنیادوں پر پرکھا جانچا جاسکے۔اکملیت روح اور جسم کا ایک نقطے پر آجانا ہے۔بنیادی طور پر جسم مادہ کثیف ہے اور روح مادہ لطیف۔۔یہ دونوں ایک نقطے پر آنہیں سکتے لیکن کچھ عوامل ایسے ہوتے ہیں جو یہ ناممکن کام ممکن کردکھاتے ہیں۔۔۔وہ لمحہ جب انسان بے پناہ پرجوش ہو کر خوش ہوتا ہے تو اسے سکون حاصل ہوتا ہے جو اسے ہلکا پھلکا کردیتا ہے۔۔اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ہلکا پھلکا ہو چکا ہے اور ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔۔۔وہ لمحہ جب آپ کسی چیز کو بہت لگن کے بعد حاصل کرلیتے ہیں۔۔بھوکے پیٹ کے لئے لقمہ حلال۔۔انسان کی محبت میں مبتلا انسان کے لئے محبوب سے وصال کا لمحہ۔۔۔کسی شوق کے جنون میں مبتلا انسان کے لئے انعام کی وصولی کا لمحہ۔۔۔ہنر کی بے پناہ داد و تحسین کا لمحہ۔دردِزہ میں مبتلا ماں کے لئے بچے کی دنیا میں آمد۔۔حالت نزع تڑپتے

سکتے وجود کے لئے موت کی نوید۔۔۔سب عوامل ہی ایسے ہیں جو اسے بے پناہ سکون دیتے ہیں ۔۔۔ڈرگز کیوں اتنی پاپولر ہو گئی ہے مغرب میں ۔۔۔۔نئی نسل خود کو نشے میں گم کر کے آخر کیا تلاش کرتی رہتی ہے۔۔وہ "اکملیت " ہی تلاش کرتی ہے۔۔وہ پُرسکون ہونا چاہتی ہے۔۔بے چینی سے چڑ ہونے لگی ہے اسے۔ یہ لوگ ڈرگز میں بھی تو پہلے تھرل پھر بے چینی اور پھر سکون تلاش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس کو نشے کے پاس رہن رکھ کر چند گھنٹوں کا سکون چاہتے ہیں۔۔۔ابدی سکون۔۔انہیں کسی نے سکھایا ہی نہیں کہ سکون حاصل کرنے کی چند اور چیزیں بھی ہیں۔۔ایسی چیزیں جن میں انسان اپنے حواس کھوئے بغیر بھی پُرسکون ہو سکتا ہے۔۔اور تقویٰ بھی سکون دینے کی ہی چیز ہے۔۔۔یہ آپ کے جسم کو بھاری نہیں ہونے دیتا۔ اسے روح کے ہم وزن رکھتا ہے۔۔اسے آلائشوں سے بچا کر رکھتا ہے۔۔یقین کیجئے آلائشیں نہیں ہوتیں تو آزمائشیں بھی نہیں ہوتیں۔۔" وہ یہ سب بتاتے ہوئے بھی کس قدر پُرسکون لگ رہے تھے جبکہ عمر کے چہرے پر ہی نہیں ہر عضو پر لاچاری طاری تھی

" آپ بہت مشکل باتیں کرتے ہیں سر!۔۔میں بہت عام سا انسان ہوں ۔۔۔مجھے اتنی مشکل فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ۔۔میرے جیسے عام انسان کے لئے یہ سب بہت مشکل ہے۔۔۔مادہ کثیف۔۔مادہ لطیف۔۔ان کا ایک مقام پر آنا" وہ اپنی کم عقلی کا اتنا کھلا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچایا نہیں تھا۔ نور محمد مسکرائے تھے

سادہ اور آسان ترین بات یہ ہے کہ دنیا کو اپنی حاجت سمجھیں رغبت نہیں۔۔۔دنیا صفر ہے اگر صرف خواہش ہے۔ اسے خواہش نہیں ضرورت سمجھیں۔۔اسے جائے عمل سمجھیں۔۔۔اسے ضرورت بنائیں۔۔۔اسے دین کی اکائی کے ساتھ ملائیں۔۔اسے دس بنائیں"

نور محمد نے اسے سادہ ترین انداز میں اپنی بات سمجھانی شروع کی تھی۔

☆ ☆ ☆

" آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ شہروز استعمال کیا جا رہا ہے۔۔۔وہ اپنے باسز کی بہت تعریف کرتا ہے اور اس نے تو ہم سے ذکر بھی نہیں کیا کہ وہ کسی سعودی این جی او کے ساتھ کام کر رہا ہے۔۔۔عوف بن سلمان کا تو نام بھی کبھی نہیں سنا میں نے اس کے منہ سے۔۔کسی انٹرنیشنل چینل کے ساتھ کسی جوائنٹ وینچر کا ذکر بھی کبھی نہیں کیا اس نے۔۔میں نے تو اس کے منہ سے کبھی عہدِ الست کا لفظ تک نہیں سنا ۔۔" زارا نے اس کی سب باتیں سن لینے کے بعد کہا تھا۔ وہ انکل آفاق ان کے بیٹے نور محمد کے بارے میں سن کر افسردہ تو ہوئی تھی لیکن اس کا تمام اضطراب اور پریشانی شہروز کے متعلق سن کر ظاہر ہوا تھا۔ سلمان کی باتوں نے اسے نا صرف حیران بلکہ پریشان بھی کر دیا تھا۔ وہ مشکوک نہیں تھی لیکن متذبذب ضرور تھی۔ سلمان حیدر پر اسرار تھا۔ لاپروا تھا اور اپنے متعلق کبھی کھل کر بات نہیں کرتا تھا لیکن وہ جھوٹا بھی نہیں تھا اور زارا کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

" سیکریسی ان کی پہلی شرط ہوتی ہے۔۔اس نے اگر اپنے گھر والوں سے بھی ذکر نہیں کیا تو یقیناً یہ اس کی جاب کی شرائط میں سے ایک رہی ہوگی۔۔۔یعنی اس کے ایگریمنٹ کا حصہ رہی ہوگی لیکن یہ فیلڈ کے لوگوں کے لئے اتنی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔۔میرے کچھ

کو مستند سمجھو۔۔ میرے پاس ان سب لوگوں کی لسٹ ہے جو اس پراجیکٹ میں شہروز کی معاونت کر رہے ہیں۔۔ وہ عوف بن سلمان کے ساتھ کام کر رہا ہے۔۔ یہ بات میرے علاوہ بھی کچھ لوگ جانتے ہیں۔۔ شہروز کے باس رضوان اکرم بھی ان میں سے ایک ہیں۔۔ ان کا نام تو سنا ہی ہوگا تم نے؟" وہ کہہ رہا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی۔ شہروز اپنی جاب کے متعلق بات کم ہی کرتا تھا۔ وہ صرف کامیابیوں کے متعلق بات کرتا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال سے تو وہ صرف ان باتوں پر دھیان دیتا تھا جن میں اس کی تعریف اور خود نمائی کا پہلو زیادہ نکلتا تھا۔ زارا نے سر ہلایا۔ رضوان اکرم کا نام اس نے سن رکھا تھا۔

"دراصل شہروز سے پہلے یہ پراجیکٹ مجھے آفر کیا گیا تھا۔۔ میں پہلے سے ہی ایک ڈاکیومینٹری تیار کر رہا تھا جو" نور محمد" کے متعلق تھی۔۔ کچھ وجوہات کی بناء پر میں نے یہ پراجیکٹ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔۔ رضوان اکرم مجھے بہت اصرار کرتے رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ مل کر کچھ نا کچھ ضرور کروں لیکن میرا دل جب کسی چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے تو پھر میں اسے نہیں کر پاتا۔۔ میں نے اپنا پراجیکٹ بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا اور رضوان صاحب یہ بات جانتے تھے۔۔ وہ جانتے تھے کہ میری اس موضوع پر کافی ریسرچ ہے۔ وہ میری ڈاکیومینٹری کے کاپی رائٹس مجھ سے لینا چاہتے تھے۔۔ میرے انکار کے کچھ عرصہ بعد عوف بن سلمان نامی ایک شخص نے تین پاکستانی جرنلسٹس کو کافی خطیر رقم پر ہائر کیا تھا۔ شہروز ان تین لوگوں میں شامل ہے۔" وہ اسے اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس کے باوجود یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ کہ شہروز ٹریپ کیا جا رہا ہے۔۔ وہ اتنی محنت کرتا ہے۔۔ اپنے کام کے لئے دن رات کا فرق بھی نہیں دیکھتا۔۔ اس کے اندر کچھ پوٹینشل تو ہوگا نا کہ جو اسے اتنے لوگوں میں منتخب کیا گیا ہے۔" وہ اب بے حد معتدل لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن کنفیوژن ابھی بھی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"محنت کی بات مت کرو۔۔ محنت سب کر لیتے ہیں۔۔ شہروز کو اس بنیاد پر نہیں چنا گیا۔۔ شہروز نے یہ سودہ محنت یا روپے کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ اس کی خواہش" شہرت" ہے۔۔ اس کے خریدنے والوں نے یہ بات بھانپ لی تھی کہ وہ شہرت کی خاطر آنکھیں بند کر کے بہت دور تک جا سکتا ہے۔۔ اتنا دور کہ جہاں جھوٹ اور سچ کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔۔ انسان اپنے گھر والوں کو بھول سکتا ہے۔ اپنی ترجیحات بدل سکتا ہے اور کسی کی اندھی پیروی بھی کر سکتا ہے۔۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ شہرت کے سامنے شہروز کو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔۔ کوئی بھی نہیں۔۔" اس نے آخری تین لفظوں پر زور دیتے ہوئے جملہ مکمل کیا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے سلمان کی کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ یہ خدشات تو اس کو بھی ڈراتے تھے کہ شہروز کے لئے ہر چیز شخص اور جذبہ" شہرت" کے بعد آتا تھا۔

" آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔۔ شہرت کی خواہش کوئی گناہ تو نہیں ہے تو پھر یہ سب شہروز کے ساتھ ہی کیوں۔۔" وہ عادت کے مطابق فوراً ہی بے دلی کا شکار ہونے لگی تھی۔

"شہرت کی خواہش واقعی گناہ نہیں ہے۔۔ ہم سب کے اندر یہ خواہش موجود ہوتی ہے لیکن اس خواہش کی خاطر اتنا آگے چلے جانا کہ آپ کے اعصاب ہی مفلوج ہو جائیں۔۔ اچھے برے کا فرق مٹ جائے۔ گناہ ثواب کی تخصیص نا رہے تو پھر یہ گناہ ہی ہے۔۔ میں

تمہیں کنفیوز نہیں کرنا چاہتا۔لیکن اتنا جان لیں زارا بی بی کہ یہ ایک گورکھ دھندا ہے۔۔اس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔میں نے بتایا نا کہ ایک برٹش نو مسلم ناولسٹ نور محمد ہیں جو ایک ناول "عہد الست" لکھ رہے ہیں جبکہ ایک فوٹو گرافر عوف بن سلمان ایک ڈاکیومینٹری "عہد الست" پر کام کر رہا ہے۔دونوں کا مقصد تقریباً ایک ہی ہے۔۔دونوں ہی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ دین اسلام ایک سچا مذہب ہے اور اسے دیا گیا دہشت گردی کا لیبل صرف بہتان ہے۔۔لیکن دونوں کا طریقہ مختلف ہے۔۔یہی میرا اور شہروز منور کا حال ہے۔۔ہم کام ایک ہی کر رہے ہیں لیکن ہمارا طریقہ کار مختلف ہے۔۔۔"

"آپ دونوں میں غلط کون ہے؟" زارا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔سلمان نے اس کا چہرہ دیکھا

"اس کا فیصلہ تم کرو گی ڈاکٹر۔۔۔ہر بات میں نہیں بتاؤں گا۔۔لیکن ایک بات یاد رکھنا۔اس بار دماغ سے فیصلہ کرنا۔۔قدرت بیوقوفوں کو بھی عقلمندی سے فیصلہ کرنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے۔۔۔یہی موقع دنیا میں ان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔۔یہی موقع وہ فصیل ہوتا ہے جو کامیابی اور ناکامی کے درمیان ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔زارا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔اسے فیصلہ کرنا آتا ہی کب تھا۔

☆ ☆ ☆

"زارا کچھ کہہ رہی تھی؟" وہ سہ پہر کا نکلا دوبارہ مغرب کے وقت گھر آیا تھا۔گرمیاں تھیں سو مغرب بھی سات بجے کے قریب ہوتی تھی۔اندھیرا پھیل چکا تھا اور ساتھ ہی بجلی جا چکی تھی۔امی انورٹر پر چھوٹا سا بلب روشن کئے برآمدے میں بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لئے نماز کے بعد والی تسبیحات پڑھ رہی تھیں۔یہ ان کا روز کا معمول تھا لیکن ان کا سوال بہت تاؤ دلانے والا تھا۔وہ ان کے قریب ہی بیٹھ کر اپنی شرٹ کی آدھی آستینوں کو مزید اونچا کرنے لگا۔امی نے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر پیڈسٹل فین کا رخ اس کی جانب موڑا تھا۔

"اس نے کھانا کھا لیا تھا؟ اسے شامی کباب پسند آئے؟" امی اس کے تاثرات دیکھ بھی چکی تھیں پھر بھی مسلسل سوال کر رہی تھیں۔اس نے اکتا کر انہیں دیکھا۔

"امی کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں آپ کا بیٹا نہیں آپ کی بہو ہوں۔۔جسے آپ ہر وقت کھینچ کھینچ کر کے زچ کئے رکھتی ہیں" اس نے عادت کے مطابق ان کے گندم سوال کا چنا جواب دیا پھر اٹھ کر پنکھے کے سامنے اپنے لئے چارپائی بچھانے لگا۔امی کچھ نہیں بولی تھیں بلکہ سکون سے تسبیح ختم کر کے انہوں نے اسے دروازے کے اوپر لگے کیل پر ٹانگ دیا پھر اس کے ساتھ اسی کی چارپائی کے قریب بیٹھنے آگئیں۔اس نے ان کے لئے سمٹ کر جگہ بنائی تھی۔وہ آسمان کو تک رہا تھا اور امی اس کو تکنے میں مگن تھیں۔وہ کچھ الجھا الجھا سا نظر آتا تھا۔

"تم اتنی جلدی چڑنے کیوں لگے ہو۔۔۔میں تو عادتاً ہی سوال کر رہی تھی۔۔کیا کروں کوئی بیٹی نہیں ہے تو جو بھی اچھے سے بات کرتا ہے اسی سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔تمہیں پتا تو ہے میں فطرتاً محبت کرنے والا انسان ہوں" امی اسے مسکراتے ہوئے وضاحت دے رہی تھیں سلمان نے انہیں چونک کر دیکھا۔۔یہی وضاحت تو وہ بھی ابھی دے کر آیا تھا۔

"مت کیا کریں امی۔۔۔محبت کے مطلب نہیں بدلے۔۔انداز بدل گئے ہیں۔۔۔محبت اب حاجت نہیں عادت ہو گئی ہے

۔۔۔لوگ فطرتاً محبت کرنے والے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔۔۔"

"کوئی بات ہوئی ہے کیا۔۔۔زارا نے کچھ کہا؟" امی کی سوئی ابھی بھی زارا پر ہی اٹکی تھی

"اس نے آپ کی اور میری باتیں سن لی تھیں۔۔۔جب کھانا کھاتے ہوئے آپ "آمنہ" کی باتیں کر رہی تھیں۔۔۔وہ کافی برا مان گئی

۔۔۔" امی نے اس کی بات کاٹی۔

"برا کیوں مان گئی۔۔۔کیا وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے؟"

"امی وہاں سے کوئی چیز اٹھائیں اور میرے سر میں مار دیں۔۔۔" وہ انتہائی چڑ کر بولا تھا

"پھٹ جائے گا بیٹا جی" امی مسکرائی تھیں۔ وہ دونوں بعض اوقات ایسے باتیں کرتے تھے جیسے ہم عمر دوست ہوں

"پھٹ ہی رہا ہے امی جی۔۔۔آپ کی اٹینگول باتیں سن سن کر" وہ اسی انداز میں بولا۔

"اچھا اب نہیں بولوں گی۔۔۔آؤ میں دبا دیتی ہوں سر" وہ لاڈ سے بولیں تھیں اور ایسے لاڈ کے مظاہرے بہت ہی کم آئے تھے اسکی زندگی میں۔۔امی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھیں۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔پنکھے کی گھرر گھرر کے علاوہ دور کسی کے گھر میں جنریٹر چلنے کی آوازیں ماحول میں ارتعاش بکھیر رہی تھیں۔

"مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کس بات سے آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ڈاکٹر زارا در اصل آمنہ ہے۔۔۔میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ زارا آمنہ نہیں ہے۔۔" اس نے تمہید باندھی تھی۔امی اس کے بالوں کو سہلاتی رہی تھیں۔

"زارا انگیجڈ ہے امی۔۔۔آپکو پتا ہے اس کا منگیتر کون ہے۔۔۔شہروز منور" اس نے اپنی جانب سے انکشاف کیا تھا۔امی کی انگلیاں لحہ بھر کو تھمی تھیں۔انہیں نہیں یاد آیا تھا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔

"شہروز منور۔۔۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

یہ سب آفاق صاحب کی بیٹی کے سسرالی رشتے دار ہیں امی" انکشاف اب مکمل ہوا تھا اور امی کے چہرے پر اصل حیرانی بھی اب ہی چمکی تھی۔

شہروز منور وہی لڑکا ہے جسے رضوان صاحب نے میرے بعد اپروچ کیا تھا۔۔میرا خیال ہے یہ بات میں نے آپ کو بتائی تھی" وہ انہیں یاد کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔امی نے سر ہلایا۔

"شاید۔۔پتا نہیں" وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔زارا اور اس کے منگیتر کا ذکر انہیں باور کروا گیا تھا کہ ان کا اندازہ غلط تھا۔اب سلمان سے یہ پوچھنا بھی بیکار تھا کہ وہ شہروز کو پہلے سے جانتا تھا یا زارا۔وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کے بیٹے کی دلچسپی زارا میں تھی نا شہروز میں بلکہ اس کی دلچسپی "عہد الست" میں تھی۔

"امی۔۔میں آپ کو کچھ باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔۔مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے"

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب بہت دن ہو چلے تھے۔ امی سے بہت سی باتیں تھیں کرنے کے لئے۔۔۔ امی کو اس سارے معاملے کی تب سے خبر تھی جب وہ آفاق صاحب سے مل کر اور انہیں موصول ہونے والے پوسٹ کارڈز دیکھ کر آیا تھا۔ آفاق صاحب کے ساتھ اس کی شناسائی اس دن کے بعد سے دوستی میں بدل گئی تھی۔ وہ اکثر اوقات ان کو فون کر لیا کرتا تھا صرف یہ جاننے پر کھنے کو کہ آیا نور محمد کی جانب سے دوبارہ کوئی رابطہ کیا گیا یا نہیں۔ اگرچہ دوبارہ ایسے کوئی کارڈز وغیرہ نہیں ملے تھے لیکن ایک تجسس اور ہمدردی اسے اس خاندان سے جوڑے رکھتا تھا۔ آفاق صاحب بھی اسے کافی اہمیت دینے لگے تھے اور خود بھی اسے فون کرتے رہتے تھے۔ ان ہی دنوں امی کو اس نے یہ سب باتیں بتائی تھیں اسی لئے وہ بھی آفاق صاحب کی فیملی کے متعلق کافی تفصیل سے جانتی تھیں۔ جب امائمہ کی شادی ہوئی تھی تب بھی بطور خاص آفاق صاحب نے اس کو امی سمیت مدعو کیا تھا لیکن وہ تقریب میں جا نہیں پائی تھیں مگر وہ جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا پروفیسر آفاق صاحب کے ساتھ کافی گہرے مراسم رکھتا ہے۔ نور محمد امائمہ اور آفاق صاحب وہ سب کو ناموں سمیت جانتی تھیں لیکن ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ زارا جسے وہ "آمنہ" سمجھتی ہی نہیں تھیں بلکہ پر یقین بھی تھیں کہ وہی ان کے بیٹے کی پسند ہے دراصل وہ بھی "عہد الست" کا حصہ تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی سرگرمیوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا لیکن بحیثیت ماں وہ واقعی چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اب شادی کرلے سو دل ہی دل میں انہیں اس بات پر دکھ تو ہوا کہ زارا بھی وہ لڑکی نہیں تھی جو مستقبل قریب میں ان کی بہو بن سکتی تھی لیکن ابھی وہ اس دکھ کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے بیٹے کو فی الوقت ماں ایک سامع کے روپ میں چاہیے تھی سو انہوں نے سلمان کی باتوں میں دلچسپی لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یا الٰہی میں واقعی تیری نعمتوں کو نہیں جھٹلا سکتا۔ تو مجھے وہاں وہاں سے نوازتا ہے جہاں میری سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی" نور محمد اپنے دل میں تشکر کا ایک طوفان ابلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے نماز عشاء سے فراغت کے بعد نوافل بھی ادا کر لئے تھے اور روٹین کی تسبیحات بھی پڑھ لی تھیں لیکن جی نہیں بھرا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ مصلے پر بیٹھے رہیں اور رب کا شکر ادا کرتے جائیں۔ بہت دن کے بعد وہ اتنے پرسکون ہوئے تھے کہ ان کے وجود سے ان کی خوشی کا ہر رنگ چھلک رہا تھا۔ وہ اب واقعی چاہتے تھے کہ ان کا آخری ناول اشاعت کے مرحلے سے گزر کر پبلک تک پہنچ جائے۔ ایک طویل عرصے بعد وہ اس ناول کی اشاعت کے لئے اتنے ہی پرجوش تھے جتنا کہ اپنے پہلے ناول کے لئے تھے۔ سلمان حیدر نے اپنا سارا کام مکمل کر کے انہیں ای میل کر دی تھی۔ دوسری طرف نور محمد کے بہنوئی سے مل کر بھی وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ اچھا شخص تھا اور ان کی ہر ممکن مدد کے لئے ہامی بھر کر گیا تھا۔ ان لوگوں کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا جو ان کی مدد کے لئے مخلص اور پرجوش تھے۔ سلمان حیدر کے بعد عمر منور نے بھی ان کے دائرے میں داخل ہو کر ان کی طاقت میں اضافہ کیا تھا۔ وہ معاملات جو کچھ سال پہلے بنتے بنتے بگڑ گئے تھے بالآخر درست سمت میں چلنا شروع ہو گئے تھے۔ اسی لئے وہ کافی دن کے بعد کافی مسرور نظر آتے تھے۔ انہوں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ان کے روم میٹس کی واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ سونے کی غرض سے رات کے کسی پہر ہی سہی مگر واپس آتے ضرور تھے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ سب کے لئے اچھے سے کھانے کا اہتمام کریں۔ انہوں نے جانماز کو تہہ لگا

کر اسکی جگہ پر رکھا پھر سیڑھیاں اتر کر کچن میں آ گئے۔اب مارکیٹ جانے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کچھ لا پاتے سو فریج میں جو بھی انہیں جو بھی میسر تھا انہوں نے اسے کاؤنٹر پر نکال کر رکھنا شروع کر دیا تھا۔کچھ سبزیاں تھیں۔سفید چنے کا ٹن موجود تھا۔پنیر کے کیوبز تھے۔سینڈوچ بریڈ بھی موجود تھی۔انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا پکایا جائے۔ان کے تینوں روم میٹ بلا کے خوش خوراک تھے اور چکن مٹن کے دلدادہ بھی۔۔۔ان کے لئے صرف سبزیاں پکانا انہیں سزا دینے کے مترادف تھا۔انہوں نے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد کارڈلیس اٹھایا تھا۔ان کا ارادہ تھا کہ زین العابدین کو فون کر کے اس کی واپسی کا وقت پوچھ لیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ آتے ہوئے ترکش قصاب سے حلال چکن لیتا آئے۔وہ ابھی اس کا سیل نمبر ملا ہی رہے تھے کہ داخلی دروازے کا قفل کھلنے کی آواز آئی۔انہوں نے گردن لمبی کر کے دروازے کی سمت دیکھا تھا

"لمبی عمر ہے آپ کی۔۔میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔زین العابدین اندر آ گیا تھا۔اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سلام کیا تھا پھر ہال میں پڑے کاؤچ پر گر گیا۔

"سن کر خوشی ہوئی کہ آپ مجھے یاد کر رہے تھے برادر۔۔میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں" وہ وہیں نیم دراز بولا تھا۔نور محمد نے فون کو اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔

"میں ڈنر تیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔بہت دن ہوئے آپ لوگوں نے میرے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا۔۔آپ کچھ مشورہ دیں میں کیا بناؤں۔۔میرے پاس یہ سبزیاں ہیں اور بینز۔۔۔پنیر ہے اور کچھ بریڈ سلائسز بھی" وہ اپنے دھیان میں مگن بول رہے تھے۔ان کے رویے میں خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔

"برادر میں تو دو گھنٹے بعد کارڈف کے لئے نکل رہا ہوں۔۔میرے باس نے مجھے اپنے وہاں کے آفس میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔۔میں ڈنر نہیں کر پاؤں گا۔۔وقت کم ہے اور کام زیادہ۔۔سامان بھی سمیٹنا ہے" وہ تھکا ہوا لگتا تھا۔نور محمد نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

"کارڈف۔۔۔ٹرانسفر۔۔ایسے اچانک۔۔؟" وہ حیران ہوئے تھے۔

"اچانک نہیں ہے۔۔کافی دن سے باس سے سیلری بڑھانے کی بات چل رہی تھی۔۔۔وہ چاہتا ہے میں کارڈف چلا جاؤں تو وہ انکریمنٹ لگا دے گا۔۔مجھے تو اسی سے غرض ہے۔۔میں نے ہامی بھر لی" وہ اسی انداز میں بولا۔

"آپ نے بتایا ہی نہیں پہلے" نور محمد نے شکوہ نہیں کیا تھا،وہ فقط حیران تھے۔

"بتانے والی بات تھی ہی نہیں برادر۔۔بس اب آپ کے وطن میں دل نہیں لگتا۔۔میں جلد واپس چلا جاؤں گا۔۔۔میرا رزق اتنا ہی تھا ادھر۔۔" اس نے گردن موڑ کر ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

"میں کافی بناتا ہوں۔۔آپ اپنا سامان سمیٹ لیں" نور محمد نے اس کی بات پر کوئی تاثر ظاہر کئے بناء کہا تھا۔وہ کافی میکر کی طرف مڑے تھے اور زین العابدین سیڑھیوں کی جانب چل دیا تھا۔کافی بننے میں چند منٹ ہی لگے تھے۔وہ مگ کے ہمراہ جب کمرے میں پہنچے تو زین اپنا بیگ تیار کر چکے تھے۔انہیں اس سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔اگرچہ اس کا سامان چند کپڑوں کے جوڑوں پر ہی مشتمل تھا لیکن

ان کو سمیٹنے میں بھی اس نے جس تیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ نور محمد کے لئے باعث حیرت تھی۔

"میں آپ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ ایک محسن کے طور پر یاد رکھوں گا۔۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" وہ فارمل انداز میں جملے بول رہا تھا۔ نور محمد پہلی بار مسکرائے۔

"میں امید کرتا ہوں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہی سچ ہو" ان کی بات پر زین نے ان کو بغور دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک دوسرے کو کم ہی کریدتے تھے۔ ان دونوں نے خاموشی سے کافی ختم کی تھی۔ نور محمد اس کو خالی مگ میز پر رکھتا دیکھ کر اٹھے تھے پھر انہوں نے اپنی پاکٹ سے کچھ نکالا تھا۔

"یہ میری طرف سے آپ کے لئے ایک ہدیہ ہے" انہوں نے زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچھ تھمایا تھا۔ اس نے حیرانی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ نور محمد نے اس کے ہاتھ پر ایک یو ایس بی ڈرائیو رکھ دی تھی۔

"یہ وہی چیز ہے جس نے آپ کو میرے جیسے خشک انسان کے ساتھ اتنا عرصہ باندھے رکھا تیمور نصار" وہ سادہ سے انداز میں اس کا مکمل نام لے کر بولے تھے۔ زین نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ اسے اپنی حیرانی چھپانے میں چند لمحے لگے تھے لیکن بہرحال وہ بھی ایک کائیاں آدمی تھا اس لئے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نور محمد بھی اس کے اصل کو پا سکیں گے۔ نور محمد نے دل ہی دل میں سلمان کا شکریہ ادا کیا جس نے انہیں عوف بن سلمان کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کی ایک لسٹ بھیجی تھی۔ اس لسٹ میں ہی انہیں تیمور نصار کی تصویر اور نام وغیرہ دیکھنے کو ملے تھے۔ اسی لئے وہ زین العابدین کی حقیقت پہلے سے جانتے تھے۔

"آپ جانتے تھے مجھے۔۔۔ یعنی میں خود کو بلاوجہ ایک اچھا اداکار سمجھتا رہا" اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی۔

"آپ ایک اچھے اداکار ہیں۔۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے تیمور۔۔۔ آپ بس ابھی ناتجربہ کار ہیں۔۔ اس لئے آپ نے میرے سفید بالوں کا ذمہ دار دھوپ کو سمجھ لیا۔۔۔ حالانکہ میرا دعویٰ ہے یہ تجربے کی دین ہیں" نور محمد اسی کے انداز میں مسکرائے تھے۔

"بے شک بے شک۔۔۔ میں مانتا ہوں آپ بے حد تجربہ کار ہیں" وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ آپ میرے گھر میں رہتے ہوئے میرے دوست عوف بن سلمان کے اتنے اہم پراجیکٹ پر کام کریں گے اور مجھے کانوں کان خبر بھی نا ہوگی" وہ مسلسل مسکراتے ہوئے بات کر رہے تھے۔

"آپ اتنے باخبر ہے تو آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں۔۔" تیمور کے لئے یہ سوال اہم تھا۔

"میں چاہتا تھا کہ آپ جو کام کرنے آئیں ہیں۔۔ اسے پوری ایمانداری سے کھلی آنکھوں اور ہوشمندی کے ساتھ انجام دیں۔ ہمارے راستے بے شک الگ ہوں لیکن ہمارا مقصد ایک ہی تھا۔ میں بھی یہاں کچھ عرصہ پہلے اپنے اندر اٹھنے والے سوالات کا جواب ڈھونڈنے آیا تھا اور آپ بھی یہی کرنے آئے تھے۔۔ مجھے کسی نے نہیں روکا تھا تو میرا بھی یہ فرض بنتا تھا کہ میں آپ کی معاونت کروں" وہ

تیمور کے سامنے بیٹھ کر اسے بتانے لگے تھے۔

"شکریہ۔۔لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا سر۔۔۔آپ اسلام کی اصل شکل سے بہت دور نکل گئے ہیں۔۔آپ ریڈیکلائزڈ ہو گئے ہیں۔۔میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کی نیت غلط ہے لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ آپ کا طریقہ درست نہیں ہے۔۔آپ" دین "کو سمجھ نہیں پائے" تاسف اس کے ہر لفظ سے ٹپکتا نظر آیا۔

"تیمور اس کا فیصلہ اتنی عجلت میں مت کیجئے۔۔۔آپ نے میرے ناول کا نام سنا ہے۔۔اسے پڑھا نہیں ہے۔۔ایک دفعہ اسے پڑھ کر دیکھ لیجئے۔۔۔یہ ننھی سی ڈیوائس میرے تجربے کا نچوڑ ہے تیمور۔۔۔یہ عہد الست ہے۔۔۔آپ اگر واقعی میرے تجربے کے معترف ہیں تو آپ اس کے ایک ایک لفظ کا اعتراف بھی کریں گے۔۔۔اس میں وہ سب مواد ہے جو میں اب تک اس موضوع پر جمع کرتا رہا ہوں۔۔۔میں چاہتا ہوں آپ اسے اپنے ہمراہ لے جائیں اور فرصت سے اس کی جانچ کریں" تیمور نے ان کی بات پر ہاتھ پر رکھی ڈیوائس دیکھی پھر وہ مسکرایا۔اس نے وہ ڈیوائس دوبارہ نور محمد کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"یقین کیجئے سر،،میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں۔۔لیکن پروفیشنل معاملات میں نے ہمیشہ دماغ سے نبٹائے اور سلجھائے ہیں۔۔۔یہ آپ اپنے پاس رکھیں۔۔میں آپ کے پاس جس کام کے لئے آیا تھا۔۔وہ کام میں بخوبی کر چکا ہوں۔۔۔مجھے اس" عہد الست "کی ضرورت نہیں ہے۔میرے لئے آپ کے نظریات ریڈیکل تھے اور ریڈیکل ہی رہیں گے۔۔۔ایسے نظریات دنیا کے لئے آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکے ہیں۔۔۔دنیا انہیں وائرس سمجھتی ہے۔۔آپ بھی جیت کا خیال ترک کر دیجئے" وہ اب بالکل مختلف انسان کے روپ میں ڈھل کر ان کے سامنے کھڑا تھا۔۔ایک ایسا انسان جو شاطر تھا،ذہین تھا،کائیاں تھا۔اس کے جملے میں ذومعنی اشارہ تھا۔

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔۔۔آپ میرے مقابل ہیں۔۔۔میں اپنی جیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔لیکن ایک بات یاد رکھئے گا میں مرتے دم تک آپ کو بھی جیتنے نہیں دوں گا۔۔۔لیکن میں ابھی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔آپ سفر کے لئے نکل رہے ہیں۔۔آپ کو پریشان کر کے میں بھی پریشان رہوں گا" نور محمد نے بھی واقعی بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔انہیں انسانوں کے ساتھ اپنے معاملات نبٹانے آتے تھے

"وقت فیصلہ کر چکا ہے سر۔۔۔آپ یہ بازی ہار چکے ہیں۔۔۔اب آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔۔آپ جس شخص کی خاطر اتنا تردد کر رہے ہیں۔۔وہ دنیا کے لئے ہی نہیں اس کے خاندان والوں کے لئے بھی قابل قبول نہیں رہا۔۔۔ایک دہشت گرد کی ضرورت کسی کو نہیں ہوتی۔۔ایسے شخص کو دنیا بعد میں دھتکارتی ہے۔۔گھر والے پہلے دھتکار کر دروازے بند کر لیتے ہیں۔۔نور محمد کے لئے دروازے۔۔۔بند ہو چکے ہیں۔۔۔اس لئے آپ اب اس ناول کو ردی کے بھاؤ بیچ ڈالئے۔۔۔مجھے افسوس ہے آپ کی محنت ضائع ہونے پر"

اس کے لہجے میں اتنی استقامت تھی کہ نور محمد چپ رہ گئے تھے



"مجھے تم سے بات کرنی ہے عمر"

شہروز نے تین روز بعد عمر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماحول پر چھایا بدگمانی کا غبار کافی حد تک چھٹ چکا تھا ان میں سے کسی کے درمیان بھی دوبارہ کوئی بحث نہیں ہوئی تھی۔ عمر بھی کافی پرسکون دکھتا تھا اور روٹین کے مطابق امائمہ اور وہ ڈنر کرنے چاچو کے گھر پر ہی آ رہے تھے۔ چاچو نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی اور چچی بھی امائمہ کے پہلے کی طرح لاڈ اٹھا رہی تھیں اور اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ شہروز کی واپسی کے دن قریب تھے۔ اسے ایک ہفتے کے لئے آئرلینڈ بھی جانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عمر سے حتمی بات کرنا ضروری ہے۔ اس کی ضدی طبیعت سے بخوبی واقف تھا وہ اور اسے اندازہ تھا کہ عمر کی خاموشی طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ وہ عمر کو ایک بچگانہ اور خطرناک قدم اٹھانے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا تھا۔

"کرلو بات،، اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔۔" عمر کو بھی جیسے اندازہ تھا کہ شہروز ایسے آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ڈنر کے بعد ممی اور ابو سٹنگ ہال میں بیٹھ کر عمر کی شادی کی موو ی دیکھنے لگے تھے۔ امائمہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی جبکہ وہ دونوں بیڈ روم میں آ گئے تھے

"پہلے وعدہ کرو۔۔ جذباتی نہیں ہو گے" شہروز نے اس کے خوشگوار مزاج کو دیکھتے ہوئے پہلے ہی شرط عائد کی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیڈ کے قریب پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا

"میں وعدہ نہیں کر سکتا۔۔ نا جانے تم کیا بات کرنے والے ہو۔۔ کس کے متعلق کرنے والے ہو" اس نے بھی اسی کے انداز میں جتا دیا تھا۔

"مجھے امائمہ کے بھائی کے متعلق بات کرنی ہے عمر" اس نے کہا

"واقعی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ امائمہ کا کوئی بھائی ہے۔۔۔ اس بات کا یقین تو خود امائمہ صاحبہ کو بھی نہیں رہا اب" وہ عام سے انداز میں بات کر رہا تھا لیکن یہ ایک بھاری بھرکم طنز تھا شہروز نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ یہ ان دونوں کی عادت تھی جب ایک طنزیہ انداز اپناتا تھا تو دوسرا تحمل سے کام لیا کرتا تھا۔

"میں نور محمد کی بات کر رہا ہوں عمر!"

"اچھا تو یوں کہو نا کہ تم ایک پاکستانی دہشت گرد کی بات کرنا چاہتے ہو۔۔۔ کرلو بھائی۔۔ کرلو۔۔ اجازت ہے" یہ دوسرا بھاری بھرکم طنز تھا شہروز نے بمشکل اپنی خفگی کو ظاہر ہونے سے روکا

"تم کچھ بھی کہو۔ کسی بھی انداز سے کہو عمر لیکن یہی حقیقت ہے کہ نور محمد ایک دہشت گرد ہے۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے قتل کئے ہوں گے یا وہ دھماکوں وغیرہ میں ملوث ہو گا لیکن وہ ان عناصر کے ساتھ رہا ہے جن کے مقاصد نا صرف عالمی امن کے لئے خطرہ بلکہ اسلامی ممالک کے لئے بھی ناپسندیدہ ہیں۔۔۔ یہ لوگ ریڈیکلائزڈ سوچ رکھتے ہیں۔۔۔ ان کی فنڈامینٹلسٹ سوچیں اسلامی اقدار کے منافی ہیں۔۔ یہ

ناصرف اپنے ملک کی بدنامی کا باعث ہیں بلکہ یہ اسلام کے اصولوں کے بھی خلاف چل رہے ہیں" شہروز نے اپنی بات کی مکمل کر وضاحت کی تھی۔

"مجھے تمہارے منہ سے یہ الفاظ سن کر دکھ ہو رہا ہے شہروز۔۔۔۔۔فنڈامنٹلزم کسے کہتے ہو تم۔۔یہ ریڈیکلائز ڈسوچ کیا ہے" وہ اسے تک رہا تھا۔شہروز کو اس سے بحث برائے بحث نہیں کرنی تھی۔اُسے دل ہی دل میں عمر کے انداز سے چڑ ہوئی تھی

"یہی مسلمانوں کی بلاوجہ کی تنگ نظری۔۔۔چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذہب کی بلاوجہ کی مداخلت۔۔اور کیا۔۔؟" وہ ناک چڑھا کر بولا۔۔

"چھوٹی چھوٹی باتیں۔۔۔۔یہ چھوٹی چھوٹی باتیں لگتی ہیں تمہیں۔۔؟" عمر کو حیرانی ہوئی تھی۔

"تمہیں پتا ہے یہاں عورت کا سر ڈھکنا بھی ریڈیکلائزیشن میں شامل ہو گیا ہے۔۔آفس اوقات میں گرل فرینڈ کو بیس منٹ کی کال کرنے پر کوئی نہیں ٹوکتا لیکن نماز پڑھنے کے لئے دس منٹ کا بریک نہیں دے سکتے۔۔اور کچھ علاقوں میں مسلمان روزہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ باقی آبادی کے لئے وہ ریڈیکلائزیشن ہو جاتی ہے۔۔۔داڑھی فیشن کے طور پر رکھ لو تو کوئی بات نہیں۔۔اسے سنت رسول کا نام دینا ریڈیکلائزیشن ہے۔۔آپ ویجیٹیرین ہیں تو آپ پورک کو ناپسندیدہ قرار دے سکتے ہیں لیکن اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ اسے "حرام" نہیں کہہ سکتے۔۔آپ اورگینک چکن مانگ سکتے ہیں لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ آپ کو "حلال" چکن چاہیئے تو آپ فنڈامینٹلسٹ ہیں۔۔۔اس دنیا کے دوہرے معیار میں یہ سب اور کچھ نہیں اور خدارا کوئی بھی نئی ٹرم جب مسلمان کے لئے استعمال کی جانے لگتی ہے تو اس کے بارے میں احتجاج نہیں بھی کر سکتے تو نا کرو لیکن اسے استعمال بھی تو مت کرو حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ صرف یہاں نہیں ہو رہا بلکہ پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔۔وہاں یہاں سے بھی زیادہ فنڈامینٹلسٹ کی گردان ہو رہی ہے۔۔لوگ ہر دوسرے مذہبی شخص کو ریڈیکل قرار دینے پر تل گئے ہیں۔۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا تھا۔شہروز نے گہری سانس بھری۔

تم اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہو۔۔۔کبھی تو تحمل سے بات سن لیا کرو" شہروز نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔بالآخر اسے وہ عمر نظر آ گیا تھا جو کہیں کھو گیا تھا۔وہی جذباتیت،وہی ضد،وہی اندھا جوش۔

"یہ دیکھو میرے ہاتھ۔۔جوڑتا ہوں میں تم سب کے آگے۔۔۔تم لوگ مل جل کر میرے ماتھے پر لکھوا دو کہ میں جذباتی ہوں ۔۔میں تو آج تک اس لفظ کا مطلب نہیں سمجھ پایا۔۔اور یہ تو بالکل نہیں سمجھ پایا کہ مجھے یہ ٹائٹل دیا کیوں گیا ہے۔۔۔میرا سچ بولنا جذباتیت لگتا ہے تم لوگوں کو۔۔میرا حق کا ساتھ دینا جذباتیت لگتا ہے یا پھر غلط کو غلط کہنے کو جذباتیت کہتے ہو آپ لوگ" وہ تپا ہوا بول رہا تھا۔

"دیکھا پھر ہو گئے جذباتی۔۔۔بات تو سن لو میری۔۔۔مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دو" شہروز خلاف ضرورت اور توقع کافی تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"عمر بات یہ نہیں ہے۔۔بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل شکل ہم سب نے مل جل کر مسخ کر دی ہے۔۔ہم نے دنیا کو یہ ثابت کر دیا ہے کہ

ہم جنگجو ہیں۔۔۔ہم تنگ نظر ہیں۔۔۔ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں نا باقی دنیا کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ہم مسجد یں بنا بنا کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔۔فرقہ بنانا فرقہ منانا ہمارا قومی کھیل بن چکا ہے۔ہم اپنے ملک کی پچپن فیصد آبادی کو اسلام کے نام پر محصور کر کے اپنی کامیابی اور ترقی کا راستہ روک رہے ہیں۔ہم عورتوں کو تعلیم نا دلوا کر مذہب کے نام پر بلیک میل ہو رہے ہیں۔۔۔یہی وجہ ہے کہ ہم باقی دنیا سے پیچھے رہ گئے ہیں۔۔۔ریڈیکلائزیشن چاٹ گئی ہے میرے ملک کو۔۔ملائیت نے میرے ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔۔طالبنائزیشن نے گھس کر رکھ دیا ہے اسے۔۔مذہب کھا گیا ہے میرے پاکستان کو۔۔" شہروز کے چہرے پر پاکستان کے لئے پریشانی چھلک رہی تھی جسے دیکھ کر عمر کو مزید تاؤ چڑھا

" مذہب نے نہیں کھایا پاکستان کو۔۔۔پاکستانیوں نے خود ہی کھا لیا ہے پاکستان کو۔۔۔ہر ادارہ اس میں شامل ہے۔۔۔ملا سیاست دان فوجی بزنس مین۔۔بیوروکریٹ۔۔۔صرف مذہب کو الزام کیوں دیتے رہتے ہو تم لوگ۔۔تم لوگوں نے خود مذہب کا ڈیم بنا کر اسے چورا ہے میں رکھ دیا ہے۔۔سب مل جل کر اسی میں مصالحہ شامل کرتے جا رہے ہیں۔۔۔جس کا بس چلتا ہے وہ مذہب کی نئی شکل بنا کر خود کو اسلام کا پیروکار ثابت کرنے پر تل جاتا ہے۔۔۔ایک شخص کہیں سے بھی اٹھ کر آتا ہے اور آ کر مذہب کے نام پر سب لوگوں کو بلیک میل کرنے لگتا ہے۔۔باقی سب بھیڑیں بنے اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔۔کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ جو بتا رہے ہو کہہ رہے ہو، قرآن وحدیث میں کہاں درج ہے۔۔اپنی اپنی آسانی کی خاطر سب نے مل جل کر ایک آسان ترین مذہب کو ایسی شکل دے دی ہے کہ باقی دنیا اسے" ریڈیکلائزیشن" کہنے لگی ہے اور اندھے لولے لنگڑے لوگ بھی مان چکے ہیں کہ ہاں اسلام تنگ نظری کا دوسرا نام ہے۔اب یہ مت کہنا کہ مذہب کھا گیا اس ملک کو۔۔۔اندھی تقلید کھا گئی ہے اس ملک کو شہروز" عمر ابھی بھی اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا تھا اور یہی حال شہروز کا تھا۔

" یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔۔۔یہی سوچ تو پہ لتی ہے۔۔۔اندھی تقلید سے ہی تو نکالنا چاہتے ہیں ہم۔۔۔یہی تو سمجھانا چاہتے ہیں قوم کو کہ اسلام کی چودہ سو سال پہلے کی رائج چیزوں کو اکیسویں صدی میں رائج کریں گے تو ترقی کی راہ پر کبھی گامزن نہیں ہو سکیں گے۔۔اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے کو ضرورت قرار دیتا ہے اور تنگ نظری سے نکلنا ہماری ضرورت ہے۔۔۔ہمیں ملائیت سے نکلنے کی ضرورت ہے۔۔اس ملک کو انویسٹمنٹ چاہیئے۔۔کاروبار چاہیئے۔۔۔آزادی چاہیئے۔۔سکون چاہیئے" وہ حتمی انداز میں بولا تھا۔

" یہ سب کچھ جو اس" ملک" کو چاہیئے۔۔کیا یہ سب اسلام کے دائرے سے نکل کر ملے گا؟" عمر نے سابقہ انداز میں سوال کیا تھا۔

" دائرے سے نکلنے کو کون کمبخت کہہ رہا ہے۔۔میں بھی الحمدللہ مسلمان ہوں اور اسلام کے دائرے سے نکلنے کا تو مر کر بھی نہیں سوچ سکتا۔۔میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اسلام کو بدلنا ہوگا۔۔۔پرانی دقیانوسیت سے جان چھڑوانی ہوگی۔۔۔ریڈیکلائزیشن کا طوق گلے سے اتارنا ہوگا۔۔اسلام کو ختم نہیں کرنا۔۔اسے ٹھیک کرنا ہے۔۔۔" شہروز اس کے انداز سے زچ ہو کر بولا۔

" یہ عجیب بات ہے۔۔سب مسلمان مل کر اسلام کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔۔۔مسلمان خود ٹھیک نہیں ہونا چاہتے۔۔" عمر نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بہت سادہ سے انداز میں کہا تھا۔اسے شہروز کی آخری باتوں سے بہت دکھ پہنچا تھا۔شہروز اس کے سوال پر لمحہ بھر کے لئے چپ رہ گیا تھا پھر اس نے دوبارہ سے ہمت پکڑی تھی۔

"عمر! میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ میں تمہیں صرف بتانا چاہتا ہوں کہ تم غلط ہو۔۔۔ تم نور محمد کا ساتھ دے کر غلطی کرو گے۔۔۔ وہ ایک دہشت گرد ہے۔۔۔ میرے پاس اس کے خلاف ثبوت ہیں۔۔۔ وہ واقعی گوانتاناموبے میں ہے۔۔۔ میں صرف ہوا میں تیر نہیں چلا رہا۔ میری بھی ایک ایک بات حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔ میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔۔۔ دراصل میں ایک این جی او کے ساتھ منسلک ہوں جو ایک ڈاکیومنٹری پر کام کر رہی ہے۔ میں پرائیوٹلی ایک دوسرے خبر رساں ادارے کے ساتھ بھی کام کرتا ہوں۔۔۔ وہ بہت عرصے سے اس پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس ڈاکیومینٹری کا بنیادی موضوع نور محمد اور اس جیسے لوگ ہیں جو دنیا کو ریڈیکلائزڈ کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کا نام بدنام کر رہے ہیں۔۔۔ ہماری ٹیم سب کام تقریباً مکمل کر چکی ہے۔۔۔ ہم ایک بین الاقوامی چینل کے ذریعے بہت جلد اسے آن ائر کر دیں گے۔۔۔ حقیقت سب کے سامنے آ جائے گی۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو عمر۔۔۔ اس سفید فام بوڑھے کی باتوں میں مت آؤ" اپنی جانب سے اس نے انکشاف کیا تھا۔

"میں ادارے کے ساتھ منسلک نہیں ہوں شہروز لیکن میرا دل کہتا ہے وہ سفید فام بوڑھا سچ کہتا ہے۔۔۔ ان کے الفاظ و انداز میں اس قدر تاثیر ہے کہ میں دنگ رہ گیا ہوں۔۔۔ اللہ ایسی تاثیر کسی نیک نیت کو ہی دیا کرتے ہیں۔۔۔ ان کی نیت نیک ہے۔۔۔ وہ دین کو ہم سے بہتر سمجھ چکے ہیں۔۔۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔۔۔ ان کے پاس بھی ثبوت ہیں۔۔۔ تم ڈاکیومنٹری بنا رہے ہو جبکہ وہ ناول لکھ رہے ہیں۔ تم ایک دفعہ دوبارہ ان سے ملو۔۔۔ تم میری بات سے اتفاق کرو گے شہروز" وہ اسے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہروز کو دل ہی دل میں بہت افسوس ہوا۔

"تم غلط کر رہے ہو عمر۔۔۔ تم جسے فرشتہ سمجھ رہے ہو نا۔۔۔ وہ شخص بہروپیے سے بڑھ کر ہیں۔۔۔ یہ ناول جس کا وہ راگ الاپ رہے ہیں۔۔۔ یہ ناول انہوں نے یو پی ایل کی خطیر فنڈنگ سے لکھنا شروع کیا تھا۔۔۔ یو پی ایل وہی تنظیم ہے جسے آج کی دنیا ای ڈی ایل کہتی ہے۔۔۔ تمہیں یہ باتیں جو آج پتا چل رہی ہیں نا۔۔۔ میں یہ باتیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔۔۔ مجھے تو یہ شک بھی ہے کہ وہ بندہ مسلمان ہوا ہی نہیں ہے۔۔۔ وہ تمہیں مجھے اور ہم سب کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔۔۔ ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں" اسے عمر پر غصہ آ رہا تھا اور اب کی بار وہ اپنے لہجے کی خفگی کو چھپانا نہیں چاہتا تھا۔

"ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں اور تمہاری نیت اچھی نہیں ہے۔۔۔" عمر نے چڑ کر اتنا ہی کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی

"میری نیت اچھی نہیں ہے۔۔۔ میری۔۔۔؟۔۔۔ میں جو صرف ایک نیک مقصد کے لئے اس پراجیکٹ کے ساتھ اٹیچ ہوں۔۔۔ مجھے کیا فائدہ ہوگا اس سب سے۔۔۔ میں تو صرف دنیا کو اسلام کی ایک مثبت شکل دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں۔۔۔ اسلام کا ایک روشن چہرہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں" وہ تڑپ کر بولا تھا۔

"مثبت شکل۔۔۔ روشن چہرہ۔۔۔؟" عمر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

"تو کیا اسلام کی کوئی منفی شکل بھی ہے۔۔۔ کوئی تاریک رخ بھی ہے۔۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تم دنیا کو دکھانے سے پہلے خود کو یقین دلاؤ شہروز کہ اسلام کا کوئی رُخ ایسا نہیں ہے کہ جس کی وضاحت ہمیں دنیا کو دینی پڑے۔۔۔ کوئی منفی شکل نا کوئی تاریک چہرہ۔۔۔ اگر کوئی چیز منفی ہے تو وہ ہم مسلمان ہیں، تم ہو، میں ہوں۔۔۔ بدلنا ہی ہے تو آؤ خود کو بدل کر

دیکھتے ہیں۔۔۔عہد الست کو سمجھ کر دیکھتے ہیں۔۔۔" وہ اب التجائیہ انداز میں بولا تھا۔شہروز نے اسے دیکھا پھر تاسف سے سر ہلایا۔۔وہ اسے نہیں سمجھا سکتا تھا۔وہ اسے کیسے سمجھا سکتا تھا جب وہ اسے ہی غلط قرار دے رہا تھا۔

"عمر اس میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔۔۔تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔۔یا اکیلے رہ جاؤ۔۔کیونکہ امائمہ اس کے والدین ،،چاچو،،چچی کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔کوئی تمہاری طرح احمق نہیں ہے۔۔پاگل پن مت کرو" شہروز اسی کے انداز میں بولا تھا

"یہ اگر پاگل پن ہے نا شہروز تو مجھے اس پاگل پن سے پیار ہے۔۔۔میں نور محمد سے کمٹمنٹ کر چکا ہوں۔۔میں ان کا ساتھ دوں گا۔۔اب ساری دنیا بھی ایک طرف ہو جائے گی تو بھی میں ان کا ساتھ دوں گا۔۔۔میں انہیں حق پہ مان چکا ہوں" عمر نے اپنا عزم دوہرایا تھا ۔شہروز اس کی جانب دیکھتا رہ گیا پھر اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے لگے وال کلاک کی جانب دیکھنے لگا۔۔اسے آج سے پہلے عمر پہ کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔تمہاری مرضی۔۔۔میں اب تمہیں نہیں روکوں گا۔لیکن ایک بات طے ہے آج سے تمہارا راستہ الگ اور میرا راستہ الگ۔۔" اس نے بالآخر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔عمر چند لمحے اس کے سپاٹ انداز پہ غور کرتا رہا پھر اس نے چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ سجائی تھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"منظور ہے" اس نے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ان کی باہمی محبت ان کے انفرادی مقاصد میں تقسیم ہو گئی تھی ۔وہ جدا جدا ہو رہے تھے۔۔تفرقہ پھیلنے لگا تھا یا شاید بہت پہلے پھیل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نور محمد کا پتا چل گیا ہے" رافعہ بیگم نے اس سادہ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے دو نفوس کو ان کی زندگی کی ایک بڑی خوش خبری دی تھی۔مسز آفاق نے تڑپ کر ان کا چہرہ دیکھا۔وہ اپنے سامنے بیٹھی رافعہ نامی اس خاتون سے پہلی بار مل رہی تھیں۔

" آپ میرے بیٹے کو جانتی ہیں۔۔آپ مل چکی ہیں اس سے" اندازے کے عین مطابق انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔سر آفاق بھی اب متجسس ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

" میں اسے جانتی ہوں نا اس سے ملی ہوں لیکن گزشتہ چند سالوں سے سلمان اس کا اتنا ذکر کرتا رہا ہے کہ لگتا ہے میں آپ کے بیٹے کو بہت قریب سے جانتی ہوں" رافعہ حیدر نے ان کی تڑپ کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔وہ سلمان کے کہنے پہ ان سے ملنے آئی تھیں۔سلمان چاہتا تھا کہ اس سے پہلے سب معاملات ناول کے ذریعے پبلک تک پہنچیں۔یہ بہت ضروری ہے کہ نور محمد کے گھر والے ان سب باتوں سے آگاہ ہوں۔۔اسی لئے وہ یہاں موجود تھیں۔

" میرا بیٹا کہاں ہے" آفاق صاحب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دوسرا سوال کیا تھا۔نور محمد کا ذکر انہیں ہمیشہ لاچار کر دیا کرتا تھا ۔اتنے سال گزر چکے تھے اور اتنے سالوں میں ان کی امید روز مرتی تھی روز جیتی تھی۔امائمہ کی شادی کے بعد سے تو وہ بیٹے کے غم سے مزید

بے حال رہنے لگے تھے۔ دل کو پچھتاوے ہی ستاتے رہتے تھے کہ انہوں نے اولاد کی قدر نہیں کی۔ ان کے اندر اب یہ آس دم توڑنے لگی تھی کہ وہ کبھی اپنی پہلوٹھی کی اولاد سے مل پائیں گے۔ چند سال پہلے ملنے والے کارڈز کے علاوہ اس کی جانب سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تو اس حد تک مشکوک رہتے تھے کہ یہ کارڈز بھی نجانے اس نے خود بھیجے تھے بھی یا نہیں۔

"سر! آپ پلیز حوصلے سے کام لیجیے گا۔۔۔ خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔۔۔" یہ سلمان نے کہا تھا۔

"آپ حوصلے کی بات مت کیجیے بیٹا۔۔۔ پہاڑ جتنا حوصلہ ہے میرا۔۔۔ اعصاب ہچکولے کھا کھا کر اب اتنے پتھر دل ہو چکے ہیں کہ بڑی سے بڑی خبر سن بھی سکتے ہیں اور سہہ بھی سکتے ہیں" یہ مسز آفاق نے کہا تھا۔ ان کا چہرہ اس لمحے اتنا سپاٹ تھا کہ رافعہ حیدر کو ان پر ترس آیا۔ وہ حوصلہ مندی سے سفاک نہیں نظر آتی تھیں۔ انہیں تھکن نے اس حال تک پہنچایا تھا۔

"آپ ہمیں ایسے مت دیکھیں۔۔۔ ہم ٹھیک ہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا ہمیں۔۔۔ ہم اب اس حال کو پہنچ چکے ہیں کہ کوئی اس کے مرنے کی خبر بھی دے گا تو ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ وہ اللہ کے پاس ہے۔ اللہ اسے مجھ سے زیادہ لاڈ اور توقیر سے رکھ رہے ہوں گے۔۔ اللہ کے یہاں تو اس کی قدر ہو رہی ہوگی نا" سر آفاق نے کہا تھا۔

"بات اس سے بھی زیادہ بڑی ہے سر۔۔۔ وہ زندہ ہے لیکن۔۔۔" سلمان نے کہا پھر رک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"وہ گوانتاناموبے میں ہے سر" اس نے بطورِ خاص مسز آفاق کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔

"کہاں۔۔۔ گوانتاناموبے۔۔۔ لیکن کیوں۔۔۔ وہاں تو۔۔ وہاں تو۔۔۔ دہشت گرد رکھے جاتے ہیں۔۔ میرے معصوم بیٹے نے کیا بگاڑا ہے کسی کا۔۔" بات واقعی بیٹے کی مرگ سے بڑی تھی۔

"میں آپ کو تمام باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں سر۔۔۔ یہ سازش بہت پہلے شروع ہوئی تھی جب نور محمد کے ماموں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اپلائی کیا تھا۔۔۔" سلمان نے کہنا شروع کیا تھا۔ وہاں سے جہاں سے یہ ساری سازش شروع ہوئی تھی۔ نور محمد کے چاہنے والے، اسے جاننے والے۔۔۔ وہ ہر شخص کا تذکرہ کرتا رہا۔۔۔ صوفی سیف اللہ۔ استقلال بیگ۔۔ بل گرانٹ۔۔ وہ دونوں میاں بیوی تمام تر سماعتیں اس کی جانب مبذول کئے ایک ایک لفظ کو بغور سن رہے تھے۔

"2007 میں وہ پولیس کی جانب سے مقتول قرار دیا گیا تھا۔ میں یہ بات جانتا تھا لیکن میں نے جب آپ کو بتانے کی ہمت کی تب ہی آپ نے مجھے وہ پوسٹ کارڈز دکھا دیے۔ جب آپ کو وہ پوسٹ کارڈز ملے تھے تب ہی میں حیران ہو گیا تھا کیونکہ میں نے خود اس فیونرل میں شرکت کی تھی جو نور محمد کے لئے پڑھایا گیا تھا۔ یہ ایک بے حد انوکھی بات تھی سر۔۔ آپ کو لوٹن سے کارڈز بھیجے گئے تھے پھر جب میں نے لوٹن کال کی اور نور محمد عرف بل گرانٹ سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کو بھی کچھ کارڈز ملے ہیں جو پاکستان سے بھیجے گئے تھے۔۔ ابھی یہ ہی الجھن نہیں سلجھی تھی کہ میرے ایک مہربان میجر اظہر نے مجھے کچھ تصاویر دکھائیں۔ یہ تصاویر ایک ڈاکیومنٹری کے اسکرین شوٹس تھے جس میں نور محمد کچھ قیدیوں کے ہمراہ زرد لباس پہنے نظر آ رہا تھا۔ ہم سب کو گمراہ کیا جا رہا تھا کہ ہم کنفیوز ہو جائیں" وہ سب کچھ بتا چکا تھا لیکن بہت کچھ ابھی بھی باقی تھا۔

"سر سازش اتنی بڑی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی۔۔۔کون خیر خواہ ہے اور کون بد خواہ۔۔۔ آپ یقین کیجئے میں بہت سی چیزوں سے واقف ہوں لیکن میرا خود کا دماغ گھوم جاتا ہے جب کیا کب کیسے کہاں کس طرح والے سب سوال اٹھتے ہیں۔۔۔بہت سے لوگ ہیں جو ایسی سازشوں کا شکار ہوتے ہیں۔نور محمد ان میں سے ایک ہے۔۔۔بہر حال ایک بات طے ہے وہ المہاجرون کے نام پر بدنام کیا گیا جبکہ اس کا کوئی تعلق اس تنظیم کے ساتھ تھا ہی نہیں۔اس کی بے گناہی کے ثبوت بھی موجود ہیں۔۔۔وہ لوٹن کی ایک جامعہ مسجد میں بے ضرر زندگی گزار رہا ہے۔اس کی گواہی خود بل گرانٹ صاحب دیں گے جو اس کے ساتھ رہیں ہیں اور اس کی نیک خصلت کی تعریف کرتے ہیں اور ان کا ناول "عہد الست" نور محمد کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔۔۔ہمارے پاس بہت سے حقائق ہیں۔ثبوت ہیں۔۔۔میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بہت حوصلہ مند ہیں اور یہ حوصلے کا ہی امتحان ہے۔۔۔یہ اگر جنگ ہے تو سمجھیں اپنے آخری مراحل میں ہے سر۔۔۔اس جنگ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں لیکن۔۔۔اس نے ان دونوں کا چہرہ دیکھتے ہوئے توقف کیا" یہ اپنی جانب سے انہیں حوصلہ دینے کی ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔وہ دونوں ساری گفتگو سننے کے دوران ایک بار بھی رنجیدہ نہیں ہوئے تھے۔

"اب آپکو نور محمد کو قبول کرنے کی زیادہ بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔۔۔لوگ بہت سوال کریں گے۔۔۔انگلیاں پہلے سے زیادہ اٹھیں گی۔۔۔بہتان پہلے سے زیادہ لگیں گے اور ہمت پہلے سے زیادہ درکار ہوگی۔۔۔یہ آسان جنگ نہیں ہوگی" رافعہ حیدر نے سلمان کی نامکمل بات کو مکمل کیا تھا۔سر آفاق نے اپنی اہلیہ کی سمت دیکھا۔ان کی آنکھوں میں وہ حوصلہ چمکنے لگا تھا جسے دیکھنے کی سلمان اور اس کی والدہ کو امید دی تھی۔وہ کچھ بولنا بھی چاہتے تھے لیکن ان کی اہلیہ ان سے بھی پہلے بول اٹھی تھیں۔

"میں نے جب اپنے بیٹے کو کھویا تھا اس دن سے میں صرف ایک بات کے لئے پچھتا رہی ہوں کہ میں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔۔۔اس پر بھروسہ نہیں کیا۔۔۔اس کا خیال تو رکھا۔۔۔اسے محبت تو دی لیکن محبت کا مان نہیں دیا۔ممتا کی طاقت نہیں بخشی۔۔۔یہ میری سنگین غلطی ہے جو مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔۔۔میں اب کوئی غلطی نہیں دوہراؤں گی۔۔۔اب ساری دنیا ایک طرف ہو کر بھی کہے نا کہ میرا بیٹا ایسا ہے ویسا ہے۔۔۔میں نہیں مانوں گی۔۔۔میں کبھی نہیں مانوں گی" رافعہ حیدر اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور انہوں نے مسز آفاق کو اپنے کندھے کے ساتھ لگایا تھا۔

"ہم بھی نہیں مانیں گے۔۔۔ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔۔۔نا ہی ہمارے بیٹے اتنے سستے ہیں کہ دہشت گردی کے نام پر قربان ہوتے چلے جائیں۔۔۔"سلمان نے اپنی امی کو دیکھا۔وہ مسکرایا تھا۔وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔۔۔ہاتھ سے ہاتھ مل رہا تھا۔قدم سے قدم مل رہا تھا۔۔۔منزل دور تھی لیکن راستہ نظر آنے لگا تھا۔



اس نے یو ایس بی کو لیپ ٹاپ میں انسرٹ کر کے اپنے ساتھ بیٹھے پاکستانی دوست شہروز منور کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی آئسکریم کافی کے بڑے سے کپ کو ہاتھ میں لئے اسٹرامنہ میں دیئے ارد گرد کی چکا چوند میں مگن تھا۔ یہ اس کا پانی کا پہلا سفر تھا اور یہ سفر تیمور نے ہی اس کے لئے ترتیب دیا تھا۔ وہ ویلز کی بندرگاہ ہولی ہیڈ سے بذریعہ فیری (چھوٹا بحری جہاز) آئرلینڈ جا رہے تھے۔ تیمور کو احساس تھا کہ اس نے اپنے مہمان کے سامنے اس کے وطن کی خامیاں گنواتے میں کچھ زیادہ ہی سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا سو وہ اپنے رویے کا ازالہ کرنے کی خاطر اسے ویلز اور ڈبلن کی سیر کروا رہا تھا۔ شہروز منور اس کی مہمان نوازی سے خوش دکھائی دیتا تھا اور فیری کے سفر شروع کرتے ہی وہ اطمینان سے عرشے سے پر بیٹھ کر پانی پر بننے والے چاند کے عکس کو دیکھنے میں مگن ہو گیا تھا۔ تیمور کو پانی کا سفر کبھی خوشگوار نہیں لگا تھا۔ وہ یہ اعتراف کرنے سے کتراتا تھا کہ اسے پانی کے سفر سے خوف آتا تھا اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ اِدھر اُدھر دیکھے بنا ہ ایک آدھ گھنٹے میں بل گرانٹ کے مواد کا سرسری جائزہ لے لے تو اچھا ہے۔

وہ اس سارے کھیل کا ایک بہت ہی طاقتور مہرہ تھا۔ عوف بن سلمان کے بعد وہ واحد شخص تھا جو واقعی جانتا تھا کہ نور محمد امریکی تحویل میں ہے۔ عوف بن سلمان کی ڈاکیومینٹری کے لئے اسی نے نور محمد کا پہلا تحریری انٹرویو اور بعد میں فوٹیجز تیار کی تھیں۔ وہ نا صرف اس سے مل چکا تھا بلکہ اس نے اس سے اردو زبان میں کچھ باتیں بھی کی تھیں۔ اس وقت نور محمد کو امریکی تحویل میں آئے چند مہینے ہوئے تھے۔ تیمور نصار کو وہ بہت معصوم بلکہ کسی قدر بیوقوف لگا تھا۔ اس کے پاس وہ فوٹیج اور متعلقہ مواد اور اس کے علاوہ بھی کچھ اہم ثبوت ابھی بھی موجود تھے۔ وہ اس سارے پراجیکٹ سے اور اس کے ایک ایک ٹرن اور ٹوئسٹ سے بخوبی واقف تھا۔ پراجیکٹ "عہد الست" اس کے لئے بھی بہت اہم تھا۔ وہ اپنی اس ڈاکیومینٹری کے متعلق بہت پر امید تھا کہ یہ اس کے کریئر کے لئے ایک بڑا اسٹنگ سیل ثابت ہوگا۔ وہ نا صرف بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا بلکہ یورپ میں اپنے لئے وہ جگہ بھی حاصل کرنے کا خواہاں تھا جو آنے والے وقت میں اسے مزید شہرت کامیابی اور یوروز دلوانے میں اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔

وہ بہت قابل اور کائیاں آدمی تھا۔ اس کی قوتِ مشاہدہ بھی غضب کی تھی۔ وہ اڑتی چڑیا کے پر تو نہیں گن سکتا تھا لیکن اس کی رفتار دیکھ کر اس کی منزل کی سمت کا تعین ضرور کر لیتا تھا۔ نور محمد (بل گرانٹ) کا پراجیکٹ اسی لئے اسے بے حد اہم لگ رہا تھا کہ وہ بالواسطہ اور بلاواسطہ اس کا حریف بن چکا تھا۔ اس نے بل گرانٹ کے ساتھ اس کے گھر میں کچھ مہینے گزارے تھے۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا جس کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا لیکن وہ اپنے پراجیکٹ سے صرف اس بات پر علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بل گرانٹ نے استنے مہینوں اسے اتنا اچھا ٹریٹ کیا تھا اس کے باوجود یہ بھی سچ تھا کہ اسے بل گرانٹ کے مسودے میں بے پناہ دلچسپی تھی وہ ان کے سامنے تو یہی ظاہر کر کے آیا تھا کہ اسے ان کے ناول سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا کہ اسے ایک دفعہ اپنے حریف کے کام کو بھی جانچنے کا موقع مل رہا تھا۔ اسی لئے وہ اپنی ساری توانائی مجتمع کیے لیپ ٹاپ پر آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا۔

یو ایس بی کے انسرٹ ہوتے ہی سسٹم نے اپنا کام کرنا شروع کیا تھا۔ چند لمحوں میں اس کے لیپ ٹاپ نے وہ مواد نقل کرنا شروع کر دیا تھا اور پھر اس کے سامنے عہد الست کا پہلا صفحہ کھل گیا تھا

☆ ☆ ☆

روشنی کو حکم تھا کہ وہ اس کے پورے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ روشنی کی بساط نہ اوقات کہ وہ اس کے حکم سے انکار کرتی سو اس نے فقط پلکیں جھپکی تھیں اور ایک معصوم وجود کو تاریکی سے روشنی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی۔ وہ آچکا تھا ایک ایسی دنیا میں جو تخلیق ہی اس کے لیے کی گئی تھی تا کہ وہ اس طرح جی سکے جس طرح جینے کا حکم ہے۔ اسی لیے وہ مطمئن اور پر سکون تھا۔ اسے زندگی کی نعمت دان کر دی گئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کا ایک ایک نقش، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اور اس کے خون کی ایک ایک بوند اس نعمت پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھی۔ وہ چند لمحے قبل دنیا میں آیا تھا لیکن اس کی حیات مکمل تھیں۔ وہ سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا واقعی" دنیا" ایک حقیقت ہے؟"

☆ ☆ ☆

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں اور پھر بند کر لی تھیں۔ روشنی اسے تکلیف دیتی تھی۔ یہ اسے ماں کی کوکھ سے ماں کی گود تک کا فرق سمجھاتی تھی اور اسے اس فرق سے نفرت تھی۔

"تم کون ہو؟" اس کی سماعتوں نے وہی سوال سنا تھا جس کی وہ عادی تھیں۔ روشنی جب بھی تاریکی کو چیر کر اس تک پہنچتی تھیں۔ اس کی سماعتیں یہی سوال سنتی تھیں۔

"نمبر دو سو ایک" اس نے بکھرتے ٹوٹتے اعصاب کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب بھی دے دیا تھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" یہ دوسرا سوال تھا اور شاید دو سو ویں مرتبہ پوچھا گیا تھا یا دو ہزار ویں مرتبہ۔۔۔ اسے یاد نہیں تھا۔ اسے اس سوال کا صرف جواب یاد رہتا تھا

"پتا نہیں" اس نے جواب دے دیا تھا

"کہاں جاؤ گے؟" تیسرا سوال تھا

"پتا نہیں؟" اس نے تیسرا جواب بھی ٹھیک دیا تھا

"کیا کرتے ہو؟" اس نے تیسرا جواب ٹھیک دیا تھا اس لئے چوتھا سوال پوچھا گیا

"پتا نہیں"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" یہ آخری سوال تھا

"پتا نہیں" اس نے آخری سوال کا جواب بھی درست دیا تھا۔

"بہت خوب، تم بہت ذہین ہو۔۔ تم نے سب کچھ سیکھ لیا ہے۔۔۔ اب تم جنت میں جانے کے لئے بالکل تیار ہو۔۔۔ وہاں زندگی قابل رشک ہو گی کیونکہ وہاں ستر حوریں ہوں گی۔۔۔ ستر ہوں گی یا اسی ہوں گی۔۔ یاد رکھنا تم ایک کے بھی قابل نہیں ہو گے۔۔۔ وہ تمہاری چھپکلی جیسی شکل پر تھوک دیں گی لیکن کفران نعمت مت کرنا۔۔ وہ حوریں ہمیں دے دینا۔۔ ہم نے یہاں تمہارا خیال رکھا ہے، تم وہاں ہمارا خیال رکھنا۔۔۔ او کے باس۔۔"

اس کی گھٹی ہوئی بصارت و سماعت نے تضحیک و تحقیر کی آمیزش سے تر جملہ سنا تھا پھر کمی کرتی ہوئی ہنسنے کی آوازیں آئی تھیں۔ یہی آخری جملہ تھا جو ہمیشہ تبدیل ہو جاتا تھا باقی سب وہی تھا جو ایک عرصے سے وہ سنتا تھا۔ اس سوال کے ساتھ ہی اس کی گردن بالکل ایک طرف کو لڑھک گئی تھی۔ اس کے اعصاب کی بچی کچھی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتا۔ اسے ایک پلیٹ تھما کر آگے دھکیل دیا گیا تھا

اسے کچھ سمجھ آتا تھا کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کے دماغ تک جانے والی رگوں کا راستہ پتا نہیں کیوں اتنا پیچیدہ ہو گیا تھا کہ وہ خون جو طاقت و توانائی کا منبع ہے ان رگوں میں چکرا تا رہتا تھا مگر منزل تک نہیں پہنچ پاتا تھا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ غنودگی میں رہتا تھا اور ہوش و حواس میں آتا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت نیند کی کیفیت اس پر مسلط رہتی تھی۔ اسے واقعی یاد نہیں تھا وہ کون تھا، وہ کیا تھا، وہ کہاں تھا اور وہ کیوں تھا۔ اسے ایک لفظ ادا کرنا آتا تھا

"نہیں" وہ ہر سوال کا جواب یہی دیا کرتا تھا کیونکہ ایک عرصے سے اس پر بہت سے تشدد کر کر کے اسے سکھایا گیا تھا کہ اسے صرف "نہیں" بولنا ہے اور اب اسے "نہیں" پر اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ وہ بولتا ہی "نہیں" تھا۔ اسے "نہیں" بولنے پر معافی ملتی تھی اور کھانا بھی اور وہ اس صورتحال سے بہت مطمئن تھا ورنہ ابتداء میں جب وہ بن بول اور سمجھ سکتا تھا تب اسے "نہیں" بولنا نہیں آتا تھا تب اسے کھانا اور معافی دونوں پانے کے لئے بہت سخت سزاؤں سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ باتھ روموں میں بتوں کے ساتھ بھی سویا تھا اور بتوں کی غلاظتیں بھی کھائی تھیں۔ اس کے اعصاب نے اتنے بدبودار احساسات سہے تھے کہ اس کی حیات مفلوج نا ہوتیں تو خودکشی کر لیتیں۔ سو اب وہ اس "لایعنی کیفیت" میں خوش تھا۔ "نہیں" اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہ "نہیں" اسے پہلی قطار سے دوسری تیسری اور پھر چوتھی قطار تک لے جاتا تھا۔ پہلی قطار میں اچھی کارکردگی پر دوسری قطار کا پاس ملتا تھا دوسری قطار میں پلیٹ اور گلاس ملتا تھا۔ تیسری قطار میں پھیکا شوربہ اور ایک بن ملتا تھا۔ چوتھی قطار سب سے اچھی تھی وہاں اسے ایک انجکشن دیا جاتا تھا جو اسے اس "نہیں" کی کیفیت سے نکال کر کہیں دور بہت دور لے جاتا تھا۔ وہ اس کی ماں کی گود تھی جہاں وہ سکو سمٹ کر لیٹ جاتا تھا وہاں صرف سکون تھا اور جب وہ اس پر سکون کیفیت سے نکلتا تھا تو اسے صرف اپنا نام یاد رہتا تھا۔۔۔ نمبر دو سو ایک۔۔۔ یہاں اس کا یہی نام تھا

☆ ☆ ☆

آسمان کی سیاہی پانی کو پوری طرح اپنے رنگ میں رنگے ہوئے تھی لیکن دور سے نظر آتی تاریکی کو چیرتی ہوئی روشنیاں پانی پر اپنا عکس دیکھنے کے قابل ہوتیں تو خود ہی اپنی بلائیں لیتے نا تھکتیں۔ شہروز بھی ان کی جھلملاتی شرارتوں سے مبہوت ہوا جا رہا تھا۔ وہ کب سے عرشے پر کھڑا دور سے نظر آتی ان روشنیوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔ آئر لینڈ کی بندرگاہ نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ شہروز کا یہ فیری (چھوٹا بحری جہاز) کا پہلا سفر تھا۔ وہ تیمور نصار کے ساتھ آئر لینڈ جا رہا تھا۔ پہلے وہ اسی کے ساتھ برمنگھم آیا تھا پھر بذریعہ سڑک مختلف شاہراہوں سے ہو کر ویلز پینگور سے ہوتے ہوئے وہ ہولی ہیڈ (ویلز کی بندرگاہ) پہنچے تھے اور پھر بذریعہ فیری اب وہ ڈبلن جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ ایک تفریحی ٹور تھا جو تیمور نصار نے اس کی خاطر ترتیب دیا تھا۔ لندن میں عمر سے چپقلش کے بعد بظاہر کوئی فرق نہیں پڑا تھا لیکن دلوں میں بال سا آگیا تھا۔ اس کی واپسی میں بھی چند دن ہی باقی رہ گئے تھے سو اب وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کا بہانہ کر کے آرام سے اپنے کام نبٹانے میں مگن تھا۔

تیمور فیری میں سوار ہوتے ہی اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ گیا تھا اور اب وہ اسی میں مکمل طور پر غرق تھا۔ شہروز بھی اسی لئے اس سکون کو محسوس کرنے میں مگن ہو گیا تھا جو ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔ یہاں پوری دنیا آباد نظر آتی تھی۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پانی پر سفر کر رہا ہے بلکہ یہ ایک شاپنگ مال میں گھومنے پھرنے کے برابر تھا جہاں نا صرف ایک لائبریری تھی، بچوں کے لئے پلے ایریا تھا۔ فوڈ کورٹ بھی تھا جہاں تقریباً دس مشہور فوڈ چینز کے اسٹال تھے غرضیکہ احساس ہی نا ہو رہا تھا کہ یہ ایک چھوٹا موٹا بحری سفر ہے۔ ان دونوں نے اپنے لئے کافی لی تھی اور اب اطمینان سے منزل پر پہنچنے کا انتظار تھا۔ آدھا گھنٹے میں وہ ڈبلن کی بندرگاہ پر پہنچ گئے تھے۔ تیمور ابھی بھی لیپ ٹاپ میں منہ دیے کام میں مصروف تھا۔۔۔ ڈبلن کی پورٹ پر پہنچ کر سب لوگ قطار بنا کر باہر نکلنے لگے تھے جب تیمور نے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا۔ شہروز بھی اس کو اٹھتا دیکھ کر ہی اٹھا تھا۔ فیری سے باہر نکل کر وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ "پاسپورٹ کنٹرول" نام والی تختی نے ان دونوں کو ہی ٹھٹھک کر رکنے کے لئے مجبور کیا۔

"پاسپورٹ۔۔؟" شہروز نے حیرانی سے تیمور کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ پاسپورٹ نہیں لایا تھا۔ اس کے اس طرح کے تمام ضروری کاغذات چاچو کے گھر میں ہی تھے کیوں کہ پاکستان کے لئے اس کی فلائٹ ہیتھرو سے ہی تھی۔ وہ انہیں ہمہ وقت اپنے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے پاکستان سے آتے ہی اس بارے میں عمر سے پوچھا تھا تو عمر نے کہا تھا یہ لندن ہے سعودی عرب نہیں ہے کہ ہر وقت اپنی شناختی دستاویز ساتھ لے کر پھرنا پڑے اور اب یہاں امیگریشن حکام کا ہونا اسے کنفیوژ کر رہا تھا۔ تیمور اس کے عقب میں ہی تھا

"کیا یہاں پاسپورٹ کی ضرورت پڑتی ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔ وہ کندھے اچکا کر آگے دیکھنے لگا۔

"پاسپورٹ پلیز" ایک آفیسر نے ان کے کنفیوزڈ چہرے دیکھ کر خود بھی سپاٹ چہرہ بنا لیا تھا۔ شہروز ایک بار پھر مڑ کر تیمور کی جانب دیکھنے لگا

"ایکسکیوزمی۔۔ کیا یہاں پاسپورٹ کی ضرورت پڑتی ہے؟" تیمور نے وہی سوال آفیسر سے پوچھا جو شہروز نے اس سے پوچھا تھا

"آف کورس۔۔۔ آئر لینڈ ایک آزاد ملک ہے۔۔ برطانیہ نے اس پر اپنا تسلط جما رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آئیوالوں سے

پاسپورٹ بھی طلب نہیں کر سکتے۔۔" اسی آفیسر کے ساتھ کھڑی ایک لیڈی آفیسر نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔وہ سخت نگاہوں سے شہروز کو دیکھ رہی تھی۔تیمور شہروز کے بالکل ساتھ ہو کر آفیسر ڈیسک کے سامنے آ گیا

"معاف کیجئے گا۔ہمیں کسی نے ہولی ہیڈ سے روانہ ہوتے وقت اس بارے میں نہیں بتایا تھا ورنہ ہم پاسپورٹ ساتھ لے آتے۔۔میں تیمور ہوں۔میرا تعلق ترکی سے ہے۔یہ میرے پاکستانی دوست ہیں۔۔ڈبلن دیکھنے کے لئے میرے ساتھ آئے ہیں۔آپ اجازت دیں تو ہم دو گھنٹے میں شہر دیکھ کر واپس آ جاتے ہیں۔۔اگر آپ کو اس میں کوئی قباحت محسوس ہوتی ہے تو ہم یہیں سے واپسی کا ٹکٹ لے کر واپس چلے جاتے ہیں" وہ بے حد مہذب اور شستہ لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں ایک دوسرے کو کچھ اشارہ کیا

"کیا آپ کے پاس آپ کی شناخت کے لئے کوئی دستاویز ہے؟" لیڈی آفیسر نے تیمور کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔وہ کچھ زیادہ ہی کھوئی ہوئی کیفیت میں تھا۔اس نے لمحہ بھر سوچا پھر نفی میں سر ہلایا پھر یکدم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا

"میرے پاس لندن کی پبلک لائبریری کا کارڈ ہے۔۔آپ وہ دیکھ سکتے ہیں۔۔میں کئی سالوں سے یہاں ہوں۔۔ڈبلن پہلی بار آنے کا اتفاق ہوا ہے"

"کیا ہم اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں" لیڈی آفیسر نے کہا تھا۔تیمور نے سر ہلایا۔شہروز نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔اس کے والٹ میں اس کا پاکستانی شناختی کارڈ موجود تھا اور اس کے علاوہ اس کے پاس اس چینل کا کارڈ بھی تھا جس کے لئے وہ کام کرتا تھا۔وہ بہت آرام سے اپنے یہ کارڈز ان کو دکھا سکتا تھا۔تیمور کے سر ہلانے پر لیڈی آفیسر نے اس کی اینٹری کر دی تھی۔وہ آرام سے آگے بڑھا تو شہروز نے اس کی جگہ لے لی تھی

"آپ پاکستانی ہیں" وہ پوچھ رہی تھی۔اس نے کارڈ کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔شہروز نے سر ہلایا۔تیمور اسے باہر انتظار کرنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا تھا

"آپ ایک طرف آ جائیے" اسی آفیسر نے شہروز کو کہا۔اسے بڑی حیرانی ہوئی لیکن وہ اس کے اشارہ کی گئی سمت میں ہو گیا تھا۔اگلا مسافر اس کی جگہ پر آ گیا۔وہ اسی آفیسر کی رہنمائی میں ڈیسک کے اندر کی جانب ہوا تھا۔

اپنا بیگ یہاں رکھ دو" اس لیڈی آفیسر کا لہجہ کیبن میں جاتے ہی بہت کرخت ہو گیا تھا۔شہروز کو کافی برا محسوس ہوا۔اس نے کچھ کہے بناء اپنا بیگ میز پر رکھ دیا تھا۔یہ ایک چھوٹا سا سفری بیگ تھا۔اس میں لیپ ٹاپ کے علاوہ ایک چھوٹا تولیا اور اسی طرح کی چند ضروری چیزوں کے علاوہ کچھ نا تھا۔وہ آفیسر اس کے بیگ کو تنقیدی نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس پر اسکینر پھیرنے لگی تھی پھر اس نے شہروز کو دیکھا

"اسے کھولو" یہ دوسرا حکم تھا۔

"میرے پاس میرا شناختی کارڈ ہے" شہروز نے وضاحت کی۔لیڈی آفیسر نے اسے گھور کر دیکھا

"میں نے کہا بیگ کھولو"

"اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔۔صرف ایک لیپ ٹاپ۔۔۔" وہ اتنا ہی بولا تھا کہ اس کی بات کاٹ دی گئی

"اسے کھولو" اس آفیسر کا لہجہ مزید کرخت ہوا۔شہروز کے بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔اس آفیسر کو بولنے کی بھی تمیز نہیں تھی

"اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے گھورتے ہوئے بیگ کھول دیا تھا

وہ تنقیدی نگاہوں سے بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اس نے اندرونی چھوٹی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چیک کرنا شروع کیا تھا

"تم مجھے چور سمجھ رہی ہو؟" وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔لیڈی آفیسر نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس سے بھی زیادہ چڑ کر بولی۔۔۔

"نہیں۔۔۔دہشت گرد" شہروز کا دماغ شخص کی آواز کے ساتھ پھٹا تھا

"کیا۔۔کیا کہا تم نے۔۔۔میں تمہیں دہشت گرد نظر آ رہا ہوں۔۔کیا میرے سینے پر بارودی جیکٹ بندھی دیکھی ہے تم نے؟" اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔یہ اس کی توہین تھی۔اس نے خود دیکھا تھا وہاں پاسپورٹ کنٹرول والے ڈیسک پر ہر شخص کو معمولی کاروائی کے بعد جانے دیا جا رہا تھا تو پھر اس کو کیوں روک لیا گیا تھا

"تم خاموش رہو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔۔۔میں نے ابھی تمہاری جیکٹ چیک نہیں کی۔۔لیکن کوئی بعید نہیں کہ تمہاری شرٹ کے نیچے ایسا کچھ ہو۔۔آخر تم مسلمان ہو۔۔اور پھر پاکستانی بھی ہو" وہ خباثت سے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی بھی تھی۔۔شہروز کا دل چاہا اس کا گلا دبا دے۔

"کیا بکواس ہے یہ۔۔میں ایک معزز شہری ہوں۔۔میرا کوئی پولیس ریکارڈ ملا ہے کیا جو تم مجھے دہشت گرد قرار دے رہی ہو"

"میں دوسری بار کہہ رہی ہوں۔۔مجھے اپنا کام کرنے دو اور خاموش رہو" وہ شہروز کے غصیلے انداز پر غرا کر بولی۔شہروز کے نتھنے غصہ برداشت کرنے کے چکر میں پھولنے لگے تھے۔لیڈی آفیسر اس کی جانب دیکھے بنا اب بیگ کو ٹٹولنے میں مصروف تھی۔لیپ ٹاپ والے بیگ سے اس نے کچھ کاغذ برآمد کیے تھے۔یہ اخبارات کے کچھ تراشے تھے،وہ انہیں کھول کر دیکھنے لگی تھی۔شہروز نے یہ تراشے کچھ پرانے اخبارات سے لیے تھے۔ان میں ای ڈی ایل (یو پی ایل یعنی لوٹن کے رہنے والے تعصب پسند سفید فام لوگوں کی یہ تنظیم کالعدم ہو گئی تھی تو پھر اس کی جگہ ایک تنظیم ای ڈی ایل بنائی گئی تھی) کے متعلق ایک آرٹیکل تھا۔لوٹن کے رہنے والے ایک سعودی مسلمان نے سویڈن میں خودکش حملہ کیا تھا جس کی تصویر اور اس کے متعلق مواد بھی ان تراشوں میں شامل تھا۔۔شہروز یکدم کچھ محتاط ہوا تھا۔اس نے یہ تراشے کسی غلط مقصد کے لئے نہیں سنبھالے تھے۔وہ انہیں صرف فراغت کے اوقات میں پڑھنا چاہتا تھا

"یہ آرٹیکلز ہیں۔۔۔میں ایک ڈاکیومینٹری پر کام کر رہا ہوں۔۔۔جو کہ۔۔۔" اس نے وضاحت دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس آفیسر نے اس کی بات درشت انداز میں کاٹ دی تھی

"اپنی شرٹ اتارو"

"کیا آآآ۔۔تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا آفیسر۔۔میں نے آخر کیا کیا ہے۔۔میرے بیگ سے بم نکل آیا ہے کیا۔۔۔یہ عام سے اخباری تراشے ہیں۔۔۔میں ان سے کوئی دھماکہ نہیں کرنے والا تھا" وہ انتہائی برامان کر بولا تھا۔پاکستان ہوتا تو وہ ہر چیز کولات رسید کر کے اب تک باہر نکل چکا ہوتا لیکن یہ آئرلینڈ تھا۔

"تم اگر خود شرٹ اتار سکو تو اچھا ہے ورنہ میں اپنے ساتھی کو بلوالیتی ہوں۔۔۔یہ ضابطے کی کاروائی ہے۔۔تم اگر تعاون کرو تو اچھا ہے" لیڈی آفیسر اب کی بار ذرا نرم لہجے میں بولی تھی۔وہ بار بار ان اخباری کٹنگز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"یہ اگر واقعی ضابطے کی کاروائی ہے تو پھر سب کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔۔۔صرف میرے ساتھ کیوں۔۔مجھے وضاحت کا موقع تو دو" اس کے نرم لہجے سے شہروز کو مزید شہ ملی تھی۔وہ چلا کر بولا تھا

"پاسکر۔۔اندر آؤ۔۔مجھے تمہاری ضرورت ہے" اس لیڈی آفیسر نے باہر کی جانب منہ کر کے اونچی آواز میں کہا تھا۔ایک لمحے میں ہی اس کا اونچا لمبا ساتھی اندر آگیا

"کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ شخص تلاشی لینے نہیں دے رہا" اس نے کندھے اچکا کر کہا اور وہ کٹنگز بھی اس کے چہرے کے آگے لہرائی تھیں۔پاسکر نامی آفیسر نے اسے گھور کر دیکھا

"میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔۔۔ہم صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔۔آپ تلاشی لینے دیں"

"میں تعاون کر رہا ہوں۔۔آپ تلاشی لے لیجیے۔۔۔لیکن میرے صرف ایک سوال کا جواب دیں۔۔کیا آپ لوگ سب ہی آنے والوں کی شرٹس اتروا کر تلاشی لیتے ہیں۔۔۔اگر آپ کا جواب ہاں ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔آپ بخوشی اپنا کام کیجیے لیکن اگر سب کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جاتا تو میرے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا

"تم مسلمان ہو"

"وہ شخص جو میرے ساتھ آیا ہے وہ بھی مسلمان ہے۔۔۔اس کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا تم نے" شہروز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں

"تم مسلمان ہو اور پاکستانی بھی۔۔۔دہشت گردی کے عالمی کھلاڑی۔۔۔میں تمہیں یہ بات پہلے ہی بتا چکی ہوں" وہ آفیسر کندھے اچکا کر بولی تھی

"سب مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں۔۔۔یہ بات تم جتنی جلدی ذہن نشین کر لو۔۔تمہارے لئے اتنا اچھا ہے" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا تھا

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔لیکن تم پاکستانی بھی ہو" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔شہروز کے تلووں سے لگی اور سر پہ بجھی

" پاکستانی دہشت گرد نہیں ہیں" وہ مڑ کر بولا تھا
" میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی ۔۔تم میرا بہت وقت ضائع کر چکے ہو ۔۔۔اب مجھے اپنی ڈیوٹی کرنے دو ۔۔۔میں تمہیں جانے دیتی اگر تمہارے بیگ سے یہ تراشے نا ملتے" وہ ٹس سے مس بھی نہیں ہوئی تھی ۔شہروز غصے سے کھولتا ہوا ان کی جانب دیکھتا رہا
" شرٹ اتار دو مسٹر" پاکر بولا تھا
" شہروز نے خاموشی سے اپنی شرٹ اتار دی تھی ۔ان دونوں آفیسر نے چیک کیا کہ اس نے کوئی جیکٹ تو نہیں پہن رکھی ۔اسی لیڈی آفیسر نے اس کے پاؤں تک ہاتھ لگا کر چیک کیا تھا۔
" کیا تم لوگ اب یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی پینٹ بھی اتار دوں" وہ نظروں ہی نظروں میں انہیں بھونتے ہوئے بولا تھا۔وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسے۔
" اوہ ۔۔۔اب اتنے بھی بیرومت بنو ۔۔" پاکر بولا تھا ۔اس کے بعد وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ اشاروں کی زبان میں باتیں کرتے رہے ۔لیڈی آفیسر نے آئرش میں اپنے ساتھی سے کچھ بات بھی کی جس سے شہروز فقط اندازہ ہی لگا سکا کہ وہ عورت اسے اینٹری دینے کے خلاف تھی جبکہ پاکر نامی آفیسر تراشوں کو معمولی قرار دیتے ہوئے شہروز کو جانے کی اجازت دینے کی حمایت کر رہا تھا
" تم اپنی شرٹ پہن سکتے ہو" بالآخر اسے اجازت دے دی گئی تھی ۔لیڈی آفیسر نے وہ تراشے اپنے پاس ہی رکھ لیے تھے
" شکریہ ۔۔۔بہت مہربانی " شہروز کا انداز ابھی بھی ویسا ہی تھا۔
" اب تمہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں" وہ باآواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔
" مجھے یہ یقین تب تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم ڈبلن سے واپس نہیں آجاتے ۔۔۔تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو ۔۔۔تمہارے بارے میں مشکوک رہنے کے بہت سے جواز ہیں میرے پاس" وہ لیڈی آفیسر بے حد بدتمیز اور مغرور تھی۔
" بھاڑ میں جاؤ تم دونوں" وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔اس نے شرٹ کے بٹن لگائے تھے اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔باہر موجود آفیسر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور شہروز کا پارہ یہ دیکھ کر مزید ہائی ہو گیا کہ قطار میں جو لوگ موجود تھے وہ بھی اسے گھورنے میں مگن تھے شاید اس کی بلند آوازیں باہر تک آرہی تھیں ۔وہ انتہائی برا چہرہ بناتا ہوا باہر کی سمت آیا تھا۔ذرا سا ہٹ کر ویٹنگ ایریا میں تیمور اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔
" مجھے واپس جانا ہے" وہ دوٹوک انداز میں بولا تھا
" کیا ہوا ۔کوئی مسئلہ ہو گیا کیا ۔۔سب ٹھیک ہے نا" وہ اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر بولا ۔
" سب ٹھیک ہے ۔۔ضرورت سے زیادہ ٹھیک ۔۔۔اب واپس چلیں ۔۔تم چاہو تو بعد میں آجانا" شہروز نے اتنا کہا اور پھر اس کی

جانب دیکھے بناء واپسی کے لئے قدم بڑھائے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر اس سرزمین سے دور چلا جائے جہاں اسکی اتنی توہین کی گئی تھی۔ ان دونوں آفیسرز کو گالیاں دینے کی خواہش اس کے دل میں اتنی زور سے اٹھ رہی تھی کہ اسے برداشت کرتے ہوئے وہ مزید تپ رہا تھا۔ یہ پردیس تھا جہاں اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا تھا جو اگر اس کے ساتھ اس کے دیس میں کوئی کرتا تو اس سے مار ہی کھا لیتا۔

کیا وہ واپسی کے سفر پر چل پڑا تھا

☆ ☆ ☆

"آپ پاکستان آئیں گے؟" سلمان نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔ نور محمد (بل گرانٹ) نے سر ہلایا اور پھر ان کی آواز سنائی دی۔

"بہت خوشی اور طمانیت کے ساتھ" وہ واقعی پرسکون لگتے تھے۔ سلمان کو بھی اچھا لگا۔ یہ ان کے ساتھ اس کی پہلی اسکائپ کال تھی۔ وہ کچھ عرصے سے اس کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے بالخصوص تب سے جب سے انہوں نے دوبارہ سے "عہد الست" پر کام شروع کیا تھا۔ وہ بہت سے نکات اس کے ساتھ زیر بحث لاتے رہے تھے۔ سلمان بھی اپنی کارکردگی کے متعلق ہر بات رپورٹ کرتا رہتا تھا۔ آج اسکائپ پر ویڈیو کال پہلی مرتبہ ہو رہی تھی۔ سلمان نے دیکھا ان کی سرمئی اور سنہری داڑھیوں والی داڑھی پہلے سے کچھ گھنی ہو چکی تھی اور چہرہ پہلے سے زیادہ پرنور ہو چکا تھا۔ اسے ان پر رشک آیا۔ وہ اللہ کے چنیدہ بندوں میں سے تھے۔

"ہمیں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے بہت اچھا لگے گا۔۔۔ پاکستان کو آپ سے ملاقات کا بے چینی سے انتظار رہے گا" وہ اپنی خوشی چھپائے بناء بولا تھا۔

"اور مجھے اس دن کا بے چینی سے انتظار ہے جس روز نور محمد اپنی سرزمین پر قدم رکھیں گے۔۔۔ اپنے گھر والوں سے ملیں گے۔۔۔ میں اس روز ذہنی طور پر بالکل ہلکا پھلکا ہو جاؤں گا"

"انشاء اللہ۔۔۔" سلمان نے کہا لیکن اس کا انداز کسی قدر پژمردہ ہو چلا تھا۔

"میں چاہتا ہوں آپ میرے آنے پر ایک پریس کانفرنس کی تیاری کریں۔۔۔" نور محمد کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں بکھری تھیں

"پریس کانفرنس۔۔۔ وہ کس لئے سر!"

"میں جانتا ہوں عہد الست کی اشاعت کے بعد نور محمد کے متعلق بہت سے مزید سوالات اٹھیں گے۔۔۔ مزید ابہام پیدا ہو جائیگا۔۔۔ میں اس ابہام کو دور کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ابہام جتنا کم ہوگا، ہماری بات میں اتنا ہی وزن پیدا ہوگا۔۔۔ اس سے نور محمد کی جلد رہائی میں مدد ملے گی" ان کی دلیل میں وزن تھا مگر سلمان نے اس تجویز کو رد کر دیا تھا

"سر! میڈیا کے ساتھ آپ کی براہ راست ملاقات کوئی اچھی تجویز نہیں ہے۔۔۔ آپ ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے پائیں گے۔۔۔ میں آپ کے علم و ہنر یا تجربے پر شک نہیں کر رہا لیکن حقیقت یہ ہے کچھ چیزیں آپ کو الجھا دیں گی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں نے گزشتہ سالوں میں جب بھی کسی سے عہد الست یا نور محمد کے متعلق بات کی ہے۔۔۔ لوگوں نے اسے مثبت طریقے سے نہیں لیا ہے۔ زیادہ تر

لوگ باقاعدہ ثبوت مانگتے ہیں ورنہ وہ ہماری بات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہیں۔ آپ مجھے اور بیجر صاحب کو میڈیا سے نپٹنے دیں۔" سلمان کا اپنا ایک موقف تھا۔

"میں نے گزشتہ سالوں میں دنیا سے چھپ کر دیکھ لیا ہے۔۔۔ یہ بے فائدہ ہے۔۔آپ نہیں چھپ سکتے۔۔آپ کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔۔ورنہ آپ بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔۔۔میں نے نور محمد سے عقیدت تو رکھی لیکن ان سے بددیانتی بھی کی۔۔ان کے بارے میں اتنا عرصہ خاموش رہنا عقلمندی نہیں تھی۔۔۔میں نے یہ سوچنے میں بہت وقت گزارا کہ میری بات جھوٹ قرار دی جائے گی یا لوگ مجھے مورد الزام ٹھہرائیں گے۔۔۔مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کہیں نا کہیں ہم دینِ اسلام کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھ رہے ہیں۔۔۔خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں، اس کی پیروی بھی کرتے ہیں لیکن دنیا کے سامنے اسے ڈیفینڈ بھی نہیں کرتے۔۔۔ڈر جاتے ہیں۔۔۔میں کیوں اس بات سے خوف زدہ رہوں کہ میں اگر اسلام کے متعلق ٹھوک بجا کر بات کروں گا تو لوگ مجھے دہشت گرد سمجھیں گے۔۔لوگوں کو جو سوچنا ہے۔۔وہ سوچیں گے۔۔کل انسانیت کو راہِ راست پر لانا میرا کام نہیں ہے۔۔۔یہ اللہ کا کام ہے۔۔میں یا آپ اللہ کے کاموں کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔۔۔ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں۔۔۔نڈر بے خوف کوشش۔۔بس اب مجھے کوشش کرنے دیں۔۔۔مجھے اس خوف سے نکلنے دیں۔۔۔میں نور محمد کی رہائی کی لئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا ہوں" وہ چپ ہوئے یہ دیکھنے کو کہ سلمان ان کی بات سن بھی رہا ہے، کہیں رابطہ کٹ تو نہیں گیا

"ہمم۔۔" سلمان نے ہنکارا بھرا تھا۔

"آپ نور محمد کی رہائی والی بات پر اس قدر مایوس کیوں لگتے ہیں؟" نور محمد نے اس کے انداز کو بغور دیکھا تھا۔ سلمان نے چند ساعتیں کچھ سوچنے میں گزاریں۔

مایوس تو نہیں ہوں سر!" اس کے منہ سے ان کے سوال کے جواب میں پہلا جملہ یہی نکلا تھا۔ اس کا انداز اس کے بیان کی نفی کر رہا تھا

"سر! مجھے آپ کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔۔۔آپ جو کہہ رہے ہیں وہی سچ ہے۔۔۔برحق ہے۔۔۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری ہر کوشش کے باوجود ابھی بھی کچھ چیزیں ہیں جو الجھی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس جو چیزیں دستاویز کی شکل میں ہیں۔۔۔عوف بن سلمان صاحب کے پاس بھی وہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ان کی ڈاکیومینٹری زیادہ مستند سمجھی جائے گی کیونکہ ان کا نیٹ ورک بہت بڑا ہے۔ ان کی رسائی بہت دور تک ہے۔۔۔آپ جانتے ہیں۔۔۔ان کی ایک بڑے بین الاقوامی چینل کے ساتھ کاروباری وابستگی بھی ہے۔۔۔وہ سچے بے شک نا ہوں لیکن کامیاب ضرور ہو چکے ہیں۔۔۔ہم کئی سالوں کی کوشش کے بعد بھی جو کچھ اکٹھا کر پائے ہیں وہ سب چند مہینوں میں انہوں نے بھی اکٹھا کر لیا ہے۔۔۔ان کے پاس بہت سے لوگوں کے تحریری بیان ہیں۔ میرے بہت سے ساتھی ان کی معاونت کر رہے ہیں۔۔۔میں نہیں جانتا کہ سچے ہونے کے باوجود ہم تعداد اور طاقت میں ان کا مقابلہ کر پائیں گے یا نہیں۔۔۔یہ چیز بعض اوقات مجھے پریشان کر دیتی ہے۔۔۔میں نے آفاق صاحب کو بہت امید دلا دی ہے لیکن اگر میں ان کے بیٹے کے لئے کچھ نہیں کر پایا تو ان سے زیادہ مجھے دکھ

ہوگا۔" اس نے انہیں اپنی الجھن سے آگاہ کر دیا تھا۔ نور محمد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری
"میں نے نبی آخر الزماں ﷺ کی زندگی سے یہ بھی سیکھا ہے کہ جنگیں تعداد اور طاقت سے نہیں حکمت عملی سے جیتی جاتی ہیں ۔۔مایوس مت ہوں ۔۔۔ اگر آپ مایوس ہو کر میدان میں اتریں گے تو یقیناً آپ ہار جائیں گے ۔۔آپ بھی میری طرح دعا کریں کہ اللہ ہمیں مزید اچھے لوگوں کا ساتھ بخشیں ۔۔میرے پیارے نبی نے بھی جب اللہ سے دعا کی تھی تو انہیں حضرت عمرؓ جیسے انسان کی معاونت عطا کی گئی تھی جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی ۔۔۔بھروسہ رکھئے ۔۔اللہ ہم سے بہتر حکمت والے ہیں" ان کے سمجھانے کا انداز اس قدر سحر انگیز تھا کہ سلمان کو اپنی ساری مایوسی چھنٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆ ☆ ☆

وہ واپسی کا سفر تھا۔
ڈبلن کی روشنیاں ماند پڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں اسی جگہ پر بیٹھے تھے جس جگہ پر وہ ڈبلن جاتے ہوئے بیٹھے تھے۔ پانی کی ہلکی سی باس دیتی خوشبو، فضا میں بکھری چہل پہل اور پانی پر بنتا دھندلی ہوتی ہوئی روشنیوں کا عکس ۔۔دوسرے مسافروں کے قہقہے، آوازیں سرگوشیاں ۔۔۔کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ دونوں ہی گم سم سے تھے۔ تیمور نے شہروز کا الجھا ہوا انداز دیکھ کر اسے دوبارہ مخاطب نہیں کیا تھا یا شاید وہ خود ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شہروز کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہیں پا رہا تھا لیکن پھر اس نے تیمور کو ان دونوں آفیسر کے رویے کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ با آواز بلند بڑبڑانا چاہتا تھا۔ اسے فی الوقت کسی اچھے سامع کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے تاثرات چاہ کر بھی چھپا نہیں پا رہا تھا۔ وہ ان کے رویے پر کافی برہم تھا۔
۔اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا۔ یہ ننانوے پر پہنچ کر سانپ کے ڈس جانے اور پھر دوبارہ سے زیرو پر پہنچ جانے کے مترادف تھا۔ بظاہر تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ آندھی آئی تھی نا طوفان۔ کوئی آ کر اس سے اس کا اسٹارڈم چھین کر تو لے نہیں گیا تھا لیکن دو آفیسرز نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔۔اس کے تن کا برانڈڈ لباس اور اس کا لہجہ بدل کر بولتا ہوا دیسی برٹش لہجہ بھی اس کے کام نا آیا تھا
"مجھے یہ یقین تب تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم ڈبلن سے واپس نہیں آجاتے ۔۔۔تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو ۔۔۔تمہارے بارے میں مشکوک رہنے کے بہت سے جواز ہیں میرے پاس"
اس لیڈی آفیسر کا لہجہ ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھٹک کر اس سارے واقعہ کو بھول جانا چاہا تھا۔ اس واقعے کو بھول جانا ہی بہتر تھا
"تم اتنا ناراض مت ہو ۔۔۔پاکستان اور پاکستانیوں کے متعلق یہ ایک عمومی رویہ بن چکا ہے ۔۔مغربی اقوام تم لوگوں کو قابل موت نہیں سمجھتیں" تیمور نے افسوس کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ شہروز نے اسے گھور کر دیکھا
"تو پھر بھاڑ میں جائیں مغربی اقوام ۔۔۔میں سیاست دان نہیں ہوں ۔۔۔میں ان کی فنڈنگ پر چلنے والی کسی این جی او کا مالک

بھی نہیں ہوں۔۔۔ مجھے کھانے کو نہیں دیتے یہ لوگ۔۔۔لعنت بھیجتا ہوں میں ان سب پر" وہ غرا کر بولا تھا+ ۔اس کے انداز پر تیمور ذرا سا مسکرایا تھا

"اب اتنا برہم بھی مت ہو۔۔۔جن کے گھر میں بیٹھے ہو۔۔ان کے بارے میں ایسے بات مت کرو" وہ شاید اس کے گرم مزاج کو معتدل کرنے کے لئے شگفتہ سے انداز میں بول رہا تھا

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔۔کہ میں ان کے گھر بیٹھا ہوں۔۔ان لوگوں کو تو اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ کسی دوسرے ملک سے آنیوالا ان کے بارے میں کیا سوچے گا۔۔۔کبھی ہمارے یہاں آ کر دیکھیں ہم غیر ملکیوں کو کتنی عزت دیتے ہیں۔۔۔سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔۔۔کسی کی اتنی توہین نہیں کرتے" وہ چڑ کر بولا تھا

"تم لوگوں کی مجبوری ہے یہ۔۔۔تم لوگ امداد بہت لیتے ہو ان سے۔۔۔اس لئے۔۔" شہروز نے اب کی بار اس کی بات کاٹنے کے لئے الفاظ استعمال نہیں کئے تھے۔اس نے صرف ہاتھ کا اشارہ کر کے اسے چپ ہو جانے کے لئے کہا تھا

"مسٹر تیمور۔۔۔میں درخواست نہیں کر رہا۔۔میں صرف بتا رہا ہوں کہ اس وقت مجھ سے یہ سب باتیں مت کرو۔۔۔میری کھوپڑی بالکل گھومی ہوئی ہے۔۔۔میں نہیں چاہتا کہ میں تم سے الجھوں۔۔۔امداد کہاں سے آتی ہے کہاں جاتی ہے۔۔کس طرح استعمال ہوتی ہے۔۔کس کے مفاد کے لئے استعمال ہوتی ہے۔۔۔یہ تم بھی جانتے ہو۔۔ان کی امداد انہی کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفاد میں کھپ جاتی ہے۔۔۔اس لئے مجھے ان کے احسانات مت گنواؤ" وہ کھا جانے والے انداز میں بولا تھا۔تیمور کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوئی

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔۔۔تم پاکستانیوں کی ایک بات مجھے بڑی پسند ہے۔۔تم لوگ اپنی عورتوں،اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لئے بڑی جلدی جذباتی ہوتے ہو۔۔۔مرنے مارنے پر تل جاتے ہو" وہ ابھی بھی اسے چڑا رہا تھا۔

شہروز اس کی بات پر خاموش کا خاموش رہ گیا۔وہ وطن کے لئے جذباتی کب ہوا تھا۔وہ تو وطن کے لئے جذباتی ہونے کو بیوقوفی قرار دیتا تھا اور مذہب کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا ایک عرصے سے۔۔۔

وہ تو اسلام کا ایک نیا ورژن تلاش کر رہا تھا تاکہ پاکستان میں اسے نافذ کر کے دنیا کے سامنے خود کو لبرل اور موڈریٹ ثابت کر سکے۔ایک دم سے پچھتاوے کی عجیب سی لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔اسے یاد آیا تھا کہ عمر نے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ اسے جذباتیت کا مارا ہوا قرار دے کر اس سے منہ موڑ آیا تھا۔وہ تو خود کو اتنا بڑا مدبر سمجھتا تھا کہ اسے لگتا تھا وہی پاکستان کی بھلائی کے متعلق سوچ سکتا ہے۔اس کے لئے پاکستان کی بھلائی صرف اس میں تھی کہ وہ ریڈیکلائزیشن سے نکل آتا اور اس مقصد کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

اس کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا تھا۔دو لوگوں کے رویے نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا

وہ جو اپنے آپ کو معزز معتبر سمجھ کر دوسروں کو دہشت قرار دینے کی تکلیف دہ گیم کا حصہ بنتے چلا تھا،اسے خود کو ہی دہشت گرد قرار دے دیا گیا تھا۔وہ خود کو بہت قابل سمجھتا تھا۔اس نے اس مقام تک پہنچنے کے لئے سخت محنت کی تھی۔اسے لگتا تھا اس نے جو بھی حاصل کر لیا

اس میں اس کی قابلیت اور دانائی کا ہی ہاتھ ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے لفظوں سے اپنے انداز سے لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ وہ جو بولتا ہے۔ لوگ سنتے ہیں۔ وہ جو کہتا ہے لوگ اسے سچ مانتے ہیں۔۔ وہ اسے اپنی طاقت سمجھتا تھا۔ وہ خود پسندی کے اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں اپنے علاوہ بھی اگر کوئی نظر آ جائے تو وہ آئینہ ہوتا ہے جہاں انسان صرف اپنا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ وہ خود ہی اپنے لئے تالیاں بجاتا ہے، وہ خود ہی اپنے آپکو سراہتا رہتا ہے۔۔ اسے اپنے آگے کوئی اہم نہیں لگتا اور پھر وہ ایسے کام کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے جو غلط ہوتے ہوئے بھی خود پسندی کی عینک کے عقب سے غلط نہیں لگتے۔

اسے کوئی اتنی حقارت سے دہشت گرد کیسے کہہ سکتا تھا۔ کوئی اس کی اتنی توہین کیسے کر سکتا تھا

اس کے اندر یکدم ایک خیال بجلی کی طرح کوندا تھا

"کیا مجھے حق ہے کہ میں کسی کو بنا تحقیق کے دہشت گرد کہہ دوں جبکہ میں خود اس بات کا سخت برا مناتا ہوں کہ کوئی میرے لئے یہ لفظ استعمال کرے" اس نے خود سے یہ سوال کیا تھا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خود احتسابی کے مرحلے سے گزر رہا تھا اور ایسے مرحلے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

"وہ شہروز منور تھا۔۔۔ جس نے گزشتہ کچھ سالوں میں اپنے سر کے بال سے لے کر اپنے پاؤں کی انگلی تک پر بے حد محنت کی تھی۔ ۔ وہ برانڈڈ کپڑے پہنتا تھا۔ وہ دبئی سے شاپنگ کرتا تھا۔ چائنیز کھانے کھاتا تھا۔ امریکن اسٹائلسٹ سے گرومنگ کے لئے رابطے میں رہتا تھا۔ جاپانی انسٹرکٹر کے جم میں جاتا تھا۔ یہ سب اس کے لئے زندگی گزارنے کے جدید طریقے تھے۔ یہ سب کر کے وہ سمجھتا تھا کہ سب کو یہی کرنا چاہیئے۔ پاکستان کو اصلاحات کی ضرورت تھی اور یہ اصلاحات لباس۔ ناچ گانے، کھانے پینے انگریزی زبان اور ظاہری حلیے تک محدود تھیں۔۔ باقی سب کام سیاست دانوں کا تھا، بیوروکریٹس کا تھا، فوجیوں کا تھا۔ باقی لوگ صرف بھیڑوں کی طرح آنکھیں بند کر کے اندھی پیروی کے لئے پیدا کیے گئے تھے۔ اس لئے یہ ان جیسے میڈیا پرسنز کا، دانشوروں کا اور پڑھے لکھے نام نہاد لبرلز کا کام تھا کہ وہ عوام کی رہنمائی کر کے انہیں سکھاتے کہ وہ چودہ سو سال پرانی باتیں کر کے اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان اور پاکستانیوں کو اتاترک ماؤزے تنگ مارٹن لوتھر کنگ کے بارے میں بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا لیکن حضرت عمرؓ یا حضرت علیؓ کی مثال دیتے ہوئے اسے ڈر لگتا تھا کہ کوئی اسے بھی ریڈیکل نا کہہ دے۔۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ زندگی گزارنے کا لبرل طریقہ کہیں اس کی احساس کمتری تو نہیں ۔۔ وہ اپنی شناخت سے اس قدر خائف کیوں تھا کہ وہ زندگی کے کسی معاملے میں مسلمان نہیں لگنا چاہتا تھا، پاکستانی نہیں لگنا چاہتا تھا۔ وہ اگر مسلمان ہونے سے پاکستانی ہونے سے اتنا خائف تھا پھر اسے کوئی حق نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے کسی دوسرے بیٹے کی معاملے میں اناپ شناپ بولتا۔ اس کی داڑھی کو نشانہ بناتا یا اس کی نمازوں پر تنقید کرتا۔

"تم اب کیا سوچ رہے ہو؟" تیمور نے اسے اس قدر گم دیکھ کر سوال کیا تھا۔ شہروز نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے دوسری بار سر جھٹکا۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب ہی نہیں تھا۔ وہ واقعی بڑے کڑے احتسابی مرحلے سے گزر رہا تھا یا شاید اسے اس کڑے

احتسابی مرحلے سے گزارا جا رہا تھا۔کسی کی دعائیں رنگ لا رہی تھیں۔

"میں تمہیں بتاؤں تم کیا سوچ رہے ہو؟" تیمور نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تھا۔شہروز اب بھی کچھ نہیں بولا تھا

"تم نور محمد کے بارے میں سوچ رہے ہو نا۔۔؟" شہروز نے اب کی بار مزید چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔اس کا دل چاہا پوچھے کون سا نور محمد۔۔برٹش یا پاکستانی۔۔لیکن وہ چپ رہا تھا۔۔اسے طنز کرنا آتا تھا لیکن ابھی اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بھی بولے

"نہیں تو۔۔۔میں صرف اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں" اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا

"اچھا۔۔پھر شاید میں نور محمد کے بارے میں سوچ رہا ہوں" شہروز اس کے اس جملے پر حیران ہوا تھا۔اس نے اسے بغور دیکھا آیا کہیں اس نے پی تو نہیں رکھی۔وہ اتنا کھویا کھویا کیوں لگتا تھا

"میں جونیئر نور محمد سے کبھی نہیں ملا۔۔لیکن مسٹر ڈیڈ نیل نے جب مجھے اس کے بارے میں بتایا تو اس شخص کے لئے لفظ "جادوگر" استعمال کیا تھا۔مسٹر ڈیڈ نیل ہماری ڈاکیومینٹری کے کانٹینٹ ہیڈ ہیں۔۔انہوں نے کہا تھا کہ نور محمد لوگوں پر جادو کر کے انہیں اندھا کر دیتا ہے پھر وہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔۔۔انہوں نے کہا کہ بل گرانٹ جیسا ذہین اور شاطر ادیب بھی اس کے جادو سے نہیں بچ سکا۔۔میں نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا تھا لیکن جب میں بل گرانٹ (نور محمد) سے ملا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ جونیئر نور محمد ہی نہیں سینئر نور محمد بھی جادوگر ہیں۔۔۔یہ لوگ کچھ نا کچھ تو ایسا ضرور کرتے ہیں کہ جو ان سے ملتا ہے ان کا ہو جاتا ہے۔۔۔تمہیں پتا ہے نبی آخرالزماں ﷺ کے بارے میں بھی ان کے دشمن یہی کہا کرتے تھے کہ وہ جادوگر ہیں۔۔۔ان کا جادو پتا ہے کیا تھا۔۔۔ان کی محبت۔۔ان کا اخلاق۔۔ان کا ایثار۔۔جیسی محبت اپنوں سے کرتے تھے ویسی محبت پرائے سے بھی۔جیسی سوچ دوست کے لئے رکھتے تھے۔۔ویسی سوچ دشمن کے لئے بھی۔۔۔جو عورت انہیں کچرا پھینک کر آلودہ کر دیتی تھی،اس کا گھر صاف کر آیا کرتے تھے۔جو لوگ پتھر مار کر لہولہان کرتے تھے،ان کے لئے بھی دعا کر دیا کرتے تھے۔۔۔بتاؤ جو ایسے نبی کے رستے پر چلے گا وہ ایسے اخلاق والا ہی ہو گا نا۔۔۔اسے دلوں میں گھر کرنے کا گر آتا ہو گا کہ نہیں۔۔۔میں نے نور محمد کو ایسا ایثار پسند پایا۔۔۔مجھے اپنے پورے ناول کا مواد بنا سوچے سمجھے پکڑوا دیا۔۔یہ جانتے بوجھتے کہ میں انہیں نیچا دکھانے کا سارا سامان لئے بیٹھا ہوں۔تم یقین نہیں کرو گے کہ میں ان کے گھر سے آتے ہوئے کتنی سخت زبان استعمال کر کے آیا ہوں کہ شاید وہ مجھ سے بھی سخت برتاؤ کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔وہ خاموش رہے لیکن مجھے برا بھلا نہیں کہا" وہ اب مسکرایا تھا۔شہروز نے اس کے چہرے پر یہ مسکراہٹ پہلے نہیں دیکھی تھی

"جو اللہ اور اس کے نبی کے رستے پر چلتا ہے نا۔۔اس کے اوصاف بدل جاتے ہیں،خصوصیات بدل جاتی ہیں۔۔۔یہی وہ کیمیائی تبدیلی ہے جو مٹی کو سونے میں بدل دیتی ہے۔۔۔مٹی کو خبر ہوتی ہے نا سونے کو پتا چلتا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے اور ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ اوصاف بدل جاتے ہیں۔۔۔" وہ عجیب فلسفیانہ انداز اپنا کر بول رہا تھا۔شہروز نے زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا تھا اسے "مجھے نہیں پتا وہ پہلے کیسا لکھتے رہے ہیں لیکن میں نے عہدِ الست کا کچھ حصہ پڑھ کر دیکھا ہے۔۔۔میں سمجھتا تھا۔۔۔چار لائنیں گھسیٹ کر

ہمیں تمہیں بھی اچھا پسند بنانے کا مواد اکٹھا کر رکھا ہو گا۔۔۔لیکن اب جب چند صفحات پڑھ کر فارغ ہوا ہوں تو سوچ رہا ہوں۔۔۔" وہ چپ سا ہو گیا تھا۔شہروز نے اسکی جانب دیکھا

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے اس کی جانب رخ کیا اور آواز کو دھیما کرتے ہوئے بولا

"نور محمد واقعی جادوگر ہیں۔۔۔انہوں نے مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔۔۔میں بدل رہا ہوں میرے پاکستانی دوست۔۔۔" وہ کس قدر پراسرار لگتا تھا

"تم کیا بول رہے ہو۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا" شہروز نے اس کی پراسراریت کے اثر کو زائل کرنے کے لئے اس کی جانب دیکھنا بند کر دیا تھا

"اس میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔۔۔وہ اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ جب ہم کسی حرام فعل کو سرانجام دیتے ہیں تو کائنات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔۔۔اس بگاڑ کو روکنے کے لئے قدرت اپنا ایک مخصوص خودکار بحالی نظام متحرک کرتی ہے تاکہ اس توڑ پھوڑ کو روکا جا سکے۔۔۔یعنی قدرت ہم سب کو راہ راست پر آنے کا موقع ضرور فراہم کرتی ہے اور اس کے ذرائع کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔اور میرا ذریعہ بنی یہ چھوٹی سی فلیش ڈرائیو۔۔۔" اس نے بات مکمل کر کے اپنی گردن کے گرد لٹکے کیمرہ کے پاؤچ سے ایک ڈرائیو برآمد کی تھی اور اسے انگوٹھے اور انگلی میں پھنسا کر شہروز کے چہرے کے سامنے کر دیا تھا

"یہ کیا ہے؟" شہروز الجھ کر پوچھ رہا تھا

"یہ ایک عام سی یو ایس بی ہے۔۔۔لیکن تم اسے تلاوت کی وہ آواز سمجھو جو اسلام کے ایک دشمن کے کانوں تک پہنچی تھی اور پھر ان کے بھی اوصاف بدل گئے تھے۔۔۔آج کی مسلم دنیا اس دشمن کو اللہ کے پیارے رسول کے دست راست کے طور پر جانتی اور پہچانتی ہے اور ان کا نام اتنے سال گزرنے کے بعد بھی زندہ و جاوید ہے۔۔۔وہ عمر بن خطاب تھے لیکن ہم انہیں عمر فاروق کہنا ہی پسند کرتے ہیں۔۔۔تاریخ میں مٹی کو سونے میں بدل دینے کی اس سے بڑی مثال نہیں مل سکتی" تیمور نصاری کی پراسراریت عروج پر تھی۔شہروز نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے احتراز برتا تھا۔اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔

"اسے تم رکھ لو۔۔۔" اس نے وہ یو ایس بی شہروز کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی

"تمہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی" شہروز اپنے لہجے کا طنز چھپا نہیں پایا تھا۔اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔وہ جس قسم کی جاب کرتا تھا،اس میں طنزیہ گفتگو کرنا ایک ہنر مانا جاتا تھا۔تیمور اس کے انداز اور الفاظ پر مسکرایا

"نہیں۔۔۔کیونکہ مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں تو خود بھی تلاوت کر سکتا ہوں۔۔۔الحمدوللہ"

☆ ☆ ☆

"بل گرانٹ اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔۔۔وہ پاکستان جا رہا ہے" مسٹر ٹیرن نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"اس کے اندر کا انقلابی انسان ابھی تک زندہ ہے۔۔حالانکہ اسے قسمت نے اتنے تھپڑ مارے ہیں۔۔لیکن جس نے سبق نہیں سیکھنا نہیں سیکھنا" مسٹر ٹیڈ نیل نے اپنا سگار منہ میں رکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا تھا۔وہ دونوں لندن کے ایک لگژری اپارٹمنٹ کی کافی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔یہ اپارٹمنٹ مسٹر ٹیرن کا تھا

"کچھ لوگ واقعی کتے کی دم کی طرح ہوتے ہیں لیکن بل گرانٹ تو تیندوے کی دم ثابت ہوا۔۔لیمی اور بیکار" مسٹر ٹیرن کا انداز ابھی بھی ویسا ہی تھا

"آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔۔اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔۔جب چیزوں کو بدلا نا جا سکے پھر انہیں چھوڑ دینا چاہیے" مسٹر ٹیڈ نیل کو زیادہ فکر نہیں تھی۔وہ وقتاً فوقتاً کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتے تھے

"وہ اپنے ناول کو پبلک کر رہا ہے مسٹر ٹیڈ نیل۔۔۔بیک وقت دو زبانوں میں۔۔۔اردو اور انگلش۔۔اس میں لوٹن کے متعلق بھی اناپ شناپ لکھے گا اور پھر اسلام کی محبت میں تقریریں بھی ہوں گی۔۔۔مجھے اس بات کا سخت رنج ہے" مسٹر ٹیڈ نیل نے کافی کا مگ میز پر رکھ دیا۔اس میں موجود کافی ویسے بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی اور فی الوقت ان کے جذبات بھی

"آپ رنج مت کریں۔۔اسے کرنے دیں جو کر رہا ہے۔"

"مسٹر ٹیڈ نیل۔۔تم حد کرتے ہو۔۔۔میری سالوں کی محنت ہے۔۔سب اس شخص نے برباد کر دی۔۔۔۔لوٹن کے ریڈیکلز میرے بچے کو میری نظروں کے سامنے ورغلا کر لے گئے۔۔۔میرا نو عمر بیٹا جہادی بن گیا۔۔لیکن سیاستدان کچھ کر سکے لوٹن کے لئے نا تم جیسے لوگ۔۔۔ہم پاؤنڈز اور محنت دونوں خرچ کر کر تھک گئے۔۔۔اور پھر محنت کتنی لگی ہے میری۔۔ایک نیم پاگل ریڈیکل کو تشدد کروا کر میٹرو پولیٹن پولیس سے گرفتار کروانا، پھر اس کا غلط ریکارڈ بنوانا پھر اسے مردہ ڈیکلئیر کروانا۔کسی اور کی لاش کو اس کی لاش میں بدل کر دنیا کے سامنے پیش کرنا۔اس کا فیونرل کروانا۔۔۔یہ سب آسان نہیں تھا میرے لئے۔۔لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے،،، میں اپنے ملک کو ریڈیکلائزڈ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔۔یہ بات تم بھی لکھ لو کہ اسلامائزیشن کا وائرس ایسے ہی اس ملک کے لوگوں کو لاحق ہوتا رہا نا تو ایک دن یہاں کے سب لوگ داڑھیاں رکھ کر سر پر ٹوپی پہنے نظر آئیں گے۔۔میری بات یاد رکھنا" وہ چڑ کر بولا تھا

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔۔اوور ری ایکٹ مت کرو۔۔تم کچھ زیادہ ہی سوچ رہے ہو۔۔۔اس بات کو کچھ زیادہ ہی حواسوں پر سوار کر رہے ہو

۔۔ایک شخص کے اسلام قبول کر لینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا" مسٹر ٹیڈ نیل نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی

"میں زیادہ سوچ رہا ہوں۔۔میں۔۔؟۔۔تمہیں اندازہ ہے کہ اگر وہ ناول پبلک ہو گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ میں اس ساری پلاننگ میں شامل تھا تو میری ساکھ کس قدر متاثر ہوگی۔۔میں لوٹن میں ایک ہیومن ایکٹیویسٹ کے طور پر جانا جاتا ہوں۔۔۔میں کیسے نا سوچوں۔۔

مجھے ہی سوچنا ہے۔۔تم لوگ تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔۔تم لوگوں سے امیگریشن کی کوئی پالیسی مرتب نا ہو سکی اب تک۔۔۔مسلمز جوق در جوق ہر سال یہاں آ رہے ہیں، یہاں کے بینفٹ کے مزے لے رہے ہیں اور یہاں رہنے والوں کو اندھی ریڈیکلائزیشن کا نشانہ بنا رہے ہیں ۔۔ہماری نسلیں ان کے رنگ میں رنگتی جا رہی ہیں ۔۔تم کہہ رہے ہو ایک شخص سے فرق نہیں پڑتا۔تمہیں نہیں پتا بل گرانٹ جیسا ایک شخص دس لوگوں کو اپنی طرف راغب کر لیتا ہے اور وہ دس لوگ مزید سو لوگوں کو نگل جاتے ہیں ۔۔۔تم لوگوں سے اور کچھ نہیں ہوتا تو ایک کام کرو اس ملک کا نام بدل کر مکہ یا مدینہ رکھ لو" وہ بہت غصے میں تھے۔

"اچھا اچھا، تم ہائپر مت ہو۔۔۔ہم نے اپنی پوری نیک نیتی سے ایک کوشش کی تھی۔۔۔بل گرانٹ ہی دغا دے گیا تو اب اس میں ہمارا کیا قصور ہے" مسٹر ڈینیل کو اپنے جذبات کو اعتدال میں رکھنا آتا تھا۔

"بل گرانٹ کو ہو کیا گیا۔۔مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا۔۔اچھا بھلا انسان تھا۔۔۔وہ بھی ریڈیکل ہو گیا" وہ مزید بولے تھے

"اچھا بھلا۔۔۔؟" مسٹر ٹیرن نے طنزیہ انداز میں ہنکارا بھرا

"اب دیکھنا اسے تم۔۔۔میری بازو کے جتنی داڑھی ہے۔۔نام بھی نور محمد رکھ لیا ہے۔۔ڈھیلی سی شرٹ اور سادہ سے ٹراؤزرز میں لوٹن کی گلیوں میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔۔۔بہر حال میں اس کے متعلق بات کر کے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔۔۔مجھے صرف اس بات سے غرض ہے کہ اس نے اپنا ناول مکمل کر لیا ہے اور وہ اسے پبلک کرنے والا ہے۔" وہ تھک کر بولے تھے

"میں نے کہا نا تم ہائپر مت ہو۔۔۔میں آج ہی عوف بن سلمان کو فون کرتا ہوں۔۔۔اسے گرین سگنل دیتا ہوں کہ ناول سے پہلے ڈاکیومنٹری آن ایئر کر دے" انہوں نے تسلی دی تھی

"اس سے کیا ہو گا" مسٹر ٹیرن نے مزید ناک پھلائی تھی

"ڈاکیومینٹری ہو یا ناول۔۔جو چیز پہلے پبلک کے سامنے آئیگی۔۔۔وہی سچی قرار پائیگی۔۔باقی سب جھوٹ کا پلندہ سمجھا جائیگا"

"ڈاکیومنٹری کا سارا کام مکمل ہے؟" مسٹر ٹیرن کو اب کی بار دلچسپی محسوس ہوئی تھی

"تقریباً۔۔عوف بن سلمان نے اپنا ایک بہت ہی ہوشیار ترکش بندہ اس کام پر لگایا ہوا ہے۔۔۔تیمور نصار سے مل چکا ہوں میں ۔۔۔بڑا ہوشیار اور محنتی آدمی ہے۔۔۔مجھے یقین ہے بہت اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔"

وہ مزید تسلی دیتے ہوئے مزید تفصیلات بتانے لگا۔۔مسٹر ٹیرن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں

☆ ☆ ☆

وہ عمر رسیدہ تھکی ہوئی ٹیمز کا کنارا تھا۔

کسی لاچار ضعیفہ کی طرح زمانے بھر سے نالاں وہ اپنے آپ میں گم لاپرواہ بہتی چلی جاتی تھی۔ٹیمز کی جولانی اور عروج کا وقت گزر چکا تھا۔اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا اور اس کا سحر مدھم ہو گیا تھا۔لندن کے پاس دنیا کو مرعوب کرنے کے لئے اب ٹیمز سے بھی زیادہ دلکش

چیزیں موجود تھیں ۔۔اس لئے شہروز کو اس کے بہتے پانی میں ایک وقار جھلکتا تو محسوس ہوتا تھا لیکن کشش نہیں ۔۔۔ پاکستانی سیاحوں کی ٹیمز کا حسن بکھیرتی داستانیں ماضی بعید کا قصہ معلوم پڑتی تھیں۔

ٹیمز کی طرح اس کے جذبات بھی تھکے ہوئے لاچار اور افسردہ سے تھے۔

وہ کل رات کی فلائٹ سے واپس جارہا تھا۔لندن آنے کے بعد وہ پہلے بھی دو بار یہاں آیا تھا۔اس کنارے کے گرد بیٹھ کر دور سے نظر آنے والی روشنیوں کو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج کچھ الگ بات تھی۔آج عمر کے ساتھ اس کی آخری رات تھی۔وہ ایک رات پہلے اپنے سات روزہ ٹور سے واپس آیا تھا اور تب سے ہی وہ عمر کو وہ کچھ پریشان لگا تھا لیکن اس نے پوچھا نہیں تھا حالانکہ وہ سب کے ساتھ ہنس بول رہا تھا۔ان سب کے لئے چھوٹے موٹے سووینئرز بھی لایا تھا لیکن اس نے اپنے ٹور کی کوئی بھی قابل ذکر بات نہیں کی تھی۔اس نے ان سب کو اپنی تصویریں بھی نہیں دکھائی تھیں۔وہ ٹورازم کا دلدادہ تھا اور اسے ہر نئی جگہ کی لاتعداد تصویریں لینے کا شوق تھا۔وہ اپنے فیس بک پیج پر ہر روز دسیوں پکچرز اپلوڈ کرتا رہتا تھا لیکن عمر نے فیس بک پر بھی ڈبلن کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔اسی لئے عمر کو اس کے رویے سے کچھ غیر معمولی رنگ جھلکتے محسوس ہوتے تھے۔ان دونوں کے درمیان اگرچہ تعلقات اب نارمل ہو چکے تھے لیکن اس ہر موضوع سے وہ دونوں کترا رہے تھے جو گھوم پھر کر نور محمد کی طرف چلا جاتا۔وہ دونوں ہی اب اپنے اپنے راستوں پر اکیلے چلنے کو ترجیح دینا چاہتے تھے۔عمر جان بوجھ کر اس سے کسی موضوع پر بات ہی نہیں کرتا تھا جو ان کے درمیان کسی مزید اختلاف کا باعث بنیں لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ شہروز کچھ اداس ہے مگر براہ راست پوچھنے پر بھی دل مائل نہیں تھا

"ہماری اگلی ملاقات اب انشاء اللہ پاکستان میں ہوگی۔۔" اسے لگا شاید وہ ان سب کے لئے اداس ہے۔اس لئے اس نے کب سے پھیلی خاموشی کو جیسے درمیان سے برخاست کرنا چاہا تھا

"کب تک پلان کرو گے تم لوگ۔۔؟" شہروز نے بھی اسی کے انداز میں بات برائے بات کی تھی

"تم جب بھی اپنی شادی کی بریانی کھانے کے لئے ہمیں بلاؤ گے ہم فوراً ہی آجائیں گے بس" وہ اس نادیدہ تناؤ کو کم کرنا چاہتا تھا

"اس کا مطلب بہت جلد ارادہ ہے پاکستان آنے کا" شہروز اس کی جانب مڑا تھا۔اس نے اپنی طرف سے یہ باور کروایا تھا کہ وہ جلد شادی کا اردہ رکھتا ہے

"ہاں ارادہ تو ایسا ہی ہے۔۔بس تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔۔تم کچھ فائنل کرو تو چھٹی کے لئے اپلائی کریں۔۔لیکن ذرا دھیان رہے کہ میرا ایبٹا دنیا میں آچکا ہو۔۔اسے بھی تایا کی شادی کے جشن میں شریک ہونے کا موقع ملنا چاہیئے" عمر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔امائمہ کی ڈیوڈیٹ کچھ ہفتوں میں متوقع تھی

"تایا۔۔؟" شہروز نے آنکھیں پھیلائیں

"جانے دو یار۔۔تایا تو تم ہو گے۔۔۔میں تو چاچو بنوں گا۔۔دو سال چھوٹا ہوں تم سے"

"عمروں سے فرق نہیں پڑتا۔۔۔تم زیادہ ذہین ہو۔۔زیادہ تجربہ کار ہو۔۔زیادہ پڑھے لکھے ہو۔۔۔اور زیادہ امیر بھی۔۔اور میں زیادہ ہینڈسم ہوں بس۔۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا درجہ زیادہ ہو گیا۔۔۔وہ تمہارا ہی ہوگا۔۔اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میرا بیٹا تمہیں تایا کہے گا" وہ اپنی دھن میں مگن بول رہا تھا۔شہروز کچھ نہیں بولا ۔عمر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا اور اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ واقعی پریشان ہے

"تم کچھ پریشان ہو؟" عمر نے یکدم اس سے سوال کیا تھا۔وہ اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتا تھا۔شہروز نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں تھا

"چپ کیوں ہو۔۔بولو نا" اس نے اسے بولنے کے لئے مجبور کیا تھا

"وہ میرا بھی بیٹا ہوگا۔۔تایا کہے چاچا کہے۔۔کیا فرق پڑتا ہے" وہ مصنوعی انداز میں مسکرا کر بولا ۔عمر نے پوچھا کچھ تھا وہ جواب کچھ اور دے رہا تھا۔

"شہروز۔۔۔کیا بات ہے۔۔تم کچھ پریشان لگتے ہو" عمر کو اپنے سامنے کھڑے اس شخص سے بھائیوں والی الفت تھی۔یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پریشان ہوتا اور شہروز کو اندازہ نا ہوتا اور اندازہ ہو جاتا اور پھر وہ استفسار نا کرتا۔شہروز کے لئے بھی یہ بہت مشکل تھا کہ اس کے دل میں کچھ کشمکش یا بے چینی ہوتی اور وہ عمر سے اس متعلق بات نا کرتا

"آئرش کافی تعصب پسند ہیں۔۔۔" شہروز نے اس کی جانب دیکھے بناء کہا تھا۔عمر نے اس کے اس جملے کے پیچھے سے جھانکتی کسی کہانی کو کھوجنے کی کوشش کی لیکن وہ اس معاملے میں اتنا ہوشیار نہیں تھا

"میں ایک ہی بار گیا ہوں۔۔۔جب میں ہائی اسکول میں تھا تب کی بات ہے۔۔اچھا تجربہ تھا میرے لئے تو۔۔۔دراصل وہاں زیادہ تر کیتھولک لوگ ہیں۔۔۔پینے پلانے کے دلدادہ۔۔۔اور برٹش نیشنل کو زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن سیاحوں کے ساتھ تو بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔۔اس فیلڈ سے ان کا کاروبار وابستہ ہے۔۔۔کیا ہوا۔۔کوئی بات ہوئی کیا؟" عمر نے اپنا تجربہ بیان کرنے کے بعد پوچھا تھا۔شہروز نے ہونٹ بھینچے جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا کہنا چاہیئے اور کیا نہیں پھر اس نے تھک کر سارا قصہ بیان کر دیا تھا

"انہوں نے ڈبلن کی اینٹری ہی نہیں دی؟" عمر سن کر حیران ہوا تھا

"اینٹری تو دے دی تھی لیکن میرا دل ہی نہیں چاہا کہ میں مزید آگے کا سفر کرتا۔۔اتنی توہین۔۔۔اتنا برا رویہ۔۔میں نے ایسا کیا ہی کیا تھا کہ انہوں نے مجھے مجرم سمجھ لیا" اس نے خود کو لفظ "دہشت گرد" کہنے سے روکا۔وہ عمر کے سامنے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ابھی تو تیمور نصار کی باتیں ہی ذہن میں گونج رہی تھیں۔وہ اپنی ذہنی الجھن میں اس قدر گم تھا کہ تیمور نصار کی کایا پلٹ والی گتھی پر بھی غور نہیں کر پا رہا تھا۔اس نے جو باتیں کی تھیں وہ بھی کافی غور طلب تھیں۔عمر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا

"اتنا پریشان نا ہو۔۔یہ کوئی ایسا خاص ایشو نہیں ہے۔۔۔اتنا سر پر سوار مت کرو۔۔۔آئرش بعض اوقات اس طرح کا رویہ اپنا جاتے

ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم جذباتی ہی ہو جاؤ۔۔یہ تو میری خاصیت ہے" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے بولا تھا۔ شہروز نے اسے دیکھا پھر دیکھتا ہی رہا۔اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ جب کوئی آپ کو یہ کہتا ہے کہ جذباتی مت ہو تو دل چاہتا ہے کہ اسے مزید جذباتی ہو کر دکھایا جائے۔بپھرے ہوئے دریاؤں پر بند باندھنا آسان نہیں ہوتا۔

"انہوں نے میرے لئے لفظ دہشت گرد استعمال کیا عمر۔۔تم تصور کرو۔۔مجھے دہشت گرد کہہ دیا" وہ واقعی اس ایک ایشو کو سر پہ سوار کر چکا ہوا تھا کہ اس سے ان دونوں آفیسرز کا رویہ بھلایا ہی نہیں جا رہا تھا۔عمر نے جتانے والے انداز میں اسے دیکھا پھر اس کے چہرے پر پھیلا سوچوں کا جال دیکھ کر اس نے خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا

"میں نے تو داڑھی بھی نہیں رکھی ہوئی۔۔میرا لباس مغربی لوگوں سے زیادہ مغربیت لئے ہوئے تھا۔میں نے تو کسی سے یہ سوال بھی نہیں کیا تھا کہ آیا وہاں کی فوڈ کورٹ میں حلال فوڈ دستیاب بھی ہے یا نہیں۔۔میں نے وہاں ایک جوڑا بیٹھا دیکھا تھا جس کے دونوں رکن مرد تھے لیکن میں نے ان کو دیکھ کر ناک بھوں تک نہیں چڑھائی۔۔۔پچھلی سیٹ پر بیٹھا نو عمر لڑکا مسلسل شراب پینے میں مصروف تھا لیکن میں نے برا منا کر اپنی سیٹ بھی نہیں بدلی۔۔۔اس سے زیادہ غیر اسلامی ہو کر کیسے دکھاؤں ان کو" یہ ایک انتہائی بودی دلیل تھی۔

"میں سوچ رہا تھا دنیا میں کسی کو دہشت گرد کہہ دینا کیا اتنا ہی آسان ہے۔۔آپ کے بارے میں کوئی ثبوت بھی نا ہو۔۔آپ لباس انداز اور گفتگو میں دوسری اقوام کی نقل کر کر کے تھک ٹوٹ چکے ہوں پھر بھی کیا آپ کا کلمہ گو ہونا آپ کو دنیا کے لئے خطرے کی علامت قرار دے دیتا ہے۔۔ان آفیسرز نے اچھا نہیں کیا۔۔انہوں نے مجھے اندر سے توڑ دیا ہے۔۔انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ میرے لئے اتنی حقارت سے یہ لفظ استعمال کرتے" وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں سنوارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"برا مت ماننا لیکن اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ تم نور محمد کے بارے میں بھی ایسے مت سوچو۔۔جب ایک لفظ تمہیں اپنے لئے گالی لگ رہا ہے تو پھر تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم کسی دوسرے شخص کو وہ گالی دو۔۔اسے دہشت گرد قرار دو" وہ اب شہروز کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔اس نے لہجے اور الفاظ کو حتی الامکان حد تک نرم رکھا تھا۔شہروز کی ذہنی حالت کے باعث وہ اس قدر احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہروز سمجھے کہ وہ کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کچھ جتا رہا ہے۔شہروز نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا

"تم بھی کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو عمر۔۔نور محمد کا ذکر یہاں کہاں سے آ گیا۔۔وہ تو سرٹیفائیڈ دہشت گرد ہے۔۔۔وہ واقعی لوگوں کو انتہاء پسندی کی جانب لے جا رہا تھا" شہروز نے اس کی بات کا کچھ جواب تو دینا ہی تھا سو اس نے دیا۔یہ ان خیالات سے بھی زیادہ بودا جواب تھا جو اس کے ذہن میں گول گول گھوم رہے تھے۔عمر نے گہری سانس بھری۔

"انتہاء پسندی پتا نہیں کسے کہتے ہو تم۔۔۔نماز روزہ کی تلقین یا پھر حلال حرام کی احتیاط۔۔اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کرتا تھا وہ انسان۔۔اس کے اچھے اخلاق اور رویے نے اگر کسی کے بیٹے کو یا کسی کی بیٹی کو اسلام میں دلچسپی لینے کے لئے مجبور کر دیا تو اس کی بناء پر وہ دہشت گرد ہو گیا۔سرٹیفائیڈ دہشت گرد۔۔۔" عمر نے بہت ہی تحمل بھرے انداز میں لفظ "سرٹیفائیڈ" پر زور دیا تھا پھر شہروز کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بولا

"مذاہب کی تبلیغ وتشہیر کرنے والوں کو اگر دہشت گرد قرار دینا ٹھیک ہے تو پھر سب سے پہلے عیسائی مشنری دہشت گرد قرار دے جانے چاہئیں۔۔" وہ اس سے سوال کر رہا تھا

"تم اسے معصوم سمجھتے ہو نا؟" شہروز نے اسی انداز میں سوال کیا تھا

"وہ معصوم ہی تو ہے۔۔ مجھے بتاؤ اس شخص کا قصور کیا ہے۔۔۔ کیا صرف یہ کہ وہ ایک پریکٹیکل مسلم ہے۔۔ جو ان بچوں پر چیختا تھا جو مسجد کے احاطے میں خالی بیئر کے ٹن اور خنزیر کا فضلہ پھینک جاتے تھے۔۔ کیا اپنی عبادت گاہ کی حفاظت اس کا جرم ہے۔۔ کیا رحمانی طلب کرنے کے لئے آنے والوں کو اللہ کا پیغام دینا اسے دہشت گرد قرار دینے کے لئے کافی ہے۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ تم بھی اس طرح اس کی توہین کر رہے ہو" عمر نے اس سے سوال کیا تھا

"شاباش ہے دوست۔۔ تم اب میرا موازنہ اس شخص سے کرو گے۔۔ بہت خوب۔۔ یہاں میں اپنی الجھنوں میں ہوں اور تم مجھے طعنے دینے لگ گئے ہو۔۔ مجھے نہیں کرنی کوئی بات آؤ اب گھر چلتے ہیں۔۔۔ میں واقعی جذباتی ہو رہا ہوں۔۔ ہو جاؤں گا ٹھیک خود بخود" شہروز چڑ کر بولا تھا۔ عمر چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ اس نے سبق پڑھ لیا تھا لیکن سبق سیکھا نہیں تھا

☆ ☆ ☆

"زارا باجی! آپ سے ملنے کوئی آنٹی آئی ہیں" گیٹ کیپر نے انٹر کام پر بتایا تھا۔ وہ دوپہر کے بعد ہاسپٹل جانے والی تھی۔ اس لئے ابھی تک بستر سے نہیں نکلی تھی اور نکلنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے اس نے ابھی تک سلیپنگ سوٹ بھی نہیں تبدیل کیا تھا۔ وہ کسلمندی سے بستر میں گھسی واٹس ایپ میسجز دیکھ رہی تھی۔ امائمہ کا میسج تھا۔ ممانی (عمر کی امی) کے میسج بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ سب پوچھ رہے تھے کہ کچھ چاہئے تو ابھی بھی بتا دو۔ شہروز کی رات کی فلائٹ تھی۔ اسے قطر کے دو گھنٹے کے اسٹے اوور کے بعد دوپہر تک لاہور پہنچ جانا تھا۔ عمر نے بھی اسی قسم کا ایک میسج کیا ہوا تھا۔ نہیں کیا تھا تو شہروز نے نہیں کیا تھا۔ زارا نے اس کا فیس بک پیج بھی دیکھ لیا تھا جہاں مکمل سناٹا تھا۔ اس نے چند دن سے کوئی اسٹیٹس دیا تھا نا کوئی نئی تصویر نظر آ رہی تھی ورنہ اسے عادت تھی کہ خبطیوں کی طرح سوشل میڈیا پر ان رہتا تھا۔ اپنا آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا وہ ہر چیز اپنے دوستوں اور اپنے فینز کے ساتھ ڈسکس کرتا رہتا تھا۔ اس لئے اس کا کوئی نیا اسٹیٹس یا تصویر نا پا کر فطری طور پر زارا اسی سوچ میں الجھی تھی کہ آیا وہ اس طرح غیر حاضر کیوں ہے۔ سلمان حیدر نے اسے اُس کے متعلق انکشافات کا ڈھیر نا لگایا ہوتا تو شاید وہ اس بات کو عام سے انداز میں لیتی اور اب تک غیر سنجیدہ انداز میں اس کے پیج پر اس کی غیر حاضری کے متعلق کوئی پھبتی کس چکی ہوتی لیکن اب وہ اس صورتحال کے کئی معنی خود ہی اخذ کر رہی تھی اور خود ہی رد کر رہی تھی۔ اس لئے کسی آنٹی کی آمد کا سن کر اس نے زیادہ اچھا رسپانس نہیں دیا تھا۔ ابی کی وفات کے بعد سے اب ہر آنے والے مہمان کو خوش آمدید کہنا اس کے فرائض میں خود بخود شامل ہو چکا تھا لیکن زیادہ تر دوست احباب ہمیشہ کال کر کے آتے تھے۔ آنے والے مہمان کے متعلق اندازے لگاتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے بال درست کرتی وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی

"آپ آئی ہیں۔۔۔اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں" وہ آنٹی رافعہ کو اپنے انتظار میں بیٹھا دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولی پھر انہیں انتظار کروانے پر شرمندگی محسوس ہوئی تو بولی

"آپ مجھے کال کر لیتیں آنٹی۔۔۔دراصل میں آج سو کر ہی لیٹ اٹھی تھی۔۔۔شام کی ڈیوٹی تھی تو دل ہی نہیں چاہا کچھ کرنے کو۔۔۔آئی ایم سوری آپ کو اکیلے بیٹھنا پڑا۔۔کسی نے آپ کو پانی وانی بھی پوچھا ہے کہ نہیں۔۔۔میں آپ کے لئے چائے بنواتی ہوں" ایک ہی سانس میں کئی جملے بول ڈالے تھے اس نے۔۔۔

"یہاں آؤ اور آرام سے میرے پاس بیٹھو۔۔۔بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو۔۔۔غلطی تو میری ہے۔۔۔مجھے بتا کر آنا چاہیئے تھا۔۔۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بٹھایا پھر مسکراتے ہوئے بولیں

"میں تم سے گلہ کرنے آئی ہوں" انہوں نے مزید کہا تھا۔زارا حیران ہوئی

"کیا ہوا آنٹی۔۔۔مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی"

"تم نے مجھے شہروز کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔۔۔اتنی باتیں ڈسکس کیں۔۔۔اتنا کچھ بتایا اپنے متعلق۔۔۔لیکن جو بتانا چاہیئے تھا، وہی نہیں بتایا" وہ مسکراتے ہوئے مصنوعی ناراضی ظاہر کر رہی تھیں

"مجھے پھپھو نے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ تم لوگوں کی جلد شادی ہونے والی ہے۔" وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔زارا کے چہرے پر شرمگیں سی مسکراہٹ پھیلی۔۔۔یہ شاید پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اس ذکر پر کسی کے سامنے شرمائی تھی۔آنٹی رافعہ نے بغور اس کے انداز کا مطالعہ کیا تھا

"خوش ہو نا۔۔۔میں بھی تمہارے لئے بہت خوش ہوں۔۔۔اللہ تمہیں آئندہ زندگی کے تمام سکھ عطا کرے۔" وہ دعا دے رہی تھیں۔

"کیسا بچہ ہے شہروز۔۔۔؟" وہ اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر ساتھ ہی سوال بھی کر رہی تھیں۔زارا کو چائے پانی سب بھول گیا تھا۔اسے بس ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی دیرینہ سہیلی سامنے آ بیٹھی تھی اور اس کے محبوب کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

"اچھا ہے آنٹی۔۔۔میرے ماموں کا بیٹا ہے" وہ مسکرائی تھی

"ماموں کا ہو یا چاچو کا۔۔۔یا کسی دور پار کے عزیز کا بیٹا۔تمہارے حق میں اچھا ہے تو بس سب سے اچھا ہے" وہ اسکے ہاتھ کو تھپتھپا رہی تھیں

"جی آنٹی۔بہت اچھا ہے" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی

"سن کر خوشی ہو رہی ہے" وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔

"میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں" اس نے اٹھنا چاہا تھا لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا اور اسے اٹھنے نہیں دیا تھا۔

"چائے ہی نہیں کھانا بھی کھاؤں گی لیکن ابھی نہیں۔۔۔ابھی میں ایک کام سے تمہارے پاس آئی ہوں" وہ ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھیں۔زارا نے الجھ کر ان کا چہرہ دیکھا

"زارا! جو ہمارے حق میں اچھا ہو۔۔دل چاہتا ہے نا کہ وہ سب کے حق میں بھی اچھا ہو۔۔ہے نا۔۔میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا" وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں جہاں تاثرات کچھ الجھے ہوئے سے تھے

"مجھے پھپھو نے شہروز کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں۔۔۔۔وہ غلط ہاتھوں میں ہے۔۔اس نے تم سے بھی ذکر کیا ہوگا" زارا سے چند لمحے کچھ نہیں بولا گیا اور آنٹی بھی خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی تھیں

"جی آنٹی۔۔۔دراصل۔۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، وضاحت دینا چاہتی تھی لیکن آنٹی رافعہ کے ساتھ اس کا رشتہ اس نہج کا ہو چکا تھا کہ وہ ان سے کوئی بات چھپا نہیں سکتی تھی۔اس لئے وہ دو لفظ بول کر ہی چپ ہو گئی تھی

"زارا! میں تمہارے لئے یہ اجازت نامہ لائی ہوں۔۔"عہد الست کی تقریب رونمائی ہے۔۔۔میں چاہتی ہوں کہ تم وہاں شہروز کے ساتھ آؤ۔۔۔میڈیا پرسنل کی حیثیت سے شہروز کو بھی مدعو کیا جائیگا لیکن میں۔۔۔" انہوں نے اتنا کہا پھر رکیں

"ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں وہاں ایک ساتھ آؤ۔۔شہروز اپنے حوالے سے نہیں بلکہ تمہارے حوالے سے وہاں آئے۔۔۔سمجھ رہی ہو نا میری بات" وہ اب سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔زارا کے چہرے کی مسکراہٹ کا زاویہ پہلے سپاٹ ہوا تھا پھر الٹے ہوئے آدھے دائرے کی طرح ہونٹوں کے کنارے نیچے جھک گئے تھے۔۔وہ ہمیشہ ہتھیار ڈالنے میں عجلت کا مظاہرہ کرتی تھی

"یہ بہت مشکل کام ہے آنٹی۔۔آپ کو پھپھو نے سب کچھ بتایا ہوگا۔۔آپ جس ناول کی بات کر رہی ہیں نا شہروز بھی ایسی ایک ڈاکیومینٹری پر کام کر رہا ہے۔۔اس حساب سے یہ تقریب اس کے لئے اپنے حوالے سے اہم ہوگی۔۔وہ کبھی نہیں مانے گا۔۔۔اسے اپنے حوالے زیادہ عزیز ہیں۔۔۔وہ کبھی میری نسبت سے اس تقریب میں شریک نہیں ہوگا۔۔وہ میری بات کبھی نہیں سنے گا"

"زارا! تم اس کی ہونے والی شریک حیات ہو۔تمہاری بات کی اہمیت ہونی چاہیئے۔۔۔بالفرض اگر اس کی نظر میں تمہارے موقف کی اہمیت نہیں بھی ہے تب بھی یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اسے سمجھاؤ کہ وہ جس طرف جا رہا ہے۔۔وہ غلط ہے۔وہ تباہی کے دہانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔" آنٹی نے ذرا سا برا مان کر کہا تھا پھر اس کا پژمردہ انداز دیکھ کر نرم ہوتے ہوئے بولیں

"ہر بات میں کمزور پڑ جانا اچھی بات نہیں ہوتی۔۔میرے بچے اپنی طاقت کو پہچانو۔۔تم اس کی نصف بہتر بننے جا رہی ہو۔۔تم اس کے دم سے اور وہ تمہارے دم سے پہچانا جائیگا۔۔عورت کو اللہ نے مرد کی ذات پر بڑے اختیارات دیئے ہیں۔۔۔بہت حق دیا ہے۔۔اور جہاں کا حق زیادہ ہوتے ہیں وہاں فرائض بھی زیادہ ہوتے ہیں۔۔۔عورت مرد کی زندگی میں صرف لاڈ اٹھوانے، اپنے حسن کو سراہنے یا پھر اس کے بچے پیدا کرنے ہی نہیں آتی۔۔وہ اسے راہ راست پر لانے کے لئے بھی آتی ہے۔۔۔اپنی ذمہ داری کو پہچانو۔۔۔تم شہروز کی زندگی کا قطب نما ہو۔۔تمہارا فرض ہے کہ اسے حق اور باطل میں فرق کرنا سکھاؤ" آنٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے نصیحت کی تھی زارا ان کی بات کو سن رہی تھی اور ایمان بھی لا رہی تھی۔اس کے سامنے بیٹھی خاتون کو ایک عجیب وصف حاصل تھا۔وہ لوگوں کو اپنی بات سمجھا لینے کے فن سے بخوبی آگاہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے پاؤں تو بالکل روغنی نان بنتے جا رہے ہیں" عمر نے اس کے گلابی سوجے ہوئے پھولے پھولے پاؤں کی جانب دیکھتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔ امامہ نے اس کے اس طرح کہنے پر پاؤں کی جانب دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی

"مجھے تو لگتا ہے میں خود پوری کی پوری روغنی نان بن گئی ہوں۔۔ وزن اتنا بڑھ گیا ہے یکدم۔۔۔ اور پاؤں تو بالکل کپا ہوئے پڑے ہیں۔۔۔ درد بھی بہت کرتے ہیں" اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے پھیلایا تھا۔ وہ آجکل کافی سہل پسند سی ہو گئی تھی۔ ایک تو دن ایسے تھے اور پھر عمر اور آنٹی بھی اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمہ وقت تساہلے آرام کرتی رہتی تھی۔ ابھی بھی وہ آرام سے ٹانگیں پسارے کاؤچ پر بیٹھی تھی جبکہ عمر فلور کشن پر لیپ ٹاپ گود میں لیے مگن تھا۔ اس کے پاؤں پر نظر پڑی تو چڑانے کے لیے ایسے بول دیا۔ درد کا سن کر عمر کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے

"واقعی بہت درد کرتے ہیں؟" اس کے سوال پر امامہ نے منہ بنایا

"اور نہیں تو۔۔۔ سارا وزن پاؤں پر ہی تو ہوتا ہے۔۔۔ اتنے سوجے ہوئے ہیں تو درد ہی کریں گے نا"

"اوہو۔۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔؟" اس کا دھیان ابھی لیپ ٹاپ کی جانب تھا۔ امامہ مصنوعی ناراضی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی

"پہلے بتا دیتی تو کون سا تیر مار لیتے آپ" وہ طنز کر رہی تھی۔ عمر ہنسا

"کیا پتا کوئی تیر مار ہی لیتا" ایسا کہتے ہوئے اس نے دائیں آنکھ بھی دبائی تھی۔

"تم آنکھ ہی مار سکتے ہو۔۔ تمہیں کہاں آتا ہے یہ تیر ویر مارنا۔۔۔ یہ تو بہادر سورماؤں کا کام ہے۔۔" امامہ نے ذرا سا آگے ہو کر اپنی پشت پر پڑا کشن ٹھیک کیا تھا پھر ریموٹ اٹھا کر بولی تھی

"ارے یہ بہادر سورما تو بس قصے کہانیوں میں ملتے ہیں۔۔۔ اصل بہادر تو عورت ہوتی ہے۔ بہادر، باہمت اور واقعی جفاکش" وہ لیپ ٹاپ سائڈ میں رکھ کر اٹھا تھا

"وہ کیسے۔۔؟" امامہ نے بات برائے بات کی تھی۔ اس کا دھیان ٹی وی میں لگ گیا تھا

"وہ ایسے کہ اتنا وزن اٹھانا اور پھر اٹھائے رکھنا میرے بس کی تو بات نہیں مگر تم دن رات اٹھائے پھرتی ہو۔۔۔ یہ بہادری ہمت اور جفاکشی ہی تو ہے" وہ اسے سراہتے ہوئے باتھ روم کی سمت چلا گیا۔ امامہ دوبارہ سے ٹی وی دیکھتے ہوئے سوچنے لگی تھی کہ اس کے کتنے کام اس کی سستی کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ بے بی کے آنے میں تھوڑا وقت ہی رہ گیا تھا اور جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے وہ مزید سستی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ گھر میں ننھے مہمان کی ضرورت کی چیزیں آنے لگی تھیں۔ آنٹی نے عمیر کا اب تک سنبھالا ہوا اور جھولا اور بے بی بجھوا دیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی کھلے پڑے تھے جبکہ ان دونوں نے مل کر بھی کچھ کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ کی تھی۔ وہ سب بھی ایسے ہی پھیلا پڑا تھا۔ امامہ کا دل چاہتا تھا کہ اس میں ہمت تھی کہ وہ سب چیزیں سمیٹ کر رکھ لے۔ وہ روز سوچتی تھی کہ آج یہ سب نبٹا لوں گی لیکن پھر سستی

آڑے آجاتی۔ وہ ذہنی طور پر اب کچھ مطمئن ہوتی جاتی تھی اور اس کی وجہ بھی عمر ہی تھی۔ اس نے وہ فیس بک پیج جو نور محمد کی تلاش کے لئے بنایا تھا۔ اسی میں تبدیلیاں کر کے اسے فعال کر دیا تھا۔ وہ امائمہ سے ڈسکس تو نہیں کرتا تھا لیکن امائمہ کو فیس بک کی وجہ سے ہی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ وہ فیس بک پیج پر لوگوں کا رسپانس دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ پیج کے فعال ہوتے ہی چند گھنٹوں میں لوگوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اس پر لائکس کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی تھی اور سب سے زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ اس میں انتھکس کی تخصیص نہیں تھی۔ وہ سفید فام جو تو مسلم تھے ان کا ٹرن آؤٹ سب سے زیادہ تھا۔ وہ اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا رہے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر سب اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ اگر نور محمد واقعی معصوم ہے تو پھر اسے فی الفور رہا کیا جانا چاہیے۔ امائمہ کو یہ سب دیکھ کر بہت ڈھارس ملی تھی۔ پہلے جب یہ موضوع چھڑا تھا تو ساس سسر اور سب سے بڑھ کر شہروز کی باتیں سن کر وہ بہت ناامید ہو گئی تھی اور اسی لئے اس کی رائے بھی اپنے بھائی کے بارے میں کنفیوژن کا شکار ہو گئی تھی لیکن اب وہ پر امید ہو چلی تھی کہ اللہ کوئی سبیل ضرور پیدا کر دیں گے۔ اس نے امی سے بھی بات کی تھی اسے ان سے بھی بہت کچھ پتا چلا تھا۔ ابو کے رویے میں آنے والی مثبت تبدیلی اور سلمان حیدر نامی صحافی کی معاونت۔۔ یہ سب چیزیں اس کو حوصلہ اور شرم دونوں دلانے کے لئے کافی تھیں۔ وہ عمر سے اس بات پر معذرت کرنا چاہتی تھی کہ اس نے بزدلی اور منافقانہ رویہ اپنا کر غلطی کی تھی لیکن عمر اسے اس کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ یہی سب سوچ رہی تھی جب عمر باتھ روم سے نکلا اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا چھوٹا ٹب تھا۔ اس نے وہ لا کر امائمہ کے کاؤچ کے سامنے رکھ دیا تھا

"یہ لیں بیگم صاحبہ آپ بھی کیا یاد کریں گی" وہ کہہ رہا تھا۔ امائمہ نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا

"اس نیم گرم پانی میں کچھ دیر پاؤں رکھ کر بیٹھو۔۔۔ سوجن دور ہو گی اور تمہیں اچھا لگے گا" وہ اپنی جانب سے ٹوٹکہ بتا رہا تھا

"واقعی۔۔ لیکن تمہیں کس نے بتایا؟" امائمہ دل ہی دل میں اس کے انداز محبت پر نہال ہوئی لیکن سوال پوچھتے وقت عام سا انداز اپنا لیا

"میں نے ابھی نیٹ سے دیکھا ہے کہ اگر اس حالت میں پاؤں میں ورم ہو تو کیا کرنا چاہیے" عمر خوش ہوتے ہوئے بولا تھا۔ وہ پہلے بھی ایسے کام کرتا رہتا تھا۔ انٹرنیٹ سے اس کے لئے پریگننسی میں خود کو صحتمند رکھنے کے ٹوٹکے اور یوٹیوب سے اس کے لئے یوگا کے آسن کی ویڈیوز ڈاؤن لوڈ کرنا اس کی روٹین میں شامل تھا۔ امائمہ نے اپنے پاؤں کھسکا کر پانی میں ڈبو دیے تھے۔ عمر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ امائمہ کو چند لمحوں میں ہی گرم پانی کی تاثیر پورے بدن میں محسوس ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی کمر کاؤچ کی پشت سے ٹکالی تھی۔ ایسا لگتا تھا تھکن کوئی پاؤں کی انگلیوں کے ذریعے نچوڑ کر لے جا رہا ہو۔ پاؤں کو سکون ملا تو ذہنی سکون بھی خود بخود پیدا ہونے لگا تھا۔ دل میں عمر جیسا شریک حیات ملنے پر شکر گزاری کے جذبات بڑھنے لگے۔

اس نے آنکھیں کھول کر عمر کی طرف دیکھا اسی لمحے اس نے بھی اس کی جانب دیکھا پھر وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائے تھے

"تمہیں پتا ہے عمر میری امی تمہارے بارے میں کیا کہا کرتی تھیں۔۔ امی کہا کرتی تھیں کہ امائمہ ایک دن تم عمر احسان جیسا لائق

پارٹنر چننے کے فیصلے پر فخر کروگیا اور واقعی مجھے فخر ہوتا ہے عمر کہ مجھے تم جیسا ساتھی ملا۔۔ یو آر دا بیسٹ عمر" وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولی تھی

"اس چھوٹے سے پانی کے ٹب کی وجہ سے اب اتنا بھی شکر گزار مت ہو امائمہ۔۔۔ یہ واقعی میرا فرض ہے۔" وہ عام طور سے ایک دوسرے کی ایسی باتیں مذاق میں اڑا دیا کرتے تھے لیکن اس لمحے نا صرف امائمہ بلکہ عمر بھی سنجیدہ تھا۔اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا

"میں تمہارا خیال نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔۔تم میری خاطر ہی تو یہ سب تکلیف سہہ رہی ہو۔۔تمہیں اس حالت میں دیکھتا ہوں ہوں تو دل میں تمہاری ریسپیکٹ مزید بڑھ جاتی ہے۔۔عورت بے حد قابل عزت ہے یار۔۔میرا تو ماننا ہے دنیا کی ہر عورت اچھی ہوتی ہے۔۔ورنہ اتنی تکلیف سہنا آسان بات نہیں ہے اور اسی لئے اللہ کے یہاں عورت کا اتنا درجہ ہے۔۔آج تک یہی پڑھتے سنتے آئے ہیں کہ مرد اور عورت برابر ہیں لیکن اب یقین ہو چلا ہے کہ عورت جب ماں بن جاتی ہے نا تو اس کا درجہ مرد سے بہت برتر ہو جاتا ہے۔۔وہ بہت زیادہ کی مستحق ہو جاتی ہے" وہ اس کے ہاتھ کو تھپتھپا رہا تھا۔وہ اب ایسی باتیں کثرت سے کرتا تھا

"عمر یہ بات میں اس لئے نہیں کہہ رہی کہ تم ایک اچھے شوہر ہو یا اچھے بیٹے ہو۔۔۔بلکہ اس لئے کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔۔ایک بہترین انسان۔"

"آج تو کوئی اچھا ہی دن ہے بھائی۔۔۔بیوی تعریف کرنے کے موڈ میں ہے" عمر نے اس کی بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا۔امائمہ چند لمحے کچھ نہیں بولی بلکہ لفظ جمع کرتی رہی

"میں نے وہ پیج دیکھا عمر۔۔نور محمد والا۔۔۔۔۔مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔۔تم واقعی بہت اچھے ہو۔۔ورنہ کون کرتا ہے کسی کے لئے اتنا۔۔۔تم میرے ماں باپ اور بھائی کے لئے جو کر رہے ہو۔۔اللہ ہی تمہیں اس کا اجر دے گا عمر" امائمہ اب بھی اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔وہ اگر دیکھتی تو پھر شاید جملہ مکمل نا کر پاتی۔عمر نے گہری سانس بھری

"امائمہ ایک بات یاد رکھنا یہ کام میں کسی کے لئے نہیں کر رہا۔۔یہ میرے اپنے ذہنی سکون کے لئے بہت ضروری ہے۔۔اور میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔۔۔بات صرف یہ نہیں ہے کہ نور محمد تمہارا بھائی ہے۔۔وہ اگر کوئی ایس وائے زیڈ بھی ہوتا اور کوئی مجھے اس کی زندگی کے یہ سب واقعات بتا کر اس کی مدد کرنے کو کہتا تو میں تب بھی اس کی مدد ضرور کرتا۔۔۔" عمر کے لہجے میں اس قدر استقامت تھی کہ امائمہ کو اس پر رشک آیا۔

"تم نے واقعی وہ پیج دیکھا۔۔میں بہت خوش ہوں لوگوں نے بہت اچھا ریسپانس دیا ہے۔۔عمیر بھی میرے ساتھ مل گیا ہے۔۔ابو بھی آج صبح پتا کیا کہہ رہے تھے۔۔۔کہنے لگے عمر تو بہت ڈھیٹ ہے۔۔جس بات پر ڈٹ جاتا ہے پھر اس پر ڈٹا رہتا ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ ہمیشہ جائز بات پر ضد کرتا ہے۔۔اس بات کا مطلب یہ کہ وہ بھی اب ناراض نہیں ہیں اور تم دیکھنا اب بہت جلد تمہارا بھائی مل جائیگا۔میں نے آج تک اس کام میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا جس میں میرے پیرنٹس میرے ساتھ تھے۔۔انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائیگا۔۔تم

صرف اپنا حوصلہ قائم رکھو اور دوبارہ کچھ غلط ملط مت سوچنا۔۔میں بہت پرامید ہوں۔۔اور مجھ سے زیادہ سر نور محمد پرامید ہیں۔۔وہ اس ویک اس پورے کاز کو پبلک کے سامنے اپورٹ کرنے پاکستان جا رہے ہیں۔۔۔ان کے ناول کی تقریب رونمائی ہوگی اور پھر میڈیا نور محمد کا ذکر کھلے عام کرنے سننے پر مجبور ہو جائیگا میری آج ان سے بات ہوئی تھی۔۔کہتے بہت خوش ہوں۔۔دانہ دانہ کرکے تسبیح بن رہی ہے" امائمہ کو یہ سب بتاتے ہوئے وہ بھی کافی خوش نظر آیا

"مجھے بھی پاکستان ہونا چاہیئے تھا" امائمہ نے اس کے چہرے پر پھیلے سکون کو محسوس کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی

"انشاء اللہ۔۔۔یہ ذرا شہزادہ عالم یا شہزادی صاحبہ دنیا میں تشریف لے آئیں پھر ہم بھی جائیں گے" وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دے رہا تھا۔امائمہ کو اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ سکون محسوس ہوا۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا زارا" شہروز اس کے منہ سے عوف بن سلمان اور پھر اپنے ڈاکیومینٹری پراجیکٹ کے متعلق اتنی تفصیلات سن کر حیران ہوا تھا۔زارا نے سینٹرل ٹیبل پر پڑا اس کا لایا ہوا اسفید ٹیولپ کا بوکے دیکھا۔ان کی مہک اسے کاؤچ تک آ رہی تھی۔ٹیبل پر وہ تحائف بھی پڑے تھے جو اسے ماموں ممانی اور امائمہ نے بھجوائے تھے اور انہی میں وہ وہ خوبصورت پلاٹینم کا ڈائمنڈ پینڈینٹ بھی تھا جو شہروز اس کے لئے لایا تھا اور اس نے واٹس ایپ پر اسے اس کا امیج بھی بھیجا تھا۔وہ صبح لاہور پہنچ گیا تھا اور اب ڈنر سے پہلے وہ اس کے گھر موجود تھا۔زارا جانتی تھی وہ اسے ڈنر کے لئے باہر بھی لے جائیگا۔وہ جب بھی بہت دن کے بعد اس سے ملتا تھا۔اسے اتنا وقت ضرور دیتا تھا کہ وہ ایک وقت کہیں اطمینان سے بیٹھ کر چائے کافی پی سکیں یا کھانا کھا سکیں۔اتنے دن بعد ملنے پر ان چند گھنٹوں میں اس کا التفات بھی عروج پر ہوتا تھا۔وہ اس سے باتیں کرتا تھا۔اس کے مسئلے بھی سن لیتا تھا۔اپنی تعریفیں بھی کر لیتا تھا اور کبھی کبھی اس کی تعریف بھی کر لیتا تھا۔اس حساب سے دیکھا جاتا تو آج کا دن زارا کے لئے بڑا قیمتی تھا۔ایسے دن اس کے حافظے میں بہت دیر تک محفوظ رہتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خود کو شہروز کے سامنے وہ متنازعہ مسئلہ چھیڑنے سے روک نہیں پائی تھی۔وہ شاید ایسا کر بھی لیتی اگر آنٹی رافعہ نے اس کی اتنی اچھی برین واشنگ نا کی ہوتی

"اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے شہروز کہ کس نے بتایا۔۔۔فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ تم نے نہیں بتایا" زارا نے عام سے انداز میں کہا تھا۔یہ شکوہ نہیں تھا۔وہ شکوے کر کے اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔اس کے لئے گفتگو کا موضوع ہی کافی تھا

"زارا۔۔۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر اس کا نام لیا جیسے جتانا چاہ رہا ہو کہ تم بھی حد کرتی ہو

"یہ ایک انتہائی کانفیڈینشل ایشو ہے یار۔۔آفس میں ہونے والی سب باتیں تو میں نہیں بتاتا تمہیں۔۔۔میری جاب ہی ایسی ہے" وہ وضاحت نہیں دے رہا تھا صرف اپنی جھنجھلاہٹ چھپا رہا تھا۔وہ اپنی ہونے والی بیوی سے یہ باتیں نہیں کرنے آیا تھا

"شہروز۔۔اس بات کو چھوڑ دو۔۔فی الوقت اس سے زیادہ اہم مسئلہ درپیش ہے۔۔۔تم یہ پراجیکٹ چھوڑ دو شہروز۔۔۔ہمیں کوئی

ایسا کام نہیں کرنا جو اللہ کی ناراضی کا باعث بنے" وہ بہت تحمل سے بولی تھی

"زارا۔۔۔" وہ مزید چڑ گیا اس کی آنکھیں بھی پھیل سی گئی تھیں

"اس معاملے میں اللہ کہاں سے درمیان میں آ گیا۔۔۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور کیا تم سوچ بھی سکتی ہو کہ میں کوئی ایسا کام کروں گا جو اللہ کو ناپسند ہو۔۔ میں شہروز منور ہوں۔۔ جون، فلپ یا اسمتھ نہیں ہوں۔۔ مجھے یہ اسلامیات کا درس مت دو"

"شہروز امائمہ کا بھائی دہشت گرد نہیں ہے" وہ لاچاری سے بولی تھی۔ اسے اپنی بات اسی طرح منوانی آتی تھی۔ شہروز نے اس کا چہرہ بغور دیکھا

"اوہ۔۔ اب میں پہنچ گیا ہوں صحیح اسٹیشن پر۔۔۔ تمہیں صرف میرے پراجیکٹ کا ہی نہیں پتا بلکہ یہ بھی پتا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے۔۔۔ تمہیں یقیناً عمر نے بتائی ہیں یہ سب باتیں۔۔۔ وہ خود جب کچھ نہیں کر سکا تو اس نے تمہیں میرے خلاف بھڑکا دیا" وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔ زارا نے فوراً نفی میں گردن ہلائی تھی

"نہیں شہروز۔۔ عمر نے کچھ نہیں کہا۔۔۔ اس سے میری بات بھی نہیں ہوئی۔۔ مجھے سلمان حیدر نے بتایا ہے یہ سب" زارا نے اس کے سامنے یہ نام لینا ضروری سمجھا تھا

"سلمان حیدر۔۔۔؟" اس نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا

"وہ بھی ایک صحافی ہیں۔۔۔ یونیورسٹی میں تمہارے سینئر تھے۔۔ فری لانسر ہیں۔۔۔ رضوان اکرم صاحب جانتے ہیں انہیں" وہ اسے تفصیل سے بتا رہی تھی۔

"رضوان صاحب کو چھوڑو۔۔۔ تم یہ بتاؤ تم کیسے جانتی ہو "انہیں"۔۔۔" اس کی ٹون مزید طنزیہ ہوئی تھی۔ زارا نے تاسف سے اس کے انداز کو دیکھا تھا

"شہروز تم ان سب باتوں کو چھوڑ دو۔۔۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی لیکن ابھی تم میری بات غور سے سنو۔۔۔ تم اس پراجیکٹ کو چھوڑ دو۔۔۔ میری خاطر" اس نے التجائیہ انداز اپنایا تھا

"زارا تم کب بچوں کی طرح بی ہیو کرنا چھوڑو گی۔۔۔ یہ کوئی اسکریبل کی گیم نہیں ہے کہ تم ایک بار کہو اور میں تمہاری دلجوئی کی خاطر سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاؤں۔۔۔" وہ اچھل کر بولا تھا۔

"شہروز۔۔ پلیز۔۔۔ میری خاطر" وہ منت پر اتر آئی تھی اور وہ جانتی تھی کہ شہروز اس کے اس انداز سے چڑتا ہے

"زارا یہ دیکھو۔۔۔" اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے

"میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔۔ میں پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں۔۔۔ عمر کو ناراض کر کے آیا ہوں۔۔ اور اب تم یہاں یہ جذباتی فلم اسٹارٹ کر کے بیٹھ گئی ہو۔۔۔ تم لوگ مجھے جانتے نہیں ہو گیا۔۔ میں کوئی غلط کام کیسے کر سکتا ہوں" وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں

بول رہا تھا۔زارا چند لمحے کچھ نہیں بولی۔اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا

"تم اس سارے معاملے سے دور رہو یار۔۔۔یہ تمہارے لئے ایک الگ سیارے کی کہانی جیسا ہے۔۔۔تمہیں جو بتایا گیا ہے وہ سب حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔۔میں جانتا نہیں ہوں کہ سلمان حیدر کو تم کیسے جانتی ہو لیکن وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو ابھی تک اپنی ضدی طبیعت کے باعث اپنا کریئر نہیں بنا پایا۔۔حیرانی اس بات کی ہے کہ اس نے تمہیں کیوں اپروچ کیا۔تم اس ساری سازش پر غور کرو۔۔وہ جلتا ہے مجھ سے۔۔۔میری ترقی نے میرے بہت سے حریف پیدا کر دیے ہیں۔۔وہ بندہ بھی انہی میں سے ایک ہے" وہ اب اپنے لہجے کو نرم رکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا

"شہروز!تم غلط سمت میں سوچ رہے ہو۔۔میں اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔تمہارا پراجیکٹ اگر میرے لئے کسی اور سیارے کی کہانی ہے نا تو یہ بندہ تمہارے لئے کسی اور سیارے کی مخلوق ہے۔۔وہ کسی کا حریف نہیں ہو سکتا" ساری گفتگو میں وہ پہلی مرتبہ ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔شہروز نے اس کی جانب غور سے دیکھا

"زارا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔۔۔اس خلائی مخلوق کی بات کا یقین ہے۔۔۔ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔۔۔میں اس پراجیکٹ کی خاطر عمر کی ناراضی مول لے سکتا ہوں تو پھر کسی کی بھی ناراضی مول لے سکتا ہوں" وہ اتنا کہہ کر کاؤچ پر پیچھے کی جانب ہوا تھا اور کسی ناراض بچے کی طرح منہ بسور کر بیٹھ گیا تھا۔اس کے لفظوں نے زارا کا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔وہ اس شخص کے لئے کبھی پہلے نمبر پر نہیں رہی تھی۔وہ ہمیشہ دوسرے تیسرے نمبر کا امیدوار تھی۔یہ بہت تکلیف دہ سچ تھا۔وہ بھی ہاتھوں کی انگلیوں کو چٹخاتی ہوئی رنج والم کی تصویر بنی بن کر بیٹھ گئی تھی۔چند لمحے بعد شہروز نے اسے دیکھا پھر جانے اس کے دل میں کیا سمائی۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا تھا

"زارا۔۔میری جان۔۔" اس نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

"تمہیں لگتا ہے۔۔میں اتنا برا ہو سکتا ہوں؟۔۔۔میں بھی کوئی غلط کام کر سکتا ہوں کیا۔۔۔تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔۔میں اتنا برا نہیں ہوں۔۔مجھے بھی اللہ کو منہ دکھانا ہے۔۔" وہ زارا کو اتنا لاچار کبھی نظر نہیں آیا تھا۔اس نے اسے کبھی اتنی محبت سے اسے مخاطب بھی نہیں کیا تھا۔زارا کو یکدم احساس ہوا کہ وہ بھی الجھا ہوا نظر آتا تھا۔اس کی ذہنی کیفیت بھی مخدوش ہو سکتی تھی۔وہ واقعی اگر اس پراجیکٹ کے لئے عمر کی ناراضی مول لے رہا تھا تو یقیناً یہ پراجیکٹ اس کے لئے بہت اہم تھا۔زارا کچھ نہیں بولی۔وہ اتنے مضبوط دل کی مالک نہیں تھی کہ محبوب کو اس طرح لاچار بیٹھا دیکھتی اور پھر بھی اپنے موقف پر ڈٹی رہتی۔

"میں پہلے ہی بہت الجھا ہوا ہوں یار۔۔۔میرے ذہن میں بھی ہلچل مچی ہے۔۔دل کہتا ہے جو بھی عمر کہہ رہا ہے وہ بھی غلط نہیں ہے۔۔۔میں خود ڈبلن میں بہت کچھ سہہ کر آیا ہوں۔۔۔مسلمانوں کے لئے مغرب میں تعصب بڑھ رہا ہے۔۔امائمہ کا بھائی دہشت گرد نہیں ہو سکتا لیکن وہ انتہا پسندانہ جذبات تو رکھتا تھا اور یہ بات سب جانتے ہیں۔۔۔اب میں یہ تو نہیں کہہ کر اس مسئلے سے جان چھڑوا سکتا کہ او ہو نور محمد تو میرا رشتہ دار ہے اس لئے وہ بہت معصوم ہے۔۔دنیا ان باتوں کو نہیں مانتی۔۔۔یہاں جو دکھتا ہے وہی بکتا ہے۔۔نور محمد گو اتنا

موبے میں ہے۔۔۔یہی امر اسے دہشت گرد قرار دینے کے لئے کافی ہے۔۔۔تم بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔یہ پراجیکٹ میرے کریئر کے لئے بہت اہم ہے۔۔۔میرا ایک ترکش کولیگ اس پراجیکٹ سے علیحدہ ہو گیا ہے۔۔۔میں اب یہ پورا پراجیکٹ ہینڈل کروں گا۔۔اس پر صرف میرا نام ہوگا۔۔۔یہ میری شناخت کا ذریعہ بنے گا۔۔میری ایک الگ پہچان بن جائیگی صحافت کی دنیا میں۔۔۔میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔کسی قیمت پر نہیں۔۔۔میرے ساتھ یہ سب مت کرو۔۔۔مجھے اکیلا مت کرو۔۔میری طاقت بنو یار۔۔میری مدد کرو۔۔مجھے میری شناخت بنانے دو" وہ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لئے بے حد نرم لہجے میں اپنا موقف واضح کر رہا تھا۔اس کے انداز میں محبت سے زیادہ التجا تھی۔وہ ایک دوست سے کنارہ کر آیا تھا اور اب یہاں دوسرا کڑا مرحلہ درپیش تھا۔جان سے بھی زیادہ عزیز کون جس کے ساتھ اس کی زندگی کی ہر چھوٹی سے چھوٹی خوشی وابستہ تھی اس کے ساتھ کنارہ کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔زارا چند لمحے اس کے ہاتھوں کی حرارت کو محسوس کرتی رہی۔وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔وہ اتنا برا نہیں ہو سکتا تھا۔۔ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"تم شہروز کی زندگی کا قطب نما ہو۔۔تمہارا فرض ہے کہ اسے حق اور باطل میں فرق کرنا سکھاؤ" جس مقام پر اس کا اعتماد اور توانائی ایک ساتھ کم پڑنے لگی تھی عین اسی مقام پر اسے آنٹی رافعہ کی بات یاد آ گئی۔

"شہروز" زارا نے اپنے گالوں پر سجے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا پھر اسے اپنے چہرے سے ہٹا دیا لیکن چھوڑا نہیں

"تم بہت ذہین ہو۔۔میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔۔میں تو عام سی باتیں کرنے والی،عام سے انداز میں سوچنے والی لڑکی ہوں لیکن ایک بات میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔۔انسان اپنی ذات کے حوالے سے بہت دیر تک نہیں پہچانا جاتا۔ایک وقت ہوتا ہے وہ باپ اپنے خاندان کی نسبت سے جانا جاتا ہے،پھر ذات برادریاں اور قبیلے آجاتے ہیں۔۔قدرت گنے چنے خوش قسمت انسانوں کو وہ مقام دیتی ہے کہ وہ صرف اپنے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔۔۔تمہیں بھی قدرت نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ تمہارا اپنا ایک حوالہ ہے۔۔۔ایک شناخت ہے" وہ بات کو ادھورا چھوڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا

"شہروز!انسان کتنا بھی سوٹڈ بوٹڈ ہو لے،اس کی گفتگو میں کتنے ہی اسرار کیوں نا چھلکتے ہوں۔۔۔وہ جس قدر مرضی مشہور ہو۔۔ایک حد کے بعد اس کی ذاتی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔۔اس کے بعد اس کی شناخت اس کا مذہب ہوتا ہے۔۔اس کا وطن ہوتا ہے۔۔اور وہ انہی حوالوں سے پہچانا جاتا ہے۔۔اور یہ حوالے کبھی نہیں بدلتے۔۔اس کی یہی شناخت اہم ہوتی ہے۔۔۔باقی سب پیچھے رہ جاتا ہے۔۔۔تم یو ایس اے چلے جاؤ یا فرانس۔۔ایمازون کے جنگل ہوں یا کینیڈا کے دور دراز علاقے۔۔تم مسلمان رہو گے۔۔پاکستانی ہی رہو گے۔۔" زارا کی توانائی بحال ہو رہی تھی۔اسے ادا کرنے کو مناسب لفظ مل ہی گئے تھے۔شہروز نے اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا

"میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں زارا اور میرے لئے یہ حوالے بہت اہم ہیں۔۔۔یہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں" وہ عام سے انداز میں بولا تھا

"اس لئے شہروز تمہاری اولین ذمہ داری ان حوالوں کو معتبر بنانا ہے۔۔انہیں سنوارنا ہے۔۔۔جس قدر یہ حوالے معتبر ہوں

گے، اسی قدر تم معتبر ہو گے۔۔۔تمہیں قدرت موقع دے رہی ہے۔۔اسے پہچانو شہروز۔۔۔کوئی ایسا کام مت کرو جس سے تم تو معتبر ہو جاؤ لیکن تمہارے حوالے حقیر ہوں۔۔۔اپنے حوالوں کی توہین مت کرو" زارا نے کہا تھا۔

شہروز نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر وہ اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا تھا۔وہ کس قدر درست بات کر رہی تھی اور پھر ڈبلن کی پورٹ پر اس کے ساتھ جو ہوا تھا اگر وہ سب اسے کچھ نہیں سکھا پایا تھا تو پھر اسے کچھ بھی" کچھ" نہیں سکھا سکتا تھا۔شہروز نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو دیکھا۔یہ چہرہ کس قدر قیمتی تھا اس کے لئے۔۔۔یہ زارا کا چہرہ تھا۔اس کی زارا کا چہرہ۔۔زارا قیمتی تھی اس کے لئے۔۔اور وہ یہ بھی جانتا کہ وہ خود زارا کے لئے کس قدر قیمتی تھا۔۔وہ اس کی روح کی ساجھے دار تھی۔دنیا میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن سے آپ اس قدر بے تکلف ہوتے ہیں کہ آپ کا وجود ان کے لئے کھلی کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ان سے آپ کچھ نہیں چھپا پاتے لیکن انہیں لوگوں میں شاید کوئی ایک آدھا ایسا ہوتا ہے جن کو آپ اپنی روح تک رسائی دیتے ہیں۔زارا واقعی اس کی روح کا حصہ تھی۔وہ اسکی احمقانہ باتوں کو رد نہیں کر پاتا تھا تو اس کی اتنی قیمتی بات کیسے رد کر دیتا لیکن دوسری جانب اس کا کریئر تھا۔جس کو بنانے میں اس کا ایک ایک لمحہ صرف ہوا جا رہا تھا۔یہ پراجیکٹ اس کے لئے اب مزید اہم ہو گیا تھا۔عوف بن سلمان نے اسے خود کال کر کے کہا تھا کہ وہ ڈاکیومینٹری کی سب ذمہ داریاں اب اکیلے نبھائے گا اور اس کے لئے اسے تمام چینلز پر مکمل پروجیکشن دلوائی جائیگی۔بین الاقوامی خبر رساں ادارے بھی اسی کا نام لے کر یہ ساری باتیں بریک کریں گے۔وہ کافی پریشان تھے اور انہوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ تیمور کے اس طرح ان کے پراجیکٹ سے علیحدہ ہو جانے پر ان کے کاز کو کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ یہ کام جتنی جلدی ممکن ہو، پایہ تکمیل تک پہنچ جائے۔۔وہ شہروز کو مزید شہرت کے خواب دکھا دکھا کر پاگل کئے دے رہے تھے۔مشہور ہو جانے کی خواہش اس کے ذرے ذرے میں پنپ رہی تھی۔ایسی صورتحال میں زارا کی باتیں اسے جھلانے پر مجبور کر رہی تھیں۔شہرت کی وہ ہوش اڑا دینے والی دیوی تھی جو بانہیں پھیلائے اسے اپنی آغوش میں لینے کو بے تاب کھڑی دکھائی دیتی تھی وہ اسے بھی کیسے رد کر دیتا۔وہ پاگلوں کی طرح اس کی تلاش میں پھرا تھا اور اب جب وہ سامنے کھڑی تھی تو اس کی پھیلی ہوئی بانہوں کو جھٹلا دینا آسان نہیں تھا۔اس نے اپنے درد کرتے سر کو اپنے ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شہروز۔۔کیا بات ہے میرا بیٹا کچھ پریشان ہے؟" امی کب اس کے کمرے میں آئیں اور کب اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں اسے خبر بھی نا ہوئی تھی۔وہ کب سے بالکونی میں کھڑا سامنے مین سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔وہ لاہور میں ہی تھا ان کے ایریا میں گزشتہ کچھ مہینوں میں تین نئے کیفے ٹیریا بنے تھے جہاں رات گئے ہجوم رہتا تھا۔نوجوان لڑکے لڑکیاں مت نئے فیشن کے دلدادہ، باؤلنگ کھیلنے اور شیشہ پینے کے شوق میں وہاں جمع رہتے۔ان کا علاقہ بہت پرسکون ہوا کرتا تھا لیکن اب یہاں شور ہنگامہ بہت بڑھ گیا ہوا تھا جس کی بنا پر مقامی آبادی خوش نہیں تھی لیکن کوئی شکایت بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ تقریباً ہر گھر سے ایک آدھا بچہ ان کیفے ٹیریا میں اپنی شامیں بنانے کا شوقین تھا۔انہی کیفے ز کی وجہ سے یہاں ٹریفک کا ہجوم بھی زیادہ رہنے لگا تھا لیکن شہروز وہاں بنا کسی مقصد کے کھڑا لایعنی

سوچوں میں گھرا تھا۔عجیب سناٹا تھا جو روح پر جمود طاری کر رہا تھا اور عجیب شور تھا جو کانوں کو تکلیف دیتا لگتا تھا۔امی کی آواز سن کر اس نے گہری سانس بھری اور مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔وہ اس کے برابر آ گئی تھیں۔شہروز کچھ نہیں بولا اور پھر سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔بجلی چلی گئی تھی لیکن ایک ہی لمحہ لگا تھا جب تاریکی نے سارے ماحول کو اپنے پنجے میں جکڑ کر ہڑپنے کی کوشش کی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یو پی ایس جنریٹرز کی بدولت اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ایک ایک کر کے روشنیاں ہونے لگی تھیں۔ان کی شدت پہلے سے کم تھی لیکن پھر بھی تاریکی شکست خوردہ ایک جانب پڑی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ان دونوں ماں بیٹے نے یہ منظر دیکھا

"روشنی بھی ہار نہیں مانتی نا۔۔تاریکی کتنی ہی ظالم کیوں نا ہو۔۔روشنی اپنا راستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے" امی نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔وہ اس کی ماں تھیں۔وہ جانتا تھا کہ وہ ذومعنی باتیں نہیں کرتی تھیں لیکن اس لمحے اس کو لگا کہ جیسے انہوں نے اس پر طنز کیا ہے۔وہ سامنے ہی دیکھتا رہا۔ان کی بات کا کوئی جواب دیا نا کوئی چہرے پر کوئی تاثر ابھرا۔امی ایک نظر اس پر ڈالتیں اور پھر سامنے دیکھنے لگتیں لیکن جب وہ کچھ بول کر نہیں دیا تو انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا

"کیا بات ہے۔۔آج تو میرے پاس بیٹھے بھی نہیں۔۔میں نے سوچا میں خود اپنے بیٹے کے پاس بیٹھ جاؤں کچھ لمحے۔۔۔کل تو پھر واپس کراچی چلے جاؤ گے" وہ عام سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔شہروز نے بہت سست سے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔وہ اس کی ماں تھیں۔اس نے یاد کرنے کی کوشش کی وہ گزشتہ بار کب ان کے پاس اطمینان سے بیٹھا تھا۔کب ان سے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔۔اسے یاد نہیں آیا تھا۔وہ اس کی عزیز ترین ہستی تھیں۔دنیا میں کوئی دوسرا وجود،کوئی دوسرا چہرہ،کوئی دوسری ذات اس کے لئے ان سے زیادہ مقدم نہیں تھی اور اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے گزشتہ بار کب ان سے باتیں کی تھیں۔ان کی باتیں سنی تھیں اسے آج پتا چلا تھا کہ امی ذیابیطک ہو چکی تھیں۔وہ چھ مہینے سے انسولین لے رہی تھیں اور اسے خبر بھی نہیں تھی۔اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور وقت اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گیا تھا۔وہ امی کے ساتھ بہت اٹیچڈ رہا۔وہ بہت پرتھلی قسم کی عورت تھیں۔سارا دن پھرکی کی طرح گھر کے کاموں میں مگن گھومتی پھرتی رہتی تھیں پھر شام کو ان کے پاؤں میں درد ہونے لگتا تو شہروز ان کے پاؤں کا مساج کرتا اور ان کے پاؤں دبا دیتا اور ساتھ ساتھ ان کے پاؤں میں گدگدیاں کرتا رہتا۔وہ ناراض ہوتیں تو کہتا

"امی یہ تو میرا فرض ہے۔۔آپ میری جنت کی سیڑھی ہیں۔۔آپ نے مجھے جنت میں لے جانا ہے۔۔لیکن آپ مجھے تب ہی جنت تک لے جا سکیں گی نا جب خود ٹھیک سے چلیں گی۔۔یہ درد کرتے پاؤں کے ساتھ جنت میں کیسے جائیں گے ہم" اس کی ایسی باتیں سن کر وہ ہنسنے لگا کرتی تھیں۔دونوں بھائی بہت چھوٹی عمروں سے آفس جانے لگے تھے اس لئے گھر میں وقت نہیں دے پاتے تھے لیکن وہ ہمہ وقت امی کے ساتھ رہنے والا بیٹا تھا۔امی بھی اس کے لاڈ دونوں دوسرے بیٹوں سے زیادہ اٹھاتی تھیں۔بہروز بھائی اور مہروز بھائی اسے چڑایا کرتے تھے کہ تم نے ہماری امی ہم سے ہتھیا لی ہیں۔اب صورتحال یہ تھی کہ وہی ماں اس لاڈلے بیٹے کی شکل دیکھنے کو ترستی تھیں۔۔اس کے لئے بھی یہ سب باتیں نصف صدی کا قصہ بن کر رہ گئی تھیں۔امی کے ساتھ اتوار بازاروں میں پھرنا،انہیں ان کی سہیلیوں کے یہاں لے جانا،ان

کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر مٹر کے دانے نکلواتے ہوئے ان سے ڈھیروں باتیں کرنا خواب کے جیسا لگتا تھا حالانکہ چند سال ہی تو گزرے تھے وہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں سوئی میں دھاگہ ڈال کر دیا کرتا تھا اور وہ اس کی شرٹ کا بٹن ٹانک دیا کرتی تھیں۔ چند سال کہنے کو چند سال تھے۔ ان سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ مصروف کم اور معروف زیادہ ہو گیا تھا۔ اب وہ اچھا لگتا تھا بھلا امی کی سہیلیوں کے گھروں میں جاتا، اتوار بازاروں میں گھومتا یا ان کے ساتھ سبزیاں بنواتا۔۔ وہ یہ سب کیسے کر سکتا تھا۔ امی کا چہرہ دیکھتے ہوئے جیسے اس نے ان کی آنکھوں میں وہ سارے دھندلے منظر بھی دیکھ ڈالے تھے۔ ان کا ہاتھ ابھی بھی اس کے کندھے پر تھا۔ یہ ہوتی ہے ماں جو اولاد کی توجہ کو ترستی ہے مگر اس کی آنکھوں میں چھپی بے چینی اور پریشانی کو ایک لمحے میں محسوس کر لیتی ہے۔ ایک دم سے پتا نہیں کیسے آنکھیں بھیگنے کے قریب ہو چلی تھیں۔ اس نے ذرا سا جھک کر ان کا ماتھا چوما تھا۔ پھر اپنا بازو ان کے کندھوں پر رکھ کر انہیں خود سے قریب کر لیا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے اس کے پہلو میں آ گئی اور اپنا بازو اس کی پشت پر پھیلا دیا۔ شہروز کو جیسے سکون سا آ گیا تھا۔ اپنے قد سے اونچے بیٹوں کی مائیں سمجھتی ہیں بیٹے ان کی طاقت ہیں، انہیں یہ نہیں پتا ہوتا کہ ان اونچے بیٹوں کی اصل طاقت ہوتی ہے ماں۔۔۔ دنیا کی کوئی اینٹی ڈپریسینٹ ماں کے لمس سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتی۔ تین چیزیں ہمیشہ انسان کے تناؤ کو کم کر دیتی ہیں۔۔۔ ماں کا لمس۔ اولاد کی مسکراہٹ اور اللہ کے حضور رات کی تنہائی میں پچھتاوے میں گھر کر بہایا گیا آنسو۔۔۔ شہروز نے پہلی اینٹی ڈپریسینٹ مل لے لی تھی۔ امی نے اس کی جانب دیکھا

"کیا بات ہے۔۔ کن سوچوں میں گم ہو۔۔ زارا سے جھگڑا ہو گیا؟" امی کے لئے اس کے خراب موڈ کی بس اتنی سی وجوہات ہو سکتی تھیں

"سوچ رہا ہوں۔۔ وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے نا امی" اس نے اسی طرح امی کو اپنے بازوؤں میں لئے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تھا

"وقت کبھی نہیں بدلتا میرے بچے۔۔ حالات بدل جاتے ہیں۔۔ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔۔ معیار بدل جاتے ہیں۔۔ دراصل انسان بدل جاتے ہیں۔۔ اور الزام وقت کے سر آ جاتا ہے" انہوں نے بھی اپنا ہاتھ اس کی پشت سے نہیں ہٹایا تھا۔ شہروز نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا

"امی آپ کو بھی لگتا ہے میں بدل گیا ہوں" اس کے سوال پر امی مسکرائی تھیں اور پھر اس کی جانب دیکھا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ شہروز کو احساس ہوا کچھ سوالات کبھی نہیں پوچھنے چاہئیں۔

"اچھا۔۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ یہ اچھا ہوا یا برا" اب وہ ایسا ضدی بچہ بن رہا تھا جو کسی شرارت پر سرزنش کے بعد دلائل مانگنے لگتا ہے

"میں تمہیں ایک کہانی سناؤں۔۔۔ اپنے بچپن کا ایک واقعہ۔۔؟" امی نے اس سے سوال کر لیا تھا۔ کسی کڑوی دوائی کو شوگر کوٹڈ کیسے کرنا ہے یہ فقط ممتا ہی جان سکتی ہے۔ امی اسے اسی طرح بیڈ کی سمت لے آئی تھیں

"یہاں بیٹھو" انہوں نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا تھا۔ وہ بھی بلا چوں چراں کئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ امی اسے بتانے لگی تھیں

"میں جب چھوٹی تھی نا۔۔یہی کوئی ساتویں آٹھویں میں ہونگی شاید۔۔تب ہم یہاں شاد باغ میں اپنے آبائی گھر میں رہا کرتے تھے۔۔۔ان دنوں لکی ایرانی سرکس کا بڑا شور ہوتا تھا۔۔ہمارے سب ملنے والے باری باری اپنے بچوں کے ساتھ سرکس دیکھ کر آچکے تھے۔۔وہاں کی باتیں سن سن کر ہم سب کزنز کا بڑا جی للچاتا تھا کہ ہم بھی جائیں۔۔بالخصوص اس شیر کا بڑا تذکرہ ہوتا تھا جو کرسی پر بیٹھ کر دکھاتا تھا اور اپنے مالک کے پیچھے پیچھے مودب بنا گھومتا رہتا تھا کسی کو ضرر پہنچاتا تھا نا مالک کے حکم کے بغیر دھاڑتا تھا۔۔۔ہم سب دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ شیر جیسا خوفناک جانور اتنا فرمانبردار کیسے ہو گیا۔" امی کے چہرے پر عہد رفتہ کی یہ یاد بڑی مسکراہٹ بن کر بکھری تھی

"خیر جی اللہ اللہ کر کے بڑے ابا یعنی تمہارے دادا سے اجازت لی گئی اور ہم تمہارے بڑے ماموں کی چھوٹی وین میں بھر کر سرکس پہنچے۔۔۔وہ بڑے مزے کا دن تھا۔۔سرکس کے شامیانوں میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔۔خوبصورت سنہرے لباس پہنے ہوئے سنہری رنگت والی رقص کرتی روسی لڑکیاں، گول سی سرخ ناک لیئے گدگداتا ہوئے جوکر۔۔اچھل اچھل کر بھاگتے اور پھر گرتے پڑتے بونے نما چھوٹے قد والے انسان۔۔۔ہم سب بچے بہت خوش تھے۔۔۔پھر وہ لمحہ آیا جب ہم سب نے بھی اس خوفناک شیر کو بھیگی بلی بنے اپنے مالک کے پیچھے آتے دیکھا۔۔یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا بہت گدگداتا ہوا لمحہ تھا۔۔۔ایک طرف سب خوفزدہ تھے اور دوسری جانب یہ یقین کہ یہ شیر کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔۔" امی اتنے دلچسپ انداز میں اپنے بچپن کا واقعہ اسے سنا رہی تھیں کہ اتنی پژمردہ طبیعت کے باوجود ان کی مسکراہٹ دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگا تھا

"شیر پورے رنگ میں گول گول گھومنے لگا اور ہم سب حیرت کے سمندر میں غرق اسے دیکھتے تھے۔۔ہم سب نے اس لمحے کا کافی انتظار کیا تھا لیکن جانتے ہو کیا ہوا۔۔۔تمہارے احسان چاچو (عمر کے ابو) ہم سب کزنز میں کافی ذہین تھے نے سب سے پہلے ناک چڑھائی اور بولے۔۔۔" مجھے یہاں بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔۔سب لوگ تالیاں سن کر چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔۔۔اس شیر کو دیکھو۔۔ایسا ہوتا ہے شیر۔۔۔شیر کو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔۔شیر کو بکری کی طرح نہیں ہونا چاہیئے۔۔یہ کیسا شیر ہے جو نا اپنی مرضی سے دھاڑ رہا ہے نا آنکھیں پھاڑ رہا ہے۔۔۔سر جھکائے اپنے مالک کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔۔۔مجھے نہیں اچھا لگ رہا ایسا شیر۔" ان کا کہنا تھا کہ ہم سب باقی لوگ بھی ایسا ہی سوچنے لگے کہ واقعی یہ کیسا شیر ہے۔۔جو خوف اور دہشت کی ایسی علامت ہے کہ انسان کے سامنے ہو تو انسان ڈر کے رہ جائے اور اب یہ کیسے بلی کی طرح سر جھکائے چپ چاپ بس اپنے مالک کے تعاقب میں چلا جا رہا ہے۔۔۔ہم سب کی دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی۔۔۔ہم سب کے بجھے ہوئے انداز دیکھ کر بڑے ابا نے وجہ پوچھی اور وجہ جان کر جانتے ہو وہ کیا بولے۔۔وہ کہنے لگے۔۔" یہ شیر نہیں ہے بلکہ یہ بکری بن چکا ہے۔" واپسی پر انہوں نے ہمیں ایک بہت ہی کام کی بات بتائی۔۔انہوں نے کہا" سرکس میں آ کر ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ شکر ہے اللہ نے ہمیں روزی کمانے کے حلال اور پسندیدہ طریقے سکھا رکھے ہیں۔۔ورنہ پیٹ کی طلب تو وہ چیز ہے جو جنگل کے بادشاہ کو بھی جوکر بنا سکتی ہے یہی دیکھ لو۔۔۔انسانوں نے شیر کو سکھا دیا ہے کہ وہ سر جھکا کر اپنی روش سے ہٹ کر چلے گا تو تالیاں بجیں گی۔۔تالیاں بجیں گی تو کھانے کو ملے گا۔۔بس وہ تالیاں کماتا ہے اور ان تالیوں کا کھانا کھاتا ہے۔۔۔اسے اس کی اس غرض نے شیر نہیں

رہنے دیا۔اسے بکری بنا دیا ہے۔۔۔" میں نے بڑے ابا کی بات سن کر پوچھا۔۔۔"لیکن بڑے ابا شیر خوش کیوں نہیں نظر آتا؟"۔۔۔تو بڑے ابا بولے۔۔۔"خوش کیسے نظر آئے۔۔اب وہ بھی خوش نہیں رہ سکتا۔۔۔کیونکہ اس کی ترجیحات ہی بدل گئی ہیں۔۔۔اب وہ اچھا ہونے سے زیادہ اچھا لگنے کی دھن میں مبتلا ہو چکا ہے"امی خاموش ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔شہروز کو کچھ سمجھ میں آیا تھا اور کچھ نہیں۔

"میرے بچے۔۔۔اتنی سی بات ہے بس۔۔۔یہی آجکل کے انسان کا المیہ ہے۔۔۔وہ اچھا ہونے سے زیادہ اچھا لگنے کے جنون میں مبتلا ہو چکا ہے۔۔۔اس کا من چاہے کس قدر میلا ہو لیکن اس کا تن،اس کی چمڑی سفید ہونی چاہیئے۔۔۔اس کی روح بے شک زبوں حالی کا شکار ہو لیکن اس کے بدن پر برانڈڈ چیزیں ہونی چاہئیں۔۔۔تاکہ دیکھنے والی آنکھ اسے چاہے اور سراہے۔۔۔آجکل کے انسان کو واہ واہ چاہیئے۔۔اور اس واہ واہ کو سمیٹنے کے چکر میں وہ اپنے مقام سے ہٹتا جا رہا ہے۔۔۔اسے خود پتا نہیں چل رہا کہ شیر بکری بنتا جا رہا ہے۔۔۔۔تالیوں کی آوازیں اسے اپنے پیاروں کی آوازوں سے زیادہ مرغوب ہوتی جا رہی ہیں۔۔ستائش کی لت اسے اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔۔۔سراہے جانے کی خواہش بری نہیں ہے۔۔۔یہ ہر انسان کے اندر فطری طور پر ہوتی ہے لیکن اگر یہ خواہش مداری کی طرح آپ کو ناچنے اور قلابازیاں لگانے پر مجبور کر رہی ہے تو پھر یہ خواہش نہیں بیماری ہے۔۔۔۔میں تو یہ بھی کہوں گی کہ رزق ہو یا علم۔۔عشق ہو یا ہنر۔۔۔اگر آپ کو اپنے مقام سے ہٹا کر اپنی گرفت میں جکڑنے لگے تو یہ سب بیماری ہی ہے۔۔۔اس سے دور رہنا ہی اچھا۔۔۔اس لئے میرے بچے اب تم خود سوچو کہ تمہارا بدل جانا اچھا ہوا یا برا۔" وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے کہہ رہی تھیں۔

شہروز نظریں نا اٹھا سکا تھا۔امی کے یہ چند الفاظ،الفاظ نہیں تھے بلکہ آئینہ تھے اور اس آئینے میں شہروز کو اپنا عکس رنگین دھاریوں والے لباس،جھالر والی لمبی ٹوپی اور ربڑ کی سرخ ناک کے ساتھ نمایاں نظر آ رہا تھا۔تالیاں کمانے کے چکر میں جنت گنوا رہا تھا وہ۔ستائش کی لت اسے بخیہ ادھیڑ چکی تھی۔



"عہد الست پاکستان کی کہانی ہے"

نور محمد نے اپنے سامنے موجود لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے سادہ مخصوص انداز میں بات شروع کی تھی۔ہال کچا کھچ بھرا ہوا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی تقریباً تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں۔میڈیا پرسنز کے علاوہ بھی تمام مکاتب فکر کے لوگوں کو سلمان حیدر نے ایک چھت کے نیچے جمع کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔میجر اطہر کی بدولت چند ریٹائرڈ آرمی آفیسرز سول سوسائٹی کے اراکین،ہیومن رائٹس تنظیموں کے کارکن اور اس کے علاوہ ملک کے مشہور مدبر و دانشور کی نمائندگی کرتے بہت سے لوگ بھی موجود تھے کچھ یونیورسٹیوں اور کالجز کے طلباء بھی آئے ہوئے تھے۔عمر کی سوشل میڈیا کی تحریک کے باعث بھی نوجوان طبقے کی بھرپور نمائندگی دیکھنے میں نظر آ رہی تھی۔زارا اکیلی ہی اس کانفرنس کو اٹینڈ کرنے کے لئے آئی تھی۔شہروز نے اس دن کے بعد سے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ لاہور میں ہی موجود ہے۔آنے سے پہلے اس نے اسے آخری کوشش کے طور پر کال کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن شہروز نے اس کی کال ریسیو نہیں

کی تھی۔زارا کا دل اس کے رویے سے بالکل ٹوٹ گیا تھا لیکن پھر بھی وہ یہاں آگئی تھی۔سلمان حیدر نے اور آسی رافعہ نے اس کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔اس کا یہاں موجود ہونا اس بات کا غماز تھا کہ وہ ان کی دل سے قدر کرتی تھی۔وہ شہروز کو اپنے ساتھ نہیں لا پائی تھی لیکن اس نے خود آ کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ حق اور باطل میں نا صرف فرق کر سکتی تھی بلکہ اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ حق کا ساتھ بھی دے سکتی تھی۔اسٹیج پر نور محمد (نیل گرانٹ) کے ساتھ پروفیسر آفاق علی اور ان کی اہلیہ بھی موجود تھے۔اس کے علاوہ بھی کچھ انجان چہرے دیکھنے میں نظر آ رہے تھے۔سب سے پہلے حاضرین کو کچھ پمفلٹ بانٹے گئے تھے جس میں نور محمد کے متعلق چیدہ چیدہ باتیں بیان کی گئی تھیں۔اس کے بعد پروجیکٹر اور ایل ای ڈی پر وہ ثبوت بھی دکھائے گئے تھے جو تیمور نصار کے ذریعے ان تک پہنچے تھے۔تیمور نصار کو بھی ہال میں موجود تھا۔اس ڈاکیومینٹری کا ذکر بھی کیا گیا تھا جو نور محمد کی زندگی پر بنائی جارہی تھی لیکن اس ساری سازش کا پردہ فاش ہونے پر اس کا ارادہ موخر کر دیا گیا تھا۔تیمور نصار نے خود اٹھ کر ڈاکیومینٹری سے بھی چند حصے پروجیکٹر پر دکھاتے ہوئے کچھ چیزوں کی وضاحت کی تھی۔مسٹر ٹیڈ نیل اور مسٹر ٹیرن کا ذکر بھی کیا گیا تھا لیکن ان کے نام کچھ وجوہات کی بناء پر ظاہر نہیں کیے گئے تھے اور انہیں فرضی ناموں کے ذریعے سب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔وہاں موجود اکثر لوگوں کو پہلے ہی خبر تھی کہ اس ساری تقریب کا مقصد اور موضوع کیا ہے۔اس لئے جب سوالات کا سیشن شروع ہوا تو لوگوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔سلمان حیدر، نور محمد (نیل گرانٹ) اور تیمور نصار کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔اسی لئے انہوں سو فیصد مستند طریقے سے جوابات دے کر تمام تر ابہام ختم کر دیا تھا۔سب سے آخر میں نور محمد کی تقریر تھی۔وہ خود سب سے مخاطب ہو کر کوئی پیغام دینا چاہتے تھے۔ان کی بات شروع ہونے سے پہلے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ "پاکستان" کی بات کرنے والے ہیں۔

"جی ہاں عہد الست پاکستان کی کہانی ہے۔۔اور عہد الست نور محمد کی کہانی بھی ہے۔۔لیکن میں اب نور محمد کا ذکر نہیں کروں گا۔۔میں ان کے بارے میں آپکو سب کچھ بتا چکا ہوں۔۔میں اب صرف اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ آخر اس ساری سازش کی وجہ کیا تھی۔مجھے کہنے دیجئے کہ کوئی بھی ریاست اس قدر کمزور نہیں ہوتی کہ کوئی بیرونی طاقت اسے جکڑ لے، ہڑپ لے اور کھا جائے۔۔۔کمزور دراصل اس ریاست میں بسنے والے لوگ ہوتے ہیں۔۔۔وہ کمزور پڑتے ہیں تو ریاست کمزور ہونے لگتی ہے۔۔۔پاکستانیوں کی کمزوری نے پاکستان کو کمزور کیا ہے۔۔۔اس کا ذمہ آپ کسی دوسرے کے سر نہیں ڈال سکتے۔۔بالکل ایسے جیسے نور محمد کو سب سے پہلے اس کے اپنوں نے کمزور کیا تھا۔۔۔انہوں نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کا بھروسہ نا کر کے، اس کی ناقدری کر کے اسے کمزور کیا تھا۔۔۔باہر والوں نے تو اسے بعد میں استعمال کیا۔۔۔یہی آپ سب اپنے وطن کے ساتھ کر رہے ہیں۔۔۔اسی لئے میں کہتا ہوں کہ عہد الست پاکستان کی کہانی ہے" وہ بہت موثر انداز میں اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے۔

تیسری رو میں بیٹھی زارا کو اس سارے عرصے میں یہ باتیں سب سے زیادہ دلچسپ لگی تھی۔اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ایک نو عمر طالب علم آگے خالی چیئر دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔زارا کے ساتھ والی کرسی خالی ہو گئی تھی۔اس نے دیکھا کوئی اور اس کرسی پر آ بیٹھا تھا۔اس نے بے دھیانی میں اس جانب دیکھا تھا اور پھر وہ ساکت رہ گئی تھی۔اس کے ساتھ شہروز آ کر بیٹھ گیا تھا۔اس نے حیرانی اور خوشی کے

ملے جلے تاثرات کے ساتھ کچھ کہنا چاہا لیکن شہروز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے اور نور محمد کی باتیں سننے کا اشارہ کیا تھا۔

"میں پاکستان کو نور محمد سے تشبیہ کیوں دیتا ہوں؟۔۔۔ میں سمجھتا ہوں نور محمد بھی وہ ہیرا تھا جس کی قدر نہیں کی گئی اور پاکستان بھی وہ ہیرا ہے جس کی قدر نہیں کی جا رہی۔ میں نے نور محمد کے بچپن کے سب حالات سنے ہیں۔ وہ ایک ایسا بچہ تھا جس کی ذہانت و قابلیت بے مثل تھی اگر اس کی صحیح آبیاری کی جاتی تو وہ ایسے مشکل حالات سے دوچار نہ ہوتا۔ دنیا سے الٹے سیدھے القابات دینے سے پہلے سو بار سوچتی لیکن صد افسوس ایسا نا ہو سکا اور یہی پاکستان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ ملک ایک جیتا جاگتا معجزہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے رحم کھا کر آپ لوگوں کو ایک بہترین خطہ عطا کیا تھا لیکن معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ اسے ویسے سنبھال نہیں پا رہے جیسے کہ اس کا حق تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس خطے میں بسنے والے لوگ اس کی اساس کو سمجھ ہی نہیں پائے۔" نور محمد رکے تھے اور پوڈیم پڑے گلاس میں سے چند سپ پانی پیا تھا

"عہد الست اس زمین کے لئے ایک اساس ہے اور آپ اس اساس سے ہی نظریں چرائے پھرتے ہیں۔۔۔

عہد الست کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔۔۔ اور۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔۔۔ آپ اس خطے سے عہد الست کی نفی کر ہی نہیں سکتے۔۔۔ بالکل ایسے جیسے آپ کسی انسان سے اس عہد کی نفی نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار اس مٹی کی سرشت میں ہے بالکل ایسے جیسے یہ میری یا آپ کی سرشت میں ہے۔۔۔ آپ کو دنیا کے نقشے پر کوئی دوسرا ایسا ملک نہیں ملے گا۔۔۔ وہ آئیڈیالوجی جس کے تحت یہ ملک حاصل کیا گیا تھا وہ آئیڈیالوجی ہی "عہد الست" ہے۔ میں جب بھی تاریخ میں پاکستان کے بارے میں پڑھتا ہوں تو یہی لکھا دیکھتا ہوں کہ دنیا کے چند مسلمان ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ ایک ایسا خطہ حاصل کر کے رہیں گے جہاں وہ اللہ کے بتائے رستے پر چل سکیں اور اپنی زندگیاں اسلام کے عین مطابق گزار سکیں۔۔۔ یہ صرف وہ کوششیں اور قربانیاں نہیں تھیں جو آپ کے آباء نے اس ملک کو حاصل کرنے میں صرف کیں بلکہ یہ وہ نیت بھی تھی جو ان قربانیوں اور کوششوں کے پیچھے کارفرما تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کتنی بھی کوشش کر لے اس خطے سے مذہب کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اس ملک کو سیکولر کر نہیں سکتے۔۔۔ آپ اس ملک کو سیکولر ہونے دے ہی نہیں سکتے۔۔۔ آپ میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے ہوں گے کہ عقیدہ وطنیت تو مذہب اسلام میں ہے ہی نہیں۔۔۔ معاف کیجئے گا میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔۔۔ ہو سکتا ہے اللہ انسان کو اس کے وطن کی بنیاد پر نا جانچیں لیکن وہ پاکستانی قوم سے یہ سوال تو ضرور کریں گے کہ بتاؤ وہ خطہ جس میں تم میرے نام لیوا ہو کر رہنا چاہتے تھے، جہاں میری ماننے والے ایک جگہ جمع ہو کر زندگی گزارنا چاہتے تھے، جہاں ان تمام اصول کا نفاذ تمہاری اولین ترجیح تھی جو میں نے زندگی گزارنے کے لئے ضروری قرار دیے ہیں تو بتاؤ اس خطے کا کیا حال کر آئے ہو۔۔۔ آپ اللہ سے اللہ کے نام پر ایک چیز مانگتے ہیں اور وہ آپ کو عطا بھی کرتا ہے تو کیا وہ آپ سے سوال نہیں کرے گا۔۔۔ پوچھ پڑتال تو ہوگی۔ اس لئے عقیدہ وطنیت پاکستان کے لئے بے حد اہم ہے، تھا اور رہے گا۔ آپ اسلام کو اس سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے"

نور محمد کا انداز بیان بالکل سادہ اور رواں تھا وہ لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھ رہے تھے۔ وہ فی البدیہہ اپنا مافی الضمیر بیان کر رہے تھے۔

"مذہب اس وطن کا حوالہ ہے اور یہ وطن آپ کا حوالہ ہے۔۔۔ آپ کسی ایک چیز کو بھی دوسری سے جدا نہیں کر سکتے۔۔۔ ضرورت

صرف اس امر کی ہے کہ آپ اپنے حق کو پہچانتے ہوئے اپنے فرائض کو ادا کرنے کی سعی کیجیے۔۔ ریاست وہاں بسنے والے ہر شہری کی وراثت ہوتی ہے۔۔ اور وراثت کی دیکھ ریکھ نا کی جائے تو اچکے اسے لوٹ کر لے جاتے ہیں۔۔ اپنی ریاست کی حفاظت کیجیے۔۔ یہ ریاست آپ کا حق ہے اور اس کی حفاظت آپ کا فرض ہے۔۔۔ آپ سب کا۔۔ اور اب میں جو بات کرنے لگا ہوں۔۔ وہ سب سے اہم ہے" ان کے اس جملے نے سب کو مزید متوجہ کیا تھا۔

" ریاست سات ستونوں پر چلتی ہے۔۔ اس کا سارا وزن۔۔ یہ سات ستون اٹھاتے ہیں۔۔ اس میں بلا تخصیص سب لوگ ہی آجاتے ہیں۔۔ سیاست دان، فوج۔ کھلاڑی، وکیل، صحافی۔ مدبر و دانشور، اداکار۔۔ ڈاکٹرز۔ انجینیرز۔ بزنس مین۔۔ ہنر مند۔۔۔ ریاست انہی افراد کے کندھوں پر چڑھ کر ترقی کرتی ہے۔۔ اب یہاں اپنی صورتحال دیکھیے۔۔ یہ تمام شعبے کرپشن کا شکار ہیں۔۔ ڈاکٹر ہو یا انجینیر۔۔ فوجی ہو یا پولیس مین۔۔ سب صرف اپنی غرض کے محتاج ہیں۔۔ جس کا جہاں اور جتنا بس چلتا ہے وہ اپنے مفاد کی خاطر اتنی کرپشن کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ملک سلامت ہے۔۔" وہ سانس لینے کو رکے تھے اور اب ان کے سامنے بیٹھا مجمع شرمسار نظر آتا تھا

" آپ لوگوں کو یہ امر بے شک حیران نا کرتا ہو لیکن مجھے ضرور کرتا ہے۔۔ کہ آخر ساتوں ستونوں کے اس قدر کمزور ہونے کے باوجود اللہ نے اس ریاست کو کس کے سہارے چھوڑ رکھا ہے۔۔ میرے دوستو!۔ آپ حیران مت ہو دراصل ریاست کا ایک آٹھواں ستون بھی ہوتا ہے اور وہ اس ریاست کی " ماں" ہوتی ہے۔ وہی دراصل کسی ریاست کی طاقت کا سب سے بڑا منبع ہوتی ہے۔۔ ساتوں ستون کمزور پڑ جائیں تب بھی کوئی ریاست کمزور نہیں پڑتی لیکن اگر یہ آٹھواں ستون کمزور پڑ جائے تو ریاست میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔۔ وہ کمزور ہونے لگتی ہے۔۔ اس خطے کو اللہ نے بہت طاقتور ماں سے نوازا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس خطے کی ماں کمزور ہوتی جاتی ہے۔۔ آج کی ماں اپنے بچے کو سکھاتی ہے کہ تم سب سے بہترین ہو۔۔ تمہارے مقابلے کا دنیا میں دوسرا کوئی نہیں۔۔ جاؤ اور جا کر سب کو پیچھے چھوڑ دو۔۔ ماں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سبق سے کتنے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں۔۔ یہ سب کو پیچھے چھوڑ دینے والا سبق کیوں سکھاتی ہے ماں۔۔ وہ یہ کیوں نہیں سکھاتی کہ سب کو ساتھ لے کر چلو۔۔ اسی میں بھلائی ہے۔۔ خیر ہے۔۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے نا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ نیک بنے تو آپ کو اپنے ہمسائے کے بچے کو بھی نیک بنانا پڑے گا کیونکہ آپ کے بچے نے گھر سے نکل کر ہمسائے کے بچے کے ساتھ ہی کھیلنا ہے۔۔ اب یہ فیصلہ آپ خود کریں کہ اللہ نے کتنے گھروں تک ہمسائے کی حد بندی کی ہے۔۔۔ چالیس گھر۔۔ یاد رکھیں چالیس گھر تک مسلمان کے ہمسائے ختم نہیں ہوتے۔۔۔ ایک ماں کی ذمہ داری ان چالیس گھروں کے بچوں کو سنوارنے کی ہے۔۔۔ معاشرے تب ہی متوازن ہوتے ہیں۔۔ ورنہ آپ اپنے بچے کو جتنا مرضی " بہترین" بنالیں۔۔ وہ نہیں بن سکتا۔۔۔ اس لئے اپنی اولاد کو گھڑ دوڑ کا گھوڑا نا بنائیں۔۔ اسے آگے بھاگنا مت سکھائیں۔۔ اسے سب کے ساتھ مل کر بھاگنا سکھائیں۔۔ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں۔۔۔ اپنی ریاست کی ماں کو ان کاموں میں خوار مت کریں جس کے متعلق اللہ نے اس سے سوال نہیں کرنا۔ اللہ کو اس کے گورے رنگ سے غرض ہے نا اس کے بیش قیمت مہنگے لباس سے۔۔ اللہ کو غرض ہے اس کی اولاد کی تربیت سے جسے پیمانہ بنا کر وہ جنت کا حصول

آسان کر دے گا۔ ماں مجسم عہد الست ہے۔۔ وہ مجسم دس ہے یعنی اگر وہ دین (اکائی) و دنیا (صفر) کے متوازن رستے پر ہے تو ہی اس کا بچہ "بہترین" ہے۔۔

یہی عہد الست ہے" وہ خاموش ہو گئے تھے۔ زارا نے شہروز کی طرف دیکھا۔ وہ بس ایک ٹک سامنے نور محمد کی طرف دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ خاموش ہو چکے تھے اور پوڈیم سے ہٹ رہے تھے۔ ہال میں اب بھنبھناہٹ سی شروع ہو گئی تھی۔

"تم میری وجہ سے یہاں آئے ہو" زارا نے اسے مخاطب کرنے کے لئے پوچھا تھا۔ وہ خود اتنی مسمرائز رہی تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا اسے کیسے مخاطب کرے

"نہیں" شہروز نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ زارا مصنوعی ناراضی سے اسے دیکھ کر بولی

"مجھے پہلے ہی پتا تھا" شہروز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا پھر زارا نے اسے سامنے کی جانب جاتے دیکھا، چند لمحوں بعد وہ نور محمد کے قریب کھڑا نظر آیا تھا۔ زارا نے دیکھا وہ ان سے ہاتھ ملا رہا تھا پھر اس نے سلمان حیدر سے ہاتھ ملایا تھا۔ تیمور نسار نامی شخص کو اس نے گلے سے لگایا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی روشنی زارا کو دور سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ عہد الست کی روشنی تھی۔ زارا نے سکون کا سانس لی تھا۔ شہروز کی جانب سے اتنا سکون اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا

☆ ☆ ☆

"اس بار جو لوگ رہا کیے جا رہے ہیں۔۔۔ ان میں یہ نام بھی شامل کر دیں" اس بار رعب او نچے لمبے جیلر، جس کا نام ولیم ڈیرک تھا لیکن وہ اپنے ماتحتوں میں جیلر ڈوڈی کے نام سے مشہور تھا نے اپنے سامنے بیٹھے ماتحت کو ایک چٹ پکڑائی تھی۔ اس ماتحت نے جسے سب اس کی غیر موجودگی میں جیلر ڈوڈی کی گرل فرینڈ کہتے تھے، ذرا سا آگے ہو کر وہ چٹ اپنے سامنے کرلی

"نمبر دو سو ایک۔۔۔؟ اس کو ریلیز کرنا ہے؟" وہ دوہرا رہا تھا۔ چہرہ استفہامیہ انداز میں آفیسر کی جانب نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جیلر نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے سامنے پڑی فائل کو دیکھنے میں مگن تھا۔ اس نے اطمینان سے وہ فائل دیکھی تھی پھر ان پر اپنے دستخط کر کے اسٹیمپ بھی لگا دی تھی۔ اس اثناء میں وہ ماتحت سامنے بیٹھا رہا تھا۔ جیلر ڈوڈی نے اس بار اس کا استفہامیہ انداز بغور دیکھا تھا پھر اس نے بھی آنکھوں میں سوال کی تھا کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے

"وہ لسٹ فائنل تو ہو گئی تھی۔۔ چالیس لوگ پہلے ہی منتخب ہو چکے ہیں۔۔۔ ان میں پہلے ہی انیس پاکستانی ہیں۔۔ اب ایک اور پاکستانی رہا کرنے کا مقصد۔۔؟ ماتحت نے سوال کیا تھا

"نمبر دو سو ایک پاکستانی ہے؟" جیلر ڈوڈی نے کچھ حیران ہو کر پوچھا

"ہاں۔۔ پاکستانی ہے۔۔" اس نے مؤدب انداز میں کہا تھا

"اچھا۔۔ لیکن یہاں تو اسے برٹش لکھا اور ظاہر کیا گیا ہے" جیلر ڈوڈی واقعی حیران تھا

"سر اسٹھنک پاکستانی ہے ۔۔۔ برطانوی شہریت لے لی تھی بعد میں ۔۔ المہاجرون کے ساتھ نام لیا جاتا رہا ہے اس کا" اس ماتحت کو زبانی کلامی اتنا ہی یاد تھا۔ جیلر ڈوڈی نے سر ہلایا

"المہاجرون کے ساتھ ۔۔؟ افغانیوں کے ساتھ بھی رابطے رہے ہوں گے؟" جیلر ڈوڈی نے پوچھا تھا۔ ماتحت نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر نفی میں سر ہلایا

"پاگل ہے سر۔ جو اس کام نہیں کرتے اس کے ۔۔ میرا نہیں خیال اس کا کسی سے بھی رابطہ ہوگا"

"اس کا مطلب مستند قسم کا معصوم ہے؟" جیلر ڈوڈی بھی اسی انداز میں ہنسا تھا

"سو فیصد معصوم تو نہیں ہو سکتا۔ اشتعال انگیز تقریریں تو کرتا رہا ہوگا ۔۔ اس کے ریکارڈ میں لکھا تھا کہ ہائی اسکول میں ٹاپ رینکرز میں سے تھا ۔۔ ذہین ہوگا ۔۔ لیکن اب بالکل بے ضرر ہو چکا ہے ۔۔۔" وہ ماتحت اپنے سینئر کی دلچسپی کو محسوس کر کے مزید مستعد انداز میں بولنے لگا تھا۔

"اچھی بات ہے ۔۔۔ اتنی سزا تو ملنی چاہیے تھی" جیلر ڈوڈی نے سر ہلایا

"ہمارے پاس کب سے ہے؟" جیلر ڈوڈی نے اگلا سوال کیا

"سر سیون سیون لندن دھماکوں کے بعد ہماری تحویل میں آیا تھا ۔۔ چھ ماہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے پاس تھا لیکن میں اس کی تصدیق کر کے آپ کو بتاؤں گا" ماتحت نے مؤدب ہو کر کہا جیلر ڈوڈی نے ہاتھ کے اشارے سے نہیں کا اشارہ کیا پھر چہرے پر ناپسندیدگی بھی چھلکی

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔۔ بس یہاں سے گیا تو ہمارا کام ختم ۔۔۔ آپ صرف اپنی کاروائی پوری کریں اور اس کا نام بھی فائنل لسٹ میں ڈال دیں اور بھجوا دیں ۔۔ مزید کام مت بڑھائیں ۔۔ یہ برنٹرز تو ہمارا کام ویسے بھی کبھی ختم نہیں ہوتے دیتے ۔۔ اب جب لسٹ فائنل ہو چکی تھی تو حکم آ گیا کہ اس قیدی کو بھی ریلیز دو" جیلر ڈوڈی نے برا سا منہ بنایا

"کوئی ہائی فائی ایشو اٹھ کھڑا ہوا ہوگا سر" ۔۔ ورنہ ان کی عادت تو نہیں ہے ایسی" ماتحت نے بھی سر ہلایا

"ہائی فائی ایشو نہیں ہے ۔۔ بس اپنے ہاتھ صاف رکھنا چاہتے ہیں ۔۔ اس قیدی کی زندگی پر کوئی ناول لکھی گئی ہے ۔۔۔ جس میں اس سازش کا ذکر ہے کہ اسے کیسے ریڈیکل قرار دے کر امیریکن تحویل میں دیا گیا جبکہ یہ معصوم اور بے ضرر انسان تھا ۔۔۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ناول بھی کسی مشہور برٹش نیشنل نے لکھا ہے جس کے آباؤ اجداد کو ان کی ملکی خدمات کے سلسلے میں نائٹ ہڈ بھی کیا گیا تھا ۔۔۔ عوامی سطح پر اس کی بات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے ۔ وہ شخص خود مسلمان ہو چکا ہے اور اس نے اس ناول میں ثابت کیا ہے کہ اسلام کے ماننے والوں کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں ۔ سوشل میڈیا پر بھی اس کا بہت ذکر ہو رہا ہے ۔ اس ناول کی مخالفت میں ایک ڈاکیومینٹری بھی تیار کی جا رہی تھی لیکن آخر میں اس کے تیار کرنے والے بھی اپنی بات سے منحرف ہو کر ناول لکھنے والے کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ۔۔ یہی وجہ ہے کہ

پبلک کافی تنقید کر رہی ہے۔۔ سو اس سے پہلے کہ پبلک میں مزید بے چینی پیدا ہو یہ خود کو کلین چٹ دلوانے کے لئے اس کی فوری رہائی چاہتے ہیں۔۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔۔ ہم نا تین میں نا تیرہ میں۔۔ تم بس جلد از جلد پیپر ورک ختم کر کے اسے ریلیز دے دو۔۔ یہ پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کی تحویل میں دیا جائیگا پھر وہاں سے جہاں مرضی جائے۔۔ ہمیں کیا۔۔ خیر تم چھوڑو ان سب باتوں کو۔۔ آؤ ذرا مجھے اچھا سا مساج دو" جیلر ڈوڈی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے اپنی تھکن کو ظاہر کیا تھا۔۔ وہ ماتحت مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا

☆ ☆ ☆

وہ عجیب رات کا پچھلے پہر کا منظر تھا

گھنٹہ بھر پہلے بارش برس برس کر کر اتنا ہلکان ہوئی تھی کہ اب تھک کر منہ چھپائے آسمان کی گود میں چھپ سی گئی تھی لیکن اس کی جل تھل ہر طرف محسوس کی جا سکتی تھی

رات کا سناٹا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ جھینگر کی آوازیں اور اسٹریٹ لائٹ کے گرد اڑنے والے پروانوں کی بھنبھناہٹ آپس میں گڈمڈ ہوئی جاتی تھیں جس کے باعث فضاء میں ارتعاش سا آیا ہوا تھا۔ چاند کی کوئی آخری تاریخ تھی تب ہی آسمان پہ چاند کا نام ونشان بھی نا نظر آتا تھا۔ بادل اپنا کام نپٹا کر اب چھٹ چکے تھے۔ آسمان پہ تاروں کی مکمل اجارہ داری زمین والوں کو دور سے محسوس ہو جاتی تھی۔ ماحول پر سکوت تھا نا سکون تھا اسی وجہ سے رات ہیبت زدہ دکھائی دیتی تھی۔ رات نے ہر ذی روح کو اپنے مسکن میں محصور ہو جانے پہ مجبور کر رکھا تھا۔ اسی لئے جب رات کے اس پچھلے پہر پروفیسر آفاق علی کے گھر کے باہر ایک گاڑی آ کر رکی تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نا ہوئی تھی حتیٰ کہ گھر والے خود بھی بے خبر بستر میں دبکے ہوئے تھے۔ گھر کی کال بیل بجائی گئی تھی اور تین بار کے بعد گھر کے سناٹے بھرے ماحول میں ہلچل پیدا ہوئی تھی پھر روشنیاں جلنے لگی تھیں

"کون ہے۔۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اس قسم کے سوال ایک دوسرے سے پوچھے جا رہے تھے۔ دروازہ کھولا جائے یا نا کھولا جائے کی بحث آنکھوں ہی آنکھوں میں جاری تھی۔ ابا آفاق علی گیٹ کے ذرا قریب تھے اور ساتھ ہی ان کا ملازم بھی موجود تھا جبکہ مسز آفاق علی اپنے مخصوص انداز میں شال اوڑھے برآمدے کے دروازے کے قریب مضطرب نظر آتی تھیں

"یہ آفاق علی کا گھر ہے؟" جب اندر یہ ہلچل مچی ہوئی تھی تو باہر سے اچانک سوال پوچھا گیا تھا سوال پوچھنے والے کی آواز بھاری اور بارعب تھی۔ پروفیسر صاحب کا اتنا تجربہ تو تھا کہ وہ آواز سے یہ اندازہ لگا سکتے کہ ان کے متعلق اس وقت سوال کرنے والا کیا مقصد لے کر آیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے انٹرکام اٹھا کر کان سے لگایا تھا

"جی میں آفاق علی ہوں۔۔ یہ میرا ہی گھر ہے" انہوں نے عجیب سی امید میں گھر کر بتایا تھا۔ کافی دن ہو گئے انہیں کچھ اچھی اطلاعات ملی تھیں لیکن بار بار استفسار پر بھی کچھ حتمی نہیں پتا چل سکا تھا۔ وہ انتظار کے طویل اور کڑوے سفر کے سب سے کٹھن مرحلے سے گزر رہے تھے۔ نور محمد یہاں آ چکا ہے۔ نور محمد وہاں ہے۔ نور محمد اس کی تحویل میں ہے۔۔ ہر جگہ سے ایک نیا جواب سننے کو

مل رہا تھا۔ یہ تکلیف اس لمحے کے جیسی تھی جب بچہ ماں کی گود میں آنے والا ہوتا ہے لیکن آیا نہیں ہوتا۔۔ پروفیسر آفاق علی مرد تھے لیکن وہ اس "دردِ زہ" کو اپنی اہلیہ کے ساتھ لمحہ لمحہ محسوس کر رہے تھے۔ انہیں تو ہر دستک ہی ایک نئی امید دلا دیتی تھی۔ اسی لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ رات کے اس پہر ہونے والی غیر متوقع دستک انہیں چونکاتی نہیں۔۔۔ ان کی چھٹی حس نے الارم سا بجا کر یکدم جیسے انہیں یقین دلایا تھا کہ کوئی اچھی خبر ملنے ہی والی ہے۔ ان کا دل چاہا وہ فوراً سے بیشتر گیٹ کھول دیں لیکن احتیاط بھی لازم تھی۔ حالات اب کسی پر یقین نا کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ چوری چکاری کی وارداتیں اب نئے نئے طریقوں سے کی جانے لگی تھیں۔ اس لئے وہ چھٹی حس کی اس غیر متوقع الارم کو من و عن مان لینے میں بھی متامل تھے۔

"نور محمد آپ کا ہی بیٹا ہے؟" دوسرا سوال پوچھا گیا۔ پروفیسر صاحب ہی نہیں اچھلے تھے۔ گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑی ان کی اہلیہ بھی جھٹکا کھا کر گیٹ کے قریب آ گئی تھیں

"جی جی۔۔ میرا ہی بیٹا ہے۔۔ میرا بیٹا ہے" انہوں نے وفورِ جذبات میں گھر کر جملہ دوبارہ دہرایا تھا

"آپ کا بیٹا ہمارے ساتھ ہے۔۔ دروازہ کھولیں" خوشخبری سنا دی گئی تھی۔

"آہ۔۔۔ کسی نے بدن میں عرصے سے چبھا کانٹا کھینچ کر نکال دیا تھا

روح میں اٹھتی تمام ٹیسیں یکدم تھم گئی تھیں

تکلیف ہچکی لے کر اپنے اختتام کو پہنچی تھی

دردِ زہ کی اذیت جیسے ختم ہو گئی تھی۔

ان کا بیٹا انہیں مل گیا تھا۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کھول دیا تھا۔

"یہ نور محمد ہے" ایک لاغر، جھکا ہوا، بے رنگ و رونق چہرے والا وجود دروازہ کھولتے ہی ان کے سامنے آ گیا تھا۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا پھر اپنی اہلیہ کی جانب دیکھا

"یہ کہیں سے میرا بیٹا نہیں لگتا" انہوں نے سوچا تھا۔ ان کی اہلیہ ان کو ذرا سا پیچھے دھکیل کر آگے آئی تھیں۔ بے یقینی ان کی نگاہوں میں بھی تھی۔ وہ ان کا بیٹا تھا یا ایک تھکی ماندہ بھیڑ۔۔۔ انہوں نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھاما تھا

"امی۔۔۔ میں نور محمد۔۔۔ میں فیل ہو گیا تھا نا" ان کا ہاتھ جیسے لرز رہا تھا، اس بھیڑ کی آواز اس سے زیادہ لرزتی ہوئی تھی۔

"کیا وہ ان ہی کا بیٹا تھا؟" یہ ہمارا بیٹا ہے ان کی اہلیہ نے بے یقینی سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اونچا کیا۔ ان کے ہاتھوں نے اس کے لمس کو محسوس کیا تھا۔ بجلی آسمان پر ہی نہیں چمکتی تھی۔ یہ کبھی کبھی وجود پر بھی چمکتی ہے اور لمحہ بھر کے لئے ہی سہی لیکن کچھ ایسی چیزیں واضح ہو جایا کرتی ہیں جنہیں عام حالات میں عقل و شعور تسلیم کرنے سے انکاری ہوتے ہیں

"میرا بیٹا۔۔میرا بچہ۔۔۔میرا نور محمد" ان کے گلے سے آواز نہیں نکلی تھی یہ ایک چیخ تھی، کراہ تھی اور ایسی چیخ ،ایسی کراہ ان کے حلق سے تب بھی نہیں نکلی تھی جب انہوں نے اس بچے کو جنم دیا تھا۔انہوں نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔پروفیسر صاحب کو مزید کسی گواہی کی ضرورت نہیں تھی۔عورت کی گواہی چاہے آدھی ہو لیکن ایک ماں کی گواہی کبھی آدھی نہیں ہوتی۔وہ ان کا نور محمد ہی تھا

☆ ☆ ☆

"میں ٹھیک نہیں رہتا۔میری طبیعت ناساز ہے" اس چھوٹے سے بچے جس کے وجود پر اس سے بڑے سائز کا سرخ چغہ تھا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کے پاؤں بھی نظر نہیں آرہے تھے نے اپنی آواز میں مصنوعی نقاہت پیدا کر کے اپنے سامنے بیٹھے دوسرے چھوٹے بچے سے کہا تھا۔اس بچے نے اپنے چہرے پر کالے فریم والی بڑی سی عینک لگا رکھی تھی۔اس نے بھی اپنے وجود سے بڑے سائز کا اوورکوٹ ٹانگ رکھا تھا۔اس کی گردن کے گرد اسٹیتھو اسکوپ نہیں بلکہ ایک ہیڈ فون لٹک رہا تھا جس کے ساتھ جوئی تار اسی کے اوورکوٹ کے اندر جا رہی تھی۔وہ دونوں ایک چھوٹے سے اسٹیج پر کھڑے تھے۔ان کے سروں پر شامیانہ لٹک رہا تھا جبکہ ان کے سامنے انہی کے ساتھ پڑھنے والے دوسرے بچے،ان کو پڑھانے والے اساتذہ،مختلف سرگرمیوں میں ان کی مدد کرنے والے ہنرمند لوگ،کبھی کبھی ان سے ملنے کے لئے آنے والے بڑی عمر کے چند مخصوص افراد،ان کی پرنسپل جنہیں وہ سب باجی آمنہ کہتے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی جو ہر اتوار انہیں ملنے کے لئے ضرور آتے تھے۔ان کے علاوہ چند دوسرے نئے مہمان بھی موجود تھے۔وہ مل ملا کر پچاس پچپن لوگوں کا مجمع تھا جن کی نگاہیں ان دونوں بچوں پر مرکوز تھیں جس کی بناء پر وہ تھوڑا سا کنفیوژ بھی تھے لیکن ان کی ٹیچر باجی نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھبراہٹ ہو تو ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنا۔خبردار سامنے مت دیکھنا۔اسی لئے وہ کافی اچھا پرفارم کر رہے تھے

"آپ کی یہ کیفیت کب سے ہے؟" ڈاکٹر بنے ہوئے بچے نے مریض بچے کی نبض چیک کرنے کے لئے اس کی ہتھیلی پکڑتے ہوئے سوال کیا تھا۔اس کے چہرے پر تاسف تھا جیسے ایک نظر میں سمجھ گیا ہو کہ مریض کی حالت واقعی کافی خراب ہے۔وہ وقتاً فوقتاً اس کے وجود پر لٹکے لال چغے کو چٹکیاں کاٹ کر جانے کیا چیک کرنے کی کوشش کرتا تھا

"ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔۔۔بہت عجیب کیفیت میں ہوں" اس بچے نے آواز پر مزید نقاہت طاری کی تھی

"کیا محسوس کرتے ہیں؟" ڈاکٹر بچے نے دوسرا سوال کیا تھا

"دل چاہتا ہے بس ہر وقت یہی کہتا رہوں۔۔پاکستان میں کچھ نہیں رکھا۔۔پاکستان میں کچھ نہیں رکھا۔۔۔پاکستان میں کچھ نہیں رکھا" وہ بچہ سخت تکلیف کے عالم میں بولتے ہوئے گردن بھی ہلا رہا تھا۔اس کی ایکٹنگ اتنی اچھی تھی کہ سامنے بیٹھے اکثر لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی

"اوہو۔آپ تو واقعی بیمار ہیں۔۔" ڈاکٹر بچے نے تاسف سے سر ہلایا۔مریض بچہ اب کی بار کچھ نہیں بولا تھا

"آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسی کیفیت ہوئی کیسے۔۔۔آپ کی روٹین میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔؟" ڈاکٹر بچے کے چہرے پر سوچوں کا

حال بکھرا تھا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ میں پکڑے پین کا کونا منہ میں دبا لیتا تھا
"میں آجکل نیوز چینلز بہت دیکھ رہا ہوں۔۔۔ ایسے پروگرامز بھی بہت دیکھتا ہوں جن میں پاکستان کے مسائل اور خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اتنی زیادہ کی جاتی ہے کہ سن سن کر میرے اعصاب تھک جاتے ہیں۔۔ میں رات کو سوتے ہوئے بھی انہی مسائل کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔۔ اس وجہ سے میں ایسا بیمار سا ہو گیا ہوں۔۔ اس بچے نے اپنی بانہیں پھیلا کر اپنے وجود کی لاچاری اور سرخ رنگ کو ظاہر کیا تھا۔ ان کے انداز اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ سب کو ہی ان میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔
"اوہو۔۔ یہی تو غلطی کرتے ہیں لوگ۔۔۔ مسائل اور خامیوں کو سر پر سوار کرنے سے آپ بیمار ہو گئے ہیں۔۔ اس سے بہتر تھا کہ آپ ان مسائل اور خامیوں کا حل تلاش کرنے میں محنت کرتے تو آپ بھی بیمار نہ ہوتے۔۔۔ میں آپ کا ایک ضروری ٹیسٹ کرنا چاہتا ہوں" ڈاکٹر نے اپنی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر کوئی بٹن آن کیا تھا اور اپنی گردن میں لٹکا ہیڈ فون مریض بچے کے کانوں سے لگا دیا تھا۔ وہ مریض بنا بچہ چند لمحے ساکت بیٹھا رہا پھر اس کے وجود میں ہلکی سی لرزش ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر بچے نے جیب میں ہاتھ وال کر فوراً بٹن بند کر دیا تھا۔
"مجھے پہلے ہی شک تھا۔۔ آپ میں پیچوگوبن کم ہو گیا ہے" ڈاکٹر بچے کے چہرے پر پریشانی چھلکی تھی۔ مریض بچہ بھی پریشان سا ہو گیا تھا
"اللہ اکبر۔۔ یہ پیچوگوبن کیا ہے۔۔ اور اب میرا کیا ہو گا۔ کیا میں کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹ اور اشتیاق ایک ساتھ بڑھ رہا تھا
"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ۔۔۔ ابھی علاج کیے دیتے ہیں آپ کا" اس ڈاکٹر بچے نے کہا تھا
"یہاں میرے ساتھ کھڑے ہو جائیے" اس ڈاکٹر بچے نے کہا۔ مریض بچے نے اس کے کہے پر عمل کیا تھا۔ وہ دونوں حاضرین کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے
"اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیجیے۔۔ جس مقام پر آپ کا دل دھڑکتا ہے عین اس مقام پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ لیجیے" ان دونوں نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا
"اب میرے ساتھ دوہرائیے۔۔۔ لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔۔۔ لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔۔۔ لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ" وہ کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ دوسرا بچہ بھی اس کا ساتھ دینے لگا تھا۔ ان دونوں نے تین بار کلمہ دوہرایا تھا۔
"اب اسی انداز میں تین بار دوہرائیے۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔ لا الہٰ الا اللہ۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔ لا الہٰ الا اللہ۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔ لا الہٰ الا اللہ۔۔۔"
وہ دونوں تو پڑھ ہی رہے تھے۔ سامنے بیٹھے لوگوں میں سے بھی کچھ لوگ انہی کے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھے اسی طرح دوہرا رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں وہیل چیئر پر بیٹھا ایک لاغر سا وجود تھا جو بے حد کمزور تھا اور اس کی آواز میں عجب سی لرزش تھی لیکن وہ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے ان بچوں کے ساتھ سب دوہرا رہا تھا۔ اس کے ماں باپ بھی اس کے ساتھ بیٹھے تھے اور اپنے بیٹے

کے انداز میں ہی یہ سب کر رہے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ سلمان حیدر بیٹھا تھا اور سلمان کے ساتھ اس کی امی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا اور وہ بھی اسی طرح ان بچوں کے ساتھ دوہرا رہے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی تقریباً سب ہی لوگ ایسے کرنے لگے تھے۔ بڑوں کو ایسا کرتا دیکھ کر بچے بھی ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ وہ چھوٹا سا میدان ہی تھا لیکن اس وقت وہ ایک ہی نعرے سے گونج رہا تھا

"پاکستان کا مطلب کیا۔۔ لا الہٰ الا اللہ۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا۔۔ لا الہٰ الا اللہ۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا۔۔ لا الہٰ الا اللہ۔۔۔"

وہاں موجود کوئی چہرہ ایسا نا تھا جس پر مسکراہٹ نا تھی اور کوئی دل ایسا نا تھا جس میں نیا ولولہ نا تھا

"اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟" ڈاکٹر بچے نے سوال کیا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی سینے پر دھرا تھا۔

"میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ میری ساری مایوسی چھٹ گئی ہے" مریض بچہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولا تھا۔

"اللہ تیرا شکر۔۔۔ آئیے اب آپ کا دوبارہ ٹیسٹ کر لیتا ہوں" اس بچے نے وہیں کھڑے کھڑے کہا تھا پھر اس نے اپنے ہیڈ فون کو اس بچے کے کان سے لگایا تھا۔ اسی دوران نصب کیے ہوئے اسپیکرز سے آواز گونجنے لگی تھی۔ جس کو سن کر دوسرے بچے کے وجود میں دوبارہ لرزش پیدا ہوئی تھی پھر وہ لرزش بڑھنے لگی تھی۔ اسپیکر سے آنے والی آوازیں بلند ہو رہی تھیں

"ایسی زمین اور آسماں

ان کے سوا جانا کہاں

بڑھتی رہے یہ روشنی

چلتا رہے یہ کارواں

دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان

دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان" اس بچے نے جس کے کانوں پر ہیڈ فون نصب تھا نے اپنا سرخ چغہ آہستہ آہستہ کر کے اتار دیا تھا اور اب اس کے بدن پر سبز شرٹ نمایاں تھی۔

"آپ کا ہیموگلوبن تو بالکل نارمل ہو گیا ہے۔۔" ڈاکٹر نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ پڑھنے لگے تھے

"دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان حاضرین نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ سب تالیاں بجاتے ہوئے تمتماتے چہروں کے ساتھ ان کا ساتھ دے رہے تھے۔۔۔ کچھ دیر یہی شور وغل ہوتا رہا۔ ان بچوں کو سب ہی نے سراہا تھا۔ اس کے بعد سب کے لئے چائے کا انتظام تھا۔ بچوں کو ان کی ٹیچرز نے جو کہ مقامی لڑکیاں ہی تھیں نے ایک طرف ریفریشمنٹ کا سامان دے کر بٹھا دیا تھا جبکہ باقی مہمانوں کے لئے الگ سے انتظام تھا۔ سلمان حیدر اس اسکول کی انتظامیہ میں شامل تھا اور آج آنے والے زیادہ تر مہمان اس کی وساطت سے ہی آئے تھے۔ ان میں پروفیسر آفاق علی تھے جو اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کا بیٹا وہیل چیئر پر تھا اور سب ہی لوگ اس کے متعلق جانتے تھے۔ ڈاکٹر زارا اور سلمان کی امی بھی پہلی بار یہاں آئی تھیں

"آئیں آپ لوگوں کو اپنی ٹیم سے ملواتا ہوں۔" سلمان نے امی اور زارا سے کہا تھا۔ ان دونوں نے سر ہلایا تھا۔ زارا تو زارا فقہ بیگم بھی وہاں موجود لوگوں میں سے چند ایک کے سوا کسی کو نہیں جانتی تھیں۔ اس لئے انہیں سب سے ملنے کا اشتیاق بھی زیادہ تھا۔ باقی لوگ چائے پینے اور ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

"یہ سعدیہ ہیں۔۔ سعدیہ بتول اعوان۔۔ یہ میڈیکل اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔۔ یہ اپنے والد کے ساتھ رضا کارانہ طور پر ہماری مدد کو آتی ہیں۔۔ یہ بچوں کے ساتھ مل کر ہیوگو بن والا سارا ڈرامہ ان ہی نے تیار کروایا تھا۔ ان کے بتول ہر پاکستانی کے خون میں ایک ایجنٹ شامل ہے جسے ہیوگو بن کہتے ہیں۔۔۔ ان کی اس بات پر ان کے کلاس فیلوز کو اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہ پرواہ نہیں کرتیں" سلمان ایک لڑکی کی جانب اشارہ کر کے اس کا تعارف کروا رہا تھا جبکہ وہ مسکراتے ہوئے اس کی باتوں کو سن رہی تھی۔

"یہ کشف رسول ہیں۔۔ ان کا تعلق ساہیوال سے ہے۔۔ یہ بھی باقاعدہ اسکول نہیں گئیں لیکن یہ پڑھے لکھے لوگوں سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔۔ یہ شاعری کرتی ہیں اور یہاں بچوں کو اچھی اچھی نظمیں لکھ کر یاد بھی کرواتی ہیں" سلمان نے دوسری لڑکی کا تعارف کروایا تھا پھر وہ تیسری والی کی طرف بڑھا تھا

"یہ انعمتہ ہیں" اس نے ایک پیاری سی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ان کی ساری فیملی بیرون ملک ہوتی ہے لیکن یہ اکیلی یہاں رہتی ہیں۔۔ اسٹوڈنٹ ہیں۔ لیکن یہ بھی ہماری والنٹئر ہیں۔۔ اور میرا خیال ہے ان کا ہیوگو بن چیک کیا گیا تو سب سے زیادہ ہائی ریڈنگ آئے گی" سلمان اپنے انداز میں متعارف بھی کروا رہا تھا اور سراہ بھی رہا تھا۔ اس کی امی اس لڑکی کی نام پر ذرا اٹک سی گئی تھیں

"یہ آمنہ ہے؟" انہوں نے انعمتہ سے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ شاید یہ "آمنہ" ہے۔ ان کے سوال پر سلمان گڑبڑا سا گیا تھا جب کہ زارا نے دیکھا عقب سے ایک لڑکی نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔

"کیا ہوا۔۔ مجھے بلایا کسی نے؟" وہ نور محمد کی وہیل چیئر کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنا نام سن کر وہ ان کے قریب آ گئی۔ سلمان نے امی کا چہرہ دیکھا جہاں تجسس تھا جبکہ زارا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی وہ خجل سا نظر آیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتانے کو کافی تھے کہ اس کی امی کا تجسس ختم ہونے والا تھا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"امی یہ آمنہ ہے" سلمان نے ایسے بتایا جیسے بتانے کا دل تو نہیں تھا لیکن پھر بھی بتا دیا۔ امی فوراً آگے آئی تھیں اور اسے کندھے کے ساتھ لگایا تھا۔ زارا ان کا والہانہ انداز دیکھ کر مسکرائی اور سلمان کی جانب دیکھا۔ وہ بھی خجل سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ انعمتہ اور سعدیہ بھی کچھ کچھ واقف لگتی تھیں کیونکہ وہ بھی ذومعنی انداز میں مسکرا رہی تھیں امی ہر چیز سے لاپرواہ بس آمنہ سے باتوں میں مگن ہو گئی تھیں

"آؤ تمہیں بچوں سے ملواتا ہوں ڈاکٹر" اس نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا تھا ورنہ سب مل کر اس کا خوب ریکارڈ لگاتیں

☆ ☆ ☆

"آمنہ سے مل کر اچھا لگا" زارا نے اپنے ڈسپوزیبل چائے کے کپ کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ سلمان نے سر ہلایا۔ وہ اب مسکرا نہیں رہا تھا لیکن اس کے ہر انداز سے طمانیت جھلکتی تھی۔ اس کی ایک وجہ آج کے پروگرام کی کامیابی تھی اور دوسری وجہ امی کی آمنہ کے لئے پسندیدگی تھی۔ وہ دونوں باہر گراؤنڈ میں آ کر بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ اسکول کے بچے ادھر ادھر کھیلتے پھر رہے تھے۔ سلمان کی نگاہیں انہی پر مرکوز تھیں

"مجھے بھی" وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا

"آپ کی تو پسند ہے نا۔ آپ کو تو اچھا ہی لگے گا" زارا نے چڑانے کے لئے کہا تھا۔ سلمان نے نفی میں گردن ہلائی

"نہیں ڈاکٹر یہ بات نہیں ہے۔۔ آمنہ واقعی ایک اچھی لڑکی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ زارا نے ذومعنی انداز میں اسے دیکھا جس پر وہ ہاتھ اٹھا کر صفائی دیتے ہوئے بولا

"ارے۔۔ ایسے مت دیکھو بی بی۔۔ یہ کوئی بار مصالحے کی چاٹ والی فلم نہیں ہے کہ تم آنکھیں گھما گھما کر مجھے دیکھو۔۔ یہ محبت کی نہیں عقیدت کی کہانی ہے۔۔ میں اس لڑکی کو سات سال سے جانتا ہوں۔۔ غریب اور نادار لوگوں کے لئے کسی آرگنائزیشن، فارن فنڈنگ اور حکومتی امداد کے بغیر تن تنہا کام کرتی ہے اور ایسے کرتی ہے کہ رشک آتا ہے۔۔ ان لوگوں نے یہ اسکول تقریباً سات سال پہلے کھولا تھا۔۔ تب اس کے دادا ابھی حیات تھے اور میں ان ہی کی وجہ سے آمنہ سے متعارف ہوا تھا۔۔ میں ان دنوں ایک آرٹیکل لکھ رہا تھا جس میں پاکستانی گمنام ہیروز کا ذکر تھا کسی نے مجھے اس اسکول اور ان کے چلانے والوں کے بارے میں بتایا۔۔ میں اس سارے سیٹ اپ سے بہت متاثر ہوا تھا۔۔ یہ اسکول ایک زبردست جگہ ہے۔۔ ان لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ ایک ایسا اسکول ہے جہاں ٹیچرز بھی پڑھانے نہیں بلکہ پڑھنے آتے ہیں۔۔ سب بچے دن میں کام کرتے ہیں اور شام کو دو گھنٹے یہاں آتے ہیں۔۔ انہی سے متاثر ہو کر میں نے راسے ونڈ میں ایسا اسکول شروع کیا ہے۔۔ محنت کرنے والے نادار بچوں کو بھی اپنی عزتِ نفس قائم رکھتے ہوئے لکھنے پڑھنے کا پورا حق ہے۔۔ یہ بات میں نے اپنی امی کے بعد آمنہ کے منہ سے سنی تھی۔۔ امی کے نزدیک بھی عزتِ نفس کی بہت اہمیت ہے۔۔ میں شاید آمنہ کو بھی اسی لئے پسند کرتا ہوں کہ یہ بالکل میری امی جیسی ہے" وہ وضاحت دے رہا تھا۔ زارا مسکرائی۔

"آپ نے آمنہ کو بتایا کہ آپ انہیں پسند کرتے ہیں" وہ سوال کر چکی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے سوال کو مذاق میں نا اڑا دے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سلمان سنجیدہ ہی تھا

"میرا خیال ہے وہ جانتی ہے۔۔ مجھے منہ سے کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی" سلمان کا انداز سرسری سا تھا

"شادی کب کریں گے آپ؟" زارا نے اپنا خالی کپ زمین پر رکھ دیا تھا

"یہ معاملات میرے نہیں ہیں۔۔ امی کو ملوا دیا ہے اس سے۔۔ اب امی جانیں اور امی کے کام۔۔ ویسے میں نے آج تک امی کو کبھی کسی کام میں ہار مانتے نہیں دیکھا۔۔ مجھے لگتا ہے اس سال میں بھی دولہا بن ہی جاؤں گا" وہ پہلی بار اپنے متعلق کوئی بات اتنے تفصیلی انداز میں کر رہا تھا۔ زارا کو اچھا لگا

"شہروز کیسا ہے؟" سلمان نے اس سے پوچھا تھا۔

"اچھا ہے۔" زارا نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ وہ آجکل کراچی میں تھا۔ اس نے عوف بن سلمان کی این جی او سے لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ ان کے ڈاکیومینٹری والے پراجیکٹ کے ملتوی ہوجانے کے بعد ویسے بھی اس کا ان کے ساتھ منسلک رہنا بے معنی تھا لیکن زارا جانتی تھی شہروز نے اپنی پوری رضامندی کے ساتھ عوف بن سلمان کو استعفیٰ دیا تھا۔ وہ اخبار اور چینل کے ساتھ ابھی بھی منسلک تھا لیکن اب اس نے وہ روش ترک کردی تھی جو اس کے وطن یا ہم وطنوں کے خلاف ہوتی۔

"ہاں۔۔ اچھا تو بہت ہے اور بہت ذہین بھی ہے۔۔ میں اس کا پروگرام دیکھتا ہوں۔۔ اچھے منفرد ٹاپکس پر مثبت باتیں کرتا ہے" سلمان اسے تسلی دے رہا تھا۔ زارا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ شہروز اتنا اچھا ہوچکا تھا کہ اب اس کے دل میں اس کے لئے نا کوئی بدگمانی تھی اور نا ہی کوئی غلط فہمی۔۔ عمر اور امائمہ چند مہینوں میں آنے والے تھے ان کی آمد پر شہروز کی اور اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ وہ خوش تھی اور سلمان اس کی خوشی اس کے چہرے پر بکھری دیکھ کر مطمئن تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ چھ مہینے بعد کی بات تھی

وہی گھر جہاں سناٹے گونجا کرتے تھے اور جہاں گھر کے مکین ایک دوسرے سے بھی نظریں ملاتے احتیاط برتتے تھے وہاں عجب رونق سی لگی تھی۔ گھر کی اکلوتی بیٹی اپنی گود میں ایک بیٹی لئے اپنے شوہر کے ہمراہ اپنے ماں باپ اور بھائی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔

وہ سردیوں کے دن تھے اور سردیاں بھی کہتی تھیں اس بار شاید کوئی انتقام لینا ہے۔ دن بھر دھند سورج کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھتی اور رات کو یخ بستہ ہوائیں سردی کی شدت کو مزید بڑھا دیتی تھیں۔ اس لئے جب بہت دن کے بعد سورج کھرے اور دھند کو شکست دینے کے بعد آسمان پر پوری آب و تاب سے چمکا تو سب لوگ ہی اس کا نظارا کرنے کے لئے اپنے گھروں کے صحن اور لان میں آگئے۔ امائمہ بھی اپنی بیٹی کو لئے برآمدے کے تخت پر آبیٹھی تھی۔ امی نے دعا کے اوپر کے موٹے کپڑے اتروا کر اس کا مساج کرنا شروع کردیا تھا۔ عمر شہروز لوگوں کی طرف تھا۔ شہروز اور زارا کی شادی اس ہفتے قرار پائی تھی سو وہ وہاں اپنا زیادہ وقت گزارتا تھا۔ امائمہ مالٹوں کی باسکٹ اٹھا کر لے آئی تھی۔ ابو اور نور محمد بھی لان میں ہی بیٹھے تھے۔ نور محمد بہت کم گو تھا لیکن وہ سب کو دیکھ کر مسکراتا ضرور رہتا تھا۔ چھ مہینے میں اس کی صحت میں کافی اچھی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ امائمہ نے مالٹے چھیل کر ان پر نمک چھڑکا تھا اور پھر وہیل چیئر پر بیٹھے نور محمد کی گود میں رکھ دیا تھا کہ وہ ایک ایک کر کے کھاتا رہے۔ ابو ایک چوکی پر بیٹھے اس کے پاؤں کا مساج کر رہے تھے۔ وہ ڈاکٹرز کے ہر مشورے پر چوں چراں عمل کرتے تھے۔ نور محمد کے کھانے کا خیال رکھنا اسے ہلکی پھلکی ایکسر سائز کروانا اس کا مساج کرنا ہر چیز کا ذمہ انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ امائمہ اپنے ماں باپ کو اس طرح مصروف دیکھ کر کافی مطمئن تھی۔

"اب تو بھائی کافی سنبھل گیا ہے امی" اس نے ایک قاش اپنے منہ میں بھی رکھی تھی۔ امی نے دعا کے ننھے سے ہاتھوں کو اپنے

ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور بہت نرمی سے اس کی انگلیاں رگڑ رہی تھیں۔امامہ کی بات سن کر انہوں نے رخ موڑ کر وہیل چیئر پر بیٹھے نور محمد کی جانب دیکھا پھر مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی تھی

"اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے امامہ۔۔۔اب بہت سنبھل گیا ہے۔۔ورنہ جب یہ آیا تھا تو نا خود چل پاتا تھا نا ٹھیک سے بول سکتا تھا۔دماغی حالت ایسی تھی کہ کسی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔کھانا دے دیتے تھے تو کھا لیتا تھا پانی دے دیتے تھے تو پی لیتا تھا۔۔۔بڑا کڑا وقت تھا امامہ۔۔۔جتنا اس کے بغیر گزرا وہ سارا وقت ایک طرف اور وہ اس کی واپسی کے بعد کے پہلے چند دن ایک طرف" امی دعا کی ہتھیلی رگڑتے ہوئے بتا رہی تھیں

"آپ تو سوچتی ہوں گی کہ ایسی حالت میں بیٹے کو دیکھنے سے بہتر تھا یہ ملتا ہی نہیں" امامہ نے اپنی دھن میں مگن کہا تھا

"نہیں امامہ" امی نے قطعیت سے کہا

"میں نے اس کو جب دروازے پر اتنے سالوں بعد کھڑا دیکھا نا تو دل چاہا اسے دل میں چھپا لوں۔۔ایسے کہ دنیا اس کی طرف دیکھ بھی نا سکے۔۔میں اس کا چہرہ چھو چھو کر دیکھتی تھی اور میرا جی نہیں بھرتا تھا۔۔۔اتنا عرصہ ہو گیا تھا امامہ۔۔۔اللہ سے کچھ نہیں مانگا تھا سوائے اس بیٹے کے دوبارہ مل جانے کے۔۔۔اس کو دیکھ کر میرے منہ سے صرف کلمہ شکر نکلتا تھا۔۔۔صرف کلمہ شکر۔۔کہ یا اللہ تو نے واپس دے دیا۔۔تیری مہربانی۔۔اب باقی کام ہمارا ہے۔۔" ان کی آنکھیں جھلملائی تھیں لیکن ان کا سارا دھیان دعا کی جانب تھا

"آپ بہت ہمت والی ہیں امی" امامہ نے انہیں سراہا

ہر ماں ہمت والی ہوتی ہے امامہ۔۔جب معاملہ اپنی اولاد کا آتا ہے نا تو ہر ماں میں ہمت آجاتی ہے۔۔تم دعا کے معاملے میں ہمت والی نہیں ہو۔۔۔یہ اللہ کی عطا ہے۔۔اس نے عورت کمزور لیکن ماں بہت مضبوط بنائی ہے۔" امی نے تیل کی بوتل کھول کر اس میں سے تھوڑا تیل اپنی ہتھیلی پر انڈیلا تھا پھر دوبارہ سے اس کا ڈھکن بند کر کے دوبارہ سے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع ہوا تھا

"میرے اس بیٹے نے مجھے ہی نہیں اپنے باپ کو بھی ایک نئی ہمت عطا کی ہے امامہ۔۔۔پروفیسر صاحب اس کی خاطر ایک ٹانگ پر بھی کھڑے رہنے کو تیار تھے۔۔۔ہم نے یعنی میں نے اور تمہارے ابو نے ایک لمحہ بھی مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔۔ابتداء میں ہر روز ہاسپٹل جانا پڑتا تھا۔۔اس کی تھراپی ہو رہی تھیں۔۔۔سائیکاٹرسٹ سے ساتھ سیشنز تھے۔۔۔ہر دوسرے دن کوئی نا کوئی لیب ٹیسٹ ہوتا تھا۔۔تم جانتی ہی ہو۔۔تمہارے ابو کو ڈرائیونگ سے کتنی چڑ رہی ہے لیکن بیٹے کی خاطر ہر روز اتنی لمبی ڈرائیو کر کے ہاسپٹل لے جاتے تھے پر ہم دونوں بہت خوش ہیں۔۔۔مشکل ٹل چکی ہے امامہ۔۔۔کڑا وقت گزر گیا ہے۔۔۔تمہیں بتاؤں یہ ابتداء میں صرف ایک جملہ بولتا تھا۔" امی۔۔میں قتل ہو گیا تھا نا"۔۔۔ہر وقت بس یہی ایک جملہ۔۔۔میں سنتی تھی تو آنکھوں سے پانی کی جھڑی بہنے لگتی تھی۔۔۔دل جیسے کوئی آرے سے چیرتا تھا۔۔میں اسے اپنی بانہوں میں لے لیتی اور بس اس کا منہ سر چومتی رہتی۔۔اسے اپنے زور پر اتنا کنٹرول بھی نہیں تھا کہ منہ سے بہتے لعاب کو سنبھال سکتا۔۔سوچو۔۔باقی کام کیسے کرتا ہو گا۔۔" امی لمحہ بھر کے لئے رکی تھیں۔۔آنکھیں بھیگنے کو تیار تھیں لیکن انہوں نے آنسوؤں کو بہنے نہیں دیا تھا

"آپ کو تو بہت مایوسی ہوتی ہوگی امی" امائمہ نے پھر ایک بے تکا سوال پوچھا تھا

"نہیں امائمہ۔۔ بالکل بھی نہیں۔۔۔ مایوس ہو جاتی تو ناکام ہو جاتی۔۔۔ اور مجھے دوسری بار ناکام نہیں ہونا تھا۔۔ میں بس اسے دیکھتی تھی اور اللہ سے معافی مانگتی تھی کہ اللہ کریم تیری نعمت کی قدر نا کر سکی۔۔ مجھے معاف کر دے اور اب جو یہ موقع دیا ہے نا دوبارہ سے ۔۔ اپنے بیٹے کو دیکھنے کا۔۔ اسے پالینے کا۔۔ اسے دوبارہ سے ایک کارآمد انسان بنانے کا تو میں اسے ضائع نا کروں۔۔ میں بہت قسمت والی ہوں امائمہ۔۔ مجھے میرا بیٹا دوبارہ دیا گیا ہے۔۔ ورنہ اللہ کب اپنی نعمتوں کی قدر نا کرنے والوں پر اتنا رحم کرتا ہے۔۔۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے امائمہ تو میں مایوس ہو کر اسے کیسے ضائع کر دوں" امی نے دعا کو اپنے پاؤں پر الٹا لٹا لیا تھا اور اب اسی نرمی سے اس کی پشت رگڑ رہی تھیں ۔ امائمہ نے گہری سانس بھری۔ وہ امی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے رونا آجاتا تھا۔ اس کے ماں باپ کی عمر اب اس طرح مشقت کرنے والی نہیں تھی۔ ان کے آرام کے دن تھے اور انہیں اپنے عاقل بالغ بیٹے کو چھوٹے بچے کی طرح پالنا پڑ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ابو کی طرف دیکھا۔ اب جب اپنی اولاد سے اپنے پاؤں دبوانے کے دن تھے وہ اپنے بیٹے کے پاؤں سہلا رہے تھے۔ وہ اس قدر مگن تھے کہ لگتا تھا انہیں ارد گرد سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ نور محمد باتیں کرتا تھا لیکن اس کی باتیں بہت غور کرنے پر سمجھ میں آتی تھیں۔ امائمہ جب سے آئی تھی یہی دیکھ رہی تھی کہ ابو اس کے پاس بیٹھے بس باتیں کرتے تھے۔۔ چھوٹی چھوٹی لایعنی باتیں۔۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اسے بولنے کی تحریک دیتے رہیں گے تو بہت جلد روانی سے بولنے لگا۔ ابو نا صرف اس سے باتیں کرتے تھے، اس کی باتیں سنتے تھے۔ اسے تلاوت کرواتے تھے۔ اس سے کرکٹ میچ دکھا کر اس سے ڈسکس بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا اسے چھوٹی چھوٹی گیمز بھی کھلائیں تاکہ اس کے ہاتھ پاؤں میں خون کی گردش تیز ہو۔۔ اور امائمہ دیکھتی تھی کہ ابو نور محمد کو مجبور کرتے تھے کہ وہ گیند کو زور سے پھینکے اور جب وہ پھینکتا تھا تو ابو کو اپنی جگہ سے اٹھ کر جاتے تھے اور اسے دوبارہ لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیتے تھے تاکہ وہ یہ عمل دوہرائے۔ اسے وہیل چیئر سے اٹھا کر اسٹینڈ کے سہارے چلنے کی پریکٹس کروانا، اسے باتھ روم جانے میں مدد کرنا۔۔ یہ سب ایک بوڑھے آدمی کے لئے بہت مشقت والے کام تھے لیکن ابو ہنسی خوشی سب کرتے تھے۔ گھر میں دو کل وقتی ملازم بھی تھے لیکن نور کے سب کام امی اور ابو ہی کرتے تھے۔ ایسا لگتا ان کی زندگی کا صرف ایک محور تھا اور نور محمد تھا اور وہ اس کے کام کرتے ہوئے اتنے مطمئن نظر آتے تھے کہ امائمہ اللہ کا شکر ادا کرتی نا تھکتی تھی۔۔ اللہ نے دوبارہ اولاد دی تھی اور اسے پھر سے پرورش کرنے کی ہمت بھی دوبارہ عطا کر دی تھی۔ وہ بھائی اور ابو کی جانب دیکھ رہی تھی جبکہ امی اس کی جانب گاہے بگاہے نظر ڈال لیتی تھیں

"میں جانتی ہوں تمہیں عجیب لگ رہا ہوگا۔۔۔ شاید تمہیں میری بات کا یقین بھی نا آئے لیکن ہم نور محمد کو واپس پا کر پہلے سے زیادہ خوش اور مطمئن ہیں" امی نے دعا کی قلقاریوں کو خوشی سے سنتے ہوئے امائمہ کی جانب دیکھ کر کہا تھا

"یہ اب بہت سنبھل گیا ہے۔۔ پڑھنے لکھنے لگا ہے۔۔ خود کھانا کھا لیتا ہے۔۔ باتھ روم چلا جاتا ہے۔۔ کپڑے تبدیل کر لیتا ہے ۔۔ میں بہت پرامید ہوں کہ ایک دن یہ بالکل صحتمند انسانوں کی طرح زندگی گزارے گا" امی نے گویا اسے تسلی دی تھی کہ وہ پریشان نا ہو

"انشاء اللہ۔۔" امائمہ یہ کہتے ہوئے خود کو دلگرفتگی سے نکال نا سکی تھی

"امی میں سوچ رہی ہوں میں یہیں رہ جاؤں۔۔ میں بات کروں گی عمر سے کہ وہ مجھے کم از کم چھ مہینے کے لئے تو ضرور رہنے دے ۔۔تاکہ آپ کو کوئی ہیلپنگ ہینڈ مل سکے۔۔آپ اکیلے کیا کیا سنبھالیں گے" امائمہ نے بیٹھے بیٹھے منصوبہ بنا لیا تھا۔اسے یقین تھا عمر اسے اجازت دے دے گا۔امی کو اس کی بات سن کر ہنسی آئی

"تم کیا سمجھتی ہو۔۔ یہاں تک تم ہم اکیلے لے آئے ہیں اپنے بیٹے کو۔۔ بہت ہیلپنگ ہینڈز میسر ہیں ہمیں۔۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ کتنا پیار ملا ہے میرے بیٹے کو۔۔ اتنے لوگ ہماری مدد کو آگئے تھے کہ ان سب کا نام لینے لگوں تو ایک سانس میں لے بھی نا پاؤں۔۔ ایک نیک ماں کا بچہ ہے سلمان حیدر۔۔ اس کے ساتھ کہیں اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔۔۔ وہ صحافی ہے۔۔ اس نے اس کی خاطر بڑی محنت کی تھی اور اس کے آجانے کے بعد بھی نا صرف اس کا بلکہ ہمارا بھی بہت خیال رکھتا ہے۔۔ ہر روز اسے لینے کے لئے آتا ہے۔۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے اسے پک اینڈ ڈراپ دیتا ہے۔۔ اس نے غریب نادار بچوں کے لئے ایک اسکول بنا رکھا ہے۔۔ وہاں نور کو بھی لے جاتا ہے۔۔ اس کی امی بھی وہیں پڑھاتی ہیں۔۔ وہاں نور ہر روز لیکچر دیتا ہے۔۔ ہر روز۔۔ اور سب بیٹھ کر غور سے سنتے ہیں۔۔ اسے پوری آزادی دیتے ہیں کہ یہ جو چاہے بولے اور باقی بچے صرف بیٹھ کر سنتے ہیں۔۔ تمہارے ابو لیکچر تیار کر کے دیتے ہیں اور یہ وہاں جا کر پڑھتا ہے ان بچوں کو۔۔ واپسی پر مجھے ساری روداد خوشی خوشی سناتا ہے۔۔ آجکل سردیاں ہیں تو ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے کھلے آسمان تلے زیادہ دیر بیٹھنے سے۔۔ اس لئے نور آجکل گھر رہتا ہے۔۔ ورنہ روز جایا کرتا تھا۔۔۔ زارا بھی ہفتے میں دو بار آیا کرتی تھی۔۔ صرف اس سے ملنے۔۔ اسے موٹی ویٹ کرنے۔۔ شہروز بھی لاہور آیا ہو تو ملنے آتا ہے۔۔ اسے کہتا ہے میری شادی میں تم نے گانا ضرور گانا ہے۔۔ اور سب سے بڑھ کر وہ جو ادیب نور محمد ہیں۔۔۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس سے ویڈیو کال پر بات کرتے ہیں۔۔ اس کا حال پوچھتے ہیں۔۔ اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔۔ اور کہتے ہیں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور مجھ سے ملنے کے لئے آؤ۔۔۔ بتاؤ امائمہ۔۔ ہمیں مزید ہیلپنگ ہینڈز کیا کرنے۔۔" امی کہہ رہی تھیں اور اب کی باران کی آنکھیں جھلملائی تھیں۔

"امائمہ تم میری یا اپنے ابو کی فکر مت کرو۔۔ تم بس اب اپنی بیٹی کی تربیت پر دھیان دو۔۔۔ یہ تمہارا فرض ہے۔۔۔ اسی کی پوچھ پڑتال ہے۔۔ من کا کھایا تن کا پہنا سب یہیں رہ جائیگا۔۔ برانڈڈ کپڑے، آئی فون، برگر۔۔ ناچ گانے۔۔۔ سب غیر ضروری باتیں ہیں ۔۔۔ اصل چیز ہے انہیں انسانیت کا وہ سبق پڑھایا جائے جس کا اللہ اور پیارے رسول نے حکم دیا ہے۔۔ اس لئے امائمہ اولاد کو ایسی تربیت دو کہ وہ اللہ کے یہاں بھی سرخرو ہو سکے۔" امائمہ اب کی بار اپنے آنسو روک نہیں پائی تھی لیکن اس کا دل بوجھل نہیں تھا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے ۔اس نے امی کے ہاتھ سے دعا کو لے لیا تھا

"انشاءاللہ امی۔۔ عمر تو کہتا ہے ہم اپنی بیٹی کو بیٹے کی طرح پالیں گے۔۔ بہت پیار کرتا ہے دعا سے" وہ کہہ رہی تھی۔ امی مسکرائیں

"جب اللہ نے بیٹی دی ہے تو اسے بیٹی کی طرح ہی پالنا میری بچی۔۔ کیا بھی کسی نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بیٹی کی طرح پالے گا۔۔۔ یہ احساس کمتری ہے۔۔ اللہ نے بیٹی دی ہے تو فخر سے اسے بیٹی والی سوچ کے ساتھ پالو۔۔ اسے اس کے ہونے کا فخر دو۔۔ غرور دو۔۔ تاکہ وہ کل کو نا صرف اپنے گھر کے لئے بلکہ معاشرے کے لئے بھی ایک صحتمند کردار ادا کر سکے" امی نے نصیحت کی تھی۔

"یاد رکھو امامہ عورت کا کردار کسی بھی گھر یا معاشرے کے لئے بہت اہم ہوتا ہے۔۔۔ایک چھوٹی بچی نے کل کو بڑے ہو کر ماں بننا ہوتا ہے۔۔۔اور کتابوں میں لکھا ہے کہ ریاست کے سات ستون ہوتے ہیں،، ریاست کا سارا وزن انہی سات ستونوں پر ہوتا ہے لیکن میں جانتی ہوں۔۔۔ریاست کا ایک آٹھواں ستون بھی ہوتا ہے اور وہ اس ریاست کی "ماں" ہوتی ہے۔۔۔سارے ستون بھی کمزور ہو جائیں نا تو وہ ریاست قائم رہ سکتی ہے لیکن "ماں" نام کا یہ آٹھواں ستون اگر ناکام ہو جائے تو پھر ریاستیں ٹوٹ پھوٹ جایا کرتی ہیں۔۔۔میں نے تو اپنی زندگی سے یہی سیکھا ہے کہ ماں کو کبھی کمزور نہیں پڑنا چاہیے نا ہار ماننی چاہیے۔۔۔اسی میں اس کی اس کی اولاد کی بھلائی ہے" امی بہت محبت سے اسے سمجھا رہی تھیں، امامہ نے مسکراتے ہوئے آنکھیں گھما کر انہیں دیکھا۔ "آپ تو بہت ذہین ہو گئی ہیں امی" امی مسکرائیں

"عہد الست سے سیکھا ہے۔۔۔تمہیں بھی "عہد الست" دوں گی۔۔۔اسے ضرور پڑھنا۔۔۔تمہیں نا صرف اچھا لگے گا بلکہ تمہیں کچھ نئی چیزیں بھی سیکھنے کو ملیں گی" امی کہہ رہی تھیں۔امامہ نے دعا کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

روشنی کو حکم تھا کہ وہ اس کے پورے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔روشنی کی بساط نہ اوقات کہ وہ اس کے حکم سے انکار کرتی سو اس نے فقط پلکیں جھپکی تھیں اور ایک معصوم وجود کو تاریکی سے روشنی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی۔وہ آ چکا تھا ایک ایسی دنیا میں جو تخلیق ہی اس کے لیے کی گئی تھی تا کہ وہ اس طرح جی سکے جس طرح جینے کا حکم ہے۔اسی لیے وہ مطمئن اور پرسکون تھا۔اسے زندگی کی نعمت دان کر دی گئی تھی۔اس کے معصوم چہرے کا ایک ایک نقش، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اور اس کے خون کی ایک ایک بوند اس نعمت پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھی۔وہ چند لمحے قبل دنیا میں آیا تھا لیکن اس کی حیات مکمل تھیں۔وہ سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا واقعی "دنیا" ایک حقیقت ہے؟"

☆ ☆ ☆

نور محمد نے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھتے ہوئے اس کے معنی و مطالب پر غور کرنے کی کوشش کی تھی۔امی کہتی تھیں یہ کتاب اس کی زندگی کے حالات پر لکھی گئی تھی لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کیا کیا کچھ ہو چکا تھا۔وہ ماضی کو کھنگالنے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا۔امی کہتی تھیں جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے۔۔۔اسے بھول جاؤ۔۔۔اور وہ واقعی بھول جاتا تھا۔اس کے پاس کرنے کو اور بہت کام تھے۔وہ کب تک ماضی کو یاد کرتا رہتا۔وہ گریڈ تھری کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔پہلے پہل اسے صرف انگلش پڑھانے کے لئے کہا گیا تھا لیکن اب وہ میتھس انگلش اور اردو بھی پڑھا رہا تھا۔اس کا سارا وقت اپنی کلاس کے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرتا تھا۔اسے انہیں پڑھانے میں مزا آتا تھا۔وہ بھی اس کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے اور یہ امر نور محمد کے لئے سب سے مطمئن کر دینے والا تھا کہ کچھ لوگ تھے جو اس کی معیت میں اس قدر خوش ہوتے تھے۔وہ کبھی نہیں جا پاتا تھا تو سلمان حیدر فون کر کے اسے کسی نا کسی بچے سے بات ضرور کرواتا تھا جو اس بات

پر اصرار کرتا کہ ہم اداس ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی وہ بچے تھے جنہیں پڑھاتے ہوئے اسے اپنا آپ معتبر لگتا تھا۔وہ اوہیل چیئر کے بغیر چل سکتا تھا اگرچہ چال غیر متوازن تھی لیکن وہ خوش تھا کہ وہ اپنی ٹانگوں پر چلتا تھا۔ایک بازو ابھی بھی رعشہ کا شکار تھی لیکن ڈاکٹرز پر امید تھے کہ وہ بھی جلد ٹھیک ہو جائیگی۔وہ اپنی زندگی سے بے حد مطمئن تھا۔کیا نہیں ہے یا کیا ہونا چاہیئے تھا کی بجائے وہ جو ہے جیسا ہے شکر ہے کہ اصولوں پر چلنے میں خوش رہتا تھا۔اس کے گھر والے بھی اس بارے میں زیادہ نہیں سوچتے تھے۔ابو کہتے تھے

" زندگی فقط سسکی سے شروع ہو کر ہچکی پر ختم ہو جانے والا ایک مختصر ترین عمل ہے جو شروع تو مٹی کے اوپر ہوتا ہے لیکن ختم ہمیشہ مٹی کے نیچے ہوتا ہے لیکن خاک سے بنے انسان کو تب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ وہ خاک کی خوراک نہیں بن جاتا۔اس لئے زندگی کی کمیوں کے بارے میں اتنا مت سوچو۔۔اللہ کا شکرادا کرو کہ اس نے اتنا اچھا بنایا ہے۔نور محمد نے کانپتے ہاتھ مگر مسرور دل کے ساتھ اپنا پلیکٹ درست کیا تھا۔عہد الست ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔اس نے آخری صفحہ نکال لیا تھا جس کا پہلا جملہ ہی دلچسپ تھا

"کیا واقعی دنیا ایک حقیقت ہے"۔یہ عہد الست کا اختتام تھا

جب آپ زندگی کا زیادہ عرصہ اس دنیا میں گزار لینے کے بعد یہ سوال پوچھتے ہیں تو دنیا بھی قہقہہ لگا کر آپ کا تمسخر اڑاتی ہے اور سوال پوچھتی ہے کہ

" اے اشرف المخلوقات!۔۔تجھے تیرے رب نے دنیا کے سینے پر اتارا، تجھے اپنا مشیر بنایا، تجھے زمین کی سلطنت دان کی گئی۔۔تجھے فہم وفراست عطا کی گئی۔تجھے مسجود ملایک بنایا گیا۔۔تو یہ سوال پوچھتا اچھا نہیں لگتا۔۔۔تجھے حق نہیں کہ تو میرے بارے میں سوال کر۔۔میرے بارے میں تجھے سب بتایا گیا۔۔میں کیا ہوں، میری حقیقت کیا ہے۔مجھے کیسے برتنا ہے، کیسے استعمال کرنا ہے۔۔میں صفر ہوں۔۔جب تک دین کی اکائی کے ساتھ نہیں ملوں گی۔۔تمہارے کام نہیں آؤں گی۔۔مجھے دس بنا کر استعمال کرنا۔۔تمہیں تو سب بتایا گیا تھا۔۔مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ تم کیا ہو۔۔مجھے صرف تمہاری تعریفیں سنا سنا کر مرعوب کیا گیا تھا۔تم وہ ہو جسے جنوں فرشتوں نے سجدے کیئے تھے۔۔تم وہ ہو جسے اللہ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔تم خلیفۃ الارض ہو۔۔۔تم مسجود ملائک ہو۔۔۔تم اشرف المخلوقات ہو۔۔اس لئے یہ میرا حق ہے کہ سوال کروں کہ

" اے گوشت کے لوتھڑے۔۔

خاک وآب کے متزاج تو مجھے بتا۔۔۔

کیا واقعی انسان ایک حقیقت ہے؟؟؟؟"

تمت بالخیر